تفسیر موضوعی

جلد اوّل

قرآن کا دائمی منشور

آیۃ اللہ استاد جعفر سبحانی

مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

نام کتاب ------------------ تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور

جلد ------------------ اوّل، دوم

مؤلف ------------------ آیۃ اللہ اُستاد جعفر سبحانی

مترجم ------------------ مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و تنظیم نو ------------------ قلب علی سیال

کمپوزنگ ------------------ فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)

طبع ثانی ------------------ مکتبہ جدید پریس لاہور

سال اشاعت ------------------ فروری 2012ء

ناشر ------------------ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ مکمل سیٹ ------------------ 3000 روپے

اس کتاب کی اشاعت کیلئے الحاج شیخ وحید احمد نے تعاون فرمایا ہے ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ادارہ۔

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشرواشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیات قرآنی کو ایک مقام پر لاکر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کر دی گئی ہے، لہٰذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔

تفسیر قرآن کا یہ طریقہ علماء ومحققین اور عام طالبانِ قرآنیات کے لیے بڑی اہمیت اور افادیت رکھتا ہے۔ وہ اس کے ذریعے قرآن کی ہمہ گیر تعلیمات اور اسلام کے آفاقی ضوابط کو بہتر اور جامع طور پر سمجھنے سمجھانے کے علاوہ بالوقت استنباط احکام بھی کر سکتے ہیں۔ آیت اللہ جعفر سبحانی نے فارسی زبان میں یہ اولین تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور کے نام سے ترتیب دی اور علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ نے اسے فارسی سے اردو میں منتقل فرمایا ہے۔

تفسیر موضوعی کی طباعت واشاعت میں حسب ذیل دو مقاصد ہمارے پیشِ نظر رہے ہیں:

۱: اردو خوان طالبان قرآنیات کو تفسیر قرآن کی ایک نئی روش سے روشناس کرانا۔

۲: علماء ومحققین کی خدمت میں اسلامی وقرآنی تعلیمات کا ایک ایسا مرقع پیش کرنا کہ جس میں ہر موضوع اپنی جگہ مکمل ہو۔

اس وقت تفسیر موضوعی کی جلد نمبر 1، 2 کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے پیش نظر دو جلدوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ تاکہ کتاب کی قیمت میں کمی کی جا سکے۔ کتاب تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور کی طباعت ثانی دس سال بعد پیش کی جا رہی ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرِ نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔ اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست

تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور جلد نمبر 1، 2

عنوان	صفحہ نمبر

تفسیر موضوعی:

قرآن کا دائمی منشور جلد دوم

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مقدمہ مؤلّف

تفسیر قرآن کا ایک نیا رُخ

فارسی زبان میں اوّلین تفسیر موضوعی

ہماری ملت کے عظیم اسلامی انقلاب کے طلوع کے موقع پر قرآن کہ جس کی تعلیمات ہی پر ہمارے انقلاب کی بنیاد ہے، کے اعلیٰ مفاہیم کی تعلیم ایک لازمی فریضہ ہے تا کہ سارے انقلابی ادارے ان پر پوری توجہ مبذول رکھ سکیں اور اس آسمانی کتاب کی تعلیم کو عام کرنے کے وسائل مہیا کر سکیں۔ کیونکہ اسی کے احکام پر عمل کرنا انقلاب کے قائم ودائم رہنے کا اور دوسرے علاقوں میں پھیلنے کا ضامن ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری ملت کے اس انقلاب نے علاقے کی عظیم ترین طاقتوں کے مقابلے میں خالی ہاتھ جو کچھ کر دکھایا' ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اس نے سپر طاقتوں کو گہری سوچ اور تعجب میں مبتلا کر دیا ہے۔ مشرق اور مغرب کے سیاست دانوں کے سارے اندازوں اور توقعات پر پانی پھیر دیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایک قوم شرق اور غرب کی سُپر طاقتوں پر بھروسہ کیے بغیر اور کسی فوج کے بغیر صرف ایمان کی قوت سے لیس ہو کر استعمار کے جوئے کو اپنے کندھے سے اُٹھا کر پھینک سکتی ہے اور میدانِ سیاست میں بحیثیت ایک طاقت کے اُبھر کر ساری دنیا کے محروموں، مجبوروں اور مستضعفین کو یہ خوشخبری سُنا سکتی ہے کہ اگر آزادی کی قیمت ادا کی جائے اور خون وشہادت کے مکتب کی پیروی کی جائے تو بآسانی استقلال و آزادی حاصل ہو سکتی ہے، دشمن کا تکبر خاک میں ملایا جا سکتا ہے اور اپنے مختلف گروہوں میں اُلفت اور محبت پیدا کی جا سکتی ہے۔

حق وباطل کی اس جنگ میں ہماری ملت کا سرمایہ صرف ایمان باللہ کی قوت اور قرآن کی بشارتیں تھیں۔ قرآن میں موجود میدانِ جنگ میں استقامت اور پامردی سے متعلق آیات سے شناسائی نے اور راہِ خدا میں آرزوئے شہادت نے ہمارے بہادروں اور جواں مردوں میں شہادت کی ایسی پیاس پیدا کر دی ہے کہ وہ ہمہ وقت شوقِ شہادت میں آنسو بہاتے اور بیتاب ومضطرب رہتے ہیں۔

اس قیمتی سرمائے کی حفاظت کیلئے ضروری ہے کہ تمام محفلوں اور مجلسوں میں اور بنیادی اور نشریاتی اداروں اور محکموں میں قرآن کو تقویت دی جائے ،نئی نسل جو گذشتہ دور میں مختلف النوع وجوہات کی بنا پر قرآن کریم کی حقیقی اور اصلی تعلیم سے محروم رہی ہے، اسے اس کی صلاحیتوں کے مطابق اور ممکنہ طریقوں سے قرآن کے اعلیٰ مفاہیم سے آشنا کیا جائے اس سلسلے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کیلئے ہر قسم کے وسائل اور ذرائع سے مدد لی جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہم سب کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ اگر ہم سب اس پر عمل کریں تو ہماری مِلت کی اپنی آسمانی کتاب سے آگاہی کیلئے ایک عظیم تحریک وجود میں آ جائے۔ پہلے مرحلے پر اس نوخیز اور انقلابی نسل کو فہمِ قرآن کی کلید سے آشنا کرنے کی ضرورت ہے، یعنی عربی زبان اور اس کے مروجہ قواعد کی تعلیم کی کوششیں کی جائیں۔

اس طرح (ایرانی) آئین کی سولہویں دفعہ [1] کا مقصد پوری طرح حاصل ہو سکے گا۔اس کی صورت یہ ہے کہ جوان نسل کی قرآن سے آگاہی کیلئے ایک مؤثر قدم اٹھایا جائے۔اگلے اقدامات بھی اس کے ساتھ ہوں تو ہمارے نوجوان اس جاوداں کتاب کی تعلیم حاصل کرنے کے راستے پر خود آگے بڑھیں گے۔اس طرح قرآن رفتہ رفتہ ان کی روح اوران کے اذہان میں اتر تا چلا جائے گا۔جن تعلیمی اداروں کے پاس وسائل اچھے ہوں وہ قرآن میں درج تاریخی،واقعاتی،علوم طبیعاتی وفضائی کے مسائل کو پیش کرنے کیلئے فلموں،سلائیڈوں اور مفید ڈراموں سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔جس کا انداز یہ ہو کہ قرآن پاک کا احترام بھی باقی رہےاور ساتھ ساتھ قرآنی داستانوں کے اصلاحی اور تربیتی نکات اور عالم خلق وآفرینش کے بارے میں اس کے نظریات بصری وسمعی طور سے سامنے آجائیں۔

علمائے عظام جو قرآن کے محافظ اوراس کے علوم واسرار کے حامل ہیں اس وقت ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کتاب کے اسرار و رموز کی تفہیم کیلئے زیادہ سے زیادہ کوشش کریں،خواہ یہ معارف عقلی ہوں۔جیسے مبداء ومعاد اور روح وفرشتہ خواہ قوانین وشرائع کی تشریح وتفصیل ہو یا قرآن کے دیگر پہلو ہوں۔اسی طرح اخلاقی،سماجی،سیاسی اور اقتصادی مسائل پر گفتگو کرتے وقت انسانی زندگی کے ساتھ قرآن کے تعلق کو قائم رکھتے ہوئے،ان کو اس طرح پیش کریں کہ اس کتاب کے مطالب زندگی کی راہوں کی نشاندہی کریں۔

---

[1] اس دفعہ کا متن یہ ہے: چونکہ اسلامی علوم ومعارف کی زبان عربی ہےاور فارسی ادبیات میں بھی مکمل طور سے رَچ بس گئی ہے لہٰذا یہ زبان ابتدائی سطح سے لے کر متوسط سطح کے آخر تک تمام کلاسوں اور تمام شعبوں میں پڑھائی جائے۔

تفسیر کی دنیا میں انقلاب

اسلامی مفسرین کو قرآن کریم کے اعلیٰ مقاصد کی تشریح و تفہیم کے سلسلے میں ایک مؤثر قدم اٹھانا چاہئے اور وہ یہ کہ تفسیر کے طرز میں ایک دقیق تبدیلی لائیں اور اس کتاب کی تفسیر میں ایک ہی انداز کا تکرار نہ کریں۔سورہ بہ سورہ اور آیت بہ آیت اس تکرار سے اجتناب کریں اور دوبارہ ایک نئی طرز تفسیر یعنی تفسیر موضوعی کی طرف توجہ فرمائیں اور ملاحظہ کریں کہ اس نوع کی تفسیر میں قرآنی علوم و معارف کی کتنی وسعتیں اور جہتیں سما سکتی ہیں۔

اسی راستے پر مولف نے معمولی سا قدم اٹھایا ہے تا کہ اس مقدس ہدف اور مقصد کو حاصل کر سکے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دے راقم نے فارسی زبان میں پہلی مرتبہ قرآن کے انتہائی بلند حقائق کی پیاسی نئی نسل کیلئے ''تفسیر موضوعی'' پیش کی ہے۔اس سلسلے میں آغاز سُخن کے طور پر چند نکات عرض خدمت ہیں۔

قرآن۔۔۔۔۔ایک دائمی معجزہ

قرآن مجید پیغمبر اسلام کا ایک دائمی معجزہ ہے اور قیامت تک کیلئے آپ کے دین کی حقانیت کی سند ہے دین اسلام چونکہ جاودانی اور ہمیشہ رہنے والا دین ہے۔اس لیے اس کو ہر زمانے اور ہر دور میں سند اور دلیل کا حامل ہونا چاہیئے اور ہر زمانے میں دلیل و گواہ بھی اس کے ساتھ ہونے چاہئیں۔

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے دلائل وقتی اور ان کے زمانوں کے ساتھ مخصوص تھے اور بعد میں آنے والی نسلیں ان کے مشاہدے بے بہرہ تھیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شریعت کی مدت ان کے معجزات کی طرح بہت محدود تھی۔ان کے معجزات کی لوگوں کے ذہنوں میں پائیداری اسی حد تک تھی کہ جس حد تک ان کا دین دوام رکھتا تھا اور وہ پیغمبر خاتم ﷺ کے دین کی خصوصیات نہیں رکھتا تھا۔

مگر پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت آخری اور خاتم ہے، چنانچہ آپ کا دین جاودانی اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دین کو ایسے معجزے کے ساتھ ظاہر کیا جو مرور زمانہ کے ساتھ پرانا اور فرسودہ نہ ہو۔ بلکہ ہمیشہ زمانے کی پیشانی پر آفتاب کی مانند چمکتا رہے نہ کہ کسی زمانی اور مکانی سرحد کا قائل ہو، تا کہ تمام زمانوں میں اپنے پیروکاروں کے دلوں سے ہر قسم کا شک و تردد دور کر سکے۔

قرآن کا لامتناہی ہونا

ابھی قرآن نازل ہوئے نصف صدی بھی نہیں گزری تھی کہ علماء اور دانش ورانِ اسلام نے اس کے دقیق اور مخفی مطالب سمجھنے اور اس کے استخراج اور استنباط کیلئے کئی ایک علوم وفنون کی بنیاد رکھی ،حقیقت میں علوم اسلامی کے بیشتر شعبوں مثلاً لغت صرف ونحو،معانی و بیان ،بدیع

،قرائت، تجوید، قصصِ قرآن، آیات کی شانِ نزول وغیرہ کی بنیاد اسی زمانے میں رکھ دی گئی تھی تا کہ قرآن کے اعلیٰ مفاہیم کا ادراک آسان ہو۔

اس کتاب پر اس طرح کی شایان شان توجہ دی گئی اور پھر پچھلی چودہ صدیوں میں ماہرین نے اس کے بلند معانی اشکار کیے اور اس کے مفاہیم کو سمجھنے میں بہت وقت صرف کیا، شب و روز اس کی محدود آیات کو اُلٹ پھیر کر دیکھا اور اس کو مطالعہ اور بحث وتمحیص کا موضوع بنائے رکھا۔ مگر اس کے باوجود یہ جاودانی معجزہ اور عجیب وغریب اسرار آمیز کتاب ایسی ہے کہ ابھی تک فکر بشر کی رسائی اس کے تمام مخفی اسرار اور خزانوں تک نہیں ہو سکی۔

قرآن گویا عالمِ فطرت کے مانند ایک ایسا صحیفہ ہے کہ انسان کی بینش و دانش اور فکر ونظر جس قدر وسیع اور عمیق ہوتی جائے گی اور جس قدر اس کے بارے میں بحث وتمحیص ومطالعہ کیا جائے گا اسی قدر اس کے رموز واسرار پر سے پردہ اٹھتا جائے گا اور بالکل نئے حقائق انسان کے ہاتھ آتے جائیں گے۔ خدائے لامتناہی ولامحدود کی کتاب سے اسی امر کی توقع بھی کی جانی چاہیے۔ جب خود اس کا وجود لامتناہی اور لامحدود ہے اور اس کے وجود کے لئے کسی قسم کی حد بندی نہیں ہے تو اس کی کتاب کو خود اس کی نشانی ہونا چاہیے، تا کہ وہ آفتاب کی طرح خود اپنی گواہ اور دوسروں کیلئے رہنما ہو۔

اسلام کے عالی قدر پیغمبرؐ وہ پہلے فرد ہیں جنہوں نے قرآن کے مفاہیم وحقائق کے ''لامتناہی'' ہونے کی تصریح کی ہے اور اسے قرآن کا سب سے بڑا اتعاف قرار دیا ہے جیسا کہ آپؐ نے فرمایا:

له ظهر وبطن ،فظاهره حكم وباطنه علم، ظاهره انيق وباطنه عميق ،له، تخوم وعلى تخومه تخوم[1] ،لاتحصى عجائبه ولاتبلى غرائبه ،فيه مصابيح الهدى ومنار الحكمة[2]

''قرآن کیلئے ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ اس کا ظاہر حکم وفرمان ہے اور اس کا باطن علم وآگاہی ہے۔ اس کے عمیق اور گہرے معانی خوبصورت الفاظ کے قالب میں ڈھالے گئے ہیں۔ قرآن کی جڑ ہے اور اس کی ہر جڑ کی ایک اور جڑ ہے۔ اس کے عجائبات کی کوئی انتہا نہیں اور اس کے حقائق ہمیشہ تر وتازہ ہیں۔ اس کی آیات ہدایت کی مشعلیں اور حکمت کے سرچشمے ہیں۔''

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکتب کے پہلے تربیت یافتہ شخص حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام قرآن مجید کی اس طرح تعریف وتوصیف کرتے ہیں:۔

---

[1] چند ایک نسخوں میں نجوم کا لفظ آیا ہے۔ یعنی ستارے یہ اس امر کیلئے کنایہ ہے کہ ہر آیت ستارے کی طرح دوسری آیت کی رہنما ہے

[2] اصول کافی۔ کتاب القرآن ج2 ص599

"انزل علیه الکتاب نورًا لاتطفأ مصابیحه وسراجًا لایخبو توقده وبحرًا لایدرك قعره وبحرلاینزفه المتنزفون وعیون لاینضبها الماتحون ومناهل لایغضها الواردون۔"

قرآن وہ مشعل ہدایت ہے جو کبھی بجھتی نہیں اور وہ چراغ ہے جس کی لو مدھم نہیں ہوتی ۔ یہ ایسا سمندر ہے جس کی تہ ظاہر نہیں ہوتی ۔ پانی نکالنے سے یہ خالی نہیں ہوتا۔ اس کے چشموں کا پانی کبھی کم نہیں ہوتا۔ اس کے گھاٹ سے پینے والے اس کے پانی کو کم نہیں کر سکتے۔

ایک شخص نے حضرت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے پوچھا:

"مابال القرآن لایزداد عند النشر والدرس الاّ غضاضة فقال انّ الله تعالیٰ لم یجعله لزمان دون زمان، ولالنّاس دون ناس فهو فی کلّ زمان جدید، وعند کل قوم غض الیٰ یوم القیامة"[1]

"قرآن کی درس و تدریس اور نشر و اشاعت سے اس کی تازگی کم نہیں ہوتی، بلکہ اس کی تروتازگی میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ امام نے جواب میں فرمایا: خدا نے قرآن کو معین زمانے اور مخصوص لوگوں کیلئے نہیں بھیجا۔ چنانچہ وہ ہر زمانے میں تروتازہ رہتا ہے اور یہ دنیا کی تمام اقوام و ملل میں قیامت تک کیلئے نیا اور تازہ ہے۔"

اس حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام نے نہ صرف قرآن کے لامحدود اور لامتناہی ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ بھی بیان فرمائی ہے۔

نہ صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہمارے آئمہ طاہرین علیہم السلام نے قرآن کے لامتناہی ہونے کی خصوصیت بیان فرمائی ہے۔ بلکہ عرب کے اہل دانش نے بھی اس آسمانی کتاب سے واسطہ پڑتے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ قرآن کی جڑیں بھی عمیق اور گہری ہیں اور اس کی شاخیں بھی ایسی بلندی و بالا اور پُر بار ہیں کہ جن تک طائر فکر کی پرواز ممکن نہیں۔

عرب کا ادیب، حکیم و فلسفی ولید بن مغیرہ مسجد الحرام میں بیٹھا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں سورۂ مومن کی آیات کی تلاوت فرما رہے

---

[1] تفسیر برہان ج1 ص28

تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چند آیات سننے کے بعد وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے لوگوں (بنی مخزوم) سے آ کر کہنے لگا:

"واللہ لقد سمعت من محمّد انفا کلاماً ماھو من کلام الانس ولا من کلام الجن، وان لہ لحلاوۃ ان علیہ لطلاوۃ وان اعلاہ لمثمر، وان اسفلہ لمغدق، وانہ لیعلو و ما یعلی۔[1]

"میں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسا کلام سُنا ہے جو انسانوں اور جنوں کے کلام سے قطعی مشابہت نہیں رکھتا۔ اس کی گفتگو شیریں، اس کا ظاہر خوبصورت، اس کی شاخیں میووں اور پھلوں سے لدی ہوئی ہیں۔ اس کی جڑیں دلوں کی گہرائی میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ وہ تمام کلاموں سے برتری رکھتا ہے۔ اس سے بلند تر گفتگو اور کلام ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

قرآن کے بارے میں ولید کی یہ گفتگو درحقیت نوعِ بشر کی پہلی تعریف و تحسین کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے اپنے فطری فکر و ہوش سے اور صاف ستھرے ذہن سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ:

"اعلاہ لمثمر و ان اسفلہ لمغدق، وانہ لیعلو و ما یعلی۔"

"اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی ہیں۔ اس کی جڑیں دلوں کی گہرائی میں اُتر جاتی ہیں۔ یہ سب کلاموں سے برتر و بالا ہے، کوئی کلام اس سے بلند تر نہیں ہو سکتا ہے۔"

مختلف نقطہ ہائے نظر سے ۔۔۔۔ قرآن کی تفسیر

تیسری صدی ہجری کے آغاز میں اور علومِ اسلامی میں پختگی اور ارتقاء پیدا ہونے پر تفسیر قرآن میں ایک خاص تبدیلی ظاہر ہوئی۔ قرآن کی آیات کی تحقیق و مطالعہ اور بحث و تمحیص کے دائرے میں زیادہ وسعت پیدا ہوئی۔ ایک عرصے تک تفسیر قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث یا صحابہ اور تابعین اور بعض اوقات اہل کتاب (جو بعد میں مسلمانوں کے حلقے میں آ گئے تھے) کی آراء پر مشتمل ہوتی تھی۔ مگر بعد از اں یہ آسمانی کتاب متعدد اور مختلف پہلوؤں سے زیرِ تحقیق و مطالعہ آئی۔ ہر شخص نے اسے اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھا اور ہر ماہر اور صاحبِ فن اپنے فن کے نقطہ نظر سے اس کے حقائق کو آشکار کرنے لگا۔

عربی ادب میں مہارت رکھنے والے ماہرین مثلاً زجاج مؤلف کتاب "اعراب القرآن" اور واحدی مؤلف

---

[1] مجمع البیان ج5 ص587

کتاب ''البسیط'' اور ابوحیان مولف کتاب ''البحر والنھر'' نے اپنے اپنے داخلی رجحانات کے مطابق قرآنی آیات پر ترکیب و اعراب اور کبھی لغت اور ''اشتقاق و استنباط'' کے لحاظ سے تحقیق کی۔ اس سلسلے میں کئی ایک تفسیریں مرتب ہوئیں۔

علم معانی و بیان کے اساتذہ مثلاً زمخشری نے ''کشاف'' میں فصاحت و بلاغت سے متعلق نکات بیان کرنے میں اپنی استعداد صرف کی اور قرآن کی فصاحت و بلاغت کے وہ رموز و اسرار بیان کیے جن کا زمانہ جاہلیت کے عرب اپنی طبع اور مزاج اور صاف و شفاف فطرت سے ادراک رکھتے تھے۔ مگر اس کی علمی اصطلاحات کو نہیں جانتے تھے۔ اس طرح قرآنی اعجاز کا ایک پہلو آشکار ہو گیا۔

متکلمین، فلاسفہ اور عرفاء آیات کے اس پہلو کے بارے میں زیادہ تر بحث و تمحیص و تحقیق کرتے رہے جو ان کے انداز فکر کے مطابق تھا۔ وہ لاشعوری طور پر اس کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے۔ جیسے فخر رازی نے کتاب ''مفاتیح الغیب'' میں اور عبدالرزاق کاشی نے تفسیر ''تاویل الآیات'' میں اور ان سے پہلے ''اخوان الصفاء'' میں اسلام کے اعلیٰ معارف سے متعلق آیات کے سلسلے میں بحث و گفتگو کی ہے۔ مگر بہت سے مقامات پر خود اپنے افکار و نظریات کو قرآن پر لاد دیا ہے اور قرآنی آیات کی غیر مناسب اور ناروا تاویلیں کی ہیں۔

جو حضرات قرآن کے مطالب بیان کرنے میں فقہی اور عملی احکام سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے انہوں نے قرآن کی تفسیر کے دوران ان آیات کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی جو احکام سے متعلق ہیں۔ مگر دوسری آیات کے بارے میں چنداں شرح و بسط سے کام نہیں لیا۔ ان افراد میں سے ''قرطبی'' کا نام لیا جا سکتا ہے جس نے اپنی تفسیر میں اس انداز کو اپنایا ہے۔ ان میں سے بعض افراد نے تو صرف آیاتِ احکام ہی کی تفسیر کی ہے اور فقط اسی موضوع پر کتابیں تمام کر دی ہیں۔ ان لوگوں میں جصاص مؤلف کتاب ''احکام القرآن''، فاضل مقداد مؤلف کتاب ''کنز العرفان''، اردبیلی مؤلف کتاب ''زبدۃ البیان'' اور جزائری مؤلف کتاب ''قلائد الدرر'' کا نام لیا جا سکتا ہے، بعض افراد نے قرآن کے صرف قصص بیان کرنے یا اسباب نزول کی تحقیق کرنے یا قرأتِ قرآن بیان کرنے کے ذریعے اس آسمانی کتاب کی خدمت کی ہے۔ اسلام کے عالی مقام مفسرین میں وہ حضرات بھی ہیں۔ جنہوں نے اس سے آگے قدم بڑھا کر اور بے انتہا زحمتیں اور مشقتیں اُٹھا کر کوشش کی کہ قرآنی آیات کے تمام پہلوؤں پر تحقیق، بحث اور مطالعہ کیا جائے اور آیت کے ہر قسم کے نکات کو مختصراً بیان کر دیا جائے۔ مثال کے طور پر شیخ طُوسی کی ''تبیان''، طبرسی کی ''مجمع البیان''، نیشاپوری کی ''غرائب القرآن'' اور آلوسی کی ''رُوح المعانی'' وغیرہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

تفسیر قرآن کا نیا رخ

ہم اس بحث میں قرآن کی تفسیر کے اس نئے رُخ کی نشان دہی کرتے ہیں جس کی طرف چودھ صدیوں پر محیط تفسیر قرآن کی طویل تاریخ میں بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس رُخ پر بالکل ہی توجہ نہیں دی گئی۔ مگر شاذ و نادر ہی اس کی مثال ملتی ہیں۔ اس نوع کی تفسیر کی حقیقی اساس درج ذیل دو مطالب پر مبنی ہے:

ا۔ قرآن کی تفسیر خود قرآں کے ذریعے: ان شخاص کی آراء اور نظریات کے تحت نہیں، جن کی بات اور گفتگو سند نہیں جیسے عکرمہ، ضحاک، سدی، کلبی

وغیرہ، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ زیادہ تر اسلامی تفاسیر ان ہی افراد کے نظریات سے بھری پڑی ہیں۔

۲۔ تفسیر قرآن موضوعی شکل وصورت میں: آیت آیت اور سورت سورت کی الگ الگ شکل میں نہیں۔ گوکہ تفسیر کی یہ قسم بھی بہت سے لوگوں کیلئے انتہائی مفید ہے لیکن پہلی شکل جیسی جامعیت اور وسعت نہیں رکھتی ہے۔ اب ہم دونوں طریقوں کی تشریح وتفصیل بیان کرتے ہیں:

حقیقی مفسر وہ ہے جو آیات قرآن کی تفسیر میں خود کو ہر قسم کے عقیدے نظریے اور طے شدہ فیصلے سے علیحدہ رکھے۔ وہ قرآن کو اپنے افکار اور آراء کے سامنے نہ پیش کرے بلکہ اپنے افکار کو قرآن کے سامنے پیش کرے۔ قرآن کی علمی چوٹیوں کو سر کرنے اور اس کے پوشیدہ رازوں اور گرانبہا خزانوں کے ساتھ انکشاف کا بہترین طریقہ اول خود قرآن کا مطالعہ اور ایک دوسرے سے مشابہ آیات کا مطالعہ اور تحقیق ہے اور پھر قطعی احادیث کا درجہ آتا ہے۔[1]

قرآن ایک جگہ خود کو ''تبیان'' اور تمام چیزوں کیلئے واضح بیان کے طور پر پیش کرتا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ

''قرآن جو تمام حقائق کو واضح کرنے والا ہے ہم نے تم پر نازل کیا ہے۔۔(نحل/ ۸۹)

اس آیت کے مطابق جب قرآن سارے حقائق کو روشن اور واضح کرنے والا ہے تو فطرتاً اسے اپنے آپ کو بھی واضح اور روشن کرنے والا ہونا چاہیئے۔ ایک آیت میں جو نکتہ مبہم ہے، چاہیئے کہ اسے کسی دوسری کی مدد سے سمجھا جا سکے۔ مثلاً ارشاد الٰہی ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ

''ماہ رمضان میں یہ قرآن لوگوں کی رہنمائی، ہدایت کی نشانیوں اور حق وباطل کے درمیان فرق کرنے کیلئے نازل ہوا ہے۔''(بقرہ/ ۱۸۵)

یہ بھی فرمایا گیا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا

''ہم نے تمہاری طرف واضح نور بھیجا ہے۔''(نساء/ ۱۷۴)

ان آیات کے مطابق قرآن سارے کا سارا ''ہدایت''، ''بینہ''، ''فرقان'' اور ''نور'' ہے۔ وہ کتاب جو اس نوعیت کی اعلیٰ وارفع

---

[1] بلاشبہ آیات کا کچھ حصہ مثلاً وہ آیات جو احکام سے متعلق ہیں۔ بلکہ تمام آیات کے مخصوص پہلوؤں کی صحیح احادیث کے ذریعے تفسیر ہونی چاہیے۔ ہم اس سلسلے میں کسی اور مقام پر تفصیلی گفتگو کریں گے اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑتے

صفات کی حامل ہو اس میں خود کو روشن کرنے اور اپنی وضاحت کرنے کی صفت بھی ہونی چاہیے۔ یہ بات خلاف عقل ہے کہ جو کتاب حق و باطل کے درمیان فرق کرنے، ساری کی ساری نور ہونے، روشنی اور برہان و گواہ ہونے کی مدعی ہو، اس کے مقاصد اور اہداف اس قدر پیچیدہ اور مبہم ہوں کہ انسان اس کے مفاہیم کو سمجھنے کیلئے حیران و سرگردان رہے۔

لہٰذا اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آیات کی تفسیر کے لیے خود قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور ایک آیت کو اسی مفہوم کی دوسری آیت کی مدد سے سمجھنا چاہیے۔ مفسرین نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے:

"ان القرآن یصدق بعضه بعضاً۔"

"قرآن کا ہر حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔"

پیغمبر اکرمؐ نے ہر قسم کے طے شد فیصلوں اور آراء کے مطابق آیات کی تاویل کرنے سے روک تھام کیلئے فرمایا ہے۔: "جو شخص قرآن کی تفسیر اپنے ظن و گمان کے مطابق کرے گا، وہ اپنے لیے جہنم میں جگہ بنائے گا۔"[1]

اہل بیتؑ رسول سے تفسیر قرآن کے سلسلے میں جو خاص طریقہ ہم تک پہنچا ہے وہ یہی قرآن کی قرآن سے تفسیر کرنے کی روش ہے جو روایات اہل بیتِ رسولؐ سے نقل ہوئی ہیں وہ واضح طور پر اس پر گواہ ہیں۔ ان پیشواؤں کی احادیث جو تفسیر قرآں کے سلسلے میں آج موجود ہیں، ان میں کوشش یہی رہی ہے کہ خود آیات سے یا دوسری آیات کی مدد سے اعلٰی مفاہیم اخذ کیے جائیں ان حضرات نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اپنے ذاتی اور علمی نظریات کو قرآن پر حاوی کر دیں اور آیاتِ خداوندی کی تفسیر میں اپنے نظریے کو لاگو کرنے کی روش اختیار کریں۔ امیر المومنین اپنے ایک خطبہ میں قرآن کے بار میں فرماتے ہیں:

"کتاب اللہ تبصرون به وتنطقون به وتسمعون به وینطق بعضهٗ ببعض ویشهد بعضه علی بعض ولا یختلف فی اللہ ولا یخالف بصاحبه عن اللہ"

"اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ذریعے تم دیکھتے ہو، اسی کے ذریعے بولتے اور سنتے ہو۔ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کے ذریعہ بولتا ہے ایک حصہ دوسرے کا گواہ ہے۔ یہ کتاب اللہ کے بارے میں اختلاف نہیں رکھتی اور جو اس کے ساتھی ہو اسے اللہ کے خلاف نہیں کرتی۔

قرآن سے قرآن کی تفسیر کا ایک نمونہ

آپ کی توجہ نمونے کے طور پر ان دو آیات کی طرف مبذول کی جاتی ہے جن میں سے ایک دوسری آیت کی مفسر اور اس میں مبہم نکتے

---

[1] تفسیر یا الرائے کی حرمت سے متعلق احادیث بطور تواتر نقل ہوئی ہے تفسیر مجمع البیان جلد نمبر 1 ص 13۔ اور تفسیر البرہان جلد 1 ص 17 ملاحظہ فرمائیے

کی وضاحت کرنے والی ہے۔قرآن مجید سورہ شعراء کی آیت ۱۷۳ میں قومِ لوط کے بارے میں فرماتا ہے:

"وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا‌ ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ"

''ہم نے ان کیلئے بارش بھیجی اور ڈرائے گئے افراد کی حالت بہت بُری ہوگی۔''

باوجودیکہ اس آیت کا مفہوم واضح ہے مگر مصداق کے لحاظ سے مجمل ہے۔کیونکہ معلوم نہیں کہ بری بارش سے کیا مراد ہے لیکن دوسری آیت جو اس سلسلے میں کسی مناسبت سے سورہ حجر کی آیت ۷۴ میں آئی ہے اس حقیقت کو روشن اور واضح کرتی ہے جیسا کہ فرمایا:

"وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ"

''ان پر ہم نے پتھروں کی بارش برسائی۔''

جب یہ روش اور طریقہ قرآن کی ساری آیات میں باریک بینی، ضبط وتحمل اور ثابت قدمی کے ساتھ اختیار کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ حقائق کی دنیا ہمارے سامنے روشن نہ ہوجائے اور بہت سے ابہام دور نہ ہوجائیں۔

مغربی تہذیب اور قرآن کے غلط مطالب

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں یونانی علوم مثلاً طبیعیات، ریاضی اور فلسفے کے جو ترجمہ ہوئے اس نے مفاہیم دینی اور فہم آیات قرآنی میں بہت گہرا اور عمیق تغیر پیدا کردیا۔اس کے نتیجے میں ایک پہلے سے طے شدہ طبیعی ،فلسفی اور فکری ونظری مسائل کا سلسلہ قرآن پر لاد دیا گیا ہے۔قرآن مجید کی کچھ آیات کی فلسفہ ''مشاء'' اور ''اشراق'' اور ہیئتِ بطلیموس کے تناظر میں تفسیریں کی گئی ہیں۔حتیٰ کہ بعض مفسرین ومحدثین نے ان اسلامی آیات واحادیث کو جو اسرار وآفرینش وخلقت سے متعلق تھیں ان کی ہیئت بطلیموس کے سانچے میں ڈھال دیا۔جو آیات واحادیث اس بطلیموسی نظریے سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں ان کی خوب خوب من مانی تاویلیں کی گئیں۔

ایسے ہی حالات بلکہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ حالات اس وقت ظہور پذیر ہوئے، جب مغربی ممالک میں مختلف موضوعات مثلاً فضائی، فلکی، طبیعیاتی اور ریاضی میں عجیب وغریب تبدیلیاں وجود میں آئیں اور ان کے ذریعے عالم آفرینش کے رموز اور جہانِ خلقت کے راز یکے بعد دیگرے آشکارا ہوئے۔چنانچہ دنیا میں انسان کیلئے وسائل فطرت کی تسخیر آسان ہوگئی اور زمین وسمندر اور فضا اس کے شہپر قدرت کے تحت آ گئے۔

مختلف معاشروں اور اقوام کے ایک دوسرے کے قریب آنے اور وابستہ ہونے کی وجہ سے ان علمی اور فکری تبدیلیوں کا سلسلہ کچھ مشرق کی سمت بھی پھیلتا رہا۔مگر دینی مسائل اور اصولِ مذہب بھی اس نئی مغربی فکر، کی زد میں آ گئے وجہ یہ تھی کہ مغرب نے اپنے سارے فیصلے قوت حسی اور تجربے پر استوار کیے تھے اور ماوراءِ طبیعی مسائل سے منہ موڑ لیا تھا اور بعض اوقات اس کے برخلاف فیصلے دے رکھے تھے۔چنانچہ جو بھی چیز مغرب کے تجربات سے باہر تھی اس نے اسے افسانہ اور گھڑی ہوئی قرار دے دیا۔

جب یہ طرز فکر مشرق میں پہنچی ،جس کا لازمی نتیجہ ماوراءِ طبیعی مسائل اور معارف الٰہی کے بارے میں غلطی فہمیاں پھیلانا تھا تو کچھ لوگوں کو اس نے الحاد وانکار کی طرف مائل کیا اور بعضوں کو بہت سی آیات قرآن کی تاویل کرنے پر لگا دیا۔ یہاں تک کہ انبیا کے معجزات اور روح ،فرشتہ ،اور عالم برزخ کے موضوعات جو قرآن مجید کے نزدیک درست تھے اب مادہ پرستی کے اصولوں پر پرکھے جانے لگے اور ان کی اس نہج پر تفسیر ہونے لگی۔ علم طبیعیات میں پیش رفت نے کچھ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ان مسائل میں حدود سے تجاوز کرتے ہوئے بہت سی آیات قرآنی کی طبیعیات ،ریاضی اور قوانین مادی کے مطابق توجیہ کریں ۔گویا قرآن محض ایک طبیعیات اور کیمیا کی کتاب ہے۔ اس کا دوسرا نہ کوئی ہدف ہے نہ مقصد۔

موجودہ صدی میں چند ایک تفاسیر جو مفسرین اسلام کے ہاتھوں لکھ گئیں وہ قرآنی مسائل کے تجزیے اور توضیح کے دوران مغرب زدگی سے دوچار ہوئیں وجہ یہ ہے کہ ان میں مفاہیم قرآنی اور قوانین اجتماعی و اخلاقی کی توضیح اور تشریح مغربی افکار کی یلغار کے زیر اثر ہوئی ہے۔ان میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مغرب کے مکاتب فکر اور وحی الٰہی کے مکتب میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور ان دونوں میں یگانگت اور قربت ثابت کی جائے۔

یہ لوگ درحقیقت قرآن کے حقیقی ہونے کے عقیدے اور مغربی تہذیب سے وابستگی کی کشمکش میں پھنس گئے ہیں۔اس لیے کہ مغربی افکار مادہ کے علاوہ اور بالا چیز کے انکاری ہیں۔ یہ حضرات ان دونوں کو ایک اور یکساں ثابت کرنے کی کوشش میں تاویل اور تصرف کرتے رہے ہیں اور اصل میں قرآن کی حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے انسانی افکار کو زیادہ اہمیت دے دی ہے۔

چنانچہ روح فرشہ۔حیات برزخ ،معجزہ وغیرہ کی تفسیر میں پریشانی میں مبتلا ہوئے ہیں ان سب کو مادیت کے اصول اور سولب کے تحت پیش کیا گیا ہے ہندوستان اور مصر پر مغربی غلبے کے دوران میں ان دونوں ملکوں میں جو چند ایسی تفاسیر لکھی گئیں۔اگر آپ ان کا مطالعہ کریں تو اس المیے کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے

قرآن کا تدریجی نزول

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ قرآن مجید کی آیات 22 سال کی مدت میں پیغمبر اکرمؐ کے قلب پر نازل ہوئی ہیں ہم اس وقت ان کے تدریج نازل ہونے کے سبب پر بحث نہیں کررہے۔اس کے علل واسباب کی طرف خود قرآن نے اشارکیا ہے۔ جو بات اہم ہے وہ یہ ہے قرآن کوئی روایتی کتاب نہیں ہے جو چند ابواب پر مشتمل ہو۔ایسا نہیں کہ اس میں ہر موضوع پر ایک معین نقطے پر بحث کی گئی ہو۔قرآن دراصل ایک کتاب آسمانی اور کتاب ہدایت ہے، جو لوگوں کی مبداء اور معاد کی طرف رہنمائی کیلئے اور روح اور جسم کے ارتقاء کیلئے بھیجی گئی ہ۔ ایسی کتاب جو مبداء اور معاد کی طرف عالمین کی رہنمائی کرتی ہو، اور مادی اور روحانی اتقاً کیلئے نازل ہوئی ہو، اس سے کسی مصنوع نظم کی توقع بے جا ہے ۔چنانچہ قرآن اپنے نظم و نسق میں ایک خصوصیت رکھتا ہے۔جس کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں۔

ا۔قرآں اکثر اوقات ایک موضوع سے کسی مناسبت کی وجہ سے دوسرے موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات پند و نصیحت کی غرض

سے وجدان وفطرت کی بیداری اور عقل وخرد کی رہنمائی کیلئے کسی ایک سورت میں مختلف مطالب کی ضرورت ہوتی ہے۔لہٰذا ان سے مطالب کو ایک ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔شروع میں انسان خیال کرتا ہے کہ ایک سورت کے مطالب میں مکمل ہم آہنگی نہیں۔لیکن غور وفکر سے واضح ہوجاتا ہے کہ ان آیات میں ایک خاص ربط اور خاص ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہی ربط وہم آہنگی اس کا سبب بنی ہے کہ یہ آیات ایک سورت میں یکجا کر دی گئی ہیں۔

۲۔افکار کی ہدایت ،فطرت کی رہبری ،خوابیدہ افکار ووجدان کی بیداری اور کسی موضوع کی اہمیت اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ ایک موضوع پر مختلف مواقع پر بار بار گفتگو کی جائے ۔مکرر یاددہانیوں کے بغیر مقاصد ہاتھ نہیں آتے ۔ چنانچہ کئی ایک عوامل اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ قرآن بہت سے اجتماعی اوراخلاقی نکات کو متعدد موقعوں پر پیش کرے ۔ایسی تکرار نہ صرف یہ کہ عیب نہیں بلکہ بلاغت کی نشانی ہے اور تقاضوں کے مطابق گفتگو کرنے کی اساس ہے۔مثلاً قرآن دینا کی طاقت ور اقوام اوران کی زندگی سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت کئی مواقع پر دیتا ہے اور کئی بار کہتا ہے:

"سیروا فی الارض" ''زمین میں چل پھر کر دیکھو''

اس بار بار کی یاددہانی کی وجہ وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔

۳۔بعض اوقات قرآن نے کسی بڑے مسئلے کا فقط ایک حصہ پیش کیا ہے اور باقی حصہ دوسرے موقعے پر مجموعی طور پر بیان کیا ہے۔قرآن نے اقوامِ عالم کی سرگزشت بیان کرنے میں یہی طریقہ اپنایا ہے۔یہ طریقہ اس لیے ضروری ہے کہ قرآن ہدایت ویاددہانی کی کتاب ہے۔

۴۔قرآن اپنے عقلی اور بلند مفاہیم پیش کرنے میں معاشرے کی استعداد، اہلیت اور ارتقاءِ فکری کو بھی نظر میں رکھا ہے۔قرآن ایک موضوع سے متعلق عقلی دلائل اور فلسفیانہ استدلال ایک ہی جگہ بیان نہیں کر دیتا بلکہ کسی مناسبت سے کسی گفتگو کے دوران ایک نکتہ یا ایک دلیل پیش کرتا ہے باقی ماندہ نکات اور دلائل دوسری سورتوں میں بتدریج ذکر کرتا ہے۔

مثلاً معاد اور حیات نو کی طرف انسانوں کی بازگشت قرآن کے معارف عقلی میں سے ہے جس نے اس کا امکان ثابت کرنے کیلئے مختلف دلائل وبراہین سے استفادہ کیا ہے۔[1] اور ہر مقام پر ان میں سے کسی ایک کا ذکر کیا ہے۔یہ خصوصیت ہم کو اجازت دیتی ہے کہ ہم کہیں کہ قرآن ایک قدرتی گلستان ہے،جس میں اکثر اوقات ایک ہی قسم کی بیسیوں پھول گلستان کے مختلف حصوں میں کھلتے ہیں اور کہیں خاص قسم کے پھولوں کے درمیان دوسری قسم کے پھُول اُگتے ہیں اس کا نظام ہمارے باغبانوں کے ہاتھوں بننے والے باغوں کا سا نہیں یہ اپنے لیے خود ایک مخصوص فطری نظام رکھتا ہے۔

---

[1] ہم نے معاد وقیامت کے امکان کے بارے میں قرآن کے ساتے دلائل کتاب ''معاد انسان د جہان'' میں جمع کر دیئے ہیں۔اس کتاب کی طرف رجوع کریں

تفسیر موضوعی کا طریقہ

مندرجہ بالا خصوصیات کا حامل ہونے اور تبدریج نازل ہونے کی بناء پر یہ ضروری ہے کہ قرآن کی تفسیر قدیم روش یعنی سورۃ بہ سورہ کے علاوہ موضوع کے لحاظ سے بھی کی جائے اور تفسیر موضوعی بھی پیش کی جائے یعنی ایک موضوع کی آیات جو قرآن میں آئی ہیں ان پر ایک ہی جگہ تحقیق کی جائے اور یکجا ان کا مطالعہ کیا جائے مثلاً جو مفسر چاہتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کے بارے میں قرآن کا نظریہ معلوم کرے یا قرآن میں معاد کے بارے میں تفصیلی اور وسیع بحث کرے یا قرآن میں بنی اسرائیل کی سرگزشت کا مطالعہ کرے اور اس پر تحقیق کرے یا انسان کے افعال میں جبر و اختیار کے بارے میں فیصلہ کرے یا افعالِ خدا سے متعلق معارف مثلاً ارادہ، ہدایت اور قضاء و قدر پر قرآن کی نگاہ سے بحث کرے تو اسے چاہئے کہ ایک موضوع سے متعلق ساری آیات کو پوری توجہ اور باریک بینی کے ساتھ ایک جگہ جمع کرے اور پھر ان سے نتیجہ اخذ کرے۔ ایک موضوع کی آیات کا مکمل احاطہ کیے بغیر صحیح فیصلے تک نہیں پہنچا جا سکتا ہے چہ جائیکہ نامکمل مطالعہ کے بعد صحیح فیصلہ کیا جائے۔

مُسلمانوں میں مختلف نظریات کے مکاتب فکر پیدا ہونے اور ہر گروہ کے اپنے عقیدے پر قرآن سے استدلال کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر گروہ اپنی توجہ آیات کے ایک سلسلے کی طرف مبذول رکھتا ہے اور دوسرے سلسلے سے غفلت برتتا ہے۔ اس طریقے سے آیات کا حقیقی مفہوم دگرگوں ہوسکتا ہے۔ افعال بشر میں جبر کے نظریے کے قائل یا تفویض کے نظریے کے تابع افراد یہی طریقہ اپنائے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدائی مقاصد کی تفسیر کرنے میں ایسی غلطیوں اور غلط فہمیوں کے مرتکب ہوئے ہیں جن کا ازالہ ممکن نہیں۔

شاید کہا جا سکے کہ تفسیر کے اس طرز (یعنی تفسیر موضوعی) کی طرف مرحوم علامہ مجلسی وہ اول شخص ہیں جو اجمالاً توجہ رکھتے تھے، انہوں نے کتاب ''بحار الانوار'' میں ہر باب اور موضوع کے آغاز میں اس موضوع سے متعلق آیات کو جمع کرکے ان کی اجمالی تفسیر کی ہے یہی مختصر سا اقدام فن تفسیر کی پیش رفت کے سلسلے میں عظیم اقدام بنا ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مرحوم مجلسی کے بعد اس موضوع پر مزید کام نہیں ہوا۔

بے شک ایسی تفسیر موضوعی لکھنے کیلئے جو جامع بھی ہو اور قرآن میں نازل شدہ اکثر مفاہیم کو مذکورہ بالا طریقے پر انجام دے، خاص قسم کی متعدد جماعتوں اور کمیٹیوں کی ضرورت ہے جن میں سے ہر گروپ اس سلسلے میں خاص ذمہ داری سنبھالے۔ اس علمی ہدف تک پہنچنے کی کیفیت ہم کتاب ''مفاہیم القرآن'' [1] کے مقدمے میں تحریر کر چکے ہیں یہاں مختصراً اس کا ذکر کرتے ہیں سب سے پہلے ایک ایسا گروپ جو قرآن سے خاص آشنائی رکھتا ہو، وہ ان موضوعات کے مطابق آیات قرآن کو جمع کرے اور پھر ان کی تقسیم بندی کرے اور اس مجموعے کو اسلام کے ایسے محققین کے ہاتھوں میں دے، قرآن جن کی روح کی گہرائیوں میں اُترا ہو۔ ان میں سے ہر فرد ان موضوعات کے ایک حصے کی خاص طرز پر تفسیر کرے اور اس کے بارے میں قرآن کا نظریہ واضح طور پر اخذ کرے۔

مگر ایسا گروپ ملنے اور یہ عظیم کام شروع ہونے سے پہلے مولف جو عالم جوانی سے قرآن کے ساتھ ایک خاص انس رکھتا ہے

---

[1] پہلی عربی تفسیر موضوعی جو 1393ھ میں شائع ہو چکی ہے

، چند ایک قرآنی موضوعات تفسیر موضوعی کی شکل میں لکھ کر دلچسپی رکھنے والوں کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ اس کتاب میں قرآن کے عقلی، اجتماعی اور اخلاقی مباحث میں سے تقریباً بیس موضوعات کو جو نسل جواں اور تشنہ عوام کی توجہ کا مرکز ہیں بیان کیے گئے ہیں اور واضح اور موضوعی شکل میں ان پر تحقیق کی گئی ہے۔ مولف اس کا دعوےٰ قطعی نہیں کرتا کہ ان موضوعات کا حق اچھی طرح ادا ہو گیا ہے مگر یہ ضرور ہے کہ راقم نے قرآن کے اعلیٰ مقاصد تک پہنچنے کیلئے زیادہ سے زیادہ سعی اور کوشش کی ہے:

''لا یکلف اللہ نفسًا اِلاّ وسعھا'' ''خدا وسعت سے زیادہ کسی نفس کو ذمہ داری نہیں دیتا۔''

اگر اس حقیر اور ناچیز سی خدمت کا کوئی ثواب اور جزاء ہو تو راقم اپنے پدر بزرگوار مرحوم ایت اللہ حاج شیخ محمد حسین سبحانی[1] کی پاک روح کیلئے ہدیہ کرتا ہے۔ وہ پہلے شخص تھے، جنہوں نے مولف کو خدا کی کتاب سے آشنائی کیا۔ ساتھ ساتھ خداوند متعال سے ایران کے نو آباد اسلامی معاشرے کیلئے قرآن سے زیادہ سے زیادہ آشنا اور اس کے احکام پر عمل کرنے کی توفیق کا سوال کرتا ہے۔ یہ وہ معاشرہ ہے جو اپنے عظیم انقلاب کے سبب اقوام عالم میں ایک بڑا نام پیدا کر چکا ہے۔

جعفر سبحانی

20 صفر المظفر 1401ھ

مطابق 7 دی ماہ 1359

[1] وہ عالم ربانی جنہیں دیکھ کر جنہیں مل کر، جن کی باتیں سن کر اور جن کا کردار دیکھ کر ہر شخص اللہ اور اولیاء الٰہی کو یاد کرنے لگتا تھا۔ ان کی روح مقدس 11 شوال 1393ھ کو اشیان جادواں کی طرف پرواز کر گئی۔ ان کا جسد خاکی حضرت معصومہ علیہا السلام کے جوار میں مقبرۃ العلماء میں سپرد خاک ہوا۔ عاش سعیدًا و مات سعیدًا (سعادت کی زندگی اور سعادت کی موت حاصل کی)

قرآن کا دائمی منشور

قرآن مجید کی دو طریقوں سے تفسیر کی جا سکتی ہے۔ دونوں ہی طریقے اپنے اپنے انداز سے پڑھنے والے کی مقاصد قرآن کی طرف رہبری کرتے ہیں۔

ا۔ اول قرآن کی تفسیر سُورت بہ سورت یعنی ایک سورہ کا تعین کر کے اس کی آیات کی یکے بعد دیگرے تفسیر کی جائے کبھی کبھی آیت کے مطالب کو روشن کرنے کیلئے دوسری آیات سے بھی مدد لی جائے۔ یہی تفسیر کا مروجہ طریقہ ہے اور زیادہ تر مفسرین نے یہی روش اپنائی ہے۔

۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات کی قرآنی موضوعات کے مطابق تفسیر کی جائے۔ ایک موضوع سے متعلق آیات اکثر قرآن کی مختلف سورتوں میں مختلف مناسبتوں سے نازل ہوئی ہیں۔

کسی ایک موضوع کے بارے میں قرآن کی گہرائیوں اور وسعتوں تک رسائی کیلئے ضروری ہے کہ اس موضوع سے متعلق ساری آیات مختلف سورتوں سے جمع کی جائیں اور سب پر یکجا بحث اور تحقیق کی جائے۔ مثال کے طور پر قرآن نے ''عبارت میں شرک'' کے بارے میں مختلف سورتوں میں بدیع اور بے انتہا دلچسپ انداز میں بحث کی ہے۔ اب قرآن کے عمیق اور وسیع نُقطہ نگاہ سے شرک کے بارے میں آگاہی کیلئے اس سے متعلق ساری خصوصیات اور مباحث سے آشنائی کیلئے ضروری ہے کہ شرک سے متعلق تمام آیات کو جمع کر کے ان پر بحث و تحقیق کی جائے۔

دوسرے موضوعات بھی ہیں۔ مثلاً ''صفات خدا'' جیسے علم، قدرت اور حیات۔ اور اسی طرح صبر و توکل وغیر جیسے موضوعات۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اپنی تفسیر کیلئے قرآن دو اہم اور سودمند طریقے پیش کرتا ہے۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بہت اہم اور قیمتی ہیں۔ اس قسم کی تفسیر کی واضح مثال سامنے رکھنے کیلئے ہم اس کتاب میں مختلف قرآنی موضوعات کو پیش کرتے ہیں ہم سب کی ایک الگ موضوع کے طور پر تفسیر کریں گے۔ سب سے پہلے سورہٗ انعام کی آیات 151 اور 152 میں جو دس موضوعات موجود ہیں ہم ان پر بحث کریں گے اور ان کو ''قرآن کا دائمی منشور'' کے عنوان سے پیش کریں گے۔ ان پر بحث و تمحیص سے فارغ ہو کر ہم دوسرے اہم اجتماعی اور اخلاقی موضوعات پیش کریں گے۔ اس طور ہم نوجوان نسل کیلئے جو اپنی آسمانی کتاب سمجھنے کے آرزومند اور دلدادہ ہے، قرآن کے نئے رُخ کی نشاندہی کریں گے ان دونوں آیات میں جو احکام آئے ہیں وہ مندرج ذیل ہیں:

ا۔ شرک باللہ کی ہر نوع کو رد کریں اور اس کی مذمت کریں۔

۲۔ ماں باپ سے نیکی کریں۔

۳۔ اپنی اولاد کو بُھوک اور افلاس کے ڈر سے قتل نہ کریں۔

۴۔ ناجائز اور خلافِ شرع جنسی کام سے پرہیز کریں۔

۵۔جن انسانوں کا خون محترم ہے انہیں قتل نہ کریں۔

۶۔یتیم کے مال کے قریب نہ جائیں، بجز اس طریقے کے جو نیک اور اچھا ہو۔

۷۔ناپ تول میں انصاف اور عدالت برتیں۔

۸۔اللہ تعالیٰ ہر شخص پر اس کی استطاعت کے مطابق ذمہ داری ڈالتا ہے۔

۹ گفتگو میں انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، خواہ وہ اپنے ہی رشتہ داروں کے بارے میں ہو۔

۱۰ جو عہد و پیمان ہم نے خدا سے باندھا ہے اس پر قائم رہیں۔

یہ دائمی منشور جو آپ نے ملاحظہ کیا ہر اس معاشرے کی اصلاح کی بنیاد جو چاہتا ہے کہ ترقی کرے اور ارتقا کی منزلیں طے کرئے۔قرآن نے ان موضوعات کے بارے میں اور جگہ بھی خصوصاً سورۂ بنی اسرائیل میں گفتگو کی ہے۔انشاء اللہ ان آیات میں سے چند کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

دو اہم نکات

الف:تورات میں بھی دس احکام ایسے موجود ہیں ،جن پر یہودی معاشرہ فخر کرتا ہے ۔ان کا فلم کی صورت میں''(T E N COMMANDMENTS'')کے نام سے بھی پیش کیا جا چکا ہے اس کے ذریعے سے انہوں نے اپنی مذہبی حیثیت پیدا کی ہے۔دراصل کہا جا سکتا ہے کہ یہی ان کی تعلیمات کی اساس ہیں۔یہ دس تعلیمات حسب ذیل ہیں:

۱۔غیر خدا کو سجدہ نہ کر۔

۲۔خدا کا نام بلا وجہ زبان پر جاری نہ کر۔

۳۔ہفتہ کے دن (سبت)تعطیل کر۔

۴۔ماں باپ کا احترام کر۔

۵۔کسی کو قتل نہ کر

۶۔زنا نہ کر۔

۷ چوری نہ کر

۸۔اپنے ہمسائے کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دے۔

۹۔اپنے ہمسائے کے گھر میں طمع نہ کر اور

۱۰۔ہمسائے کی بیوی، غلام، کنیز، گائے اور گدے کے للچائی ہوئی نظر سے نہ دیکھ [1]

---

[1] تورات، سفر خروج، باب 20 ص 140۔طبع فاضل خانی 1851 لندن۔ان تعلیمات کا کچھ حصہ انجیل متی۔باب 22 میں بھی آیا ہے۔

ان احکام میں سے بعض اسی ''دائمی منشور'' میں ابھی پیش کیے گئے ہیں۔ان میں سے بعض تعلیمات قرآن میں وسیع پیمانے پر بیان ہوئی ہیں۔مثلاً ہمسائے سے متعلق احکام اسلام اور قرآنی تعلیمات میں صرف ہمسائے مخصوص نہیں جیسے جھوٹی گواہی مطلقاً حرام ہے، خواہ جس کے خلاف دی جارہی ہو وہ ہمسایہ ہو یا نہ ہو۔اسی طرح تورات کا نواں اور دسواں حکم اسلام میں فقط ہمسائے تک محدود نہیں۔ممکن ہے سورۂ انعام کی مندرجہ بالا دس تعلیمات،تورات کے ان دس امور پر مشتمل منشور کے مقابلے میں پیغمبر اسلامؐ کو دیئے گئے ہوں۔(تورات کے یہ دس نکات قرآن کے نازل ہونے کے زمانے میں یہودیوں میں بہت شہرت رکھتے تھے)

(ب)دوسرا نکتہ جو اہمیت کا حامل ہے وہ انقلاب ہے جو ان دو آیات (سورۂ انعام 151،152)نے قبیلہ خزرج کے ایک سردار کے دل میں پیدا کر دیا تھا۔یہی وہ انقلاب تھا جو پیغمبر اکرمؐ کی مدینے ہجرت کی بنیاد بنا۔عرصے سے مدینے میں اوس وخزرج قبائل کے درمیان ایک تباہ کُن جنگ جاری تھی۔ایک مرتبہ خزرج قبیلے کا سردار اسعد بن زرارہ اپنے حریف اوس قبیلے کے مقابلے اپنے قبیلے کو مضبوط اور طاقت ور کرنے کیلئے مکہ آیا اس قصد سے کہ قریش سے فوجی اور مالی امداد حاصل کرے اور اپنے سوسالہ دشمن کی سرکوبی کر سکے۔وہ اپنے دیرینہ شناسا عتبہ بن ربیعہ کے گھر پہنچا اور اس سے مدد چاہی۔اس کے پرانے دوست عتبہ نے یوں جواب دیا کہ ہم اس وقت تمہاری درخواست کا ''ہاں'' میں جواب نہیں دے سکتے۔وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ اس وقت کچھ عجیب اختلافات میں گھر گئے ہیں۔ہم میں ایک ایسا شخص اُٹھ کھڑا ہوا ہے جو ہمارے خداؤں کو بُرا بھلا کہتا ہے اور ہمارے اکابرین کو بیوقوف اور کم عقل سمجھتا ہے۔اس نے اپنی شیریں بیانی سے ہمارے جوانوں میں سے کچھ کو اپنا ہم نوا بنا لیا ہے۔اس نے ہمارے درمیان ایک گہری خلیج حائل کر دی ہے۔وہ شخص حج کے زمانے کے علاوہ باقی دنوں میں شعب[1] میں رہتا ہے اور حج کے دوران شعب سے نکل کر حجر اسماعیل میں آبیٹھتا ہے اور لوگوں کو اپنے دین کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اسعد نے مکہ کے دوسرے سرداروں سے ملاقات کرنے کی بجائے مدینہ واپس لوٹ جانے کا ارادہ کیا۔جانے سے پہلے عرب کی قدیم رسم کے مطابق اس نے خانہ خدا کی زیارت کا قصد کیا۔مگر عتبہ نے اسے ڈرایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ طواف کے موقع پر وہ نوظہور پیغمبر کی گفتگو سن لے اور ان کی سحر امیز گفتگو اس پر اثر انداز ہو جائے۔اس کا حل عتبہ نے یہ پیش کیا کہ اسعد اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لے۔تا کہ پیغمبر اکرمؐ کا کلام نہ سن سکے۔ اسعد مسجد الحرام میں آیا اور طواف شروع کر دیا۔ پہلے ہی چکر میں اس کی نگاہ پیغمبر اسلامؐ پر پڑی۔وہ حجر اسماعیل میں بیٹھے تھے۔،اور بنی ہاشم کے کچھ لوگ آپؐ کی حفاظت کر رہے تھے مگر ان کی گفتگو کے ڈر سے وہ آپؐ کی طرف نہیں گیا طواف کے دوران میں اس نے خیال کیا کہ میں تو احمقوں کی سی بات کر رہا ہوں۔کل کو مدینے میں لوگ مجھ سے مکہ کے احوال دریافت کریں گے تو میں کیا جواب دوں گا۔بہتر یہی ہے کہ جانے سے پہلے میں ابھی اس واقعے کے بارے میں کچھ معلوم کر لوں۔چنانچہ آگے آیا اور زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق ''انعم صباحاً''(صبح بخیر) کہا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: میرے خدا نے اس سے بہتر تحیہ وسلام بھیجا ہے اور وہ یہ ہے کہ ملاقات کے وقت کہا جائے ''سلام علیکم''۔

---

[1] اس سے شعب ابی طالبؑ مراد ہے

پھر اسعد نے درخواست کی کہ آنحضر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دعوت کے بارے میں اپنے ہدف اور مقصد کی وضاحت فرمائیں۔آنحضرتؐ نے سورۂ انعام کی آیات 152 اور 153 کی تلاوت فرمائی۔ یہ دونوں آیات زمانہ جاہلیت کے سارے ہی جذبات، عادات اور رسم ورواج کی وضاحت کرتی تھیں اور اس میں اس کی اس قوم کے درد کا درمان موجود تھا جو پچھلے ایک سو بیس سال سے برادر کشی میں مشغول تھی۔ چنانچہ اسعد کے دل پر ان کا گہرا اثر ہوا۔ وہ فوراً اسلام لے آیا اور آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ اپنے کسی پیرو کو مبلغ کے طور پر مدینے بھیجیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے مصعب بن عمیر کو اسلام کے پہلے مبلغ اور قاری قرآن کی حیثیت سے مدینہ روانہ فرمایا۔ مدینے میں خدائی آیات کا اثر اس طور ہوا کہ کچھ لوگ اسلام لے آئے اور انہوں نے اگلے حج کے موقع پر اپنے نمائندے مکے بھیجے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے عقبہ میں پیغمبر اکرمؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور یہ بیعت عقبہ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوئی ہے۔[1] اب ہم دونوں آیات کا متن محترم قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں:

۱۔ قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمۡ عَلَيۡكُمۡ اَلَّا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔا

''میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ شرک و بُت پرستی کو ختم کر دوں۔''

۲۔ وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ۚ

''میرے پروگرام کا سرنامہ ماں باپ سے احسان اور نیکی قرار پایا ہے۔''

۳۔ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ مِّنۡ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَاِيَّاهُمۡ ۚ

''میرے دین پاک میں فقر و فاقہ کے خوف سے اولاد کشی قبیح ترین عمل شمار ہوتا ہے۔''

۴۔ وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ ۚ

''میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ نوعِ بشر کو بُرے کاموں سے دور رکھوں اور ہر ظاہری اور باطنی گندگی سے روکوں۔''

۵۔ وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِىۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالۡحَـقِّ ؕ ذٰلِكُمۡ وَصّٰٮكُمۡ بِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۵۱﴾ [2]

''میری شریعت میں ناحق آدم کشی اور خونریزی بہت شدت سے ممنوع ہے۔''

---

[1] اعلام الوریٰ ص 25-40۔ بحار الانوار 19 ص 8-11

[2] انعام 151

۶۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ

''مال یتیم میں خیانت حرام ہے۔''

۷۔ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ

''میرے دین کی بنیاد عدالت ہے۔لہٰذا میرے قانون میں کم فروشی حرام ہے۔''

۸۔ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ

''خدا کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

۹۔ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ

''انسان کی زبان اور گفتگو جو اس کے تمام جذبات ونفسیات کا آئینہ ہے، اس کو حق وحقیقت کی راہ میں استعمال ہونا چاہیے۔سچائی کے علاوہ کوئی چیز زبان پر جاری نہیں ہونی چاہیئے۔اگر چہ کہنے والے اور اس کے رشتہ داروں کا نقصان ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔''

۱۰۔ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۱۵۲ [1]

''جو عہد و پیمان خدا سے باندھے ہیں ان کا احترام کرو۔ یہ تمہارے خدا کی وصیت اور سفارش ہے جس کی تم کو پیروی کرنی چاہیئے۔''

پھر اگلی آیت میں اس طرح فرماتا ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۵۳

''یہ ہے میرا راستہ جو سیدھا اور راست ہے۔اسی پر چلو اور ان راہوں پر نہ جاؤ کہ جو تم کو راہ خدا سے بھٹکا دیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی خدا نے تمہیں وصیت اور سفارش کی ہے۔تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔''

---

[1] سورہ انعام۔آیت 152

قرآن کا دائمی منشور

پہلا اصول

توحید پرستی

ہر غیر خدا کی غلامی سے نجات

توحید پرستی

ہر غیر خدا کی غلامی سے نجات

ہر زمانے میں انبیاء الٰہی کی دعوت کی بنیاد یہ رہی کہ سارے انسان ایک واحد خدا کی عبادت کریں اور دوسری موجودات کی پرستش سے اجتناب کریں۔ یکتا پرستی اختیار کرنا اور دوگانہ پرستی کی زنجیروں کو توڑنا آسمانی احکام وقوانین کی پہلی بنیاد ہے یہی سارے انبیا کے پروگراموں کا سرنامہ قرار پائی ہے۔یعنی تمام انبیاء ایک ہی ہدف ومقصد کیلئے چنے گئے اور وہ ہدف ومقصد یکتا پرستی کو مستحکم کرنا اور شرک پرستی سے جنگ کرنا تھا۔قرآن مجید اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کرتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ

''ہم نے ہر اُمت میں ایک پیغمبر بھیجا کہ خدا کی عبادت کرو اور خدا کے علاوہ ہر معبود کی پرستش سے اجتناب کرو۔''

اور پھر کہا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿٢٥﴾

''تم سے پہلے کسی پیغمبر کو ہم نے نہیں بھیجا مگر یہ کہ اسے ہم نے وحی کی کہ میرے علاوہ کوئی معبود نہیں۔پس میری عبادت کرو۔(انبیاء)

قرآن مجید یکتا پرستی کو ساری آسمانی شریعتوں کے درمیان مشترک بنیاد کے طور پر متعارف کرواتے ہوئے فرماتا ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا

''کہہ دیں: اے اہل کتاب !اس کلمہ کی طرف جسے ہم نے اور تم نے قبول کرلیا ہے،جلدی سے آؤ اور وہ یہ ہے کہ خدا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور اس کیلئے کسی شریک ومثیل کی عبادت

کے قائل نہ ہوں'' (آل عمران۔ ۶۴)

بُت پرستی کی بنیاد

بت پرستی کی حقیقت کے بارے میں اظہار خیال اور یہ کہ اس نظریے نے کس طرح انسانوں میں نشوونما پائی ایک مشکل کام ہے۔ بت پرستی کسی خاص قوم یا کسی خطے میں کسی ایک دو خاص شکل میں نہیں رہی کہ اس کی بنیاد اور اصلیت کے بارے میں انسان یقین کے ساتھ اظہار خیال کر سکے دنیا میں بت پرستوں کے افکار و عقائد، جیسے برہمنوں، بدھ مت والوں اور ہندوؤں کے اتنے مختلف اور گوناں گوں ہیں کہ ان میں بہت مشکل سے کوئی قدر مشترک تلاش کی جا سکتی ہے۔[۱]

بائدہ کی عرب اقوام مثلاً عاد و ثمود جو حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کی امت تھیں اور اہل مدین جو حضرت شعیبؑ کی امت شمار ہوتے تھے، سب ہی بت پرست تھے۔ حضرت سلیمانؑ کے ہم عصر سرزمین سبا کے رہنے والے سورج کو پوجتے تھے۔ ان کی طرز فکر کو قرآن نے بھی ایک طرح بیان کیا ہے، زمانہ جاہلیت کے عرب جو نسل اسماعیلؑ سے تھے، ایک عرصے تک خدا پرست اور حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ کی تعلیمات پر چلتے رہے۔ لیکن زمانہ کے ساتھ ساتھ بت پرست قوموں سے ربط ضبط کی وجہ سے تبدریج ان کے یہاں بھی بت پرستی نے خدا پرستی کی جگہ لے لی۔

وہ پہلا شخص جس نے مکے اور اس کے اطراف میں بت پرستی رائج کی وہ عمرو لحی تھا اس نے اپنے شام کے سفر میں بلقاء شہر میں کچھ لوگوں کو بتوں کی پوجا کرتے دیکھا جب اس نے اس کی وجہ دریافت کی تو ان لوگوں نے کہا یہ بت جن کی ہم پرستش کرتے ہیں، جب ہم ان سے بارش طلب کرتے ہیں بارش برساتے ہیں اور جب مدد مانگتے ہیں تو ہماری مدد بھی کرتے ہیں۔ اس نے ان کی بت پرستی کو ایسا پسند کیا کہ ایک بڑا بت ''ہبل'' اپنے ساتھ مکہ لے آیا اور اسے خانہ کعبہ کی چھت پر رکھ دیا اور وہاں کے لوگوں کو اس بت کی پرستش کی دعوت دی۔ اسطرح مکہ میں بت پرستی نے راہ پائی اور رفتہ رفتہ عرب کی مختلف اقوام و قبائل میں بتوں کی بہتات ہو گئی جن کو وہ پوجنے لگے۔[۲]

بعض محققین کی رائے میں بت پرستی کی بنیاد قوم کی بڑی شخصیتوں کی تعظیم و تکریم سے پڑی۔[۳] جب کوئی بزرگ شخصیت دنیا سے گزر جاتی تو اس کی یادگار کے طور پر بعد کے لوگ اس کا مجسمہ بنا لیتے تاکہ اس کی یاد دلوں میں زندہ رکھی جائے۔ زمانہ گزرنے اور نسل بدلنے کے بعد یہ مورتیاں ان لوگوں میں معبود کی صورت اختیار کر لیتیں۔ حالانکہ ان مجسموں کو جس زمانے میں ڈھالا جاتا اس وقت اس قسم کا خیال لوگوں کے

---

[۱] انسائیکلو پیڈیا خصوصاً آثار قدیمہ سے متعلق انسائیکلو پیڈیا نے ان ایشیائی اقوام کے کچھ عقائد بیان کیے ہیں جو وسیع علاقے میں رہتی ہیں اور سب ہی بت پرست ہیں۔

[۲] سیرۃ ابن ہشام۔ ج 1 ص 87

[۳] مؤلف کے نزدیک یہ نظریہ ثابت نہیں۔ اس کا بھی پتہ نہیں کہ ان کا مقصد اکابرین کی تعظیم و تکریم تھا۔ یا عبارت و پرستش۔

ذہنوں میں نہیں ہوتا تھا۔

بعض اوقات کسی خاندان کا بزرگ اپنی زندگی میں قابل احترام سمجھا جاتا۔اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کی مشکل کا بت بنا کر اس کی پرستش کرنے لگتے۔مختلف داستانوں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم یونان اور روم میں ایک خاندان کا سربراہ اپنی حیات ہی میں پوجا جاتا اور مرنے کے بعد اس کے مجسمے بنا کر بھی لوگ اس کو پوجتے۔موجودہ دور میں عالمی عجائب گھروں میں بڑی بڑی مذہبی شخصیتوں کے بت موجود ہیں۔کسی زمانے میں خود ان کی پرستش کی گئی اور ان کے مرنے کے بعد ان کے بت بنائے گئے۔

حضرت ابراہیمؑ کا اپنی قوم کے سردار نمرود سے جو مذاکرہ ہوا۔اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ نمرود کی قوم اس کی کو پوجتی تھی[1]۔اسی طرح فرعون کی قوم اس کی پرستش کرتی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی مخصوص بتوں کی پرستش کرتا تھا۔یہ بت شاید گزشتہ فراعنہ کے مجسمے ہوں گے۔جیسا کہ قرآن میں ہے:

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ (اعراف۔127)

''قوم فرعون میں سے ایک گروہ نے کہا: کیا موسیٰ اور اس کی قوم کو آزاد چھوڑ دے گا کہ وہ روئے زمین پر فساد کریں اور تجھے اور تیرے خداؤں کو چھوڑ دیں۔''

عبادت میں شرک کے اسباب

عبادت میں شرک کے کچھ علل واسباب ہیں جن میں سے تین کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں:

ا۔ایک سے زیادہ خالق کا اعتقاد

ثنویت اور تثلیث پر اعتقاد غیر خدا کی پرستش کا ایک سبب ہے۔ بودھ مذہب میں خدائے ازلی وابدی نے تین خداؤں یا تین مظاہر میں تجلی کی جن کے نام یہ ہیں:

برہما............خلق کرنے والا۔

وشنو............باقی رکھنے والا اور حفاظت کرنے والا

شیوا............مارنے والا۔

عیسائیوں کے یہاں اس نام سے:

---

[1] سورہ بقرہ کی آیت 158 دیکھیں۔

باپ خدا...... بیٹا خدا...... اور روح القدس خدا

زرتشت کے مذہب میں ''آہورا'' اور ''مزدا'' کا اعتقاد رکھنے کے باوجود، دو دوسرے خداؤں یزدان اور اہریمن کا اعتقاد تھا۔ گو کہ زرتشت کا ان دونوں کے بارے میں حقیقی عقیدہ بہت مبہم ہے۔

۲۔ مخلوق کے خدا سے دور ہونے کا خیال

غیر خدا کی پرستش کا دوسرا سبب خدا کا مخلوق سے الگ ہونے کا خیال تھا بت پرست خدا کو مخلوق سے دور فرض کرتے تھے۔ ان کا یہ تصور تھا کہ اس دوری کی بناء پر ان کی دُعا اور درخواست اس تک نہیں پہنچتی۔ لہٰذا فطرتاً کچھ ایسے وسیلے اور واسطے بنا لیے جائیں، جو ان کی باتیں خدا تک پہنچایا کریں۔ گویا مقام ربوبیت بھی انسانی فرمانرواؤں کے دربار کی طرح ہے کہ واسطوں اور وسیلوں سے اس تک پہنچنا چاہیئے جو ان کی درخواستوں کو خدا تک پہنچادیا کریں۔ اسی لئے کچھ لوگ قدسیوں فرشتوں، جنوں اور روحوں کی پرستش کرتے ہیں کہ یہ وسیلے پرستش کرنے والوں کا پیغام خدا تک پہنچائیں۔

قرآن مجید میں خداوندِ عالم نے مختلف انداز سے اس سبب کو رد کیا ہے اور کہا ہے کہ خدا اپنے بندوں سے سب سے زیادہ قریب ہے اور ان کے داخلی اور خارجی سارے حالات سے آگاہ اور باخبر ہے۔ اپنے بندوں کی ظاہر اور مخفی باتوں کو سنتا ہے۔ لہٰذا اس کو ان مصنوعی خداؤں کی پرستش کی حاجت نہیں۔ اس لئے کہ اگر اس پرستش کا مقصد تمہاری درخواستوں کا پہنچانا ہے تو خدا براہ راست ان تمام سے آگاہ ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

۱۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ

''ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔'' (ق۔16)

۲۔ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ

''کہہ دیں کہ اگر تم اس چیز کو جو تمہارے دل میں ہے، خواہ چھپاؤ یا ظاہر کرو، خدا جانتا ہے۔ (آل عمران۔29)

۳۔ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ

''کوئی تین افراد آپس میں کوئی راز کی بات نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کو چھوتھا ہے اور نہ پانچ افراد مگر یہ کہ خدا ان کا چھٹا ہوتا ہے۔'' (مجادلہ۔7)

قرآن مجید ان آیات اوا یسی دیگر آیات سے اس سبب کو باطل کرتا ہے

۳۔ مختلف قوتوں کی مختلف خداؤں یا منتظموں کے سپرد کیا جانا

انسان فطرتاً اپنے سے برتر طاقت وقوت کے سامنے جھکتا ہے یہ احساس اگر اس کے ہاتھ پیر سے نہ بھی ظاہر ہو، پھر بھی وہ اپنے اندر ایک قسم کا فروتنی کا احساس ضرور رکھتا ہے۔ ساتھ ساتھ انسان اس دنیا میں حواس خمسہ سے ربط رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ ساری ہی چیزوں کو احساس کے قالب میں ڈھالے اور اسے محسوس کرے۔ چنانچہ اس کی خواہش رہی ہے کہ غیبی طاقتوں اور برتر قوتوں کو محسوس کی شکل میں اور جسم وتصویر کی صورت میں دیکھے۔ ایک طرف اس کا یہ اندازِ فکر رہا ہے۔ دوسری طرف انسانی فکر کی نارسائی اور ناپختگی اور شرک آمیز فلسفیانہ موشگافیتوں کی وجہ سے وہ یہ خیال کرنے لگا کہ عالم کا ہر واقعہ ایک الگ قوت قاہرہ کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتا ہے اور یہ قوت قاہرہ خود مخلوقِ خدا ہے۔ جیسے سمندر کا خدا، خشکی کا خدا، جنگ کا خدا، صلح کا خدا وغیرہ۔ گویا اس جہانِ آفرینش کا انتظام خان خانی حکومتوں جیسا ہے، عالم کا ہر گوشتہ (اور شعبہ) ایک طاقت کے سپرد کیا گیا ہے اور یہ طاقتیں اس شعبے کے انتظام میں مختار ہیں اور جو چاہیں کریں، چانچہ ساحل سمندر پر رہنے والے سمندری خدا کی پرستش کرتے ہیں تاکہ وہ ان کو دریائی نعمتوں سے بہرہ مند کرئے اور طوفان وطغیان سے محفوظ رکھے، زمین اور بیابانوں میں رہنے والے خشکی کے خدا کی پرستش کرتے ہیں تاکہ زمین کے منافع ان کے حصے میں آئیں اور وہ آفات وزلزے سے محفوظ رہیں اسی طرح دیگر خداؤں کی پرستش کا حل ہے مگر چونکہ یہ ''خدا'' ان کو نظر نہیں آتے اس لیے ان کی خیالی شکلیں دھات، پتھر اور لکڑی کی گھڑ لیتے ہیں، چنانچہ ان بتوں کو حقیقی طاقتوں کی فرضی تصویریں اور مجسمے کہا جاسکتا ہے، جن کی یہ پرستش کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں میں کچھ فرشتوں کی، کچھ دوسرے جنوں کی، ثوابت جیسے، شعری اور کچھ دوسرے سیارگان کی پرستش کرتے تھے۔ ان کی اس پرستش کا مقصد یہ تھا کہ ان کے منافع اور خیر کو حاصل کریں اور ان کے شر اور ضرر سے امان میں رہیں۔

یہ بتوں کے بنانے میں خاصی وسعت نظر رکھتے تھے، انہوں نے اپنے اوپر لازم نہیں کیا تھا کہ معبود جیسا بت بنائیں۔ چنانچہ ہر ایک خدا کیلئے الگ الگ بت اور اصنام تیار کرتے جو ایک دوسرے سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا اس ساری پرستش کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ مادرائے مادہ اور خیالی امور کو محسوسات کے سانچے میں ڈھالیں۔ فرشتے اور جن کی قسم کے ان کے خدا چونکہ دیکھے اور چھوئے نہیں جاسکتے تھے، حتیٰ کہ ستارے بھی غروب ہوجایا کرتے اور وہ ہر وقت نظروں کے سامنے نہ رہتے اس لیے وہ لوگ ان کے اصنام بنا کر ان کی پرستش کرتے۔

قرآن مجید اس خیال کی سخت مذمت کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں کے گھڑے ہوئے خداؤں کو طاقت اور قوت کا مالک بنایا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ بہت سے موقعوں پر یہ بات بیان کرتا ہے کہ خلقت کے امور کا وہ خود مدبر ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ ؕ

''وہ عرش قدرت پر متمکن ہوا۔ وہی امور خلقت وآفرینش کی تدبیر کرتا ہے۔'' (یونس۔3)

قرآن مجید نے بہت سی آیات میں تفصیل سے خلقت، جلانا، مارنا، سورج چاند کی گردش، دن اور رات کا نظام، روزی رسانی

وغیرہ کا خاص خدا کا کام کہا ہے، اور شرک اور ثنویت کے ہر قسم کے تصور، خدا کی قدرت کے مقابل کسی بھی قسم کی قدرت اور ہر طور کی مخلوق کو قوت و طاقت سپرد کرنے کی مذمت کی ہے۔ اب تک ہم غیر خدا کی پرستش کے تین اسباب کے آشنا ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے ہم اس بات کا دعویٰ نہیں کرتے کہ اور دوسرے اسباب نہ ہوں گے۔ مگر یہ تین اسباب جن کی قرآن نے شدت اور سختی سے مذمت کی ہے، دنیا میں شرک کے پھیلنے کی بنیاد تھے۔

ایک مسلمان جو اس خدائے واحد پر اعتقاد رکھتا ہے جو ہر جگہ حاضر ہے اور اپنے بندوں کے قریب ہے جس کے ہاتھ میں امور خلقت کی باگ ڈور ہے اور اس نے یہ کسی اور کے سپرد نہیں کی، ایسے خدا کے علاوہ وہ کسی کی پرستش کر ہی نہیں سکتا، نہ صرف یہ بلکہ اس کو چاہیے کہ شرک و بت پرستی کے نظریے کے خلاف نہ شدت نبرد آزما ہو اور ایک لمحے کیلئے بھی اس بات پر راضی نہ ہو کہ کوئی فرد بھی دائرہ توحید سے باہر قدم رکھے۔

تیسرے سبب کے سلسلے میں ہم ایک نکتے کا ذکر کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص اس چیز کا معتقد ہو کہ خدا کے علاوہ کوئی خالق اور اس کے سوا کوئی مدبر نہیں۔ جہانِ خلقت کے سارے کام اسی سے متعلق ہیں اور اس قسم کا کام خدا نے اپنے غیر کے سپرد نہیں کیا۔ البتہ خدا کے دوسرے کام مثلاً شفاعت و مغفرت جو خدا کے حق طلق و ملک ہیں وہ دوسرے افرد کو واگذار ہوئے لیکن توجہ کرنے چاہیئے کہ یہ غیر خدا کی پرستش کا ایک سبب بنا ہے اور قرآن نے صراحت کے ساتھ شفاعت کو خدا کا حق طلق و ملک قرار دیا ہے۔ کوئی شخص اس کے اذن اور حکم کے بغیر شفاعت نہیں کر سکتا جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ط

''سارا سارا حق شفاعت اسی کیلئے ہے۔'' (زمر۔44)

مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ط

''کوئی شفاعت کرنے والا نہیں۔ مگر خدا کی اجازت کے بعد۔'' (یونس۔3)

زمانہ رسالت پیغمبرؐ میں بت پرستوں کا ایک گروہ بتوں کی پرستش اس تصور کے ساتھ بھی کرتا تھا کہ وہ بارگاہ الٰہی میں اثر رکھتے ہیں اور مغفرت اور شفاعت کے معاملات ان ہی کو سونپ دیئے گئے ہیں۔

قرآن میں عبادت کا مفہوم

عربی زبان کی لغت لکھنے والوں نے ''عبادت'' کی تشریح میں قریبی مفہوم کی تعریف کی ہے اور عبادت کو خضوع اور تذلل کے معنی میں لیا ہے یہاں ان کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

ا۔ لسان العرب میں لکھا ہے:

"اصل العبودیة الخضوع والتذلل"

''عبودیت کی اصلیت خضوع اور تذلل ہے۔''

۲۔ راغت اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے:

"العبودیة اظهار التذلل ،والعبادة ابلغ منها لانها غایة التذلل ،ولایستحق الامن له غایة الافضال وهو الله تعالیٰ ولهذا قال ،الاتعبدوا الا ایاه"

''عبودیت اظہار تذلل ہے ، جب کہ عبادت اس کا مبالغہ ہے۔ کیونکہ وہ انتہائے تذلل کا نام ہے اور اس کا مستحق نہیں ، مگر وہ جو انتہائی فضل و کرم رکھتا ہو اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ، اسی لئے وہ کہتا ہے: عبادت نہ کرو مگر اس کی۔''

۳۔ قاموس میں بھی لکھا ہے:

"العبادۃ الطاعۃ"

''عبادت اطاعت ہے۔''

عربی لغت لکھنے والوں نے ''عبادت'' کو خضوع و تذلل ، اطاعت اور تذلل کے انتہائی اظہار کے معنی میں لیا ہے مگر یہ تمام تعریفیں اپنے وسیع اور عام معنی میں ہیں۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ تمام موقعوں پر اطاعت ، خضوع اور اظہار تذلل عبادت و پرستش شمار نہیں ہوتی۔ ایسے موقعوں پر عبادت کا لفظ استعمال بھی کیا گیا تو وہ اس کے معنی میں وسعت کے طور پر ورنہ ان موقعوں پر پرستش صادق نہیں آتی۔ بیٹے کا اپنے ماں باپ کے سامنے اور شاگرد کا اپنے استاد کے سامنے خضوع بلکہ بعض اوقات انتہائی تذلل میں شدت بھی اختیار کر لیں۔ اب ہم ان آیات کا ذکر کرتے ہیں ، جن سے صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ انتہائی خضوع و تذلل چہ جائیکہ مطلق خضوع و تذلل ، عبادت و پرستش نہیں ہے:

ا۔ قرآن میں بصراحت موجود ہے کہ حضرت آدمؑ ملائکہ اور فرشتوں کے مسجود تھے اور خدا نے حکم دیا تھا کہ سب ان کو سجدہ کریں۔ جیسا کہ فرمایا:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ

''یاد کرو وہ وقت جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔'' (بقرہ۔34)

صریح آیت یہ ہے کہ حضرت آدم مسجود ملائکہ تھے (نہ کہ قبلہ) اس کے باوجود یہ سجدہ ، جو حضرت آدمؑ کے سامنے انتہائی خضوع تھا ، شرک باللہ شمار نہیں ہوا۔ اس عمل کی بناء پر فرشتے مشرک نہیں ہوئے اور اس ذریعے سے انہوں نے خدا کا شریک قرار نہیں دیا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے آدمؑ کی پرستش بھی نہیں کی ، بلکہ ان کی تعظیم و تکریم کی ہے۔ یہ بات اس امر پر گواہ ہے کہ غیر خدا کے سامنے ہر قسم کی تعظیم و تکریم اس کی

عبادت و پرستش نہیں ہے۔

اگر چہ ''اسجدوا لآدم'' کی تعبیر ''اسجدوا للہ'' کی تعبیر کے ساتھ ایک جیسی ہے۔لیکن اس کے باجود پہلی نوعیت کا سجدہ آدمؑ کی عبادت نہیں مگر خدا کا سجدہ اس کی عبادت ہے۔ چنانچہ ان دونوں قسم کے سجدوں کے فرق کو کسی اور جگہ یعنی خضوع کے سرچشمے اور علت میں تلاش کرنا چاہیئے۔کبھی کہا جاتا ہے کہ آیت میں آدمؑ کے سامنے سجدہ کا معنی فرشتوں کا آدم کیلئے خضوع کرنا ہے اور اصطلاحی سجدہ مراد نہیں ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ ہر خضوع عبادت نہیں۔

خضوع کی ایک ہی قسم عبادت ہے اور وہ وہی خضوع ہے جو انتہائی تذلل کی شکل میں ظہور پذیر ہو۔مثلاً انسان اپنا خضوع سجدے کی شکل میں انجام دے اور فرض یہ کیا گیا کہ فرشتوں نے اس قسم کا کام انجام نہیں دیا۔ یا کہا جاتا ہے کہ آدمؑ کو سجدہ کرنے سے مراد آدمؑ کو قبلہ قرار دینا ہے، نہ کہ آدمؑ کیلئے حقیقی سجدہ کرنا۔

یہ دونوں مفروضے باطل ہیں، اس آیت میں جو سجدے کا ذکر ہے اس کی تفسیر ''خضوع'' کرنا ظاہر معنی اور فہم و عقل کے خلاف ہے ۔اس لفظ ''سجدۂ'' سے لغت اور عام مفہوم میں بھی وہی اصطلاح سجدہ ذہن میں پہلے آتا ہے اور ابھرتا ہے نہ کہ ''خضوع''۔

اگر حضرت آدمؑ ملائکہ کیلئے صرف ''قبلہ'' ہوتے تو شیطان کیلئے اعتراض کی مجال اور گنجائش نہ ہوتی کہ وہ کہے کہ:

ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿٦١﴾

''کیا ایسے کو سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔'' (اسراء)

یہ قطعی ضروری نہیں ہے سجدہ کرنے والے سے ''قبلہ'' اشرف و افضل ہو کہ اعتراض کی گنجائش نکلے۔ بلکہ ضروری ہے کہ ساجد سے مسجود اشرف ہو۔ چونکہ حضرت آدمؑ شیطان کی نظر میں افضل و برتر نہیں تھے اس لیے ان کے سامنے سجدہ کرنے پر اس نے اعتراض کیا۔ چنانچہ آیت کا مفہوم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ملائکہ نے خداوند تعالیٰ کے حکم سے حقیقتاً آدم کو سجدہ کیا اور وہ حکم خداوندی سے مسجود ملائکہ قرار پائے اس واقعے میں فرشتوں نے اپنی طرف سے آدمؑ کے حضور انتہائی تذلل دکھایا۔مگر آدمؑ کی عبادت نہیں کی۔

۲۔سورۂ یوسف کی آیت 100 میں ہے:

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ

''یوسف اپنے ماں باپ کو تخت پر لے گیا اور انہوں نے (برادرانِ یوسف کے ساتھ) یوسف کو سجدہ کیا۔تو یوسف نے اپنے ماں باپ سے کہا: اے باباجان! (ان کا سجدہ کرنا) یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے، اسے خدا نے اس طرح سچ کر دکھایا۔''

قرآن سورۂ یوسف کی آیت 4 میں حضرت یوسفؑ کے خواب کو اس طرح بیان کرتا ہے:

يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝۴

''بابا جان! میں نے عالمِ خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے اور سورج چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔''

طویل مدت کے بعد حضرت یوسفؑ کے حضور بھائیوں اور ماں باپ کے سجدہ کرنے سے یہ خواب حقیقت بنا پتہ چلا کہ کسی شخص کو سجدہ کرنا جو انتہائی تذلل کا مظہر ہے، عبادت اور پرستش نہیں ہے۔

چنانچہ شرک اور عبادت کے معاملہ میں فیصلہ کرتے وقت محض ظاہر پر نظر نہیں رکھنی چاہیئے۔ بلکہ نیتوں، عقیدوں اور اس عمل کے اسباب پر بھی غور و خوض کرنا چاہیئے۔ ان کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

۳۔ خداوند عالم قرآن میں حکم دیتا ہے کہ ماں باپ کے سامنے ہم مہربانی، محبت اور تواضع اور انکساری کا اظہار کریں جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ

''ہمیشہ انتہائی تذلل کے ساتھ شانۂ رحمت و انکساری ان کے لئے جھکائے رکھو۔'' (بنی اسرائیل۔24)

۴۔ مراسم حج میں سارے مسلمان خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں جو پتھر اور مٹی کے علاوہ کچھ نہیں۔ قرآن مجید اس طواف کا حکم دیتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ

''بیت عتیق (خانہ کعبہ) کا طواف کرو۔'' (حج۔29)

۵۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ ہم صفا و مروہ کے درمیان سعی کریں۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ

''صفا اور مروہ خدا تعالیٰ کی نشانیوں اور شعائر میں سے ہیں، جو شخص حج یا عمرہ کے مراسم انجام دے اس پر لازم ہے کہ ان دو پہاڑوں کے درمیان سعی کرے۔'' (بقرہ۔158)

سوال یہ ہے کہ کیا پتھر اور مٹی کا طواف کرنا اور دو پہاڑیوں کے درمیان سعی کرنا پتھر اور مٹی اور پہاڑ کی عبادت ہے؟ اگر مطلق خضوع پرستش گنی

جائے تو ہمیں ان تمام اعمال کو ایک قسم کا جائز شرک سمجھنا ہوگا۔[1]

"تعالیٰ اللہ عن ذالك علوًّا کبیرًا"

"خدا اس سے برتر ہے کہ شرک کا حکم دے جو سب سے بڑا ظلم اور شرفِ انسانیت کی پستی کا سبب ہے۔"

۶۔ قرآن میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ مقام ابراہیم میں نماز ادا کریں۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى

"مقام ابراہیمؑ میں اپنی نماز کیلئے جگہ لو۔" (بقرہ۔125)

بلاشبہ نمازی خدا کیلئے نماز پڑھتے ہیں، لیکن مقامِ ابراہیم میں نماز پڑھنا، جہاں حضرت ابراہیمؑ کا نقش قدم بھی دیکھا جاسکتا ہے، اس بزرگ مردِ خدا کی ایک طرح کی عزت وتکریم ہے۔ اس عمل میں کہیں بھی شرک کی بو نہیں آتی۔

۷۔ قرآن میں خداوند عالم ایک گروہ کی تعریف کرتا ہے جو مومنین کے سامنے خضوع کرتے ہیں۔ اور کافروں کے مقابلے میں بڑائی کا اظہار کرتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ

"عنقریب خدا ایک گروہ بھیجے گا، جن کو وہ دوست رکھتا ہے اور وہ خدا کو دوست رکھتے ہیں اور وہ مومنین کے کیلئے منکسر ہیں اور کفار کے مقابلے میں سرکش۔" (مائدہ۔54)

یہ آیات اور پھر مراسم حج میں مسلمانوں کے اعمال اس کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مطلق خضوع وتذلل یا تکریم واحترام عبادت اور پرستش نہیں۔ اگر لغت تیار کرنے والوں نے عبادت کو خضوع اور تذلل کے معنی میں لیا ہے تو گویا انہوں نے اس کا وسیع معنی بیان کیا ہے۔ مذکورہ آیات نے ثابت کردیا ہے کہ مطلق خضوع وتذلل عبادت نہیں۔ جیسا کہ مطلق عزت وتکریم اور احترام بھی عبادت نہیں۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ہمیں تمام نوعِ بشر حتیٰ کہ انبیاءؑ کو بھی (نعوذ باللہ) مشرک سمجھنا پڑے گا۔ اس لیے کہ وہ بھی واجب الاحترام افراد کا احترام کیا کرتے تھے۔ شیخ

---

[1] تمام مسلمان مراسم حج میں حجر اسود کا استلام کرتے ہیں اور یہ استلام حجر فریضۂ حج میں ایک مستحب امر ہے یہ عمل ظاہر میں تو (حقیقت میں نہیں) ان کاموں کے مشابہ ہے جو مشرک اپنے بتوں کے ساتھ انجام دیتے تھے جب کہ ان میں سے ایک شرک کہلایا اور دوسرا نہ صرف یہ کہ شرک نہیں بلکہ بت پرستی اور توحید پرستی کے مراسم کا ایک حصہ ہے

جعفر کاشف الغطاء مرحوم کا اس سلسلے میں ایک جملہ ہے جس کا متن اور ترجمہ ہم حاشیے میں دے رہے ہیں۔[1]

کیا حکم خدا شرک کو غیر شرک بنا دیتا ہے؟

جب بھی ان لوگوں سے جن کو وہابی بھی کہا جاتا ہے، فرشتوں کا حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے اور حجر اسود کے استلام وغیرہ کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے کہ اگر ہر خضوع وتذلل شرک ہے تو پھر خدا نے فرشوں کو کیوں حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں (وغیرہ) تو وہ کہتے ہیں کہ چونکہ یہ کام خدا کے حکم سے انجام پائے اس لیے شرک نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ عبادت و پرستش کا معنی وہی تعظیم وخضوع اور بے چون وچرا اطاعت ہے۔

اب اگر قرآن اور حدیث میں آدمؑ، یوسفؑ اور والدین کے سامنے خضوع کرنے یا پیغمبرؐ اور اولی الامر کی اطاعت کرنے یا کعبہ، مقام ابراہیمؑ حجر اسمٰعیل، استلام حجر اسود آبِ زمزم سے تبرک حاصل کرنا اور اس جیسے دیگر امور کے بارے میں گفتگو آتی ہے تو یہ ان اعمال کے دوسرے مواقع پر جواز کی دلیل نہیں بتاتے، بلکہ کہتے ہیں کہ اس خضوع، اطاعت تعظیم اور تبرکات کی حقیقت عبادت ہی ہے۔ لیکن چونکہ یہ افعال حکمِ خدا سے انجام پاتے ہیں۔ چنانچہ خدا کی عبادت اور پرستش شمار ہوتے ہیں نہ کہ ان حضرات کی پرستش۔ لہٰذا اگر اس قسم کے کام ہم دوسرے موجودات کیلئے انجام دیں کہ جہاں خدا نے ایسا حکم نہیں دیا تو گویا ہم نے ان کی پرستش کی ہے اور خدائی نسبت ہم نے شرک کیا ہے۔ اس لحاظ سے قبروں کے سامنے خضوع کرنا اور مشاہد کے در و دیوار کو بوسہ دینا اور ضریح کو چومنا وغیرہ، چونکہ خدا کے حکم سے نہیں ہے اس لیے یہ صاحبان قبور کی عبادت شمار ہوگا۔ آج وہابی حضرات اس امر پر بہت زور دیتے ہیں مگر وہ ایک نکتے سے غافل ہیں اور وہ یہ کہ حکم خدا موضوع کو نہ بدلتا ہے اور نہ اسے دگرگوں کرتا ہے، کسی عمل کی ماہیت خدا کے حکم سے بدل نہیں سکتی اگر ان اعمال کی ماہیت شرک اور غیر خدا کی پرستش ہو تو حکیم خدا سے شرک ہرگز غیر شرک نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور پر:

۱۔ کسی کو گالیاں دینا اور بُرا بھلا کہنا اپنی جگہ اس شخص کی اہانت ہے۔ برا بھلا کہنا نہیں بھی اور کسی بھی آبرومند شخص کے لیے توہین سمجھا جاتا ہے، اب اگر کسی کو سب وشتم کرنا واجب کردے تو حکم خدا اس بُرا بھلا کہنے کی ماہیت کو بدل نہیں سکتا فحش کلامی اور بُرا بھلا کہنا ہر صورت میں فحش اور بُرا بھلا کہنا ہی ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ حکم خدا کے بعد اس قسم کا عمل جائز ہوجائے گا۔ لیکن اس کی ماہیت اور حقیقت نہیں بدلے گی۔

۲۔ ضیافت اور پذیرائی مہمان کیلئے تکریم اور احترام سمجھی جاتی ہے۔ اب اگر کسی شخص کی ضیافت اور مہمان نوازی حرام ہوجائے تو وہ کام جو اپنی جگہ

---

[1] شیخ جعفر کاشف الغطاء کہتے ہیں: لاریب انّه لایراد بالعبادة التی لاتکون الّا للّٰه ومن اتی بها لغیر الله فقد کفر، مطلق الخضوع والخشوع والانقیاد کما یظهر من کلام اهل اللغة والالزم کفر العبید والجراء وجمیع الخدام للامراء بل کفر الانبیاء فی خضوعهم للاباء...... ”عبادت سے مقصود خدا کی عبادت ہے۔ جو بھی اس کو غیر خدا کیلئے بجالائے وہ کافر ہوجاتا ہے مُطلق خضوع اور اطاعت (مراد) نہیں۔ اگرچہ اہل لغت نے اس کی اسی طرح تفسیر وتشریح کی ہے اس تفسیر کی بناء پر تو غلام مزدور، کاریگر اور تمام نوکر چاکر اور خادم کافر ہوجائیں گے بلکہ اس تشریح سے ضروری ہوجائے گا کہ ہم (معاذ اللہ) خدا کے انبیاء کو کافر خیال کریں کیونکہ وہ بھی اپنے والدین کے ساتھ خضوع کرتے تھے (منہج الرشاد، صفحہ 24 طبع نجف، تالیف شیخ اکبر جعفر کاشف الغطاء۔ م 1228ھ انہوں نے یہ کتاب آل سعود کے ایک امیر کے خط کے جواب میں لکھی آلِ سعود اوّل روز سے وہابیت کے نظریے اور مکتب کی ترویج کرتے ہیں۔

احترام ہے، حرمت کی وجہ سے اہانت میں تبدیل نہیں ہوجائے گا۔ چنانچہ طواف کعبہ اور آستسلام حجر اسود وغیرہ اگر اپنے ذات سے پتھر کی عبادت اور پرستش ہیں تو اللہ کا حکم ان کی ماہیت کو نہیں بدلے گا۔ اور یہ اعمال آدمؑ، یوسفؑ یا کعبہ اور حجر اسود کی پرستش ہی رہیں گے۔

وہابی جو یہ کہتے ہیں کہ یہ اعمال اپنی جگہ عبادت ہیں مگر چونکہ خداوند تعالیٰ نے ان کا حکم دیا ہے، اس لیے انہیں انجام دینے میں کوئی نقصان نہیں، اس کا معنی یہ ہوا کہ اس قسم کے کام ''جائز شرک'' ہیں۔ مگر یہ ایسی بات نہیں جس کو انسان قبول کر سکے۔ مختصر یہ کہ دونوں میں سے ایک نظریے کا انتخاب کرنا پڑے۔ یا تو ان اعمال کو ہم موضوع شرک سے باہر سمجھیں اور کہیں یہ کہ اپنی جگہ پر شرک کے مفہوم میں نہیں آتے یا یہ کہیں کہ یہ موضوع کے لحاظ سے تو شرک کے مصداق ہیں، لیکن خدا نے ان کے متعلق اجازت دی ہے کہ اس قسم کے شرک کے ہم مرتکب ہوں۔

یہ دوسرا نظریہ اس قدر بے بنیاد ہے کہ کوئی شخص اس کو ایک امکان کے طور پر بھی پیش نہیں کرسکتا۔ البتہ آگے چل کر ہم اسکا ذکر کریں گے کہ ایک ہی عمل ایک لحاظ سے تواضع اور تعظیم شمار ہو اور دوسرے مقام پر شرک اور ثنویت، مثلاً اگر فرشتے اس عنوان سے آدم کو سجدہ کریں کہ وہ خدا ہے تو یہ شرک ہے، خواہ بفرض محال خدا اس کا حکم بھی دے۔ مگر اس عنوان کے علاوہ شرک نہیں۔ خواہ خدا اس کا حکم نہ بھی فرمائے۔ زیادہ سے زیادہ بغیر حکم خدا کے یہ فعل بدعت شمار ہوگا۔ حکم خدا کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان اعمال کی خدا کی طرف نسبت دے اور اس کو واجب یا مستحب کے طور پر انجام دے کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہے اور اس نے جزو شریعت قرار دیا ہے تو اس صورت میں اس کا عمل بدعت نہیں کہلائے گا۔

علماء نے بدعت کی تعریف یہ کی ہے:

''البدعة ادخال ماليس من الدين في الدين''

''بدعت اس سے عبارت ہے کہ جو عمل دین کا جزو نہیں ہے اسے دین و مذہب میں داخل کیا جائے۔''

ہم استلام حجر اسود، خانہ کعبہ کے گرد طواف، صفا اور مروہ کے درمیان سعی اور آپ زمزم سے تبرک حاصل کرنے کو بلاشبہ ایک دینی و مذہبی سنت کے طور پر انجام دیتے ہیں۔ اگر ان کیلئے حکمِ الٰہی نہ ہوتا یہ قطعی بدعت شمار ہوتے۔ حکم الٰہی کا فائدہ یہ ہے کہ وہ ان اعمال کے انجام دینے والے کو بدعت اور شریعت سازی کی تہمت سے بچا لیتا ہے۔ لیکن اگر خود اپنی جگہ یہ عمل پتھر اور مٹی کی عبادت ہو تو حکم الٰہی اس کی قلب ماہیت نہیں کرسکتا اور اس کی اصلیت کو نہیں بدل سکتا ہے۔ (ظاہر ہے کہ اس وقت ہم شرک اور عبادت کے موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں نہ کہ بدعت پر)

علماء اس بات پر متفق ہیں کہ:

''القاعدة العقلية لا تخصص''

''یعنی قاعدہ عقلی مخصوص نہیں کیا جاسکتا کہ کچھ لوگوں کو قانونِ عقلی سے مبرا کیا جاسکے۔''

جب عقل یہی کہتی ہے کہ ہر معلوم کو ایک علت کی ضرورت اور حاجت ہے یا کسی مثلث کے تین زاویے، دو زاویہ قائمہ کے برابر ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ دائرے کا رقبہ برابر ہے، اس کے نصف قطر مربع سے 3/4 کے حاصل ضرب کے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے الیکٹران کی اپنی مدار پر گردش بعض موقعوں پر بلاعلت کے ممکن ہے۔ اگر کوئی عالم طبیعیات اس قسم کی بات کرے تو علت و معلول کے قانون اور کلیے سے اس کے ناواقفیت کی دلیل ہوگی۔ ممکن ہے اس کا خود کا مشاہدہ نہ ہو۔ اس لیے اس نے علت سے انکار کر دیا ہو۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس دنیا کے کسی دوسرے خطے میں ایک مثلث کے زاویے ایک زاویہ قائمہ کے برابر ہیں یا پھر دو سے زیادہ زاویہ قائمہ کے برابر ہیں تو یہ ایسی ہی بات ہوگی، جیسے وہ کہے کہ دو کو اگر دو سے ضرب دیں تو پانچ ہوتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ عقلی قوانین کو کہیں مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ان اعمال کی ماہیت خود اپنی جگہ شرک اور عبادت ہے یا انسان اور جمادات کی پرستش ہے تو پھر وہابی شخص کو یہ کہنا چاہیے کہ شرک کی ذاتی حرمت و کراہت کی ان موقعوں پر تخصیص ہوئی ہے اور یہ قبیح فعل (یعنی شرک) جو ظلم کی ایک قسم ہے ان موقعوں پر جائز اور مباح ہے۔ حالانکہ عقلی قاعدہ کلیہ قابل تخصیص و استثنا نہیں ہوتا۔

جب امام مسجد نبوی شیخ عبدالعزیز اس قسم کے احترامات کی توجیہ یہ کر رہا تھا کہ یہ حکم الٰہی کی وجہ سے صحیح ہیں تو اس سے کہا گیا تھا کہ تمہاری گفتگو کا مطلب یہ ہوا کہ شرک کے یہ اعمال جائز ہیں۔ گویا خدا نے حکم دیا ہے کہ ان موقعوں پر ہم شرک کے مرتکب ہوں

ان لوگوں کی توجہ اس آیت کی طرف مبذول کرنی چاہیے کہ:

قُلْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝٢٨

''کہہ دیں کہ خدا بری چیز کا حکم نہیں دیتا کیا خدا کی طرف ایسی چیز کی نسبت دیتے ہو، جس کو تم نہیں جانتے (اعراف)

اگر آدمؑ کے سجدے اور استلام حجرِ اسود کی ماہیت عبادت ہو تو خدا اس قسم کے بُرے کام کا قطعی حکم نہ دیتا کہ جو شرک ہے۔

جب واضح ہوا کہ ''عبادت'' کا معنیٰ خضوع اور اظہار تذلل وغیرہ نہیں تو دیکھنا چاہیے کہ عبادت درحقیقت ہے کیا۔ تاکہ عبادت کے معیار اور میزان کی شناخت ہو جانے کے بعد ہر موقع پر غیر خدا کیلئے اسے انجام دینے سے پرہیز کیا جائے۔ اگلی بحث اس موضوع پر کی جائے گی اور توحید و شرک کے معیار کی وضاحت کی جائے گی۔ اس کو مدِ نظر رکھ کر ہم ہر عمل تکریمی اور تعظیمی کو شرک شمار نہیں کریں گے اور انبیاءؑ و اولیاء اور پیشوایانِ حق کے احترام کے جرم میں مسلمانوں کو ہم مشرک نہیں سمجھیں گے۔

عبادت

خدا یا خدائی کاموں کا مبدأ جان کر خضوع کرنا

عربی زبان میں عبادت کا لفظ اسی معنی میں ہے جس معنی میں فارسی میں پرستش ہے، خواہ ان الفاظ کی منطقی تعریف وتفسیر کی جا سکے یا نہ، ان کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ زمین اور آسمان ہمارے ذہنوں میں روشن اور واضح مفہوم رکھتے ہیں۔ مگر ہم میں سے اکثر ان کی کامل تعریف نہیں کر پاتے۔ اس کے باوجود یہ دونوں الفاظ سننے سے ان کا معنی ہمارے ذہنوں میں تصویر کی شکل میں واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عبادت اور پرستش کے الفاظ کے بھی حقیقی معنی سے ہم سب آگاہ ہیں۔ حالانکہ ہم اس کے مفہوم کو منطقی تعریف کے قالب میں ڈھال نہیں پاتے۔ چنانچہ عبادت اور تعظیم یا پھر پرستش اور کسی کو بڑا سمجھنے میں ہم فرق کر سکتے ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے سے الگ سمجھتے ہیں۔

وہ گرویدہ عاشق جو اپنے معشوق کے درو دیوار کے بوسے لیتا ہے آیا اس کے لباس کو اپنے سینے سے لگاتا ہے یا پھر اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر کو چومتا ہے اس کو دنیا میں معشوق کا پرستش کرنے والا نہیں پکارا جاتا۔ دنیا کے عظیم رہبروں کے مومیائی مجسمے جب اُس خطے کے عوام دیکھنے جاتے ہیں، یا ان اکابرین کی قدیمی رہائش گاہوں پر جا کر چند سیکنڈ خاموش رہ کر ان کی یاد مناتے ہیں تو کسی بھی قوم میں یہ عمل عبادت اور پرستش شمار نہیں ہوتا۔ حالانکہ ان کا خضوع اور ان بڑوں سے تعلق کا اظہار اسی انداز کا ہوتا ہے، جیسا موحدوں کا خداوند عالم کے لئے خضوع۔

اس بحث میں صرف بیدار وجدان ہی فیصلہ کر سکتا ہے ہے اور احترام وتعظیم اور عبادت و پرستش میں فرق کر سکتا ہے۔ اب اگر ''عبادت'' کے لفظ کا منطقی تعریف کے طور پر تجزیہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل تین طریقوں سے یہ تعریف کی جا سکتی ہے مگر تینوں تعریفوں کا مقصد ایک ہی ہے۔

۱۔ عبادت کی پہلی تعریف

عبادت وہ عملی یا لفظی اور زبان سے خضوع ہے جس کا سرچشمہ کسی کی الوہیت کا اعتقاد ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ الوہیت کیا ہے اس بحث کا حقیقی نکتہ یہی ہے۔ اس کو توجہ سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

''الوہیت'' کے معنیٰ ''خدائی'' اور ''الہٰ'' کا معنیٰ ''خدا'' ہے۔ اب اگر کہیں لفظ ''الہٰ'' کی معبود کے طور پر تفسیر ہوئی ہے تو وہاں یہ معنی اس لفظ کے لازمی تقاضے کے طور پر ہے، نہ یہ کہ ''معبود'' الہٰ کا حقیقی معنیٰ ہے۔

چونکہ حقیقی الہٰ اور خیالی الہٰ دونوں ہی دنیا کی مختلف اقوام میں معبود تھے اور ان کی عبادت کی جاتی تھی، اسی لیے یہ تصور کر لیا گیا الہٰ ''معبود'' کے معنیٰ میں ہے دراصل معبود ہونا الہٰ کے معنی کے لوازم میں سے ہے۔ اس کا ابتدائی اور بنیادی معنیٰ نہیں۔ کلمہ اخلاص وتوحید ''لا الٰہ الاّ

اللہ'' اس بات کا واضح گواہ ہے کہ لفظ اللہ کا معنی خدا ہے نہ کہ معبود۔ اگر اس کلمے میں لفظ اللہ معبود کے معنیٰ میں ہو تو یہ جملہ عبث ہوگا۔ کیونکہ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ بھی ہزاروں معبود (یعنی جن کی عبادت ہوتی ہے) موجود ہیں۔

جو لوگ لفظ اللہ کو معبود کے معنی میں لیتے ہیں وہ اس غلطی کو رفع کرنے اور اس جملے کی اصلاح کیلئے مجبور ہیں کہ لفظ ''حق'' کو بھی ساتھ ملائیں اور کہیں کہ لا الٰہ الا اللہ کا معنی ہے کہ معبود برحق خدا کے علاوہ نہیں ہے۔

یہاں لفظ ''حق'' کا استعمال جملے کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے۔ چنانچہ ''الٰہ'' بمعنی ''خدا'' اور ''الوہیت'' بمعنی ''خدائی'' ہے اور ہر قسم کی تعظیم و تکریم جس کا سرچشمہ کسی خدا کی الوہیت کا اعتقاد ہے، اسکو عبادت کا نام دیتے ہیں۔

اس تعریف کی گواہی ان آیات سے ملتی ہے جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ ان آیات کے مطالعے اور ان پر غور و غوض سے پتہ چلتا ہے کہ ''عبادت'' گفتار و رفتار کی وہ نوع ہے، جس کا سرچشمہ کسی کی الوہیت کا اعتقاد ہو۔ چنانچہ جب تک اس نوعیت کا اعتقاد کسی موجود کے بارے میں نہ ہو تو اس کے سامنے خضوع اور فروتنی یا اس کی تعظیم و تکریم عبادت و پرستش نہیں کہلائے گی۔ اس بات کا گواہ یہ ہے کہ قرآن جب خدا کی عبادت کا حکم دیتا ہے تو فوراً اس کی دلیل بہم پہنچاتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اللہ نہیں جیسا کہ فرمایا:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ

''اے قوم میرے خدا کی عبادت کرو، جس کے علاوہ تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔'' (اعراف۔ 59)

اس آیت کا مضمون ۹ یا اس سے بھی زیادہ موقعوں پر آیا ہے۔ قارئین کرام سورۂ اعراف کی آیت 65، 173، 85 اور سورۂ ہود کی 5، 61، 84 اور سورۂ انبیاء کی آیت 25 اور سورۂ مومنوں کی 23، 32 اور طٰہ کی آیت ۱۴ بھی دیکھیں۔ ان تعبیرات سے پتہ چلتا ہے کہ ''عبادت'' وہ خضوع و تذلل ہے، جس کا سرچشمہ الوہیت کا اعتقاد ہے اور اگر اس نوع کا اعتقاد درمیان میں نہ ہو تو اس کو عبادت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۳۵

''وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب ان سے کہا جائے کہ اللہ کے علاوہ کوئی خدا نہیں، تو وہ تکبر کرتے ہیں۔ (صافات)

یعنی اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کیونکہ وہ دوسرے موجودات کی الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ

''کیا ان کا اللہ کے علاوہ کوئی خدا ہے، خدا پاک ہے، اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں۔'' (طور۔ 43)

اس آیت میں شرک کا معیار یہ رکھا گیا ہے کہ وہ غیر خدا کی الوہیت کے معتقد ہوں۔

الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

''وہ جو خدا کے ساتھ دوسرا خدا قرار دیتے ہیں۔ وہ بہت جلد اپنے اعمال کے نتائج سے آگاہ ہو جائیں گے۔'' (حجر)

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ

''جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو خدا نہیں پکارتے۔'' (فرقان۔68)

مشرکین کی دعوت اپنے بتوں کی الوہیت کے اعتقاد کے ساتھ تھی اس بات کی گواہ ذیل کی آیات ہیں:

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا

''اللہ کے علاوہ انہوں نے ایسے خدا قبول کیے ہیں جو ان کی عزت کا سبب نہیں۔'' (مریم۔81)

اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ

''کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا ہیں۔'' (انعام۔19)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ

''جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ (جیسے چچا) سے کہا: کیا بتوں کو خدا بناتے ہو۔''؟ (انعام۔۷۴)

جن آیات میں بت پرستوں کے شرک کا ذکر ہوا ہے ان کی طرف رجوع کرنے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ بت پرستوں کے شرک کی وجہ ان کا اپنے معبودوں کی الوہیت کا اعتقاد تھا۔ وہ مخلوق خدا کی طرح خدا مانتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ خدا بزرگ کے بعض کام ان کے سپرد ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ان کی بھی عبادت و پرستش کرنی چاہیے۔ جب ان کو خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی تو یہی ان کا اپنے خداؤں کی الوہیت کا اعتقاد ان کو یہ دعوت قبول کرنے میں رکاوٹ بنتا ہے اور وہ اس سے کفر کرتے اور انکار کرتے۔ اگر کسی کو اس کا شریک قرار دیا جاتا تو اس پر ایمان لے آتے۔ یہ آیت اسی بات کو پیش کرتی ہے:

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ؕ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴿۱۲﴾

''یہ اس لئے کہ جب خدا کو وحد پکارا جاتا ہے تو اس کا کفر وانکار کرتے ہیں اور اگر اس کا شریک قرار دیا جائے تو ایمان نے آتے ہیں حکم اور فیصلہ کرنا بلند رمرتبہ بزرگ

وبرتر خدا کا کام ہے(مومن)

آیت اللہ شیخ محمد جواد بلاغی مرحوم اپنی تفسیر ''آلاء الرحمان'' میں (افسوس کہ وہ ۲ جلدوں سے زیادہ نہیں لکھی جاسکی) عبادت کی حقیقت کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

العبادة مایرونه مستشعرا بالخضوع لمن یتخذه الخاضع الها لیوفیه بذلك مایراه له من حق الامتیاز بالالهیة

''عبادت وہ عمل ہے جو اس ذات کے حضور انسان کے خضوع کا ترجمان ہو، جس کو اس نے الٰہ قرار دیا ہے تاکہ مقام الوہیت رکھنے کی وجہ سے جو حقِ برتری وہ رکھتا ہے اس کے اس حق کو ادا کرے۔''

بلاغی مرحوم نے عبادت کے بارے میں اپنے وجدانی ادراک کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ مذکورہ بالا آیت بھی اس تعریف کے صحیح ہونے پر گواہ ہیں۔

استادِ بزرگوار حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خمینی اپنی قیمتی اور بے بہا کتاب میں اسی نظریے کو پیش کرتے ہیں:

''عربی میں لفظ ''عبادت'' اور فارسی میں پرستش اس سے عبارت ہے کہ کسی کی خدائی کی حیثیت سے تعریف وتوصیف کی جائے۔ خواہ بڑے خدا کی حیثیت سے یا چھوٹے خدا کی حیثیت سے۔''

اس نظریے کو واضح ترین گواہی ان آیات سے ملتی ہے جو شرک کی شدت سے مخالفت کرتی ہیں۔ سارے مشرک فرقے ان موجودات کو الٰہ سمجھتے تھے جن کے سامنے وہ خضوع کرتے اور ان کی تعریف وتوصیف کرتے تھے۔ ان کے سامنے ان کے تذلل کا سبب بھی یہی تھا۔

2۔ ربّ سمجھ کر خضوع کرنا

لفظ عبادت کے مفہوم کو ہم ایک دوسرے قالب میں بھی ڈھال کر پیش کر سکتے ہیں۔ یعنی عبادت ربوبیت پر اعتقاد کی بناء پر قولی یا عملی خضوع ہے اور لفظِ عبودیت، ربوبیت کے مقابل ہے۔ جب کوئی انسان خود کو عبد وبندہ اور مقابل کو اپنا ربِ تکوینی سمجھے اور اس خیال کے تحت اس کے سامنے خضوع کرے تو اس نوع کے عمل کو عبادت کہتے ہیں۔ ذیل میں پیش کی گئی آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبادت ربوبیت پر اعتقاد کا تقاضا ہے۔ وہ آیات یہ ہیں:

وَقَالَ الْمَسِيحُ يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ط

''عیسیٰ مسیح نے کہا اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے۔'' (مائدہ۔72)

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ

''یہ تمہاری اُمت ہے جو اُمّت واحدہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔''(انبیاء۔92)

إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ

''اللہ تمہارا اور میرا رب اور مالک ہے، بس اس کی عبادت کرو۔یہی صراطِ مستقیم ہے۔''(آل عمران۔51)

یہی مضمون بعض دوری آیات میں بھی آیا ہے

چند ایک آیات میں عبادت ''خالقیت'' کے شایان شان شمار ہوئی ہے جیسا کہ فرمایا:

ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ ۚ

''یہ ہے اللہ تمہارا رب، نہیں ہے کوئی خدا اس کے علاوہ۔یہی ہے سب کا پیدا کرنے والا پس اسی کی عبادت کرو۔''(انعام۔102)

حضرت آیت اللہ خوئی اپنی تفسیر میں لفظِ عبادت کے یہ معنی بیان کرتے ہیں:

العبادۃ انما یتحقق بالخضوع الشئ علی انہ رب یعبد

''عبادت وہ شمار ہوگی جب کسی کے سامنے خضوع اس حیثیت سے کیا جائے کہ وہ رب ہے۔''

اس تعریف کی واضح دلیل وہی اوپر دی ہوئی آیات ہیں۔

لفظ ''ربّ'' سے کیا مراد ہے

عربی میں رب اس کو کہا جاتا ہے، جس کے سپرد کسی چیز کا انتظام وانصرام کیا جائے اور اس چیز کی سرنوشت اس کے اختیار میں ہو، عربی میں گھر کے مالک بچے کی دایہ اور مزارع کو بھی ''رب'' کہتے ہیں اور وہ اس لیے کہ ان کا اختیار اس کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے۔ان کا مستقبل ان کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔اگر ہم خدا کو اپنا رب سمجھتے ہیں تو وہ اسی لئے کہ ہمارے ہر پہلو کی سرنوشت مثلاً وجود وہستی، حیات وممات، رزق وروزی ،قانون وشرح اور مغفرت وبخشش سب ہی اس کے ہاتھ میں ہے۔اب اگر کوئی تصور کرے کہ ہمارے معاملات میں سے کوئی ایک معاملہ جو ہمارے سرنوشت سے متعلق ہے کسی اور کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے تو اس صورت میں ہم نے اس کو اپنا ''رب'' خیال کیا ہے اللہ تعالیٰ نے حیات وممات یا رزق وروزی یا قانون سازی اور تشریع یا مغفرت وبخشش کا معاملہ کسی اور کے سپرد کیا ہے۔اب اگر ہم اس عقیدے کے ساتھ اس کے

سامنے خضوع و فروتنی کریں تو گویا ہم نے اس کی عبادت اور پرستش کی ہے۔

دوسرے لفظوں میں عبادت اور پرستش ،احساس بندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ بندگی کی حقیقت بس یہ ہے کہ انسان خود کو غلام اور بالاتر مقام والے کو اپنے وجود وہستی ،موت وحیات ،رزق وروزی کا اور کم سے کم خاص طور سے مغفرت اور شفاعت اور وضع قوانین اور ذمہ داریاں سونپنے کا مالک اور مختار سمجھے۔ ایسی صورت میں اس نے اس کو اپنا ''ربّ'' تصور کیا ہے جو شخص بھی زبان یا اپنے عمل سے اس قسم کی مملوکیت کا احساس ظاہر کرے اور اپنے عقیدے اور احساس کو عمل یا الفاظ کے سانچے میں ڈھالے تو بلاشبہ اس نے اس کی پرستش اور عبادت کی ہے۔

3۔عبادت کی تیسری تعریف

اپنے وجدان کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر عبادت میں تیسری تعریف بھی بیان کی جا سکتی ہے یعنی:

''عبادت اس کے سامنے خضوع اور فروتنی کرنا جس کو ہم خدا یا خدائی افعال کا مبداء تصور کریں۔

بلاشبہ عالمِ خلقت سے متعلق امور مثلاً عالم کا انتظام والضرام ،انسان کا جلانا اور مارنا، جانداروں کو روزی پہچانا، بندوں کی مغفرت اوران کے گناہوں کی بخشش یہ سب خدا کے کام ہیں۔اگر آپ ان آیات کا مطالعہ کریں جو ان موضوعات سے متعلق ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن ان کاموں کو قطعی خدائی کام جانتا ہے اوران کاموں کی کسی غیر کی طرف نسبت کو بڑی سختی سے روکتا ہے یہ ایک بات ہوئی۔

دوسری بات یہ کہ ہم جانتے ہیں کہ عالمِ خلقت اور جہان آفرینش میں ایک نظم اور سسٹم ہے اور ہر فعل جو اس جہان میں ظاہر ہوتا ہے وہ بغیر اسباب فراواں کے انجام پذیر نہیں ہوتا، جب کہ یہ سارے اسباب خدا تک منتہی ہوتے ہیں ۔قرآن نے خود کئی جگہ ان افعال کے علل اوراسباب کی صراحت کی ہے ،جو ہیں تو خدا کا غیر مگر اسی کے حکم سے کام کرتے ہیں۔ مثلاً قرآن اصرار کرتا ہے کہ زندہ کرنے اور مارنے والا خدا ہی ہے جیسا کہ فرمایا:

وَهُوَ الَّذِىۡ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ وَلَهُ اخۡتِلَافُ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ‌ؕ

''وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور رات اور دن کو ایک دوسرے کے بعد لاتا ہے۔'' (مؤمنون 80)

مگر یہی قرآن دوسری آیات میں فرشتوں کو مارنے کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡهُ رُسُلُنَا

''جب کسی کی موت آ پہنچتی ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے اس کی جان لے لیتے

ہیں۔'' (انعام۔61)

ان دونوں کو مدنظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان طبیعی اسباب کی فاعلیت اور سببیت (خواہ مادی ہوں یا غیر مادی مثلاً فرشتے) خدا ہی کے اذن حکم اور فرمان سے ہے یہ درحقیقت قرآن کے بلند معارف میں سے ایک ہے اور یہ امر خدائی افعال کے بارے میں بہت سی آیات کے مطالعے سے مترشح ہوتا ہے۔

اب اگر انسان خدائی افعال کو خدا سے جدا سمجھے اور کہے کہ یہ کام نورانی موجودات یعنی فرشتوں اور اولیاء اللہ کے سپرد ہو گئے ہیں اور اس اعتقاد کے ساتھ ان کے سامنے خضوع کرے تو یقیناً اس کا یہ خضوع عبادت اور اس کا یہ عمل شرک باللہ کا رنگ لیے ہوگا۔

دوسرے لفظوں میں اس کا اعتقاد ہو کہ خداوندِ عالم نے ان کاموں کی انجام دہی ان کو تفویض کی ہے جو پورا اختیار رکھتے ہوئے ان کاموں کو انجام دیتے ہیں تو اس صورت میں ان کو خدا کے مثل اور ''ند'' کی حیثیت سے لایا گیا ہے۔ بلاشبہ ایسا اعتقاد عین شرک اور اس اعتقاد کے ساتھ ہر قسم کی درخواست اور خضوع ان کی عبادت اور پرستش ہوگی۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ

''کچھ لوگوں نے خدا کیلئے مثل اور شریک قرار دیا ہے اور ان سے خدا کی طرح محبت کرتے ہیں۔'' (بقرہ165)

خدا کے مثل اور ''ند'' کے تصور کے احاطہ میں کوئی بھی موجود نہیں آسکتا۔ مگر یہ کہ وہ ایک یا کئی ایک کاموں میں آزاد اور خودمختار ہو۔ اس کے برعکس اگر وہ خدا کے حکم اور اذن سے وہی کام کرے تو نہ صرف یہ کہ اس کا مثل اور ''ند'' نہیں ہوگا بلکہ ایک مطیع و فرمانبردار موجود کہلائے گا، جو اس کے حکم سے اپنا فریضہ انجام دیتا ہے۔ دور رسالت کے مشرکین بھی اتفاقاً اپنے ان خداؤں کو جن کی وہ پرستش کرتے تھے، خدائی امور انجام دینے میں کسی حد تک آزاد سمجھتے تھے۔ دور جاہلیت میں سب سے کم ترین شرک کا عقیدہ یہ تھا کہ لوگ سمجھتے تھے کہ قانون سازی اور تشریع کا کام احبار اور راہبوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

یا پھر شفاعت و مغفرت جو صرف خدا کا حق ہے، ان کے بتوں اور معبودوں کو تفویض کیا گیا ہے، وہ اس کام میں خودمختار اور آزاد بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شفاعت کے متعلق آیات اس بات پر اصرار کرتی ہیں کہ کوئی شخص خدا کے اذن کے بغیر شفاعت نہیں کرسکتا۔

اگر ان کا عقیدہ یہ ہوتا کہ ان کے معبود خدا کے اذن سے شفاعت کریں گے تو پھر اذن خدا کے بغیر شفاعت کی نفی پر اصرار کی ضرورت کیا تھی۔ یونانی فلسفیوں میں سے بعض نے ہر دنیا کیلئے ایک خدا کا تصور باندھا ہوا تھا کہ جس کے ذمے اس دنیا کا انتظام تھا جب کہ درحقیقت یہ خدا کا کام ہے۔

عرب میں زمانہ جاہلیت میں جو لوگ فرشتوں اور ثابت و سیار ستاروں کو پوجتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے خیال مین جہانِ خلقت اور عالم انسان کا انتظام و انصرام ان ہی کے سپرد کیا گیا ہے اور خداوندِ عالم اس انتظام اور انصرام سے قطعی جدا ہو گیا ہے۔ یہ فرشتے

اور ستارے مکمل اختیار رکھتے تھے اور عالم کے انتظام کے مالک تھے۔ جبکہ ہر قسم کا خضوع اور فروتنی جو اس احساس کو ظاہر کرے وہ عبادت اور پرستش شمار ہوتی ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں کچھ دوسرے عرب لکڑی، پتھر اور دھات کے بنے ہوئے ان بتوں کو اپنا خالق اور پیدا کرنے والا یا جہان خلقت اور عالم انسان کا مدبر و منتظم تو نہیں سمجھتے تھے مگر ان کو مقامِ شفاعت کا مالک ضرور سمجھتے تھے اور کہتے تھے:

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ

''یہ اللہ کے ہاں ہمارے شفیع ہیں۔'' (یونس۔18)

اس باطل تصور کی وجہ سے یہ عرب ان کی عبادت کرتے، ان کی پرستش کو بارگاہ الٰہی میں تقرب کا وسیلہ سمجھتے اور کہتے:

مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى ؕ

''ہم ان کی پرستش اس بناء پر کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کریں۔'' (زمر۔3)

مختصر یہ کہ ہر وہ عمل جس کا منبع اس طرح کا احساس ہو اور ایک طرح کی سپردگی ظاہر کرے وہ عبادت شمار ہوتا ہے اس کے مقابلے میں وہ عمل جس کا منبع اس قسم کا اعتقاد نہ ہو اور بغیر اس اعتقاد کے کوئی شخص کسی اور کے سامنے خضوع اور فروتنی کرے یا اس کی تعظیم و تکریم کرے تو وہ عبادت اور شرک تو نہیں ہوگا۔ مگر ممکن ہے وہ فعل حرام ہو۔ مثلاً عاشق کا معشوق کیلئے، رعیت کا فرمانروا کیلئے اور عورت کا شوہر کیلئے سجدہ کرنا عبادت تو نہیں مگر اسلام کے مقدس دین میں حرام ہے۔ اگر کوئی بھی پرستارانہ شکل بنائے وہ حرام ہی ہے۔ یہ دوسری بات کہ خود خدا اس کا فرمان دے اور اس کے اذن سے ایسا کام انجام دیا جائے۔

اس گفتگو سے ایک سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ وہ یہ کہ اگر عبادت کیلئے الوہیت، ربوبیت یا الٰہی کام تفویض شدہ ہونے کا اعتقاد شرط ہے تو اس نیت اور ان شرائط کے بغیر کیا انسان کو سجدہ جائز شمار ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ سب لوگوں کے نزدیک سجدہ پرستش کا ذریعہ اور دنیا کی ساری قومیں خدا کی اسی طور پرستش اور عبادت کرتی ہیں، اس لئے اسلام نے اجازت نہیں دی کہ کسی اور کیلئے عام وسیلے کو استعمال کیا جائے۔ حتیٰ کہ وہاں بھی جہاں یہ عبادت شمار نہ ہو۔ یہ تحریم اسلام کی خصوصیات میں سے ہے۔ حضرت یعقوبؑ کے زمانے میں یہ تحریم نہیں تھی۔ ورنہ وہ اپنی اولاد کے ساتھ مل کر حضرت یوسفؑ کو سجدہ نہ کرتے۔

بعض محققین نے مندرجہ ذیل آیات سے دلیل دی ہے کہ غیر خدا کیلئے سجدہ کرنا مطلقاً حرام ہے خواہ وہ پرستش کے طور پر نہ ہو:

لَا تَسۡجُدُوۡا لِلشَّمۡسِ وَلَا لِلۡقَمَرِ وَاسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ الَّذِىۡ خَلَقَهُنَّ اِنۡ كُنۡتُمۡ اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ ۝۳۷

''سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو خدا کو سجدہ کرو اگر اس کی عبادت کرتے ہو۔''(حٰم السجدہ۔)

وَّاَنَّ الۡمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۙ﴿۱۸﴾

''سجدے کی جگہیں خدا کیلئے ہیں اس کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔''(جن۔18)

ان دونوں آیات میں غور وخوض کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا ہدف ومقصد اس سجدے کی حرمت ہے جو پرستش اور عبادت کے طور پر کیا جائے نہ کہ جو تعظیم کے طور پر ہو۔کیونکہ پہلی آیت میں فرمایا کہ ''ان کنتم ایّاہ تعبدون''اور دوسری آیت میں فرمایا: فلا تدعوا مع اللہ اور اس آیت میں ''دعوت'' سے مراد عبادت و پرستش ہے۔بہتر ہے کہ اس کے بارے میں اجماع اور احادیث سے بھی استدلال ہو صاحب البیان فرماتے ہیں:

فقد اجمع المسلمون علی حرمة السجود الغیر اللہ

''مسلمانوں کا اجماع اور اتفاق ہے کہ غیر خدا کیلئے سجدہ حرام ہے۔''

استادِ بزرگوار حضرت آیت اللہ العظمٰی خمینی سجدے کے بارے میں خواہ وہ غیر خدا کیلئے بطور عبادت نہ بھی ہو فرماتے ہیں: ''جی ہاں اگر خدا کسی خاص تواضع سے مزید منع کردے تو اس کی اطاعت کی جانی چاہیے خواہ وہ شرک نہ بھی ہو۔جیسا کہ ہم غیر خدا کیلئے سجدہ احترام کے طور پر بھی جائز نہیں سمجھتے اگر کوئی کسی بزرگ کو احتراماً سجدہ کرے تو ہم اس کو گناہ گار شمار کرتے ہیں گو مشرک نہیں کہتے۔ [1]

یہاں تک ہم ''عبادت'' اور ''شرک'' کی حقیقت سے بہ وضاحت آشنا کر چکے ہیں۔ضروری ہے کہ اس گفتگو سے نتیجہ نکالیں کہ اگر کوئی شخص کچھ دوسرے انسانوں کے سامنے خضوع اور فروتنی کرے مگر ان کو نہ ''الٰہ'' سمجھے نہ ''رب'' اور خدائی کاموں کا مبداء خیال کرے بلکہ ان کا اس وجہ سے احترام کرے کہ وہ:

عِبَادٌ مُّكۡرَمُوۡنَ ۙ﴿۲۶﴾ لَا يَسۡبِقُوۡنَهٗ بِالۡقَوۡلِ وَهُمۡ بِاَمۡرِهٖ يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۷﴾

''خدا کے مکرم ومحترم بندے ہیں بات کرنے میں اس پر سبقت نہیں کرتے اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔''(انبیاء)

تو یقیناً یہ عمل سوائے تعظیم وتکریم اور تواضع اور فروتنی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔خداوند عالم نے اپنے بندوں میں سے بعض کا چند ایک خصوصی صفات سے تعارف کروایا ہے جو ان لوگوں کی تعظیم وتکریم اور احترام کی طرف ہر انسان کو مائل کرتا ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ﴿۳۳﴾

---

[1]۔البیان صفحہ ۵۰۴

''خدا نے آدم، نوح، اولاد ابراہیم اور اولادِ عمران کو عالمین میں منتخب کیا ہے۔'' (آل عمران)

قرآن مجید کے مطابق خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو مقامِ امامت پیشوائی کیلئے منتخب کیا۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط

''خدا نے کہا میں نے تم کو پیش وائی کیلئے چُنا ہے۔'' (بقرہ۔124)

خداوند عالم نے قرآن میں حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ موسیٰؑ عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اعلیٰ صفات کے ساتھ توصیف کی ہے ان میں سے ہر صفت دلوں کو ان کی طرف مائل کرتی ہے اور ذہنوں کو متاثر کرتی ہے حتیٰ کہ ان میں سے بعض کی محبت ہمارے لیے واجب ولازم شمار کی ہے۔[1]

اب اگر انسان ان بندگانِ خدا کو بغیر ان کو خدا سمجھے یا خدائی کاموں کا مبداء خیال کیے ان کی زندگی یا ان کی وفات کے بعد یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ خدا کے مکرم ومحترم بندے ہیں ان کی تعظیم اور احترام کرے تو کسی بھی قوم ومذہب میں یہ احترام پرستش نہیں سمجھا جائے گا اور نہ ہی ایسا کرنے والے کو مشرک کہا جائے گا۔

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور دوبارہ یاددہانی کراتے ہیں کہ ہم سرورکونینؐ کی پیروی میں مراسم حج کے دوران حجر اسود کا بوسہ لیتے ہیں جو ایک سیاہ پتھر سے زیادہ نہیں خانہ خدا کے گرد طواف کرتے ہیں جو مٹی اور پتھر کے علاوہ اور کچھ نہیں، صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان سعی کرتے ہیں گویا وہی کام انجام دیتے ہیں جو بت پرست اپنے بتوں کیلئے انجام دیتے تھے مگر آج تک کسی شخص کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ ہم مسلمان اس عمل کے ذریعے محض مٹی اور پتھر کو پوج رہے ہیں وجہ یہ ہے کہ ہم ان پتھروں اور مٹی میں کسی نفع یا نقصان کے قائل نہیں ہے۔ اگر ہم ان باتوں کو اس اعتقاد کے ساتھ انجام دیں کہ یہ پتھر اور یہ پہاڑ خدا ہیں یا خدائی کاموں کا مبداء ہیں تو پھر بت پرستوں کی صف میں گنے جائیں گے۔

چنانچہ پیغمبرؐ وامام کے ہاتھ کا بوسہ لینا یا قستاد، ماں باپ کے ہاتھ چومنا یا قرآن اور دینی کتابوں یا ضریح یا بندگان برگزیدہ کی ضریح یا ان سے مربوط اشیاء کو چومنا صرف تعظیم وتکریم ہی کہلائے گا۔ اس بحث کے آخر میں ہم مجبوراً قارئین کی توجہ عبادت کی نامکمل اور ناقص تعریفوں کی طرف مبذول کرواتے ہیں۔

ا۔ ''المنار'' استاد شیخ محمد عبدہ کے درس کی تقریریں ہیں اس میں وہ ''عبادت'' کی حسب ذیل تعریف کرتے ہیں:

العبادة ضربٌ من الخضوع بالغ حدالنهاية ناشئ عن استشعارالقلب

---

[1] ۔شوریٰ۔ ۲۳

عظمة المعبود لا يعرف منشاها واعتقاد لتسلطه لا يدرك كنهها وماهيتها [1]

''عبادت شدید اور حد سے زیادہ خضوع ہے جس کا سرچشمہ احساسِ عظمت ہے وہ عظمت کہ جس کا منشاء نہیں معلوم مگر خضوع کرنے والا اس پر اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ تسلط کا حامل ہے جس کی کنہ اور حقیقت واضح نہیں۔''

یہ تعریف نقص سے خالی نہیں عبادت کی ایسی صورتیں ہیں جہاں شدید اور حد سے زیادہ خضوع نہیں ہوتا۔ مگر بہر حال عبادت شمار ہوتی ہے مثلاً وضو، غسل اور اقامت عبادت گنے جاتے ہیں مگر خضوع اور فروتنی کے لحاظ سے رکوع اور سجدے کے درجے تک نہیں پہنچتے تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عبادت شدید اور حد سے زیادہ خضوع ہے۔ ممکن ہے کہ عاشق کا اپنے معشوق کیلئے اور سپاہی کا اپنے فوجی افسر کے سامنے خضوع اور انکساری اس خضوع اور فروتنی کی نسبت کچھ زیادہ ہو جو بہت سے بندگان خدا اللہ کی عبادت کے موقع پر دکھاتے ہیں مگر پھر بھی عاشق اور سپاہی کے اس خضوع کو عبادت نہیں کہتے بلکہ انسان کے اس خضوع اور فروتنی کو جو وہ اس ذات کے سامنے کرتا ہے جس کو الٰہ سمجھتا ہے پرستش اور عبادت کہا جاتا ہے۔ مگر یہی مولف اپنی بحث کے دوران ایک ایسا جملہ بھی کہتا ہے جس کو ''عبادت'' کی صحیح تعریف کہا جا سکتا ہے اور ہمارے موقف کے مطابق ہے:

للعبادة صور كثيرة فى كُلّ دين من الاديان شرعت لتذكير الانسان بذٰلِك الشعور بالسلطان الالٰهى الاعلى الّذى هو روح العبادة وسرها [2]

''ہر دین میں عبادت کی مختلف شکلیں ہیں اور ان عبادات کو تشریع کا ہدف و مقصد عظیم خدائی تسلط اور غلبے کے ادراک اور احساس کی طرف انسان کو متوجہ کرنا ہے جو عبادت کی روح اور حقیقت شمار ہوتا ہے۔''

''الشعور بالسلطان الالٰهى'' کا فقرہ اس بات کی ترجمانی کرتا ہے کہ عبادت کرنے والا چونکہ اس کی الوہیت کا معتقد ہے اس لیے اس کی عبادت کرتا ہے جب تک یہ اعتقاد نہ ہو اس وقت تک انسان کا عمل عبادت نہیں کہلایا جا سکتا۔

۲۔ شیخ جامع الازہر قاہرہ شیخ محمود شلتوت اپنی تفسیر میں عبادت کی تعریف اسی طرح کرتے ہیں جیسی تم نے شیخ محمد عبدہ سے نقل کی ہے الفاظ میں فرق ہے لیکن دونوں مضمون اور مطلب میں ایک جیسی ہیں نہ کہ جن طرح شیخ شلتوت لکھتے ہیں:

---

[1] المنار جلد ا صفحہ ۵۷

[2] ۔المنار جلد ا صفحہ ۵۷

العبادۃ خضوع لایحد لعظمۃ لایحد [۱]

''عبادت و پرستش لامحدود خضوع ہے، لامحدود عظمت کے سامنے۔''

ایک نقص کہ جو''المنار'' کی عبارت میں تھا وہی اس تفسیر میں بھی ہے اور وہ معمولی غور وخوض کے بعد واضح ہوجاتا ہے البتہ المنار میں ایک نقص اور بھی ہے جو عبارتِ شلتوت میں نہیں کیونکہ ''المنار'' کے مطابق عبادت کا سرچشمہ معبود کی عظمت کا اعتقاد ہے مگر جس عظمت کا منشاء معلوم نہیں جب کہ عبادت کرنے والا جانتا ہے کہ عظمت کا سبب الٰہی فرماں روائی اور اس کا خدا ہونا ہے تو پھر اس عظمت کی حقیقت کیوں معلوم نہیں۔ [۲]

۳۔ بدترین تعریف وہ ہے جو ابن تیمیہ نے کی ہے وہ کہتا ہے:

لعبادُ ۃاسم جامع لکل مایحبه الله ویرضاه من الاقوال والاعمال الباطنة والظاهرة کالصّلوٰة والزکوٰة والصیام والحجّ وصدق الحدیث واداءالامانة وبرالوالدین وصلة الارحام و......... [۳]

''ہر وہ ظاہری و باطنی قول وعمل جسے اللہ پسند کرتا ہے اور جس سے وہ خوش ہوتا ہے، عبادت ہے جیسے نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، سچا قول، امانت کی ادائیگی، والدین سے حسنِ سلوک صلہ رحم

....

اس مصنف نے دوری اور تقرب میں فرق نہیں رکھا اور خیال کرلیا ہے کہ جو چیز قرب خدا کا سبب ہے وہ اس کی پرستش کا بھی سبب ہے حالانکہ ایسا نہیں وہ امور جو اس کی رضا اور خوشنودی کا سبب ہیں اور اجر و پاداش کے حامل ہیں وہ عبادت شمار ہوئے بغیر بعض اوقات تقرب کا باعث ہیں مثلاً ماں باپ سے نیکی کرنا یا زکوٰۃ و خمس دینا یہ ساری باتیں قرب کا باعث ہیں مگر پرستش نہیں ہیں خدا کی اطاعت بیشک ہیں لیکن ہر اطاعت عبادت نہیں کہلاسکتی۔

---

[۱] ۔تفسیر القرآن الکریم صفحہ ۳۷

[۲] ۔الآءالرحمٰن صفحہ ۵۹

[۳] مجلۃ البحوث الاسلامیہ۔ مشارہ دوم صفحہ ۱۸۷ بحوالہ کتاب ''العبودیۃ'' صفحہ ۳۸

توحید کی دوسری قسمیں

توحید سے متعلق قرآن کی زیادہ تر آیات کا اصرار خدائے واحد کی عبادت پر ہے پھر بھی توحید خداوندی ایک اسی قسم کی توحید تک محدود نہیں۔ توحید کا مختلف زاویوں اور حوالوں سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ توحید درذات۔

۲۔ توحید درصفات

۳۔ توحید درافعال

ان میں سے ہر ایک کی مزید شاخیں ہیں جن پر علم کلام کی کتابوں میں بحث اور تحقیق ہوئی ہے چونکہ اس کیلئے ایک کتاب درکار ہوگی اس لیے ہم توحید کی دوسری اقسام کا بیان دوسرے موقع کیلئے اُٹھا رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں مؤلف نے اپنی مبسوط کتاب ''توحید وشرک ازنظرِ قرآن'' میں توحید سے متعلق تمام مسائل کو قرآنی نقطہ نظر سے واضح کیا ہے جو حضرات چاہیں اس کتاب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

ہم نے توحید کے مختلف اقسام میں سے صرف ''توحید درعبادت'' کو یہاں اس لئے پیش کیا ہے کہ قرآن نے اسی پر زیادہ اصرار کیا ہے دوسری قسموں پر اتنا زور نہیں دیا گیا دنیا پہلے بھی اور آج بھی زیادہ تر اسی شرک میں مبتلا ہے چنانچہ گمان قوی ہے کہ ''الاّ تشرکوا به شیئاً'' سے مراد وہی ''شرک درعبادت'' ہے جو زمانہ جاہلیت کے عربوں اور ہمیشہ ستارے بت پرستوں کو دامن گیر رہا، ''شرک درذات'' یا ''شرک درافعال'' نہیں۔

اس گفتگو میں مناسب تھا کہ ''شرک درعبادت'' کی ایک اور قسم پر بھی جو قرآن میں ''ریاء'' کے نام سے ذکر کی گئی ہے بحث کی جائے اور اس پر تحقیق کی جائے اور ''ریاء'' کے نقصانات کا ذکر کیا جائے۔ یہ بھی مناسب تھا کہ توحید کے معاشرے پر اثرات اور اس کے برعکس شرک کے اخلاقی اور اجتماعی مفاسد پر گفتگو کی جائے مگر طول بحث کے خوف سے ہم دوسرے مباحث کی طرف رجوع کرتے ہیں ان مباحث سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کتاب ''توحید وشرک ازنظر قرآن'' کا ملاحظہ کریں۔ یہ بہت جامع اور مفصل کتاب ہے۔

قرآن کا دائمی منشور

دوسرا اصول

والدین سے
حُسن سلوک

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ (انعام۔151)

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ (انعام ۔ 151)

والدین کی خدمت اوران کیلئے ایثاروجاںثاری سے بڑھ کر دنیامیں کوئی دوسری خدمت اورایثاروقربانی نہیں، دوسرے کیلئے کوئی انسان اس سے بڑھ کرخدمت انجام نہیں دے سکتا۔زندگی کے ابتدائی مراحل میں انسان کی ہستی اوراس کا وجودان دوسر پرستوں کی جانفشانیوں کی مرہون منت ہوتی ہے۔ چنانچہ ضمیر کا تقاضایہ ہے کہ ان سے مہرمحبت سے پیش آیا جائے،ساری زندگی ان کے احترام کوملحوظ رکھنا چاہیئےآج مذہبی معاشروں میں جومحبت اورحسن سلوک والدین اوراولاد کے درمیان نظرآتاہےوہ ہرطورقابلِ تعریف ہے۔ یہ امرمغربی اقوام کیلئے باعث تعجب ہے

مغرب کی سردمہریاں

آج یورپ اورامریکہ میں گھریلوزندگی میں مہرومحبت کے جذبات سرد پڑتے جارہے ہیں اورزندگی مشینی صبح وشام میں تبدیل ہورہی ہے قانونی بلوغ کے بعداولاد ماحول کے تقاضوں کے تقاضوں کےمطابق والدین سے ناطہ توڑ لیتی ہے۔اس بہانے سے کہ نوجوان اپنے پیروں پرکھڑے ہوکرزندگی کی سختیوں کوجھیل سکیں گے۔وہ درحقیقت اپنے مرکز سے دورکردیئے جاتے ہیں۔اس دلیل کانقص واضح ہےان کی فکری صلاحیتوں کی نشوونمااورزندگی کی سختیوں اورتلخیوں کے مقابلے میں ان کوتیارکرنے کیلئے اپنےمحفوظ مرکز سے ان کودورکرنا سودمندنہیں ہوسکتا۔ اور یہ کچھ ہمدردی اورمحبت کےرشتوں کوتوڑکراورخاندانی قربتوں کے ماحول کو پیچھےچھوڑکرحاصل نہیں ہوسکتا۔

آج کے دورمیں مغربی ممالک میں مہرومحبت کی گرم جوشی کے موقوف ہونے سے رشتہ داری زیادہ سے زیاداولادتک محدودرہ گئی ہے باقی رشتہ دارچچاماموں وہاں وغیرہ بےگانے سمجھے جاتے ہیں۔بعض ہوست پرست مائیں اورعیاش باپ عملاً محبت ویگانگت کی عمارت کوتہ وبالاکرکےاپنی کم سن اولادکوبچوں کی دیکھ بھال کےمراکز میں بھیج کراپنے آپ کوان کی پرورش کی پابندیوں سےآزادکرچکے ہیں،نتیجتاً پرمسرت گھریلوماحول ٹھنڈےاورخشک ماحول میں تبدیل ہوچکے ہیں۔

دانش وروں کے مطابق بچوں کی یہ پرورش گاہیں ان کی جسمانی صحت کی توضامن ہوسکتی ہیں۔مگران کی ماں کی آغوش کی گرمی اوربچوں کیلئے باپ کی تڑپ نہیں دے سکتیں۔ایسے بےمہرماحول میں پرورش پاکرجوبچے نکلتے ہیں وہ سخت مزاج بےرحم اورمجرم ہوتے ہیں ظاہرہےاس طریقہ کارسےمعاشرے کی دشواریوں میں اضافہ ہی ہوتاہے۔

ایک ڈاکٹرجس کی بات پربھروسہ کیاجاسکتاہےاورجس نے سالہاسال انگلستان اورامریکہ میں گزارے تھے کہتا تھا کہ مغرب میں ’’بوڑھوں کےگھر‘‘بہت ہی دل سوزمنظرپیش کرتے ہیں۔

مؤلف نے چونکہ اول باریہ بات سنی تھی اس لئے اس کی وضاحت چاہی۔ڈاکٹر نے کہاکہ مغربی ممالک میں آپس میں محبت اورحمدلی کے جذبات سرد پڑجانے کی وجہ سے اولادبلوغت پرپہنچ کروالدین سے الگ زندگی گزارنے کی فکرکرنے لگتی ہے اس طریق زندگی نے کچھ ایساجمود پیداکردیاہے کہ سال ہاسال ماں باپ اپنی اولادکامنہ نہیں دیکھ پاتے وقت گزرنے کے ساتھ یہ لاتعلقی اوردوری بڑھتی جاتی ہے

خصوصاً جب ماں باپ ضعیف ہو کر لاچار اور مجبور ہو جاتے ہیں تو حکومت ان کو ''بوڑھوں کے گھر'' پہنچا دیتی ہے جہاں کچھ منتظم ان کی دیکھ بھال کیلئے مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ان بے چاروں کی یہ زندگی اتنی تلخ ہو جاتی ہے بس اپنی باقی ماندہ زندگی کے دن گنتے رہتے ہیں غیروں کے ہاتھ میں بالکل بے دست و پا اور ان کے رحم و کرم پر اپنے عزیزوں سے دور پڑے رہتے ہیں ایسے ادارے ''بوڑھوں کے کلب'' کہلاتے ہیں۔ اس مہر و محبت کے ختم ہو جانے یا کم ہو جانے کے دو اسباب ہیں:

۱۔ دینی اساس اور مذہبی عقائد کا کمزور ہونا: یہ ماں باپ کے ساتھ تکریم و تعظیم اور مہر و محبت کے فروغ کیلئے بہت بڑا عامل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ آخرت میں ابدی انعامات اور جزاء کے حصول کا بھی باعث ہے۔

۲۔ اولاد کو گھر کے ہمدردانہ اور محبت بھرے ماحول سے نکال کر نرسری اور پھر ہوسٹلوں میں پہنچا دینا: یہ سلسلہ مہر و محبت اور قربتوں کی بنیاد ہی کو کھوکھلا کر ڈالتا ہے۔ اور بچوں کی نشو و نما کو روک دیتا ہے یہ طریقہ زندگی آزادی اور بے راہروی کو فروغ دیتا ہے اور بس افسوس تو یہ ہے کہ یہ طرز فکر مشرق معاشروں میں بھی پیدا ہو رہا ہے۔ یہاں بھی بعض لوگ اندھی تقلید میں اپنے بچوں کو کم عمر میں ہی سے کبھی اس کے اور کبھی اس کے ذمے کر دیتے ہیں یا پھر زبان سیکھنے اور مغربی آداب سیکھنے کیلئے بیرون ملک بھیج دیتے ہیں۔

ایسے ماں باپ کو خود اس کا اندازہ کر لینا چاہیے کہ اگر اولاد یہ کچھ سیکھ بھی لے پھر بھی ان کیلئے کچھ اچھی ثابت نہیں ہوگی اور ایک دن والدین کو ''بوڑھوں کے کلب'' کا رُخ کرنا پڑے گا۔

آیت اللہ بروجردی مرحوم نے اپنی مرجعیت کے زمانے میں ہمبرگ جرمنی میں دریائے السٹر کے کنارے ایک عظیم مسجد بنوائی جو آج بھی اس علاقہ کے مسلمانوں کے کام آ رہی ہے۔ آقائے محقق مرحوم جو جرمنی میں شیعہ علماء کے نمائندے تھے وہاں کا ایک عبرتناک واقعہ بیان کرتے تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشینی زندگی میں انسان خود بھی مشین کی طرح سرد اور بے حس ہو جاتا ہے اور دنیا کی ہر چیز کو خودغرضی اور لالچ کی عینک سے دیکھنے لگتا ہے۔

ان کا بیان ہے کہ جرمنی میں میرے قیام کے زمانے میں میری ایک جرمن پروفیسر سے جان پہچان ہو گئی مسلسل ملاقاتوں میں اس نے اسلام کے اصولوں اور احکامات سے شناسائی حاصل کر لی اور رفتہ رفتہ اسلام سے اس کا گہرا تعلق ہو گیا۔ آخر کار وہ مسلمان ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد ایک مرتبہ اس نے مجھے شہر کے ایک ہسپتال سے ٹیلیفون کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں اس کی عیادت کیلئے گیا وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ دریافت حال پر اس نے بتایا کہ آج میری بیوی مجھے دیکھنے آئی اور جب اس کو پتہ چلا کہ میرا مرض لا علاج ہے تو اس نے مجھے خدا حافظ کہا اور ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر چلی گئی۔ آقائے محقق کا کہنا ہے کہ میں نے یہ صورت حال سن کر اس کو تسلی دی دل جوئی کے الفاظ کہے اور واپس آ گیا۔ چلتے وقت ہسپتال کے دفتر میں پیغام دے آیا کہ یہ مریض مسلمان ہے اگر اس کو کوئی حادثہ پیش آئے تو ہمارے مرکز کو خبر دی جائے کچھ دنوں بعد ہسپتال سے فون آیا کہ اس پروفیسر کا انتقال ہو گیا ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کا جنازہ آپ کے اختیار میں ہے میں چند دوستوں کے ہمراہ ہسپتال گیا اور پروفیسر مرحوم کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہو گیا۔ قبرستان سے نکلا تو ایک نوجوان سے مڈھ بھیڑ ہو گئی جو اپنے باپ کا میت کا خواہاں تھا اور کہتا تھا کہ وہ میرا باپ ہے اس کے جسد خاکی کا میں حقدار ہوں میں نے جواب دیا کہ چونکہ وہ مسلمان تھا اس لئے اس کی آخر رسوم بھی ہم

لوگوں سے متعلق ہیں اس کا عیسائی گرجے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس نوجوان نے نہایت ڈھٹائی سے جواب دیا کہ مجھے باپ کی میت سے صرف اتنا سروکار ہے کہ اس کے ہسپتال کے مردوں میں چیر پھاڑ کے شعبے کو ۶۰ مارک کے عوض فروخت کر چکا ہوں اس لئے اس کا جسدِ خا کی مجھے اس مرکز کے سپرد کرنا ہے تاکہ وہ اس کا دل نکال لیں پھر آپ جنازہ واپس لے جا کر جہاں چاہیئے گا دفن کر دیجئے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ واقعہ سن کر مجھے بے انتہا رنج ہوا اور عبرت ہوئی کہ آپس کے تعلقات اور مہر و محبت کے رشتے اس حد تک کمزور پڑ چکے ہیں کہ بیٹا باپ کی لاش کو چند سکوں کے عوض بیچ دے آپ اس شقی القلبی اور سنگدلی کو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس حکم کے ساتھ رکھ کر پرکھیں جو آپؑ نے اپنے ایک صحابی ابراہیم بن شعیب کو دیا تھا۔

ابراہیم بن شعیب نے کہا کہ میرے والد اس قدر ضعیف ہوگئے ہیں کہ میں ان کی قضائے حاجت کیلئے اپنے کندھوں پر اٹھا کر جاتا ہوں۔ امامؑ نے فرمایا:

تو یہ کام خود ہی انجام دیا کر اور کھانا بھی لقمہ لقمہ کر کے اس کے منہ میں دیا کر یہ کام تیرے لئے جہنم کی آگ سے ڈھال کا کام دے گا[1]

خطرے کا الارم

ایک روزنامے میں شائع ہونے والی یہ خبر خطرے کا الارم ہے:

''ماں کہتی ہے کہ میں نے زندگی کا ایک حصہ خون جگر پی کر اپنے بچوں کو پالا، پوسا اور بڑا کیا اپنے خون اور ہڈیوں کا سرمایہ یک جا کیا۔ یہاں تک کہ ان کی شادی اور بیاہ کیا میں نے کہ اب میں چند دن آرام کا سانس لوں گی۔ مگر وہ اب مجھ سے کہتے ہیں کہ تو بوڑھی ہوگئی ہے ہمارے لئے تو محض دردسر ہے ہم نے کوئی سند لکھ کر نہیں دی ہے کہ آخر عمر تک تیری مصیبت اٹھائیں۔''[2]

بیشک پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ مگر ایسی خبریں بچوں کی تربیت کرنے والے استاد، استانی اور والدین کے لئے اہم ہیں او خطرے کا الارم ہیں۔

---

[1] ۔کافی ج ۲ ص ۱۶۲

[2] ۔رونامہ کیہان تہران ۲۸/ ۷/ ۴۶

قرآن میں والدین کی ملکوتی نشانیاں

قرآن مجید نے والدین کے ملکوتی کوائف کو تصویر کھینچی ہے اور طرح طرح سے ان کے مقام اور مرتبے کو اجاگر کیا ہے ان کا خلاصہ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ قرآن نے چھ آیات میں حکم دیا ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی اور احسان کریں سورہ بقرہ آیت 83 میں **وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا** کہہ کر ''سورۂ نساء آیت 36، سورہ انعام آیت 151 سورہ بنی اسرئیل آیت 23 اور'' **ووصينا الانسان بوالدين حسناً** '' اور ''احسانا!'' کہہ کر سورۂ عنکبوت آیت 8 اور سورۂ احقاف آیت 15 میں یہ بات پیش کی گئی ہے۔

۲۔ سارے آسمانی پیغمبروںؑ کی دعوت کی بنیاد یہ رہی ہے کہ ہم ذات واحد کی عبادت کریں اور اس کے غیر کی پرستش سے پرہیز کریں۔ سارے انسانوں کی نشوونما اور ارتقاء کی ضامن توحید اور یکتا پرستی ہے اور انبیاءؑ کرام کے دوسرے احکام درحقیقت اسی مقدس ہدف و مقصد کی تکمیل کیلئے ہیں۔

والدین کے مقام کے بلند و بالا ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ قرآن تین جگہ توحید کے بعد والدین سے نیکی کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ اس حکم سے اندازہ ہوا ہے کہ خدا کی عبادت کے بعد ان بزرگ سرپرستوں کا احترام اہمیت میں دوسرے درجے پر ہے یعنی اگر خداوند عالم انسان کو پیدا کرنے والا اور خالق و یکتا ہے تو والدین انسان کے وجود کے مربی اور اس کی بیشتر صلاحیتوں اور خوبیوں کی نشوونما کرنے والے ہیں۔ جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

''خدا نے حکم دیا ہے کہ ہم اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور والدین کے ساتھ نیکی کریں۔'' (بنی اسرائیل۔ 23)

یہی بات سورہ بقرہ کی آیت 83 میں بھی کہی گئی ہے۔

۳۔ دو موقعوں پر شرک سے منع کرنے کے بعد یعنی توحید کی طرف متوجہ کر کے، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کا ذکر ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

''خدا کا شریک قرار نہ دو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔'' (نساء۔ 36)

یہی بات سورہ انعام کی آیت 151 میں کہی گئی ہے جو ہماری بحث کا تعین کرتی ہے۔

۴۔قرآن میں والدین کے سیمائے ملکوتی کی تصویر کشی اس طرح ہے کہ خدا کا شکرانہ ادا کرنے اور والدین کا شکریہ ادا کرنے کا یکجا ذکر ہے۔جیسا کہ حکم دیا گیا ہے:

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ

''میرا اور اپنے والدین کا شکر گزار رہ تیری بازگشت میری ہی طرف ہے۔''(لُقمان۔14)

۵۔چند ایک آیات میں خصوصی توجہ دلانے کیلئے حضرت سلیمان اور دوسرے صالح اور نیک افراد کے حوالے سے بیان ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں خدا تعالیٰ سے درخواست کرتے تھے کہ ان کو توفیق عطا فرمائے کہ ان نعمتوں کا شکر ادا کر سکیں جو خود ان اور ان کے والدین کو عطا کی گئی تھیں جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ

''پروردگارا! مجھے طاقت عطا فرما کہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر ارزانی کی ہیں۔''(نمل۔19)

یہی مضمون سورہ احقاف کی آیت 10 میں بھی آیا ہے ایسا معلوم ہوتا کہ اولاد اور والدین میں ایسی یگانگی کارفرما ہے کہ جو نعمت خداوند عالم نے والدین کو عطا کی وہ اس طرح ہے گویا خود بیٹے کو ملی ہو چنانچہ انسان کی ذمہ دری یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے بھی اور اپنے والدین کی طرف سے بھی شکر ادا کرے۔

۶۔اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنی نعمتوں کے ذکر کرتے وقت کہتا ہے کہ وہ ان نعمتوں کو یاد رکھیں جو اس نے ان کو اور ان کے والدہ کو عطا فرمایا۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰي وَالِدَتِكَ

''اس نعمت کو یاد کرو جو ہم نے تم کو اور تمہاری والدہ کو عطا کی ہے۔''(مائدہ۔110)

۷۔قرآن مجید حضرت عیسیٰؑ کی مخلص شخصیت کی نشاندہی کرتے ہوئے اس نکتے کو اجاگر کرتا ہے کہ آپؑ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ خداوند عالم نے آپؑ کو اپنی والدہ کیلئے رؤف اور مہربان کہا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۳۲

''مجھے میری والدہ کے ساتھ نیکی کرنے والا قرار دیا ہے اور سخت گیری نافرمان نہیں بنایا۔''(مریم۔32)

۸۔قرآن یاد دہانی کرواتا ہے کہ والدین سے محبت اور مودت صرف انکی زندگی تک محدود نہیں رہنی چاہیئے بلکہ ان کے انتقال کے بعد

بھی ان کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔ خداوند تعالٰی سے ان کیلئے طلب مغفرت کرتے رہنا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کی زبانی فرمایا گیا ہے:

رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنۡ دَخَلَ بَیۡتِیَ مُؤۡمِنًا

"پروردگارا! بخش دے مجھے میرے والدین کو اور جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ داخل ہو۔" (نوح۔28)

کعبہ کی تعمیر کے بعد حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ نے فرمایا:

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ ﴿۴۱﴾

"پروردگارا! مجھے میرے والدین کو اور مومنین کو روزِ حساب بخش دینا۔" (ابراہیم۔41)

اس مقام پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس کلام کی قدر و قیمت واضح ہوتی ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں کہ:

"والدین کی موت خدمات کے ختم ہونے کا سبب نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ ان کی موت کے بعد بھی ان سے نیکی کرتے رہنا چاہیئے۔ ان کیلئے نماز پڑھنا، روزہ رکھنا اور حج کرنا چاہیئے۔ خدا وہی ثواب جوان کیلئے مقرر کیا ہے، بیٹے کو بھی دے گا۔"

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گرامی نے فرمایا:

"تم میں سے زیادہ نیک وہی ہے جو اپنے ماں باپ سے ان کی موت کے بعد بھی نیکی کرے۔"[1]

۹۔ اس بات کی وضاحت کیلئے کہ والدین سے نیکی اور محبت صرف اس تک محدود نہیں کہ ان کے سامنے مسکراتے رہنا ہے چاہیئے اوان سے صرف میٹھے بول بولنے چاہئیں۔ اگر چہ ان باتوں کی بھی بہت اہمیت ہے قرآن میں واضح طور پر حکم دیا گیا ہے کہ والدین کی زندگی کے بارے میں فکر مند رہا کرو اور مالدار اولاد کو چاہیے کہ وصیت کرے کہ ایک اچھی رقم ان کے والدین کو بھی ملے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنۡ تَرَكَ خَيۡرَا ۖۚ اۨلۡوَصِيَّةُ لِلۡوَالِدَيۡنِ

"اگر مال چھوڑ جائیں تو والدین کیلئے وصیت کریں۔" (بقرہ۔180)

۱۰۔ نہ صرف کچھ رقم کی وصیت کا حکم دیتا ہے بلکہ مال خرچ کرنے کیلئے والدین کے انتخاب کو بہتر قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

قُلۡ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ فَلِلۡوَالِدَيۡنِ

"پوچھتے ہیں کہ راہ خدا میں کیا خرچ کریں کہ کہہ دو کہ ماں باپ پر اپنے مال میں سے خرچ کرو۔" (بقرہ۔215)

---

[1] ۔ سفینۃ البحار ج ۲، ص ۶۸۶

۱۱۔ والدین ضعیفی میں اولاد کی مدد کے سب سے زیادہ محتاج ہوجاتے ہیں اس سن وسال میں ان کی مدد کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ ان حالات میں ان سے سخت سست بات کرنا ان کی تکلیف کا باعث ہوگا۔ وہ تو اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ جس دور میں ان کے قوائے جسمانی جواب دے چکے ان کا مقام اوراحترام بہرحال ملحوظ رہے۔ چنانچہ قرآن ان باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خصوصی حکم دیتا ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا‌ ؕ اِمَّا يَبۡلُغَنَّ عِنۡدَكَ الۡكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوۡ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنۡهَرۡهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوۡلًا كَرِيۡمًا ۝۲۳

''اگران میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے ایسی بات نہ کہہ جو ان کو آزردہ کردے۔ ان سے تند بات نہ کر بلکہ نرمی سے بات کر۔'' (بنی اسرائیل)

۱۲۔ قرآن صرف ان منفی احکام (جیسے تند اور تکلیف دہ بات نہ کرنا) کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ والدین کے مقام وحیثیت کے مطابق اگلی آیت میں ایک مثبت حکم دیتا ہے جو بوڑھے ماں باپ کے دلوں میں سرور اور خوشی پیدکرے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

وَاخۡفِضۡ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارۡحَمۡهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِىۡ صَغِيۡرًا ؕ‏ ۝۲۴

''اپنی محبت کے پروبال ان کیلئے بچھادے اور کہہ: پروردگارا! جس طرح انہوں ے نے میری بچپن سے پرورش کی ہے اپنی رحمت ان پر نازل فرمایا۔'' (بنی اسرائیل)

امام جعفر صادق علیہ السلام ان دو مختلف ذمہ داریوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

''اگر وہ تجھ کو ملول ورنجیدہ کریں تو یہ نہ کہہ میں تم سے ملول اور آزردہ ہوں اگر تجھے دُکھ پہنچائیں تو ان کو ڈرادھمکا نہیں ان سے پرخاش نہ رکھ۔ ان کے بارے میں کہہ دے خدایا! ان کو بخش دے۔''! ان کے ساتھ ملائمت اور نرمی سے بات کر، ان کو کھلی بانہوں سے قبول کر، انکی طرف صرف مہربانی کی نگاہ کر، اپنی آواز ان کی آواز سے بلند نہ کر، اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ اور راہ چلتے ہوئے ان سے آگے نہ ہو۔[1]

---

[1] ۔ تفسیر البرہان ج ۲، صفحہ ۴۱۳

احترام کی حدود

قرآن نے بیشک واضح الفاظ میں والدین کی عظمت واحترام برقرار رکھنے کیلئے ان کی اطاعت وفرماں برداری کی اولاد کو ترغیب دی ہے۔ مگر ایک قابل توجہ نکتہ ایسا بھی ہے، جس کی طرف قرآن نے رہنمائی کی ہے یعنی یہ کہ والدین کیلئے اولاد کی محبت ایسی اندھی نہیں ہونی چاہیے کہ انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ اگر وہ ظالم اور جابر ہوں تو اولاد کو ان کے خلاف حق کی گواہی سے نہیں روکنا چاہیے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ

''اے اہل ایمان! انصاف کو قائم رکھو۔ اللہ کیلئے گواہی دو۔ اگرچہ وہ خود تمہارے یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کے خلاف ہو۔'' (نساء۔135)

اگر ماں باپ شرک وبت پرستی اور جادہ حق سے انحراف کی دعوت دیں تو چاہیے کہ ان کے مقابلے میں مزاحمت کا انداز اختیار کرے، بیٹا ہونا اسے حقیقت کے برعکس راستے پر نہ لے جائے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا

''اگر وہ دونوں کوشش کریں کہ اس چیز کو جس کا تجھے علم نہیں، میرا شریک قرار دیں تو پھر ان کی اطاعت نہ کر۔''[1] (لقمان۔15)

امیر المومنینؑ ایک مختصر سے جملے میں والدین کی محدود اطاعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فحق الوالد علی الولد، ان یطیعه فی کلّ شیءٍ الا فی معصیة الله"[2]

باپ کا بیٹے پر حق یہ ہے کہ وہ اس کی ہر چیز میں اطاعت کرے سوائے ایسے موقعوں پر جو گناہ اور اللہ کی نافرمانی شمار ہوتے ہیں۔''

ایک عیسائی نوجوان اسلام لایا اور مراسم حج کے بعد جناب امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے اپنے گھر کے حالات

---

[1] ۔اس آیت کا مضمون سورہ عنکبوت آیت ۸ میں بھی آیا ہے

[2] ۔اصول کافی ج ۲، صفحہ ۱۶

بیان کیے اور کہا کہ اس کی ماں نابینا ہے۔ امامؑ نے فرمایا:

''اپنی ماں کا خاص خیال رکھ اور اس سے نیکی کا سلوک کیا کر۔ جب وہ انتقال کر جائے تو تو ہی اس کی تجہیز و تکفین کرنا مجھ سے اپنی اس ملاقات کا کسی سے نہ ذکر کرنا۔ یہاں تک کہ منیٰ میں تجھ سے میری دوبارہ ملاقات ہو۔''

نومسلم جوان کہتا ہے کہ جب میں منیٰ میں آیا تو لوگوں نے آپ کو ہر طرف سے گھیر رکھا تھا اور مختلف سوالات کر رہے تھے اور آپ کی کیفیت یہ تھی کہ گویا کوئی چھوٹے بچوں کو درس دے رہا ہو۔ میں کوفے واپس گیا اپنی ماں سے اور زیادہ التفات سے پیش آنے لگا اس کی زیادہ خدمت کرنے لگا۔ اس کو خود کھانا کھلاتا اور اس کے لباس کا خاص خیال رکھتا۔ میری ماں کہنے لگی۔ بیٹا! تو بدل گیا ہے پہلے جب تو ہمارے دین میں تھا تو مجھ سے ایسا عمدہ سلوک نہیں کرتا تھا جس دن سے تو مسلمان ہوا ہے اس قسم کا نیک سلوک کرنے لگا ہے اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے۔ میں نے کہا: پیغمبر کے ایک فرزند نے مجھے ایسا ہی حکم دیا ہے، ماں نے کہا کہ کیا وہ پیغمبر ہے میں نے کہا نہیں وہ فرزند پیغمبر ہیں ماں نے پھر اصرار کیا کہ نہیں وہ پیغمبرؐ ہے کیونکہ پیغمبر ہی اس قسم کے حکم دیا کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ ماں ہمارے پیغمبرؐ کے بعد اب کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ وہ فرزند پیغمبرؐ ہیں وہ کہنے لگی: بیٹا تیرا دین بہتر دین ہے مجھے بھی اس کی تعلیم دے میں نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا تو وہ مسلمان ہوگئی میں نے احکام اسلام اس کو سکھائے وہ نماز ظہر، عصر اور مغرب اور عشاء بجالائی اسی رات وہ بیمار ہوئی کہنے لگی: میرے بیٹے جو کچھ تو نے مجھے سکھایا تھا دوبارہ سنا۔ میں نے پھر سے سب دہرایا وہ خوش و خرم دنیا سے رخصت ہوئی صبح ہوئی تو مسلمان جمع ہوئے اور اس کو غسل دیا۔ میں نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور اس کو سپرد خاک کیا۔[1]

---

[1]۔ بحارالانوار جلد ۶۱ صفحہ ۸۱ (روایت کافی سے منقول ہے)

قرآن کا دائمی منشور

تیسرا اصول

اولاد کو قتل نہ کرو

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ

بھوک کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ ہم تم کو اور ان کو بھی رزق دیتے ہیں۔ (انعام 151)

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ

بھوک کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ ہم تم کو اور ان کو بھی رزق دیتے ہیں۔ (انعام 151)

انسان کے اندر جو نہایت گہرے جذبات اور مہر و محبت کے احساسات پائے جاتے ہیں ان میں سب سے بڑھ کر اولاد کیلئے ماں باپ کے جذبات ہیں۔ والدین کے اپنی اولاد کیلئے جذبات محبت سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی جذبہ نہیں۔

مگر کبھی انسان کی شقی القلب اور سنگدلی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ ایسا نازک اور حقیقی محبت کا جذبہ بھی اس کے اندر دم توڑ دیتا ہے اور اس مہر و محبت کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ معصوم اور بے گناہ بچوں پر بھی وہ رحم نہیں کرتا جو بے چارے اپنا بچاؤ تک نہیں کر سکتے اور وہی فرد جس سے رحم دلی اور محبت کی توقع کی جائے وہ بجائے بچے کی تربیت، پرورش اور ہر قسم کی آفتوں سے بچاؤ کے اپنی انگلیاں اسی معصوم کے نازک گلے میں پیوست کر کے اس کی زندگی ختم کر دیتا ہے یا کنویں میں پھینک دیتا ہے یا منہ بند کر کے اس کا گلا گھونٹ دیتا ہے یا پہاڑ سے نیچے پھینک دیتا یا پانی میں شقی القلبی سے ڈبو دیتا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں عربوں کا یہی طریقہ تھا کہ وہ اپنے جگر گوشوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے تھے اسلام نے اس شرمناک اور دردناک رواج کی شدت سے مخالفت کی اور اس کی جڑ سے اکھاڑنے کیلئے سعی کی جس کے نتیجے میں اس شقی القلبی کی جگہ دوبارہ مہر محبت اور شفقت وحسن سلوک نے لے لی۔

اُس زمانہ میں آج کے سائنسی وسائل نہیں تھے پتہ چل سکے کہ شکم مادر میں بچے کی کیفیت کیا ہے آیا بچہ لڑکا ہوگا یا لڑکی اس لئے وہ انتظار کرتے یہاں تک کہ بچہ تولد ہوتا اور اس کے بعد وہ اپنے ہاتھ اپنے جگر گوشے کے خون سے رنگتے۔ آج ترقی کا دور ہے اس لیے انسان شکم مادر ہی میں بچے کو ختم کر دیتا ہے آج انسان اس بات پر قادر ہے کہ اس کے جگر گوشے کو رحم مادر ہی میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے گوشت کے لوتھڑوں میں دنیا ہی میں لایا جائے۔

آج اور زمانہ جاہلیت کے لوگوں میں صرف یہی ایک فرق نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ علم وصنعت سے مرصع اور مسلح ہو کر آج کا انسان زیادہ شقی القلب اور سنگدل ہو گیا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں تو صرف جاہل باپ اپنا ہاتھ نوزائندہ دختر کے خون سے رنگتا تھا۔ آج تو تعلیم یافتہ مائیں بھی اپنی جبلی مامتا کو بھول کر یہ کام کر رہی ہیں۔

پرانے زمانے میں محض بعض لوگ اور طبقے اس قسم کے اقدامات کے مرتکب ہوتے تھے (ان کے اس اقدام کے اسباب کی تشریح ہم آگے چل کر کریں گے) دوسرے لوگ ان کی مذمت کرتے تھے اور ان کے اس کام کو باعث شرم تصور کرتے تھے۔ مگر آج کے دور میں بعض

رسائل وجرائد اور بعض ادارے پیغایات ونشریات کے ذریعے اس عمل ننگ وعار کی حمایت کرتے ہیں۔ کمزور دلائل کو بنیاد بنا کر اور زمین وآسمان کے قلابے ملا کر اس کو معاشرے کیلئے ضروری اور جائز عمل ثابت کرتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ تاریخ پھر دہرائی جا رہی ہے اور جاہلیت کا دور صنعت اور ٹیکنالوجی کا لبادہ اوڑھ کر دوبارہ پلٹ آیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

محرّک ایک ہے

آج کے خلائی دور کا انسان صرف اسی معاملے میں عہدِ جاہلیت کے ایک آدمی سے ملتا جلتا نہیں بلکہ اور بھی بہت سے پہلوؤں میں دونوں یکساں ہیں۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ بچوں اور رحم مادر میں جنین کے اس قتل کے پیچھے محرک بھی دونوں کے یہاں ایک ہی نظر آتا ہے۔ عرب کے بعض قبائل قحط کے آثار دیکھ کر اپنے بچوں کو بوجھ سمجھتے اور اس وقت یا آیندہ کے فقر وفاقہ سے ڈر کر اپنی اولاد کو زندہ درگور کر دیتے۔ قرآن مجید نے دو موقعوں پر اس سبب کی طرف اشارہ کیا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ

''اپنی اولاد کو قحط اور بھوک کی وجہ سے قتل نہ کر۔ ہم ان کو اور تم کو (دونوں ہی کو) رزق دیتے ہیں''(انعام۔151)

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قحط کے مواقع پر قتل کرتے تھے۔ ایک دوسری آیت سے پتہ چلتا ہے کہ متوقع قحط کے ڈر سے وہ یہ اقدام کرتے تھے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ

''اپنی اولاد کو قحط اور فقر کے خوف سے قتل نہ کرو۔''(بنی اسرائیل۔31)

زمانہ جاہلیت کے عربوں اور موجودہ زمانے میں اسقاط حمل کے طرفداروں میں جو فرق نظر آتا ہے وہ یہ کہ وہ لوگ علم ودانش اور اس کے ذریعے معاشرے کی نشوونما سے نابلد تھے، خصوصاً آبادی کی افزائش کے مضمرات سے وہ نہیں واقف تھے اور صرف اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ موجود یا متوقع فقر وفاقہ سے چھٹکارا ملے۔

مگر آج کا انسان اقتصادی اور معاشی خیر وفلاح اور بین الاقوامی سطح پر حفظان صحت کے اصولوں سے آگاہی رکھ کر بھی اپنے اس عمل کو حق بجانب ٹھہراتا ہے اور کہتا ہے کہ معاشی وسائل اور اجناس کی پیداوار سے زیادہ آبادی بڑھ رہی ہے اس لیئے برتھ کنٹرول کے علاوہ ہمارے پاس چارہ نہیں خواہ یہ اسقاط حمل کے ذریعے سے ہی ممکن ہو۔

یہ لوگ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ یہ پریشانی کوئی نئی نہیں۔ جو مشکل آج خلائی زمانے میں لوگوں کو لاحق ہے وہ مذکورہ بالا آیات کے مطابق زمانہ جاہلیت میں عربوں کو بھی درپیش تھی۔ وہ بھی اپنی اولاد کو فقر وفاقہ اور غلے کی کمی کے خوف سے قتل کرتے تھے حالانکہ آج کے لوگ

اپنے کو عربوں سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب سمجھتے ہیں۔ اگر آبادی کے تیزی سے بڑھنے کی بنا پر اسقاط حمل کی عام اجازت کیلئے شور کیا جاتا ہے تو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ:

۱۔ اگر ہمارے ملک میں جہاں آبادی کا تناسب بیس آدمی فی کلومیٹر ہے اور آبادی کو بڑھنے سے روکنے کیلئے اسقاط حمل کی ضرورت پڑ گئی ہے تو ان ممالک میں جن کی آبادی فی کلومیٹر چار سو سے پانچ سو افراد تک ہے قتل عمد کی چھوٹ دے دینی چاہیے۔

۲۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر اس ملک کے دریاؤں پر بند باندھ دیئے جائیں تو ویران زمینیں آباد ہو جائیں اور ساری زرعی زمینیں خوب غلہ اگلنے لگیں مچھلی کی افزائش کا صحیح بندوبست ہو سکے اور لوگوں کی سطح فکر اور تربیت بہتر ہونے لگے تو رفتہ رفتہ یہ ملک ۱۵ کروڑ انسانوں کی کفالت کر سکتا ہے۔

۳۔ ایران آج بھی افرادی قوت کی کمی سے دو چار ہے کچھ ہی عرصہ پہلے تک تقریباً دس لاکھ آدمی بیرونی ملک سے آ کر یہاں کام کاج میں مشغول تھے اس افرادی قوت میں کمی کے باوجود ہم آبادی بڑھنے کو روکنے کی بات کرتے ہیں۔ درحقیقت ہماری اصلی ضرورت افرادی قوت کی ہے نہ کہ آبادی کم کرنے کی۔ سبھی جانتے ہیں کہ اس ملک میں ڈاکٹروں انجینئروں، اہلِ فنون، ٹیکنیشنز اور کاریگروں کی کمی ہے آج بھی بیرونی ممالک سے ہم ڈاکٹروں اور انجینئروں کو بلاتے ہیں۔

۴۔ ترقی یافتہ ممالک جو ہمارے ملکوں میں آبادی کنٹرول کیلئے اپنے ماہرین کو بھیجتے ہیں بہتر ہے کہ وہ ان کو اس وقت اپنے پاس ہی رکھیں اور جب دوسرے ممالک کی آبادی ان کی آبادی کے نصف تک پہنچ جائے تو پھر ان کیلئے منصوبہ بندی کریں اور پروگرام بنائیں۔

۵۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے جو رقم برتھ کنٹرول پر صرف ہوتی ہے وہ فقیر و نادار خاندانوں کو زندگی کے وسائل فراہم کرنے پر صرف کی جائے۔ انسان کشی کے بجائے یہ رقم غریب اور مفلوک الحال انسانوں کو زندہ رکھنے پر خرچ ہو۔"[1]

زمانہ جاہلیت میں اولاد کے قتل کے دوسرے اسباب

یہ ایک مصدقہ بات ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ قرآن مجید نے اس انسانیت سوز حرکت کی متعدد آیات میں مذمت کی ہے۔ سورۂ تکویر کی آیات 8 اور 9 میں تنبیہ کی گئی ہے کہ قیامت کے دن بے گناہ بچوں کے بارے میں سوال ہوگا کہ وہ کیوں زندہ دفن کر دیئے گئے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝

"جب لڑکی کے بارے میں سوال ہوگا کہ کس گناہ میں قتل کی گئی۔" (سورہ تکویر)

خطبہ قاصعہ میں امیر المومنین علیہ السلام زمانہ جاہلیت کے عربوں کی زندگی کے بارے میں بتائے ہوئے ان کے اس برے کردار کی

---

[1] ۔ عنوان ا سے ۵ تک انقلاب اسلامی سے پہلے کے زمانے سے متعلق ہیں۔

طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں:

من بنات مؤودة واصنام معبودة

"بچیوں کو قتل کرنا اور بتوں کی پرستش ان کا شعار تھا۔"

سوال یہ ہے کہ یہ جاہلانہ رسم کن قبائل میں رائج تھی۔ مورخین کا عمومی خیال یہ ہے کہ قبیلہ بنی تمیم کا ہاتھ یقینی طور پر اپنی اولاد کے خون سے رنگا ہوا تھا کچھ لوگوں کے خیال میں اس مہلک بیماری کے اثرات دوسرے قبائل مثلاً "قیس، اسد، ہذیل، اور بکر بن اوئل" میں بھی سرایت کر چکے تھے۔[1]

قبیلہ بنی تمیم میں اس مذموم حرکت کے رواج پانے کی وجہ یہ تھی کہ اس قبیلے نے ایک بار نعمان بن منذر کو ٹیکس اور خراج نہیں دیا اس کے جواب میں اس نے بنی تمیم کی سرکوبی کیلئے لشکر کشی کی۔ ان کا مال اسباب لوٹا وران کی عورتوں کو قید کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔

کچھ دنوں کے بعد سردار نعمان کو راضی کرنے اس کے پاس پہنچے اور درخواست کی کہ بنی تمیم کے قیدیوں کو جن میں اکثر لڑکیاں تھیں، آزاد کر دے اس نے جواب دیا کہ لڑکیوں کو اختیار ہے چاہے یہاں رہیں چاہے اپنے گھروں کو جائیں۔ ساری لڑکیوں نے اپنے قبیلے میں واپس جانے پر آمادگی ظاہر کی سوائے قیس بن عاصم کی بیٹی نے اس نے قید کرنے والوں کے پاس رہنا پسند کیا اور باپ کے ساتھ نہیں گئی۔ یہ بات قیس پر بہت گراں گزری۔ چنانچہ اس نے عہد کیا کہ اس کے بعد اگر اس کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تو وہ اس کو زندہ نہ چھوڑے گا اور پیدا ہوتے ہی اس کا خاتمہ کر دے گا۔[2] اس واقعے کے بعد اس نے اپنی پوری زندگی میں سترہ لڑکیوں کو زندہ درگور کیا اس کا یہ عمل دوسرے قبائل کیلئے بھی نمونہ بن گیا۔

قیس اور اس جیسے دوسرے افراد کے اس اقدام کا سبب جھوٹی غیرت تھی۔ آلوسی [3] کے بقول غیرت کا ان کو اس قدر شدید احساس تھا کہ کہیں لڑکیوں کی وجہ سے ان کو شرمندہ نہ ہونا پڑے ان کی لڑکیاں نامناسب اور پست طبقے کے افراد سے بیاہی گئی تو ان کی نظر نیچی نہ ہوں اس لئے وہ پیدا ہوتے ہی اپنی لڑکیوں کو مار ڈالتے اور بے بنیاد غیرت کو سبب بنا کر ایک انسان کے قتل کے مرتکب ہوتے۔

خلائی دور تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے

افسوس کی بات یہ ہے کہ خلائی دور کا انسان جو بظاہر اسقاطِ حمل اور برتھ کنٹرول کا حامی ہے دراصل غیر شرعی جنسی روابط کو آزادی کی خاطر اسقاطِ کو قانونی کا تحفظ دے رہا ہے۔ اس طرح کچھ لوگوں کو کچھ انسانوں کی جان و ناموس پر اور بے گناہ بچوں پر تسلط دے دیا گیا ہے اس

---

[1] ۔ شرح ابن ابی حدید ج ا صفحہ ۱۴۷

[2] ۔ شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۳، ص ۱۷۵

[3] ۔ "بلوغ الارب فی معرفة احوال العرب" (ج ۳ ص ۴۲) تالیف: محمود شکری آلوسی بغدادی۔

خلاف عقل عمل کی توجیہ اس طرح کی جاتی ہے کہ چونکہ کچھ لڑکیاں اور بے شوہر عورتیں غفلت میں حاملہ ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا خاندانی عزت کے تحفظ کیلئے ایسی حاملہ عورتوں کو قانون کی سرپرستی دی گئی ہے۔

اس منطق میں بات صرف اتنی سی ہے کہ چند بے راہ رو عورتوں کی آبرو کی حفاظت کیلئے ہم قتل نفس اور اسقاط حمل کے مرتکب ہوتے رہیں۔ جب کہ قرآن کی نگاہ میں ایک کا انسان کا قتل تمام انسانوں کے قتل کے برابر ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ

''جب کوئی کسی کو بغیر اس کے کہ وہ قتلِ نفس یا دفساد فی الارض کا مرتکب ہوا ہو قتل کردے تو ایسا ہے گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کیا ہے۔'' (مائدہ۔32)

حیرت ایسے لوگوں پر ہے جو اس انسان دشمن حرکت کی حمایت کرتے ہوئے یا وہ گوئی سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''دنیا کے کونے کونے میں فطرت اس قدر غیر مطلوب بچے پیدا کرتی ہے کہ اگر صحت مند ماحول اور قانونی تحفظ فراہم نہ کیا جائے تو یہ طے ہے کہ یہ افزائش مخفی غیر صحت مندانہ اور غیر قانونی طور سے ہوگی۔''

یہ بات صحیح ہے کہ انسانی شرف کی حفاظت ہونی چاہیے مگر کیا قتل نفس کی قیمت پر اور ایک بے گناہ بچہ اس طبیب کے ہاتھ مارا جائے جس کو معاشرے کی سلامتی اور صحت کا ضامن سمجھا جاتا ہے۔

یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ کہا جائے کہ چونکہ معاشرے کے بعض لوگ نشہ آور اشیاء کے عادی ہیں اور ان کے پاس یہ نشہ آور چیزیں جو چھپے چوری رہتی ہیں وہ صحت عامہ کے اصول کے مطابق نہیں الہٰذا افیون اور ہیروئن کی خرید و فروخت کو آزاد کر دینا چاہیے تا کہ ہیروئن کی فروخت قانونی اور صحت عامہ کے مطابق ممکن ہو سکے۔

لڑکیوں کے قتل کا ایک دوسرا سبب

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لڑکیوں کو اس لئے بھی مار ڈالتے تھے کہ ان کو بیٹی والا کہے جانے سے نفرت تھی، قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمۡ بِالۡاُنۡثٰى ظَلَّ وَجۡهُهٗ مُسۡوَدًّا وَّهُوَ كَظِيۡمٌ ۚ‏ ﴿۵۸﴾

جب ان میں سے کسی کے یہاں لڑکی (پیدا ہونے) کی خبر دیں تو اس کا چہرسیاہ ہو جاتا ہے اور غصے سے بے چین ہو جاتا ہے۔'' (نحل)

يَتَوَارٰى مِنَ الۡقَوۡمِ مِنۡ سُوۡۤءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمۡسِكُهٗ عَلٰى هُوۡنٍ اَمۡ يَدُسُّهٗ فِى

التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''اس بُری خبر کی وجہ سے وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (وہ سوچتا ہے) کہ کیا ذلت کے باوجود وہ اسے رہنے دے یا اسے مٹی میں دفن کر دے۔ سُن لو وہ کیسا بُرا فیصلہ کرتے ہیں۔ (نحل)

یہ آیت ایک خاص سبب کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ یہ کہ کچھ قبائل ایسے بھی تھے جو اپنے یہاں لڑکی کی پیدائش اور موجودگی کو باعث شرم سمجھتے تھے جب ان کو خبر دی جاتی کہ تمہارے یہاں بچی پیدا ہوئی ہے تو وہ اس کو زندہ درگور کرنے کی فکر کرنے لگتے

صعصعہ بن ناجیہ (مشہور شاعر فرزدق کا دادا) اصحاب پیغمبرؐ میں سے تھا ایک دن آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اے پیغمبرؐ خدا! میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک نیک کام انجام دیا تھا شاید وہ اس وقت میرے کام آئے۔ ایک دن میرے دو اونٹ گم ہوئے ان کی تلاش میں میں ایک بیابان کی طرف نکل گیا وہاں ایک گھر دیکھا پہنچا تو دیکھا کہ ایک بڑی عمر کا شخص اس گھر کے دروازے پر بیٹھا ہے میں نے اس سے اپنے اونٹوں کا پتہ پوچھا اس نے علامت پوچھی میں نے بتایا کہ میثم نبی دارم کے قبیلے کے اونٹوں کا نشان ان پر ہے اس نے کہا یہ دونوں اونٹ میرے پاس ہیں۔ اسی دوران ایک بڑھیا گھر کے اندر سے نکل کر آئی اس شخص نے فوراً اس سے پوچھا کی میری بیوی کے یہاں کیا ولادت ہوئی ہے اگر لڑکا ہے تو رہنے دوگا اور اگر لڑکی ہوگی تو زمین میں دفن کر دونگا۔ اس بڑھیا نے جواب میں کہا کہ لڑکی ہوئی ہے یہ سن کر مجھ پر رقت طاری ہوگئی اور اس کی زندگی بچانے کی فکر کرنے لگا میں نے اس شخص سے دریافت کیا کہ کیا یہ لڑکی میرے ہاتھ بیچو گے؟ اس نے جواب دیا کہ کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ انسان اپنی اولاد کو بیچے اور کیا کسی عرب کو اپنی لڑکی بیچتے دیکھا ہے میں نے کہا کہ میں اس بچی کو آگے بیچنے کیلئے نہیں خرید رہا۔ بلکہ مقصود اس کی جان بچانا ہے۔ آخر کار میں اس کی بچی کو اپنے دو گم شدہ اونٹوں (جو اس کے پاس پہلے سے موجود تھے) اور اپنے سواری کے اونٹ کے عوض خرید لیا اس شرط پر کہ وہ مجھے اونٹ پر گھر تک پہنچا دے اس دن سے آج تک میں نے قیمت دے کر 280 بچیاں خریدی ہیں اور ان کو قتل ہونے سے بچالیا ہے۔ [۱]

فرزدق شاعر اپنے خاندان کی تعریف و مدح میں اور اپنے دادا کے اس عمل پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے:

ومنا الّذی منع الوائدین

واحیا الوئید فلم توئد [۲]

''ہم میں سے ہے وہ جس نے لڑکیوں کے قتل کو منع کیا اور جو لڑکیاں موت کے در پر کھڑی تھی ں

[۱] ۔بلوغ الراب نے ج ۳ ص ۴۶ پر اس تعداد کو ۳۶۰ اور صفحہ ۴۵ پر ۹۶ بیان کیا ہے زمانہ جاہلیت کے عربوں کے وسائل کو نظر میں رکھتے ہوئے آخری تعداد (۹۶) زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

[۲] شرح ابن ابی الحدید ج ۱۳ صفحہ ۱۷۶ تا ۱۷۷

ان کو زندگی بخشی۔''

زمانہ جاہلیت میں تو ایک ایسا نیک شخص پیدا ہوا تھا جو اپنے پس انداز مال سے بے گناہ بچوں کی جان خریدے کیا آج کی تکنیکی دور میں جب انسان فطرت کے وسائل کو زیر نگیں کر چکا ہے۔ایسے رحمدل لوگ ہیں جو بے گناہ اور معصوم بچوں کو قتل ہونے سے بچائیں اور ایسے بچوں کی پرورش کا بندوبست کریں تا کہ ایسی عورتوں کی عزت بھی محفوظ رہ جائے اور معصوم بچوں کی جان بھی انسان دشمنوں کی دست بُرد سے بچ جائے۔

اولاد کے قتل کی چوتھی وجہ

اولاد کو قتل کرنے کا ایک سبب اور بھی تھا وہ منت مانتے تھے کہ اگر ان کی اولاد کی تعداد اتنی ہوگئی اور ان کی فلاں حاجت پوری ہوئی تو اپنے ایک بیٹے کو بتوں کے سامنے قربان کریں گے۔مندرجہ ذیل آیت میں اسی طرف اشارہ ہے:

قَدۡ خَسِرَ الَّذِيۡنَ قَتَلُوۡۤا اَوۡلَادَهُمۡ سَفَهًۢا بِغَيۡرِ عِلۡمٍ

''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو حماقت اور کم علمی کی بناء پر قتل کیا ہے، خسارے میں ہیں۔(انعام۔140)

اور یہ بھی فرمایا گیا ہے:

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيۡرٍ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ قَتۡلَ اَوۡلَادِهِمۡ شُرَكَآؤُهُمۡ لِيُرۡدُوۡهُمۡ وَلِيَلۡبِسُوۡا عَلَيۡهِمۡ دِيۡنَهُمۡ ؕ

''اوراسی طرح بہت سے مشرکوں کیلئے ان کے شریکوں نے ان کی اپنی اولاد کے قتل کو ان کی نظروں میں اچھا قرار دیا تا کہ وہ ان کو ہلاک کردیں اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ بنادیں۔''(انعام۔137)

پیغمبر اکرمؐ نے قریش کی عورتوں سے جو بیعت اور عہدو پیمان لیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات عورتیں بھی اس قسم کے گناہ سے اپنا ہاتھ آلودہ کر لیتی تھیں۔جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

اِذَا جَآءَكَ الۡمُؤۡمِنٰتُ يُبَايِعۡنَكَ عَلٰٓى اَنۡ لَّا يُشۡرِكۡنَ بِاللّٰهِ شَيۡـًٔا وَّلَا يَسۡرِقۡنَ وَلَا يَزۡنِيۡنَ وَلَا يَقۡتُلۡنَ اَوۡلَادَهُنَّ

''جب ایمان لانے والی عورتیں آپ کے پاس آئیں تو وہ آپ کی بیعت ان باتوں پر کریں کہ وہ

خدا کیلئے شریک کی قائل نہیں ہوں گی چوری نہیں کریں گے، زنا و بدکاری نہیں کریں گے اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے............'' (ممتحنہ۔12)

مگر یہ واضح نہیں ہے کہ ان کے اپنی اولاد کے قتل کرنے کا سبب کیا تھا۔

اولاد کے یوں قتل کے بارے میں تاریخ میں بہت سے قصے بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک داستان ہم نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مسلمان شاعرہ کے کچھ اشعار جو ماؤں کی اصلاح کیلئے کہے گئے ہیں، پیش کر کے اس بحث کو ختم کریں گے۔

جزیرہ نمائے عرب میں اسلام پھیلنے کے بعد قیس بن عاصم بارگاہ نبوت میں حاضر تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے عربوں میں لڑکیوں کو قتل کا رواج دیا تھا۔ ایک انصاری نے لڑکیوں کی اس صورت حال کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا کہ میں نے اپنی تمام بیٹیوں کو زندہ دفن کیا، مگر اس بارے میں آج تک مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بجز ایک دفعہ جب میں سفر میں تھا۔ میری بیوی حاملہ تھی میرا سفر طویل تھا اس دوران میں وضع حمل ہوا اور لڑکی پیدا ہوئی میرے خوف سے اس نے اس بچی کو اپنی بہن کے حوالے کر دیا جب میں سفر سے واپس آیا تو بیوی نے بتایا کہ خدا نے ہمیں لڑکی دی تھی مگر وہ مردہ پیدا ہوئی تھی۔ میں خوش ہوا کہ چلو اس دفعہ میرا ہاتھ میری اولاد کے خون سے آلودہ نہیں ہوا۔

کچھ عرصے کے بعد ایک دن میں گھر پر تھا کہ اچانک لڑکی گھر میں داخل ہوئی جو بہت خوبصورت اور ملیح تھی۔ اس کی چوٹیاں گندھی ہوئی تھیں اور گلو بند پہنا ہوا تھا۔ میں نے بیوی سے جب پوچھا کہ یہ لڑکی کون ہے تو اس نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو تمہارے سفر کے دوران پیدا ہوئی تھی، خوف سے میں نے اس کو اپنی بہن کے حوالے کر دیا تھا میں خاموش رہا بیوی کا یہ تاثر ملا کہ میں اس کے گھر میں رہنے پر راضی ہوں اور اب اس بچی کو کچھ نہیں کہوں گا۔ اور اس ذلت کو برداشت کر لوں گا۔

جب بیوی گھر سے باہر کہیں گئی تو میں نے نعمان بن منذر سے اپنے عہد و پیمان کی بناء پر اپنی لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے دور ایک جگہ لے گیا اور زمین میں گڑھا کھودنا شروع کیا۔ اس دوران میں میری بیٹی بار بار اس گڑھا کھودنے کے بارے میں پوچھتی رہی جب میں نے گڑھا کھود لیا تو اس کو پکڑ کر گڑھے میں لٹا کر مٹی ڈال دی وہ چیختی چلاتی رہی مگر میں نے اس کے دلخراش نالوں پر کان نہ دھرا۔ وہ مجھے پکارتی رہی اور فریاد کرتی رہی، بابا جان! کیوں مجھ پر مٹی ڈال رہے ہو مگر میں نے ہاتھ نہیں روکا اور اس کو مٹی کے نیچے دبا دیا۔ یہی وہ پہلا موقع تھا جب میرا دل اپنی اس لڑکی کی حالت پر رو دیا۔

قیس کی یہ داستان ختم ہوئی تو پیغمبرؐ اکرم کی آنکھیں یہ دلدوز سرگزشت سن کر آبدیدہ ہو چکی تھی۔ آپ نے فرمایا:

انّ ھذہ لقسوۃ ومن لا یرحم لا یرحم

''یقیناً یہ بڑی سنگدلی ہے جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جا سکتا۔''

یہاں مناسب ہے کہ ایک مسلم خاتون کا وہ منظوم پیغام جوان ماؤں کے نام ہے جو ایسے جرم کی مرتکب ہوتی ہیں قارئین کرام کے سامنے پیش کروں:

میراپیام ماؤں تک پہنچادو

به‌خواب آمد مرا طفل جنینی — به گفتار مادرم را گر ببینی
به‌گو مادر خطا از من چه دیدی — که بی جرمم بخونم درکشیدی؟
درونت کودکی آرام بودم — کجا محکوم بر اعدام، بودم؟
به‌خونم چنگ وندان تیز کردی — زخون، دامان خودلبریز کردی
به‌دم تا فزه رسیده میهمانت — نه آسیبی رسیدا فزمن به جانت
به‌مهمان بایدت مهمان نوازی — به بی رحمانج اس نابودسازی
تو فکر خرج ذبرحم رانمودی — زجسم کوچکی جان درربودی!
مرا، روزی، به‌همر بود، ماور — دلی افسوس تمودی تو باور
تو گردش را به‌من ترجیح دادی — اساس ظلم در عالم نهادی
امید کودکاں بر مام باشد — چو مادر باشدش آرام باشد
امیدم بود ردیت را ببینم — گل از گلـس حسنت بچینم
دلم می‌خواست به‌پستانت زنم چنک — غمت بیرون نمائم از دل تنگ
دلم می‌خواست از شیرت نبوشم — صدای مادرم آید به‌گوشم!
امیدم بودلت خندم ببینی — کنار تخت خوابم خوش نشینی
امیدم به‌دبستانم فرستی — دهی تعلیم، درس حق پرستی
بیایم از در دشادت نمایم — سرود کودکان بهرت سرایم
امیدم بود کردم من جوانی — زمان پیریت قدرم بدانی
من اینک روح پاکم درجنان است — مکانم در جوار احوریان است
کنون کن توبه، استغفار، شاید — خدای مهربانی رحمت نماید
تمنادارد اافسرارتوانی — پیامم را به‌مادر هارسانی

نظم کا ترجمہ

خواب میں شکم مادر سے اسقاط شدہ بچہ میرے پاس آیا

اور کہا کہ اگر تم میری ماں سے ملو

تو اس سے کہنا کہ اے مادر! میری کونسی خطا تم نے دیکھی

کہ بے جرم وخطا میرا خون کر دیا

تیرے اندر میں ساکن بچہ تھا۔

کب میرے قتل کا حکم جاری ہوا تھا۔

میرے خون سے توں نے اپنے پنجے اور دانت تیز کئے

اور خون سے اپنے دامن کو تر کیا

میں نیا نیا تمہارے یہاں مہمان آیا تھا

تم کو مجھ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی

مہمان کیتو مہمان نوازی کرنی چاہیئے

نہ کہ بے رحمی سے اس کو ختم کر دینا چاہیئے

تم نے مجھ پر خرچ وغیرہ کا خیال کیا۔

اور میرے چھوٹے سے جسم سے روح نکال دی

اے ماں! میری روزی تو میرے اپنے ساتھ تھی

مگر تم نے اس پر یقین نہیں کیا

تم نے سیر وتفسر یح کو مجھ پر ترجیح دی

اور دنیا میں ظلم کی بنیاد رکھی

بچوں کی امید اور آرزو تو ماں ہوتی ہے

جب ماں ان کے پاس ہو تو ان کو سکون اور آرام ملتا ہے

مجھے امید تھی کہ تمہارے چہرے کی زیارت کر دوں۔

اور تمہارے حسن کے گلشن سے پھول چنوں

میں چاہتا تھا کہ تمہارے پستان کو اپنے ہاتھوں میں لوں

اور تمہارے غمگین دل سے غم والم دور کروں

میرا دل چاہتا تھا کہ تمہارا دودھ پیوں

اور ماں کی شیریں آواز میرے کانوں میں آئے۔

مجھے امید تھی کہ مجھے ہنستا ہوا دیکھو گی

اور میرے جھولے کے پاس تم خوش خوش بیٹھو گی

مجھے توقع تھی کہ تم مجھے سکول بھیجو گی

اور حق پرستی کا مجھ کو درس دو گی

جب میں سکول سے واپس آؤں گا تو تم خوش ہو گی۔

اور میں بچوں کا نغمہ تم کو سناؤں گا۔

مجھے امید تھی کہ میں جوان ہوں گا

اور تم اپنے بڑھاپے میں میری قدر و منزلت کو پہچانو گی

تمہارے بڑھاپے میں میں تمہارا غم خوار ہوں گا۔

ہر کام میں تمہارا مدد گار رہوں گا۔

اب میری پاک روح جنت میں ہے۔

میری جگہ حوروں کے جوار میں ہے

اب تم توبہ واستغفار کرو کہ شاید

خدائے مہربان تم پر رحم کرے

اے افسرؔ میری تمنا ہے کہ

ہو سکے تو میرا پیغام ماؤں تک پہنچادو۔

ایک توجہ طلب بات

سورہ ممتحنہ میں اللہ تعالیٰ پیغمبرؐ اکرم کو حکم دیتا ہے کہ آپ آیت میں پیش کی گئیں تفصیلات کے مطابق عورتوں سے بیعت لیں اور وہ یہ کہ:

اَنۡ لَّا یُشۡرِکۡنَ بِاللّٰہِ شَیۡـًٔا وَّلَا یَسۡرِقۡنَ وَلَا یَزۡنِیۡنَ وَلَا یَقۡتُلۡنَ اَوۡلَادَھُنَّ

''کسی چیز کو خدا کا شریک نہ ٹھہرائیں چوری نہ کریں بدکاری نہ کریں اور اپنی اولاد کو قتل نہ کریں۔'' (ممتحنہ۔12)

ایک سوال یہاں ذہن میں ابھرتا ہے کہ اگر مرد اولاد کے قتل کے مرتکب ہوتے تھے تو پھر پیغمبرؐ اکرم عورتوں سے اس کی بیعت کیوں لیں کہ وہ اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔

اس کا جوب یہ ہے کہ اولاد کا قتل زندہ در گور کرنے کی شکل مین جس کو عربی زبان میں ''وأد'' کہتے ہیں مردوں کے ساتھ مخصوص تھا مگر یہ فعل اسقاطِ حمل کی صورت میں عورتوں کے ہاتھوں بھی ہوتا تھا۔ ممکن ہے شاذ و نادر سہی مگر پہلی شکل میں بھی یہ کام عورتوں میں رائج ہو اسی لئے عورتوں سے اس قسم کی بیعت لی گئی۔[1]

---

[1] ۔کشاف ج ۳، صفحہ ۲۳۳۔ مجمع البیان، ج ۵ صفحہ ۲۷۵

قرآن کا دائمی منشور

چوتھا اصول

جنسی بے راہ روی کے خلاف جہاد

وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ ۚ

بُرے کاموں کے نزدیک نہ جاؤ خواہ ظاہر ہوں یا مخفی۔

(الانعام۔151)

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ

بُرے کاموں کے نزدیک نہ جاؤ خواہ ظاہر ہوں یا مخفی۔

(الانعام۔151)

جنسی جبلت ان مسئلوں میں سے ایک ہے کہ جن کے بارے میں جس قدر بحث اور گفتگو کی جائے بلکہ سیمینار منعقد کیے جائیں، اتنا ہی نوجوان نسل کیلئے مفید اور کارآمد ہوں گے اور معاشرے کو تنزلی اور بے راہ روی سے بچائیں گے۔ آج کے دور مین جن مسائل سے ہم دو چار ہیں ان میں سے ایک ہمارے جوانوں کی عفت اور پاکدامنی کی حفاظت کا مسئلہ بھی ہے۔ دراصل ہمارے نوجوان ایک ایسے ماحول میں سانس لے رہے ہیں جہاں جنسی جنون اور جنسی دیوانگی دن بدن بڑھ رہی ہے یہ بیماری مغرب سے ہمارے مشرقی ممالک میں بہت سرعت سے پھیل رہی ہے۔

مغرب نے عورتوں کو ''آزادی نسواں'' کے بہانے سرکار اور قانونی طور سے جنسی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔ عورتوں کی شخصیت اور اس کی قدر و قیمت کو جنس تک محدود کر دیا گیا ہے۔ یورپ والے عورت سے محض جنسی لذت مانگتے ہیں اور بس باقی ساری باتیں حیلے اور بہانے ہیں۔ ہماری بات کہاں تک صحیح ہے اس کا اندازہ ان عہدوں اور کام کی نوعیت سے ہوسکتا ہے جو مغرب نے عورت کو سونپ رکھے ہیں۔

ان قلیل تعداد عورتوں کی طرف نظر نہ کریں، جنہوں نے شرف انسانیت کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے وہ کوئی کام اور ملازمت اپنی حیثیت اور شخصیت کے برخلاف قبول نہیں کرتیں، بلکہ گھر پر رہ کر بچوں کی تربیت پر توجہ مرکوز کرنا بہتر سمجھتی ہیں اپنے لیے گرے ہوئے کام ان کو پسند نہیں۔

ان معدودے چند عورتوں کو چھوڑ کے مغرب نے عورتوں کیلئے جو کام مخصوص کیے ہیں وہ فلموں میں اداکاری ، ہوائی جہازوں میں ہوٹلوں میں ہوسٹس کے کام فیشن شو میں لباس کی تراش خراش کی نمائش، ماڈلنگ اور مختلف صنعتی مصنوعات کے اشتہارات کی زینت بننا اور بس ان پیشوں نے ان کی شرافت اور عفت و پاکدامنی کو تباہ کر دیا ہے۔ عورتوں کو اپنی منزلت سے اس قدر گرا دیا گیا ہے کہ وہ محض اپنے جسم کی نمائش اور خوبصورتی اور حُسن کے ذریعے دوسروں کیلئے روپے کماتی ہے اور ان کی تجارت میں ترقی اور افزائش کیلئے استعما ہوتی ہے۔

آج بے چارہ نوجوان ایسے ماحول میں زندگی گذار رہا ہے جہاں در و دیوار سے جنسی تحریکات کی بارش ہوتی ہے بھانت بھانت کے محرکات اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور جنسی خواہش کو ابھارنے کیلئے ہر وقت مستعد ہیں سینما اور ٹی وی کی رنگ برنگی فلمیں قسم قسم کی ترغیب دینے والی مطبوعات اور رسالے، کام کاج کے دوران نیم برہنہ عورتوں کی موجودگی ساحل سمندر پر عورتوں کی برہنگی، شراب خانے ، نائٹ کلب اور ایسے بیسیوں مظاہر ہمہ وقت موجود ہیں جو نوجوانوں کو جنسی جنوں کی طرف دھکیلتے رہتے ہیں میں اور معصوم نوجوان مرد اور عورت کے دلوں میں بدکاری اور بے راہ روی کی چٹکیاں لیتے رہتے ہیں۔

اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے

آج جب خدا تعالیٰ نے ایران کی مستضعف اور مجبور و محروم ملت پر اپنا احسان و کرم کیا کہ ان کو اس طاغوتی حکومت کے مقابلے میں کامیاب کیا جو ہمہ وقت جوانوں میں جنسی فساد پھیلانے کے نت نئے حیلے بہانے وضع کرتی رہتی تھی اور ایک بے مثال ریفرنڈم کے ذریعے جمہوری اسلامی حکومت وجود میں آ گئی ہے اس کامیابی کے جلو میں اس حکومتِ اسلامی کی ذمہ داری ہے کہ وہ فسادِ اخلاق کے عوامل کے خلاف ایک مقدس اور ہمہ گیر جہاد شروع کرے اور اس کام کیلئے جرائد و مطبوعات، ریڈیو ٹیلیویژن، ثقافت و ہنر، خطیبوں، واعظوں، ادیبوں اور مقرروں اور دیگر اصلاحی ذرائع سے مدد لے۔

ہماری جمہوری اسلامی حکومت کو یہ فسادِ اخلاق ورثے میں ملا ہے جو دانستہ گھروں کے اندر نفوذ کر چکا تھا گھر اور گھریلو زندگی کی بنیادوں کو اس نے ہلا ڈالا تھا، یہاں تک کہ پچھلی قابلِ نفرت حکومت کے دور میں ہر ایک شادی کے مقابلے میں ایک طلاق ہوا کرتی تھی یعنی ۵۰ فی صد شادیاں طلاق پر ختم ہوتی تھیں بلکہ طلاق کا قومی گراف اوپر کی طرف رواں تھا۔

اُس دور میں امریکی سی آئی اے کی سرپرستی میں بعض بیرونی ایجنٹوں نے ایک پروگرام جنسی تربیت کا بھی سکولوں کالجوں اور دیگر علمی اور فنی مراکز میں شروع کر دیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا جال تھا جس میں جوانوں کو پھانسا گیا تھا کہ ان کی عفت اور پاک دامنی کے ساتھ کھیلا جائے اور کم عمری میں ان کو جنسی اور اخلاقی فساد میں اس قدر ملوث کر دیا جائے کہ وہ نہ کسی اور رخ پر سوچ سکیں اور نہ کسی اور کام کے رہ سکیں۔ اس قابل نہ رہیں کہ وہ داخلی اور خارجی عوام جو ایرانی معاشرے کو برباد کرنے کے درپے تھے ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں اور ان کا مقابلہ کریں۔ بلکہ وہ اسی جنسی پروگرام میں منہمک رہیں دوسری طرف استعمار آزادانہ اپنے کام کیے جائے اسی سے پوچھنے والا کوئی نہ ہو۔

فحاشی اور بدکاری اگر کسی معاشرے میں داخل ہوجاتی ہے تو دیمک کی طرف اندر ہی اندر اور رفتہ رفتہ اس کی تہذیب وتمدن کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ وہ معاشرہ تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے۔ آپ اطمینان رکھیں مغرب کی یہ مشینی تہذیب جو فساد جنسی میں آج غرق ہے اندر سے کھوکھلی اور بوسیدہ ہو کر ایک دن نیست ونود ہو جائے گی۔

فحاشی اور عریانی کا یہ سیلاب نہ صرف یہ کہ نوجوانوں کو اپنے ملک کے سیاسی اور دیگر بنیادی مسائل سے دور رکھتا ہے اور ان سے ان کو بے پرواہ کر دیتا ہے، بلکہ معاشرے میں ازدواج اور شادی بیاہ کی رسم کی کمی کا بھی سبب بن جاتا ہے۔ نوجوانی کی عمر میں شادی کیلئے لڑکے لڑکیاں جنسی ملاپ کیلئے مائل ہوتے ہیں اور جنسی قربتیں ہی اس کا محرک بنتی ہیں۔ بعد میں اولاد کی پیدائش اور خاندان کی تشکیل اسی جنسی قربت کا نتیجہ ہوتی ہے دونوں میاں بیوی کی توجہ کا مرکز اولاد اور گھر بن جاتے ہیں، شروع میں اولاد اور گھر مدنظر نہیں ہوتے۔

اب اگر ایک جوان لڑکا با آسانی لڑکیوں سے جنسی ملاپ کر سکتا ہے تو وہ یہ سستا نسخہ چھوڑ کر شادی بیاہ اور اس کی ذمہ داریوں کے جھمیلے میں کیوں پڑے، چنانچہ فحاشی اور عریانی کا پھیلاؤ بھی معاشرے میں شادی کی کمی کا باعث ہے۔

حکومتِ اسلامی کی ذمہ داری

ایران کی حکومت اسلامی کو جو الطاف الٰہی کے سایہ میں اور ملت ایران کے عزم و استقلال کے نتیجے میں روز بروز اور زیادہ مستحکم ہو رہی ہے، چاہیے کہ پچھلی قابلِ نفرت حکومت جو کچھ آلودگیاں چھوڑ گئی ہے اس سے معاشرے اور ماحول کو پاک کرنے کیلئے مندرجہ ذیل تجاویز پر غور کرے۔

ا۔ فساد کے ایجنٹوں اور مراکز سے جنگ

اس راستے میں پہلا اقدام یہ ہونا چاہیے کہ جنسی فساد کے تمام عوامل اور اس کے مراکز کے خلاف جنگ کی جائے ہر اس عامل اور سبب کو ممنوع قرار دیا جائے جو نوجوانوں کو بے راہ روی اور جنسی معاملات میں ملوث کیے رہتا ہے۔ نوجوانوں کی زندگی کے گلشن سے ہر نوع کی خودرو گھاس کو اکھاڑ پھینکنے کیلئے ایک صحیح اور موثر پروگرام ضروری ہے اس کا انتظام ایک علمی اقتصادی اور فنی کمیٹی کے ہاتھوں میں ہو جو اپنے پروگرام کو نافذ بھی کر سکے۔ اگر مناسب پروگرام بنائے جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ فساد کے مراکز آسانی سے بند نہ کیے جا سکیں۔

۲۔ مرد وزن کے آزادانہ میل جو پر پابندی

جنسی فساد کے مراکز کے قلع وقمع کے علاوہ عیاشی، جنس پرستی اور عورت مرد کے آزادانہ اختلاط کی محفلوں اور بلا وجہ میل جول کی بھی روک تھام ہونی چاہیے اسلامی حجاب کو بھی رواج پانا چاہیے جس کا مقصد خود کی نمائش سے اور غیر مردوں کے سامنے حسن اور ادا سے پردہ اور حجاب کرنا ہے (مغرب کی) تقلید سے بچنا اور ایسے کھیلوں سے دور رہنا ہے جو ہیجان پیدا کریں اور کھیلوں میں شریک اور تماشائیوں دونوں کو گمراہ کر دیں نیز بلا ضرورت کی نمود و نمائش سے بچنا ہے۔

۳۔ شادی کرانے میں مادی اور اخلاقی کمک

حکومت مختلف صوبوں میں ایسے ادارے تشکیل دے سکتی ہے اور قرض حسنہ کا اجراء کر سکتی ہے تا کہ وہ نوجوان جو شادی کے خواہش مند ہیں مگر مالی وسائل نہیں رکھتے ان سے استفادہ کر سکیں۔ یہ ایک اخلاقی اور ملی فریضہ ہے جس کی طرف حکومت کو فوری توجہ دینی چاہیے۔ ایک معقول رقم اس مد میں مختص کرنی چاہیے۔ پچھلی حکومت جو کثیر رقم فضول اور بے ہودہ فحاشی اور عریانی کو رواج دینے میں صرف کرتی تھی اس کو بہتر طریقے سے ازدواج اسلامی کے ادارے کو مضبوط بنانے میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اس رقم کو قرض، مکان سرمایہ اور وسائل زندگی کی خرید کیلئے صرف کیا جانا چاہیے۔

شادی بیاہ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کی دوری

آج کے زمانہ میں اسلامی شادی اور ازدواج کے راستے میں کچھ قانونی اور فضول علاقائی رسمیں رکاوٹیں بنی ہوئی ہیں حکومت کو چاہیئے کہ جس قدر جلد ہو سکے اپنے وسائل سے ان رکاوٹوں کو دور کرے۔ ان میں سے چند رکاوٹوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

(الف)......اس ملک میں مغرب کی نقالی میں اور معاشرے میں جنسی کرپشن پھیل جانے کی وجہ سے شادی کی عمر بڑھا دی گئی ہے گرم علاقے کی لڑکیاں جن میں جنسی میلانات ابتدائے بلوغ ہی میں بیدار ہو جاتے ہیں، ان کو اس بات نے مجبور کیا ہوا ہے کہ یا تو وہ اس جبلی خواہش کے خلاف سالہا سال لڑتی رہیں یا پھر اپنے کو فحاشی اور بے راہ روی کے حوالے کر دیں۔

شادی کی عمریں بڑھا کر شاید بعض لوگ سمجھ رہے ہیں کہ وہ اب زیادہ مہذب ہو گئے ہیں۔ وہ اگر سائنس اور ٹیکنالوجی میں یورپ کی گرد تک نہیں پہنچے تو کیا ہوا کم از کم ازدواج کے سن کے تعین میں ان کے برابر ہو ہی گئے ہیں۔ یہ رکاوٹ جس قدر جلد ہو ہٹائی جائے تا کہ جسمانی اور روحانی نشوونما کے حامل ہر لڑکے اور لڑکی کی شادی ہو سکے۔

(ب)......شادی کی عمر بھی کم ہو اور ساتھ ساتھ اس کی بھی کوشش کی جائے کہ جو بھی وسائل ان کے اختیار میں ہیں ان ہی سے شرعی شادی کا سامان کریں یہ آسان بھی ہوگی اور فطرت اور عقل کے عین مطابق بھی ہوگی پر تکلف رسم ورواج کو چھوڑ دیں جو فریقین پر کمر توڑ مالی بوجھ بھی ڈالتے ہیں اور محض دکھادے کیلئے احمقانہ رسموں اور تقریبات کو منعقد کرنے کا باعث ہوتے ہیں اس نقطہ نظر کو اس قدر پھیلایا جائے اور لوگوں کو اس کا قائل کیا جائے کہ لوگ طاغوتی اور امیرانہ ٹھاٹ بات کی شادیوں کو برا سمجھنے لگیں اور ایسی تقریبات منعقد کرتے ہوئے شرمائیں۔ اس کے برعکس ایک دوستانہ تقریب منعقد کریں جس میں عقد کا اہتمام ہو۔ جہاں قرآن، آئینہ، پھول شاخ نبات اور چند سکوں کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔ ان ہی تک شادی کا اہتمام محدود کریں معاشرے میں اس بات کو عام کریں کہ ایسی شادیاں زیادہ پائیدار ہوں گی، جن میں خلوص اور روحانیت کا عنصر بھی موجود ہو۔

(ج)......اگر والدین یہ محسوس کریں کہ شادی کے بعد لڑکا مالی مشکلات سے دوچار ہوگا۔ تو باپ کو چاہے کہ دولہا اور دلہن کے اخراجات برداشت کرے اور یہ خیال کرے کہ اس کے خاندان میں ایک فرد کا اضافہ ہو گیا ہے ساتھ ساتھ روزی اور معاش کے حصول میں لڑکے کی رہبری کرے یہاں تک کہ وہ خود کفالت کے درجے پر پہنچ جائے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے:

من ادرك ولده والده وعنده ما یزوجه فلم یزوجه ففسد فالاثم بینهما

''وہ باپ جس کا بیٹا حدِ بلوغ کو پہنچ گیا ہے اور باپ طاقت رکھتا ہے کہ اس کیلئے بیوی لے آئے اور اگر وہ یہ کام نہ کرے اور وہ جوان خراب ہو جائے تو باپ اپنے بیٹے کے گناہ اور جرم میں شریک شمار ہوگا۔''

اگر باپ کی خواہش ہے کہ اس کی بیٹا اپنی مجوزہ آخری تعلیم مکمل کرلے اور پھر کوئی اچھا عہدہ بھی حاصل کرلے اور اس کے بعد اس کی شادی کی جائے تو اس کی یہ سوچ غلط ہے۔آج کے زمانہ میں اس ذہین نوجوان محنت کر کے اپنی بنیادی تعلیم ۲۵ سال کی عمر میں مکمل کرسکتا ہے۔اگر کسی مضمون میں سپیشلائز کرنا چاہتا ہے تو چار پانچ سال مزید پڑھنا پڑے گا آج کل تعلیم کا دائرہ بہت وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ممکن ہے ایک جوان پی،ایچ،ڈی کرتے کرتے ۳۵ سال کا ہوجائے تو آخر ایک لڑکا اپنے فطری جنسی تقاضوں کو کہاں تک کنٹرول کرے کہ اس کی عمر اس حد کو چھونے لگے جہاں جنسی قوت اپنے انحطاط کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔

(د)......ایک دوسرا مسئلہ خاندانوں اور افراد کے درمیان شناسائی اور ملاقاتیں ہیں،لوگ ایک دوسرے کو نہیں جانتے،مگر چاہتے ہیں کہ پاک اور شریف لوگوں سے ازدواج کے رشتے قائم کریں اس کیلئے ضروری ہے کہ ایسے مراکز قائم کیے جائیں جو غلط روش سے بالکل پاک ہوں اور خالصتاً پاکیزہ ماحول رکھتے ہوان مراکز کو جوانون کے کوائف سپرد کیے جائیں تاکہ شادی کے خواہش مند افراد یہاں اپنی پسند کا انتخاب کر پائیں۔

چند برس قبل بعض لوگوں کی طرف سے اس قسم کی پیش رفت ہوئی تھی مگر ''ساواک'' نے بدقسمتی سے اس کام کو آگے بڑھنے نہیں دیا،کیونکہ اس کا کام ہی یہ تھا کہ معقول اور مفید اداروں اور کام میں رکاوٹ ڈالے۔

(ھ)......بعض نوجوانوں کا خیال یہ ہے کہ اب جبکہ انقلاب کی کامیابی کے بعد ملک کی اصلاح اور فلاحی کام کا دور آگیا ہے کیا ہی اچھا ہو کہ شادی بیاہ کے جھمیلے میں پڑ کر ذمہ داریوں کے بوجھ اپنے سر لینے کے بجائے وہ ملک کی خدمت میں پوری طاقت وقوت سے لگ جائیں۔

مگر ان کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ازدواج کا رشتہ ملک کی خدمت میں رکاوٹ نہیں بنتا اس کے برعکس شادی کرنے اور اچھی گھریلو زندگی گزارتے ہوئے ایک جوان اصلاحی اور فلاحی کام بہتر طور انجام دے سکتا ہے۔

(و) شادی کے راستے میں دوسری رکاوٹوں کے سلسلے میں خود نوجوانوں سے کہا جائے کہ وہ اپنے تجربے کے مطابق ان رکاوٹوں کو تحریر کریں ایک کمیٹی ان کے مسائل پر غور کرے اور اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کرے تاکہ حکومت ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کرے جو معاشرے میں عفت و پاک دامنی کے راستے میں موجود ہیں۔

۵۔اسلامی ثقافت کا معیار بلند کرنے ہوئے عوام کو بدکار عورتوں اور مردوں کے انجام اور کرپٹ معاشروں کے دردناک نتائج سے آگاہ کیا جائے۔ہر ہر علاقے میں ان کو نشر کیا جائے اور رسالوں اور جرائد کے ذریعے سے ان کی تربیت کی جائے یہ نہ صرف فحاشی روکنے کا سبب بن سکتے ہیں بلکہ سرپرستِ اخلاق کام بھی دے سکتے ہیں۔

۶۔متعہ کو رواج دینا اور اس کے حدود اور خصوصیات کو پیش کرنا: ازدواج کی یہ قسم نوجوانون کی تعلیم کے دوران میں گناہ میں ملوث ہونے سے بچا سکتی ہے خصوصاً جب وہ بیرون ملک تعلیم مکمل کرنے گئے ہوں ممکن ہے،اسی نکتے کی وجہ سے اسلام نے اجازت دی ہے کہ مسلمان جوان غیر مسلمانوں سے ''متعہ'' کی شکل میں ازدواج کر سکتے ہیں۔تعلیم کے دوران میں چونکہ اس غیر ملکی ماحول میں ان کی مدت قیام مختصر ہوگی اس لیے وہ تولید نسل سے اپنے آپ کو روک سکتے ہیں۔اصولی طور پر ہر ملک اور ہر علاقے میں متعہ ان شرائط کے ساتھ جو اسلام نے متعین کی ہیں انسان

کو فحاشی سے قطعی بچا سکتا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ اکثر نوجوان متعہ کے حقائق سے آگاہ نہیں تھے اور اس کو حرام کاری کی ایک نوع تصور کرتے تھے۔ فرق صرف یہ کہ اول میں صیغہ ہے اور دوسرے میں نہیں۔ حالانکہ اس کی ماہیت اور مزاج میں اور فحاشی و بدکاری میں واضح فرق ہے مگر یہاں اس کی تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں۔ مختصر یہ کہ متعہ خود ایک شادی ہے، بجز اس کے کہ نکاح کی اس قسم میں مصلحتوں کی بناء پر اخراجات شوہر کے ذمہ نہیں اور بیوی اور شوہر ایک دوسرے کی میراث بھی نہیں لے سکیں گے۔

۷۔ ان سب سے بڑھ کر اور اہم نوجوان نسل میں تقوٰی، پرہیزگاری اور دینی فہم و ادراک کو بلند کرنا ہے اور عوام میں ہر سطح پر خوفِ خدا پیدا کرنا ہے۔

۸۔ بدکار عورت اور مرد پر حد جاری کرنا۔ اس بحث کے آخر میں اس پر مختصر گفتگو کی جائے گی۔

مغرب میں جنسی اخلاق

جنسی میلانات انسانی جبلت میں شمار ہوتے ہیں اور انسان اسے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بلوغت کے بعد ہی یہ صلاحیت بیدار ہوتی ہے اور عرصہ جوانی میں جنسی جذبہ اور احسان قوی ترین ہوتا ہے جو باقی دوسرے احساسات سے زیادہ اثر اور غلبہ رکھتا ہے، چنانچہ ضروری ہے کہ اس زمانے میں اس کی صحیح طور پر رہنمائی کی جائے اور اس کو فطری راستے پر رکھا جائے ورنہ امکان ہے کہ مصیبتوں بلکہ کسی ایسے سے دوچار ہونا پڑے۔ اب ''جنسی اشتراک'' خواہ اصول صحتِ عامہ اور طبی اصولوں کے تحت کیوں نہ ہو علمی حلقوں میں اچھا نہیں سمجھا جاتا اور اب کوئی بھی اس کی حمایت نہیں کرتا۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرزِ معاشرت میں باپ اور اولاد کا رابطہ نہیں رہتا اور ہر باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنی اولاد کو پہچانے اس کا اس سے رابطہ رہے۔ وہ اس کی بقا کا وسیلہ اور اس کے وجود کی نشانی بنے۔

چنانچہ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کے عہد و پیمان کو لایعنی سمجھنا اور بیوی کا کسی ایک مرد کو شوہر کی حیثیت دینے کو مہمل اور بے کار سمجھانے کی کوششیں خیال خام ثابت ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ ان ممالک میں جہاں اس روش کو اپنانے کی سعی کی گئی، تمام طبقوں نے وہاں اس کی شدید مخالفت کی نتیجتاً مجبور ہو کر ازدواج قانونی کو رواج دیا گیا اور اس کو قانونی اور سرکاری شکل دی گئی۔

لینن اور اس کے ہم خیال تصور کرتے تھے کہ ملکیت کا ہونا جھگڑے اور کشمکش کا سبب ہے چنانچہ ملکیت کے نظریے کی مخالفت کرنی چاہیے اور اس کو معاشرے سے ختم کرنا چاہیے ان کی نظر میں دولت، نام، معین بیوی ایسی باتیں ہیں جو تشخص کا باعث ہیں اور ان ہی سے نزاع اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اس لیے معاشرے سے ایسی چیزوں کو جو جھگڑے کا سبب ہیں نکال باہر کرنا چاہیے۔[1]

مگر جب اس نظریے پر عمل کیا گیا تو سب نے دیکھا کہ یہ تجربہ بہت سے مراحل میں ناکامیاب ہو رہا ہے۔ خصوصاً جنسی اشتراک کے

---

[1]۔ کیمونسٹ مینی فیسٹو صفحہ ۶۳ پر جو بحث کی گئی ہے، وہ قابل مطالعہ ہے۔

معاملے میں کوئی شخص بھی تیار نہیں تھا کہ وہ اپنی اولاد سے رشتہ منقطع کر لے۔ اپنے وجود کو معاشرے میں گم کر دے اور اس کو نہ پہچانے۔ چنانچہ دانشوروں کا اس بات پر اتفاق ہوا کہ جنسی جبلت کیلئے حدود متعین کی جانی چاہئیں۔

رسل (RUSSEL) کا نظریہ

مشہو انگریز دانشور رسل کا ایک سلسلے میں ایک خاص نظریہ ہے وہ جنسی آزادی کی اس حد تک حمایت کرتا ہے، جب تک اختلاط نسل کی نوبت نہ آئے اس کے اپنے نظریے کی دو بنیادیں ہیں۔ایک ''آزادی''اور دوسرے ''اولاد کی لازمی شناخت'' چنانچہ ہر کم کو وہ جائز سمجھتا تھا، اگر اولاد کے غلط ملط ہونے کا خطرہ نہ ہو۔

یہ تجویز تین وجوہات کی بناء پر رد کی جانی چاہیے

اول یہ کہ انسانی آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنی خواہش اور ارادے کے تحت جو چاہے کرے۔ آزادی ایک گراں بہا نعمت ہے۔مگر اس کے یہ معنی لیے جائیں تو یہ اخلاق پر کاری ضرب ہے۔ یہ تو جنگل کی آزادی ہے۔اس لیے کہ جو جانور جنگل میں زندگی گذارتے ہیں وہ یہی چاہتے ہیں کہ ان کی خواہشات کے مقابلے میں کوئی روکاوٹ نہ ہو۔ انسان کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو اپنی دوسری اعلیٰ اور مقدس صلاحیتوں کی نشوونما سے ہم آہنگ اور اس کے مطابق کرے۔ اپنے آپ کو ارتقاء کے راستے پر گامزن کرے ایسی آزادی جوان صلاحیتوں کو برباد کرے آزادی نہیں کہلا سکتی۔ بغرض محال اس کو آزادی کا نام بھی دیا جائے تو بھی وہ قابل احترام نہیں ہے۔ بہر حال آزادی اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے بے لگام نہیں ہو سکتی اور نہ ذمہ داریوں سے فرار کا نام ہے اور نہ ہی ازدواج اور شادی بیاہ کی قیدا اور رشتے کو توڑنے کی سند بن سکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر ہم قانونی بیوی اور دوسروں کے ساتھ ہر قسم کے قانونی تعلق کو تسلیم کر لیں تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ قانونی بیوی کبھی اپنے شوہر سے خیانت نہیں کرے گی۔ شہوت کے ہیجان اور جنسی خواہش کے طغیان کے موقع پر دوسروں کے حقوق کا خیال ذہن سے بالکل محو ہو جاتا ہے انسان اندھا ہو جاتا ہے اور اس وقت وہ سوائے اپنی خواہش کو پورا کرنے کے کسی قانون اور عہد و پیمان کی طرف دھیان نہیں دیتا کیا ان حالات میں شوہر کو یہ یقین دلایا جا سکتا ہے جو بچہ اس کی قانونی بیوی کے شکم میں ہے وہ اس کا اپنا ہے نہ کہ کسی اور کا۔

تیسرے یہ کہ شادی کے شروع میں میاں بیوی کے درمیان قربت کا ذریعہ جنسی لذت اور جنسی لگاؤ ہوتا ہے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں کے درمیان روحانی اُلفت اور محبت پیدا ہو جاتی ہے بیوی صرف اپنے شوہر کی ہو جاتی ہے اور دونوں ہمدردی اور محبت کے جذبات سے سرشار ہو کر ایک دوسرے قریب سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ اگر اس پس منظر میں قانونی شادی کے تحت جو بیوی بنی اس کو دوسرے مردوں کے ساتھ میل جول کی اجازت دے دی جائے کہ وہ محدود پیمانے پر جنسی میل ملاپ رکھ سکتی ہے تو تعجب نہیں کہ کچھ ہی دن

گزرنے پر میاں بیوی کے تعلقات میں سرد مہری آجائے، عورت اپنے شوہر سے دور ہو کر غیر مردوں سے دل بستگی پیدا کرلے گی نتیجتاً ازدواجی رشتہ کمزور پڑ کر گھریلو ماحول کو برباد کردے گا۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جنسی دوستی قطعی ممنوع ہے۔ یہ ''گرل فرینڈ'' اور ''بوائے فرینڈ'' کے مغربی طرز کے سلسلے جو کچھ لوگوں میں رائج ہیں، اسلام کے طے شدہ محرمات میں سے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کو ''اخدان'' کہتے ہیں جو ''خدن'' کی جمع ہے یعنی دوست، یار اور ساتھی، جیسا کہ فرمایا:

وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ

''ان (عورتوں) کا مہر شائستگی کے ساتھ ادا کردو۔ عفیف اور پاک دامن رہیں نہ کہ زنا کار اور یار بنانے والی۔'' (نساء۔ ۲۵)

یہاں تک رسل کے نظریے کے لایعنی ہونے کا ذکر تھا اب موقع ہے کہ ''زنا'' سے متعلق آیات کا مطالعہ کیا جائے۔ پہلے ہم لفظ ''فحشاء'' کی تفسیر پیش کرتے ہیں جو زیر نظر آیت میں جمع کی شکل میں آیا ہے۔ قرآن کے دائمی منشور کی چوتھی بنیاد ہر اس چیز سے دوری ہے جس کی عربی زبان میں ''فحشاء'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ

''بُرے کاموں کے نزدیک نہ جاؤ خواہ ظاہر ہوں یا مخفی۔'' (انعام۔ ۱۵۱)

آج کی اصطلاح میں ''فحشاء'' شرع کے برخلاف جنسی اعمال کو کہتے ہیں، عربی زبان میں ہر قسم کی بہت برے اور نفرت انگیز کردار و گفتار کو ''فحشاء'' کہتے ہیں۔[1]

اس طور ہر نوع کا برا اور نفرت انگیز کام مثلاً دروغ گوئی، عہد شکنی ''فحشاء'' کا نام دیتا ہے جیسا کہ فرمایا:

قرآن ایک جگہ عورت اور مرد کے شرع کے برخلاف اختلاط کو ''فحشاء'' کا نام دیتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝۳۲

''زنا کے قریب نہ جاؤ حقیقت میں یہ بُرا کام اور قبیح روش ہے۔'' (بنی اسرائیل۔ ۳۲)

اس طرح قوم لوط کے عمل کو ''فاحشة'' کہا گیا ہے:

---

[1] ۔ مفردات راغب۔ مادہ ''فحش''

اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾

''اس بُرے کام کو کیوں انجام دیتے ہو، جس کو تم سے پہلے کسی نے انجام نہیں دیا۔''(اعراف۔۸۰)

یونہی پاک دامن عورتوں پر بُرے کام کا الزام رکھنا ''فاحشه'' قرار دیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

''جولوگ ایمان والوں کے بارے میں غلط خبروں کو پھیلاتے ہیں، ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔''(نور۔۱۹)

عرض یہ ہے کہ قرآن مجید اگران تینوں موقعوں کو ''فحشاء'' قرار دیتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ''فحشاء'' صرف ان ہی تین موقعوں کیلئے بولا جاتا ہے بلکہ اس لفظ کے وسیع معنیٰ ہیں۔ یہ تینوں موقعے اس کے وسیع معنیٰ ہی میں آتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ بہت نفرت انگیز گناہ ''فحشاء'' کہلاتے ہیں۔ حتیٰ کہ انسان کا قتل اور مالِ یتیم پر ہاتھ بڑھانے جیسے اعمال بھی۔ [1]

مگر چونکہ اس موقع پر قرآن کے ان دائمی احکام میں اپنے خاص محدود مفہوم میں یہ لفظ آیا ہے اس لیے یہاں اس سے مراد اس کی وہی محدود معنیٰ ہوں گے۔ خلاصہ یہ کہ ہر قسم کا نفرت انگیز کام چاہے کھلم کھلا انجام دیا جائے یا چھپ کر ''ماظهر منها وما بطن'' والی آیت کے مطابق حرام ہے اور اس سے دوری اختیار کرنی چاہیئے۔ مثلاً کچھ لوگ لاپروائی اور بے شرمی سے خراب عورتوں سے واسطہ رکھتے ہیں یہ وہی آشکار فحشاء ہے۔ بعض مخفی طور پر داشتہ رکھتے اور اس سے جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔ یہ مخفی فحشاء ہے۔ قرآن ان دونوں طریقوں کے گناہ کو ایک دوسری آیت میں بھی بیان کرتا ہے۔

وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ

''ان عورتوں کا مہر شائستگی کے ساتھ ادا کردو وہ عفیف اور پاک دامن رہیں نہ کہ زنا کار اور نہ یار بنانے والی۔''(نساء۔۲۵)

ان باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنسی مسائل خواہ آشکار ہوں یا مخفی اس قرآن فرمان سے متعلق ہیں۔ اور آیت

---

[1] ۔ ''فحشاء'' کا لفظ قرآن میں ۷ مرتبہ ''فاحشة'' ۱۳ مرتبہ اور ''فواحش'' ۴ مرتبہ آیا ہے۔ زیادہ تر یہ لفظ وسیع معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ چند موقعوں پر عمل جنسی کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ لفظ ''زنا'' تمام مشتقات کے ساتھ دس مرتب قرآن میں آیا ہے۔

کا اشارہ ان ہی کی طرف ہے بیشک آیت کے مطالب کو ان میں محدود نہیں کیا جاسکتا ہے ممکن ہے آیت اس سے اور وسیع معنی رکھتی ہو۔

زنا کے مفاسد

زنا اس کو کہتے ہیں کہ دو مخالف صنف بغیر از دواج کے رشتے کے جنسی جبلت کی تسکین کیلئے جنسی اعمال انجام دیں۔ یہ کام تمام اقوام میں قبیح اور بُرا فعل شمار ہوتا ہے۔ ایسے فعل کا نتیجہ نسب کی خرابی اور تناسل بیماریوں کا ظاہر ہونا اور معاشرتی جرائم مثلاً قتل وغارت، چوری اور خیانت میں افزائش ہوا ہے، یہ فعل انسانی معاشرے کے عظیم ترین سرمائے یعنی حیا اور عفت کو ختم کر دیتا ہے۔ اس لیے قرآن نے اس کو انسان کیلئے بُری راہ قرار دیا ہے:

سَآءَ سَبِيۡلًا

(بنی اسرائیل۔ ۳۲)

علاوہ ازیں عورت کا مختلف مردوں سے اختلاط اس کا سبب بنتا ہے کہ اولاد سے شفقت کرنے والا کوئی نہیں رہتا اور آخر کار یہ سلسلہ قطع نسل تک جا پہنچتا ہے۔

زنا کی قانونی سزا

معاشرے کو جنسی انحرافات سے پاک کرنے اور جنسی خرافات کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کیلئے ضروری ہے کہ جن باتوں کا ہم نے بحث کے شروع میں ذکر کیا ہے وہ سختی سے نافذ کی جائیں۔ پھر اسلام نے اس قبیح فعل کی سزا مقرر کی ہے۔ اگر ان سزاؤں کو ان شرائط کے تحت جو فقہ اسلامی میں بیان ہوئی ہیں نافذ کیا جائے تو یہ بے ہودہ اور ناشائستہ سلسلے جو درحقیقت اخلاقی کرپشن، معاشرتی ابتری اور گھریلو نظام کی تباہی کا سبب بنتے ہیں، جڑ سے ختم ہو جائیں۔ بدکار عورت اور مرد کی سزا سورہ نور کی آیت ۲ میں اس طرح آئی ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِىۡ فَاجۡلِدُوۡا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا مِائَةَ جَلۡدَةٍ‌ وَّلَا تَاۡخُذۡكُمۡ بِهِمَا رَاۡفَةٌ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ‌ۚ وَلۡيَشۡهَدۡ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝۲

''ہر ایک بدکار عورت اور بدکار مرد کو سو تازیانے لگاؤ۔ ان کے بارے میں احکام الٰہی کے نافذ کرنے میں ہرگز رحم نہ کرو اور خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو نیز سزا جاری کرتے وقت ایمان والوں کا ایک گروہ حاضر ہو۔''

زنا کاری کو روکنے اور اس کے خاتمہ کا بہترین راستہ یہی ہے کہ جو اس آیت میں بتایا گیا ہے نہ کہ نقد جرمانہ [1] جرمانہ مالدار لوگوں کیلئے کوئی اہم سزا غریبوں کیلئے سوائے جیل جانے کے دوسرا راستہ نہیں۔ وہ جرمانہ ادا نہیں کر پائے تو ان کو جیل بھیج دیا جائے گا اور وہ حکومت پر بوجھ بن جائے گے، اس طرح مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ ساری قوموں میں ''زنا'' کی سزا مقرر رہی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زانی کی سزا قتل اور زانیہ کی سزا سنگسار کرنا تھی۔ ہندوستان کی قدیمی قوانین میں زانیہ کو بھوکے کتوں کے سامنے پھینک دیا جاتا تھا تاکہ وہ اس کو چیر پھاڑ دیں اور زانی مرد کو جلا دیا جاتا تھا۔ روم کے قانون کے مطابق بدکار عورت مرد دونوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ انگلستان میں زنا کار کی شہر میں تشہیر کی جاتی تھی اور اس کو اس قدر زدوکوب کیا جاتا کہ وہ مر جاتا۔ بعض قوموں میں اس کو جلا دیتے، بعض میں دریا میں ڈبو دیتے اور کہیں پھانسی پر لٹکا دیتے۔ قرآن میں حد کے بارے میں کچھ شرائط ہیں جو فقہ کی کتابوں میں مفصل بیان ہوئی ہیں۔ اب ہم اپنی بحث کو چند مزید نکات بیان کر کے ختم کرتے ہیں:

ا۔ مذکورہ بالا آیت میں جہاں قرآن نے زنا کی حد کا حکم بیان کیا ہے، وہاں پہلے زانیہ کا اور پھر زانی کا ذکر کیا ہے مگر جب چوری کی حد مقرر کی ہے تو پہلے ''سارقہ'' کا نام لیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا

''اور چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹو۔'' (مائدہ۔ ۳۸)

اس تقدم اور تأخر میں نکتہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چوری میں اصلی عامل مرد اور زنا میں اصلی عامل بے لگام عورتیں ہوتی ہیں اس لیے قرآن جہاں زنا کے بارے میں گفتگو کرتا ہے وہاں عورت کا مرد سے پہلے اور جہاں چوری کے متعلق بات کرتا ہے وہاں مرد کا عورت سے پہلے نام لیتا ہے۔ [2]

۲۔ عرب معاشرہ فحشاء میں کس قدر غرق تھا، اس تصویر کشی کیلئے ذیل کا یہ واقعہ کافی ہے:

پیغمبر اکرمؐ نے طائف کے قلعہ کو فتح کرنے کیلئے اس کے محاصرے کا حکم دیا، مجاہدینِ اسلام کی اس قلعے کا دروازہ کھولنے کیلئے کوششیں بارآور نہ ہوئیں۔ لشکر اسلام کامیابی حاصل کیے بغیر مدینے واپس آ گیا۔ طائف کے سرداروں نے آپس میں مشورہ کر کے اراداکیا کہ معاشرہ اسلامی میں شامل ہو جائیں اس لیے کہ اس سارے علاقے پر پرچم لہرا چکا ہے اور اب یہاں شرک کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ طائف کے لوگوں نے ایک

---

[1] ۔ ''بات'' اور ''بہائی'' مسلک میں نو مثقال سونا دیتے سے جنسی خیانت بخشی جاسکتی ہے ایسی سزا امیروں کو چھوتی دینے کے علاوہ اور کوئی نتیجہ نہیں رکھتی۔ ان کی کتاب ''اقدس'' کے صفحہ ۱۵ پر ہم پڑھتے تھے۔

''قد حکم اللہ لکل زان او زنیۃ دیۃ مسلمۃ الیٰ بیت العدل وھی تسعۃ مثاقیل

''ہر بدکار اور عورت پر لازم ہے کہ بیت عدل میں دیت دے جو نو مثقال سونے سے عبارت ہے۔''

[2] ۔ مجمع البیان جلد ۹ ص ۱۹۲ طبع صیدا

وفد مدینے بھیجا۔انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے سامنے قبولِ اسلام پر آمادگی ظاہر کی مگر اس کیلئے پیغمبر اکرمؐ کو کچھ شرائط پیش کیں۔پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ اپنی شرائط لکھ کر لاؤ۔قبیلہ ثقیف کے نمائندوں نے حضرت علیؑ سے درخواست کی کہ وہ ان کی درخواست تحریر کردیں۔جب حضرت علیؑ نے ان کی شرائط سنیں تو آپؑ نے لکھنے سے انکار کردیا۔وفد نے خالد بن سعد سے درخواست کی کہ وہ شرائط لکھ دے۔حضرت علیؑ نے خالد سے سوال کیا کہ تم کو معلوم ہے کہ کیا لکھو گے؟ اس نے کہا میں ان کی درخواست لکھوں گا پیغمبر ان کی شرائط قبول کرنے میں کاملاً مختار ہیں۔اس نے شرائط تحریر کیں اور ثقیف کے وفد کو دے دیں وہ اس تحریر کو پیغمبرؐ کی خدمت میں لے آئے۔جو شخص اس کو پڑھنے پر مامور تھا، جب اس شرط پر پہنچا کہ بنی ثقیف کیلئے ''سود حلال ہونا چاہیے تو پیغمبر کو ناگوار گزرا اور آپؐ نے یہ آیت فرمائی:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا

''اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور جتنی رقم سود میں سے باقی رہ گئی ہے وہ چھوڑ دو۔''

(بقرہ۔۲۷۸)

جب ایک دوسری شرط پڑھی گئی جس میں درخواست تھی کہ ''زنا'' کو ان لوگوں پر حلال کیا جائے اور اسے منع نہ کیا جائے تو پیغمبرؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝۳۲

''زنا کے قریب نہ جاؤ، وہ قبیح کام اور بہت بُری راہ ہے۔'' (بنی اسرائیل۔۳۲)

اور اس وقت آپ نے حکم دیا کہ وہ کوئی دوسری درخواست لکھیں۔[1]

طائف کی فحاشی کا تاریخ میں اس طرح ذکر ہے کہ وہاں جسم بیچنے والی عورتیں اپنے گھروں دروازے پر جھنڈے نصب کرتی تھیں ،اس سے پتہ چلتا تھا کہ یہاں فاحشہ عورت جسم فروشی کرتی ہے ان کو ''ذوات الاعلام'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔پیغمبر اکرمؐ نے اس گندگی اور گناہ میں ملوث قوم کو پاک وصاف اُمّت میں تبدیل کیا کہ جس کے مرد اور عورتیں آنے والی نسلوں کیلئے نمونہ بنیں۔

۳۔سو تازیانے کی سزا غیر شادی شدہ لوگوں کیلئے ہے۔شادی شدہ کیلئے رجم اور سنگساری ہے اور دونوں سزاؤں کی شرائط فقہ کی کتابوں میں درج ہیں۔

۴۔قرآن سورہ مومنوں کی آیت ۵ میں ایمان لانے والوں کی ایک نشانی یہ بتاتا ہے کہ وہ اپنی شرم گاہ کو گناہ سے بچائے رکھتے ہیں ۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵

---

[1] ۔اسد الغابہ ج ۱ صفحہ ۲۱۶۔مادہ ''تمیم بن جراشتہ'' اور سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۴۲ تا ۵۴۴ پر ثقیف کے نمائندہ وفد کے سرگذشت تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔

''وہ جو اپنی شرم گاہ کو حرام سے محفوظ رکھتے ہیں۔''

قرآن سورہ فرقان میں ایمان لانے والوں کی ایک نشانی زنا سے دور رہنا قرار دیتا ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا

''زنا سے دور رہتے ہیں جو اس کام کو انجام دے وہ گناہگار شمار ہوتا ہے۔''(فرقان۔۶۸)

قرآن حضرت مریمؑ کا ایک عفیف اور پاک دامن خاتون کی حیثیت سے تعارف کراتا ہے:

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا

''اور مریم بنت عمران جس نے اپنی شرم گاہ کو حرام سے محفوظ رکھا۔''(تحریم۔۱۲)

قرآن صاحب ایمان افراد کا اس طور تعارف کراتا ہے:

وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ

(احزاب۔۳۵)

ان تاکیدات کی بناء پر ان ممالک میں جن کو اسلامی کہا جاتا ہے،عفت اور پاک دامنی کی عمومی کیفیت اور احوال کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور انہیں اپنا جائزہ لینا چاہیے۔

قرآن کا دائمی منشور

پانچواں اصول

نفسِ انسانی کا اِحترام

نفس

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ

جس انسان کو اللہ نے محترم شمار کیا ہے اُسے ناحق قتل نہ کرو۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی خداتم کو وصیت کرتا ہے تاکہ ان میں غور وفکر کرو۔ (انعام۔۱۵۱)

انسان کے مثبت روحانی پہلوؤں سے آگاہی قرآن میں انسان کے مقام اوراس کی حیثیت سے شناسائی اس کے روحانی اور جسمانی اقدار کی وضاحت ان سب باتوں کی طرف اس آسمانی کتاب میں اشارہ ہوا ہے یہ موضوعات قرآن کی اہم بحث کو اجاگر کرتے ہیں جن کو کسی موقع پر ''انسان در قرآن'' کے عنوان سے بیان کیا جانا چاہیے۔

قرآن میں انسان کے بلند مقام کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جو اس کی عظمت اور ارفع مقام کی نشان دہی کرتا ہے اس کو دوسری مخلوق سے جدا ایک خاص انداز سے تعارف کروایا گیا ہے۔ قرآن نے انسان کو اس عالم طبیعی میں خدا کا خلیفہ اور جانشین [۱] اور ایسے یگانہ فرد کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے جو امامت کا بار اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے [۲]

انسان قرآن کی نظر میں خدا کی طرف سے معلم کا [۳] فرشتوں [۴] خشکی اور دریاؤں کا مسخر کرنے والا ہے [۵] اور یہ بہترین

---

[۱] ۔اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ (بقرہ۔۳۰)

[۲] ۔اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ (احزاب۔۷۲)

[۳] ۔عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵ (علق۔۵) اور وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ (بقرہ۔۳۱)

[۴] ۔قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ (بقرہ۔۳۳)

[۵] ۔وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (بنی اسرائیل۔۷۰)

طرز پر پیدا کیا گیا ہے۔[1]

اس مثبت مقام اوران اقدار کی بنا پر جو خلقت کے میدان میں انسان رکھتا ہے اس کا خون اس کی آبرو اور اس کا مال یہاں تک کہ اس کی میت بھی محترم ہے چنانچہ چار طرح کے احترام اس کی انسانیت کا نتیجہ ہیں ۔لیکن اس شرط کے ساتھ کہ کفر وشرک یا ظلم سے اپنی قدرت وقیمت کم نہ کردے۔نفس انسان کا احترام اور انسان کے قتل کی حرمت،احترام انسانیت میں سے ایک ہے اسی کیلئے قرآن تین موقعوں پر انسانی معاشرے کو ذیل کے مضمون سے مخاطب کرتا ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط [2]

''جس انسان کو خدا نے محترم قرار دیا ہے اس کو ناحق قتل نہ کرو۔''

قرآن نفس انسانی کے احترام کو ذہنوں میں راسخ کرنے کیلئے صرف اسی حکم پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ بار بار اس کے ذکر اور مختلف سزاؤں کو متعین کرکے معاشرہ انسانی میں ناحق خونریزی کو روکتا ہے۔قرآن ''قتل'' کے بارے میں مختلف بیانات،احکام اور سزاؤں کے تعین کے ذریعے انسان کے بلند مقام اور حیثیت کو واضح کرتا ہے۔اب ان کا ذکر کیا جاتا ہے:

ا۔قرآن بلاوجہ اور ظالمانہ خونریزی کو اتنا بڑا گناہ سمجھتا ہے کہ اس فرد کے قتل کو تمام انسانوں کے قتل کے برابر قرار دیتا ہے۔جیسا کہ فرماتا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط

''جو شخص کسی انسان کو قتل کرے جب کہ اس نے قتل کا ارتکاب نہیں کیا اور نہ زمین میں فساد کیا ہے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کردیا۔'' (مائدہ ۳۲)

اس بات کو محض مبالغہ آرائی نہیں سمجھنا چاہیے اس قرآنی فیصلے میں ایک منطق ہے جو ان لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں جو انسانی نفسیات کو سمجھتے ہیں،اس لئے کہ جو شخص کسی بے گناہ کے خون سے اپنا ہاتھ بلاوجہ رنگتا ہے وہ دوسرے بے گناہ انسانوں پر بھی ہاتھ اٹھا سکتا ہے اور بلا جھجک ان کی جان لے سکتا ہے۔یہ بھی پہلے مقتول جیسے انسان ہیں جو بے گناہ قتل کیا گیا ہے وہ خون کا پیاسا بن جاتا ہے اور اس کیلئے اس بے گناہ یا اس بے گناہ کے قتل میں فرق نہیں ہے۔جیسا کہ بدطینت آدمی بے گناہ انسانوں کو قتل کرنے میں نہیں جھجکتے اسی طرح نیک اور رحم دل انسان بھی ہیں جو انسان دوستی کے جذبے سے دوسرے انسان کو موت کے منہ سے بچا بھی لیتے ہیں۔ان کی یہ سعی پوری انسانیت کو زندگی دینے کے مترادف ہے ان کا مقصد صرف انسانوں کو نجات دلانا ہوتا ہے۔اور بس خواہ وہ زیادہ استطاعت اور طاقت نہ رکھتے ہوں۔چنانچہ قرآن وہی

---

[1] ۔لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ (تین۔۴)

[2] ۔سورہ انعام۔۱۵۱،بنی اسرائیل۔۳۳۔اور فرقان۔۶۸ کو بھی دیکھیں۔

پچھلا فیصلہ ایسے آدمی کیلئے بھی دیتا ہے جو کسی انسان کو موت سے بچالے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَمَنۡ اَحۡيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ

''جو شخص کسی انسان کو موت سے بچالے ایسا ہے گویا اس نے سارے انسانوں کو نجات دلائی ''(مائدہ۔۳۲)

علاوہ ازیں معاشرہ انسانی کے سارے افراد ایک جسم کے مختلف اعضاء کے مثل ہیں جس طرح جسم کے کسی ایک عضو کی تکلیف یا چوٹ باقی سارے جسم کی تکلیف سمجھی جاتی ہے اسی طرح کسی ایک فرد کا وجود معاشرے سے اگر ختم کر دیا جائے تو یہ باقی سارے افراد کا نقصان کہلائے گا، وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں ہر فرد کی اپنی اہمیت اور افادیت ہے ہر فرد معاشرے کی تعمیر اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

۲۔قرآن خون ریزی کو وہ پہلا گناہ کہتا ہے جو اس روئے زمین پر کیا گیا ہے اور حضرت آدمؑ کے بیٹوں ہابیل اور قابیل کا واقعہ بیان کرتا ہے جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا تھا۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

فَطَوَّعَتۡ لَهٗ نَفۡسُهٗ قَتۡلَ اَخِيۡهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ۞

''نفس سرکش نے آہستہ آہستہ اس کو بھائی کے قتل کرنے پر آمادہ (اور پکا) کر دیا۔ اور وہ زیاں کاروں میں سے ہو گیا۔''(مائدہ۔۳۰)

۳۔ایک بے گناہ مومن کے قتل کو قرآن بے انتہا بُرا سمجھتا ہے جو دوسرے گناہوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا ۞

''جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے اس کی سزا جہنم ہے جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ خدا اس پر غضب نازل کرتا ہے، اسے اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے اور اس نے عظیم عذاب اس کے لیے تیار کر رکھا ہے۔''(نساء۔۹۳)

اس آیت میں جو مومن کو عمداً قتل کرے اس کیلئے چار شدید اخروی سزائیں سنائی گئی ہیں۔

(الف)''وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔''

فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا

(ب) ''خدا کا غضب اس کو گھیر لے گا۔''

وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ

(ج) ''خدا کی رحمت سے وہ دور ہو جائے گا۔''

وَلَعَنَهٗ

(د) ''بہت بڑے عذاب میں گرفتار ہوگا۔''

وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا

یہ چار سزائیں اخروی عذاب کے ساتھ ہوں، سطحی نظر سے یہ چاروں سزائیں ممکن ہے ایک ہی سزا معلوم ہو، لیکن درحقیقت ان میں سے ہر ایک مستقل سزا ہے، چونکہ ہم اس دنیا میں اُخروی سزاؤں کی کیفیت اور تعداد سے واقف نہیں اس لیے ان کا جُدا جُدا ادراک نہیں کر سکتے۔ بہرحال یہ تو واضح ہے کہ چوتھی سزا جہنم میں ہمیشہ رہنے کے علاوہ ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ جہنم میں کسی بڑے عذاب میں گرفتار ہوں، مگر اس میں ہمیشہ نہ رہیں۔ خود جہنم میں ہمیشہ رہنا اور ''عذاب عظیم'' کے علاوہ ہے جو قاتلوں اور مجرموں کیلئے خاص ہے۔

۴۔ کیا مومن کا قاتل جہنم میں ہمیشہ رہے گا

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مومن کا قاتل خواہ کوئی بھی ہو آیت میں وارد پہلی سزا...... یعنی خالداً فیہا ...... کے مطابق جہنم میں ہمیشہ رہے گا۔ مگر بعض مفسرین اس آیت کو ایسے قاتل کے متعلق سمجھتے ہیں جو کسی مومن کو اس لیے قتل کرے کہ وہ ایمان رکھتا ہے اس قتل کا محرک خود کفر ہو تو بلا شبہ ایسا بے ایمان قاتل جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔[1]

بہرحال دوسری آیات جن کے مطابق خداوند عالم تمام گناہوں کو سوائے شرک کے بخش دیتا ہے ان دونوں آخری نظریوں کی تائید کرتی ہیں، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ

''خدا صرف شرک کے گناہ کو نہیں بخشتا اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دیتا ہے۔ (نساء۔ ۴۸)

پھر سورہ زمر کی آیت ۵۳ میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾

''خدا تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے وہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

---

[1] ۔ وسائل شیعہ۔ ج ۱۹ باب ۹، روایات ۔ ۱ ۔ ۲ صفحہ ۱۹

اس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ ایسے افراد کی دیت ادا کرے سے پہلے حقیقی توبہ قبول ہو جاتی ہے۔ اگر چہ اس صورت میں حقیقی توبہ بہت مشکل ہے۔

۵۔ قتل کی قسمیں

سورہ بنی اسرائیل آیت ۳۳ میں قتل عمد کے بارے میں حکم بیان کیا گیا ہے۔ اس پر آگے چل کر بھی بحث کی جائے گی۔ فقہاء قتل کی ایک اور قسم کا ذکر کرتے ہیں، جس کو ''شبہ عمد'' کہتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ قتل عمد میں قتل کا ارادہ پہلے سے ہوتا ہے اور کسی آلۂ قتل کو استعمال کیا جاتا ہے، جیسے کوئی شخص کسی کو قتل کرنے کے قصد سے کوئی ہتھیار، پتھر یا لکڑی استعمال کرے۔ شبہ عمد میں قتل کرنے کی نیت نہیں ہوتی۔ ارادہ دوسرے کام کا ہوتا ہے جو قتل پر انجام پذیر ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی کو زدوکوب کرنے کا قصد کرے۔ قتل کرنے کا نہیں۔ مگر مار پیٹ کے دوران میں اسکے ہاتھوں وہ آدمی قتل ہو جائے جب کہ وہ اس کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ قتل عمد کی تین قسمیں ہیں۔ اور شبہ عمد کی ایک شکل ہے۔

(الف) وہ کام یا آلہ قتل کیلئے استعمال ہوتا ہو اور جس سے ضرب اور زخم لگایا جا سکے۔

(ب) انسان مد مقابل کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو خواہ آلہ وہ عمل قتل کرنے والا نہ ہو۔

(ج) عمل اور آلہ بھی قتل کرنے والے ہوں اور وہ شخص اپنے مخالف کو قتل کرنے کا قصد بھی رکھتا ہو۔

ان تینوں شکلوں میں سے جس صورت میں قتل ہو، قتلِ عمد شمار ہوگا اس کا حکم قصاص ہے۔ اگر دوسرا فریق راضی ہو جائے تو دیت اور خون بہا دینا پڑے گا۔ لیکن عمل اور آلہ قتل کا نہ ہو اور نہ ہی قتل کا ارادہ رکھتا ہو، بلکہ صرف زدوکوب کرنے کا قصد ہو۔ مگر اتفاق سے مار پیٹ کے دوران میں وہ شخص قتل ہو جائے تو یہ قتل شبہ عمدہ شمار ہوگا۔ شبہ عمد کا حکم قرآن میں نہیں آیا مگر فقہاء اور احادیث اسلامی نے اس کا ذکر کیا ہے۔[1]

قرآن ایک تیسری قسم کا ذکر کرتا ہے اور اس کو ''قتل خطائی'' کہتا ہے اور اس کو تین صورتوں میں تقسیم کرتا ہے ان تینوں کو قرآن ایک ہی آیت میں بیان کرتا ہے۔ اس آیت کو ہم تین حصوں میں پیش کر رہے ہیں:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ

کسی مومن کیلئے جائز نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے، مگر یہ کہ یہ کام غلطی سے انجام پا جائے جب غلطی سے کوئی شخص کسی مومن کو قتل کر دے تو اسے چاہیے کہ ایک مومن غلام آزاد کرے اور اس کا خون بہا (جو ہزار مثقال سونا ہے) ادا کرے مگر یہ کہ مقتول کے وارث اس کو دیت

---

[1] ۔ تحریر الوسیلہ ج ۲، ص ۵۵۶ کی طرف رجوع کریں

معاف کر دیں۔

قتل کی تلافی یہاں دو نوعیت سے بیان ہوئی ہے:

(الف) غلام آزاد کرنے جو حقیقت میں ایک مومن کے قتل ہونے کے معاشرتی نقصان کی تلافی شمار ہو گا اس لیے کہ اگر ایک آزاد شخص معاشرے میں قتل ہوا ہے تو اس کے عوض ایک غلام آزاد کرنے سے اس کا ازالہ ہو جائے گا۔ ایک آزاد فرد کا معاشرے میں اضافہ ہو جائے گا۔

(ب) دیت اور خون بہا کی ادائیگی بہ درحقیقت مقتول کے گھرانے کو اس کے قتل سے جو اقتصادی نقصان پہنچا ہے اس کا ازالہ ہے۔ دیت اور خون کی قیمت نہیں سمجھنا چاہیے مسلمان کا خون اس سے کہیں قیمتی ہے کہ پیسہ ادا کرنے سے اس کی تلافی ہو سکے یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ خطا کی کوئی سزا نہیں بہت سی خطاؤں کی پہلے سے روک تھام ہو سکتی ہے۔ اگر اسلام قتل کی سزا اور جرمانہ متعین نہ کرتا تو یہ جرم پھیلتا ہی جاتا اور کوئی روک نہ ہوتی۔ علاوہ ازیں اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ لوگ اس بات کو اہمیت دیں کہ خون کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں کہ خطا کے بہانے قاتل اتنی بھاری ذمہ دار سے چھوٹ جائے۔

(ii) فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ

''مگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو جو تمہارے دشمن ہیں (کافر ہیں) اور وہ خود مومن ہو تو اس صورت میں صرف ایک غلام آزاد کرے۔''

مقتول کے وارثوں کو دیت نہیں دی جائے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ مقتول کے وارث تو کافر ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی حالت میں ہیں۔ دیت دینا ان کی مالی حالت کو مستحکم کرنا ہے ظاہر ہے یہ کام مسلمانوں کیلئے خطرہ شمار ہو گا۔ علاوہ ازیں اسلام لانے کی وجہ سے مومن مقتول کا رشتہ اس کے کافر وراثوں سے اسلام کی نظر منقطع ہے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ کافر مسلمان سے حالتِ جنگ میں ہیں چنانچہ مالی تلافی اور خون بہا کا مسئلہ یہاں پیش نہیں آتا۔

(iii) وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

''اگر مسلمان مقتول ایسے گھرانے سے ہو جو کافر ہیں مگر مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ بھی رکھتے ہیں تو اس صوررت میں پیمان کے احترام کیلئے قاتل کو ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیے اور پس ماندگان کو خون بہا بھی دینا چاہیے۔ اگر غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو دو ماہ پے در پے روزے

رکھے۔ یہ ایک طرح کی تخفیف وتوبہ ہے جس کو خدا قبول کرتا ہے۔ خدا علیم اور حکیم ہے۔'' (نساء۔ ۹۲)

''وان كان من قوم بينكم وبينهم ميثاق'' کا فقرہ کہہ رہا ہے کہ ورثا کافر ہیں اس سے مراد مسلمانوں کا آپس میں عہد و پیمان نہیں یہ واحد موقع ہے کہ جہاں ایک کافر اس پیمان کی وجہ سے جو اس کے لوگوں اور مسلمان سے میراث لے گا۔ یہ استثناء عہد و پیمان کی حفاظت اور اس کو برقرار رکھنے کیلئے ہے۔ اگر غلام آزاد کیا جانا ایک طرح اس معاشرتی نقصان کی تلافی ہے جو ایک مومن کے قتل سے اس معاشرے کو پہنچا ہے تو دیت کا ادا کرنا معاشی نقصان کا ازلہ ہے جو ایک شخص کے قتل ہونے سے اس کے گھر کو پہنچا ہے دو ماہ مسلسل روزے رکھنا اس اخلاقی اور روحانی نقصان کا ازالہ ہے جو قاتل کو لاحق ہوا ہے اگر چہ وہ قتل کا مرتکب غلطی سے ہوا ہے۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ غلام آزاد کرنا ایک عمل ''تقربی'' ہے[1] یہ بھی ممکن ہے کہ دو ماہ مسلسل روزہ رکھنا کہ جو خود بھی عبادت ہے اس کی جگہ لے لے۔ یہ بات کہ اول صورت میں مقتول کے وارثوں کی طرف سے دیت معاف کیے جانے کی بھی گفتگو آئی ہے یعنی ''الا ان يصدقوا'' جبکہ دوسری اور تیسری صورت میں خون بہا معاف کرنے کا ذکر اس لیے نہیں آیا کہ پہلے صورت میں مقتول کے ورثا مسلمان تھے اور دوسری تیسری صورت میں یہ ورثا مسلمان نہیں بلکہ کافر تھے۔ چنانچہ ان صورتوں میں معاف کرنے کا سوال نہیں اٹھتا اور اس لیے یہ بات نہیں کی گئی ایک بات یہ بھی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے کسی مسلمان کو غیر مسلم کا زیر بار اور احسان مند نہیں ہونا چاہیے۔

اس گفتگو سے یہ بات واضح ہوئی کہ پہلی صورت میں دیت ادا کرنے سے پہلے غلام آزاد کرنے کا حکم کیوں آیا ہے جبکہ تیسری صورت میں کیفیت اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ جب وارث مسلمان ہوں اور دیت ادا کرنے میں دیر ہو تو کوئی نامناسب ردعمل کا خدشہ نہیں۔ اس کے برعکس اگر وارث غیر مسلم ہوں۔ جن سے عہد و پیمان ہو چکا ہے تو دیت ادا کرنے میں تاخیر سے عہد و پیمان پر برا اثر پڑ سکتا ہے اور جلدی ادا کرنے کے حکم کا مطلب یہ ہے کہ عہد و پیمان نباہنے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۲۔ قتل عمد میں مسئلہ قصاص بھی ذکر ہوا ہے اور زیر غور آیات میں اس بات کی طرف ''الا بالحق'' سے اشارہ ہوا ہے کہ دوسری آیات میں یہ مسئلہ اور بھی واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ قصاص کا مسئلہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، چنانچہ اس پر تحقیقی اور غور و خوض ہونا چاہیے۔

قرآن کی رُو سے قصاص

جو مسائل تحقیق طلب ہیں ان میں سے ایک قرآن میں تجویز کردہ مسئلہ قصاص بھی ہے یہ آسمانی کتاب قصاص کو معاشرے کی زندگی کا ضامن سمجھتی ہے۔ جن آیت کا ذکر ہو رہا ہے وہ قرآن کے دائمی منشور کا پانچواں اصول ہے۔ یہ ہر قسم کی خون ریزی کو شدت سے روکتی ہے اور انسان کے قتل کی صرف ایک صورت جائز سمجھتی ہے یعنی وہ عدالت انصاف کے تقاضے کے تحت بطور ''حق'' انجام پائے جیسا کہ ''الا بالحق'' سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس فقرے کا وسیع مفہوم ہے اور اس سے تقاضائے حق کی روشنی میں قتل کا جواز ملتا ہے۔ اس کی واضح مثال

---

[1] ''تقربی عمل'' وہ عمل ہے جو قرب خدا کا سبب بنے، چاہے وہ عبادت شمار نہ ہو۔ صدقہ دینا خمس و زکوۃ سب ہی اعمال تقربی شمار ہوتے ہیں۔

''قصاص'' کی ہے عرب زبان میں قصاص کسی چیز کا پیچھا کرنے اور اس کے تعاقب میں جانے کو کہتے ہیں۔ گویا جو خون ناحق بہایا گیا ولی اس کا قصاص کے ذریعے تعاقب کرتا ہے۔

قصاص سے متعلق آیات دو قسم کی ہیں

(الف) چند آیات خاص قصاص سے متعلق ہیں مثلاً:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ

''اے صاحبانِ عقل! قصاص تمہارے لیے حیات ہے۔'' (بقرہ۔۱۷۹)

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ

''مقولین کے بارے میں تمہارے لیے قصاص کا حکم دیا گیا ہے۔'' (بقرہ۔۱۷۸)

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ

''جو شخص ناحق مارا جائے اس کے ولی کو انتقام لینے کا اختیار دیا گیا مگر اس سلسلے میں وہ حد سے تجاوز نہ کرے۔'' (بنی اسرائیل۔۳۳)

(ب) بعض آیات میں یہ کلیہ پیش کیا گیا ہے کہ ہر قسم کی زیادتی کو جواب اسی کے برابر ہونا چاہیے۔ مثلاً:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ

''برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے اور اگر کوئی معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا اجر و ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔'' (شوریٰ۔۴۰)

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ

''اگر مواخذہ کرو تو اتنا ہی جتنا تم سے مواخذہ کیا گیا ہے۔'' (نحل۔۱۲۶)

قصاص سے متعلق آیات اتنی زیادہ ہیں کہ یہاں ان کا ذکر ممکن نہیں ان میں غور و غوض سے ہم کو مندرجہ ذیل نکات کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔:

ا۔ قصاص معاشرے کی زندگی کا ضامن ہے

ان لوگوں کے اس گمان کے برخلاف جن کا کہنا ہے کہ خون خون کو نہیں دھوسکتا قرآن معاشرے کو زندگی کے تحفظ کیلئے قصاص

تجویز کرتا ہے۔قرآن کے مطابق اکثر موقعوں پر انسانی جان کی حفاظت قانونِ قصاص کے نافذ کیے جانے سے ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ

''اے صاحبانِ عقل! قصاص میں تمہارے لیے حیات ہے۔''

قصاص کے سلسلے کے شدید اور سخت نظریات سے آشنائی کیلئے ہم اس بحث کی تمہید میں کچھ کہنا چاہیں گے: ''قصاص'' کے مخالفین کا کہنا ہے کہ کسی شخص کی زندگی کیوں ختم کی جائے اس کو پھانسی پر کیوں لٹکایا جائے خواہ اس نے ایک یا زیادہ بے گناہوں کو قتل کیا ہو، خون سے خون نہیں دھل سکتا۔اس لیے ایک اور آدمی کو کیوں مارا جائے۔ایک دوسرے گھر کو مزید بے آسرا کیوں کیا جائے۔

درحقیقت قاتلوں سے یہ ہمدردیاں اور اندازِ فکر نیا نہیں۔یہ خیالات عرصے سے پل رہے ہیں یہاں تک کہ سزا اور بدلے کے بارے میں کئی مکاتب فکر دنیا میں پیدا ہوئے ہیں اور جرم و سزا کے باب میں بڑا انقلاب آچکا ہے۔[1]

اس فکری انقلاب کا باعث دراصل یورپ والوں کا وہ ردِعمل تھا جس کا اظہار انہوں نے یورپ میں ہر جرم کیلئے بے رحمانہ غیر انسانی اور سخت سزاؤں کے رواج کے خلاف کیا۔

۱۷۸۰ء میں انگلستان میں ۳۵۰ جرائم کی سزا قتل تھی۔ ۱۸۳۹ء میں صرف ۱۸ جرائم کی سزا قتل رہ گئی اور باقی جرائم کیلئے قید کی سزا نافذ کی گئی۔

اس طرز فکر کے مقابل ایک دوسرے خیال کے لوگ بھی تھے اس فکر کو ''مکتب طرد'' کہتے ہیں۔اس خیال کے لوگ قائل ہیں کہ خطرناک مجرموں کو جن کی سماج دشمن حرکتیں ہر لحاظ افراد اور معاشرے کیلئے پریشان کن ہو جاتی ہیں اور جن لوگوں کی اصلاح ممکن نہیں رہی ان کو قتل کر دیا جائے یا آزادی سے بالکل محروم کر دیا جائے کسی خاص جگہ عمر قید رکھا جائے یا معاشرے سے الگ کر دیا جائے۔اس طرح معاشرہ ان سے پاک ہو جائے گا۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں افلاطون بھی اس خیال کا طرف دار تھا۔سولہویں اور سترہویں صدی میں بھی بہتیرے دانشور یہی طرزِ فکر رکھتے تھے اور جرائم پیشہ افراد کے عمر قید یا جلاوطنی کیے جانے کے قائل تھے بیسویں صدی کی کے اوائل کا دانشور (Maxwell) بھی ''مکتب طرد'' کا حامی تھا۔

افراط اور تفریط کے ان دو طریقوں کے رواج کے باوجود اب بھی دنیا میں چھوٹے بڑے ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ ایسے ممالک ہیں جہاں قتل کرنے کی سزا قتل ہے۔مثلاً:

انگلستان، ریاست ہائے متحدہ امریکہ (۵۰ سے ۴۲ ریاستیں مع کولمبیا اور مرکزی حکومت کے) فرانس، جاپان، ایران، آئرلینڈ، برما، پاکستان، ترکی تانگانیکا، ٹوگو، جبرالٹر، جزیرہ موریشس، ری پبلک جنوبی افریقہ، مرکزی افریقہ، مصر، ویتنام، چیکوسلواکیہ، چین (تائیوان فرمز) دھومی روڈیشیا، زنجبار، ساحل عاج، سالواڈور، سینگال، سوڈان، سیرینا، سیشلز، عراق، گھانا، فلپائن

[1]۔جرم شناسی ج ۲ ص ۳۲۵

،کمپوچیا، کیونیڈا، کیوبا، گیمبیا، گوٹے مالا، گینی جدید، لاؤس، لبنان، لہستان، لائبیر یا، مالادی ،ملائشیا، مراکش ،میکسیکو(اس کی چندریاستیں) ہندوستان اور ہانگ کانگ'[1]

اب مختصراً قصاص کے جواز کے دلائل پرغور خوض کیا جائے گا۔

۲۔قصاص کا خاتمہ مجرموں کو کھلی چھوٹ دینا ہے

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسلام ہر طرح کے قصاص کا قائل نہیں،قصاص کیلئے حدود ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ایک قتل کے بدلے میں دسیوں آدمی قتل کیے جائے یا کسی ایک آدمی کے قتل ہوجانے پر پورے پورے قبیلےاور خاندان سے بلاوجہ انتقام لیا جائے ۔یہ نہیں کہ فارسی محاورے کے مطابق ایک رومان کی خاطر قیصرے کے محل کو آگ لگادی جائے ۔اسلام آنے سے پہلے زمانہ جاہلیت میں ایسا ہی ہوتا تھا اور آج بھی بعض قوموں میں کہیں کہیں یہ طریقہ مروج ہے۔

ساتھ ہی ساتھ مظلوم کے خون کو نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا،مقتول کے وارثوں سے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے تم دفاع اور قصاص کا حق نہیں رکھتے۔ایسا کرنا گویا معاشرہ کا میدان جرائم پیشہ افراد اور فسادیوں کے ہاتھوں میں دے دینا ہے اور قاتلوں کے ہاتھ میں کھیلنا ہے۔بے گناہوں کا خون رائیگاں کرنا اور بدلہ لینے کی خواہش جو وارثوں کے سینوں میں ہو۔ اس سے بے اعتنائی برتنا ہے یہ دونوں ہی سلسلے خطرناک ہیں ۔معاشرے میں خون کے بہنے کو نظرانداز کردینا بدامنی کا سبب بن سکتا ہے۔اور وارثوں کو بدلہ نہ لینے دینا نہ صرف منصفانہ نظام سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ دنیا کے کسی جمہوری اور ترقی یافتہ نظام سے ہم آہنگ نہیں ۔ چنانچہ یہ منطق کہ خون سے خون نہیں دُھل سکتا ہر جگہ صحیح نہیں ۔ بلکہ اکثر موقعوں پر دوسروں کی عبرت کیلئے مجرموں اور ظالموں کو مناسب سزا ملنی چاہیے،بدلہ لے کر اس کا اس کے صحیح مقام پر پہنچانا چاہیے۔انسان دشمن کی سرکوبی کرنی چاہیئے تاکہ فتنہ فساد اور اس کے شر کی روک تھام ہوسکے۔جیسا کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

ردوا الحجر من حیث جاء فان الشر لایدفعه الاالشر [۲]

''جدھر پتھر آئے اُسے اُدھر پلٹادو۔کیونکہ سختی کا خاتمہ سختی ہی سے ہوسکتا ہے۔''

امام سجاد علیہ السلام نے قصاص کے بارے میں مختصراً جو کچھ فرمایا ہے وہ درحقیقت آیہ قصاص کی تفسیر ہے اس پر غور کرنا بہت مفید ہوگا۔امام سجاد علیہ السلام نے آیت۔

وَلَكُمۡ فِي ٱلۡقِصَاصِ حَيَوٰةٞ يَٰٓأُوْلِي ٱلۡأَلۡبَٰبِ

''اے صاحبانِ عقل! تمہارے لیے قصاص میں حیات ہے۔''

[۱]۔''اعدام''(پھانسی) تالیف مارک آنسل،بانی،مکتب دفاع اجتماعی) ترجمہ:مصطفےٰ رحیمی۔ص ۱۸۔۱۹

[۲]۔نہج البلاغہ،حکیمانہ کلمات،شمارہ ۳۱۴

کی قرأت کے بعد فرمایا:

ولکم، اُمة محمد فی القصاص حیاۃ لان من هم بالقتل فعرف انه یقتص منه فکف لذلك عن القتل ،کان ذلك حیاۃ الذی هم بقتله وحیاۃ لهذا الجانی الّذی ارادان یقتل وحیاۃ لغیر هما من النّاس ،اذاعلموا ان القصاص واجب لایجترون علی القتل ،مخافة القصاص ۔[1]

''اے امت محمدؐ! تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ قصاص تمہارے اور اسلامی معاشرے کیلئے حیات اور زندگی کا سبب ہے کیونکہ جو شخص قتل کا ارادہ رکھتا ہے، مگر جانتا ہے کہ قاتل بھی آخر کار قتل کیا جائے گا تو مجبوراً وہ اپنے شیطانی خیال کو چھوڑ دے گا اور قتل کرنے سے باز آجائے گا۔

چنانچہ اول قصاص کا جواز اور ضرورت یہ ہے کہ یہ اس شخص کی حیات کا باعث ہے جو قتل کیا جانے والا تھا مگر بچ گیا دوسرے یہ کو خود مجرم کی زندگی کا بھی باعث ہے کہ اگر وہ کسی کے قتل کا مرتکب ہوتا تو اس سے بھی قصاص لیا جاتا اور قتل کیا جاتا۔ مگر اس قصاص کے خوف سے اس نے قتل جیسے جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ تیسرے قصاص دوسروں کی زندگی کا بھی سبب ہے۔ معاشرے میں دوسرے لوگوں کی جان بھی اس ذریعے سے امان میں رہے گی۔ لوگ قصاص کے خوف سے دوسروں کے قتل کے اقدام سے بچیں گے (عبرت حاصل کریں گے)

۲ زیادتی ممنوع ہے

قرآن قصاص کو جائز سمجھتا ہے، مگر اس کے باوجود اس سے علاج اور دوا کا کام لیتا ہے اور ہر قسم کی زیادتی کو روکتا ہے وہ صاف صاف اعلان کرتا ہے کہ:

فلا یسرف فی القتل......

''خونریزی میں زیادتی نہ کرو اور قتل کرنے میں حدود سے نہ بڑھو۔''

ایک قتل کیلئے ایک قتل ایک عضو کیلئے ایک عضو کا قصاص ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ (مائدہ۔۴۵)

---

[1] ۔وسائل ج ۱۹۔کتاب قصاص۔باب ۱۹۔حدیث ۶،ص ۳۸۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اعلیٰ وارفع مقام کے باوجود اپنے قاتل سے قصاص کیلئے آخری وصیت میں فرمایا:

انما انا رجل واحد فلا یقتل بی الا واحد [1]

''میں ایک ہی شخص ہوں میرے بدلے میں صرف ایک شخص کو قتل کرنا۔''

اس میں اہم نکتہ یہ ہے کہ قصاص صرف مقتول کے خاندان والوں کے دلوں کی تشفی کیلئے نہیں ہے، بلکہ عام مصلحتوں اور فائدوں کو بھی اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے۔اس حکم قصاص کا اجتماعی فلسفہ بہت بلند اور اہم ہے اور اس کے مقابلے میں انتقام اور دلوں کی تسلی کی کوئی حیثیت نہیں۔

۳۔قصاص کے ساتھ معافی بھی ہے

قرآن اگر قصاص کا حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ عفو اور معافی کا بھی ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے:

فَمَنۡ عَفَا وَاَصۡلَحَ فَاَجۡرُهٗ عَلَى اللّٰهِ‌ؕ

''جو شخص عفو و درگزر سے کام لے اور صلح کر لے تو اس کا اجر وثواب اللہ کے ذمے ہے۔'' (شوریٰ۔۴۰)

اگر قرآن مجرم کی سزا کا حکم دیتا ہے تو ساتھ ساتھ جہاں صبر اور تحمل زیادہ مفید ہے، وہاں اس کی طرف بھی توجہ مبذول کرواتا ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَهُوَ خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ

''اگر صبر وشکیبائی اختیار کرو تو وہ صابروں کیلئے بہتر ہے۔'' (نحل۔۱۲۶)

آخر میں قرآن اس معاملے کے دونوں پہلوؤں میں سے ایک کے انتخاب کا حق مقتول کے وارث کو دیتا ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

فَقَدۡ جَعَلۡنَا لِوَلِيِّهٖ سُلۡطٰنًا

''ولی کو اختیار ہے کہ مصالح کو مدِ نظر رکھ کر مصالح کے مطابق عمل کرے۔'' (بنی اسرائیل۔۳۳)

مندرجہ بالا نکات کی طرف توجہ کرنے سے قصاص کے بارے میں قرآن کا حکم اور اس کا معاشرے کیلئے مفید ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ساتھ ساتھ افراط وتفریط کے فکر کا پوچ ہونا بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔

---

[1] ۔نہج البلاغہ مکتوب ۴۷۔حضرتؑ نے اولاد عبد المطلب کو اس خطرے سے آگاہ کا یکہ کہیں ''امیر المومنین قتل ہو گئے، امیر المومنین قتل ہوئے، کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے آلودہ نہ کریں۔'' آگاہ رہو سوائے ایک شخص کے اور وہ بھی میرا قاتل، دوسرا شخص قتل نہ ہو۔''

قرآن کا دائمی منشور

چھٹا اصول

یتیم کی حمایت

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ

یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر احسن طریقے پر (جو یتیم کے مفاد کی حفاظت کیلئے ہو) یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی اور رشد و کمال تک پہنچ جائے۔

(انعام۔ ۱۵۲)

وَلَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡيَتِيۡمِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ حَتّٰى يَبۡلُغَ اَشُدَّهٗ‌ ۚ

یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر احسن طریقے پر (جو یتیم کے مفاد کی حفاظت کیلئے ہو) یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی اور رشد و کمال تک پہنچ جائے۔

(انعام۔ ۱۵۲)

بچہ انسانی معاشرے کی بنیاد کی خشتِ اول ہے، کوئی عمارت اسی وقت مستحکم ہوگی جب اس کے ستون اور بنیاد استوار ہو، چنانچہ بچے کی صحیح تربیت اور پرورش اس کو انحراف اور کج روی سے بچانا، اس کے حقوق کی دشمنوں سے حفاظت کرنا اپنی جگہ خود معاشرے کی تعمیر ہے۔ چنانچہ ترقی یافتہ معاشروں میں اور دین اسلام میں قرآن و احادیث کی رو سے بچوں کے ایسے خصوصی حقوق ہیں جو معاشرے کے دوسرے افراد کے لئے نہیں ہیں۔ بچوں میں بھی ''یتیم بچوں'' کی طرف بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ فقہ اسلامی میں یتیم بچوں کیلئے ایک الگ باب ہے۔

بچہ دراصل اپنی کم عمری اور ناتوانی کی وجہ سے کسی ہمدرد سرپرست کا محتاج ہوتا ہے، جو اس اجنبی دنیا میں اس کا ساتھ دے اور اس بچے کے مادی اور روحانی حقوق کی حفاظت کرے۔ اس حمایت اور سرپرستی کی بچے کو سن بلوغ تک ضرورت ہوتی ہے۔ جن بچوں کے مشفق سرپرست ان کے ساتھ ہوتے ہیں ان کی تربیت، پرورش، اور ہر طرح کی حفاظت بآسانی انجام پاتی ہے۔ پدری محبت خود اپنی جگہ بچے کیلئے ایک عظیم سہارا ہے باپ اس ذمہ داری کو خواہ کتنا بھی اپنے کندھوں سے ہٹانا چاہے فطری لگاؤ اس کو بچے کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھنے پر مستعد رکھتا ہے۔

ظاہر ہے یتیم جو اپنے حقیقی سرپرست سے محروم ہو گیا ہو۔ اس سرپرستی اور شفقت اور حمایت کا بہت زیادہ محتاج ہے اسلامی معاشرہ اپنے اس فرد کیلئے ایک خصوصی ذمہ داری عائد کرتا ہے تاکہ آگے چل کر وہ قوم کا کارآمد رُکن بن سکے۔

چنانچہ قرآن مجید نے مختلف سورتوں میں یتیم کے موضوع پر بات کی ہے اور اس کے حقوق اور کیفیات کو بیان کیا ہے۔ لفظ ''یتیم'' اپنے دوسرے مشتقات کے ساتھ قرآن میں تیئیس مرتبہ آیا ہے۔ یتیم اور اس کے لازمی حقوق کے بارے میں قرآن کے تمام احکام سے شناسائی کیلئے ضروری ہے کہ ''یتیم'' سے متعلق ساری آیات یکجا کر دی جائیں۔ پھر مختصراً تفسیر موضوعی کی طرز پر ان پر گفتگو کی جائے۔

۱۔ گزشتہ شریعتوں کی نظر میں یتیم

قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ خداوند رحیم و کریم نے یتیم کیلئے نہ صرف دین اسلام میں لطف، مہربانی اور شفقت سے پیش آنے کو کہا ہے، بلکہ گذشتہ شریعتوں میں بھی قانونِ الٰہی نے یتیم کی حمایت کی تھی گذشتہ زمانے میں بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے ایسا پیمان لیا تھا، جس کی رو سے ان کو ''یتیم'' سے نیکی اور شفقت کرنے کو کہا گیا تھا جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا

وَّذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ

''یاد کرو وہ وقت جب خدا نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا اور ان کو حکم دیا کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں، اور ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیکی کریں۔'' (بقرہ۔ ۸۳)

۲۔ یتیم کا پناہ دینا

یتیم کی حالت کی بہتری اور اس کی زندگی کی حفاظت کیلئے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اس کی بے سروسامانی دور کرنے کیلئے اس کا کوئی سرپرست مقرر کیا جائے تا کہ وہ اپنے اس سرپرست کے سائے میں اپنی نشوونما اور رشد و کمال کی طرف بڑھے۔ قرآن مجید اس عمل کو ''ایواء'' کے لفظ سے پکارتا ہے جس کی معنی پناہ دینے کے ہیں بات یہ ہے کہ جو بچہ اپنے باپ سے محروم ہو جاتا ہے وہ اپنے سب سے بڑے عزیز ترین پناہ دینے والے کو کھو بیٹھتا ہے۔

چنانچہ اول اول اس کیلئے رشتہ داروں میں سے نزدیک ترین کو اس کا سرپرست بننا چاہیے تا کہ وہ ان کے درمیان اجنبیت محسوس نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یتیمی کے دور میں جو نعمتیں ان پر نازل فرمائیں ان میں سے ایک ''پناہ'' فراہم کرنا تھا۔ چنانچہ خداوندِ عالم دوسری نعمتوں سے پہلے ان نعمت کا ذکر کرتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی ۪﴿۶﴾

''کیا تم کو اس نے یتیم نہیں پایا اور پناہ دی۔'' (الضحیٰ۔ ۶)

اسلام کا حکم ہے کہ لوگ اس کو اپنے گھر لے جائیں اور اولاد کے درمیان تربیت کریں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من کفل یتیماً من المسلمین فادخله الیٰ طعامه وشرابه ادخله الله الجنة البتة[1]

''جو شخص یتیم بچہ اپنے گھر لے جائے اور کھانے پینے کی چیزوں میں اس کو اپنا شریک قرار دے تو خدا ضرور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔''

ایک ایرانی شاعر نے گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد ہی سے وجدان حاصل کرتے ہوئے کہا ہے:

---

[1]

پدرمرده راسایه برفرفگن

غبارش نیفشاں وخارش فگن

اگرسایه خودشبرفت ازسرش

تودرشایه خویشتن پرورش

''یتیم کے سر پر سایہ ڈال دے!! اس سے گرد صاف کر اور کانٹا نکال دے۔ اگر اس کا اپنا سایہ سر سے اُٹھ گیا ہے۔ تو تو اپنے سایہ میں اس کی پرورش کر۔''

۳۔ یتیم سے حسنِ سلوک

قرآن دو موقعوں پر ''یتیم'' سے نیکی کرنے کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے:

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ

''ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے نیکی کرو۔'' (نساء۔۳۶)

یہی مضمون سورۂ بقرہ کی آیت ۸۳ میں بھی آیا ہے، یتیم سے نیکی بہر حال مختلف صورتوں میں انجام دی جاسکتی ہے، مگر اس کی تربیت اور تعلیم سے بڑھ کر اور کوئی نیکی نہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام صحابی کو حکم دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

ادب اليتيم بما تؤدب منه والدك

''یتیم کی اس طرح تربیت کرو جس طرح اپنے بیٹے کی تربیت اور اصلاح کرتے ہو۔''

۴۔ یتیم سے مہربانی کا برتاؤ

یتیم سے مہربانی اور التفات سے پیش آنا اس سے نرم اور شریں گفتگو کرنا اور اس کی قدر کرنا ان حقوق انسانی میں سے ایک ہے جس کی خداوند تعالیٰ ایک معاشرہ اسلامی سے توقع رکھتا ہے، یتیم بچے کے احساسات اس قدر نازک اور لطیف ہوتے ہیں کہ دوسروں سے بہترین سلوک کی توقع میں ان باتوں سے بھی ملول اور آزردہ ہو جاتا ہے جو باتیں عموماً اور بچوں کو بری نہیں معلوم ہوتیں۔

چنانچہ قرآن مختلف آیات میں مختلف عنوان سے یتیم کی حساسیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ باتوں کا ذکر کرتا ہے جن کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(الف) جو لوگ یتیموں کی عزت نہیں کرتے ان کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ﴿١٧﴾

''ایسا نہیں ہے، وہ یتیم کا اکرام واحترام نہیں کرتے۔'' (فجر۔۱۷)

(ب) جو لوگ یتیم کا احترام ملحوظ رکھتے اور اس کو اپنے دروازے سے دھتکار دیتے ہیں، ان کو قرآن ایسے افراد میں سے سمجھتا ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ﴿١﴾ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ﴿٢﴾

''کیا توں نے اس شخص کو دیکھا ہے جو روز جزا پر ایمان نہیں رکھتا وہ وہی ہے جو یتیم کو اپنے گھر کے دروازے سے دھتکارتا ہے۔'' (ماعون۔۱،۲)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من مسع رأس یتیم کانت له بکلّ شعرة مرت عیلها یده حسنات [1]

''جو شخص یتیم کے سر پر دست شفقت پھیرتا ہے خداوند عالم ان بالوں کی تعداد کے برابر جو اس کے ہاتھ کے نیچے سے گزرتے ہیں اس کو نیکیاں اور اجر دے گا۔

۵۔ یتیم کی نقدی اور اجناس سے مدد

اسلامی معاشرے میں اگرچہ یتیم اپنے کسی قریبی رشتہ دار یا کسی صالح فرد کی کفالت میں آجاتا ہے تاہم بعض اوقات وہ یتیم کے سارے اخراجات برداشت نہیں کر پاتے۔ اس لیے قرآن مجید حکم دیتا ہے کہ صاحب ایمان افراد یتیموں کے بارے میں خود بھی ذمہ داری کا احساس رکھیں اور نقدی اور اجناس ان کیلئے مہیا کریں۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ

''مال جس کو وہ دوست رکھتا ہے ذوی القربیٰ، یتیموں اور مسکینوں کو دے۔'' (بقرہ۔۱۷۷)

ایک دوسری آیت میں قرآن یتیموں کو ان لوگوں میں سے قرار دیتا ہے جن کی مالی مدد کرنی چاہیئے:

قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ

[1] ۔ مستدرک۔ ج ۲۔ ص ۶۱۶

''کہہ دو! جو کچھ تم خرچ کرتے ہو والدین، عزیز و اقارب، یتیموں اور مسکینوں پر ا (اور خدا کی رضا کا سبب ہے)'' (بقرہ۔۲۱۵)

کبھی قرآن حکم دیتا ہے کہ ان کو کھانا کھلانے کی صورت میں خرچ کیا جائے، کریم شخص یتیم کو اپنے دسترخوان پر بٹھائے اور اپنے ساتھ کھانا کھلائے تاکہ وہ خوشی محسوس کرے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

ویطعمون الطعام علیٰ حبه مسکیناً ویتیماً واسیراً

''اس کی محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔'' (دھر۔۸)

قرآن ذمہ داریوں کے بنانے کی ایک نشانی یہ بتاتا ہے کہ قحط کے موقع پر رشتہ دار یتیم کو کھانا کھلاتے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ﴿۱۵﴾

''یا کھانا کھلانا بھوک کے دن رشتہ دار یتیم کو۔'' (بلد۔)

قرآن تاکیدی احکام کے ذریعے کمزور یتیم بچے کیلئے اپنی مہربانی اور شفقت کو ظاہر کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ عیسائیوں کے گمان کے برخلاف اسلام مہر و محبت اور شفقت کا دین ہے، جہاں مہر و محبت ضروری ہو وہاں اس انسانی جذبے سے استفادہ کرتا ہے اور جہاں تلوار کی کاٹ کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تلوار استعمال کرنے کو کہتا ہے۔

۶۔ یتیم ''مستضعف'' کا واضح مصداق ہے

آج کے دور میں ''مستضعفین'' کے مسئلے کی طرف سب کی توجہ مرکوز ہے، ہر تحریر و تقریر میں یہ موضوع زیر بحث ہے ہم اس وقت ''مستضعف'' کے لغوی معنی کیا ہیں یا قرآن ان کے بارے میں کیا کہتا ہے، اس گفتگو میں نہیں پڑیں گے یہ موضوع ہماری بحث سے باہر ہے ،لیکن اگر ''مستضعف'' کے حق بحال کرنے اور ان کی حالت بہتر بنانے کیلئے ''بنیاد مستضعفین'' قائم کی ہے۔ یتیموں کی دیکھ بھال اور جو بچے اپنے سرپرستوں سے محروم ہو گئے ہیں ان کی سرپرستی بھی حکومت اسلامی کے ذمہ ہے۔ بنیادی طور پر یتیم کا وجود، خواہ وہ امیر ہو یا غریب ،ایک ایسا اجتماعی مسئلہ ہے جس کو اسلام کے زندگی بخش اصولوں کے ذریعے حل کرنا چاہیئے، مغربی طرز پر عام یتیم خانے بنانے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ایسے ادارے اخلاق اور انسانی اقدار سے عاری ہوتے ہیں۔ وہ بچے جوان میں پلتے بڑھتے ہیں، گھریلو ماحول سے دوری کی وجہ سے اور خشک صبح و شام گزارنے کی بناء پر ان اداروں سے ایسے انسان بن کر نکلتے ہیں جو مہر و محبت کے جذبات سے خالی اور فطرت سے دور ہوتے ہیں۔

قدرتی اور صحیح طریقہ وہی ہے جو اب تک اسلامی معاشروں میں رائج رہا ہے۔ یعنی یتیم ہمیشہ قریبی رشتہ داروں کے سپرد ہوتے یتیم

بچے اپنے چچا یا ماموں کے یہاں ان کی اپنی اولاد کی طرح زندگی گزارتے، کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہ کرتے اور نہ شفقت اور محبت سے محروم ہوتے ان کو ایک قدرتی ماحول ملتا ہے۔ بعض اوقات قریبی رشتہ داروں کے مالی حالات اس یتیم کی کفالیت میں حائل ہوں تو حکومت اسلامی یتیم کی زندگی کے ضروری اخراجات پورے کرے، اس کام کیلئے حکومت ایک فنڈ مقرر کرے جو ہمدرد اور نرم دل لوگوں کی سر پرستی میں کام کرے یا پھر یتیموں کے سر پرست ادارے قائم ہوں جو اس کام کو اپنے ذمے لیں اسلامی معاشرے کے ذہن نشین کرایا جائے کہ پیغمبر کرام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

انا و کافل الیتیم کھاتین فی الجنة

''(پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دو انگلیاں یکجا کر کے فرمایا کہ) میں اور وہ شخص جو یتیم کی سر پرستی کرے جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح یکجا ہوں گے۔'' (سفینۃ البحار، جلد ۲ صفحہ ۷۳۱)

جیسا کہ عرض کیا گیا یتیم کا وجود خود اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے، خواہ وہ غریب ہو یا نہ ہو۔ اس کے حل کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرنی چاہیئے۔ قرآن نے بہت کوشش کی ہے کہ معاشرے کے مہر و محبت کے جذبات کو یتیم کی طرف موڑ دے۔ یہاں تک کہ حکم دیا کہ میت کا ترکہ تقسیم کرتے وقت اگر اس خاندان میں کوئی یتیم ہو تو ایک حصہ اس کو بھی دیا جائے۔ خواہ وہ وارث نہ بھی ہو۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَاِذَا حَضَرَ الۡقِسۡمَةَ اُولُوا الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنُ فَارۡزُقُوۡهُمۡ مِّنۡهُ وَقُوۡلُوۡا لَهُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا۝۸

''ترکہ تقسیم کرتے وقت رشتہ داروں، یتیموں اور غریبوں کو اس میں سے حصہ دو اور ان کے ساتھ اچھی بات کرو۔'' (نساء۔۸)

آیت ظاہراً ترکہ تقسیم کرنے کے وقت سے متعلق ہے۔ یہ ذمہ داری وارثوں کی ہے کہ وہ میراث کے اپنے حصے سے یتیم اور دوسرے لوگوں کو دیں جن کا آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیت وصیت کرنے کے وقت سے متعلق ہے یعنی وصیت کرنے والے پر لازم ہے کہ وصیت کرتے وقت یتیم اور مسکین پر نظر رکھے، بہر صورت مقصد یہ ہے کہ معاشرے کی توجہ ان ضرورت مند لوگوں کی طرف مبذول رہے۔

۷۔ یتیم کے مال کی نگہداشت

اب تک جن آیات پر گفتگو ہوئی ہے وہ سب غریب یتیم کے متعلق تھیں، قرآن نے اپنے ان اہم ارشادات کے ذریعے غریب یتیم کی مشکلات اور اس کے مسائل حل کیے ہیں۔ مگر یہ بھی نظر میں رہے کہ وہ یتیم جو غریب نہیں اس کے مشکلات بھی کسی غریب یتیم سے کم نہیں، چنانچہ

ضروری ہوا کہ اسلام ایسے حل پیش کرے جس سے ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کی حفاظت کی جاسکے ایسا نہ ہو کہ موقع پرست ان کے حامی اور ہمدرد بن کر ان کے مال ومتاع کو خورد برد کرلیں۔اس سلسلے میں جو آیات نازل ہوئی ہیں وہ ایک خاص ترتیب سے یہاں پیش کی جارہی ہیں:

(الف) کچھ آیات بتائی ہیں کہ جو لوگ یتیم کا مال خورد برد کرتے ہیں شدید ترین سزا ان کے انتظار میں ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۰﴾

''جو لوگ یتیم کا مال ظلم وجور سے کھاتے ہیں درحقیقت وہ آگ کھاتے ہیں (ان کے شکم میں وہ آگ میں تبدیل ہوجاتا) اور وہ جلد ہی وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالے جاہیں گے۔(نساء۔۱۰)

قرآن میں بہت کم موقعوں پر اس قسم کی تنبیہ اور دھمکی آئی ہے۔اور اس نوع کے ظلم وجور کے سلسلے میں قرآن کا موقف یہ ہے کہ عمل انسان کی دو شکلیں ہیں۔ایک جو نظر آتی ہے یعنی ظاہر اور ایک اس کا مخفی اور باطنی رخ یتیم کا مال ظلم سے کھانے کی باطنی صورت میں آگ ہے ۔گو اس کی حقیقت مادی انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہے اس کی حقیقت کے ادراک کیلئے ایک برتر حس کی ضرورت ہے۔آیت بظاہر ''انسان کے اعمال کے مجسم ہونے'' کی طرف اشارہ کررہی ہے یعنی انسان کے اس دنیا کے اعمال دوسرے جہان میں اپنی باطنی صورت میں مجسم ہوں گے یہ بہت مفصل اور دلچسپ بحث ہے جو آئندہ کسی موقع پر پیش کی جائے گی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کی قیامت کے دن کچھ لوگ قبر سے اس حال میں اٹھیں گے کہ ان کے منہ سے آگ گر رہی ہوگی ۔جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کون لوگ ہوں گے تو آپؑ نے مندرجہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔کچھ اور آیات بھی اس قسم کے ظلم کا ذکر کرتی ہیں۔مثلاً:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا

''یتیموں کا مال اپنے مال میں غلط ملط کرکے نہ کھاؤ، یہ کام بہت بڑا گناہ ہے۔''(نساء۔۲)

اس سے بڑھ کر اور کیا گناہ ہوگا کہ ایک قوی اور صاحب اختیار شخص ایک کمزور ناتواں اور اپنا بچاؤ نہ کرسکنے والے پر یورش کرے اور اس کی زندگی برباد کردے۔

(ب) کچھ لوگ یتیم کو ایک دوسری طرح ستاتے ......وہ یہ یتیم کے اچھے مال کو اپنے کم تر اور کم قیمت مال سے بدل لیتے قرآن ایسے لوگوں کو متنبہ کرتا ہے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ

''یتیموں کا مال خود ان ہی کو دو، ہرگز ان کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے نہ

بدلو۔‘‘(نساء۔۲)

اسلامی مفسرین کا کہنا ہے کہ جب اس قسم کی تہدید آمیز آیات نازل ہوئیں تو پرہیزگار ولیوں اور سرپرستوں نے جو یتیموں کی اپنی آغوش میں پرورش کرتے تھے اور ان کی زندگی کے آخراجات خود ان یتیموں کے مال سے پورا کرتے تھے، انہوں نے طے کر لیا کہ وہ یتیم کو بود و باش اپنی بود و باش سے بالکل جدا کر دیں اور اپنے مال میں ایک دینار بھی یتیم کے مال سے مخلوط نہ ہونے دیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ردعمل یتیم کے مفاد میں نہیں تھا۔ اس سے تو وہ بے چارے دیندار لوگوں کے التفات سے محروم ہو جاتے جب کوئی اچھا کام اور منصوبہ اشکالات سے دوچار ہو جائے تو نیک اور پرہیزگار لوگ کم ایسے کام میں ہاتھ ڈالنے کیلئے تیار ہوتے ہیں۔ یہی بات سبب بنی کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یتیم سے معاملات کرنے اور اس کے مال وجائیداد کے انتظام کے بارے میں سوال کیا گیا تو قرآن نے اس کے جواب میں افراط وتفریط دونوں طریقوں کی مذمت کی بلکہ کہا کہ یتیموں کے ساتھ تمہارا سلوک اور رویہ سچا اور بھائی چارگی کا ہونا چاہیے، نہ تو یتیم کے مال کو خورد برد کرو نہ ہی ایسے محتاط ہو جاؤ کہ ان کی بود و باش اپنے سے الگ کر دو۔ اس کے بجائے تیسری راہ یعنی درمیانی راہ اختیار کرو۔ جیسا کہ فرمایا:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ

’’یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ ہر وہ کام جو یتیموں کی اصلاح اور بہتری کے لئے ہے، وہ بہت اچھا ہے اگر ان کے ساتھ میل جول رکھو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور اللہ مصلحت اور اس مفاد کو جانتا ہے۔‘‘(بقرہ۔۲۲۰)

چنانچہ یتیم کے مال سے خرچ کرنے کا معیار یہ ہے کہ جو رقم خرچ ہو وہ یتیم کی مصلحت اور اس کے مفاد میں ہو جو اس کے مال اور تربیتی دونوں سلسلوں سے متعلق ہو۔

اکثر اوقات یتیم کی تربیت اور اس کی ذہنی نشوونما اس کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ اور خاندان کے دوسرے افراد ساتھ رہیں۔ اس کا حساب کتاب الگ نہ ہو۔ بلکہ اس کی زندگی گزارنے کے معقول خرچ اخراجات اسی کے مال میں سے کیے جائیں۔ قرآن ایک دوسری جگہ بھی ایسے میل جول کا ذکر کرتا ہے جو یتیم کے معنوی اور مادی فائدے میں ہو۔ اس کو اس طرح پیش کیا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ ھِيَ اَحْسَنُ [1]

’’یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر شائستہ اور احسن طریقے پر۔‘‘

---

[1] ۔سورہ انعام۔۱۵۲ اور سورہ بنی اسرائیل ۳۴۔

۸۔ ذمہ داری کی حدود

یہ نہیں کہ یتیم کی تربیت اور اس کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری کبھی بھی ختم نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس کی ایک طے شدہ حد اور مدت مدنظر ہونی چاہیئے، قرآن کی نگاہ میں یتیم کے معاملہ میں ولی کی ذمہ داری اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب یتیم حد بلوغت کو پہنچے، وہ مسلسل آزمائشوں سے یہ بھی ثابت کر دے کہ اب وہ اپنے مال کی حفاظت اور دیکھ بھال کے قابل ہو گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ

''یتیم جب حدِ بلوغ کو پہنچ جائیں تو ان کو آزماؤ اور پرکھو۔ اگر ان میں رشد (اور معاملہ فہمی) دیکھو تو ان کا مال ان کے سپرد کر دو۔'' (نساء۔۶)

قرآن مستقبل کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ولی کو خصوصی حکم دیتا ہے کہ جب یتیم کو اس کا مال سپرد کرو تو گواہ ضرور کر لو ایک یا کسی گواہ اس کے گذشتہ کردار کی درستی کی تصدیق کریں اور مال کی واپسی کے وقت یتیم کے افعال کی گواہی دیں جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا

''جب یتیم کا مال اس کے سپرد کرو تو گواہ بناؤ اور خدا حساب لینے کو کافی ہے۔'' (نساء۔۶)

''وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا'' کا فقرہ یتیموں کے ان ولیوں کو خبردار کرتا ہے کہ جن کی یہ سوچ ہو کہ جعلی گواہی کے ذریعے اپنا کام چلائیں گے۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایک باریک بین حساب کرنے والا دیکھ رہا ہے۔ اس کے سامنے کوئی بات چھپی نہیں اور وہ چھوٹی سی چھوٹی چیز کا حساب کرنے والا ہے۔

۹۔ یتیم کی تربیت کی ذمہ داری

یتیم کی تربیت اور اس کے مال اور جائیداد کی حفاظت قرآن ایک اجتماعی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ چنانچہ حکم دیتا ہے کہ صاحب حیثیت افراد یتیموں کیلئے جو تکلیف اٹھائیں اس کے لئے یتیم کے مال سے ایک دینار بھی نہ لیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ولی اور سرپرست نادار اور غریب ہو۔ اس صورت میں اپنی زحمت اور مشقت کا معاوضہ اس یتیم کے مال سے لے سکتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ

''اگر ولی خود صاحب مال ہے تو اپنے نفس کی پاک دامنی کو محفوظ رکھتے ہوئے اس میں سے کوئی چیز نہ لے اور اگر غریب و نادار ہے تو معروف مقدار میں (اپنا معاوضہ) اس میں سے لے۔'' (نساء۔٦)

۱۰۔عدل کا قیام

قرآن یتیم کے معاملہ میں جو جامع ترین گفتگو کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ان سے ہر قسم کی معاشرت عدل اسلامی کی بنیاد پر ہو۔جیسا کہ گرمایا گیا ہے:

وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلۡيَتٰمٰى بِالۡقِسۡطِ

''یتیموں سے متعلق معاملات میں عدل و قسط قائم کرو۔'' (نساء۔١٢٧)

چنانچہ قرآن ان عورتون سے شادی کرنے سے روکتا ہے، جن کی گود میں یتیم بچے ہوں اور مرد ڈرتا ہو کہ ان کے بارے میں عدل و قسط سے کام نہیں لے سکے گا۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِى الۡيَتٰمٰى فَانۡكِحُوۡا مَا طَابَ لَـكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ

''جب تم کو خوف ہو کہ عورتوں کے یتیموں کے بارے میں عدل و قسط سے کام نہیں لے سکو گے تو دوسری پاکیزہ عورتوں سے شادی کر لو۔'' (نساء۔٣)

یتیم کے متعلق آیات ہیں، دوسری بھی اخلاقی اور اجتماعی نکات ہیں، کہ امید ہے کہ انشاءاللہ کسی اور موقع پر ان پر گفتگو کی جائیگی۔

قرآن کا دائمی منشور

ساتواں اصول

قرآن

اور قسط وعدل

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ

ناپ تول کا حق انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ (انعام۔ ۱۵۲)

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ

ناپ تول کا حق انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ (انعام۔ ۱۵۲)

عدل وقسط جو ظلم و جور کی ضد ہیں، زندگی کے ان اہم مسائل میں سے ہیں، جن کا قرآن نے بہت ذکر کیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں لفظ ''عدل'' اپنے سارے مشتقات کے ساتھ ۲۷ مرتبہ اور لفظ ''قسط'' مختلف صورتوں میں ۲۳ مرتبہ آیا ہے۔ مختصر یہ کہ جہاں بھی معاشرہ انسانی کے عدل وقسط کا ذکر ہوگا وہاں لازمی طور پر قرآن عدل وقسط کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیتا ہے اور آدمی کو عدل کے راستے سے ہر طرح کے انحراف سے روکتا ہے۔

ہم اس مختصر اور مخصوص گفتگو میں قسط وعدل اور ظلم وجود کے سارے پہلو زیر بحث نہیں لا سکتے اور نہ ہی ان کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کر سکتے ہیں اس وقت ہمارا موضوع ناپ تول میں قسط وعدل کو ملحوظ رکھنا ہے۔ اسی ذیل میں اور بھی امور قارئین کی نگاہ سے گزریں گے۔

قِسط سے کیا مراد ہے؟

جو مسائل قابل توجہ ہیں ان میں سے ایک قرآنی لفظ ''قسط'' کو سمجھنا ہے۔ یہ کبھی مطلق عدل وانصاف کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی خصوصی معاشی انصاف کے طور پر پوری طرح آگاہ ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اس سلسلے کی جو آیت نازل ہوئی ہیں ان پر غور وخوض کیا جائے۔ قرآن میں قسط کا لفظ کبھی عدل کے ساتھ اور کبھی تنہا آیا ہے۔

عدل کے ساتھ والی ایک آیت کا ذکر کیا جاتا ہے؟

فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ⑨

''دشمنی رکھنے والے دو گروہوں میں عدل وقسط کے ساتھ صلح کرا دو اور عدل وقسط کو اختیار کرو کہ خدا قسط اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔'' (حجرات۔ ۹)

محدثین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں آنحضرتؐ نے امام آخر حضرت مہدی علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

فیملا الارض قسطًا وعدلاً کما ملأت جورًا وظلمًا۔ [1]

''وہ زمین کو قسط وعدل سے یوں بھر دیں گے جیسے وہ جور وظلم سے بھر چکی ہوگی۔''

---

[1] ۔ منتخب الاثر۔ ص ۱۴۷۔ یہ حدیث مختلف شکلوں میں کبھی جور کا لفظ ظلم سے پہلے اور کبھی بعد میں نقل کی گئی ہے۔

کچھ لوگوں کی نظر میں بظاہر قسط و عدل دو مترادف الفاظ ہیں اور ان کا ایک ہی معنی ہے جس طرح ظلم و جود کے بھی ایک ہی معنی ہیں اور تاکید کیلئے اکٹھے لائے جاتے ہیں مگر آیاتِ قرآنی اور احادیثِ اسلامی اور عربی لغت کی طرف توجہ کرنے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں کہیں لفظ قسط لفظ عدل کے ساتھ آتا ہے، اس سے مراد قسط اقتصادی اور حقوق و اموال میں انصاف ہے۔ اگر یہ قانون کلی نہ بھی کہا جا سکے تو اس کے اکثر معنی یہی ہوتے ہیں۔ ابن منظور کے مطابق پیغمبر کرام ﷺ نے فرمایا:

اذا حکموا عدلوا واذا قسموا اقسطوا۔ [1]

''جب فیصلہ کرتے ہیں عدل و انصاف سے کرتے ہیں اور جب تقسیم کرتے ہیں تو ہر شخص کا حصہ انصاف کے مطابق دیتے ہیں۔''

اس نکتے کی تائید ابو ہلال عسکری کے اس جملے سے ہوتی ہے جو اس نے اپنی کتاب ''الفروق'' میں لکھا ہے، وہ کہتا ہے:

''قسط' وہ حصہ اور مقدار ہے جس کی تقسیم میں انصاف کیا گیا ہو۔'' [2]

مختصر یہ کہ لفظ ''قسط'' 'تقسیط' کی طرح ''تسہیم'' کے معنی میں ہے یعنی سہم اور حصے کی تقسیم اور شرط کے ساتھ کہ حصہ کے تعین میں عدل اور انصاف ملحوظ رکھا جائے۔ چنانچہ واضح ہوا کہ جہاں کہیں یہ دونوں الفاظ (عدل وقسط) ساتھ آئے ہیں تو قسط سے ہمیشہ یا اکثر اوقات مراد عدلِ اقتصادی ہے یعنی اموال اور حقوق میں عدل کیا جانا۔ اب لفظ ''قسط'' جہاں تنہا آتا ہے اس پر گفتگو کی جائے:

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ قرآن اور اسلام میں لفظ ''قسط'' تمام حالات میں ''قسط اقتصادی'' کے معنی میں آیا ہے اور سارے انبیاء اسی مقصد کے حصول کیلئے بھیجے گئے ہیں۔ اس نکتے کی دوسری آیات کے ذریعے تائید کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ناپ تول سے متعلق آیات میں لفظ ''قسط'' استعمال ہوا ہے، لفظ ''عدل'' نہیں، وہ آیت یہ ہے۔:

وَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَالۡمِيۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ ۚ

''تم ناپ تول انصاف کے ساتھ کرو۔'' (انعام۔ ۱۵۲)

حضرت شعیبؑ اپنی قوم کو اقتصادی انصاف کی دعوت دیتے ہوئے لفظ ''قسط'' کو استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

وَيٰقَوۡمِ اَوۡفُوا الۡمِكۡيَالَ وَالۡمِيۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ

''اے قوم! ناپ تول کا حق عدل کے ساتھ ادا کرو۔'' (ہود۔ ۸۵)

قرآن اپنے کلی احکام میں جب لین دین میں عدل قائم کرنے کو کہتا ہے تو لفظ ''قسط'' کو استعمال کرتا ہے:

---

[1] ۔لسان العرب۔ مادۂ قسط۔

[2] ۔الفردق مادہ قسط

وَاَقِيۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِيۡزَانَ۝۹

''وزن کا حق انصاف سے ادا کرو اور کم فروشی نہ کرو۔'' (الرحمٰن)

لفظ ''قسط'' تنہا بغیر لفظ عدل کے کچھ دوسری آیات میں بھی عدل اقتصادی کیلئے آیا ہے۔[1]

یہ آیات یہاں نقل نہیں کی جارہی ہیں۔اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قسط کا لفظ قرآن میں عدل اقتصادی کیلئے آیا ہے خواہ ''عدل'' کے ساتھ ہو یا تنہا۔''

اتفاقاً نہج البلاغہ میں بھی لفظ قسط اس حصہ کیلئے جو انصاف کے ساتھ دیا گیا ہو استعمال ہوا ہے۔اس میں بھی بعض اوقات لفظ ''عدل'' کے ساتھ آیا ہے اور بعض اوقات اس کے بغیر مثلاً:

وقام بالقسط فی خلقه وعدل علیهم فی حکمه۔[2]

''اس نے اپنی مخلوق کے بارے میں قسط کے ساتھ قیام کیا اور فیصلہ کرنے میں عدل کو بنیاد قرار دیا۔''

امامؑ کے خطبے میں ''فی خلقه'' سے مراد انسان ہوں تو قسط کے یہاں معنی معاشرے میں اقتصادی انصاف کا حکم ہوگا۔بعض اوقات امامؑ نے لفظِ ''قسط'' کو تنہا استعمال کیا ہے اور اس سے منصفانہ حصہ اور مقدار مراد لی ہے چنانچہ مور کی خلقت کے ذکر میں فرماتے ہیں:

وقل صبغ الا وأخذ بقسط۔[3]

''بہت کم ہی رنگ ہوگا، مگر یہ کہ اس سے ضروری حصہ لیا ہے۔''

اس نقطہ نظر پر تنقید

آیاتِ قرانی میں غور و فکر اور ان پر توجہ اس قانون کے حتمی اور کلی ہونے کی نفی کرتی ہے قرآن میں لفظ ''قسط'' ایسے موقعوں پر بھی استعمال ہوا ہے، جہاں صرف اقتصادی انصاف ہی نہیں بلکہ انصاف کے تمام پہلو مراد ہیں۔

۱۔قرآن کی نگاہ میں انبیاءؑ کے آنے اور کتب نازل کرنے کا مقصد ''قسط کا قیام'' ہے۔قسطِ اقتصادی اس کل کا ایک جزو ہے بلکہ کہا جاتا ہے کہ نظامِ اقتصادی ایک صحیح انسانی نظام کی بنیادوں میں سے ہے، وہ قطعاً مقصد اور ہدف نہیں ہے آیت کا متن یہ ہے:

[1] ۔سورہ النساء آیت ۳۔اور آیت ۱۲۷ دیکھیں۔

[2] ۔نہج البلاغہ خطبہ۔ ۱۸۳

[3] ۔نہج البلاغہ خطبہ۔ ۱۶۳

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ

''ہم نے اپنے انبیاءؑ کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور حق و باطل کی پہچان اور پیمائش کا ذریعہ بھیجا تا کہ لوگ قسط و عدل قائم کریں۔'' (حدید۔ ۲۵)

یہ تو ظاہر ہے کہ انبیاء صرف اقتصادی انصاف کو منظم کرنے اور رائج کرنے کیلئے مبعوث نہیں ہوئے تھے، ان کا مقصد ان کی زندگی کے تمام ابعاد (Dumensions) میں عدل قائم کرنا تھا، خواہ وہ فکری ہوں یا عقیدتی اور انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ انبیاء صرف اقتصادی پروگرام کی تنظیم کیلئے بھیجے گئے تھے وہ انبیاء کے دین و شریعت کو محض مادی نگاہ سے دیکھتے ہیں خدا کے ایک نمائندے کی حیثیت سے نہیں، وہ انسان کو محض نسل کی افزائش اور مصرف کنندہ (Consuner) جاندار سمجھتے ہیں۔ اس کے بارے میں ساری بحث و تمحیص اسی نقطہ نگاہ سے کرتے ہیں۔ حالانکہ انسان کیلئے تنہا اقتصادی پہلو نہیں بلکہ اور دوسرے پہلو بھی ہین، جن کی اہمیت کسی طور کم نہیں۔

۲۔ خداوند عالم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ وہ کہیں کہ میرے پروردگار نے مجھے عدل و قسط کے ساتھ مامور کیا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ

''کہیں کہ میرے خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں قسط و عدل کو قائم کروں۔'' (اعراف۔ ۲۹)

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں قسط سے مراد انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں میں عدل کو قائم کرنا ہے۔ قسط اقتصادی ان میں سے ایک پہلو اور کل کا ایک جزو ہے۔

۳۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ جو لوگ منہ بولے بیٹے رکھتے ہیں وہ ان کو ان کے حقیقی باپ کے نام سے پکارا کریں۔ کیونکہ یہ کام قسط سے زیادہ قریب ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ

''ان کو ان کے باپ کے نام سے پکارو۔ یہ کام قسط (انصاف) سے زیادہ قریب ہے۔'' (احزاب۔ ۵)

یہاں قسط اقتصادی کا مفہوم نہیں نکلتا۔ خلاصہ یہ کہ جہاں قسط اور عدل دونوں الفاظ یکجا آئیں، وہاں یہ کہنا کہ قسط سے مراد اسلام کے مالی نظام اور اقتصادی انصاف کو ملحوظ رکھنا ہے، حقیقت کے قریب ہے اگر اس کو ایک کلی قانون کے طور پر قبول نہ بھی کیا جائے تو ایک غالب قانون کے طور پر ہم قبول کر سکتے ہیں۔ مگر جہاں قسط کا لفظ عدل سے علیحدہ استعمال ہو تو اس موقع پر کوئی کلی ضابطہ نہیں ہے، وہاں اندازہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا ذکر ہو رہا ہے، خواہ وہ مادی ہوں یا روحانی بعض موقعوں پر اقتصادی انصاف مراد ہوتا ہے۔ ہر کلام میں

موجود قرائن سے ابہام کو دور کیا جا سکتا ہے۔[1]

قرآن میں عدل وقسط کے ابعاد

قرآن کے لحاظ سے عدل وقسط کے ابعاد (Dimenions) اور جہات کی تشریح وتفصیل ایک وسیع مقالے میں سما سکتی ہے اس وقت ہماری بحث اس کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لئے ہم اس پر اختصار سے گفتگو کریں گے۔

ا۔ عدل وقسط کی حکومتی جہت

قرآن کے نقطہ نظر سے عدل کا ایک رخ اور بعد Dimensions منتخب سربراہ کا معاملہ ہے مستکبرین اور غلبہ وتسلط کے خواہاں لوگوں کی حکومت موروثی خاندانی حکومت جو نیزے کی چمک اور توپ وٹینک کی طاقت کے ذریعے لوگوں پر مسلط کی گئی ہو وہ ظلم ہی ظلم ہے اور انصاف وعدل کے راستے سے قطعی انحراف ہے۔ ضروری ہے کہ حکومت اور حکمران عوامی تائید رکھتے ہوں اور عوام اپنے سربراہ کو خود اپنے رجحان سے تسلیم کرتے ہوں (اس سلسلے میں ان افراد کا حساب علیحدہ ہے جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے معین ہیں) قرآن حکومتی انصاف کے بارے میں فرماتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿٤١﴾

''وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار دیں تو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے منع کرتے ہیں تمام امور کا انجام تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔'' (حج ۔۴۱)

اس آیت میں حکومتی عدل کا ایک رخ پیش کیا گیا ہے یعنی اسلامی سربراہ مملکت کو چاہیے کہ وہ نماز قائم کر کے خدا سے اپنے روحانی رشتے کو محفوظ کرے۔ زکوٰۃ ادا کر کے اپنے عوامی پہلو کو تقویت دے۔ حکومت کرنے سے اس کا مقصد نیکی اور معروف کو قائم کرنا اور منکر اور برائی کو ختم کرنا ہو۔ حکومت میں عدالت کے پہلو پر تفصیلی بحث کیلئے ایک الگ کتاب چاہیے۔ چنانچہ اس کی مختصر کرتے ہوئے اب ہم عدل وقسط کے ایک دوسرے رخ کو پیش کرتے ہیں۔

---

[1] ۔ آخر بات جو اس سلسلے مس کہی جا سکتی ہے یہ ہے کہ ''عدل'' اعتدال اور میانہ روی اور سارے پہلوؤں میں مادی اور روحانی ہر قسم کی افراط وتفریط سے دوری کا نام ہے۔ اس میں اور قسط میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ یہ لفظ ایسے موقعوں پر استعمال ہوتا ہے جو قابل تقسیط تقسیم اور حصہ بندی ہو، خواہ وہ مالی امور ہوں یا حقوق سے متعلق ان میں مرافعہ اور محاکمہ ہو یا نہ ہو۔

۲۔قسط وعدل کی قانونی جہت

عدل کے قانونی پہلو سے مراد یہ ہے کہ قانون وضع کرنے میں تمام لوگوں کے مصالح اور مفاد اور معاشرے کی فطری اور حقیقی ضروریات اور خواہشات نظر میں رکھی جائیں کسی طبقے کیلئے امتیاز اور ترجیح نہ ہو۔ تمام افراد قانون کی نگاہ میں برابر ہوں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہمیشہ نظر میں رہے:

الناس کاسنان المشط سواء

''لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح ایک دوسرے کے مساوی ہیں اور ان میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں۔ (الفقیہ ص۔۴۵۱)

۳۔عدل وقسط کا اقتصادی پہلو

عدل کے اقتصادی پہلو سے مراد یہ ہے کہ ثروت ودولت، قدرتی وسائل اور نعمتوں کی تقسیم میں ہر قسم کی ترجیحات ختم کر دی جائیں۔ فطری اور اکتسابی فرق مثلاً لیاقت، صلاحیت، فعالیت وغیر اس تقسیم کی بنیاد ہے کیونکہ انصاف کی نظر میں بے جا امتیاز اور فرق قابل مذمت ہے مگر حقیقی فرق کی بنیاد پر امتیاز، خواہ وہ ذاتی ہو یا اکتسابی عین عدل ہے۔ اسلامی میں حکمران کیلئے ضروری ہے کہ وہ سرمایہ کے ارتکاز، ذخیرہ اندوزی ،احتکار اور کسی ایک فرد کو دوسروں پر ترجیح دینے کی روک تھام کرے ساتھ ساتھ وہ کسی کے حق پر بے جا تصرف نہ کرے اپنی قوت سے فقر وفاقہ اور طبقاتی امتیاز کو مٹانے کی کوشش کرے۔

۴۔عدل وقسط کا اجتماعی رُخ

اجتماعی عدل سے مراد یہ ہے کہ عوام کا ایک دوسرے سے رابطہ اور پھر ان کا حکومت سے رابطہ عدل اور حق کی بنیاد پر ہو۔ یہاں استکبار، لُوٹ مار اور دوسروں کے استحصال کا نام ونشان بھی نہ ہو۔ قوم اس حد تک توانا ہو کہ نفاذ قوانین پر نگرانی کا حق رکھتی ہو تا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر سکے اور نیکیوں کا حکم دے سکے اور برائیوں سے روک سکے۔ اس کے علاوہ یہ کہ لوگ کوشش کریں کہ حق دار کو اس کا حق پہنچے ایک مسئلہ لین دین کا بھی ہے جس پر کڑی نگرانی ہونی چاہیے۔ سبھی یا کچھ لوگ لین دین کے معاملات پر نگران ہوں تا کہ خودغرض اور موقع پرست افراد مستضعفین کا حق پائمال نہ کر سکیں۔

قرآن بعض موقعوں پر پیغمبر عالی قدر حضرت شعیبؑ کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ مسلسل اس پر اصرار کرتے ہیں کہ:

وَلَا تَنۡقُصُوا الۡمِكۡيَالَ وَالۡمِيۡزَانَ

''ناپ تول میں کمی نہ کرو۔'' (ھود۔ ۸۴)

یہ بھی کہا کہ:

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ

''اے قوم! ناپ تول کا حق عدالت کے ساتھ پورا کرو۔'' (ھود۔ ۸۵)

یہ بھی کہا کہ:

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ۝۱۸۱

''پیمانہ کا حق ادا کرو اور کسی کو ضرر و نقصان نہ پہنچاؤ۔'' (شعراء۔ ۱۸۱)

قرآن پورے انسانی معاشرے کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ

''پیمانہ کا حق ادا کرو اور صحیح ترازو کے ساتھ وزن کرو۔'' (بنی اسرائیل۔ ۳۵)

قرآن ایسے موقع پرستوں کی مذمت کرتا ہے جو جنس خریدتے وقت اپنا حق تو پورا وصول کرتے ہیں اور اس کو فروخت کرتے وقت لوگوں کا حق صحیح طور پر ادا نہیں کرتے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝۲ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝۳

''وائے اور ہلاکت ہے کم فروشوں پر جو لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں مگر جب لوگوں کے لئے ناپ یا تول کرتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔'' (مطففین۔ ۱ تا ۳)

اس میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ قرآن اقتصادی یا اجتماعی معاملات میں ایسے (چھوٹے چھوٹے موقعوں پر بھی) عدل و انصاف کو پورے معاشرے کی مجموعی حالت کے لئے مفید سمجھتا ہے۔ اس شخص کی بھی اصلاح چاہتا ہے جو لوگوں کا مال چرا کر سمجھتا ہے کہ اس کا مستقبل اچھا ہو جائے اور وہ مال دار ہو جائے گا۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا

ٹ ''صحیح ترازو کے ساتھ تولو، اس کام کا انجام اچھا ہوگا۔'' (بنی اسرائیل۔ ۳۵)

بڑے بڑے انقلاب چھوٹی چھوٹی زیادتیوں اور غیر محسوس ناانصافیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں رفتہ رفتہ یہ کام اس قدر ناقابل برداشت

ہو جاتے ہیں کہ آتش فشاں کی طرح پھٹ کر سب خشک وتر کو جلا دیتے ہیں چنانچہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں قرآن کی منطق قسط وعدل کے بارے میں یہ ہے کہ:

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا

''عدل کی حفاظت سب کیلئے اچھی ہے اور اس کا انجام سب کیلئے احسن ہے۔''

اس آیت میں لفظ ''تاویل'' سرانجام کے معنی میں آیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اقتصادی عدل تمام طبقات کے لئے اچھا انجام کار ہے۔ اس سلسلے میں احادیث اسلامی میں تاکیدی احکام آئے ہیں۔ ایک شخص نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے عرض کیا کہ ایک گروہ ناپ تول میں کمی کرتا ہے تو امامؑ نے فرمایا:

اولئك الّذين يبخسون النّاس اشياءهم

وہ ایسے لوگ ہیں جو دوسروں کے مال میں تجاوز کرتے ہیں۔''[1]

قرآن نے چند ایک آیات میں ''بخس'' کی حرمت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا معنی ''کم کرنا'' ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ

''لوگوں کے مال میں کمی نہ کرو۔'' (اعراف۔ ۸۵)

سورہ ہود کی آیت ۸۵ اور سورہ شعراء کی آیت ۱۸۳ میں بھی یہی مضمون آیا ہے۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

''تمہارے درمیان دو چیزیں ہیں جن کی وجہ سے گذشتہ امتیں نابود اور فنا ہوئی ہیں اور وہ دو چیزیں ناپ اور تول ہیں۔''[2]

---

[1]۔ وسائل شیعہ۔ ج ۱۲ ص ۲۵۸

[2]۔ وسائل شیعہ۔ ج ۱۲۔ ص ۲۹۱

قرآن کا دائمی منشور

آٹھواں اصول

استطاعت کے مُطابق

ذمہ داری

لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

ہم کسی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں دیتے۔

(انعام۔۱۵۲)

لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

ہم کسی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں دیتے۔

(انعام۔۱۵۲)

آج کے زمانہ کے متمدن معاشروں میں اسلام کی مقبولیت اوراس کے پھیلاؤ کے کئی اسباب محققین اسلام نے بیان کیے ہیں۔ان میں سے سب ہی اہم ہیں۔

مگراس نکتے کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے کہ اسلام کے اصول وفروع کس قدر آسان اور سہل ہیں۔ چنانچہ اس کے سارے اصول وفروع اس کے عقائداوراحکام ہر دور میں ہر انسان کی سمجھ میں آسکتے ہیں اورنگاہوں میں روشن ہوسکتے ہیں یہی وہ آسانی اورسہولت تھی جس کی بناء پرلوگ صدراسلام میں جوق درجوق اس کی طرف آئے اورانہوں نے پرانے دین ومذہب سے رشتہ توڑلیا۔ یہ لوگ عیسائی علماء کی ایک اورتین خداؤں کی لایعنی باتوں سے تھک چکے تھے اورمجوسیوں کی ثنویت ،دوخدا کے تصور سے اور بہرے گونگے خیالی خداؤں سے بھی اکتا گئے تھے۔

اس وقت ہم برہمنوں اور بدھ مذہب میں موجود ابہام پر گفتگو نہیں کریں گے۔نہ ہی دین زرتشت کے دوخداؤں کا ذکر کریں گے جن میں سے ایک کووہ مبداءخیراوردوسرے کومبداءشر جانتے تھے اور پھر بھی دونوں کوخدا کی مخلوق کہتے تھے، بلکہ قارئین کرام کی توجہ دین مسیحیت کی طرف مبذول کروائیں اورمسئلہ تثلیث کوپیش کریں گےاس زمانے میں یہ دین روم کے مشرقی حصہ میں غلبہ پاچکا تھا۔

عیسائیوں کا تین خداؤں پرراسخ عقیدہ ہے جس کووہ ''اقانیم ثلاثہ'' (تین خدا) کہتے ہیں، وہ اس مسئلہ میں اس قدرحساس ہیں کہ کسی بھی صورت میں اس پرنظر ثانی کرنے کوتیارنہیں ۔حتیٰ کہ مارٹن لوتھرنے اپنی معروف اصلاح اورریفارمیشن میں بیشترعیسائی عقائد میں تجدیدنظر کی مگر وہ مسئلہ تثلیث کو ہاتھ نہیں لگاسکا۔اوراس کوعیسائیوں کے مسلم عقائد سے حذف نہیں کرسکا۔مگرعیسائی چاہتے ہیں کہ خودکوموحدوں کی صف میں بھی لاکھڑاکریں۔ یہ ایک دوسرے کی ضدنظریات باہم کرکیسے ہوسکتے ہیں یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ان میں ایک گروہ نے یہ کہہ کرکہ ''تثلیث''ایک ایسارازاورمعمہ ہےجس کا انسانی عقل ادراک نہیں کرسکتی اس بندگلی میں سے راستہ نکال لیاہےاورعلمی تحقیقات اورتثلیث کی توجیہ ووضاحت سے اپنی جان چھڑالی ہے ۔دوسرے طرف عملی طورپرانہوں نے دین اورعلم کے تضادکوممنوع قراردے دیاہےاوراس کوقبول نہیں کرتے ۔بعض نے ''تثلیث''اور''توحید''کوایک یکجا کرنے کیلئے بےانتہا توجیہات کی ہیں اس طرزاستدلال نے یونانی سوفسطائیوں کی ضرورسرخروکیاہے مختصر یہ کہ ایک عیسائی صحیح طورپرسمجھ نہیں پاتا کہ تین خدا کس طرح تین بھی ہیں اورایک بھی۔اس عقیدہ تثلیث کے مقابلہ میں قرآن سورہ توحید میں خدا کی صفات واضح ترین الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ ابہام بالکل باقی نہیں رہتا۔جیسا کہ فرماتا ہے:

''کہیں کہ خدا ایک ہے، وہی ہے مقصود اور پناہ گاہ اس نے نہ کسی کو جنا ہے اور نہ خود کسی سے پیدا ہوا ہے۔ اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔''[1] اسلام کا یہ آسان اور سادہ نظریہ کہاں اور وہ ابہام اور پیچیدگیاں کہاں؟

عقائد اسلامی کا صرف یہی حصہ (توحید) نہیں بلکہ دوسرے بنیادی مسائل بھی اسی طرح آسانی سے بیان کیے گئے ہیں اسلام نے انسان کو کبھی معموں اور فضول باتوں میں الجھائے نہیں رکھا۔ اس کے برعکس اپنے اصول اور فروع کو واضح ترین طریقے سے پیش کیا ہے اور ہمیشہ:

لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا [2]

کو مدنظر رکھا ہے اس کی نظر میں ''تثلیث'' اور ''عشاء ربانی'' جیسی ذمہ داریاں (اگر صحیح ہوں بھی تو) عقل کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ یہ ذمہ داریاں انسان کیلئے ناقابلِ برداشت اور اس کی استطاعت سے باہر ہیں۔ انسان کی عقل میں جو بات نہیں آسکتی یا عقل کی رو سے وہ ناممکن ہے اس کی ذمہ داری کسی پر نہیں ڈالی جاسکتی۔

فروع میں آسانی

اسلام میں صرف اصول وعقائد کو سمجھنا آسان نہیں بلکہ فروع دین واجبات اوراحکام بھی خاص سہولتوں کے حامل ہیں۔ مسلمانو ں پر جو روزہ فرض کیا گیا ہے موسم کے ساتھ ساتھ اس کی مدت میں جو کمی وبیشی ہوتی رہتی ہے اس کا مقابلہ آپ یہودیوں اور عیسائیوں میں رائج روزے سے کرلیں جو ۲۶ گھنٹے کا ہوتا ہے۔ آپ پر خود یہ حقیقت واضح ہوجائے گی۔

روزے کے متعلق جو آیات سورہ بقرہ میں آئی ہیں ان کا مطالعہ ہم کو اس حقیقت سے آشنا کرتا ہے کہ ''ذمہ داری اتنی ہی ہے، جتنی انسان میں استطاعت ہے''۔ ان آیات[3] میں روزہ ایک الٰہی فریضہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مگر پھر بھی بیمار مسافر[4] اور بوڑھے افراد جو مشکلوں سے روزہ رکھ سکتے ہیں[5]، ان کو روزے کے فرض سے مستثنٰی قرار دیا گیا ہے اور اس حکم کی دلیل یہ بیان کی ہے:

یُرِیۡدُ اللّٰهُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ

''اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا۔'' (بقرہ۔ ۱۸۵)

---

[1] ۔قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ

[2] ۔سورہ انعام کی آیت ۱۵۲۔ اعراف کی آیت ۴۲۔ سورہ مومنون کی آیت ۶۲ ہے۔ جبکہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۳ میں یہی بات ایک دوسری طرح بیان ہوئی ہے۔

[3] ۔سورہ بقرہ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۵

[4] ۔سورہ بقرہ آیت ۱۸۵ وَمَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ

[5] ۔سورہ بقرہ۔ ۱۸۴

جو اپنا قرض ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے ،ایسے قرضداروں کے بارے میں اسلام کا حکم ہے کہ ان پر کسی قسم کے دباؤ سے اجتناب کیا جائے ۔گھر اور دیگر لوازماتِ زندگی بیچنے پر ان کی مجبور نہ کیا جائے ۔ان چیزوں کو فقہی اصطلاح میں ''مستثنیات دیون'' کہتے ہیں ۔قرضدار اور قرض خواہ کا رویہ یہ ہونا چاہیے۔

وَاِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيۡسَرَةٍ ؕ

''اگر مقروض سختی کی حالت میں دن گزار رہا ہے تو ایسے دن کا انتظار کرو جب اس کی حالت اچھی ہو جائے اور اس کی مشکلات دور ہو جائیں۔'' (بقرہ ۔۲۸۰)

قرآن بار بار اپنے احکام کو واضح کرتا ہے اور ان کی دلیل پیش کرتا ہے ۔ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ حقیقت کو نہ سمجھ پائیں اور ان احکام کو بوجھ سمجھنے لگیں وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ یہ فرائض اور واجبات خود ان ہی کیلئے سود ہیں ۔لوگوں کو تکلیف اور زحمت میں ڈالنا مقصد نہیں ہے ۔مثلاً نماز سے پہلے وضو کا حکم ہے اور اگر مجنب ہوں تو غسل کریں مگر عذر کی صورت میں تیمم کر آ سکتے ہیں مسئلے کو واضح اور روشن کرنے کے لئے ان فرائض و واجبات کے سلسلے میں فرماتا ہے:

مَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيَجۡعَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ وَّلٰكِنۡ يُّرِيۡدُ لِيُطَهِّرَكُمۡ

''خدا نہیں چاہتا کہ تم کو زحمت اور مشقت میں ڈالے، بلکہ چاہتا ہے کہ اس ذریعے سے تم کو پاک کرے۔'' (مائدہ ۔٦)

قرآن مجید، نابینا لنگڑے اور بیمار افراد کو جہاد سے مستثنیٰ کرتا ہے [1] اور ان کو اس ذمہ داری سے معاف شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے:

لَيۡسَ عَلَى الۡاَعۡمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡمَرِيۡضِ حَرَجٌ ؕ

''نابینا، لنگڑے اور بیمار افراد پر جہاد میں شرکت کرنے کی ذمہ داری قطعی نہیں ہے۔'' (فتح ۔١٧)

اور پھر قرآن آخر میں اپنے سارے قوانین اور فرائض و احکام کیلئے ایک ضابطہ معین کرتا ہے اپنے سارے احکام کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کہتا ہے:

وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ؕ

''اسلام میں حرج آور اور مشقت آمیز احکام وضع نہیں کیے گئے ہیں۔'' (حج ۔٧٨)

یہ آیت اور اس مضمون کی احادیث مثلاً ''لا ضرر ولا ضرار ''اسلام کے ایسے کنٹرول کرنے والے قوانین ہیں جو احکام کو ضرر اور حرج سے دور اپنی حدود میں رکھتے ہیں۔

---

[1] ۔یہ تینوں گروہ سورہ نور کی آیت ٦١ میں ایک دوسری طرح سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

اُمّتِ اسلامی پر بہت زیادہ الطاف الٰہی ہیں

قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُمّت اسلامی اپنی لیاقت اور صلاحیت کی بناء پر اللہ تعالی کی زیادہ عنایات سے مستفیض ہوتی رہی ہے۔ گذشتہ امتوں کی نسبت اس کی جوابدہی کم رہی ہے۔ گذشتہ اُمتوں سے جب کوئی خطا سرزد ہوتی یا وہ اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی کرتیں تو اس بُھول اور خطا کی وہ جوابدہ سمجھی جاتیں۔ مگر امت اسلامی ان باتوں میں مقابلۂ آسودہ خاطر ہے اور ان کا بوجھ اس پر کم ہے۔ گذشتہ اُمتوں کی مشقت بھری ذمہ داریاں اور فرائض بھی اس کے سر نہیں ہیں۔ مندرجہ ذیل آیت میں یہ دونوں حقیقتیں واضح ہیں:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ

''پروردگارا! جب ہم کسی چیز کو بھول جائیں یا خطا اور غلطی سے دوچار ہوں تو ہم سے ہرگز مواخذہ نہ کرنا اور مشقت کے امور کی ہم کو ذمہ داری نہ دینا، جیسا کہ ہم سے پہلی امتوں کو دی گئی تھی'' (بقرہ۔۲۸۶)

اس آیت اور اس جیسی دوسری آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں ذمہ داریاں اور فرائض انسان کی اپنی توانائی کے مطابق مقرر کیے گئے ہیں۔ یہ تکلیف دہ بھی نہیں ہیں۔ اگر تربیت کی خاطر پچھلی امتوں کو اس قسم کی پر مشقت اور عام قوت سے زیادہ ذمہ داریاں دی گئی تھیں تو وہ دین مقدس اسلام میں موجود نہیں ہیں۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا

''پروردگارا! ہم کو اس عمل کی جس کی ہم طاقت نہیں رکھتے، ذمہ داری نہ سونپ ہم سے درگزر کر اور ہم پر رحم فرما۔'' (بقرہ۔۲۸۶)

یہاں دو نکتوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱......اس ضمن میں روایات اور احادیث کا بھی ایک سلسلہ ہے جو مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار کی جلد ۵ کے صفحات ۳۰۰ سے ۳۰۸ تک جمع کیا ہے، اختصار کی خاطر ہم ان میں سے ایک حدیث کا یہاں ذکر کرتے ہیں، پیغمبر ﷺ گرامی قدر نے فرمایا:

ان هذاالذین متین فاوغلوافیه برفق ولاتکرهواعبادُهٔ الله الی

عباداللہ فتکونوا کالراکب المنبت لاسفراً اقطع ولاظهراً ابقی [۱]

''یہ دین (اسلام) محکم استوار ہے جو ہر قسم کی تکلیف، زحمت اور مشقت سے دور ہے اس میں رفق اور ملائمت سے داخل ہو۔ خدا کی عبادت کو خدا کے بندوں پر گراں نہ کرو۔ ورنہ اس تندو تیز سوار کی مانند ہو جاؤ گے جو نہ تو اپنے مقصد تک پہنچا اور نہ سواری کو باقی رکھ سکا۔''

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گرامی اپنی شریعت کی اس طرح توصیف کرتے ہیں:

بعثت بالشریعة السهلة السمحة [۲]

''میں سہل اور آسان شریعت کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں۔''

ماہ رمضان میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ سفر کی حالت میں روزہ توڑ دیں، کچھ لوگوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سبقت کی اور اپنا روزہ نہ توڑا ان کا خیال تھا کہ اس طرح ان کو زیادہ ثواب ملے گا۔ آنحضرتؐ نے ان کو گناہگار افراد کا نام دیا:

فسماهم رسول الله عصاة [۳]

۲.....قوت اور استطاعت کس طرح ذمہ داری اور فرائض کی شرط ہو سکتی ہے علم کلام میں علماء نے اس سلسلے میں بہت کچھ گفتگو کی ہے ان کے اقوال نقل کرنا بحث کو طویل کر دے گا جو حضرات دلچسپی رکھتے ہیں وہ ماخذ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ [۴]

---

[۱] ۔اصول کافی ج ۲ ص ۸۶

[۲] ۔سفینۃ البحار ج ۱۔ص ۶۹۵

[۳] ۔وسائل الشیعہ ۔ج ۷ ص ۱۲۵

[۴] ۔شرح المواقف ج ۳ ص ۱۶۰۔تفسیر رازی ج ۸ تفسیر سورہ لہب، المغنی نگارش عبدالجبار معتزلی جلد ۱۱ ص ۳۰۹ وغیرہ

قرآن کا دائمی منشور

نواں اصول

گفتگو میں عدل

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ

جب بات کرو تو عدل کرو خواہ وہ قرابت دار کے بارے میں ہو۔

(انعام۔۱۵۲)

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ

جب بات کرو تو عدل کرو خواہ وہ قرابت دار کے بارے میں ہو۔
(انعام۔۱۵۲)

حریت اور آزادی کی طرح عدل وانصاف بھی ایسے شیریں الفاظ ہیں جو انسان کے کانوں کو بھلے معلوم ہوتے ہیں ایک ذمہ دار اور حساس آدمی کیلئے انصاف کے اجراء اور انسانی آزادی کے برقرار ہونے سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔

اگر مستکبروں اور ظالموں کو زبردستی کرنے، خوف وہراس پھیلانے، دوسروں کے حقوق پیروں تلے روندنے اور انسانی جان لینے میں لطف اور مزہ آتا ہے تو دوسری طرف انسان دوست آدمی کیلئے عدل وانصاف کے قیام اور دوسروں کے حقوق ان تک پہنچانے سے شیریں تر اور لطف دہ کوئی اور چیز نہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ:

العدل احلی من الشھد [1]

''عدل کرنے والوں کیلئے حقوق وحدود کی پاسداری شہد سے زیادہ شیریں ہوتی ہے۔''

عدل کی تعریف وتوصیف تو نہایت آسان ہے، مگر عدل وانصاف کو ملحوظ رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ اکثر حضرات عدل کے بارے میں ایک نہیں کئی مقالے لکھ سکتے ہیں انفرادی اور اجتماعی انصاف کی تعریف کر سکتے ہیں اس کی خوبیاں بیان کر سکتے ہیں مگر جب انصاف کے تقاضے پورے کرنے کا وقت آتا ہے تو یہی حضرات اس کے بالکل برعکس عمل کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقالہ یا وہ کتاب انہوں نے نہیں کسی اور نے لکھی تھی۔

مثال کے طور پر اقوامِ متحدہ سیکورٹی کونسل، ہیگ کی بین الاقوامی عدالت، ایمنسٹی انٹرنیشل اور اس قبیل کے دوسرے اداروں پر نگاہ ڈالیں یہ سارے مراکز انسانی معاشرے میں عدل وانصاف کو جاری کرنے اور کمزوروں کے حقوق کی حفاظت کیلئے بنائے گئے ہیں مگر دعوے کرنے اور اس پر عمل کرنے میں ہزاروں میل کا فاصلہ ہے درحقیقت یہ سارے ادارے سپر طاقتوں کے زیر سایہ کام کرتے ہیں اور کمزور اور بے بس قوموں کی طرف کم ہی رخ کرتے ہیں۔ ایران عراق جنگ کے موقع پر تہران میں امریکہ کے جاسوسی کے مرکز پر قبضے کے بعد ان نمائشی اداروں کا مکروہ اور انسان دشمن چہرہ پوری طرح نظر آ گیا ہے۔ یہ بات اب بالکل واضح ہو گی ہے کہ ان تنظیموں کا مطمع نظر صرف سپر طاقتوں کے مفادات کی حفاظت کرنا ہے مستضعف اور کمزور اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے والی قوموں کے حقوق کی حفاظت کے بارے میں وہ نہ کبھی سوچتے ہیں اور نہ اعتناء برتتے ہیں۔

بلاشبہ اسلامی نقطہ نظر سے اور بین الاقوامی حقوق کے لحاظ سے بھی سفیر اور سفارتی عملہ ایک خاص احترام کا مستحق ہے اور وہ ملت جس

---

[1] ۔ سفینۃ البحار۔ ج ۲، ص ۱۶۶

نے صدیوں ظلم وستم سہا ہے اور اب عدل وانصاف کے اجراء کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی ہے وہ دینی اور بین الاقوامی احکام وقوانین کو پاؤں تلے نہیں روند سکتی مگر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ کیا واقعی یہ لوگ سفیر اور ارکان سفارت تھے یا ایسے جاسوس تھے جو سفارت کے پردے میں ایک ملت اور اس کی مسلم خودمختاری کے خلاف ریشہ دوانیاں کررہے تھے۔ خیانت اور جرائم کے جو کچھ ثبوت دستاویزات کی شکل میں وہ چھوڑ کر گئے ہیں ان کو بھی دیکھنا چاہتے ذہن میں صرف یہ نہ رکھیں کہ ارکان سفارت کو یرغمال بنایا گیا تھا بلکہ یہ بھی دیکھیں کہ جاسوسی کے اس مرکز میں ایک ربع صدی سے اس ملت کے خلاف کیا کچھ ہورہا تھا۔

یہاں امیر المومنینؑ کے اس ارشاد کی حقیقی قدر و قیمت اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ جس میں آپؑ فرماتے ہیں:

الحق اوسع الاشیاء فی التواصف وضیقھا فی التناصف [1]

''حق بات کہتے وقت وسیع ترین چیز ہے اور عمل کے موقع پر اور صاحب حق کو حق دیتے وقت بہت تنگ اور مشکل چیز ہے۔

انصاف کے اجراء میں رکاوٹ

امیر المومنین علیہ السلام عدل کے قیام کو ایک بہت اہم امر شمار کرتے ہیں جس کے راستے میں کئی رکاوٹیں ہیں، قرآن مجید اس رکاوٹ کا حقیقی ہوا و ہوس اور نفسانی خواہشات کی پیروی بتاتا ہے اور تاکیدی طور پر حکم دیتا ہے کہ ان کی پیروی نہ کروتا کہ وہ تم کو انصاف سے نہ روک دیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا

''ہوا وہوس کی پیروی نہ کروتا کہ عدالت کو قائم کرسکو۔'' (نساء۔ ۱۳۵)

قرآن جب متنبہ کرتا ہے کہ بغض وعداوت کسی کے ساتھ انصاف کرنے میں رکاوٹ نہ بنے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسروں سے حب اور بغض کا سرچشمہ ہوا و ہوس ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا

''کسی قوم کو دشمنی تم کو خلاف عدل پر مائل نہ کرے۔'' (مائدہ۔ ۸)

درحقیقت اغراض پرستی ظلم وستم کا بہت بڑا منبع ہے یہ کبھی ذاتی مفاد کی حفاظت کے طور پر اور کبھی دوسروں کی محبت اور دشمنی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] ۔ نہج البلاغہ خطبہ ۲۱۱

اما اتباع الھوٰی فیصد عن الحق [1]

''ہوا و ہوس کی پیروی تم کو حق سے روک دے گی۔'' (عدل کبھی حق سے جدا نہیں ہوتا)

اسلام کے احکام کی بنیاد عدل ہے

توحید جس طرح اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اسلام کے سارے اصول و فروع کی بنیاد ہے اور اس کا وجود تمام انفرادی اور اجتماعی عقائد و فرائض میں نظر آتا ہے، اسی طرح عدل و اعتدال اپنے وسیع معنوں میں تمام انفرادی اور اجتماعی واجبات اور فرائض کی بنیاد ہے۔ بہت سے اسلامی نظریات اور دینی احکام میں اس کا اثر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، چنانچہ توحید اور عدل کو انفرادی اور اجتماعی احکام کیلئے اہم رُکن شمار کرنا چاہیے۔ قرآن واضح حکم دیتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں سے فرمائیں:

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ

''میں مامور ہوں کہ تمہارے درمیان عدل برقرار رکھوں۔'' (شوریٰ۔ ۱۵)

یعنی میں خدا کی جانب سے مبعوث کیا گیا ہوں کہ انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں سے ہر قسم کا ظلم و ستم اور امتیاز اور ترجیح اور زیادتیاں دور کردوں۔ انسانی معاشرے کو ظلم و ستم کی گندگی سے پاک کردوں۔ قرآن اس رہبر کی قدر و منزل پہچانتا ہے جو خود بھی صراطِ مستقیم پر ہو اور معاشرے کو ہمیشہ عدل و انصاف کی طرف بلائے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

''کیا وہ جو بالکل مبداء خیر نہیں اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود سیدھے راستے پر قدم رکھتا ہے۔'' (نحل۔ ۷۶)

آخر میں قرآن مجید انسانیت کی طرف متوجہ ہو کر تمام لوگوں کو عدل و انصاف کی دعوت دیتا ہے اور تین بلند انسانی صفات کا ذکر کرتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاۗئِ ذِي الْقُرْبٰى

''اللہ عدل و انصاف نیکوکاری اور قرابت داروں سے نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔'' (نحل۔ ۹۰)

منصفی اور فیصلے دینے کی جو اہمیت ہے اس کی بناء پر قرآن عدالت کے تمام قاضیوں اور ججوں کو خطاب کر کے کہتا ہے:

---

[1] ۔ نہج البلاغہ، خطبہ۔ ۴۲

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ

''جس وقت لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ کرو۔'' (نساء۔۵۸)

ایک اور جگہ تاریخ کے ایک عظیم منصف کو جنہوں نے اپنی زندگی میں عجیب و غریب فیصلے سنائے خطاب کرتے ہوئے ان کو حکم دیتا ہے کہ حق کے ساتھ جو عدل سے الگ نہیں فیصلہ کرو، فرماتا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

''اے داؤد! ہم نے تم کو روئے زمین پر اپنا جانشین مقرر کیا ہے، پس لوگوں کے درمیان حق کی بنیاد پر فیصلہ کرو، ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو۔ مبادا کہیں وہ تم کو راہ حق سے گمراہ نہ کر دے۔'' (ص۔۲۶)

آیت میں حق سے مراد وہی حقیقت پسندی اور افراد کے حقوق کا لحاظ اور ہر قسم کی خود غرضی سے اجتناب ہے اس معنی میں حق کا ذکر عدل سے جدا نہیں۔ اگر اس آیت:

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

میں ہوا و ہوس کی پیروی اجراء حق اور حقیقت کے مطابق حکم کرنے میں رکاوٹ بتائی گئی ہے تو:

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا

''میں ہوا و ہوس کی پیروی اجراء عدالت میں رکاوٹ بیان کی گئی ہے۔'' (نساء۔۱۳۵)

یہ حقیقت ہے کہ نفس کی پیروی حق اور حقیقت اور عدل و انصاف سے انحراف کا سرچشمہ ہے اور راہ خدا پر چلنے میں رکاوٹ ہے یہ بات مندرجہ بالا آیتوں سے واضح ہوتی ہے۔ انصاف کرنے کا ایک شعبہ بات چیت اور گفتگو بھی ہے، خواہ وہ فیصلہ کرنے کے سلسلے میں ہو یا کسی واقعے کو بیان کرنے کے سلسلہ میں ہو، ایسا نہ ہو کہ عزیز داری اور قرابت اس کا سبب بن جائے کہ انسان حق اور حقیقت کو پس پشت ڈال کر اس رشتہ داری کی بناء پر عدل کے خلاف فیصلہ دے یا گفتگو کرے اسی لئے قرآن فرماتا ہے:

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى

بعض لوگ ایسے ہیں کہ جن کا ضمیر کچھ زندہ ہوتا ہے اس لئے دوسروں کے حق پامال کرنے سے پرہیز کرتے ہیں مگر کسی وجہ سے اگر کبھی ان کی عقل مغلوب ہو جائے اور حق ان سے پامال ہو جائے تو گمان کرتے ہیں کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ یہ حق خود بخود ختم ہو جائے گا۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ایسی سوچ کی مخالفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الحق القدیم لایبطله شیء [1]

کسی کے قدیمی حق کو کوئی چیز ختم نہیں کرسکتی۔''

احادیث اسلامی میں قاضی اور منصف کے آداب کے بارے میں اس کے مدعی کی طرف نگاہ کرنے اور بات کرنے کے سلسلے میں بہت قیمتی روایات آئی ہیں۔ امیرالمومنینؑ اپنے قاضی شریح کو اس طرح حکم دیتے ہیں:

ثم واس بین المسلمین بوجهك ومنطقك ومجلسك حتّٰی لایطمع قریبك فی حیفك ولاییأس عدوك من عدلك [2]

''مسلمانوں کے درمیان نظر کرنے، بات کرنے اور اپنے بیٹھنے کی جگہ میں مساوات رکھ تاکہ تیرے قریبی طمع کی نظر تجھ پر نہ رکھیں اور تیرے دشمن تیرے عدل وانصاف سے مایوس نہ ہوں۔''

امیرالمومنینؑ خلیفہ دوم سے کہتے ہیں: تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن کو تو اپنے دل میں جگہ دے اور اس پر عمل کرے تو وہ تجھے دوسری چیزوں سے بے نیاز کردیں۔ اگر ان کو ترک کردے تو دوسری چیزوں پر عمل کرنا تجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ خلیفہ نے پوچھا وہ تین چیزیں کون سی ہیں تو امامؑ نے فرمایا:

امامُ العدود علی القریب والبعید ،والحکم بکتاب الله فی الرضاء والسخط ،والقسم بالعدل بین الاحمر والاسود۔ [3]

قریب اور دور والوں پر حدود قائم کرنا کتاب خدا کے مطابق رضا ورغبت سے فیصلہ کرنا اور تقسیم کرنے میں سفید وسیاہ کے درمیان عدل کرنا۔

اس سلسلے میں احادیث اسلام بہت ہیں مگر یہاں ان سب کو نقل کرنا ممکن نہیں ہے۔

---

[1] ۔ نہج البلاغہ، حکیمانہ اقوال

[2] ۔ وسائل الشیعہ ج ۱۸۔ ابواب آداب القاضی، باب، ا۔ حدیث۔ ا۔ ص ۱۵۵

[3] ۔ وسائل الشیعہ ج ۱۸۔ ابواب آداب القاضی، باب، ا۔ حدیث۔ ا۔ ص ۱۵۶

قرآن کا دائمی منشور

دسواں اصول

عہد الٰہی کا ایفاء

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۗ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ

خدا کے عہد کا ایفاء کرو، خدا نے تم کو اس کی وصیت و تاکید کی ہے تاکہ تم ذکر کرتے رہو۔ (انعام۔ ۱۵۲)

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ

خدا کے عہد کا ایفاء کرو، خدا نے تم کو اس کی وصیت و تاکید کی ہے تا کہ تم ذکر کرتے رہو۔(انعام۔ ۱۵۲)

عہد و پیمان کا احترام اور اس پر لازمی طور پر عمل انسان کی فطرت کا تقاضا ہے، ہر انسان عہد و پیمان کے مطابق عمل کی ضرورت اول اول اپنی فطرت اور سرشت سے سیکھتا ہے، اسی لئے زندگی کے ابتدائی دور میں بچے اپنی پاکیزہ فطرت کی وجہ سے عہد و پیمان پر عمل ضروری سمجھتے ہیں وہ وعدہ خلافی کو برا سمجھتے ہیں۔ماں باپ کے کھوکھلے وعدوں سے پریشان ہوجاتے ہیں بچے اسی احساس کے ساتھ نشوونما پاتے ہیں اور پلتے بڑھتے ہیں اور جب تک کوئی خارجی ہاتھ ان کو اس راستے سے نہ ہٹائے یا اپنے ماحول کی کوئی بات ان کی حقیقی فطرت کے برخلاف ان کے ذہن پر اثر انداز نہ ہو، یہی احساس اور جذبہ ان میں برقرار رہتا ہے۔

ایفائے عہد چونکہ ایک فطری حقیقت ہے اس لئے وعدہ خلافی اور پیمان شکنی شدید اخلاقی پستی کی مظہر ہے۔جو انسان کی شخصیت اور انسانیت کو شدید نقصان پہنچاتی ہے سیاسی میدان میں بھی پیمان شکنی سے زیادہ رسول کرنے والی کوئی چیز نہیں وہی قوم باوقار اور سربلند رہتی ہے جو اپنے معاہدوں پر عمل کرے اور ان کا احترام کرے۔

اس کی اسی اہمیت کی بناء پر قرآن حکم دیتا ہے کہ ہم ہمیشہ اپنے عہد و پیمان کو پورا کریں، خواہ وہ خدائی عہد و پیمان ہوں یا کسی اور کے ساتھ باندھے گئے پیمان اس کو پورا شعور رکھیں کہ خدا کے سامنے اس کا خاص جواب دہی ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا

''اپنے عہد کے وفادار رہو کیونکہ عہد و پیمان کے بارے میں تم سے بازپُرس ہوگی۔''(بنی اسرائیل۔ ۳۴)

قرآن یہ بھی فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸

''وہ جو اپنی امانت اور عہد و پیمان کے وفادار ہیں۔''(مؤمنون۔ ۸)

یہ دونوں آیات قرآن میں عہد و پیمان کی حیثیت کو واضح کرتی ہیں اور اس کی خصوصی اہمیت بیان کرتی ہیں اس کی یہ اہمیت اس کی متقاضی ہے کہ قرآن میں جو آیات مختلف صورتوں میں ہم کو عہد و پیمان کی دعوت دیتی ہیں ان کو یہاں پیش کیا جائے ،لفظ''عہد'' اپنے تمام

مشتقات کے ساتھ قرآن میں ۴۵ مرتبہ آیا ہے۔ قرآن میں مختلف انداز سے عہد و پیمان کی دعوت دی ہے۔

الف: اول حکم اور عمل کے طور پر مثلاً:

وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمۡ

''جب پیمان باندھ لیا تو پیمان الٰہی کے وفادار رہو۔'' (نحل۔۹۱)

وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ ۚ

''ان عہد و میثاق کے وفادار رہو جو تم نے مجھ سے باندھے ہیں تا کہ میں (خدا) بھی انہیں پورا کروں۔'' (بقرہ۔۴۰)

ان جیسی دوسری آیات بھی ہیں:

ب: نیکوکارلوگوں کی تعریف کے ضمن میں:

وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا ۚ

''جب وہ پیمان باندھتے ہیں تو اپنے عہد و پیمان کو پورا کرنے والے ہوتے ہیں۔'' (بقرہ ۔۱۷۷)

الَّذِيۡنَ يُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ وَلَا يَنۡقُضُوۡنَ الۡمِيۡثَاقَ ۝۲۰

''وہ جو خدائی عہد و پیمان کو پورا کرتے ہیں اور کسی صورت میں عہد و میثاق کو نہیں توڑتے۔'' (رعد۔۲۰)

اور دوسری دو جگہوں پر فرمایا:

وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ ۝۸

''وہ جو امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کی پاسدار کرتے ہیں۔'' (مؤمنون۔۸ اور معارج۔۳۲)

ج: کئی ایک آیات میں پیمان شکنی کی مذمت کی گئی ہے۔ مثلاً:

وَالَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ

''وہ جو خدائی عہد و میثاق کو توڑ دیتے ہیں۔'' (رعد۔۲۵)

د: قرآن خداوند تعالیٰ کو وعدوں اور عہد و پیمان کو سب سے زیادہ پورا کرنے والا کہتا ہے اور اس وسیلے سے ہم کو ترغیب دیتا ہے کہ ہم بھی اس اعلیٰ اور ارفع صفت کو اپنائیں چنانچہ فرماتا ہے:

وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ

''خدا سے زیادہ اپنے عہد کی وفا کرنے والا کون ہے۔'' (توبہ۔۱۱۱)

پھر خدا کی یہ صفت بھی بیان کرتا ہے کہ وہ کسی صورت میں اپنے وعدوں سے نہیں پھرتا۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ

''خدا وعدہ خلافی نہیں کرتا۔'' (رعد۔۳۱)

ان آیات پر نگاہ کرنے سے قرآن مجید میں عہد و پیمان کا مقام اور اس کی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

پیمان شکنی پست شخصیت کی نشانی ہے

عہد و پیمان کی پرواہ نہ کرنا اور ان سے بے رخی برتنے کا سبب خود غرضی اور دوسروں کے حقوق سے بے اعتنائی ہے۔ خود غرض شخص کی زندگی حیوانی جبلت کے گرد گومتی ہے ایسا آدمی خدا خواہ اور حق پرست نہیں ہوسکتا جب کہ یہ ایک حقیقی مسلمان کی خاصیت ہے یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیمان شکنوں کو بے دین کہہ کر پکارتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا:

لا دین لمن لا عهد له۔ [1]

''جو شخص اپنے عہد کا وفادار نہیں ہے وہ مسلمان نہیں۔''

قرآن یہودیوں اور مشرکین کو اسلام کا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ

''یہود و مشرکین کو تو صاحب ایمان افراد کا سخت ترین دشمن پائے گا۔'' (مائدہ۔۸۲)

مگر یہی قرآن جس وقت عہد و پیمان کا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ مسلمان اپنے عہد و پیمان کو ان یہود و مشرکین تک سے پورا کریں اور اس میں کوئی کمی نہ کریں۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ

''وہ جن کے ساتھ تم نے مسجد الحرام کے پاس عہد و پیمان باندھا ہے جب تک وہ اپنے عہد کے

---

[1] ۔ بحار ج۔۶۱۔ ص۴۴۱

وفادار رہیں تم بھی اس کے وفادار رہو خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔"[1] (توبہ۔ ۷)

پیمان شکنی کی جو قرآن میں مذمت آئی ہے اس سے قرآن کا اس سلسلے میں موقف اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے مثال کیلئے ایک آیت یہاں پیش کی جاتی ہے:

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾

"اگر انہوں نے اپنے عہد و پیمان توڑ دیئے ہیں اور تمہارے دین پر طعن و تشنیع کی ہے تو کفر کے سرغنوں کو قتل کر دو اور ان کیلئے کوئی عہد و پیمان نہیں شاید وہ رک جائیں۔" (توبہ۔ ۱۲)

قرآن اگلی آیت میں سختی کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ پیمان شکنوں کے ساتھ جنگ کی جائے:

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ

"پیمان شکن گروہ کے ساتھ کیوں جنگ نہیں کرتے ہو؟" (توبہ ۱۳)

عہد و پیمان کی اہمیت اور اس کی عظمت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ جب دروانِ جنگ بھی دشمن کی صف میں سے کوئی خواہش کرے کہ اسلام کے موقف اور اس کے دلائل سے آگاہ ہوتا کہ اسلام کی طرف مائل ہو سکے تو قرآن کا حکم ہے کہ اس کو امان دی جائے اور اس سے عہد و پیمان کیا جائے تا کہ وہ باطمینان خداوند تعالی کے احکام اور قرآن کا منطق اچھی طرح سن سکے اور جب اپنی چھاؤنی کو واپس لوٹنا چاہے تو اس کو بصد احترام وہاں تک واپس پہنچا دیا جائے اس حقیقت کی مندرجہ ذیل آیت میں تصویر کشی کی گئی ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ

"جب کوئی مشرک امان چاہے تا کہ خدا کا کلام سنے تو اس کو امان دو تا کہ وہ خدا کا کلام سن سکے، پھر اس کو اس کی امان کی جگہ تک پہنچا دیا جائے۔" (توبہ۔ ٦)

اخلاقی وعدے

بعض لوگ باضابطہ عہد و پیمان کے احترام کے خصوصیت سے قائل ہوتے ہیں لیکن اپنے اخلاقی وعدوں سے بے اعتنائی برتتے ہیں

---

[1] یہی مضمون سورہ توبہ کی آیت ۴ میں بھی ہے۔

۔وعدہ کر کے اس پر عمل نہ کرنا اور اس کو پورا نہ کرنا ان کے نزدیک نہ کوئی جرم ہے اور نہ گناہ ۔یہ صحیح ہے کہ ایسے دوستانہ وعدوں سے بے اعتنائی جرم تو نہیں مگر اسلام کے اخلاقی اصول کے تحت یہ بات بہت قبیح اور قابل مذمت ہے اس سے انسان کی شخصیت کا کھوکھلا پن ظاہر ہوتا ہے اور اس کی طبیعت میں دوسرے سے بے توجہی کا اظہار ہوتا ہے ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من کان یؤمن باللہ والیوم الاخر فلیف اذا وعدہ ۔[1]

''جو شخص خدا اور روز آخرت پر یمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے وعدوں کو ایفا کرے ۔''

بعض روایات میں اخلاقی وعدوں کو پورا کرنا ایک واجب امر کے طور پر پیش ہوا ہے جو اس کی اہمیت کی اجاگر کرتا ہے چنانچہ آئمہ معصومینؑ میں سے بعض نے فرمایا کہ:

یجب علی المؤمن الوفاء بالمواعد ۔[2]

''مؤمن پر لازم ہے کہ اپنے وعدوں کو پورا کرے ۔''

بعض لوگ شریں زبانی کی خاطر اور دوسروں کو خوش کرنے کیلئے ایسے وعدے کر لیتے ہیں اور ایسے کام اپنے ذمے لے لیتے ہیں جن کو پورا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے ۔ایسی بات کے ضامن ہو جاتے ہیں جسے انجام تک پہنچانے کی استطاعت نہیں رکھتے مگر وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اپنے بس سے باہر وعدے وعید کرنا انسان کی اپنی شخصیت کو دوسروں کی نظر سے گرا دیتا ہے اور وہ بے اصول اور لا پرواہ آدمی کے طور پر شہرت پا جاتا ہے ۔مختصر یہ کہ عہد و پیمان پورا کرنے کا اسلام محض مسلمانوں کو آپس کے حقوق ہی کے طور پر قائل نہیں بلکہ اسے ہر انسان کے بین الاقوامی حقوق میں سے بھی جانتا ہے جن باتوں کا سارے انسانوں کیلئے تقاضا کیا گیا ہے ان میں سے ایک ایفائے عہد بھی ہے ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''تین چیزیں ایسی ہیں جن کی خلاف ورزی کسی طور جائز نہیں ۔اول عہد و پیمان پر عمل کر، خواہ مسلمان سے ہو یا کافر سے ۔دوسرے ماں باپ سے احسان اور نیکی کرنا چاہیے وہ ماں باپ مسلمان ہوں یا کافر ۔تیسرے امانت ادا کرنا خواہ جس کی امانت ہے وہ مسلمان ہو یا کافر ۔[3]

جنگ صفین میں معاویہ نے حیلے اور چال بازی سے حضرت علی علیہ السلام کی فوج کو جنگ نہ کرنے پر مجبور کر دیا اور یہ طے پایا کہ دونوں

---

[1] ۔اصول کافی ۔ج ،۲ ص ۳۶۲

[2] ۔مستدرک ،ج ۲۔ص ۸۵

[3] ۔''ثلاث لیس لاحد فیھن رخصٌ :الوفاء لمسلم کان او رکافر، وبر الولدین مسلمین او کافرین ،اداء الامانة لمسلم کان او کافر ''(مجموعہ ورام ۔ج ۔ا ص ۱۲۱

فریق ایک سال تک ایک دوسرے سے الگ تھلک رہیں گے اس مدت میں دو حکم یعنی دونوں فریقوں کے اپنے نمائندے ان دونوں گروہوں کے بارے میں اپنی اپنی رائے دیں گے۔

جب قرارداد اور معاہد لکھا گیا اور دو اشخاص کی تحکیم کے موضوع پر طرفین کے دستخط ہو گئے تو وہی لوگ جنہوں نے حضرت علی علیہ السلام پر تحکیم قبول کر لینے کیلئے اول اول دباؤ ڈالا تھا، اپنے اس عمل پر پشیمان ہوئے اور امامؑ سے خواہش کی کہ اپنے عہد و پیمان کی پرواہ کیے بغیر پھر جنگ شروع کر دیں۔ امامؑ نے اس کے جواب میں فرمایا:

ویحکم ابعد الرضا والعهد نرجع اولیس الله یقول "اوفوا بالعقود" وقال اوفو بعهد الله اذا عاهد تم ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدها وقد جعلتم الله علیکم کفیلا ان الله یعلم ما تفعلون

''وائے اور ہلاکت ہو تمہارے لئے! کیا اپنی رضا مندی دینے اور عہد و پیمان باندھنے کے بعد ہم اپنی بات سے پھر جائیں کیا اللہ نے نہیں فرمایا کہ اپنے عہد و پیمان کے وفادار رہو، اور یہ نہیں فرمایا کہ خدائی عہد و پیمان کے وفادار رہو اور کیا یہ بھی نہیں فرمایا کہ مستحکم ہونے کے اپنی قسموں کو نہ توڑو، جب کہ خدا کو تم سے اپنا کفیل قرار دیا ہے، خدا اس سے آگاہ ہے جو تم انجام دیتے ہو۔''

عہدِ الٰہی سے کیا مراد ہے؟

قرآن مجید میں کئی جگہ ''عہد'' کا لفظ ''اللہ'' کے ساتھ آیا ہے اور ''عہد اللہ'' کے صورت میں استعمال ہوا ہے [1]۔ دیکھنا چاہیئے کہ اس سے کیا مراد ہے؟

ممکن ہے اس سے مراد عہد و پیمان ہوں جو اس لفظ جلالہ یعنی اللہ کے ساتھ کسی نہ کسی صورت میں آتے ہیں۔ مثلاً خدا کی قسم یا نذر وغیرہ، گویا اللہ سے مناسبت ہے اس لئے اس کو ''عہد اللہ'' کہا گیا ہے، جسے ذیل کی آیت میں لفظ ''شہادت'' کی اللہ کی طرف اضافت ہوئی ہے:

وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللهِ

''ہم خدا کی شہادت کو نہیں چھپاتے۔'' (مائدہ۔۱۰۶)

---

[1]۔ سورۂ بقرہ۔۲۷۔ آل عمران۔۷۷۔ رعد۔۲۰، ۲۵۔ نحل ۹۱، ۹۵

یا ممکن ہے خدا کی کل احکام اور قوانین ہوں جو امتوں کو سونپے گئے۔ مثلاً

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ

''تم میرے احکام اور عہد پر عمل کروتا کہ میں بھی تمہاری درخواستوں پر عمل کروں۔''

(توبہ۔۴۰)

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فطری اور تکوینی عہد و پیمان ہوں جو دست خلقت نے انسان کے اندر رکھ دیئے ہیں، درحقیقت ہمارے سارے فکری ادراک خدا کے وہ تکوینی عہد و پیمان ہیں جو ہماری خلقت وآفرینش میں پوشیدہ ہیں۔[1]

مگر یہ کہنا بہتر ہوگا کہ اس سے ہر قسم کے وہ عہد و پیمان مراد ہیں جو کسی نہ کسی طرح خدا سے مربوط ہوں۔ خواہ تکوینی پیمان ہوں یا تشریعی، خواہ جزوی شکل میں ہوں یا کلی خدائی احکام کی صورت میں۔ آخر میں چند نکات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ فقہا خرید وفروخت، نکاح اور دوسرے عقد، کو عہد و پیمان کا جزو شمار کرتے ہیں ان کو پورا کرنے اور ان نے وجوب کیلئے آیت:

اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (مائدہ۔۱)

سے استدلال کرتے ہیں مگر چونکہ یہ عہد و پیمان اپنے لئے خصوصی احکام رکھتے ہیں اور فقہی کتابوں میں ان پر بحث ہوئی ہے اس لیے ہم ان پر یہاں گفتگو نہیں کریں گے۔

۲۔ حکومت اسلامی جہاد، دفاع اور جنگ کے موقع پر جو عہد و پیمان حملہ آوروں اور عہد شکنوں سے باندھتی ہے اور وہ صلح نامے اور میثاق جو ایسے مواقع پر کیے جاتے ہیں قرآن نے ان آیتوں میں جہاں عہد و پیمان کے مسائل کا ذکر ہے ان پر توجہ کی ہے۔ ایسی آیات انتہائی اہم نکات کے ساتھ موجود ہیں۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات ان کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

۳۔ اسلام پیمان شکنی کی سخت مذمت کرتا ہے۔ مگر دو موقعوں پر اس کے توڑنے کو جائز سمجھتا ہے۔

(الف)...... جب دشمن اپنا عہد و پیمان توڑ دے، ایسے موقع پر اسلامی سربراہ اپنے عہد کی پرواہ نہ کرے قرآن پیمان شکن مشرکین کے بارے میں کہتا ہے:

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

---

[1] ۔''اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ''(یٰس۔۶۰)

''یہ کس طرح ممکن ہے کہ مشرکین اللہ اور اس کے رسول سے عہد و پیمان رکھتے ہوں مگر وہ جن کے ساتھ تم نے مسجد الحرام کے پاس عہد و پیمان باندھا ہے جب تک وہ اس کے وفادار رہیں تم بھی اس کی وفاداری کرو، خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔'' (توبہ۔۷)

پیغمبر اکرم ﷺ نے جب قینقاع ،قریظہ اور مدینے کے دوسرے یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کیا تو جس دن تک یہودی اپنے عہد و پیمان کے پابند رہے ،جناب پیغمبر ﷺ نے بھی اپنے عہد و پیمان کا احترام کیا۔مگر جس روز سے انہوں نے پیمان شکنی مسلمانوں کو ایذاء رسانی اور ان کی جاسوسی پر کمر باندھی آنحضرتؐ نے بھی اپنے عہد و پیمان کی پرواہ نہیں کی ۔قریش مکہ کے ساتھ بھی پیغمبر اکرم ﷺ کی یہی روش رہی جب انہوں نے مسلمان سے اپنا عہد و پیمان خزاعہ کے خلاف بنی بکر کی مدد کر کے توڑ دیا جب کہ خزاعہ مسلمانوں کے ہم پیمان تھے تو پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی اپنا معاہدہ ختم کر دیا۔عہد و پیمان کو اس بہانے توڑنا جائز نہیں کہ عہد و پیمان پر قائم رہنے سے کچھ فوائد ہاتھ سے نکل جائیں گے۔یہ بات اس امر کی بنیاد نہیں بن سکتی کہ عہد و پیمان کی پرواہ نہ کیا جائے۔

(ب) جب اسلامی سربراہ کو دشمن کی خیانت کا خوف ہو اور قرائن اور شواہد دشمن کی بری نیت اور اس کے غلط منصوبوں کی گواہی دیں تو ایسی صورت میں سربراہ اسلامی معاہدے کی فسخ کر کے مقابل فریق کو مطلع کر سکتا ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۝۵۸

''اگر تم کو کسی گروہ کی خیانت کا خوف ہو تو منصفانہ طور پر اس کو بتا دو۔خدا خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔'' (انفال۔۵۸)

اسلامی معاشرے کا دوسرے معاشروں سے ایک خاص فرق ہے ،غیر اسلامی معاشرے اپنے وقتی مادی فوائد کو ہی اہمیت دیتے ہیں چنانچہ جب تک عہد و پیمان کے لئے مفید اور سودمند ہوتا ہے اور ان کے مفاد کا ضامن ہوتا ہے وہ اپنی بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ وہ برقرار رہے۔لیکن جب اس عہد و پیمان سے ان کو فائدہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات وہ ان کے مفاد کے خلاف جاتا ہے تو مختلف حیلے بہانوں سے اس سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔

اس کے برعکس اسلامی معاشرے کا حقیقی ہدف چونکہ انسانی اقدار کا پھیلنا اور روحانی اصول کو زندہ کرنا اور انسان دوستی کو عام کرنا ہوتا ہے اس لئے وہ کسی بھی صورت میں اپنے عہد و پیمان کو نہیں توڑتا، بلکہ حتی الامکان اس کا دفاع کرتا ہے،یہی وجہ ہے کہ جب قرآن کہتا ہے کہ جب تک دوسرا فریق اپنے پیمان کا وفادار رہے تم بھی وفادار رہو تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ

''یہ اس کی نشاندہی ہے کہ عہد و پیمان پر عمل کرنا تقویٰ ہی ہے۔'' (توبہ۔۷)

اور جب کہا کہ دشمن سے اگر معاہدے کا تم کو خوف ہو تو اپنے عہد و پیمان کو توڑ دو اور مقابل فریق کو خبر کر دو وہاں ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ

(انفال۔۵۸)

اور یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ بتائے بغیر عہد و پیمان کو توڑنا خیانت ہے۔

اور جب کہا کہ اگر دشمن کا کوئی سپاہی امان چاہے تاکہ خدا کا کلام اور قرآن کا پیغام سن سکے تو اس کو امان دی جائے فوراً ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کو اس کی جائے امن تک پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

ثُمَّ اَبْلِغْہُ مَاْمَنَہٗ

(توبہ۔۶)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

ذمة المسلمین واحدة یسعی بھا ادناھم۔ [1]

''سارے مسلمانوں کا معاہدہ ایک ہے۔ اگر ایک فرد ان میں سے امان دے تو سب اس کو قبول کریں۔''

ایفائے عہد اور تاریخ کی اہم شخصیتیں

تاریخ ایسی عظیم اور اہم شخصیتوں کا ذکر کرتی ہے جو عہد و پیمان کے ایفاء کو آخری سانس تک سینے سے لگائے رکھتی تھیں۔

ہم حجاج کے تاریک عہد کا ایک واقعہ پڑھتے ہیں کہ اس نے کچھ لوگوں کے قتل کا حکم دیا جب ان میں سے آخری آدمی کے قتل کی نوبت آئی تو مسجد کے موذن کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے اس شخص کو اپنے ایک افسر کے سپرد کیا کہ رات کو اس شخص کی نگرانی کی جائے اور صبح کو دارالامارہ میں لایا جائے تاکہ حجاج اس کو سزا دے۔

جب وہ دونوں وہاں سے چلے تو قیدی نے افسر سے کہا کہ مجھے بلاوجہ گرفتار کیا گیا ہے میں رحمتِ خدا کا امیدوار ہوں۔ میری خواہش یہ ہے کہ تم مہربانی کر کے مجھے اجازت دو تو میں آج کی رات گھر چلا جاؤں اپنے بیوی بچوں سے آخری بار مل لوں ان سے وصیت کر کے لوگوں کے حقوق ادا کر سکوں، کل صبح سویرے تمہارے پاس واپس آجاؤں گا۔ حجاج کے افسر کو اس درخواست پر سخت تعجب ہوا اور کہنے لگا کہ کبھی دیکھا ہے

[1] ۔ مستدرک الوسائل۔ جلد ۳ صفحہ ۲۵

کہ کسی پنجرے سے پرندہ اڑ کر دوبارہ اس میں واپس آ جائے؟ میں کس طرح تجھ کو جانے دوں جب کہ تیرے واپس آنے کی کوئی امید نہیں۔قیدی نے جواب دیا میں عہد کرتا ہوں کہ کل صبح اول وقت میں تمہارے پاس واپس آ جاؤں گا۔اس معاہدے پر میں اللہ تعالیٰ کو گواہ کرتا ہوں۔طاغوتی افسروں اور حاکموں کے برخلاف کے اس افسر نے ایک لمحے کیلئے اپنی روش بدلی اور اس قیدی کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔

اجازت تو دے دی مگر اس کے جانے کے بعد خلجان میں پڑ گیا ہے اسے یقین ہو گیا کہ حجاج کا عتاب اس پر آئے گا، رات کی نیند اُڑ گئی اور وہ افسر صبح تک جاگتا رہا، صبح سویرے اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔دیکھا تو وہ قیدی کھڑا تھا،افسر نے تعجب سے پوچھا کہ تو کیوں واپس آ گیا؟ اس نے جواب دیا کہ جو شخص عہد کرے اور خدا کو اس پر گواہ بنائے اس کو چاہیے کہ اس کو ضرور پورا کرے،ساتھ ہی ساتھ میں پروردگارِ عالم کی رحمت پر کامل بھروسہ رکھتا ہوں۔افسر اس کو دارالامارہ لے گیا اور اپنی سرگزشت حجاج کو سنائی اور اس کے وعدے کے پاس ولحاظ پر تعجب کیا۔حجاج نے اس شخص کو افسر کو بخش دیا۔افسر نے بھی اس کو انتہائی مہربانی سے آزاد کر دیا،آزاد ہوا مگر اس نے افسر کا شکریہ ادا نہ کیا گھر چلا گیا دوسرے دن آیا اور افسر کے احسانات کا شکریہ ادا کیا۔اس ضمن میں ایک دن دیر کرنے کی وجہ بتائی کہ مجھ کو نجات دینے والا خدا تھا اور تم اس کام کا وسیلہ اور ذریعہ تھے اگر میں تمہارا شکریہ ادا کرتا تو تم کو نعمت خدا میں شریک کیے ہوتا میں نے ضروری سمجھا کہ پہلے خدا کا شکر ادا کروں اور پھر تمہارا شکریہ ادا کروں۔[1]

---

[1] ۔ناسخ التواریخ۔جلد اول۔حالات امام باقر علیہ السلام۔ص۔۹۷

قرآن کا
دائمی منشور 2

خدائی عہد و پیمان کے ایفا کی بحث کی تکمیل کے ساتھ قرآن کا ایک دائمی منشور جو سورہ انعام کی آ ۱۵۱، ۱۵۲ آیات میں نازل ہوا ہے اس کی تفسیر مکمل ہوئی اس منشور کی تفسیر جو دس اصول پر مبنی ہے، تفسیر موضوعی کی صورت میں انجام پائی، چنانچہ تفسیر موضوعی کا طرز تحریر اور اس کی ترتیب کا اندازہ بھی قارئین کرام کیلئے واضح ہو گیا ہوگا۔ اب موقع ہے کہ قرآن کے دوسرے دائمی منشور کی طرف رجوع کریں اس میں متعدد اصول موجود ہیں اور ان میں سے چند اصولوں کا انتخاب کیا جائے گا۔ قرآن کی سورۂ بنی اسرائیل سے ۱۸ آیات کے حوالے سے دوسرا منشور پیش کیا جائے گا ان میں سے چند اصول سورہ انعام کے منشور میں بھی آئے ہیں اور چند بالکل نئے ہیں۔ یہ منشور اس سورہ کی ۲۲ ویں آیت سے شروع ہو کر ۳۹ میں آیت پر ختم ہوتا ہے، یعنی:

لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ

سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتا ہے۔

اسلامی موضوعات پر تحریر و تقریر کرنے والوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں منشوروں کی آیات اور اس جیسے اور منشوروں کی آیات کو یاد کر لیں اور ہر اصول کو دوسری اُن آیات سے ملا کر جو اس سلسلہ میں آئی ہیں ان کی تفسیر کریں۔ جیسا میں نے عرض کیا دونوں منشوروں میں بعض اصول مشترک ہیں اور بعض جدا ہیں، چنانچہ قارئین کرام اس منشور کے جملہ اصولوں سے بھی آگاہی حاصل کریں اب ان کو ہم اجمالی طور پر شمار کرتے ہیں اور جو اصول گذشتہ منشور میں نہیں آئے ان کی تفسیر پیش کی جائے گی اس سے پیشتر آپ اجازت دیں کہ آپ کو قرآن کے کچھ دیگر منشوروں سے ہم آشنا کریں۔

بیشک اس جلد میں اس کے اصولوں کی تفسیر ہم نہیں کر پائیں گے مگر ان کے متن سے آپ آشنا ہوں گے اور اس طرح مجموعی تفسیری صلاحیت اجاگر ضروری ہوگی۔ چنانچہ ان دو منشوروں کی طرح ایک تیسرا منشور بھی ہے جو سورہ مومنوں کے آغاز میں آیا ہے۔

یہ منشور ''قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ'' کی آیت سے شروع ہوتا ہے اور

الَّذِيۡنَ يَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ

کی آیت پر ختم ہوتا ہے اس منشور کے سات اصول بیان ہوئے ہیں سورہ مومنون کی آیات ۱ تا ۱۰ کی طرف رجوع فرمائیں۔ پھر ایک چوتھا منشور ہے جو سورہ فرقان میں آیات ۶۳ تا ۷۷ میں پیش ہوا ہے جو آیت:

وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِيۡنَ يَمۡشُوۡنَ عَلَى الۡاَرۡضِ هَوۡنًا

سے شروع ہو کہ سورہ کے آخر تک بیان ہوا ہے اس منشور میں ۱۱۴ اصول پیش ہوئے ہیں۔ ان اصولوں کی ہم نے تفسیر موضوعی کی ہے جو ''سیمائی انسانِ کامل در قرآن'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے جو پند و نصائح کیے اگر ان پر نظر کریں تو وہ ایک پانچواں منشور شمار کیا جا سکتا ہے جس میں ۱۱۲ اخلاق

اور معاشرتی اصول بتائے گئے ہیں اس کیلئے سورہ لقمان کی آیات ۱۳ تا ۱۹ کی طرف رجوع کریں۔ یہ قرآن کے منشور اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ انسان کی نظر میں اس کتاب کی عظمت اجاگر کرتے ہیں انسان اپنے وجود کے ذرے ذرے سے اس کے آسمانی کتاب ہونے پر یقین لے آتا ہے اور اس بات پر بھی کہ یہ وہ حکمت سے پُر کتاب ہے جو حکیم مطلق کی طرف سے نوع بشر کی سعادت اور خوش بختی کیلئے نازل کی گئی ہے۔

دوسرے منشور کے 14 اصول

اس منشور کے حسب ذیل اصول ہیں جن کو آیت کے ایک ایک حصہ کے ذریعے پیش کیا جائے گا، آیت کی تکمیل کیلئے خود قرآن کی طرف رجوع کریں۔

۱۔ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ

''خدا کے ساتھ دوسرا خدا قرار نہ دے۔''

۲۔ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ

''تمہارے پروردگار نے فرمان جاری کیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو۔''

۳۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

''ماں باپ سے نیکی کرو۔''

۴۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ

''قریبوں مسکینوں اور راستے میں رقم ختم کر بیٹھنے والے مسافروں کا حق ادا کرو۔''

۵۔ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا

''اسراف اور فضول خرچی نہ کرو۔''

۶۔ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ

''اپنے ہاتھ اپنی گردوں سے نہ باندھو اور نہ ان کو زیادہ کُھلا رکھو۔''

۷۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ

''اپنی اولاد کو بھوک کے خوف سے قتل نہ کرو۔''

۸۔ وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰٓی

''زنا اور بدکاری کے قریب نہ جاؤ۔''

۹۔ وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ

''حق کے بغیر کسی انسان کو جس کے خون بہانے کو خدا نے حرام کیا ہے، قتل نہ کرو۔''

۱۰۔ وَلَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡیَتِیۡمِ اِلَّا بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ

''یتیم کے مال کے قریب احسن صورت کے علاوہ نہ جاؤ۔''

۱۱۔ وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَہۡدِ

''عہد و پیمان کو ایفاء کرو۔''

۱۲۔ وَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ اِذَا کِلۡتُمۡ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِیۡمِ

''پیمانہ صحیح رکھو اور صحیح ترازو کے ساتھ وزن کرو۔''

۱۳۔ وَلَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡـُٔوۡلًا

''جس چیز کو نہیں جانتے ہو اس کی پیروی نہ کرو۔ کان، آنکھ، اور دل کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔''

۱۴۔ وَلَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا

''تکبر اور غرور سے زمین پر نہ چلو۔''

یہ وہ اصول ہیں جو اس دائمی منشور میں آئے ہیں۔

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ ان ۱۴ اصولوں میں سے ۸، اصول وہ ہیں جو سورہ انعام کے منشور میں بھی آئے ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ صرف خدا کی عبادت کرو۔

۲۔ ماں باپ سے نیکی کرو۔

۳۔ اپنی اولاد کو بھوک اور افلاس کے خوف سے قتل نہ کرو۔

۴۔ زنا کے نزدیک نہ جاؤ۔

۵۔ محترم شخص کو قتل نہ کرو۔

۶۔ عہد و پیمان کے وفادار رہو۔

۷۔ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ۔ اور

۸۔ پیمانہ اور وزن کرنے میں انصاف سے کام لو۔

ان کا گذشتہ منشور میں تجزیہ اور تفسیر کی گئی ہے اس منشور میں جو نئے اصول آئے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ خدا کا شریک اور رفیق کسی کو قرار نہ دو۔[1]

۲۔ قرابت داروں، مساکین اور سفر میں درماندہ افراد کے حقوق ادا کرو۔

۳۔ اسراف اور فضول خرچی سے پرہیز کرو۔

۴۔ خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرو۔

۵۔ غیر علم و یقین (گمان) کی پیروی نہ کرو۔ آلاتِ شناخت (آنکھ، کان، دِل) کی جواب دہی کی طرف توجہ دو۔

۶۔ متکبرانہ رفتار سے پرہیز کرو۔

مندرجہ بالا اصولوں کی تشریح کرکے ہم مجموعی طور سے پہلے منشور کے اصولوں کو شامل کرکے اب قرآن کے ۱۶ عقیدتی، معاشرتی اور اخلاقی اصولوں سے واقف ہوجائیں گے۔ اب ہم قارئین کرام کی اجازت سے ان نئے اصولوں میں سے اول اصول اجتماعی کی تفسیر دوسرے اصولوں سے پہلے شروع کرتے ہیں۔

انسانی زندگی میں آلاتِ شناخت و معرفت (آنکھ، کان اور دل) کی ذمہ داری اور جواب دہی کی جو اہمیت ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اس اصول کی تفسیر ہم پہلے کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ اسراف اور فضول خرچی کی حرمت کی تفسیر بھی۔ گو یہ سارے اصول انسانی زندگی کی سعادت بخشنے میں یکساں اور برابر ہیں۔

---

[1] ۔ اس سے مراد توحید ذات یا توحید افعالی ہے کیونکہ توحید در عبادت، ایک اصول کے طور پر اس آیت کے بعد آئی ہے۔

قرآن کا دائمی منشور 2

گیارھواں اصول

وسائل شناخت کے بارے میں انسان کی جواب دہی

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴿٣٦﴾

جس چیز پر تمہیں خود علم و یقین حاصل نہ ہو اس کی پیروی نہ کرو، کیونکہ کان، آنکھ اور دل میں سے ہر ایک ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ (بنی اسرائیل۔ ٣٦)

وَلَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓـئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا ۝۳۶

جس چیز پر تمہیں خود علم ویقین حاصل نہ ہو اس کی پیروی نہ کرو، کیونکہ کان، آنکھ اور دل میں سے ہر ایک ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ (بنی اسرائیل۔۳۶)

احساس جستجو اور تجسس وتحقیق کا جذبہ انسان کی روح اور نفسیات کا ایک رُخ اور بعد (Dimension) شمار ہوتا ہے ہر شخص حقیقت کا متلاشی اور مشتاق رہتا ہے، اگر انسان کی خلقت میں حقیقت کی تلاش کا جذبہ نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی جہالت کے پردوں کو چاک نہ کر پاتا۔

ہر شخص ہر معاملے کی حقیت کی تہ تک پہنچنے کا خواہاں ہوتا ہے، محض ظن وگمان اور قیاس وتصور اس کو مطمئن نہیں کر پاتے جب تک وہ واقعے کی پوری شناخت اور واقفیت نہ کر لے۔ اس جذبے کے فطری ہونے کی بناء پر ابن سینا کا کہنا ہے کہ جو شخص کسی نظریے کے بغیر دلیل کے پیروی کرے تو گویا اس نے اپنی انسانی فطرت کھو دی ہے۔

چنانچہ علم ویقین کی پیروی کرنا اور وہم وگمان سے دور ہونا انسان کے لئے فطری بات ہے۔ کبھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ عارضی فائدے کی خاطر یا مقام ومنصب حاصل کرنے کیلیئے اپنے آنکھ اور کان بند کر کے اپنی فطرت کے خلاف کسی گمان کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کیلیئے اظہار کرتے ہیں کہ وہ اس کو پورا علم ویقین رکھتے ہیں قرآن ایسے لوگوں کی متعدد آیات میں مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمَا لَهُمۡ بِذٰلِكَ مِنۡ عِلۡمٍ ۚ اِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ

''جس چیز کا وہ دعویٰ کرتے ہیں اس کے بارے میں قطعی علم ویقین نہیں رکھتے، بلکہ وہم وگمان کی پیروی کرتے ہیں۔'' (جاثیہ۔۲۴)

زیر بحث آیت میں ہے:

وَلَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ

''جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کی پیروی نہ کرو۔ (بنی اسرائیل۔۳۶)

درحقیقت یہ جملہ اس فطری حکم کی یاد دہانی کراتا ہے اور ہم کو اس کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

علم کی پیروی بنیادی اصول ہے

جیسا ہم نے شروع میں عرض کیا جن آیات پر گفتگو ہو رہی ہے وہ انسان کیلئے ایک فطری اور طبیعی حکم کو بیان کرتی ہیں، ہر معاملے میں جب تک انسان حقیقت کی تہ تک نہ پہنچے اس کو چین نہیں آتا، چنانچہ آیت میں پیش کیا گیا نکتہ اپنے وسیع معنی میں اس کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان کسی بھی موقع پر درست ماخذ کے علاوہ کسی بات پر بھروسہ نہ کرے۔

مگر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر علم کی پیروی ایک کلی اور بنیادی اصول ہے تو پھر انسان بعض موقعوں پر ظن وگمان کی پیروی کیوں کرتا ہے مثلاً کسی چیز کی ملکیت کے سلسلے میں اس چیز کو جب کسی کے تصرف میں دیکھتے ہیں تو اس کے ''دوالید'' ہونے پر بھروسہ کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ یہ اس کی چیز ہے۔

ایک عادل جب معصومؑ سے احکام خداوندی نقل کرتا ہے تو ہم اعتماد کرتے ہیں (احکام میں خبر واحد کی حجیت) اور موضوعات کو طے کرنے میں مثلاً فلاں چیز پاک ہے یا نجس، فلاں کی مِلک ہے یا نہیں، اس بارے میں دو عادل گواہوں کے قول پر ہم عمل کرتے ہیں (موضوعات میں بینہ کی حجت) ہم ان موقعوں پر قرائن پر عمل کرتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی علم ویقین سے متعلق نہیں تو پتہ چلتا ہے کہ آیت کا یہ نکتہ ایک کلی اصول نہیں ہے اور بعض اوقات انسان گمان اور ظن پر بھی بھروسہ کرتا ہے۔

اس سوال کو فخر رازی نے اپنی تفسیر میں اٹھایا ہے اور اس نکتے کو پیش کیا ہے۔[1] دس ایسے مواقع کا بھی ذکر کیا ہے جہاں شارع نے اجازت دی ہے کہ ظن پر عمل ہوسکتا ہے مگر بہر حال ایک نکتے پر رازی کی نگاہ نہیں گئی کہ اگر وہ اس پر نظر کرتا تو وہ اس نتیجے پر پہنچتا کہ ان موقعوں پر بھی عمل کی بنیاد ''یقین'' ہے، ''ظن'' نہیں اور وہاں بھی درحقیقت علم وادراک پر عمل ہو رہا ہے نہ کہ ظن وگمان پر۔

یہ صحیح ہے کہ ان قرائن وامارات میں سے کوئی بھی یقین سے بہرہ ور نہیں لیکن چونکہ شارع کی طرف سے ان کی حجت اور ان پر اعتماد کیا جانا قطعی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے اس لئے ان پر عمل گویا یقین وحجت کے طور پر عمل کرنا ہے اور شارع کی رضا کے مطابق عمل کرنا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ہر ہر حکم اور معاملے میں یقین کا حصول مشقت اور زحمت کا باعث ہوسکتا ہے اور اسلام ایک سہل اور آسان دین ہے اس لئے صاحب شریعت نے اجازت دی ہے کہ ان موقعوں پر ہم اس نوع کے قرائن وامارت پر عمل کریں شارع کی اجازت ہم تک علم ویقین کے طور پر پہنچی ہے اور آفتاب کی طرح روشن ہے کہ اس موقع پر شارع نے ہم کو اجازت دی ہے کہ ان ظنی دلائل پر عمل کریں چنانچہ اس قطعی اجازت کی وجہ سے ہمارا ان قرائن پر عمل کرنا گویا یقین پر عمل کرنا ہے نہ کہ ظن وگمان پر۔

ہر آدمی کیلئے لازمی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے سفر میں یقین کی کیفیت کا حامل ہو، ظن وگمان پر نہ چلتا ہو اور جب ان قرائن پر عمل کرنے کی

---

[1] تفسیر مناتیج الغیب۔ ج۵ ص۵۸۸ کی طرف رجوع کریں۔

اجازت زندگی کے راستے کو سہل اور آسان بنانے کیلئے قطعی دلائل سے ثابت ہے تو گویا انسان ان موقعوں پر حقیقت پر چل رہا ہے، نہ کہ خیال اور قیاس پر۔

واضح الفاظ میں انسان ذمہ داریوں اور فرائض کو قطعی دلیل پر عمل کے طور سے انجام دے، مثلاً کوئی حکم خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنے یا پھر ایسی چیز پر عمل کرے جس کا حجت ہونا قطعی دلیل سے ثابت ہو چکا ہو۔

فخر رازی نے جو دس مواقع ذکر کیے ہیں یہ اس دوسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا قابل اعتماد ہونا قطعی دلیل سے روشن ہے اسی لئے ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے:

وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا

''ظن و گمان تم کو حق کی پیروی سے بے نیاز نہیں کرتا۔'' (نجم۔۲۸)

کوئی بھی عقلمند آدمی حقیقی اعتماد کی بات کو وہم و خیال سے جو اتفاقاً صحیح بھی ہو گیا ہو، نہیں بدلتا۔ گویا انسان کیلئے بات کرنے اور فیصلہ کرنے کا دائرہ بہت محدود ہے یعنی جہاں اس کو کچھ معلوم ہے، وہاں بات کرلے اور جہاں اسے معلوم نہ ہو وہاں زبان نہ کھولے۔ حضرت امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

حق الله علی خلقه ان یقولوا ما یعلمون ویقفوا عند ما لا یعلمون۔ [1]

''خدا کا بندوں پر یہ حق ہے کہ جس چیز کو وہ جانتے ہیں کہیں اور جس چیز کو نہیں جانتے اس کے بارے میں رُک جائیں۔''

دین اسلام کے مطابق عدالت میں قاضی کو چاہیے کہ یہ جانے کہ جو حکم دے رہا ہے وہ حکم خدا ہے اگر محض وہ گمان پر فیصلہ کرتا ہے خواہ وہ فیصلہ حق بھی ہو تو اس کی جگہ جہنم ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:

رجل قضی بالحق وهو لا یعلم۔ [2]

''جو قاضی حق کے مطابق مگر جانے بغیر فیصلہ کرلے اس کی جائے قرار جہنم ہے۔

قرآن میں شناخت کے ذرائع کی جواب دہی کا ذکر

کان اور آنکھ (سننے اور دیکھنے کے دو اہم ذرائع) کی اہمیت کیلئے یہ بات کافی ہے کہ قرآن میں لفظ ''سمع'' ۲۲ مرتبہ اور لفظ ''بصر''

[1] ۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ابواب صفات القاضی۔ با ۱۲۔ حدیث: ۲۷

[2] ۔ وسائل الشیعہ ج ۱۸ ص ۱۲۷

۸۴ مرتبہ آیا ہے۔جس آیت پر گفتگو ہو رہی ہے اس میں فؤاد (یعنی دل) کو بھی جواب دہ کہا گیا ہے اور دل کے آلاتِ شناخت بھی سمع اور بصر ہی ہیں اور انہیں بھی ساتھ ساتھ جواب دہ شمار کیا گیا ہے،فؤاد، سے مراد انسان کا دل اور روح ہے جس سے انسان کی حقیقت اور شخصیت تشکیل پاتی ہے ،یہ ''فؤاد'' ہی ہے جو حقیقتاً جواب دہ ہے یہاں تک کہ سمع اور بصر کے سلسلے میں بھی یہی جواب دہ ہے مگر چونکہ یہ دونوں ذرائع شناخت یعنی کان اور آنکھ بھی انسانی زندگی میں بہت اہمیت کے حامل ہیں،اس لئے وہ خود جواب دہ اور ذمہ دار کی حیثیت سے شمار ہوتے ہیں۔

یہ آیت شروع میں ہم کو ایک فطری حکم یعنی علم کی پیروی کرنے کی طرف متوجہ کرتی ہے اور آگے چل کر اس حکم کو مدلل کرکے پیش کرتی ہے اور شناخت کے ذرائع کو بھی جواب دہ شمار کرتی ہے کان،آنکھ اور دل کا جواب دہ ہونا درحقیقت انسان کا خود جواب دہ ہونا ہے۔اس جواب دہی اور ذمہ داری کی تین طرح تفسیر کی جا سکتی ہے:

۱۔خداوند عالم نے انسانی وجود میں شناخت کے ان ذرائع کو اس لئے رکھا ہے کہ وہ ان کے ذریعے حق اور باطل کو جُدا جُدا پہچان سکے،ان میں امتیاز کر سکے اور اس طرح زندگی کی بنیاد حق پر رکھ سکے۔چنانچہ انسان جواب دہ ہے کہ بجائے آنکھ اور کان بند کرکے وہم و گمان کی طرف مائل ہونے کے،ان کے ذریعے حقائق کو اوہام سے الگ کرکے زندگی علم اور یقین پر استوار کرے۔

۲۔انسان جواب دہ ہے کہ ان شناخت کے ذرائع سے استفادے کیلئے ہر قسم کی افراط و تفریط سے اجتناب کرے۔جن چیزوں کو آنکھ سے دیکھا اور سنا ہے اس پر غور کرے کہ کیا ٹھیک دیکھا ہے اور سنا ہے؟ اور جس بات کا دل کے ذریعے فیصلہ کیا ہے کیا وہ فیصلہ صحیح تھا؟ وجہ یہ ہے کہ ہر قسم کا دیکھنا اور سننا دل کے فیصلوں کی بنیاد نہیں ہو سکتا۔ان دونوں طرح کی جواب دہی کے بارے میں آیت میں اس طرح اشارہ ہوا ہے۔

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا

۳۔انسان اس انداز سے جواب دہ ہے کہ شناخت کے ان ذرائع سے صحیح اور جائز طور پر استفادہ کرے،حرام مناظر سے آنکھ بند کرلے اور غیبت تہمت اور دوسری حرام باتوں کو سننے سے کان بند رکھے۔[1]

قیامت کے دن یہی اعضاء و جوارح حکم خدا سے انسان کے خلاف گواہی دیں گے اس لئے کہ انسان ان اعضاء کے بارے میں براہ راست ذمہ دار ہے۔ جس آیت پر گفتگو ہو رہی ہے اس کے علاوہ کئی آیات میں اس ذمہ داری کی وضاحت کی گئی ہے۔مثلاً:

حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٢٠﴾

---

[1]۔احادیث اسلامی میں اس آیت کے سلسلے میں ''مومن کی غیبت'' یا غنا' گانا اور موسیقی سننے کی حرمت پر استدلال ہوا۔شیخ انصاری کی کتاب ''مکاسب'' کی طرف رجوع کریں۔

''جس وقت وہ آگ کے قریب پہنچیں گے تو ان کے کان، آنکھیں اور کھال ان حرام اعمال کے بارے میں گواہی دیں گی جن کے ذریعے وہ ان اعمال کے مرتکب ہوئے تھے۔''(حٰم السجدہ ۲۰۔)

جب انسان کے خلاف ان کے اعمال کی گواہی ان کے اعضاء وجوارح دیں گے تو ان پر اعتراض ہوگا کہ کیوں ہمارے خلاف گواہی دی۔ وہ جواب دیں گے کہ وہ خدا جس نے ہر چیز کو قوت گویائی دی ہے اسی نے ہم کو بات کرنے کی قدرت دی ہے۔[1]

اب جب گفتگو شناخت کے ذرائع کی جواب دہی کے بارے میں یہاں تک پہنچی ہے، مناسب ہے کہ ذہن کے خارج سے شناخت اور آگاہی کے امکانات کا قرآن کی نظر سے جائزہ لیا جائے یہ ہماری بارہویں بحث کی بنیاد ہوگی۔

---

[1] ۔حٰم السجدہ۔۲۱

قرآن کا دائمی منشور 2

بارھواں اصول

شناخت کے خارجی وسائل

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

خدا نے تم کو تمہاری ماؤں کے شکم سے نکالا، جب کہ تم کوئی چیز نہیں جانتے تھے اور تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل بنائے کہ شاید شکر ادا کرو۔ (نحل۔ ۷۸)

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

خدا نے تم کو تمہاری ماؤں کے شکم سے نکالا، جب کہ تم کوئی چیز نہیں جانتے تھے اور تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل بنائے کہ شاید شکر ادا کرو۔ (نحل ـ ۷۸)

جس دن انسان اس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے اس کا ذہن ایک سادہ کاغذ کے مانند بالکل صاف اور بے نقش ہوتا ہے، وہ علم و آگاہی سے بالکل خالی ہوتا ہے۔ بتدریج حواس خمسہ کے ذریعے، جیسے آنکھ اور کان سے اپنے سے باہر کی دنیا سے آگاہی حاصل کرتا ہے اس کی آنکھیں ان چیزوں کی معلومات اس کو پہنچاتی ہیں، جو دیکھی جاتی ہیں۔ کان ان چیزوں سے آشنائی پیدا کرتے ہیں جو سنی جاتی ہیں۔ قوت ذائقہ ان چیزوں سے شناسا کرتی ہیں جو چکھی جاتی ہیں۔ قوتِ شامہ ان کی خبر دیتی ہے جو سونگھی جاتی ہیں اور قوت لامسہ اشیاء کی نرمی و سختی اور سردی و گرمی کی خبر دیتی ہے۔

صرف افلاطون ہے جس کا کہنا ہے کہ روح انسانی اس دنیا میں آنے سے پہلے اور بدن کے قالب سے تعلق پیدا کرنے سے پہلے ایک دوسرے جہان میں تمام چیزوں کو سیکھ چکی تھی اور ہر چیز سے آگاہ تھی۔ جب روح پہلے دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہوئی اور بدن سے اس کا تعلق پیدا ہوا تو اس کی آگاہیوں پر پردہ پڑ گیا ہے اس کے اور اس کی معلومات کے درمیان دوری حائل ہوگی۔[1]

یہ نظریہ افلاطون اور اس کے مکتبہ فکر کے ماننے والوں کا ہے دوسرے فلسفی اس نظریے کے برخلاف کہتے ہیں کہ انسان اپنی ماں کے شکم سے قطعی ناآگاہ پیدا ہوتا ہے دنیا میں آ کر آنکھ اور کان جیسے شناخت کے وسیلے سے اپنی باہر کی دنیا سے تعلق پیدا کرتا ہے اور پھر علم و آگاہی اور معلومات کا خزانہ بن جاتا ہے۔ قرآن کی آیات سے بھی یہی نکتہ واضح ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

''اللہ نے تم کو شکم مادر سے باہر نکالا، جب کہ تم کسی چیز سے آگاہ نہیں تھے۔ تمہارے لئے کان آنکھیں اور دل بنائے تاکہ (ان کے ذریعے علم و آگاہی حاصل کرو اور) خدا کا شکر بجالاؤ۔''

---

[1] ۔ اسفار و فلسفہ عمومی پل فولکیۃ۔ ص۔ ۱۹۵

(نحل۔۷۸)

اس آیت سے مندرجہ ذیل نکات اخذ کیے جاسکتے ہیں:

ا۔انسان اپنی مادی زندگی کے آغاز میں کسی چیز سے آگاہ نہیں ہوتا۔پھر آہستہ آہستہ عالمِ مادی سے معلومات حاصل کرتا ہےاور یہ امر افلاطون کے نظریے کے بالکل برخلاف ہے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کا ذہن پیدائش کے وقت ہر علم وآگاہی سے خالی ہوتا ہےاور علم ودانش کے لحاظ سے وہ صفر ہوتا ہے تو ہم اس بات کے کیونکر معتقد ہیں کہ انسان فطری طور پر میلانات کے ایک سلسلے سے وابستہ ہے جیسے مذہب اور خدا کی طرف میلان علم وتحقیق کی طرف رجحان،اخلاق اور نیکی کی طرف جھکاؤ اور جمال وحسن کی طرف میلان وغیرہ۔

قرآن کے مطابق انسان میں خدا کی پہچان اور اس سے لگاؤ اور پھر اچھے اور بُرے میں تمیز وہ ندا اور پکار ہے جو انسان اپنے اندر سے سنتا ہے۔چنانچہ خدا کے فرستادہ انبیاء اور انسانوں کے معلم اس فطری ندا اور پکار کو اپیل کرتے ہیں اور اس ہی کو نشوونما دیتے ہیں۔اگر ایسا ہے تو پھر مذکورہ آیت میں یہ کیوں فرمایا گیا ہے:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا

''خدا نے تم کو شکم مادر سے باہر نکالا تو تم کسی چیز سے آگاہ نہیں تھے۔''

جو آیات فطری آگاہی کا ذکر کرتی ہیں بہت ہیں ان میں سے چند پیش کی جاتی ہیں:

(الف)فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ

''خدا کے خالص دین کی طرف رُخ کیے رہو،یہی خدا کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔''(روم۔۳۰)

یہ آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اللہ کا دین فطری امور کا ایک سلسلہ ہے جس کا انسان اپنے اندر سے خواستگار ہے۔

(ب)وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝

''قسم ہے نفس اور اس خدا کی جس نے اس کو پیدا کیا اور برائیوں اور نیکیوں سے اس کو آگاہ کیا۔''(شمس۔۷،۸)

(ج)اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝

''کیا اس کو دو آنکھ،ایک زبان اور دو لب نہیں دیئے اور اس کو خوبیوں اور برائیوں کے بارے میں

ہدایت نہیں کی؟'' (بلد۔۸،۱۰)

ان آیات اور ان جیسی دوسری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ انسان آگاہیوں کا ایک سلسلہ رکھتا ہے جس کی جڑیں خود اس کے اندر ہیں۔ یہ وہی ندا اور پکار ہے انسان اپنے اندر سے سنتا ہے۔ یہ پکار اس کی فطرت اور خلقت سے مربوط ہے خارج سے نہیں تو پھر یہ آیت کس طرح کہتی ہے کہ انسان ذہن اپنی پیدائش کے دن ہر قسم کے علم و آگاہی سے خالی تھا۔ مختصر یہ کہ علم و آگاہی کی بنیادوں تو حسی آلات (آنکھ، کان وغیرہ) تک محدود کرنا اس حقیقت سے ہم آہنگ نہیں کہ بعض آگاہیاں فطری اور جبلی ہوتی ہیں۔

اس سوال کا جواب واضح ہے یہاں امور فطری سے مرادوہ استعداد، توانائی، ہموار زمین اور مخفی استطاعت کے سلسلے ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے اپنے خارجی ماحول کے زیر اثر رفتہ رفتہ نشوونما پاتے ہیں اور پھلتے پھولتے ہیں۔ مگر یہ امور جو پیدائش کے دن محض زمین فراہم کرتے ہیں ان کو علم و آگاہی نہیں کہا جاسکتا۔ مذہب کی طرف میلان یا اچھائی کی طرف رغبت کے فطری ہونے کا یہ معنی نہیں کہ یہ رجحان اس کی پیدائش کے دن ہی اس میں اجاگر ہوتا ہے اور بچہ اپنے اندر اس قسم کا میلان محسوس کرتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے کے وجود کے مرکز میں ایسی قوتیں موجود ہوتی ہیں۔ بعد میں انسان کے اپنی خارجی ماحول سے رابطے اور واسطے کے تحت یہ قوتیں اپنے کو اس طرح ظاہر کرتی ہیں، جیسے ایک بیج سے کونپل۔

خلقتِ انسان میں ایسی چھپی ہوئی قوتیں کہ جو اس کی مستقبل کی رشد وہدایت کیلئے تمہید کی حیثیت رکھتی ہوں انہیں علم و آگاہی نہیں کہا جاسکتا۔ گویا انسان ایک درخت کی طرح ہے جو خارج سے غذا حاصل کر کے پھل اور پھول دیتا ہے۔ جب تک اس کا رابطہ آفتاب، ہوا اور مین سے نہ ہو اور ان سے اپنی غذا نہ لے اس وقت تک وہ پھل دینے کی قدرت نہیں رکھتا۔ فطری علم و آگاہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے وجود میں قوت کے مرحلے سے آگے بڑھ کر فعلیت کے مرحلے تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ یہ قوت اور توانائی حواس خمسہ کے ذریعے انسان کے باہر کی دنیا سے تعلق کے بعد نشوونما پاتی ہے اور برگ وبار دیتی ہے۔

۲۔ قرآن کان اور آنکھ کی شناخت کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ سمجھتا ہے مگر ''حسیوں'' کی طرح شناخت کو ''حس'' تک محدود نہیں کرتا، ثبوت یہ ہے کہ جس آیت کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے، اس میں قرآن ''فؤاد'' کو بھی جو ایک غیر حسی آلہ ہے، شناخت کا ذریعہ بتاتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ قرآن میں ''فؤاد'' سے مراد ہے کیا اس کا مطلب انسانی عقل وخرد ہے، کبھی یہ لفظ مفرد کی شکل میں ''فؤاد'' اور کبھی ''افئدہ'' جمع کی صورت میں قرآن میں آیا ہے یا اس سے مراد کوئی اور ''دل'' نامی آلہ ہے جس کو صاحبانِ معرفت عقل کا غیر سمجھتے ہیں۔ اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑیں گے۔ قرآن شناخت کے حسی آلات میں سے صرف آنکھ اور کان کا نام لیتا ہے اور فرمایا ہے:

ان السّمع والبصر..................

اور باقی تین حواس کا ذکر نہیں کرتا۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ زیادہ تر معلومات انسان کو ان ہی دو حواس سے حاصل ہوتی ہیں۔

ابن سینا کے مطابق انسانی معلومات کے نو حصے ان ہی دو حواس سے متعلق ہیں۔ دسواں حصہ باقی تین حواس سے متعلق ہوتا ہے آپ اگر لغت کی کتابوں پر نظر کریں تو پتہ چلے گا کہ ان کے بڑے حصے کو امور سمعی اور بصری تشکیل دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن آلات شناخت میں سے صرف ان ہی دو حواس کا ذکر کرتا ہے۔

۳۔ ''حسیّ'' یہاں تک کہ ڈیکارٹ بھی جو عقل میں فطرت اور معقولات کی اہمیت کا قائل ہے، اس بات کے معتقد ہیں کہ حسیّ آلہ کی افادیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ ہماری زندگی میں قوت وطاقت بخشتا ہے، فطرت (Nature) پر ہم کو غلبہ دیتا ہے اور ہماری مادی ضرورت کو پورا کرتا ہے مگر ہم کو کبھی حالات وواقعات کے حقائق سے آشنا نہیں کرتا نہ یہ بتاتا ہے کہ عالم ہستی کی حقیقت کیا ہے اور نہ اس حقیقت کو دکھاپاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم حواس کی کارکردگی کے ذریعے اپنی زندگی کی احتیاجات تو پوری کرتے ہیں مگر ہمارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں کہ یہ ہم کہ حقائق اورواقعات کے سلسلون سے بے کم وکاست آگاہ رکھتا ہے جو کچھ ہماری حس کے ذریعے ہم پہنچتا ہے شاید وہ اس سے مختلف ہو جو خارج میں حقیقت ہے۔ مثلاً ہم گرمی کی خاطر ہاتھ آگ کی طرف بڑھاتے ہیں مگر ہم کو کہاں سے معلوم کہ جو کچھ ہم محسوس کرتے ہیں وہ کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے خارجی حقیقت کے مطابق ہے۔

ہم اس وقت اس نظریے کے بے بنیاد ہونے کے بارے میں گفتگو نہیں کرتے، اس لئے کہ یہ نظریہ سوفسطائیت تک پہنچتا ہے اور سوفسطائیت تو علم ودانش کے ذریعے حقیقت کے انکشاف کی منکر ہے، علم حقیقت کا افشاء کرتا ہے، اس سے انکار اپنے اندر بڑے مفاسد رکھتا ہے اس کا کہیں اور ذکر ہوگا۔ جو بات اسوقت زیر بحث ہے وہ یہ کہ قرآن انسان کے شناخت کے ذرائع مثلاً آنکھ کان کیلئے نہ صرف علمی بلکہ نظری قدر وقیمت کا بھی قائل ہے اس کا کہنا یہ ہے کہ انسان ان دوحواس کے ذریعے خارجی دنیا سے آگاہ ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے:

لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ

''تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے لئے اس نے کان، آنکھ اور دل بنائے۔''

تا کہ اس ذریعے سے تم آگاہ بنو، نہ کہ زندگی میں صرف قوی اور طاقت ور بن جاؤ۔

کیا ذہن سے خارج حقائق کی آگاہی ممکن ہے

کیا انسان اپنے ذہن سے خارجی اشیاء کے بارے میں جان سکتا ہے اس سلسلے میں گونا گوں نظریات ہیں جو مختلف مکاتب فکر کے ابھرنے کا سبب بنے، جیسے مندرجہ ذیل مکاتب فکر:

ا۔ جزمیوں کا مکتب

سقراط سے پہلے اور اس کے بعد کے اکثر فلسفی خارج میں موجود حقائق سے آگاہی کے امکان پر شک نہیں کرتے تھے، ان کی شناسائی

کو ممکن سمجھتے تھے، عقل انسانی کی قدرت کے قائل تھے، اسی لئے ان کو جزمی کہا جاتا ہے۔

۲۔ لاادریو کا مکتب

اس گروہ نے اس سوال کے جواب میں کہا ہے کہ نہ اس مسئلے کی تصدیق کی جاسکتی ہے اور نہ تکذیب درحقیقت یہ گروہ سوائے آگاہی نہ رکھنے اور جواب نہ دے سکنے کے اور کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔

۳۔ شکاکین کا مکتب

یہ گروہ ذہن سے خارج عالم کے متعلق شک نہیں رکھتا ان کا شک علم کے ذریعے حقیقت کی نشاندہی اور ذہن سے خارج کو سمجھنے کے بارے میں وہ ان وجوہات کی بناء پر جن میں سے بعض کا ہم ذکر کریں گے، علم کے ذریعے حقیقیت کے منکشف ہونے کے بارے میں شک رکھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہمارے علوم اور افکار قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ وجہ یہ بتاتے ہیں کہ صحیح وغلط کو اور صواب وخطا کو پہچاننے کا ان کے پاس کوئی معیار نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ یہ معیار ''حس'' ہے تو حس خود بھی غلطہ کر سکتی ہے مثلاً پانی میں لکڑی پڑی ہو تو اس کو آپ ٹیڑھا دیکھتے ہیں، حالانکہ وہ سیدھی ہوتی ہے وغیرہ۔

اگر یہ کہا جائے کہ وہ معیار عقل ہے تو عقل وخرد بھی خطا کر جاتہ ہے ایک دلیل کسی شخص کی نظر میں قابل توجہ ہوتی ہے اور دوسروں کی نگاہ میں بے معنی اور غلط ہوتی ہے۔ ایک عقیدہ کچھ لوگوں کی نظر میں صحیح ہوتا ہے اور دوسروں کی نظر میں غلط ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک فرد اپنے خاص ماحول میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ایک خاص انداز پر سوچتا ہے جبکہ دوسرا شخص دوسرے ماحول میں زندگی گزارنے کی بناء پر دوسرا طرز فکر رکھتا ہے۔ ہم اس وقت ان کے دلائل پر تبصرہ نہیں کر رہے، صرف ایک نکتے کا ذکر کرتے ہیں، ادراک اور فہم میں ''خطا'' کا وجود اور ''خطا'' کا معلوم کر لینا خود اس بات کا گواہ ہے کہ مسلم حقائق کا ایک سلسلہ ہماری نظر میں ہے جن کو ہم معیار قرار دیتے ہیں اور اسی معیار پر پرکھ کر ہم خطاؤں کو معلوم کرتے ہیں، ''خطا'' کے پتہ چلانے کا اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں کیونکہ ایک غلطی سے دوسرے غلطی کی تصحیح نہیں ہو سکتی۔

اگر ہم فطرت سلیم اور اپنے وجدان کی طرف رجوع کریں تو ہم دیکھیں گے کہ خطاؤں کے ایک انبوہ نے ہم کو گھیر رکھا ہے اس کے باجود حقائق کے ایک مستقل اور واضح سلسلے کے ذریعے ہم نے ان خطاؤں کا اندازہ کیا ہوا ہے اگر یہ حقائق نہ ہوتے تو ہم اپنی خطاؤں سے کبھی واقف نہ ہو سکتے۔

اس گروہ کے مقابلے میں شناخت اور پہچان کے امکان کے اثبات کیلئے فطرت اور وجدان کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اسلئے کہ اس گروہ کیلئے ہر قسم کا عقلی استدلال بے فائدہ ہے کیونکہ دلائل تو کچھ تمہید پر مبنی ہوں گے جو خود دلیل سے بے نیاز نہیں ہوگی، اور اگر دلائل کا سلسلہ فطرت اور وجدان جیسے نقطے پر جا کر بھی ختم نہ ہو تو گفتگو لامتناہی ہو کر بے نتیجہ ثابت ہوگی۔

قرآن اور دنیا کی شناخت کا امکان

قرآن میں شناخت کے ممکن یا ناممکن ہونے کا مسئلہ پیش نہیں کیا گیا ہے، مگر قرآن کا طرز بیان ایسا ہے جو اس کو سو فیصد ایک ممکن امر تسلیم کرتا ہے حضرت آدمؑ کو حقائق اشیاء کے علم اور حقیقتوں کی شناخت کی بناء پر یہ کتاب روئے زمین پر خدا کا خلیفہ سمجھتی ہے اور واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ اسماء (حقائق اشیاء) کا علم دے کر ساری چیزیں ان کو سکھائی گئیں، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا

''آدم کو کون و مکان کے تمام حقائق کی تعلیم دی۔'' (بقرہ۔۳۱)

یہ شناخت کوئی جزوی پہچان نہیں۔ یہ اس لئے قابل اہمیت شفناخت ہے کہ قرآن تمام اسماء اور حقائق (**کلھا**) کی شناخت کا ذکر کر رہا ہے چونکہ علم و آگاہی ذمہ داری اور تعہد Commutment پیدا کرتی ہے، لہٰذا خداوندِ عالم آدم کو تعلیم دینے اور اپنا جانشین مقرر کرنے کے بعد ایک خاص درخت کے پھل کھانے سے اجتناب کی ذمہ داری سونپتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ

''اس درخت کے قریب نہ جانا۔'' (بقرہ۔۳۵)

چونکہ جہان کی شناخت کے ساتھ ہی ذمہ داری اور فرائض آجاتے ہیں اور علم کے نتیجے میں فرض شناسی ضروری ہو جاتی ہے اس لئے حضرت آدمؑ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ایک خاص درخت کے قریب نہ جائیں اور اس کا پھل نہ کھائیں۔ قرآن اس درخت کا نام نہیں لیتا لیکن ایک روایت میں اسے تکبر، حسد اور دوسرے رذائل نفسانی کا درخت کہا گیا ہے۔[1]

جب انہوں نے اس ذمہ داری کو پورا نہیں کیا ان کے اس عمل کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ وہ جنت میں نہ رہیں، اور کسی دوسرے جگہ زندگی بسر کریں، جہاں کی زندگی رنج، تکلیف، سختی اور دشواریوں میں گھری ہوگی۔[2]

افسوس کی بات یہ ہے کہ اس موقع پر توریت قرآن کے برخلاف اس درخت کو نیک و بد کی شناخت کا درخت کہتی ہے اور اس کا ذکر کرتی ہے:

---

[1] ۔نور الثقلین۔ج ا۔ص ۱۸

[2] ۔سورہ طٰہٰ کی آیات ۱۱۷ تا ۱۲۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے نکلنا ممنوعہ درخت کے قریب جانے کا اثر وضعی تھا یعنی اس عمل کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ اس مقام سے باہر جائیں۔ مثل زہر کے جس کا اثر مارنا اور پانی کہ جس کا اثر پیاس بجھانا ہے چنانچہ حضرت آدمؑ کا جنت سے نکلنا اس پھل کھانے کا فطری اثر تھا، نہ کہ شرعی اور حقیقی سزا تھی، کوئی انسان یہ پھل کھانے کے بعد وہاں نہیں رہ سکتا، اس معاملے میں خدا کا منع کرنا پند و نصیحت تھا کہ کہیں اس قسم کے نتائج سے دوچار نہ ہوں۔

''خدانے آدمؑ سے فرمایا کہ باغ کے تمام درختوں کا تم کو اختیار ہے کہ ان سے کھاؤ لیکن نیک و بد جاننے کے درخت سے نہ کھانا، کیوں کہ جس دن تم نے اس سے کچھ کھایا اس دن موت کے مستحق ہو جاؤ گے۔''[1]

توریت اس واقعے کو مزید اس طرح پیش کرتی ہے:

''خدانے کہا کہ اب چونکہ آدمؑ نیک و بد جاننے کی وجہ سے ہم میں سے ایک ہوگیا ہے اور مبادا اپنا ہاتھ دراز کر کے درخت حیات سے بھی کچھ لے کر کھالے اور ہمیشہ زندہ رہے، چنانچہ خدانے ان کو باغ عدن سے نکال دیا تا کہ اس زمین میں جوان سے لی تھی کاشت جاری کرے آدمؑ کو نکال دیا اور باغ عدن کی مشرقی جانب کروبیان کو آتشیں تلوار کے ساتھ جو شجر حیات کی نگہبانی کیلئے گردش کرتے تھے، مسکن دیا۔''[2]

مختصر یہ کہ موجودہ تورات کے مطابق جنت میں دو درحت تھے جن کو خدا نہیں چاہتا تھا کہ آدمؑ ان کے پھل کھائیں، ایک نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا اور دوسرا حیات (جاودانی) کا درخت تھا۔ آدمؑ نے ایک جانور کے ورغلانے پر جس کو توریت سانپ کہتی ہے، اس پہلے درخت کا پھل کھالیا، خدانے اس خوف سے کہ کہیں آدم شجرِ حیات سے بھی نہ کھالیں، فوراً کّر وبیاں (فرشتوں) کو اس کی نگہبانی کیلئے مقرر کیا ہے۔

توریت میں آدمؑ کے قصے کا موازنہ اگر قرآن میں دی ہوئی سرگزشت سے کریں تو پہلے کتاب کی تحریف اور دوسرے کتاب کی اصلیت کی نشاندہی ہوتی ہے اس واقعے میں توریت کی باتیں اس انداز کی ہیں کہ ان کو وحی کا مقام نہیں دیا جا سکتا۔

موجودہ زمانے میں مغرب میں سائنس اور مذہب کے تضاد کا مسئلہ درپیش ہے اکثر مغرب والے مذہبی تعلیمات کو سائنس کے خلاف سمجھتے ہیں ان کا نظریہ یہ ہے کہ دین اور سائنس کی راہ ایک دوسرے سے الگ ہے۔ مثلاً ان کی خیال میں ممکن ہے کہ مذہب ہم کو ایک ایسی چیز کی طرف دعوت دے جس کا سائنس انکار کرے اور وہ حقیقت کے برعکس ہو اس لئے انسان کو چاہیے کہ وہ یا مذہب سے سروکار رکھے یا سائنس کی طرف دار رہے۔

یہ مسئلہ آج نیا نہیں ہے اس تضاد کی جڑوں کو ''عہدین[3]'' کی تعلیم میں تلاش کیا جائے، اسی میں توریت کا بیان کیا ہوا، حضرت آدمؑ کا قصہ بھی ہے وہ کتاب جو کہے کہ آدمؑ کو معرفت اور علم کے درخت کے پاس جانے سے منع کیا گیا تھا، وہ صدیوں تک علم و دانش کا سرچشمہ اور معرفت کا علمبرار کیونکر رہ سکتی ہے۔

اس قیاس کے مقابلے میں قرآن اولاد آدمؑ کو مختلف لب و لہجے کے ساتھ عالم کی شناخت اور معرفت کہ دعوت دیتا ہے ایک دو بار نہیں بلکہ بار بار، پہلے کہا کہ تمہارے باپ ابوالبشر آدمؑ کو ہم نے کائنات کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا۔ اسے بنی آدمؑ تم اسی باپ کی اولاد ہو۔ اپنے

---

[1] ۔تورات، سفر تکوین، فصل روم۔ جملہ ۱۷ تا ۱۹

[2] ۔توریت، سفر تکوین فصل سوم، جملہ ۲۳، ۲۴

[3] ۔عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید (مترجم) یعنی توریت اور انجیل)

باپ کی نشانی اور صفات اپناؤ تا کہ کامل اور صحیح اولاد بن سکو، جسمانی روحانی، ظاہری اور باطنی ہر طور سے باپ کے مشابہ بنو۔ ان ہی کی طرح حقائقِ عالم سے آشنا ہو۔ بقول میرزا حبیب اللہ خراسانی مرحوم:

گوہرخودراہویداکن کمال این است وبس
خویش رادرخویش پیداکن کمال این است وبس
اے معلم زاده ازآدمؑ اگرداری نشان
چون پدرتعلیم اسماء کُن کمال این است وبس

اپنے جوہر کو ظاہر کر بس یہی کمال ہے اپنے آپ کو اندر تلاش کر بس یہی کمال ہے اے استاد کے بیٹے! اگر آدم کی کوئی نشانی رکھتا ہے تو باپ کی طرح اسماء کی تعلیم حاصل کر بس یہی کمال ہے۔

وہ آیات جو ہم کو حقائق کی پہچان کی دعوت دیتی ہیں

ان آیات کو جمع کرنے کیلئے جو ہم کو موجوداتِ کائنات و زمین میں تفکر اور تدبر کی دعوت دیتی ہیں سارے قرآن کو دیکھنا پڑے گا، یہ بات ہم کسی اور موقع کیلئے اُٹھا رکھتے ہیں اس وقت چند آیات یہاں پیش کر رہے ہیں:

۱۔ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۱

”کہہ دیں: یکھو آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ ہے آیاتِ الٰہی اور ڈرانے والے ایمان نہ لانے والوں سے عذاب کو ہرگز دور نہیں کر سکتے۔“ (یونس۔۱۰۱)

۲۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۰

”آسمانوں اور زمین کی خلقت اور رات دن کے آنے جانے میں صاحبانِ عقل کیلئے (وجود خدا کی) نشانیاں ہیں۔“ (آلِ عمران۔۱۹۰)

۳۔ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ

النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

''وہ جو خداوند عالم کو قیام وقعود کی حالت میں اور اپنے ہر پہلو پر یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین میں غور وفکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں خداوند! تو نے ان کو فضول اور بے ہودہ پیدا نہیں کیا تو اس سے پاک ہے، ہم کو عذاب سے بچائے رکھنا۔'' (آل عمران۔۱۹۱)

جس زمانے میں گلیلیو اور اس جیسے دوسرے دانشوروں کو آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور وفکر کرنے کے جرم میں دار پر چڑھایا جاتا تھا اس وقت یورپ صاحبان فکر ونظر کیلئے گویا ایک وسیع قید خانہ بنا ہوا تھا۔ قرآن ایسے افراد (منجملہ اس دور کے دانش وروں) کو عاقل اور خردمند کہتا ہے جو آسمانوں اور زمین کی خلقت وآفرینش مین فکر وتدبر کریں قرآن اکثر وبیشتر غور وفکر اور علم ومعرفت کی دعوت دیتا ہے اور بار بار کہتا ہے:

''لعلکم تتفکرون (یا) افلا تتفکرون (یا) اولم یتفکروا فی انفسھم

قرآن کائنات میں ظہور پذیر ہونے والی چیزوں کی خردمندوں اور تفکر وتدبر کرنے والوں کیلئے بار بار تشریح کرتا ہے:

اِنَّ فِيۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِىۡ تَجۡرِىۡ فِى الۡبَحۡرِ بِمَا يَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَيۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾

''آسمانوں اور زمین کی خلقت اور رات دن کی گردش، دریاؤں میں کشتی کے چلنے میں جو لوگوں کے فائدے کیلئے چلتی ہیں اور پانی کا آسمان سے برسنا جس سئ خدا زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے اور چلنے پھرنے والے سب جاندار زمین میں پھیلا دیئے ہیں ہوا کی گردش اور بادل جو آسمان وزمین کے درمیان مسخر ہیں (کائنات اور زمین میں ان ظاہر ہونے والی چیزوں میں اور ان کی نہ تھکنے والی کارکردگی میں) خردمند لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں۔'' (بقرہ۔۱۶۴)

یہ ذہن میں رہنا چاہیئے کہ لفظ ''فکر'' قرآن میں ۱۸، مرتبہ، تدبر ۴، مرتبہ، عقل، ۷۴ مرتبہ اور لب، ۱۶ مرتبہ، نہی، کا لفظ جو عقل کے معنی میں ہے، ۲ مرتبہ مختلف صورتوں میں آیا ہے ان ساری آیتوں میں غور وفکر کرنے اور اس نعمت سے فائدہ اٹھانے کی دعوت دی گئی ہے ۔لفظ ''علم'' کا قرآن میں بار بار آنا قابل توجہ ہے یہ لفظ ۷۷۹ دفعہ قرآن میں مختلف صورتوں میں آیا ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ قرآن

میں علم کی اہمیت کیا ہے۔

وہ حضرات جنہوں نے اپنی شناخت صفر سے شروع کی [1]

تاریخ عالم ودانش کے دو معروف اشخاص جن میں سے ایک مشرقی دماغ کا حامل تھا اور دوسرا مغرب کا عظیم مفکر تھا ان دونوں نے ذہن سے خارج عالم کیلئے اپنی شناخت صفر سے شروع کی یہ دو شخصیتیں غزالی اور ڈیکارٹ کے نام سے مشہور ہیں۔

غزالی نے بہت سے علوم کے حاصل کرنے کے بعد خیال کیا کہ جو کچھ اس نے سیکھا ہے اس کو پرکھے اور دیکھے کہ یہ علوم اس کو حقیقت سے بھی آشنا کرتے ہیں یا نہیں۔کیا خود اس کے اور اس کی فکر کے علاوہ کوئی جدا عالم وجود رکھتا ہے یا نہیں اور اگر وجود رکھتا ہے تو اس کے حقائق غزالی کے حاصل کردہ علوم سے حاضر ہوتے ہیں یا نہیں۔غزالی نے بیٹھ کر سوچا کہ:

ممکن ہے کہ ذہن سے خارج عالم کے بارے میں میرا ادراک عالم خواب کے مانند ہو کیونکہ انسان عالم خواب میں کچھ چیزوں کا ادراک کرتا ہے اور اس وقت ان ''حقائق'' میں کوئی شک نہیں کرتا،مگر جب بیدار ہوتا ہے تو یقین کر لیتا ہے کہ جس چیز کو اس نے ابھی دیکھا تھا وہ سب کچھ خواب وخیال ہی تھا اور کچھ نہیں۔

چنانچہ بیداری کی حالت میں بھی انسان کی ساری معلومات جو بیرونی جہان کے بارے میں اس نے حاصل کی ہیں،وہ اسی قسم کی ہوں جیسے اس نے خواب کے عالم میں ''حقائق''معلوم کیے تھے جب زمانہ پلٹے اور حالات بدلیں تو پتہ چلے کہ انسان کی تمام ''آگاہی''خواب وخیال سے زیادہ نہ تھی۔

غزالی نامہ کتاب میں اس کے اس شک کی داستان بہت تفصیل سے بیان ہوئی ہے اس کتاب میں سے ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

''یہ جاننے کے بعد کہ علم یقین کیا ہے اور اس احساس کے بعد کہ میں بھی یقینی علم حاصل کروں،میں نے اپنے علوم پر غور کیا کہ دیکھوں کہ میں کیا واقعی یقینی علم سے سرفراز ہوں یا نہیں اور میری معلومات یقینی ہیں یا محض اوہام اور قیاس آرائیاں۔اس غور وخوض کے نتیجے میں مین نے اپنے آپ کو یقینی اور قاطع ''علم'' کے سرمائے سے تہی دست پایا۔میں نے دیکھا کہ بجز ضروریات وحسیات کے کوئی دوسرا علم جو یقین کی سطح کا ہو میرے پاس نہیں۔ضروریات سے مراد بدیہیات اولیہ ہیں جیسے دس تین سے زیادہ ہوتا ہے کُل جزو سے بڑا ہوتا ہے نفی اور اثبات ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے وغیرہ۔''

تو ان دو چیزوں کے علاوہ مین باقی سے ناامید ہو گیا اپنی مشکلات کا حل ان ہی ضروریات اور حسیات کی مبادی میں محدود پایا یہاں

---

[1] ۔یہ بحث مفید بھی ہے اور اس لئے بھی یہاں پیش کی گئی ہے کہ انسان کو ہر معاملے میں ''حقیقی علم'' کے نام پر بھروسہ نہیں کر لینا چاہیے اور ان تغیر پذیر علوم کی بناء پر قرآن کے مسلم حقائق کی نت نئی تاویلات نہیں ہونی چاہئیں۔

تک کہ میں اس مقام پر پہنچا کہ انہی دونوں کی بنیاد اور اساس پر پیچیدگیوں اور گتھیوں کو سلجھایا جائے۔

پھر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ ان دو بنیادوں میں بھی مجھے اچھی طرح غور وفکر کرنا چاہیے کہ کیا ان پر وثوق اور اطمینان بجا اور برمحل ہے یا یہ علوم بھی تقلیدی علوم ہیں اور ان پر اطمینان بھی اس طور کا ہے، جیسا کہ لوگ عام طور سے اپنی معلومات اور نظریات پر رکھتے ہیں۔ خوب غور وخوض کرنے پر پتہ چلا کہ محسوسات میں بھی شک وشبہ کی گنجائش ہے معلومات کا یہ طریقہ بھی اطمینان بخش نہیں۔ بینائی کی حس نے جو قوی ترین ہے میری اس طرف رہنمائی کی کہ محسوسات بھی اطمیان بخش نہیں اس لئے کہ قوت باصرہ سائے کو ساکن دیکھتی ہے، حالانکہ تجربے اور مشاہدے نے ثابت کیا ہے کہ سایہ بتدریج حرکت میں رہتا ہے اور کسی صورت میں ٹھہرا ہوا نہیں رہتا۔ ستارے ایک حقیر ذرے کی شکل میں نظر آتے ہیں ،حالانکہ علم اجرام فلکی کے براہین ثابت کرتے ہیں کہ یہ اجرام ہماری زمین سے بھی کہیں زیادہ بڑے ہیں۔[1]

پھر دوسری اساس یعنی اولیاتِ عقلی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس لئے کہ جس طرح محسوسات قابل اطمینان نہیں ممکن ہے ضروریات عقلی بھی قابل اعتبار نہ ہوں۔ محسوسات نے مجھ سے کہا کہ جیسا تیرا ایمان ''حسیات'' پر تھا ویسا ہی ''ضروریات'' پر بھی ہو گیا کیونکہ اگر عقل میری تکذیب نہ کرتی تو ہمیشہ اس پر ایمان رکھتا کہ کیا تو اس کا امکان نہیں سمجھتا کہ عقل سے بالاتر بھی کوئی چیز ہو جو عقل کے احکام کو باطل کر دے۔

محسوسات کی اس بات سے میں چپ ہو گیا، کیونکہ محسوسات کی گفتگو کی ان صورتوں کی طرح جو خواب میں تو نظر آتی ہیں، مگر خارجی حقیقت نہیں رکھتیں، تائید ہوئی۔ مختصر یہ کہ میری امید محسوسات سے جس دلیل کے ہاتھ منقطع ہوئی تھی۔

اسی دلیل نے مجھے ضروریات سے بھی ناامید کر دیا اور ان سے بھی میرا اطمیان اُٹھ گیا۔ اس لئے کہ میں نے سوچا کہ عقل کے فیصلے نے حس کی خطاؤں کو آشکار کیا تو کیا یہ ممکن نہیں کہ عقل سے بھی بالا کچھ ہو جو عقل کی غلطیوں کو ہم پرورش کرے۔ خواب میں بہت سی چیزیں دیکھتے ہو اور خیالات بھی آتے ہیں مگر بیدار ہو کر یقین کر لیتے ہو کہ وہ سب خواب وخیال تھا، ممکن ہے۔

ایک دوسرا جہاں اس حقیقت وماخذ سے ماوراء ہو جو ان سب کی تردید کرے یہ بیداریاں اس کی مناسبت سے گویا خواب ثابت ہوں۔ شاید کیفیت موت کے بعد آشکار ہو، اور یہ حدیث نبویؐ صادق آجائے کہ:

الناس نیام اذاماتوانتبهوا۔[2]

ممکن ہے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی خواب جیسی ہو، اور وہاں بیداری ہو اور حقیقتیں آشکار ہو جائیں۔

اور اس آیت کا مصداق ہو کہ:

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ

---

[1]۔ بہتر تھا کہ غزالی یہاں رُک جاتا کیونکہ حواس میں خطا کا انکشاف خود اس بات کا گواہ ہے کہ انسان حقیقت کی شناخت کا ایسا سلسلہ ضرور رکھتا ہے کہ جس کے ذریعے خطاؤں کا پتہ چلا لیتا ہے۔

[2]۔ لوگ سوئے ہوئے، جب مریں گے تو۔ بیدار ہوں گے۔

حدیدٌ(۲۲)

(اس سے کہا جائے)''یقیناً تو اس (دن) سے غفلت میں تھا پس ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا اور تیری نظر آج بہت تیز ہے۔''(ق۔۲۲)

ایسا نہ ہو کہ جو کچھ صوفیا کہتے ہیں ٹھیک ہو کہ اپنے مشاہدات میں ایسی چیزیں دیکھتے ہیں جو دوسروں کے مشاہدات سے مختلف ہیں شاید یہی صحیح ہو یا شاید صحیح نہ ہو۔ان خیالات نے مجھ پر حملہ کیا،مختلف چیزیں نفس پر منکشف ہوتی رہیں کہ ان کو دور کرنا مشکل ہو گیا میں اب عقل سے کام نہیں لے سکتا تھا۔وجہ یہ تھی کہ اب عقل کی اساس کو میں فضول سمجھتا تھا۔اس سرگشتگی سے نجات بھی دلیل عقلی سے ہی مل سکتی تھی اس کیلئے مجبوراً اولیات عقلی کی طرف دوبارہ رجوع کرنا تھا تا کہ عقل کے فیصلے سے تردید کر سکوں۔

مختصر یہ کہ سارے وسائل میں سے صرف دو چیزیں ہی باقی تھیں ایک حس اور دوسرے بدیہیات اولیہ جب مین نے ان کی چھان بین کی تو پتہ چلا کہ یہ مشکل معمہ ہے آخر کار میں نے اپنے آپ کو خالی ہاتھ پایا،یعنی ان دو چیزوں پر بھی اطمینان حاصل نہ کر سکا۔نتیجہ یہ کہ سوفسطہ کے لا علاج مرض سے دوچار ہوا،زبان سے ادا نہیں کر پا رہا تھا کیونکہ سب حال ہی حال تھا نہ کہ قیل وقال سوفسطائیت کی وحشت ناک وادی میں داخل ہوا تو تقریباً دو ماہ حالت سوفسطہ میں بسر کیے۔اس درد کی مجھے کوئی دوا نہیں ملتی تھی۔یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے اس مرحلے سے باہر آیا اور پھر اعتدال کی حالت کی طرف پلٹ آیا،یعنی ضروریات عقل میری لیے باعث اطمینان ووثوق قرار پائے۔[۱]

وہ دوسری شخصیت جس نے پہلے مختلف النوع معلومات حاصل ہیں اور پھر ان سے دست بردار ہو کر کام کو صفر سے شروع کیا وہ مشہور فرانسیسی دانشور ڈیکارٹ (۱۵۹۶ء،۱۶۵۰ء) ہے۔اس نے اپنی تمام معلومات کو کالعدم قرار دے کر نئے سرے سے معلومات کسب کرنی شروع کیں اور کہا کہ اگر میں ہر چیز میں شک وشبہ کروں تو اس لئے کہ میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے کوئی شک وشبہ نہیں۔اگر بالفرض اپنے فکر کرنے اور سوچنے میں شک کروں تو خود شک کرنا بھی ایک قسم کا فکر کرنا ہی ہے۔چنانچہ اس راستے سے اپنے وجود کی طرف پہنچا جو فکر کرنے والا اور سوچنے والا وجود ہے اور کہا کہ: ''چونکہ میں سوچ رہا ہوں اس لئے میں ہوں۔''[۲]

ہم کو اس وقت طرز استدلال کی صحت یا عدم صحت سے سروکار نہیں کیونکہ ڈیکارٹ کے استدلال پر اس کے بعد بہت تنقید ہوئی اور پر بہت سے اعتراضات ہوئے [۳]۔یہاں میرا مقصد چند ایسے مشاہیر کی طرف اشارہ کرنا ہے جنہوں نے اپنی تمام آگاہی اور معلومات کو کالعدم قرار دے کر نئے سرے سے علم وآگاہی کا آغاز کیا۔

---

[۱]۔غزالی نامہ،مصنفہ جلال الدین ھمائی۔ص۳۷۵تا۳۷۷

[۲]۔سیر حکمت درارد پا۔ج،۱۔ص۱۴۹۔پاکٹ سائز

[۳]۔کتاب ہستی شناسی۔ج۱۔ص۳۰۔سیر حکمت۔ج۱۔ص۱۴۹

قرآن کا دائمی منشور 2

تیرھواں اصول

اسراف یا
عیش پسندی

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝٢٦ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ۝٢٧

اسراف نہ کرو۔ اسراف کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں۔ شیطان نے بھی (حد سے زیادہ خودغرضی کی بناء پر) خدا سے کفر کیا۔ (بنی اسرائیل۔ ۲۶،۲۷)

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ﴿٢٦﴾ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ﴿٢٧﴾

اسراف نہ کرو۔اسراف کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں۔شیطان نے بھی (حد سے زیادہ خودغرضی کی بناء پر) خدا سے کفر کیا۔(بنی اسرائیل۔۲۶،۲۷)

يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿٣١﴾

''اے آدم کی اولاد! مسجد کی طرف جاتے وقت اپنی زینت ساتھ لے جاؤ (صفائی اور بہترین لباس کے ساتھ مسجد میں جاؤ) اور کھاؤ پیو اور اسراف نہ کرو۔وہ (خدا) اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔'' (اعراف۔۳۱)

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ ۚ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٣٢﴾

''کہہ دیں: خدائی زینتوں کو جو اس نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کی ہیں اور پاکیزہ روزیوں کو کس نے حرام کیا ہے؟ کہہ دیں یہ زینت اس جہاں میں ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائے (اگرچہ جہان میں دوسرے بھی ساتھ شرکت رکھتے ہیں لیکن) قیامت کے دن مومنین کے ساتھ ہوگی۔اس طرح ہم اپنی آیات ان کیلئے جو علم رکھتے ہیں تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔'' (اعراف۔۳۲)

غذائی اجناس کی غیر منصفانہ تقسیم

ایک تیسری دنیا کے لوگ فقر وفاقہ اور بھوک، افلاس سے دوچار ہیں اور ان پر موت کے سائے منڈلا رہے ہیں۔افریقہ ایشیا اور لاطینی

امریکہ میں کثیر آبادی اس تلخ زندگی کو جھیل رہی ہے۔ دوسری طرف مغربی اقوام خصوصاً لیٹری استعماری طاقتیں عیش پرستی اور فضول خرچی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ آج دنیا میں انسان عملی طور سے دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

ایک گروہ نعمات اور وسائل سے مالا مال ہے ان میں سے ہر فرد کے پاس ضروریات زندگی کی ہر چیز ہے دوسرا گروہ فقیر و محتاج اور محروم و پسماندہ ہے بعض اوقات وہ قوت لا یموت سے بھی محروم ہوتا ہے۔ فقر و فاقہ غیر طبعی اور غیر فطری مظہر ہے۔ اگر دنیا کے وسائل اور دولت لوگوں میں منصفانہ طور پر تقسیم ہو تو اس دنیا میں ایک بھی بھوکا ننگا نہ رہے، بین الاقوامی ماہرین کا کہنا ہے کہ اس وقت جو بھی وسائل موجود اور مہیا ہیں ان سے ۱۷ ارب انسانوں کی ضروریات زمین اور سمندروں سے پوری کی جا سکتی ہیں۔ اگر ٹیکنالوجی مزید ترقی کرے اور ذرائع پیداوار اور بڑھ جائیں تو حالات مزید بہتر ہو سکتے ہیں۔

مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اسلحوں کے انبار تیار کرنے کے اخراجات، بڑے بڑے سرمایہ داروں کی حرص و طمع، مغربی اقوام کی عیاشیاں، اسراف اور فضول خرچیاں اور تیسری دنیا کو قابوں میں رکھنے کی استعماری پالیسیوں نے دنیا کی دو تہائی (۳/ ارب) آبادی کو حیوانوں کی سطح پر زندگی گزارنے پر مجبور کیا ہوا ہے، یہ کثیر آبادی خالی ہاتھ تنگدستی اور بے سر و سامانی میں بسر کر رہی ہے۔ اس افراط تفریط کی کیفیت کو سمجھنے کیلئے اعداد و شمار پیش کیے جاتے ہیں جو شیراز میں غذائی اجناس پر سمپوزیم نے شائع کیے ہیں۔

روزانہ دنیا میں گوشت، روغنیات اور انڈوں سے ایک کروڑ سات لاکھ چھتیس ہزار ٹن پروٹین فراہم ہوتا ہے۔ جب کہ موجودہ عالمی آبادی کی ضروریات ایک کروڑ چار لاکھ انتالیس ہزار ٹن پروٹین ہے۔ گویا روزانہ تین لاکھ ٹن پروٹین ضرورت سے زیادہ پیدا ہوتا ہے، مگر ہم برابر یہی سنتے ہیں کہ دنیا کی دو تہائی آبادی بھوکی ہے، کئی لاکھ افراد قحط سے مر چکے اور کئی لاکھ قحط کے منہ میں جا چکے ہیں۔ آپ پوچھیں ایسا کیوں ہے تو جواب آسانی سے مل جائے گا۔ جب تک ایک ملک میں حیوانی پروٹین فی کس ۸۳ گرام روزانہ استعمال ہوتی ہے اور دوسرے ملک میں فی کس صرف ۵ گرام پروٹین تیسرے تو لازمی طور سے دنیا کی دو تہائی آبادی بھوک سے نڈھال رہے گی ساتھ ہی ساتھ دوسری ایک تہائی آبادی غیر متوازی غذاؤں کے استعمال سے پروٹین کے زیادہ مصرف سے مختلف بیماریوں میں مبتلا رہے گی۔[1]

یہ اعداد و شمار مغرب میں اسراف اور شکم سیری اور اس کے مقابلے میں تیسری دنیا کے ممالک میں فقر و فاقہ، محرومی اور بھوک کی صاف اور واضح تصویر کشی کرتے ہیں، یہ اعداد و شمار حقوق انسانی کا چارٹر لکھنے والوں نے اور خوبصورت نعرے لگانے والوں یہی ۸۳ گرام روزانہ پروٹین کھانے والے کی قلعی کھول رہے ہیں کیا ان حالات پر نظر کرنے کے بعد بھی ان کھوکھلے اعلانات، اداروں اور کونسلوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ مزید اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ میں مجموعی غذا جو استعمال ہوتی ہے وہ ½1 ارب چینی آبادی کیلئے کافی ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کے اعداد و شمار کی طرف توجہ فرمائیں:

ایک بچہ جو کسی ترقی یافتہ ملک میں پیدا ہوتا ہے وہ ایک ہندوستانی یا فلپائن بچے کی نسبت کئی گنا زیادہ غذا مصرف میں لاتا ہے

[1] ۔ کیہاں، شمارہ ۹۵۵۴

ہارارڈ یونیورسٹی کا غذائی شعبے کا ماہر ہم کو بتاتا ہے کہ جو غذا کی مقدار ½21 کروڑ امریکی کھاتے ہیں وہ ½1 ارب چینیوں کیلئے متوسط غذا کے طور پر کافی ہے۔[۱] آج منافقت سے بھری دنیا جو ہمہ وقت ساز کے دھن پر رقص کرتی رہتی ہے اور ساتھ ساتھ مزدور، ماں اور بچہ اور حقوق بشر کا بھی دم بھرتی رہتی ہے کسی انسان کو عملاً اتنی بھی وقعت نہیں دیتی جتنی ایک کتے کو دی جاتی ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو ذیل کے اعداد و شمار ملاحظہ کریں۔ فرانس کے ہر تین گھروں میں ایک گھر میں کتا پلا ہوتا ہے ان پالتو کتوں کیلئے خصوصی غذا ۱۹۶۱ء میں تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ پیکٹ میں مہیا کی گئی۔ ۱۹۷۰ء میں ان کیلئے دو کروڑ ستر لاکھ پیکٹ تیار کیے گئے۔ مجموعی طور سے یہ جانور ایک کروڑ بیس لاکھ ٹن خوراک استعمال کرتے ہیں یہ وہ مقدار ہے کہ اتنی ہی انسانوں کے قابل غذا ایشیا کے ایک کروڑ بیس لاکھ بچوں کیلئے کافی ہو، کتوں کیلئے تیار کی گئی اس غذا میں بے انتہائی پروٹین ہوتی ہے بلیوں کیلئے تیار کی گئی غذا اس سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہیں۔[۲]

جانوروں کی مدد کرنا عین اسلام ہے مگر کیا یہ صحیح ہے کہ ہم ایک حکم کو اپنائیں اور ساتھ ساتھ خاموش تماشائی بنے انسانوں کو بھوک سے نڈھال دیکھتے رہیں۔ جب ہم نے یہ افسوس ناک رخ دیکھ لیا تو اب زندگی میں معاشی روش اور اسراف کی روک تھام اور اعتدال پسندی کی اسلامی تعلیم کے بارے میں بھی کچھ غور کریں۔ غذا و خوراک، لباس و پوشاک، تفریح و ورزش، لوگوں سے محبت اور خلوص، معاشرے اور لوگوں کی خدمت روحانی اور نفسانی مجاہدات علمی و فکری کوششیں غرض کہ انفرادی اور معاشرتی زندگی کے ہر ہر پہلو میں اعتدال و میانہ روی کی اسلام نے حوصلہ افزائی کی ہے اس کے برعکس میانہ روی اور خطِ مستقیم سے چھوٹے چھوٹے انحراف کی بھی اسلام مذمت کرتا ہے۔ قرآن اس انحراف کی وضاحت کیلئے لفظ ''اسراف'' اور ''تبذیر'' سے استفادہ کرتا ہے لفظ ''سرف'' مفرد اور جمع کی مشکل میں ۱۵ دفعہ قرآن میں آیا ہے اس باب کے آغاز میں جو آیت ہم نے پیش کی ہے اس میں فرماتا ہے کہ:

انہٗ لایحب المسرفین

''وہ (اللہ) اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

یہ سرزنش انسان کو لرزا دینے والی ہے کیونکہ فرعون کی مذمت اسی بناء پر ہوئی کہ وہ اسراف کرنے والا اور اعتدال سے تجاوز کرنے والا تھا۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

''فرعون برتری پسند شخص تھا اور وہ مسرفین میں سے تھا۔'' (یونس۔ ۸۳)

چنانچہ عیش پسندی، شکم پروری، فضول خرچی ان میں سے کوئی لفظ بھی اس وسیع معنی کو سمجھانے کیلئے اسراف کی جگہ نہیں لے سکتا۔ قرآن

---

[۱] ۔ دشمنان بشر، ص ۱۱۳

[۲] ۔ رسالہ مکتب اسلام شمارہ، ۸، سال، ۱۵

اسراف کی مذمت کیلئے کبھی کبھی لفظ ''تبذیر'' بھی استعمال کرتا ہے جس کے معنی بیہودہ اور فضول انداز میں مال عطا کرنے کے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿٢٦﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿٢٧﴾

''اسراف نہ کرو۔اسراف کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں، شیطان نے بھی (حد سے زیادہ خودغرضی کی وجہ سے) اپنے پروردگار سے کفر کیا۔'' (بنی اسرائیل۔۲۶،۲۷)

اسراف کی اس سے زیادہ اور کیا مذمت ہوسکتی ہے کہ اسراف کرنے والوں کا تعارف شیاطین کے بھائی کی حیثیت سے کرایا گیا ہے اور شیطان کے کفر کا سبب اس کا حد سے تجاوز کرنا تھا جو ایک طرح کا اسراف ہے۔

گردوپیش کی طرف توجہ

قرآن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ معاملے کے اطراف وجوانب کی طرف بھی عمیق اور گہری نظر رکھتا ہے کلیات پر توجہ مرکوز ہو تو یہ بات اس کو جزئیات اور استثنائی پہلوؤں پر نگاہ کرنے سے نہیں روکتی، قرآن کی یہ اعلیٰ خصوصیات میں سے ایک ہے۔مثلاً جہاں دنیاوی دوستوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا کے دوست آخرت میں ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے تو ساتھ ہی ساتھ پرہیزگار اور صاحب ایمان افراد کو اس سے مستثنیٰ کرتا ہے اس سلسلے کی دو آیات پیش ہیں:

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٧﴾

''قیامت کے دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہیں، بجز متقیوں کے۔'' (زخرف۔۶۷)

جب قرآن دنیاوی شرکاء کے بارے میں کہتا ہے کہ ان میں سے بعض دوسرون پر تعدی اور تجاوز کرتے ہیں تو فوراً صاحب ایمان افراد کا استثناء کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

''بہت سے شرکاء اور میل جول رکھنے والوں میں سے بعض دوسروں پر تعدی اور تجاوز کرتے ہیں ،سوائے ایمان دار اور نیکوکار لوگوں کے۔'' (ص۔۲۴)

اس بحث کے آغاز میں جو دوسری اور تیسری آیت پیش ہوئی ہے، اس میں قرآن کی عنایت اور توجہ اس موضوع کے جزائیات کی

طرف صاف نظر آتی ہے ،دوسری آیت میں حکم ہے کہ اولادِ آدمؑ مختلف قسم کے حلال زینتوں سے استفادہ کرے خصوصاً جب لوگ مساجد میں عبادت کیلئے جمع ہوں تو ان سے استفادہ کریں۔

تیسری آیت میں ان لوگوں کے جواب میں جو سوچتے ہیں کہ زینت کو حرام سمجھنا اور پاکیزہ غذاؤں سے پرہیز زہد و پارسائی کی نشانی اور قرب خدا کا سبب ہے قرآن ذرا سخت لہجہ اختیار کرتا ہے۔[1] مگر حقیقی موضوع کی طرف توجہ کر کے قرآن نے جزئیات کی طرف متوجہ ہونے سے نہیں روکا۔ چنانچہ دوسری آیت میں فوراً اسراف کے مسئلے کی طرف توجہ کی اس خیال سے کہ شاید انسان کی ہوس اس خدائی حکم ہوئے استفادہ کر لے اور راہ اعتدال سے ہٹ کے عیش پرستی اور اسراف اور فضول خرچی شروع کر دے۔ فرمایا کہ:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ

''کھاؤ پیو اور اسراف نہ کرو، خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

یہ صحیح ہے کہ موضوع سخن كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا کے فقرے میں کھانے پینے کی چیزیں ہیں لیکن چونکہ دونوں آیات میں عام خدائی زینتوں سے فائدہ اٹھانے کا ذکر ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فقرہ بطور مثال وارد ہوا ہے جہاں صرف کھانے پینے کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ مقصد زندگی کے تمام پہلوؤں میں اعتدال قائم کرنا ہے یا کم از کم طبعی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے میں میانہ روی اختیار کرنے کا ذکر ہے۔

مقدار معیار نہیں ہے

اس میں اہم نکتہ یہ ہے کہ اسراف سے بچنے کا مقصد ہر قسم کے ضیاع اور نقصان سے روکنا ہے خواہ وہ معمولی ہی سا نقصان کیوں نہ ہو۔ صرف یہی نہیں کہ دنیا میں گندم کی قیمت گرنے سے روکنے کیلئے ہزاروں ٹن گیہوں سمندر میں پھینک دیا جانا غلط ہے بلکہ اسراف میں کیفیت اور اس چیز کی صلاحیت کی بھی اہمیت ہے۔ ایک دینار بھی جو گناہ کے راستے میں صرف کیا جائے یا ایک گٹھلی[2] بھی جو کسی وقت فائدہ دے سکتی ہے پھینک دی جائے یا کسی گرم جھلسا دینے والے بیابان میں پیاسا موجود ہو مگر بچا کھچا پانی پھینک دیا جائے وہ بھی اسراف کہلائے گا۔

چنانچہ قرآن قصاص کے مسئلہ میں جہاں قاتل کے بجائے اس کا غیر مارا جائے ،اسراف کے مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ

---

[1] ۔دوسری آیت میں قرآن کہتا ہے۔''خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ ''اور تیسری آیت میں فرمایا:''قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ''

[2] ۔ان السرف يبغضه الله حتى طرحك النواة فانّها تصلح اللشئ حتى صبك فضل مائك ''خدا اسراف پر غضب ناک ہوتا ہے یہاں تک کہ ایک گٹھلی پھینکنا بھی کیونکہ وہ بھی کسی چیز کی اصلاح کرتی ہے بلکہ تمہارا بچا کھچا پانی پھینکنا بھی۔''(بحار الانوار۔ج ۱۵۔ص ۱۹۹

كَانَ مَنْصُوْرًا﴿۳۳﴾

''جو شخص بے گناہ مارا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو قدرت دی ہے کہ وہ قصاص لے (یا دیت لے یا معاف کر دے) لیکن قتل میں اسراف نہ کرے بیشک وہ مدد دیا گیا ہے۔'' (بنی اسرائیل۔۳۳)

زمانہ جاہلیت میں اگر کوئی قتل ہو جاتا تو مقتول کے ساتھی قاتل اور اس سے وابستہ لوگوں میں فرق نہیں کرتے تھے بعض اوقات قبیلے کے سردار کو اس قصور میں کہ قاتل اسی کے قبیلے کا ہے قتل کر دیتے ،قرآن ان ساری حرکتوں کو اسراف سمجھتا ہے بالفرض قاتل کی جگہ ایک ہی شخص مارا جائے مگر وہ بے گناہ مارا جائے تو اس کو اسراف ہی کہیں گے ۔قرآن قوم لوطؑ کو مسرف کہتا ہے کیونکہ وہ لوگ خدا کی نعمتوں سے غیر فطری طور پر استفادہ کرتے تھے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ﴿۸۱﴾

''تم عورتوں کے بجائے مردوں سے آمیزش کرتے ہو تم تو مسرف قوم ہو۔'' (اعراف۔۸۱)

راغب اصفہانی نے قرآنی لت لکھی ہے وہ اسراف کے بارے میں ایک اہم نکتہ پیش کرتے ہیں:

ہر کام جو کمیت یا کیفیت کے لحاظ سے اپنی مقدار اور اندازے سے تجاوز کر جائے وہ اسراف ہے اور جو چیز راہ خدا کے علاوہ کہیں خرچ ہو خواہ تھوڑی کیوں نہ ہو وہ اسراف ہوگی۔'' [1]

اسراف کے معنی میں اس قدر وسعت ہے کہ قرآن مختلف آیات میں اسراف کو بغیر کسی قید و شرط کے ذکر کرتا ہے اور ہر طرح کے حد سے تجاوز کی مذمت کرتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ

''اس طرح ہم اسراف کرنے والوں کو سزا دیتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے۔'' (طٰہٰ۔۱۲۷)

مگر ساتھ ہی ساتھ دوسری آیات میں اسراف کرنے والوں کو یہ خوش خبری بھی دیتا ہے کہ اگر اپنی غلط روش کو چھوڑ دیں اور توبہ کر لیں تو توبہ اور مغفرت کے دروازے کھلے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

---

[1] ۔مفردات راغب۔ص ۲۳۰

يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۭ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٥٣﴾

''کہہ دیں ان میرے بندوں سے جنہوں نے اپنے بارے میں زیادتی کی ہے کہ وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوں خدا تمام گناہوں کو بخش دے گا وہ بخشنے والا رحیم ہے۔'' (زمر۔۵۳)

ایک دوسری آیت میں اسراف کرنے والوں کو طلب مغفرت کی رہنمائی کرتا ہے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا

''پروردگار! ہمارے گناہوں کو اور زندگی میں کی ہوئی زیادتیوں کو بخش دے۔'' (آل عمران۔۱۴۷)

نیک کاموں میں میانہ روی

راہ خدا میں خرچ کرنا (یعنی انفاق) ایک نیک کام ہے اسلام نے اس کا حکم دیا ہے لیکن اگر یہ کام بھی حد اعتدال سے گزر جائے یہاں تک کہ انسان کیلئے تنگی اور ترشی کا سبب بن جائے تو یقینی ہے کہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید حکم دیتا ہے کہ انفاق میں بھی ہم اعتدال سے باہر قدم نہ رکھیں، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾

''وہ جو انفاق اور خرچ کرتے وقت نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ ہی سخت گیری کرتے ہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان کی راہ منتخب کرتے ہیں۔'' (فرقان۔۶۷)

اسلام کا ایک حکم یہ ہے کہ باغ میں سے پھل توڑتے وقت اس میں سے ایک مقدار مستحق افراد کو دی جائے۔ فقہہ کی کتابوں میں اس کو حق الحصاد کہتے ہیں یہ حکم زکوٰۃ کی علاوہ ہے جو بعد میں ادا کرنی ہوگی قرآن اس موقع پر حکم دیتا ہے کہ اس فریضے کو انجام دیتے وقت حد اعتدال کو اختیار کیا جائے باغ کے مالک ایسا ہاتھ کھلا نہ رکھیں کہ جو کچھ ان کے پاس ہے یہاں وہاں دے دیں اور وہ خود اور ان کی اولاد خالی ہاتھ رہ جائے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ۖ وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ

''جب وہ پھل پک جائے تو اس میں سے کھاؤ اور اس کا حق اس کو توڑنے کے وقت

ادا کرو، اسراف نہ کرو کیونکہ خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" (انعام۔ ۱۴۱)

ائمہ طاہرین کی احادیث میں بھی ایسے اسراف کی طرف اشارہ ہوا ہے ان میں سے چند ہم یہاں نقل کرتے ہیں: امیر المومنین علیہ السلاانفاق کے بارے میں فرماتے ہیں:

"سخی بن مگر اسراف کرنے والا نہ بن، میانہ روی اختیار کر، اندازے کے اندر رہ مگر سخت گیر نہ ہو۔"[۱] بعض احادیث میں اسراف کے بجائے زندگی حدود کے اندر بسر کرنے کی دعوت دی گئی ہے جناب امیرؑ نے فرمایا ہے: "وہ شخص ایمان کا مزہ چکھے گا جس میں تین صفات پائی جائیں۔ دین کی حقیقت سے آگاہی، مصائب اور پریشانی میں استقامت اور صبر، اور زندگی میں میانہ روی۔"[۲]

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"جو شخص اپنی آمد و خرچ کا اندازہ نہ رکھے گا، وہ فقیر ہو جائے گا۔"[۳]

ایک سوال کا جواب

متذکرہ بالا آیات گواہ ہیں کہ انفاق کے مسئلے میں قانون کلی خرچ میں میانہ روی اور زندگی میں اعتدال ہے۔

ایک سوال ابھرتا ہے کہ بعض آیات میں اتنی تنگی کے باوجود ایثار اور خود پر دوسروں کی ترجیح دینے کی تعریف کی گئی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ڵ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

"اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں گرچہ خود ضرورت مند ہوں جو لوگ کہ حرص نفس سے محفوظ ہوں، وہ فلاح اور نجات پائیں گے۔" (حشر۔ ۹)

اس آیت میں مال کے احتیاج کے باوجود اس کے ایثار کرنے کی تعریف کی گئی ہے بظاہر یہ اعتدال اور میانہ روی کے خلاف ہے جو دوسری آیت میں پیش ہوئی ہے۔ خود امیر المومنین علیہ السلام اور خاندانِ رسالت کے بارے ہم پڑھتے ہیں کہ انہوں نے تین رات مسلسل

---

[۱]۔ کن سمحًا ولا تکن مبذرًا و کن مقدرًا ولا تکن مقترًا (نہج البلاغہ۔ حکیمانہ اقوال۔ ۳۲)

[۲] لایذوق المرأ حقیقة الایمان حتّٰی یکون فیه ثلاث خصال: الفقه فی الدّین ،والصبر فی المصائب ،وحسن التقدیر فی المعاش (بحار الانوار۔ ج ۱۵۔ ص ۱۹۹)

[۳]۔ ترك التقدیر فی المعیشة یورث الفقر۔

اپنی افطاری فقیر، یتیم اور اسیر کو دے دی اور خود پانی سے افطار کیا۔ چنانچہ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ﴿٨﴾

''خود ضرورت کے باوجود کھانا، مسکین، یتیم اور اسیر کو دے دیتے ہیں۔'' (دھر۔۸)

تو اہلبیتؑ رسالت کا عمل جو ایثار ہے انفاق میں اعتدال کے اصول سے کیونکر ہم آہنگ ہوگا۔ اس سوال کا جواب یہ ہے: اس میں کوئی شک نہیں ہے ان اصولوں میں سے ہر ایک یعنی انفاق میں میانہ روی اور احتیاج کے باوجود ایثار دونوں ہی احسن عمل ہیں۔ یہ انسانی خوبیوں اور اخلاق کو اجاگر کرتے ہیں۔ مگر انفاق میں میانہ روی ایک عمومی اصول ہے جو سب ہی کیلئے ہے یہ عام تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس کے برعکس احتیاج کے باوجود ایثار ایک خصوصی اصول ہے جس پر صرف جانثار افراد ہی عمل کر سکتے ہیں۔ اپنی احتیاج کے باوجود ایثار کرنے کے اصول کا سرچشمہ جانثاری اور دوسروں کیلئے قربانی کا جذبہ ہے۔ ہر شخص اس جذبے سے سرشار نہیں ہوتا یہ ان خاص لوگوں تک محدود ہے جو حضرت علی علیہ السلام جیسی زندگی کی پیروی کرتے ہیں۔ انفاق میں میانہ روی تمام لوگوں سے متعلق ہے جو اپنے مفاد کی حفاظت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مفاد کو بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ یہ بات صرف انفاق تک میں اعتدال اور پھر ایثار تک محدود نہیں۔ بلکہ اخلاقی اور اجتماعی معاملات میں اس طرح کے بہت سے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔

کسی نے امیر المومنین علیہ اسلام سے دریافت کیا کہ عدل وانصاف زیادہ باشرا ور اعلیٰ ہے یا جود و سخا تو امامؑ نے فرمایا: ''عدل معاملات کو ان کے فطری دائرے میں رکھتا ہے، مگر سخاوت معاملات کو ان کے فطری دائرے سے خارج کر دیتی ہے۔'' عدل یہ ہے کہ ہر شخص اس کے فطری استحقاق کے مطابق دیا جائے، یعنی اس کی لیاقت استعداد اور اس کے کام اور کوشش کو نظر میں رکھا جائے جب کہ جود و سخا میں یہ معیار پیش نظر نہیں ہوتا۔ کسی فطری استحقاق کو مدنظر رکھے بغیر سخی اپنا مال اس کو بخش دیتا ہے۔ یہ کام قابلِ تعریف تو ہے مگر فطرت کے خلاف ہے بہر حال استثنائی پہلو رکھتا ہے اسی لئے امیر المومنین علیہ السلام اپنی گفتگو کے آخر میں فرماتے ہیں:

"العدل سائس عام والجود عارض خاص۔"[1]

''عدل ایک عمومی قانون ہے کلی مدبر و مدیر ہے جو سارے معاشرے پر محیط ہے۔ یہ وہ شاہراہ ہے جس پر سب کو چلنا چاہیے جب کہ جود و سخا اور بخشش ایک استثنائی اور خاص حالت ہے۔'' زیر بحث سوال کا ایک اور جواب بھی ہے جو یہ ہے: ایک اور جواب بھی دیا جا سکتا ہے، یعنی یہ کہ مال صرف کرنا جہاں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہو، وہ ایثار کا موقع ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں میانہ روی کے بجائے ایثار اختیار کرنا چاہیے۔

مثلاً مدینے کے رہنے والے انصار مکے مہاجرین کی آمد سے دوچار ہوئے وہ لوگ سیلاب کی صورت میں ان کے شہر میں داخل ہوئے ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے تو بیوی بچوں کا ہاتھ پکڑا تھا اور مدینے کی طرف چل پڑے تھے یہ لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت

---

[1] ۔العدل افضل امر الجود: فقال: العدل یضع الاشیاء مواضعها والجود یخرجها من جهتها العدل......... نہج البلاغہ۔ حکیمانہ اقوال۔ ۴۳۷

میں اپنا گھر بار اور کاروبار چھوڑ کر مدینے آ گئے تھے ان کی نگہداشت اور دیکھ بھال بہت ضروری تھی، اگر ان کی مناسب خدمت اور پذیرائی مدینے میں نہ ہوتی تو اسلام کی پیش رفت اور اس کی نشوونما رُک جاتی یہی وہ موقع ہے جہاں انصار کی قربانیوں کی بناء اللہ تعالیٰ ان کی تعریف میں فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

''وہ جو مہاجرین سے پہلے مدینے میں بود و باش اختیار کیے ہوئے ہیں (انصار) اور شرف ایمان سے آراستہ ہیں او جو ان کی طرف ہجرت کرتے ہیں، ان کو دوست رکھتے ہیں، جو چیز وہ مہاجرین کو دیتے ہیں اس سے ان کو تکلیف اور رنج نہیں پہنچتا، وہ ان کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، خواہ خود ضرورت مند ہوں اور جو شخص اپنے نفس کے بخل سے محفوظ رہا وہی رستگار اور فلاح پانے والا ہے۔'' (حشر۔ ۹)

اس آیت اور اس سے قبل کی آیت میں غور و خوض سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اہم مواقع پر جیسے مدینے میں مہاجرین کی پذیرائی اور خدمت اور دوسری جگہ یتیم مسکین اور قیدی کا تالیف قلب امیر المومنین علیہ السلام کیلئے زیادا اہم تھا چنانچہ انہوں نے وہاں ایثار کو اعتدال پر مقدم رکھا اور ایثار کی راہ اختیار کی اور انفاق میں میانہ روی کی پرواہ نہ کی۔ غرض کہ جب کوئی بہت اہم موقع سامنے آئے تو کوئی حرج نہیں کہ انسان اپنے آپ کو زحمت اور مشقت میں ڈال دے تا ک وہ اہم کام انجام پا سکے۔ اسراف اور عیش پسندی کے موضوع پر ہم نے تفصیلی گفتگو کی ہے چنانچہ ضروری نہیں کہ قرآن کے دوسرے دائمی منشور کے اس اصول یعنی ''انفاق میں اعتدال و میانہ روی'' پر بھی ہم بحث کریں، جو اس آیت میں آیا ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ [1]

''اسراف نعمتوں سے فائدہ اٹھانے میں افراط کا طرز عمل اور حقیقت اعتدال سے باہر جانا ہے۔''

اس اصول کے مطالب کو مدنظر رکھیں تو انفاق میں اعتدال اور میانہ روی کا فلسفہ بھی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ حالانکہ یہ اصول خود ایک الگ بحث کا متقاضی ہے، جو ہم نے کتاب ''سیمائے انسان کامل در قرآن'' میں پیش کی ہے مہربانی فرما کر اس کتاب کے صفحات ۲۷۴ تا ۲۸۲ ملاحظہ کریں۔

---

[1] ۔سورہ بنی اسرائیل ۲۹۔ یہی مضمون سورہ فرقان کی آیت ۶۷ میں بھی آیا ہے۔ یعنی: ''وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ ''وہ کہ جب انفاق کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ کنجوسی، بلکہ ان دونوں کے درمیان راہ اختیار کرتے ہیں۔''

قرآن کا دائمی منشور 2

چودھواں اصول

اندھے تعصّبات

اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَہٗ سُوۡٓءُ عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا ؕ

کیا وہ شخص جس کا برا عمل اس کو بہت عمدہ نظر آتا ہے (اس شخص کے مانند ہوسکتا ہے جو ایسا نہیں ہے)۔(فاطر۔۸)

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ

کیا وہ شخص جس کا برا عمل اس کو بہت عمدہ نظر آتا ہے (اس شخص کے مانند ہوسکتا ہے جو ایسا نہیں ہے)۔(فاطر۔۸)

دنیا کے ہر معاشرے میں کم وبیش تعصب ضرور پایا جاتا ہے۔مگر حقیقت پسند لوگ فرد، گروہ یا عقیدے کی خواہ مخواہ کی جانب داری کو برا سمجھتے ہیں۔اس کو منطق اور دلیل کی کمزوری جانتے ہیں اور بے جا طرف دار آدمی کو غیر انسانی رجحانات کا حامل سمجھتے ہیں۔اس گھٹیا طبیعت کے لوگ اپنے اس طرز عمل کو صحیح ثابت کرنے کیلئے اس کو سچائی کا لبادہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔تاکہ ان کا یہ عمل اچھا نظر آئے اس ذریعے سے اپنے ضمیر کی آواز پر واہ نہیں کرتے اور ساتھ ساتھ لوگوں کی تنقید اور مذمت سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔عربی لغت میں ''تعصب'' کا لفظ ''عصب'' سے لیا گیا ہے جس کے معنی ''رگ'' کے ہیں۔پہلے زمانے میں ہم بستگی اور ایک خون ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی جانب داری کو ''تعصب'' کہتے تھے، رشتہ داروں کے اجتماعات کو جہاں قبائل کے لوگ جمع ہوتے تھے ''عصبہ'' کہا جاتا تھا۔

اب یہ لفظ ان معنوں میں نہیں بولا جاتا بلکہ باطل اور ناحق طرف داری اور عقل وخرد سے دور جانب داری کو تعصب کہتے ہیں اور اس گروہ کے افراط کو جو خواہ آپس میں رشتہ دار ہوں یا نہ ہوں کی طرف سے کسی چیز کی بلا وجہ طرف داری کرنے کو عصبہ کہتے ہیں پہلے زمانے میں تعصب برتنے کا سبب رشتہ داری اور خاندان کی حمایت تھی۔جبکہ یہ سراسر غیر منطقی کام تھا۔اس اخلاق سے گری ہوئی حرکت کا سبب اس قبیلہ بازی کے علاوہ جاہ ومنصب کی حفاظب، مال وثروت، کبر ونخوت ذہن تحفظ، پہلے سے کیے گئے غلط فیصلے دانش وروں کے اقوال سے سوئے استفادہ (مثلاً مرد ایک ہی بات کرتا ہے) کا نام لیا جاسکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تعصب اخلاق رذیلہ ہے کسی عقیدے اور نظریے کی غیر منطقی حمایت اور جانب داری مذموم حرکت ہے قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ مذموم عادت نہ صرف مذہب فرقوں میں بلکہ غیر مذہبی افراد اور گروہوں میں بھی بہت پائی جاتی ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ مذہبی افراد سے کہیں زیادہ دوسرے گروں میں اپنے نظریات اور خیالات کے بارے میں تعصب پایا جاتا ہے۔اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ حضرات مذہبی گروہوں کے دلائل اپنی تحریروں میں صحیح طرح پیش کرنے کے بجائے ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان نظریات وافکار کا استہزاء کرتے ہیں مقصد یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والوں کی نگاہ میں یہ نظریات کمزور اور بے بنیاد نظر آئیں۔مثال کے طور پر یہ دو مباحث اشتراکیوں کی کتابوں میں ملاحظہ کریں:

۱۔مذہبی رجحات ومیلانات کے علل واسباب کیا ہیں۔اور

۲۔نظام آفرینش میں وجود خدا کی نشانیاں

یہ لوگ ان موضوعات کا تجزیہ کرتے وقت بھرپور تعصب کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ اول تو علماء دینی کی تحریروں پر اوران کی نقطہ نگاہ پر نظر بھی نہیں کرتے دوسرے یہ کہ اقتصادی اور طبقاتی کمزوریاں بھی مذہب سے وابستگی اور دینی رجحانات کے سر تھوپ دیتے ہیں یا پھر مذہب سے لگاؤ کو فطرت اوراس کے مظاہرے کم علمی بلکہ نا آشنائی کا شاخسانہ کہتے ہیں خدا کے وجود کے اثبات میں جو برہان نظم یا اس جیسے بیسیوں دلائل ہیں ان کا کبھی نام بھی نہیں لیتے چونکہ خدا کو خود نہیں پاتے اسلئے اس کے وجود سے منکر ہوجاتے ہیں۔

ایسا عقیدہ جو دلیل وبرہان رکھتا ہو اس پر جم جانا حق کی تلاش اور حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ممکن ہے ایک شخص حقیقت کی شناخت میں غلطی کر بیٹھے اور حق کو ناحق اور ناحق کو حق خیال کرنے لگے تعصّبات کا خوگر اسی کو کہا جا سکتا ہے جو اپنی رفتار گفتار میں واضح طور سے غیر منطقی افکار کی پیروی کرتا ہو۔

پہلے سے کیے گئے غلط فیصلے

پہلے زمانے میں دانش ورانسان کے فکری اور نظری کارخانے کو آئینے سے تشبیہ دیتے تھے اوراس ذریعے سے کئی نتائج اخذ کرتے تھے، بیشک ذہن انسانی سو فیصد آئینے کے مصداق نہیں لیکن بہرحال کئی پہلوؤں سے یہ آئینے سے مشابہت بھی رکھتا ہے۔ مثلاً آئینہ جس قدر صاف وشفاف ہوگا اور زنگ آلودہ نہ ہوگا اسی حد تک وہ دوسری چیزوں کا حقیقی رنگ وصورت منعکس کرے گا اگر زنگ آلود ہوگا اور داغدار ہوگا تو حقیقت کو واضح نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ ذہن انسانی جس قدر آئینے کی طرح صاف وپاک ہوگا اس قدر وہ حقائق کو حقیقی شکل میں پیش کرے گا۔ اگر پہلے سے دوستی یا بغض ومحبت یا نفرت اور غیر منصفانہ رجحانات میں مبتلا ہوگا تو لامحالہ حقائق توڑ مروڑ کر پیش کرے گا قبیح کو حسین اور حسین کو قبیح کر دکھائے گا۔ اس حقیقت کو قرآن بہت لطیف پیرائے میں بیان کرتا ہے:

اَفَمَنۡ زُيِّنَ لَهٗ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ

''کیا وہ شخص جس کی نظر میں اس کا برا عمل اچھا دکھائی دیتا ہو اس شخص کے برابر ہے جو حقیقت کا متلاشی ہو۔'' (فاطر۔۸)

یہ تعصّبات اور منطق عقل سے عاری طور طریقے انسان کو اس طرح پست کر دیتے ہیں کہ وہ حیوان کی سطح سے بھی گر جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہر جاندار اپنے بچے سے شدید لگاؤ رکھتا ہے اور اپنی جان تک اس کے لئے لڑا دیتا ہے مگر ایک انسان ہے کہ تعصب میں اندھا ہو کر اپنی جبلت اور فطری محبت کو پیروں کے نیچے کچل کر اولاد کے قتل پر آمادہ ہو جاتا ہے تعصب کی بناء پر بچے کا قتل اس کی نظر میں ایک قابل تعریف فعل ہو جاتا ہے وہ اس بہیمانہ فعل پر فخر کرتا ہے اوراس سے حظ حاصل کرتا ہے۔ قرآن اسی موقع پر فرماتا ہے:

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيۡرٍ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ قَتۡلَ اَوۡلَادِهِمۡ

''اسی طرح بہت سے مشرکین کو اولاد کا قتل خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔'' (انعام۔ ۱۳۷)

قرآن کے مطابق غلط کام انجام دینے والے اپنے اس فعل کو قبیح اور برا نہیں سمجھتے، اگر بت پرست اپنے خالق کو چھوڑ کر اس کی کمزور اور بے بس مخلوق کی پرستش کرتے تھے۔ فرعون اور اس کے درباری دوسروں کے خصوصاً نوزائیدہ بچوں کے خون میں ہاتھ رنگتے تھے یا حد سے بڑھے ہوئے تھے تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ کاموں کو برا نہیں بلکہ عہدہ اور باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔ اپنے ان کاموں کو ایک خاص زاویہ نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان بدترین افعال کی مکارانہ توجیہ کرتے اور اس کو خوبصورت بنا کر پیش کرتے تھے۔ اس ضمن میں آیات پر غور کریں۔

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

(بلکہ سبا اور اس کے یہاں کے لوگوں کو میں نے اس حالت میں پایا کہ) ''وہ خدا کے بجائے سورج کی عبادت کرتے ہیں۔ شیطان نے ان کے اعمال کو انہیں خوبصورت بنا کر دکھایا ہوا ہے۔'' (نمل۔ ۲۴)

وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ

''فرعون کو اپنا برا کردار اچھا نظر آتا تھا۔'' (مومن ۳۷)

كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

''اسی طرح اسراف کرنے والوں کے کام ان کیلئے خوبصورت بن گئے۔'' (یونس۔ ۱۲)

قرآن شریف دوبارہ ایک دوسری آیت میں جامع انداز میں اس انحراف فکری کو پیش کرتا ہے ایسے لوگوں کو سب سے زیادہ نقصان اور خسارہ اٹھانے والے شمار کرتا ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾

''کہہ دیں کہ تم کو زیادہ خسارہ اٹھانے والے لوگوں سے آگاہ کریں، جن کا عمل اس دنیا میں بے نتیجہ تھا مگر وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے یہ کام بہت نتیجہ خیز ہیں۔'' (کہف۔ ۱۰۳، ۱۰۴)

دراصل ان کے ذہن اس قدر بیمار ہیں کہ وہ نہ واقعے کا صحیح درک کر سکتے ہیں اور نہ حقیقت کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں، منصب اور جاہ کے

طالب لوگ اس کے پیچھے اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے رہتے ہیں عوام میں ان کی کوئی مقبولیت نہیں ،مگر ان کو مغالطہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان پر فدا ہیں ۔درحقیقت یہ لوگ عوام میں بیمار دل ، نابینا اور بہرے ہو کر پھرتے ہیں ۔امیر المومنین علیہ السلام اپنے ایک خطبے میں ایسے لوگوں کو بیمار کہہ کر پکارتے ہیں ۔فرماتے ہیں:

من عشق شیئاً عشی بصرہ وامرض قلبہ فھو ینظر بعین غیر صحیحة ویسمع باذن غیر سمیعة

''جب کوئی شخص کسی چیز کا عاشق ہوجاتا ہے تو اس کی آنکھ آندھی اور دل بیمار ہوجاتا ہے ،وہ چندھیائی ہوئی آنکھ اور بہرے کان سے حقیقت کے سامنے آتا ہے ۔''(نہج البلاغہ ۔خطبہ ۔۱۰۷)

انسان کی بینائی اپنے غصے کے جذبات اور شہوت کے غلبے کے سامنے مفقود ہوجاتی ہے ۔ظاہر ہے کہ وہ ذہن صحیح فیصلہ کس طرح کر سکتا ہے کہ غصے اور شہوت کے جذبات سے مفلوج ہو رہا ہو کسی عرب شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

وانارة العقل مکسوف بطوع الھوٰی
وقلب عاص الھوٰی یزداد تنویرًا

خواہشات نفسانی کی پیروی سے عقل کی روشنی چھپ جاتی ہے مگر وہ شخص جو ہوا وہوس کے مقابلے کھڑا ہو جائے اس کی عقل وفکر ترقی کرتی ہے ۔

مولوی کہتے ہیں ۔

خشم وشھوت مرد را احول کند
ز استقامت روح را مبدل کند
چون غرض آمد ہنر پوشیدہ شُد
صد حجاب از دل لبسوی دیدہ شد
چون دہد قاضی بدل رشوت قرار
کہ شناسد ظالم از مظلوم زار[1]

---

[1] ۔مثنوی، دفتر اول ۔ص ۱۰ ۔طبعی میر خوانی

ترجمہ:

غصہ اور شہوت انسان کو اندھا کر دیتے ہیں۔ روح کو راہ راست سے بھٹکا دیتے ہیں۔ جب خود غرضی آجائے تو عقل و ہنر چھپ جاتے ہیں۔ دل کی جانب سے سو پردے نگاہ پر پڑ جاتے ہیں جب قاضی رشوت لے کر اپنی دل کو قرار دے۔ پھر وہ ظالم اور مظلوم میں کس طرح فرق کر سکتا ہے۔

تعصب نہج البلاغ کی نظر سے

امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں تعصب کے سلسلے میں بہت اچھے تجزیے پیش کیے ہیں۔ چند ایک اقتباسات یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

امامؑ اس قابل مذمت صفت کے چند بڑے نقصانات کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شیطان کی لغزش کا سبب اس کا تعصب تھا، جس کا وہ اپنی ہزاروں سالہ عبادت کے باوجود مرتکب ہوا گویا یہ خرابی انسان کے سارے گزشتہ نیک اعمال کو برباد کر دیتی ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔

''شیطان نے اپنی خلقت کے اصلیت پر یعنی آگ سے پیدا ہونے پر تعصب برتا۔ یہ خدا کا دشمن (شیطان) تعصب کرنے والوں کا پیشوا اور گردن اکڑا کر چلنے والوں کا پیش رو تھا جس نے تعصب کی بنیاد رکھی۔''[1]۔

امامؑ قبائلی تعصب کو ایک خطرناک روش قرار دیتے ہیں کہ جس کی وجہ سے لوگ بے گناہوں کے اندھا دھند قتل پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

''اپنے اکڑی گردن والے متکبر سرداروں کی پیروی سے ڈرو اور خبردار رہو کہ یہ تعصب اور فتنے کے ستون ہیں۔''۔[2]

امامؑ اپنے کلام میں ایک دوسری جگہ اس قابل مذمت صفت کی بنیاد اور اس پر عمل پیرا ہونے کے دو سبب بیان کرتے ہیں۔ اول جاہلوں کو دھوکا دینا اور دوسرا بیوقوفوں کی منطق اور دلیل

آپ فرماتے ہیں:

---

[1] ۔وتعصب علیہ لاصلہ فعدواللہ امام المتعصبین وسلف المستکبرین الذی وضع اساس العصبیۃ

[2] ۔الافالحذر من طاعۃ سادتکم و کبرائکم الذین تکبروا فانہم قواعد اساس العصبیۃ دعائم ارکان الفتنۃ

''میں نے کسی کو تعصب کرتے نہیں دیکھا مگر اس لئے کہ جاہلوں کو دھوکا دے یا بے وقوفوں کو منطق اپنائے۔''[1]

پھر امامؑ اس بات کی طرف رہبری کرتے ہوئے کہ کبھی ثبات اور مقاومت کا جذبہ درحقیقت تعصب کا پرتو ہوسکتا ہے، فرماتے ہیں:

''اگر اپنے افکار اور کردار پر تعصب ہی کرنا ہے تو کیا ہی بہتر ہو کہ بہترین خصائل وعادات کی پائیداری و وسعت پر فخر وناز کریں۔ مثلاً ہمسایوں کے حقوق کی حفاظت کرنا، عہد وپیمان کو پورا کرنا، نیکوں کی اطاعت اور سرکشوں کی مخالفت کرنا، حسن سلوک کا پابند ہونا اور ظلم وتعدی سے کنارہ کش رہنا، خونریزی سے پناہ مانگنا، خلق خدا سے عدل وانصاف برتنا، غصہ کو پی جانا، زمین میں شرانگیزی سے دامن بچانا۔ چاہیے کہ ان ساری باتوں میں ہم ثبات واستقامت دکھائیں (حق کے راستے میں ایسے ثبات واستقامت کو تعصب نہیں کہا جاسکتا) بلکہ یہ حقیقت کی تلاش اور حق کی پیروی کہلائے گی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں تین ایسے برے زمانوں کا ذکر فرماتے ہیں جو امت مسلمہ کی گھات میں ہیں۔ ان میں سے ہر اگلا دور پہلے دور کے مقابے میں زیادہ برا ہوگا۔ جیسا کہ آپؐ نے فرمایا:

1۔ تمہارا اس دن کیا حال ہوگا جب تمہاری عورتیں مفسد ہوجائیں گی اور تمہارے نوجوان گناہ میں ڈوبے ہوں گے۔ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کردو گے۔ ایک شخص نے کھڑے ہوکر سوال کیا کہ ایسا بھی ممکن ہے تو آپؐ نے فرمایا اس سے بھی بدتر ہوگا۔

2۔ ایسا زمانہ آئے گا۔ کہ تم برے کاموں کا حکم دوگے اور نیک کاموں سے دوسروں کو روکوگے وہ شخص پھر کھڑا ہوا اور تعجب کرنے لگا کہ کیا اس کا بھی امکان ہے تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس سے بھی بدتر ہوگا۔

3۔ تمہارے حال اس وقت کیا ہوگا (جب تمہارے نظریات تبدیل ہوجائیں گے اور سوچ بدل جائے گی) نیکیاں تمہاری نگاہ میں برائیاں تمہاری نگاہ میں نیکیاں ہوں گی۔[2]

سب سے خطرناک وہ موقع ہے جب سوچ اور پرکھ بدل جائے اور تمدن اور آزادی فکر کے نام پر ہر طرح کی بے ہودگی اور بے حیائی رواج پائے اور دوسری طرح عفت وپاکدامنی، پاکیزگی اور حق شناسی کی رجعت پسندی، دقیانوسیت اور پرانے خیالات ونظریات کہہ کر ان

---

[1]۔ فما وجدت احدًا من العالمين تيعصب الشيئ من لاشياء لاعن علّة تحتمل تمويه الجهلاء اوحجة تليط بعقول السفهاء

[2]۔ فان كان لابد من العصبية فليكن تعصبكم لما كارم الخصال ووعامد الافعال ومحاسن الامو..... من الحفظ للجوار والوفاء بالزمام والطاعة للكبرو الا خذبالفضل والكف من البغي والاعظام للقتل والانصاف للخلق والكظم للظيظ واجتناب الفسادفى الارض۔ یہ تمام اقتباسات نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر 17 سے جو خطبہ قاصعہ کے نام سے مشہور ہے لئے گئے ہیں۔

[2]۔ كيف بكم اذافسدت نساء كم وفسق شبابكم ولم تأمروابالمعروف ولم تنهوا عن المنكر ؟فقيل له:ويكون ذالك يارسول الله،فقال وشر من ذٰلك، كيف بكم اذاامر تهم بالمنكر ونهيتم عن المعروف ؟فقيل له: يارسول الله ويكون ذٰلك؟ قال نعم وشر من ذٰلك كيف بكم اذار أيتم المعروف منكرًا والمنكر معروفاً؟ (فروع کافی۔ ج5، ص59، حدیث14)

لوگوں کی نظروں سے گرا دیا جائے گا۔ پروردگار تو نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ

''جس سے تم آ گاہ نہیں اس کی پیروی نہ کرو۔''

پروردگارا! ہم سب کو صحیح و غلط سے اور نیکی و بدی میں تمیز کی توفیق عطا فرما۔

پروردگارا! ہماری نگاہوں سے ہر قسم کی غفلت اور ہوا و ہوس کا پردہ ہٹا دے۔

پروردگارا! ہم کو توفیق عطا فرما کہ ہم اپنے جسم سے تعصب کا پرانا لباس اتار پھینکیں اور اپنے دل اور روح کو حری پسند اور آزادی فکر و نظر سے آراستہ کریں۔

قرآن کا دائمی منشور 2

پندرھواں اصول

زبان اور قرآن

اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِۙ﴿۸﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِۙ﴿۹﴾

کیا ہم نے اس (انسان) کو دو آنکھیں، ایک زبان اور دو لب عطا نہیں کیے؟ (البلد، ۸، ۹)

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝۸ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝۹

کیا ہم نے اس (انسان) کو دو آنکھیں، ایک زبان اور دو لب عطا نہیں کیے؟

(البلد، ۸، ۹)

انسان کی زندگی میں زبان کا کردار

زبان جو جسم انسانی کا ایک حساس عضو ہے اس کے بارے میں دو رخ سے گفتگو کی جا سکتی ہے:

(۱) انسان کی مادی اور روحانی زندگی میں زبان کا کردار، اور

(۲) اسلام کی نگاہ میں انسانی زندگی میں زبان کی ذمہ داری۔

ان دونوں نکتوں پر ہم مختصراً گفتگو کریں گے۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ زبان گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ آگے سے چھوٹی، مچھلی کی طرح نکیلی ہو جاتی ہے۔ یہ بات کرنے، ذائقوں کو چکھنے اور غذا کے نگلنے کا واحد ذریعہ ہے اس کی شکل بیضوی ہے۔ نیچے کی طرف منہ کی ہتھیلی اور لامی ہڈی سے چپکی ہوئی ہے۔ اس کی ایک سطح اوپر کی ہے اور دوسری نچلی سطح ہے۔ دونوں جانب دو کنارے ہیں اور اس کی ایک نوک ہوتی ہے۔

زبان کی فزیالوجی غذا کے ذائقہ کو محسوس کرنے، اس کو چبانے اور نگلنے اور پھر گفتگو کرنے اور بولنے سے متعلق ہے۔

زبان بھی آنکھ اور کان کی طرح شناخت کا ایک ذریعہ ہے۔ زبان ہی سے چکھ کر غذا کے چار ذائقے یعنی مٹھاس، ترشی، نمکین اور کڑواہٹ کی شناخت ہوتی ہے۔ مگر قرآن اس کی مختلف ذمہ داریوں سے ایک یعنی بات کرنے اور بیان کرنے کی صلاحیت کو نگاہ میں رکھتا ہے، زبان کو اسی زاویے سے دیکھتا ہے اور چکھنے، غذا نگلنے وغیرہ کے بارے میں بات نہیں کرتا ہم بھی اس کی اسی صفت سے متعلق گفتگو کریں گے۔

زبان مین بیان کی یہ قوت اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ اس نے اس کی دوسری صفات تو پس پشت ڈال دیا ہے اور ان کی اہمیت کم کر دی ہے تجربہ بتاتا ہے کہ جو لوگ بات کرنے پر قدرت نہیں رکھتے وہ بات سننے کی بھی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جو بچہ بہرہ پیدا ہوتا ہے وہ اپنے اس نقص کی بناء پر گونگا بھی ہوتا ہے یعنی قوت شنوائی سے محروم ہونے کی وجہ سے گونگا رہ جاتا ہے۔ اس وقت اس علمی بحث میں ہم نہیں جاتے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ایک بچہ جس کی جسمانی نشوونما شروع ہو چکی ہے مگر وہ بولنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ کیا وہ آئندہ چل کر دوسرے ہم عمر بچوں جیسی نارمل شخصیت کا حامل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں۔ بات یہ ہے کہ انسان اپنی زبان اور قوت گویائی ہی کے توسط سے گفت وشنید، سوال وجواب، بحث وتمحیص کے مرحلوں سے گزر کر اپنی شخصیت میں گہرائی

پیدا کر سکتا ہے۔

تعلیم و تربیت کے ذریعے انسان کی ذہنی نشونما کا وسیلہ بھی صرف زبان ہے۔فرض کریں ایک پڑھا لکھا شخص جس نے سالہا سال تعلیم و تعلم میں صرف کیے ہیں، اچانک زبان کی لکنت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور قوت گویائی سے محروم ہو جاتا ہے۔اب اس کے پاس سوائے قلم سے لکھنے کے اور چارہ نہیں رہ جاتا۔اور وہ بھی ہر وقت اور ہر جگہ ممکن نہیں تو کیا وہ زبان سے مجبور ہو کر ان پڑھ آدمی جیسا نہیں ہو جائے گا اور اس کی ساری گزشتہ محنت رائیگاں نہیں ہو جائے گی؟

فکرِ انسانی اور انسانی ذہن ایک خزانہ ہے جس کی کنجی زبان ہے۔جب تک اس چابی سے اس خزانے کا در نہ کھولا جائے انسان کا صحیح مقام اور اس کی حیثیت کا پتہ نہیں چل سکتا۔یہ وجہ ہے کہ کہ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

''انسان کی شخصیت اس کی زبان کے نیچے چھپی ہوئی ہے نہ کہ اس کی عبا کے نیچے۔''[1]

چنانچہ جسم انسانی کا یہ عضو جو گوشت کے ایک چھوٹے ٹکڑے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔[2] درحقیقت خدا کی عظیم آیت اور نشانی ہے ،انسانیت کے رشد اور ارتقاء کا وسیلہ، انسان کے اپنے افکار و آراء کو بیان کرنے کا ذریعہ اور انسان کی شخصیت کا معمار ہے۔

قرآن میں زبان کی حیثیت

اسی کی اسی اہمیت کے مدنظر قرآن مجید انسان کی خلقت کے ذکر کے فوراً بعد زبان کی تعلیم کا ذکر کرتا ہے۔گویا یہ نعمت انسان کے لئے خدا کے سب سے اعلیٰ لطف و مہربانی کا مظہر ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ﴿۳﴾ ۙ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ ﴿۴﴾

''خدائے رحمٰن جس نے اپنے رسول کو قرآن سکھایا، انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان کی تعلیم دی۔'' (رحمان۔ا تا ۴)

قرآن نے اس نعمت کا ذکر صرف یہاں نہیں کیا ہے بلکہ یہ لفظ جمع اور مفرد کی صورت میں قرآن میں پچیس مرتبہ آیا ہے مندرجہ ذیل آیات میں اس کی اہمیت کا ذکر ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ عَیۡنَیۡنِ ۙ﴿۸﴾ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَیۡنِ ۙ﴿۹﴾

---

[1] ۔المرء مخبوء تحت لسانہ۔(نہج البلاغہ حکیمانہ اقوال شمارہ148)

[2] ۔امیر المومنینؑ خلق انسان کے عجائبات کے بارے میں کہتے ہیں:''اعجبوا لھذا الانسان ینظر بشحم ویتکلو بلحم'' ''تعجب ہے انسان پر جو چربی سے دیکھتا ہے اور گوشت سے بولتا ہے۔''(نہج البلاغہ، حکیمانہ اقوال)

''کیا ہم نے اس سے دو آنکھیں، ایک زبان اور دولت عطا نہیں کیے۔(بلد،۸۔۹)

زبان انسان کی شخصیت کی کلید ہے[۱] قرآن اس سلسلے میں ایک جملہ بادشاہ مصر کا نقل کرتا ہے:

فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ۝٥٤

''جب اس نے حضرت یوسفؑ سے گفتگو کی تو ان سے کہا کہ تم آج سے ہمارے یہاں خاص حیثیت رکھتے ہو اور معتبر ہو۔'' (یوسف۔۵۴)

حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے خواب کی پر مغز تعبیر کی اور ملک میں غلے کے کھلیاں اور ذخائر سستے تیار کئے، انھیں گوداموں میں جمع کرنے اور ان کی دیکھ بھال کے طریقے بتائے اور ساتھ ساتھ اپنے قید کئے جانے میں عزیز مصر کی بیوی کی خیانت اور اپنی پاک دامنی کا باشادہ کو اعتبار دلایا تو بادشاہ کی نگاہوں میں ان کی اعلیٰ شخصیت نمایاں ہوئی اس نے آپؑ کو اپنا معتمد بنا کر مصر کی حکومت کے وزیر خزانہ کا عہدہ آپ کے سپرد کیا، مگر جب تک حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے بات نہیں کی تھی ان کی شخصیت اجاگر نہیں ہوئی تھی آپ قید خانوں میں برسوں وقت گزارتے رہے۔[۲]

پیغمبر گرامی سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ:

تکلّو اتعرفوا

---

[۱]۔ایک معنی میں زبان انسان کی آدمی شخصیت ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے۔

لسان الفتی نصف ونصف فؤادہ　　　فلم یبق الاصورۃ اللحم والدم

''ایک جواں مرد انسان کی زبان اس کی شخصیت کا نصف ہے۔ اس کے دوسرے نصاف کو اس کی عقل و خرد تشکیل دیتی ہے اگر ان دو سے آگے چلیں تو بجز گوشت اور خون کے کچھ نہیں۔عرب زبان میں ایک ضرب المثل ہے جو ان کے نکتے کو بیان کرتی ہے: المرئباصغریہ: قلبہ ولسانہ''حقیت انسان کے دو چھوٹے اعضاء سے وابستہ ہے یعنی اس کے دل اور اس کی زبان سے۔''

[۲]۔سعدی قرآں اور احادیث سے جو ہمارے ملک کے شعراء کے لئے ہمیشہ باعث وجدان وفیصان رہا ہے استفادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

زبان در وہاں ای خرد مند چیست　　　کلید در گنج صاحب ہنر

چو در بستہ باشد چہ داند کسی　　　کہ گوہر فروش است یا پیلہ در

''اے عاقل منہ میں زبان یا ہے؟ یہ صاحب ہنر کے خزانے کی چابی ہے۔''

''جب دروازہ بند ہو تو کسی کو کیا معلوم کہ یہ جوہری ہے یا بساطی اور پھیری والا ہے۔''

بات کروتا کہ پہچانے جاؤ۔"[1]

پیام پہنچانے والوں خصوصاً آسمانی پیغمبروں کیلئے زبان کا جو اہم کردار ہے اس نے حضرت موسیٰ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خدا سے دعا کریں کہ ان کی زبان کی لکنت دور فرمائے۔

وَاحۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِیۡ ﴿۲۷﴾ یَفۡقَهُوۡا قَوۡلِیۡ ﴿۲۸﴾

"خدایا میری زبان کی گرہ کھول دے تا کہ وہ لوگ میری بات ٹھیک طرح سے سمجھ سکیں۔" (طٰہٰ۔۲۷۔۲۸)

مزید یہ کہ حضرت موسیٰ نے اپنے بھائی کیلئے بھی اللہ تعالیٰ سے درخواست کی اُن کے ساتھ ان کو بھی بھیجے تا کہ اس پیغام رسانی مین ان کی مدد کریں۔ وہ زیادہ فصیح تھے اور بات بہتر طریقے سے لوگوں تک پہنچا سکتے تھے، جیسا کہ قرآن میں ہے۔

وَاَخِیۡ هٰرُوۡنُ هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ لِسَانًا فَاَرۡسِلۡهُ مَعِیَ رِدۡاً [2]

"میرے بھائی ہارون جو مجھ سے زیادہ فصیح ہیں ان کو میرے ساتھ مددگار اور میرے یاور کے طور پر بھیج دے۔" (قصص۔۳۴)

انبیاء اور مرسلین کا پیغام رسانی کا عظیم کام اصولاً اسی زبان کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ چنانچہ خداوند عالم حضرت پیغمبرؐ کو خوشخبری دیتا ہے کہ ہم نے اپنے پیغاموں کو آپؐ کی زبان پر آسان کر دیا کہ ان کے ذریعے آپؐ پرہیزگاروں کو بشارت دیں اور عناد اور دشمنی رکھنے والوں کو ڈرائیں، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الۡمُتَّقِیۡنَ وَتُنۡذِرَ بِهٖ قَوۡمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾

(مریم۔۹۷)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے کہ آپؐ کی زندگی لوگوں کے ساتھ اسی طرح کی ہو کہ ان کی زندگی میں بھی اور آپ کے بعد بھی لوگ "لسانِ صدق" اور آپ کے ثناخواں رہیں۔ حضرت ابراہیمؑ بھی خدائے تعالیٰ سے یہی دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وَاجۡعَلۡ لِّیۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۸۴﴾

---

[1] ۔الظر ائف واللطائف ۔ص۵۸۔ یہ جملہ امیر المومنینؑ سے بھی نقل ہوا ہے۔ (نہج البلاغہ، حکیمانہ اقوال شمارہ ۳۹۲)

[2] ۔سورہ شعراء کی آیت ۱۳ بھی اسی مضمون کی ہے۔

''میرے لئے آئندہ آنے والوں میں تحسین والی زبان قرار دے۔'' (شعراء۔ ۸۴)

ایک دوسری آیت میں ایسی ہی درخواست حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوبؑ کے بارے میں بھی ذکر کی گئی ہے، جیسا کہ فرمایا

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾

''ان کو ہم نے اپنی رحمت سے بہرہ ور کیا اور لوگوں کو زبان پر ہم نے انہیں نیک نام اور بلند کیا۔'' (مریم۔ ۵۰)

آخر میں قرآن انسانوں کے درمیان زبانوں کے اختلاف کو خدا کی آیت اور نشانی کہتا ہے اس سے پہلے اس فرق اور اختلاف کی حقیقت علمی انداز میں انسان کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ چنانچہ اس آیت اور نشانی کی عظمت کیلئے یہی کافی ہے کہ اس کو آسمانوں اور زمین کی خلقت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ

خدا کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی خلقت اور تمہاری درمیان زبانوں کا تعدد اور تمہارے رنگوں کا مختلف ہونا۔'' (روم۔ ۲۲)

غرض کہ زبان وہ واحد وسیلہ ہے جس سے دعا و مناجات اور خداوند تعالیٰ کی حمد و ثنا کی جاتی ہے، دوسرے بیسیوں فرائض مثلاً نماز کی ادائیگی، شہادت و گواہی دینا، ایمان کا اظہار جس سے اسلام لایا جاتا ہے اسی زبان کے مرہون منت ہیں۔ جب خدا چاہتا ہے کہ اپنے ایک نبی پر عنایت کا اظہار کرے تو اس کو کلیمی کے مقام پر فائز کرتا ہے اور اس سے گفتگو کرتا ہے اور نبی کو بھی جواب پر آمادہ کرتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾

''خدا نے موسیٰؑ سے گفتگو کی۔'' (نساء۔ ۱۶۴)

ایک دوسری آیت قرآن گھوارے میں ایک بچے کے بات کرنے کو خدا کی آیت اور نشانی کے طور پر پیش کرتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا

'گھوارے میں اور بڑا ہو کر بھی لوگوں سے بات کرتا ہے۔'' (مائدہ۔ ۱۱۰)

اس نعمت کی حیثیت اور عظمت سب پر ظاہر ہے، دانش وروں اور حکماء کی زبان کی تعریف میں اس قدر تحریریں ہیں کہ ان صفحات میں ان کا ایک مختصر حصہ بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ایک دانش ور کا بیان ہے کہ:

''زبان ضمیر کی گواہ، حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی، حقائق اشیاء کو بیان کرنے والی گناہ سے باز رکھنے والی، محبت و دوستی کا اظہار کرنے والی، شکر گزاری کا ذریعہ اور نعمت میں اضافے کا وسیلہ ہے۔۔۔[1]

قرآن کی زبان اور حضرت محمد مصطفیؐ کی لسان نے انسانی معاشرے میں جو عظیم خدمت انجام دی ہے وہ کسی دوسرے قوت سے انجام نہ پاسکی۔، یہ بھی کہا گیا ہے کہ زبان کی کاٹ تلوار کی کاٹ سے زیادہ تیز ہے۔[2]

جب زبان کی حیثیت اور اہمیت سے ہم آگاہ ہوگئے تو لازم ہے کہ اس کی ذمہ داری کی اہمیت سے بھی آشنا ہوں۔ اس ایک گوشت کے لوتھڑے سے بڑی بڑی خدمات اور ساتھ ساتھ بڑے بڑے جرائم بھی انجام پاتے ہیں۔ اسی زبان سے بیسیوں قسم کے گناہ کا ارتکاب کیا جاتا ہے ،جس میں بعض کا قرآن میں ذکر ہے اور بعض کا احادیث میں۔ اب اس ضمن میں ہم بھی گفتگو کرتے ہیں سب سے پہلے زبان کی ذمہ داری کے سلسلے مئیں ایک آیت کا ذکر کیا جاتا ہے۔

زبان کی بھاری ذمہ داریاں

ارشاد الٰہی ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ⑯ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ⑰ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ⑱

''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہم اس کے نفس کے وسوسوں سے پوری طرح آگاہ ہین۔ اس کی رگ گردن سے زیادہ اس کے قریب ہیں۔ دو فرشتے (رقیب اور عتید) دائیں اور بائیں طرف سے اس کی نگرانی کرنے کیلئے بیٹھے ہیں۔ اچھائی اور برائی کی کوئی بھی بات وہ زبان پر نہیں لاتا کہ اس وقت یہ دونوں فرشتے اس کو ثبت کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ (ق۔ ۱۶ تا ۱۸)

پچھلی بحث میں ہم انسان کی مادی اور روحانی زندگی کے پہلوؤں میں زبان کے کردار سے واقف ہو چکے ہیں اور ان دونوں رخوں میں

---

[1] ۔الظر ائف واللطائف۔ص،۵۰۔

[2] اس موقع پر شاعر کہتا ہے۔

لسان محمد امضی عرارًا وانفذ من ظباحد الحسام

حضرت محمدؐ کی زبان تلواروں کی کاٹ سے زیادہ تیز اور زیادہ نفوذ کرنے والی ہے۔

اس کی حیثیت کا ہم کو اندازہ ہو چکا ہے۔ زبان کی اہمیت کیلئے بس یہی کافی ہے کہ کفر اور ایمان دونوں ہی زبان کے ذریعے ظاہر ہوتے ہیں، انسان کی آنکھیں رنگوں کو پہنچانتی ہیں، کان آواز کی لہروں کو سنتے ہیں اور ہاتھ ان چیزوں کی طرف بڑھ سکتے ہیں جو جسم رکھتی ہیں۔ مگر زبان کے دائرۂ کار کی کوئی حد نہیں۔ انسان کی زبان موجود و معدوم، حق و باطل، معلوم و مجہول اور خیر و شر کے بارے میں بات کرتی ہے۔ چنانچہ نہ خیر کے میدان میں اس کیلئے کوئی حد مقرر ہے اور نہ ہی شر کے میدان میں یہی وجہ ہے کہ اگر زبان کیلئے کوئی بندش نہ ہو اور عنانِ زندگی اس کے حوالے کر دی جائے تو وہ انسان کو بُرے انجام سے دوچار کر دے گی۔ اس سلسلے میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

فان هذا اللسان جموح بصاحبه والله ما ارى عبدًا يتقى تقوىٰ تنفعه حتّٰى يخزن لسانه[1]

''انسان کیلئے اس کی زبان ایک سرکش گھوڑے کی طرح ہے، پرہیزگار شخص اسی وقت اپنے تقوے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جب وہ اپنی زبان کو محفوظ رکھے۔''

یہ گوشت کا ٹکڑا کہیں ایک مختصر بات سے آگ لگا دیتا ہے اور کہیں ایک لفظ سے دوستی اور محبت کا بیج بو دیتا ہے، اور ہٹ دھرم دشمن کو رام کر لیتا ہے۔ زیادہ جامع الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ زبان اپنی کارکردگی سے اگر ایک طرف انسان کی تقدیر بناتی ہے اور اس کو سعادت سے ہم کنار کرتی ہے تو دوسری طرف بدبختی بھی لا سکتی ہے، چنانچہ قرآن نے اوپر درج آیت میں زبان کے دو نگہبانوں اور نگرانوں کی بات کی ہے جو انسان کی ہر ہر بات کو ثبت کرتے ہیں۔ قیامت کے دن یہ فردِ جرم اسکے ہاتھ میں دے دیں گے کہ انکار کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہے گی جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ⑱

''انسان خیر و شر کی کوئی بات زبان پر نہیں لاتا مگر یہ کہ دونوں فرشتے اس کو لکھ لیتے ہیں۔'' (ق۔۱۸)

چنانچہ امیر المومنینؑ اس کے بارے میں کہتے ہیں:

اللسان سبع ان خل عنه عقر[2]

''زبان ایک درندے کے مانند ہے اگر اس کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو لوگوں کو پھاڑ کھائے۔''

---

[1] ۔نہج البلاغہ، خطبہ۔ ۱۷۴

[2] ۔نہج البلاغہ، حکیمانہ اقوال شمارہ، ۶۰

اس کو لگام دینے کا بہترین طریقہ سوچنا، تولنا اور پھر بات کرنا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے، پہلے تولو پھر بولو۔ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔

لسان العاقل وراء قلبه وقلب الاحمق وراء لسانه[۱]

عقلمند کی زبان اس کی عقل کے پیچھے ہوتی ہے جب تک سوچ نہ لے بات نہیں کرتا۔ احمق کی عقل اس کے زبان کے پیچھے ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ بے سوچے سمجھے بات کرتا ہے، بات کرنے کے بعد اس کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے کس قدر غلطی کی ہے۔''

زبان کے جرائم اور آفتیں

علم اخلاق کے علماء نے زبان کی بہت سی آفتیں اور جرم شمار کیے ہیں، غزالی نے اپنی کتاب ''احیاء العلوم''[۲] میں اس بارے میں بحث کرتے ہوئے زبان کے ذریعے انجام پانے والی بیس آفتوں اور گناہوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض کا قرآن میں بھی ذکر ہے، دوسرے اعضاء انسانی گناہ کے لحاظ سے محدود دائرہ کار رکھتے ہیں اور وہ خاص حلقوں میں نافرمانی کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر زبان انسان کی زندگی میں ایک بڑا کردار اور اپنا اثر رکھتی ہے تو ساتھ ساتھ بڑی ذمہ داریاں بھی رکھتی ہے۔ جناب پیغمبر گرامیؐ نے فرمایا:

ان اکثر خطایا ابن اٰدم فی لسانِه

''اولاد آدم کے بہت سے گناہوں کا مرکز زبان ہے۔'' (احیاء العلوم، ج ۳ ص ۱۰۸ چاپ بیروت دار المعرفہ)

اب ہم ان بعض نافرمانیوں کو شمار کریں گے جو زبان کے ذریعے انجام پاتی ہیں۔ اگر قرآن مجید میں اس نافرمانی کا خصوصیت سے ذکر ہوا ہے تو اس سے متعلق آیت بھی پیش کریں گے اس وقت محض خلاصہ پیش کیا جائے گا یہ موضوع جو محرمات اسلام سے ہیں کسی اور وقت تفصیل سے بیان کیے جائیں گے۔

---

[۱] ۔ نہج البلاغہ حکیمانہ اقوال شمارہ ۴۰

[۲] ۔ المحجۃ البیضاء ج ۵ ص ۱۹۴

1۔ غیبت

غیبت ایک گناہ کبیرہ ہے، اس کے نقصانات کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ قرآن اس کے بارے میں کہتا ہے:

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ

''ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔'' (حجرات۔ ۱۲)

بلاشبہ زبان ہی کے ذریعے یہ گناہ سرزد ہوتا ہے۔

2۔ بدعت

یہ جانتے ہوئے کہ یہ دین کا جزو نہیں اگر ایک چیز کو ہم دین میں داخل کریں۔ مثلاً حلال کو حرام اور حرام کو حلال کہیں اور احکام الٰہی سے کھیلیں تو اس کو بدعت کہا جائے گا قرآن اس گناہ کا کئی موقعوں پر ذکر کرتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ

''اپنی زبان سے جھوٹی باتوں کی تعریف نہ کرو۔ یہ نہ کہو کہ یہ حلال اور یہ حرام ہے، اس طرح خدا پر افتراء نہ باندھو۔'' (نحل۔ ۱۱۶)

3۔ نفاق

دورُخا پن معاشرے کو تباہ کرنے والی ایک مہلک بیماری ہے اس سے مراد یہ ہے کہ انسان ایسی بات کرے جو اس کے دل کے مطابق نہ ہو۔ قرآن اس سلسلے میں فرماتا ہے:

يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ

''زبان سے ایسی بات کرتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتی۔'' (فتح۔ ۱۱)

ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے:

وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ

''اپنے منہ سے ایسی بات کرتے ہو جس پر یقین نہیں رکھتے۔'' (نور۔ ۱۵)

4۔ گواہی کو چھپانا

گواہی دینا حقوق انسانی سے متعلق ایک واجب مسئلہ ہے۔ یہ زبان کی ذمہ داری ہے کہ اس کو ادا کرے اور نہ چھپائے قرآن کہتا ہے:

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ

''انسانوں کے بارے میں اپنی شہادت اور گواہی ہرگز نہ چھپاؤ۔'' (بقرہ۔ ۲۸۳)

5۔ تمسخر

ایمان کے حامل افراد کے ساتھ استہزاء اور تمسخر جو دراصل ان کی توہین کے مترادف ہے اسلام میں سختی سے منع ہے، قرآن اس کے بارے میں فرماتا ہے:

لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ

''ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، شاید وہ ان سے بہتر ہو۔'' (حجرات۔ ۱۱)

6۔ جھوٹے وعدے

جھوٹے وعدے کرنا انسان کی کوتاہ شخصیت کی نشانی ہے۔ قرآن حضرت اسمٰعیلؑ کے بارے میں فرماتا ہے:

اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۚ﴿۵۴﴾

''وہ اپنے وعدوں کے سچے اور رسول اور نبی تھے۔'' (مریم۔ ۵۴)

7 جھوٹ بولنا

اس گناہ کے مذمت میں بہت سے آیات واحادیث ہیں۔ صرف ایک آیت کا ذکر کیا جاتا ہے:

اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ﴿۱۰۵﴾

''وہ شخص جھوٹ بولتا ہے جو آیاتِ خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔'' (نحل۔ ۱۰۵)

8۔ چغل خوری

یہ دو یا دو سے زیادہ لوگوں میں عداوت اور دشمنی پیدا کرتی ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں چغل خور کو ''حمّالة الحطب'' کہا جاتا ہے

۔معاشرے میں ایندھن کی لکڑیاں کاٹنے والے اور آگ لانے والا شمار ہوتا ہے، قرآن ایک متکبر کی مذمت میں کہتا ہے:

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ ﴿١١﴾

''یہ شخص ہمیشہ عیب جوئی کرتا ہے اوردونوں طرف لڑوانے کیلئے آنا جانا لگائے رکھتا ہے۔''(قلم۔۱۱)

9۔ باطل میں غوطے لگانا

اس سے مراد فحش باتیں بیان کرنا، شراب کی محفلیں سجا کر بے ہودہ اور اخلاق سے گرے ہوئے قصے بیان کرنا اور یاوہ گوئی ہے، قرآن قیامت کے دن بعض لوگون کو انہی حرکتوں کی بناء پر مجرم گردانتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَآئِضِينَ ﴿٤٥﴾

''ہم نے ہودہ گوئی کرنے والوں کے ساتھ بے ہودہ گوئی کیا کرتے تھے۔''(مدثر۔۴۵)

مسلمانوں کو قرآن ایسی محفلوں میں شرکت سے منع کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوضُوا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ

''تم ہرگز ان کی محفلوں میں شرکت نہ کرو جب تک وہ باطل باتوں سے فارغ نہ ہوں۔''(نساء۔۱۴۰)

10۔عیب جوئی

قرآن مجید عیب جوئی کرنے والوں کی بدبختی کا ذکر کرتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ﴿١﴾

''وائے ہے عیب جو، بے ہودہ گو کے لئے۔''(ہمزہ۔۱)

زبان سے محض ان ہی دس مواقع پر گناہ سرزد نہیں ہوتے بلکہ بیسیوں اور بھی گناہ ہیں، جن کا سبب یہی زبان ہے، ان میں سے بعض کا ذکر قرآن میں اور احادیث میں بھی تفصیل سے کیا گیا ہے، مثلاً:

۱۔غنا اور گانا	۲۔لڑائی جھگڑا	۳۔فحش کلامی
۴۔لعن طعن	۵۔افشائے راز	٦۔بے جا تعریف کرنا

۷۔ بلاوجہ مذمت کرنا ۸۔ ایسا مذاق کرنا جو شرع حدود سے باہر ہو۔ ۹۔فضول اور بے جا باتیں کرنا جن کو علماء اخلاق کی اصطلاح میں ''لایعنی'' کہا جاتا ہے ۱۰۔ضرورت سے زیادہ باتیں کرنا اور
۱۱۔دشمنی پیدا کرنے والی باتیں کرنا۔[۱]

اسی بڑی ذمہ داری کی بناء پر جو زبان پر عائد ہوتی ہے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''خداوند عالم زبان کو اس طرح کا عذاب دے گا کہ اس جیسا عذاب کسی دوسرے عضو کو نہیں ہوگا۔ جب زبان شکایت کرے گی تو خطاب ہوگا:

تو نے ایسی بات کو جو مشرق و مغرب تک پہنچی اور جس سے خون بہائے گئے اس لئے تجھے اس طرح عذاب دوں گا جو کسی اور عضو کو نہیں ہوگا۔''[۲]

جو شخص چاہتا ہے کہ اپنی روح اور نفس کا تزکیہ کرے اس کو جاننا چاہیئے کہ زبان کی سختی سے نگرانی اور اس کا لگام دینے سے دل میں ایمان مستحکم ہوسکتا ہے اگر نہیں تو دل کا خانہ ایمان سے خالی رہے گا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

ولایستقیم ایمان عبدحتی یستقیم قلبه ولایستقیم قلبه حتّٰی یستقیم لسانه۔[۳]

''کسی بندے کا ایمان استوار نہیں ہوگا۔ جب تک ایمان اس کے دل میں جگہ نہ بنالے اور یہ انجام نہیں پاسکتا، جب تک اس کی زبان استوار اور سیدھی نہ ہو۔''

---

[۱]۔ان اخلاقی برائیوں کی تشریح کیلئے کہ جن میں سے بعض حرام اور بعض مکروہ ہیں۔ کتاب احیاء العلوم جلد ۳ صفحات ۱۰۸ تا ۱۶۲ اور کتاب المحجۃ البیضا جلد ۵۔ صفحات ۱۷۹ تا ۳۸۸ کا ملاحظہ کریں۔

[۲]۔سفینۃ البحار۔ج۲۔ص۵۱۰۔مادہ: لسان

[۳]۔المحجۃ البیضاء: جلد ۵۔ص ۱۹۲

قرآن کا دائمی منشور 2

سولھواں اصول

شکر گزاری

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿١٥٢﴾

مجھے یاد کرو تا کہ میں تم کو یاد کروں، میری نعمتوں کا شکر ادا کرو اور کفرانِ نعمت نہ کرو۔ (بقرہ۔ ۱۵۲)

فَاذۡكُرُوۡنِىۡٓ اَذۡكُرۡكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لِىۡ وَلَا تَكۡفُرُوۡنِ ﴿۱۵۲﴾

مجھے یاد کرو تاکہ میں تم کو یاد کروں ،میری نعمتوں کا شکر ادا کرو اور کفرانِ نعمت نہ کرو۔ (بقرہ۔ ۱۵۲)

شکر گزاری اور ممنونیت ایسی اخلاقی اور معاشرتی ضرورت ہے جس سے ساری دنیا واقف ہے۔ یہ ایک طرح سے فطری اور وجدانی بنیاد کی حامل ہے کیونکہ ہر صاحب وجدان شخص کسی بھی نیکی اور خلوص کے جواب میں شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

آج کے دانش وراداۓ تشکر اور قدردانی کو (اداروں کے) انتظام اور مینجمنٹ کے لئے لازمی سمجھتے ہیں۔یعنی منتظم اور مہتمم کو چاہیۓ کہ نیکوکار رواورفرض شناس افراد کی قدردانی کرے اور غیر ذمہ دار اور فرائض سے بھاگنے والے افراد کی طرف نظر بھی نہ کرے۔کام میں زندگی کا نیا خون دوڑانے کیلئے قدردانی اور حوصلہ افزائی بہت کارگر ہوتی ہے اور نتیجہ خیز کارکردگی میں فرض شناس لوگوں کو شاباش دینا اپنا خاص اثر رکھتی ہے۔ذمہ دار اور لگن سے کام کرنے والوں کی قدردانی اور حوصلہ افزائی نہ کی جاۓ تو امکان ہے کہ کام چور اور جی چرانے والے لوگوں کی طرح بن جائیں۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ كَالۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَـكُمۡ كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ ﴿۳۶﴾

''کیا مطیع اور فرمانبردار مسلمان کو ہم مجرم جیسا قرار دیں تم کس طرح کا فیصلہ کرتے ہو۔''[۱] (قلم۔۳۵،۳۶)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اپنے ایک خط میں اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہوۓ فرماتے ہیں:

لایکونّ المحسن والمسیئ عندك بمنزلة سواء فانّ فی ذٰلِك تزهیدًالاهل الاحسان فی الاحسان وتدریبًا لاهل الاسائة فی الاسائة [۲]

تمہارے نزدیک نیکوکار اور بدکار دونوں یکساں نہ ہو جائیں ،کیونکہ اس قسم کا امتیاز نہ رکھنا نیکوکار کی بے رغبتی اور غلط کار کی جرات کا سبب بنے گا۔

---

[۱]۔اس سلسلے میں سورۂ آلِ عمران آیات ۱۱۳ تا ۱۱۵ اور سورۂ حدید۔۱۰ بھی دیکھیں۔

[۲]۔نہج البلاغہ،خط ۵۳۔(مالک اشتر کے نام امام کا خط)

شکر کا ایک روحانی پہلو بھی ہے

آج کے زمانے میں مادی نقطہ نگاہ سے لوگ شکریہ ادا کرنے کو انتظامی امور میں اہل لوگوں کو صحیح کاموں کی طرف راغب کرنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں (یہ بات درست بھی ہے اور فائدہ مند بھی) مگر اخلاقِ اسلامی کے علماء اس کو دوسرے نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ خدا کا شکر و سپاس ادا کرنا دراصل سالکین راہِ حق اور عارفین حقیقی کا مقام سمجھتے ہیں اور اس کو اعلیٰ ترین عمل گردانتے ہیں جو انسان کو اس کے روحانی مقصود تک پہنچاتا ہے۔

اگر آج کے لوگ سپاس اور قدردانی کو انسانیت کی نشانی، ادب کا مظہر اور اعلیٰ اخلاق اور ثقافت جانتے ہیں تو قرآن اس کے عمدہ روحانی پہلو (مادی پہلو کے علاوہ) کا بھی قائل ہے وہ اس کو یادِ خدا کی صفت میں ایک عمل قرار دیتا ہے جب کہ یادِ خدا ایک بہت بالا مقام ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ

(عنکبوت۔۴۵)

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ

"مجھے یاد کرو اور میرا شکر ادا کرو۔"

ایک دوسری آیت میں اس تشکر کو ایمان باللہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا۝۱۴۷

"خدا کو کیا ضرورت ہے کہ وہ تم کو عذاب دے اگر تم شکر ادا کرو اور یمان لے آؤ۔"

(نساء۔۱۴۷)

شکر گزاری کی اہمیت نظر میں اجاگر ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ شیطان دھمکاتا ہے کہ وہ یہ نہیں ہونے دے گا کہ خدا کے بندے اس کے شکر گزار رہیں شیطان کی یہ واحد آرزو ہے کہ بندگان خدا اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے کفران نعمت کریں، جیسا کہ قران میں ہے کہ وہ کہتا ہے:

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ۝۱۷

"زیادہ تر بندوں کو شکر گزار نہیں پائے گا۔" (اعراف۔۱۷)

چنانچہ خداوند تعالیٰ آلِ داؤد کو خبردار کرتا ہے کہ شکر گزار ہو کیوں کہ خدا کے شکر گزار بندے بہت کم ہیں۔جیسا کہ فرماتا ہے:

اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا ؕ وَقَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ ﴿۱۳﴾

''اولادِ داؤد خدا کے شکر گزار رہو میرے شکر گزار بندے بہت کم ہیں۔''(سبا۔۱۳)

تشکر کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بلند مرتبہ بندوں کی توصیف کرتے ہوئے ان کی شکر گزاری کا ذکر کرتا ہے اور حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کا ''شکور'' اور ''شاکر'' کی حیثیت سے تعارف کرواتا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّہٗ کَانَ عَبۡدًا شَکُوۡرًا ﴿۳﴾

''وہ (نوحؑ) شکر گزار بندہ تھا''(بنی اسرائیل۔۳)

شَاکِرًا لِّاَنۡعُمِہٖ ؕ اِجۡتَبٰىہُ وَہَدٰىہُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۱۲۱﴾

''ابراہیم خدا کی نعمتوں کے سپاس گزارہ تھے۔ان کا انتخاب کیا اور راہ راست کی ہدایت کی۔''(نحل)

اس مقام کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو ان ہی دو صفات سے موصوف کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَاللّٰہُ شَکُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿ۙ۱۷﴾ (تغابن)

فَاِنَّ اللّٰہَ شَاکِرٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۵۸﴾ (بقرہ) [1]

یہ تو ظاہر ہے کہ خدا کا شاکر ہونا اور ہے اور بندوں کا شکر گزار ہونا دوسری بات ہے۔یہ تو محض لفظی مشابہت ہے۔ورنہ خدا کی یہ دو صفات شکر پذیری اور اجر دینے کے معنی میں ہیں نہ کہ شکر گزاری اور سپاس گزاری کے معنی ہیں۔

دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ اگر اپنے آپ کو شاکر اور شکور کہتا ہے تو اس لیے کہ وہ انسانوں کے اعمال کی طرف سے بے پرواہ نہیں بلکہ ان کی قدر کرتا ہے اور ان کے عوض ان کو اجر عطا کرتا ہے۔چنانچہ مندرجہ ذیل آیت میں اپنے آپ کو شکور کہنے سے پہلے:

''لیو فیھم اجورھم''

کا فقرہ لایا ہے تا کہ خدا کے شکور ہونے کی وجہ بیان کرے۔جیسا کہ فرمایا ہے:

لِیُوَفِّیَہُمۡ اُجُوۡرَہُمۡ وَیَزِیۡدَہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ؕ اِنَّہٗ غَفُوۡرٌ شَکُوۡرٌ ﴿۳۰﴾

''تا کہ ان کا اجر ان کو دے اور اپنے فضل و کرم سے اس پر اضافہ کرے وہی بخشنے والا اور قدردان ہے۔''(فاطر)

ایک دوسری آیت میں بھی اس قدردانی کا ذکر کرتا ہے:

---

[1] اور پھر بھی فرمایا گیا ہے:

''وَکَانَ اللّٰہُ شَاکِرًا عَلِیۡمًا ﴿۱۴۷﴾ ۔'' (نساء)

اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝۳۰

''ہم نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔'' (کہف)

شکر کے درجے

خواہ شکر گذاری اور ممنونیت کو اخلاقی اور اجتماعی نقطہ نظر سے دیکھیں اور ایک انسان کو دوسرے انسان کا شُکر ادا کرنا مدنظر رکھیں۔ یا ایک عارف اور سالک کے نقطہ نظر سے خدا کے سامنے انسان کا جذبہ تشکر نگاہ میں رکھیں دونوں صورتوں میں تشکر اور سپاس کے درجے میں ہوتے ہیں۔عموماً انسان کسی ایک درجے کی طرف توجہ دیتا ہے اور دوسرے درجات کو نگاہ میں نہیں رکھتا۔

علماء اخلاق نے اپنے اپنے انداز سے شکر گذاری کی تعریف کی ہے۔مگر ہر ایک نے اس کے کسی ایک درجے کی طرف اشارہ کیا ہے، شاید ہی کوئی تعریف ایسی ہو جہاں سارے مراتب اور درجے بیان کیے گئے ہوں۔

سپاس اور تشکر کے سارے درجات سے واقفیت ہو تو ان تعریفوں کا مطلب سمجھ میں آجائے گا۔

علماء اخلاق کا کہنا ہے کہ تشکر کی بنیاد تین چیزوں پر ہے:

۱۔نعمت اور منعم کی پہچان

۲۔وہ نفسانی ردِعمل جو نیکوکار آدمی میں عاجزی پیدا کرے اور نعمت کے حاصل ہونے سے وہ خوشی محسوس کرے۔

۳۔انعام جس مقصد کے لیے دیا گیا ہے اس کی انجام دہی۔[۱]

ذیل مین شکر کے مراتب کی وضاحت کے ساتھ ان تین باتوں کی بھی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

نعمت اور منعم کی قدر و قیمت کی پہچان

اول مرحلہ تشکر کا یہ ہے کہ کام کی قدر و قیمت اور مُحسن کی حیثیت کی یہ پہچان ہو، یہ پہچان عموماً نعمت ملنے کی خوشی کے ساتھ ہی نفسانی ردِعمل یعنی دل کے جھکاؤ اور انکساری سے ظاہر ہوتی ہے اور قلب انسانی اور فکر و نظر سے متعلق ہوتی ہے۔یہ رُوح اور نفسیات انسانی کی ذمہ داری شمار ہوتی ہے، کام اور محسن کی پہچان شکر گزاری کا پہلا مرحلہ ہے۔یہی ایک سمجھ دار انسان کو ایک غفلت برتنے والے آدمی سے ممتاز کرتا ہے۔غافل انسان جانور کی طرح نعمت سے بہرہ در ہو کر بھی نعمت پیدا کرنے والے اور اس کو عطا کرنے والے سے بے توجہ رہتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں کام اور نیکوکار کی قدر و قیمت اور منعم و محسن کے سامنے دل کا جھکاؤ اسی طرح ہے، جیسے عبادت الہیٰ میں قصد قربت الی اللہ، جو

---

[۱] المحجۃ البیضاء، ج ۷، ص ۱۴۴۔

عبادت کی روح شمار ہوتی ہے اس کا ثبوت اور اصلاحی پہلو محض اس کے خدائی پہلوؤں میں ہے، یعنی کام خدا کے لیے اور خدا کے ہی حکم سے جو بھی عمل اس روحانی پہلو کے بغیر ہو وہ بے جان جسم اور سوکھے ہُوئے درخت کے مانند ہے کہ جو کسی کام کا نہیں۔

شکر کا یہ درجہ جو اہمیت رکھتا ہے اس کی بناء پر حضرت امام جعفرؑ صادق فرماتے ہیں:

"من انعم الله علیه بنعمة فعرفها بقلبه فقد ادی شکرها"۔ [1]

''جس شخص کو اللہ کی طرف سے انعام دیا جائے اور وہ اس کو صمیم قلب سے پہچانے تو اس کے سپاس و تشکر کا حق ادا کیا ہے۔''

امام جعفر صادق ایک دوسری حدیث میں فرماتے ہیں:

"ومن الشکور رئویة النعمة من الله۔" [2]

''سپاس اور تشکر کے درجات میں سے ایک یہ ہے کہ ہم سمجھیں کہ نعمت خدا کی طرف سے ہے۔''

ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت مُوسیٰ بن عمران خدا سے مناجات کرتے اور کہتے کہ خدایا میں کس طرح تیرا شکر ادا کروں کہ ہر شُکر کا انجام پانا کسی نعمت کی وجہ سے ہے جس کے لیے خود ایک شکر کی ضرورت ہے۔ اس وقت خطاب ہوا:

''اب جبکہ اس قسم کی معرفت تمھیں حاصل ہے، میرا شکر تم نے ادا کر دیا۔ [3]

اظہار شناخت اور خضوع

شکر گزاری کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان نے جو کچھ پہچانا ہے۔ اس کا اظہار کرے اور اپنی تصدیق کا خضوع قلب سے اعتراف کرے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک حقیقت انسان پر منکشف ہوتی ہے، مگر اس کا اظہار اور اعتراف کرنا اس پر گراں گزرتا ہے۔ ایک شائستہ اور معقول انسان کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ تکبر کو چھوڑ کر حق کا اعتراف کرے۔ یعنی شناخت قلبی کو اقرار کے قالب میں ڈھالے، حقیقی عاجزی اور انکساری کا اظہار اس وقت ہوتا ہے۔ جب انسان اپنے داخلی ردِ عمل کو ظاہر کرے اور اسے ظاہر کرنے سے نہ ڈرے، محسن کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کرے۔ کسی نے امیر المومنینؑ سے اسلام کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا تو امام نے اس کے جواب میں فرمایا:

---

[1] اصول کافی، ج ۲، ص ۹۶، حدیث ۱۵

[2] سفینۃ البحار۔ ج ا، ص ۷۱۰

[3] اصول کافی، ج ۲، ص ۹۸ حدیث ۲۷، غزالی نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے، احیاء العلوم، جلد ۴، ص ۱۰۸ طبع حلبی

''اسلام کی حقیقت باطنی اور اندرونی تسلیم ہے''۔

پھر فرمایا:

''وہ یقین معتبر ہے جو دلیل اور صحیح آگاہی کے ساتھ اور تصدیق کی کیفیت رکھتا ہو۔''

پھر فرمایا:

''ایمان باطنی اور اندرونی تسلیم دونوں کو اقرار کے ذریعے واضح ہونا چاہیے۔''[1]

چنانچہ علماء اخلاق کہتے ہیں کہ دلی شناخت اور معرفت کے بعد زبان کی باری آتی ہے یعنی حق شناس انسان زبانی اعتراف کے ساتھ اپنی ممنونیت کو ظاہر کرے۔

کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو نعمت اور مقام منعم کو دل سے پہچانتے تھے، مگر تکبر اور غرور کی وجہ سے اعتراف سے گریز کرتے تھے قرآن ایسے لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے:

يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝۸۳

''اللہ کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں، پھر بھی ان کا انکار کرتے ہیں ان میں سے زیادہ تر کافر ہیں۔'' (نحل)

شکرگزاری اور چاپلوسی میں فرق

منطق کی جو حُدود ہیں اس کی بناء پر اخلاق سے متعلق معاملات میں ظرافت کا عنصر بھی موجود ہے، فضیلت اخلاق کی پہچان اتنی آسان نہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے برعکس افعال رزیلہ کو آدمی اخلاق فاضلہ سمجھ بیٹھتا ہے اور دونوں میں فرق نہیں کر پاتا۔ چنانچہ ان کے حُدود مقرر کرنے میں آدمی کو چوکنا رہنا چاہیے۔ مثال کے طور پر عرض ہے کہ:

بلاشبہ ''شجاعت'' تندی تیزی، جلد بازی اور بے باکی کے مقابلے میں اخلاقی فضیلت شمار ہوگی۔ یہ صفت انسان کی ارتقاء اور نشوونما میں معاون بھی ہے مگر شجاعت اور اس کی ضد میں مشکل سے تمیز کی جاسکتی ہے، بعض اوقات ان دونوں میں انسان فرق نہیں کر پاتا

فی الحال جس تشکر وسپاس پر گفتگو ہو رہی ہے وہ خود فضائل اخلاقی گنا جاتا ہے، مگر اس کے مقابلے میں چاپلوسی اخلاق سے گری ہوئی بات سمجھی جاتی ہے، مگر ان دونوں کا فرق آپس میں اس قدر باریک ہے کہ ان کا دائرہ الگ الگ کرنا محال ہے۔

شکر گزاری اور چاپلوسی میں واضح ترین فرق یہ ہے کہ اگر قدردانی سامنے والے کی حقیقی صلاحیتوں اور خوبیوں کی بناء جاری ہی ہے تو ہماری تعریف وتوصیف تشکر اور سپاس گزاری کہلائے گی اس کے برعکس اگر سامنے والے میں صلاحیتیں اور خوبیاں نہ ہوں اور تشکر کا اظہار کیا جائے تو وہ چاپلوسی شمار ہوگا

---

[1] الاسلام هو التسليم هو اليقين، واليقين هو التصديق والتصديق هو الاقرار (نہج البلاغہ، حکیمانہ اقوال شمارہ۔۱۱)

امیر المومنینؑ اپنے کلام میں اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرماتے ہیں:

"الثناء باكثر من الا ستحقاق ملق والتقصيرعن الا ستحقاق عی اوحسد"۔ [1]

کسی کی اسکی صلاحیتوں اور خوبیوں سے زیادہ تعریف کرنا چاپلوسی ہے اور اس کی خوبیوں کو بیان کرنے میں کمی حسد اور کینے کی نشانی ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہم سپاس وتشکر اور تملق و چاپلوسی میں تمیز کریں اور اس قبیح عمل سے سختی سے پرہیز کریں۔

آج مستکبرین اور طاغوتیوں کو کھوکھلی تعریفیں بہت پسند ہیں۔ضروری ہے کہ ہم اس سے دور رہیں۔

وہ بدبخت لوگ جن کے ہاتھوں صرف بُرے کام انجام پاتے رہے اپنے ساتھ ہمیشہ بے کردار چاپلوسوں کو رکھتے رہے ہیں۔تاکہ اپنی جھوٹی تعریفوں سے اپنے رذیل کاموں کی پردہ پوشی کرتے رہیں۔قرآن نے ایسے لوگوں کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

''جو لوگ اپنے بُرے کاموں پر خوش ہیں اور اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان کی ان اچھے کاموں کے ذکر کے ساتھ جو انھوں نے کبھی انجام نہیں دیئے تعریف کی جائے ان کو عذاب سے نجات یافتہ خیال نہ کرو۔ان کے لیے تو دردناک عذاب ہے۔" (آل عمران)

ایسے بادشاہوں اور طاغوتوں سے تاریخ بھری پڑی ہے جنہوں نے اپنے لیے بڑے بڑے القاب منتخب کیے ان میں سے سبھی اپنے آپ کو عادل اور رعایا پرور کہلواتے تھے،بعض تو اپنے آپ کو کلب آستانہ ائمہ بھی کہلواتے تھے،ان القاب کی تائید شاعروں،ادیبوں،اور مقرروں کے ہاتھوں ہوتی۔مگر جو چیز ان بڑے القاب والوں کو چھو کر بھی نہیں گئی تھی وہ عدل وانصاف اور رعایا پروری تھی۔

پیغمبرؐ اکرم نے ان جُھوٹی تعریفین اور چاپلوسی کرنے والوں کے بارے میں فرمایا:

"احثوا التراب فی وجوہ المداحین"

''بے کردار مداحوں اور چاپلوسی کرنے والوں کے منہ پر خاک ڈالو۔''

اب تک ادائے شُکر کے دو نکتے واضح ہُوئے ہیں اب ہم تیسرے نکتے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ،حکیمانہ اقوال شمارہ ۳۴۷۔

شکر کی عملی صورت

نعمت کی پہچان اور ان اچھے کام اور ان اچھے کاموں کو انجام دینے والے کی حیثیت کا دل میں احساس تشکر کا ایک درجہ شمار ہوتا ہے، دوسرا درجہ نعمت اور منعم کے مقام اور حیثیت کا اعتراف ہے مگر اس نعمت سے صحیح فائدہ اٹھانا شرعی طریقے سے یہ ہے کہ دل کی پہچان اور زبان کے اعتراف کے بعد اس پہچان کو عمل کے قالب میں ڈھالا جائے۔ اس کو مجسم کیا جائے، کیونکہ نعمت پیدا بھی اسی لیے کی گئی ہے اور منعم کی خوشنودی بھی اسی میں ہے، ادائے شُکر کا یہ بہت اہم درجہ ہے مگر اس سے عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے۔ کچھ لوگوں نے شکر گزاری کی یہ تعریف کی ہے:

"الثناء علی الجمیل الاختیاری"۔

''کسی اچھے فعل پر زبانی تعریف جس کو کسی نے اپنے اختیار سے انجام دیا ہو۔''

یا اسی کے قریب قریب جملوں سے اس کا تعارف کروایا ہے حالانکہ ادائے شُکر قلبی پہچان میں مُحدود ہے اور نہ ہی زبانی اعتراف تک۔ اگر پیغمبر گرامی نے فرمایا ہے کہ:

"لیتخذ احدکم لساناً ذاکرًا و قلباً شاکرًا"۔[1]

''تم میں سے ہر ایک کے پاس سپاس گزار زبان اور شکر گزار دل ہونا چاہیے۔''

تو اس سے سپاس کے درجات بیان کرنا مقصود تھا۔ جب کہ ہر سپاس کے لیے ایک تیسرا درجہ موجود ہے۔ اسی کے ذریعے سپاس اور تشکر کی حقیقت مجسم ہوتی ہے۔ علماء نے اس کی اس طرح تعریف کی ہے:

"صرف النعمة فی محلها"

''نعمت کو اس کی صحیح جگہ صرف کرنا''

دراصل ایک نیکوکار فرد کے سپاس اور تشکر کی حقیقت بس یہی ہے، پہلے مرحلوں میں تو شُکر و سپاس کے الفاظ ہی الفاظ ہیں، سب سے بڑا کُفران نعمت بھی یہی ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ نہ اٹھائے یا پھر ان کو غیر شرعی موقعوں پر استعمال کرے۔
قرآن شکر کے اس مرحلے کی طرف چند آیات میں اشارہ کرتے ہُوئے فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝٧٨

---

[1] المحجة البیضاء۔ ج ۷۔ ص ۱۴۳۔

''خدا نے تم کو تمھاری ماؤں کے شکموں سے باہر نکالا جب کہ تم کوئی چیز نہیں جانتے تھے، تم کو اس نے آنکھ، کان ، اور دل عطا فرمایا تا کہ تم سپاس گزار اور شکر گزار بنو۔'' (نحل)

ان نعمتوں کے شُکر کا معنی یہ ہے کہ ہم اپنی آنکھ اور کان کھولیں اور آسمان و زمین میں غور و فکر کریں۔ ان میں چھپے ہوئے رازوں پر سے پردہ اٹھا کر فطرت کے مظاہر کو کنٹرول کرنے اور اس سے استفادہ کا علم حاصل کریں۔ اس طرح زندگی میں قوی اور طاقت ور بنیں۔ اور ان کی پہچان کے ذریعے جو در حقیقت اپنے پیدا کرنے والے کی آیات کی نشانیاں ہیں۔ خدا کی معرفت حاصل کریں۔

ان اعلیٰ نعمتوں کان، آنکھ اور دل) کا سپاس و تشکر ان آیات میں بیان ہُوا ہے:

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (یونس۔۱۰۱)

''کہہ دیں: آنکھ کھول کر دیکھو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ ہے۔''

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(آل عمران۔۱۹۱)

''وہ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں۔''

ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے:

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ

''کیا وہ اپنی خلقت میں غور و فکر نہیں کرتے۔''

(روم۔۸)

نہج البلاغہ میں بھی اس طرح کے سپاس و تشکر کے بارے میں ذکر ہے۔ امامؑ نے فرمایا:

"لولم یتوعد الله علی معصیية لکان یجب لا یعص شکرًا النعمته"

(حکیمانہ اقوال۔۲۹۰)

''اگر خدا نے اپنے احکام کی مخالفت پر عذاب کی وعید نہ بھی کی ہوتی تب بھی مناسب تھا کہ ادائے شُکر کے طور پر گناہ سرزد نہ ہوتا۔''

بندگان خدا سے جو معصیت سرزد ہوتی ہے وہ بس یہی ہے کہ نعمتوں کو ان کی حقیقی جگہ کی بجائے کہیں اور استدلال کیا جائے۔ اس طور کفران نعمت ہوتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام شکر گزاری کے اس درجے کے ضمن میں فرماتے ہیں:

"شکر کل نعمة الورع عما حرم الله۔"[1]

''ہر نعمت کا شکرانہ یہ ہے کہ خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کیا جائے۔(اور ہر نعمت اپنی جگہ پر استعمال کی جائے۔''

شکر نعمت کی حقیقت یہی ہے کہ وہ نعمت اپنی جگہ پر صرف ہو، مثلاً آنکھ اور کان کی نعمتوں سے دیکھنے اور سننے کی چیزوں کو اچھی طرح پہچانے اور فکر و نظر سے استفادہ کر کے صحیح نتائج اخذ کرے۔

اگر زبان سے ہم شکر اللہ کہتے ہیں تو یہ شکر گزاری کے الفاظ ہیں۔مگر حقیقت شُکر نہیں۔ان الفاظ کے ذریعے ہم خبر دیتے ہیں کہ خدایا ہم تیری نعمتوں کو ان موقعوں اور جگہوں پر استعمال کرنے میں تیرا شکرادا کرتے ہیں، جہاں کے لیے تو نے ان نعمتوں کو پیدا کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ وہاں صرف کی جائیں اور شکراُللہ کہہ کہ ہم اس طرح کے شکر و قدردانی کی گزارش کرتے ہیں۔

امیر المومنینؑ پرہیز گاروں کی صفتوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

"غضوا ابصارهم عما حرم الله علیهم ووقفوا اسماعهم علی العلم النافع لهم"

''انھوں نے اپنی نگاہوں کو اس سے جس کو خدا نے حرام قرار دیا ہے بند کر لیا ہے اور اپنے کانوں کو مفید علوم کے لیے وقف کر دیا ہے'' (نہج البلاغہ، خُطبہ۔۱۸۴)

بعینہ یہی حقیقت

"استغفر الله ربی و اتوب الیه"

کے جملے میں حکم فرما ہے، استغفار دلی مذامت ہے اور پختہ ارادہ کرنا ہے کہ کہنے والا دوبارہ گناہ کی طرف نہیں آئے گا، یہ جملہ اسی دلی پختہ ارادے کا مظہر ہے۔

آخر میں اس نکتے کی یاددہانی ضروری ہے کہ حواس شناخت کا ذریعہ بیشک ہیں، مگر وہ اپنی ذات میں کافی نہیں۔ان حواس کے ساتھ اور ذرائع بھی ہونے چاہییں تا کہ ہم حقیقت کا ادراک کر سکیں، ہر احساس کے وقت اگر عقل بھی ساتھ نہ ہو تو صحیح نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا، اس کی تفصیل آپ کتاب ''شناخت'' میں پڑھ سکتے ہیں۔

---

[1] سفینۃ البحار۔ج ا۔ص ۷۰ا۔

ادائے شکر اور نعمتوں میں افزائش

قرآن شکر گزاری اور افزائش نعمت میں ایک نہ ٹوٹنے والا ربط بتاتا ہے اور یاد دلاتا ہے کہ نعمت کا شکر ادا کرنے سے اس نعمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكُمۡ لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ‏ ﴿۷﴾

''تمھارے پرودگار نے اعلان کیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمھاری نعمت میں اضافہ کروں گا اور اگر کفران نعمت کیا تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔'' (ابراہیم)

وَمَنۡ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشۡكُرُ لِنَفۡسِهٖ‌ۚ

''جس نے شکر ادا کیا تو اس کا فائدہ خود اسی کو پہنچے گا۔ (نمل۔ ۴۰)

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ نعمت کے شکرانے اور اس کی افزدنی میں گہرا تعلق ہے۔ اب اس تعلق کا سبب معلوم کرنا چاہیے

یہ تعلق اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب ہم اللہ کی نعمتوں کے شکرانے اور خدا کے بندوں کے اچھے کاموں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو فرق ہے اس کو سمجھ جائیں۔

خدا کی نعمت کو جب شکر ادا کیا جاتا ہے تو اس سے خدا کی حوصلہ افزائی اور قدردانی مراد نہیں ہوتی۔ کیونکہ حوصلہ افزائی کا جذبہ جو داخلی ردعمل کے طور پر ابھرتا ہے، وہ خدا کے لیے تصور میں بھی نہیں کیا آ سکتا اور خدا کے بندوں کی کیا حیثیت کہ وہ خدا کی نعمتوں کی صحیح قدردانی کر سکیں۔

اس کے برعکس بندگان خدا نعمتوں کے لیے اپنے شکر و سپاس کے ذریعے اپنی اہلیت اور خوبی ثابت کرتے ہیں۔ لائق اور شائستہ لوگ ہمیشہ فیض پاتے رہنے کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں وہ بے حیثیت اور نالائق لوگ ہیں۔ جن کے پاس جو نعمت ہے وہ بھی گو یا فالتو ہے، اس میں اضافے کی ضرورت نہیں۔

اچھے کام انجام دینے والوں کا شکریہ ادا کرنا ان کی حوصلہ افزائی ہے کہ وہ ایسے کام جاری رکھیں جو خُدا کو بھی پسند ہیں۔ اس کی مثال اس پھلدار درخت کی ہے جو پھل دینے کی وجہ سے باغبان کو درخت کی مزید دیکھ بھال کی طرف متوجہ کرتا ہے اور وہ زیادہ عزم وارادہ سے درخت کی دیکھ بھال کرنے لگتا ہے۔

بہرصورت خواہ سپاس وتشکر کے نتیجے میں لیاقت اور شائستگی کی تائید ہوتی ہو یا حوصلہ افزائی اور قدردانی، دونوں صورتوں میں شکرانے اور نعمت کی فروانی میں بھرپور منطقی تعلق موجود ہے۔

مولانا روم اس سلسلے میں کہتے ہیں:

شُکر نعمت ،نعمتت افزون کند

کفر نعمت از کفت بیرون کند

''نعمت کا شکرانہ تیری نعمت میں اضافہ کرتا ہے اور کفران نعمت اس کو تیرے ہاتھ سے نکال دیتا ہے:

حضرت امام جعفرؑ صادق اس منطقی رابطے کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

"من اعطی الشکر اعطی الزیادۃ۔" (المحجۃ البیضاء۔ ج،)

''جس کو شکرانے کی توفیق دی گئی اس کو نعمت کا اضافہ بھی دیا گیا۔''

آخر میں ہم چند نکات کا ذکر کرتے ہیں:

ا۔ بندگان خدا کی ایک صفت یہ ہے کہ ہر نئی نعمت سے استفادے کے موقع پر خدا کا شکرادا کرتے ہیں (حالانکہ زندگی کے ہر ہر لمحے میں نعمتیں ہمیشہ نئی نئی ملتی رہتی ہیں)۔ایسا شکرانہ جو خضوع کا اور منعم کے عرفان قلبی کا مظہر ہو۔مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ یاددلاتا ہے کہ ذرائع نقل وحمل جیسے کشتی یا بار برداری کے جانور کو استعمال کرتے وقت خدا کا شکرادا کریں۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

''خدا کی نعمتوں کو یاد کرو جب ان پر سوار ہو تو کہو کہ پاک ہے وہ خدا جس نے ان کو ہمارے لیے مسخر کیا ہے اور ہم اس پر کچھ قدرت نہیں رکھتے تھے۔'' (زخرف)

قرآن میں ایسی آیات بہت ہیں:

۲۔ ہر قسم کی حرکت اور کارکردگی یا سکوت وتوقف شکر گزاری یا پھر کفران نعمت کا مظہر بن سکتی ہے۔یعنی اگر واجبات اور مستحبات کو انجام دینا شکرانہ ادا کرنے کا ذریعہ ہے تو محرمات انجام دینا کفران نعمت ہے،حتیٰ کہ سالکین اور راہ حق طے کرنے والوں کے مکتب میں مکروہات بھی کفران نعمت کا ایک ہلکا سا نمونہ ہیں۔حالانکہ مکروہات کا مواخذہ نہیں ہوتا۔

۳۔کوئی بھی شکرانہ مکمل طور سے ادا نہیں کرسکتا۔بات یہ ہے کہ ہر نعمت کا شکرانہ ایک دوسری نعمت کے ذریعے انجام پاتا ہے جو خود شکر کا مقام ہے ۔اور بقول شیخ سعدی:

''احسان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جس کی اطاعت قربت کا باعث ہے اور اس کا شکرادا کرنے میں مزید نعمت ہے۔ہر سانس جو ہم لیتے ہیں وہ زندگی کی معاون ہے اور ہر سانس جو باہر آئی،وہ مفرح ذات ہے۔چنانچہ ہر سانس میں دو نعمتیں موجود ہیں اور ہر نعمت پر شکر واجب ہے۔''

از دست و زبان کہ برآید
کز عہدہ شکرش بہ درآید

ہاتھ اور زبان سے جو کچھ ممکن ہوتا ہے۔ اس کا کون شکر ادا کرسکتا ہے۔ اسلامی روایات میں اس نکتے کی تشریح کی گئی ہے۔

شاکرین کا مرتبہ

قرآن کی آیات اور احادیث اسلامی سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کے یہاں شکر گزاروں کا ایسا مرتبہ ہے کہ اولیاء اللہ نے ہمیشہ خداوند عالم سے درخواست کی ہے کہ ان کو بھی شاکرین کے زمرے میں شمار کرے۔ ان آیات میں حکم ہے کہ انسان ''شاکرین'' میں سے ہو:

وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ۝۱۴۴ (اعراف)

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ۝۵۳ (انعام)

حضرت سلیمانؑ خداوند تعالیٰ سے توفیق کی دُعا کرتے تھے کہ وہ ان نعمتوں کا جوان کو اور ان کے والدین کو عنایت ہوئی تھیں، شکرانہ بجالائیں، جیسا کہ قرآن میں ان کی دُعا ہے:

رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ

''پرودگار! مجھے توفیق عنایت فرما کہ میں ان نعمتوں کا شکرادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی ہیں''۔ (نمل۔۱۹)

حضرت امام حسین بن علی علیہما السلام نے شب عاشورا اپنے مشہور خطبے میں فرمایا:

''وجعلت لنا اسماعاً و ابصاراً و افئدۃ فاجعلنا من الشاکرین۔'' [۱]

''ہم کو کان، آنکھیں اور دل تو نے عنایت فرمائے ہیں تو ہم کو شکر گزاروں میں سے قرار دے۔''

حضرت سیّد الساجدینؑ کی ۱۵ مناجاتوں میں سے ایک کا نام، مناجات شاکرین، ہے جس کے آغاز میں ہے:

''الٰھی اذھلنی عن اقامۃ شکرك تتابع طولك''

''پرودگار! تیری پے در پے نعمتوں نے مجھے تیری نعمتوں کے شکر سے غافل کر دیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ہم سب کو توفیق عنایت فرمائے کہ ہم اس کی بے کراں نعمتوں کے مقابل اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں۔

---

[۱] ارشاد مفید۔ص ۲۴۳۔

قرآن کا دائمی منشور 2

سترھواں اصول

خدائی آزمائش

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۲﴾

”الم۔ کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں وہ چھوڑ دیئے جائیں گیا اور کبھی آزمائش میں نہیں ڈالے جائیں گے۔“ (عنکبوت)

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۲﴾

"الم۔ کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں وہ چھوڑ دیئے جائیں گیا اور کبھی آزمائش میں نہیں ڈالے جائیں گے۔" (عنکبوت)

وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۳﴾

"ہم نے اُن اُمتوں کی جو ان سے پہلے تھیں آزمائش کی، خدا سچوں اور جھوٹوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ (عنکبوت)

امتحان و آزمائش وہ موضوع ہے جس کا قرآن میں بار بار ذکر آیا ہے۔ اس سے متعلق نکات مختلف اصطلاحات کے ذریعے مثلاً، فتنہ، بلاء، تمحیص، تمیز، اور امتحان، آئے ہیں۔ ان الفاظ کے معنی اور مفہوم، **المعجم المفھریں**، کتاب سے معلوم کر کے قرآن کی نگاہ میں امتحان اور آزمائش کی اہمیت اور اس کی عنایت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

قرآن میں آزمائش کا مسئلہ دو صورتوں میں پیش ہوا ہے کبھی کلی شکل میں یعنی افراد بشر کشاکش حیات میں آزمائے جاتے ہیں۔ یہ امتحان گاہ سچے کو جھوٹے سے الگ کر دیتی ہے۔ دوسری صورت محسوس اور عینی ہے، یعنی گذشتہ امتوں کی سرگزشت پیش کر کے جو آزمائش میں ڈالی گئی تھیں اور ان میں سے کچھ نا کامیاب ہوئی تھیں اور کچھ کامیاب۔

امتحان بعض باتوں کے ذریعے ہی ممکن ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ ممتحن یا امتحان لینے والا جو کسی فرد یا افراد کا امتحان لیتا ہے۔

۲۔ وہ جس کا امتحان لیا جائے۔

۳۔ امتحان کے ذرائع جن کی وجہ سے حقیقت آشکار ہوتی ہے۔

۴۔ وہ سبب جس کی بناء پر ممتحن کسی کا امتحان لیتا ہے۔

قرآن میں یہ چاروں نکات کئی آیات میں آئے ہیں، جن کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ امتحان لینے والا کون ہے؟

گفتگو چونکہ خدائی آزمائشوں کی ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ ممتحن خدا ہے جو اپنے بندوں کو مختلف آزمائشوں میں ڈالتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۵ میں:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ

سے اور دوسری آیات میں اپنے ممتحن ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ یہ نکتہ بالکل واضح ہے اس لیے اس میں مزید بحث کی ضرورت نہیں۔

خدا کا ممتحن ہونا اپنی جگہ خود ایک بحث کا نکتہ ہے۔ ایک سوال اُبھرتا ہے کہ امتحان تو وہ لیتا ہے جو کسی بات کی حقیقت سے آگاہ نہ ہو۔ مگر خداوند تعالیٰ جو بندوں کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہے، اور جو غیب و شہود سے واقف ہے اس کو اپنے بندوں کے آزمانے کی کیا ضرورت؟ اس سوال کا جواب آگے ''امتحان کے اسباب'' کے ذیل میں آئے گا۔

۲۔ وہ جن کا امتحان لیا جاتا ہے

امتحان بندگان خدا کا ہوگا جو بلوغ سے لے کے موت کے وقت تک مختلف میدانوں میں آزمائے جائیں گے۔ اس سے کچھ کامیاب اور کچھ ناکامیاب باہر آتے ہیں۔

کبھی قرآن عمومی آزمائش کا ذکر کرتا ہے جس سے سب بندگان خدا گزرتے ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝۲

''کیا لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ وہ چھوڑ دیئے جائیں گے اور کبھی آزمائش میں نہیں ڈالے جائیں گے؟'' (عنکبوت)

اس طرح کی آیات جو عمومی آزمائشوں کے بارے میں ہیں اتنی ہیں کہ یہاں پیش نہیں کی جاسکتیں کبھی قرآن خاص آزمائشوں کا ذکر کرتا ہے جو خاص لوگوں یا قوموں کے لیے تھیں چنانچہ قرآن میں ایسے بہت سے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ان آزمائشوں کی تفصیل ان کتابوں میں ملتی ہیں جن میں قصص قرآن جمع کیے گئے ہیں۔ ہم ان مواقع کا ذکر کرکے آگے بڑھ جائیں گے۔

وہ افراد جن کا قرآن خصوصیات سے نام لیتا ہے کہ آزمائش میں ڈالے گئے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔حضرت ابراہیمؑ خلیل الرحمن

قرآن آپؑ کے بارے میں فرماتا ہے:

وَاِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ

''وہ وقت یاد کرو جب خدا نے چند باتوں کے ذریعے ابراہیمؑ کا امتحان لیا اور وہ خود بھی اچھی طرح ان سے عہدہ برآ ہوئے تو ہم نے ان سے کہا کہ ہم نے تم کو لوگوں کا پیشوا قرار دیا۔'' (بقرہ۔۱۲۴)

۲۔حضرت داؤد بنی اسرائیل کے عظیم پیغمبرؑ

آپؑ دو افراد کی جانب سے سوال کے سلسلے میں آزمائے گئے، اس کی تفصیل سورہ ص کی آیات ۲۳ اور ۲۴ میں آئی ہے۔قرآن نے فرمایا ہے:

وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰہُ فَاسۡتَغۡفَرَ رَبَّہٗ وَخَرَّ رَاکِعًا وَّاَنَابَ ﴿۲۴﴾

''داؤد نے خیال کیا کہ ہم نے ان کو امتحان میں ڈالا ہے تو انہوں نے اللہ سے طلب مغفرت کی اور رکوع میں گرے اور خدا کی طرف رجوع کیا۔'' (ص)

۳۔حضرت سلیمانؑ فرزند حضرت داؤد

وہ بھی اپنے والد حضرت داؤد کی طرح آزمائش میں ڈالے گئے۔قرآن اس بات کی طرف ذیل کی آیت میں وضاحت کرتا ہے:

وَلَقَدۡ فَتَنَّا سُلَیۡمٰنَ وَاَلۡقَیۡنَا عَلٰی کُرۡسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾

''ہم نے سلیمانؑ کی آزمائش کی اور مردہ جسم اس کے تخت پر ڈال دیا تو اس وقت وہ خدا کی طرف لوٹا۔''(ص)

قرآن ان قوموں اور گروہوں کا بھی نام لیتا ہے جو آزمائش میں ڈالے گئے۔

۴۔سامری کے ذریعے آزمائش

قوم بنی اسرائیل جو حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں ''سامری'' کے ذریعے آزمائی گئی، جیسا کہ فرمایا گیا ہے

قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَکَ مِنۡۢ بَعۡدِکَ وَاَضَلَّہُمُ السَّامِرِیُّ ﴿۸۵﴾

''ہم نے تمہاری قوم کی آزمائش کی اور سامری نے انھیں گمراہ کیا۔'' (طٰہٰ)

۵۔میقات میں آزمائش

حضرت موسیٰؑ کی قوم کے منتخب افراد کی ایک جماعت کی میقات میں آزمائش ہوئی، جب کہ انھوں نے حضرت موسیٰؑ سے درخواست کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ظاہری آنکھوں سے ضرور دیکھیں گے ان لوگوں کو صاعقہ نے گھیر لیا۔ قرآن اس کی صراحت کرتا ہے:

اِنۡ هِىَ اِلَّا فِتۡنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنۡ تَشَآءُ وَتَهۡدِىۡ مَنۡ تَشَآءُ ؕ

''یہ تیری طرف سے آزمائش ہے، جس کے ذریعے جن کو چاہتا ہے گمراہ اور جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔'' (اعراف۔۱۵۵)

۶۔قوم صالح

اس قوم نے اپنے پیغمبرؑ سے درخواست کی کہ معجزے کے طور پر ایک اونٹنی پہاڑ سے نکالیں۔ خدا نے آزمائش کے لیے ان کی درخواست کا مثبت جواب دیا۔ قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

اِنَّا مُرۡسِلُوا النَّاقَةِ فِتۡنَةً لَّهُمۡ فَارۡتَقِبۡهُمۡ وَاصۡطَبِرۡ ﴿۲۷﴾

''ہم آزمائش کے طور پر ان کیلئے اونٹنی بھیجیں گے تم انتظار کرو اور صبر اختیار کرو۔'' (قمر)

۷۔بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں کی دو فرشتوں کے ذریعے آزمائش

یہ دونوں فرشتے جادو سکھاتے تھے۔ سیکھنے والے اس کا اچھا استعمال بھی کر سکتے تھے۔ قرآن اس واقعہ کو سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۲ میں اس طرح ذکر کرتا ہے:

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنۡ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوۡلَاۤ اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَةٌ

''وہ دونوں فرشتے جادو کی تعلیم دیتے وقت لوگوں سے کہتے تھے کہ ہم آزمائش کا ذریعہ ہیں۔'' (بقرہ۔۱۰۲)

۸۔ بنی اسرائیل کے کُچھ لوگ جو دریا کے کنارے زندگی بسر کرتے تھے

ان کی آزمائش اس طرح کی گئی کہ حکم دیا گیا کہ ہفتے کے دن جب دریا میں مچھلیاں زیادہ ہوتی ہیں وہ مچھلی کا شکار نہ کریں۔ یہ لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہوگئے۔ کچھ لوگوں نے اس مسئلے سے اپنے کو الگ رکھا۔ دوسرے گروہ نے حکم نہیں مانا اور تیسرے گروہ نے حکم کی اطاعت کی اور دوسروں کو بھی اس حکم پر چلنے کو کہا۔ چنانچہ آخر کار تیسرے گروہ کے علاوہ باقی دونوں غضب خداوندی میں گرفتار ہوئے۔ اس سرگزشت کی تفصیل سُورۂ اعراف کی آیات ۱۶۴ تا ۱۶۷ میں بیان کی گئی ہے۔

۹۔ اہل صنعا کا امتحان

قرآن کچھ لوگوں کا تذکرہ کرتا ہے جو صنعا شہر میں ایک باغ کے مالک تھے۔ انھوں نے قصد کیا کہ باغ کا پھل پکنے کے بعد اس طرح توڑیں کہ فقراء اور مساکین کو خبر نہ ہو اور ان کا حق اس میں سے ان کو نہ دینا پڑے اور بغیر مالیات ادا کیے سارا کا سارا پھل بازار میں فروخت کردیں۔ اچانک اس باغ پر عذاب الہیٰ نازل ہُوا اور وہ باغ ایسی بنجر زمین میں تبدیل ہوگیا۔ جس میں کبھی آئندہ گھاس تک نہ اُگے۔ قرآن ان لوگوں کے اس واقعہ کو سورۂ قلم کی آیات ۱۸ تا ۳۳ میں بیان کرتا ہے۔

۱۰۔ طالُوت کی فوج

اس زمانے کا ایک ظالم حکمران جالوت تھا۔ حضرت طالوت کو بنی اسرائیل کے ہمراہ اس کی سرکوبی کے لیے مامور کیا گیا۔ حضرت طالوت کی فوج اپنی مہم پر روانہ ہوئی۔ راستے میں اردُن اور فلسطین کے درمیان جب وہ نہر کو عبور کر رہی تھی تو ان سپاہیوں کی اس حکم کے ذریعے آزمائش کی گئی کہ جو شخص یہاں پانی پی لے گا وہ ہم میں سے نہیں جو اس سے ایک چلو سے زیادہ نہ پیئے وہ ہم میں سے ہے۔ چنانچہ ان کی اچھی خاصی تعداد نے نہر سے پانی پی لیا اور وہ آزمائش میں ناکام ہوئے۔ ایک چھوٹے سے گروہ نے حکم مانتے ہوئے پانی نہیں پیا اور وہی گروہ امتحان میں کامیاب رہا۔ وہ اس طرح کہ انھوں نے اپنے زمانے کے مشہور جابر جالوت کو مقابلے میں شکست دی اور کہا کہ:

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً

''کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ چھوٹا سا گروہ جو صبر و استقامت سے لیس تھا گروہ کثیر پر کامیاب ہُوا۔'' (البقرہ۔۲۴۹)

قرآن ان لوگوں کے امتحان کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیات ۲۴۵ تا ۲۶۲ میں کرتا ہے۔

۱۱۔ حضرت مُوسیٰؑ بن عمران

پیدائش سے لے کر اس دنیا سے جاتے وقت تک آپ مختلف آزمائشوں میں گرفتار رہے۔ قرآن نے ان میں سے بہت سی آزمائشوں کے اسباب بیان کیے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ سے خطاب کر کے فرماتا ہے:

وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۬ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ڏ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰي قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۝۴۰

''ہم نے تم کو کئی امتحانوں سے آزمایا۔ پس اس وقت تم مدین کے لوگوں میں مقیم رہے اور اب تم مقام نبوت تک پہنچے۔'' (طٰہٰ)

۱۲۔ بنی اسرائیل کے قبیلے کا ایک مقدس مقصد کے لیے امتحان

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ وہ ایک گائے کی قربانی کریں۔ اس حکم کو ٹالنے کی غرض سے ان لوگوں نے گائے کی خصوصیات پوچھنی شروع کر دیں کہ کس قسم کی گائے کی قربانی کی جائے کبھی اس کی عمر کے بارے میں سوال کیا۔ جب بتایا گیا کہ نہ بوڑھی ہو کہ کام کے قابل نہ ہو نہ ایسی کہ ابھی تک کام نہ کیا ہو، تو انھوں نے ایک دوسرا سوال کر ڈالا کہ اس کا رنگ کیسا ہونا چاہیے، جب جواب ملا کہ زرد سونے کی طرح رنگ ہو کہ دیکھنے والے کو فرحت بخشے تو انھوں نے ایک تیسرا سوال پیش کیا، حتیٰ کہ وہ مجبور ہو گئے۔ اور خدا کے حکم کو ماننا پڑا اور ساری خصوصیات کو پورا کرنے والی گائے۔ مہنگے داموں خرید کر ذبح کی۔ قرآن نے ان کی سرگزشت سورۂ بقرہ کی آیات ۶۷ تا ۷۳ میں بیان کی ہے۔

۱۳۔ جنگ احزاب میں مسلمانوں کی آزمائش

سورۂ احزاب کی آیات ۹ تا ۲۷ جنگ خندق کو اجمالی طور پر بیان کرتی ہیں۔ یہ وہ جنگ ہے، جس کو قرآن کریم مومنین کی سخت آزمائش قرار دیتے ہُوئے کہتا ہے:

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝۱۱

''وہاں صاحب ایمان آزمائش میں پڑے اور کمزور ایمان والے) سخت متزلزل ہُوئے۔'' (احزاب)

دشمن کی فوج کی آمد نے کچھ لوگوں کے دلوں میں ایک رعب اور خوف ڈال دیا۔ جس کا ذکر قرآن مجید اس طرح کرتا ہے:

وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝۱۰

''جس وقت آنکھیں پتھرا گئیں اور دل حلق میں آ گئے، خدا کے وعدے کے بارے میں مختلف گمان کرنے لگے۔'' (احزاب)

اس موقع پر مسلمان دو گرہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ نے زہر اگلنا شروع کر دیا اور سپاہیوں کے ذہنوں میں ایمان کو متزلزل کرنے اور ان کے انکار پراگندہ کرنے کی کوشش کی تا کہ وہ میدان سے بھاگ کھڑے ہوں۔ یہ وہی تھے جو کہتے تھے:

مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾

''خدا اور پیغمبر کا وعدہ محض فریب اور دھوکا تھا۔'' (احزاب)

مگر وہ دوسرے لوگ جو راسخ ایمان کے ساتھ میدان جنگ میں پہنچے تھے۔ جب ان کی نگاہ دشمن پر پڑی تو کہا:

هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾

''یہ وہی جنگ ہے جس کا خدا اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا ہے۔ ان میں ایمان اور تسلیم کا اضافہ ہوا ہے۔ (احزاب)

۱۴۔ میدان اُحد میں مسلمانوں کی آزمائش

سورۂ آل عمران میں کچھ آیات جنگ احد کے حالات کا ذکر کرتی ہیں۔ اس موضوع پر گفتگو آیت ۱۵۰ سے ۱۷۱ تک ہوئی ہے۔ اس جنگ میں اوّل مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی، مگر اصحاب پیغمبر میں سے کچھ نے مال غنیمت جمع کرنے کے لیے پیغمبر کے حکم سے سرتابی کی تو دشمن نے اچانک پیچھے سے ان پر حملہ کر دیا۔ اس حملے نے مسلمانوں پر اس طرح عرصہ حیات تنگ کر دیا کہ ایک گروہ بھاگ کھڑا ہوا اور صرف گنے چنے لوگ میدان جنگ میں پیغمبرؐ اکرم کے دفاع کے لیے باقی رہ گئے۔ اسی لیے قرآن نے فرمایا:

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

''تا کہ خدا اس کو جو تم سینوں میں رکھے ہو آزمائے اور جو کچھ دلوں میں رکھے ہو اس کو پاک و خالص کرے اور جو کچھ اندر ہے خدا اس سے بھی آگاہ ہے۔'' (آل عمران)

اب ان افراد یا قوموں کے ذکر کو ہم مختصر کرتے ہیں جو خدا کی طرف سے آزمائے گئے۔ ان واقعات کی تفصیل کے لیے متعلقہ آیات کی تفسیر دیکھی جا سکتی ہے، چنانچہ یہ بحث اختتام کو پہنچی۔ اب ہم اپنی اگلی بحث کا آغاز کرتے ہیں، جہاں دیکھنا یہ ہے کہ خدائی آزمائشوں اور امتحان کا مطلق ذریعہ کیا ہے۔

۳۔خدائی آزمائشوں کے ذرائع

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۵ میں آزمائش کے ذرائع خوف وخطر، بھوک، مالی اور جانی نقصان اور پھلوں کی کمی کو کہا گیا ہے۔البتہ آزمائش الٰہی محدود نہیں بلکہ دوسری آیات میں مال وثروت اور اولاد بھی آزمائش کا سبب بتائے گئے ہیں۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ ۙ

''جان رکھوتمھارے مال اوراولادتمھارے امتحان کا سبب ہیں۔'' (انفال۔۲۸)

لَتُبۡلَوُنَّ فِىۡۤ اَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ

''تمہارے اموال اور جانوں کے بارے میں تمھارا امتحان ہوگا۔'' (آل عمران ۱۸٦)

ایک اور آیت میں پیغمبر اکرمؐ کا خواب لوگوں کی آزمائش قرار دیا گیا ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَمَا جَعَلۡنَا الرُّءۡيَا الَّتِىۡۤ اَرَيۡنٰكَ اِلَّا فِتۡنَةً لِّلنَّاسِ

''جوخواب ہم نے تم کو دکھایا ہے لوگوں کے لیے وہ باعث امتحان ہے۔'' (بنی اسرائیل۔۶۰)

اب یہ کہ پیغمبر گرامی کا خواب کیا تھا اور کس طرح لوگوں کے لیے وہ خواب امتحان کا سبب بنا اس پر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں گفتگو کی ہے۔عالم غیب کی باتوں میں لوگوں کو آزمانے کے لیے قرآن مجید دوزخ کے اندر ایک درخت کا ذکر کرتا ہے، جس کا نام ''زقوم'' ہے اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ درخت جہنم کے بیچ میں اُگے گا اور پھل دے گا۔جس کی شکل شیاطین کے سروں کے مانند ہوگی۔کافر اسے کھائیں گے۔

جن لوگوں کا غیب پر ایمان قوی ہے وہ اس بات کو قبول کرتے ہیں اور تعجب نہیں کرتے کہ جہنم کے وسط میں آگ کے شعلوں کے درمیان درخت اُگے گا۔لیکن جن کا ایمان کمزور ہے وہ اس کو جھٹلانے کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اَذٰلِكَ خَيۡرٌ نُّزُلًا اَمۡ شَجَرَةُ الزَّقُّوۡمِ ۝۶۲ اِنَّا جَعَلۡنٰهَا فِتۡنَةً لِّلظّٰلِمِيۡنَ ۝۶۳ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخۡرُجُ فِىۡۤ اَصۡلِ الۡجَحِيۡمِ ۝۶۴ طَلۡعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوۡسُ الشَّيٰطِيۡنِ ۝۶۵

''کیا جنت اچھی منزل ہے یا وہ جگہ جہاں زقوم کا درخت ہے۔ہم نے اس درخت کو ظالمین (مشرکین) کے لیے امتحان کا سبب قرار دیا ہے وہ ایسا درخت ہے جو دوزخ کے اندر اُگتا ہے اور اس کا پھل برائی میں شیاطین کے سروں کے مانند ہے۔'' (صافات)

قرآن مجید دوزخ کے نگہبانوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ۱۹ فرشتے اس کی نگہبانی کرتے ہیں ھ، پھر کہتا ہے کہ یہ خبر امتحان اور

آزمائشوں کا ذریعہ ہے۔ وہ اس طرح کہ جو لوگ غیب پر قوی ایمان رکھتے ہیں وہ اس کو صمیم قلب سے قبول کرتے ہیں مگر دوسرے لوگ اس کو جھٹلاتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ

''ہم نے جہنم کے نگہبان فرشتوں اور ان کی تعداد کو انیس قرار دیا مگر کفار کے لیے اس میں آزمائش ہے۔''

(مدثر۔ ۳۱)

قرآن آزمائش کے ذرائع اور وسیلوں کے دائرے کو مزید وسعت دے کر کہتا ہے کہ ہم تم کو خیر و شر، اچھائی اور برائی اور نعمتوں اور بلاؤں سے آزمائیں گے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ

''ہم تم کو خیر اور شر سے آزمائیں گے۔ (انبیاء۔ ۳۵)

کیونکہ جس طرح مصائب و آلام موجب آزمائش ہیں، خدا کی عطا کی ہوئی نعمتیں بھی، جیسے، جوانی، تندرستی، تمکن و ثروت، حسن و دل آرائی امتحان اور آزمائش کا ذریعہ ہیں۔

ایک دوسری آیت میں روئے زمین پر موجود تمام چیزیں آزمائش کا سبب کہی گئی ہیں:

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝

''جو کچھ زمین میں ہے اس کو ہم نے اس کی زینت بنایا ہے تاکہ ہم آزمائیں کہ زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے۔'' (کہف)

قرآن ایک دوسری آیت میں، حالت احرام میں شکار کی حرمت کو امتحان کا ذریعہ سمجھتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ

''اے صاحب ایمان افراد اللہ تعالیٰ تم کو اس شکار کے ذریعے جو تمھاری اور تمھارے نیزوں کی دسترس میں ہے آزماتا ہے تاکہ وہ جان کے (معلوم ہو جائے) کہ کون باطن میں خدا سے ڈرتا ہے۔ (مائدہ۔ ۹۴)

امتحان کے ذرائع ان سے کہیں زیادہ ہیں جو یہاں ذکر ہوئے۔ بلکہ گذشتہ اوراق میں ان چودہ افراد یا قوموں کے ذکر کی طرف ہم دوبارہ رجوع کریں تو اور بہت سے امتحان کے ذرائع نگاہ میں آئیں گے۔ مثلاً حضرت ابراہیم کا اپنے فرزند کو ذبح کرنا، بیوی بچے کو بے آب و گیاہ جگہ میں

چھوڑ کر جانا، آگ میں جلنے کے لیے تیار رہنا وغیرہ، یہ سبھی امتحان ہیں اس طرح اور لوگوں کی زندگیوں میں غور کرنے سے امتحان کے دوسرے ذرائع بھی واضح ہوں گے۔

یہاں تک تفسیر موضوعی کے انداز سے امتحان سے متعلق تین مباحث اختتام کو پہنچے اب چوتھے موضوع یعنی خدائی آزمائشوں اور امتحان کے اسباب پر بحث شروع کی جاتی ہے۔

۴۔ خدائی آزمائشوں کے اسباب

خدا کی آزمائشیں ایک عام سنت ہے یہ سب کے لیے ہے اور کسی خاص فرد یا گروہ کے لیے نہیں، سبھی اپنی اپنی استعداد اور مکانات کے تحت آزمائے جاتے ہیں۔ ان اسباب کی طرف جو خدائی آزمائشوں سے متعلق اس بحث میں آگے آئیں گے نظر ڈالی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ دراصل ایک فطری قانون ہے جو کسی خاص فرد یا گروہ کے لیے مخصوص نہیں۔ اسباب کی تفصیل میں ہم اندارہ کرسکیں گے کہ یہ آزمائشیں اور امتحان درحقیقت انسان کی نشوونما اور ارتقاء کا وسیلہ اور اس کی صلاحیتوں اور امکانات کو اجاگر کرنے کا ذریعہ ہیں۔ ایک طرح سے یہ انسان کے لیے اللہ کی رحمت ہیں اسی لیے یہ کسی فرد یا طبقے کے لیے مخصوص نہیں۔

آزمائش ایک عام سنت ہے اور سب کے لیے ہے، قرآن اس کو اس طرح بیان کرتا ہے:

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ ﴿۲۱۴﴾

''کیا تم نے گمان کرلیا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے بغیر کسی آزمائش کے کہ جیسے گزشتہ لوگ آزمائے گئے ان کی حالت تو یہ ہوئی کہ جب وہ مشکل میں پڑے تو پیغمبر اور صاحب ایمان افراد نے کہا: خدائی مدد کہاں ہے (تو ان سے کہا گیا) کہ خدا کی مدد قریب ہے۔'' (بقرہ)

یہ جملہ کہ ''خدائی مدد کہاں ہے'' کسی اعتراض کے طور پر نہیں، بلکہ ایک قسم کی دُعا اور نصرت خداوندی کی درخواست ہے۔

ان آزمائشوں کے متعلق جو سوال کیا جاتا ہے کہ خداوند عالم جو ظاہر باطن سے آگاہ ہے اس کو کیا احتیاج ہے کہ وہ اپنے بندوں کو آزمائشوں میں ڈالے، جب کہ امتحان کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ چھپا ہوا ہے وہ آشکار ہو جائے اور حقیقت کا پتہ چل جائے

اس کا جواب امتحان کے اسباب کی تشریح سے مل جاتا ہے۔ امتحان کے کئی دوسرے وجود اور اسباب ہوتے ہیں۔ صرف مخفی باتوں سے آگاہی نہیں۔ اور وہ سب خدائی اسباب ہیں۔

چنانچہ یہ بہت اہم ہے کہ خدائی آزمائشوں میں ہم ان کے اسباب کو سمجھیں۔ ایک بڑی وجہ امتحان کی یہ ہے کہ ان کے ذریعے انسان میں چھپی ہوئی

صلاحتییں اور لیاقتیں نشوونما پاتی ہیں۔اسطرح انسان اپنے کمال کی طرف بڑھتا ہے اگر یہ امتحان اور آزمائشیں نہ ہوں تو انسان کی اپنی صلاحیتیں چھپی کی چھپی رہ جائیں۔وہ اُجاگر نہ ہوں تو اس صورت میں انسان کی ارتقاء کیوں کر ممکن ہوتی۔یہ آزمائشیں نشوونما اور ترقی کے زینے ہیں۔اس کی تشریح ملاحظہ کیجئے۔

خدا کی عمومی ہدایت

ہر موجود کی خلقت کے ساتھ ساتھ ہدایت تکوینی اور اس وجود کے کمال کی طرف فطری رہنمائی بھی ہوتی ہے اور یہ وہ مقصد وکمال ہے، جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

گویا خداوند عالم ہر موجود کے پیدا کرنے سے دو کام انجام دیتا ہے:

ا۔اس کو موجود اور ہستی بخشتا ہے اور

۲۔اس کا ہاتھ پکڑ کر اسکو پُر پیچ راستوں سے گزار کر اس کی خلقت کے مقصود کی طرف ہدایت و رہبری کرتا ہے۔

خدائی ہدایت دو طرح کی ہے:

ایک وہ ہدایت ہے جو عقل وخرد سے لیس موجودات کے لیے مخصوص ہے۔اس کی بناء پر موجودات خدا کی طرف سے تفویض کردہ ذمہ داریاں اپنے کندھے پر اٹھا سکتے ہیں یہ موجودات داخلی طور سے عقل وخرد اور فطرت کے ذریعے اور خارج سے انبیاء اور خدائی معلمین کے ذریعے ہدایت پاتے ہیں۔

ان دونوں ظاہری اور باطنی حجتوں کے ذریعے انسان اعلیٰ انسانی اہداف ومقاصد تک پہنچتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے اس قسم کی ظاہر وباطن سے ہدایت موجودات کے ایک گروہ سے مخصوص ہے۔یعنی وہ جو عقل وخرد کا حامل ہے اور جو اپنے راستے کے انتخاب میں پوری طرح آزاد ہے۔

دوسری ہدایت وہ ہے جو ساری موجودات کے لیے ہے اور کسی خاص طبقے سے مخصوص نہیں۔اس کو علمی اصطلاح میں ''ہدایت تکوینی'' کہتے ہیں۔قرآن مجید اس وسیع ہدایت کو کئی آیات میں مندرجہ ذیل آیات کے اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ﴿۵۰﴾

''خداوند عالم نے تمام موجودات کو نعمت وجود بخشی، پھر ان سب کو ان کے کمال کی راہ کی طرف ہدایت کی۔(طٰہٰ)

ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے:

الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَہَدٰی ۪ۙ﴿۳﴾

''وہ خدا جس نے ہر موجود کو پیدا کیا اور اس کو آراستہ کیا ہر موجود کے لیے اندازہ مقرر کیا اور راہ کمال کی طرف اس

کی ہدایت کی۔'' (اعلیٰ)

یہ اور اس جیسی دوسری آیات اس بات پر گواہ ہیں کہ ہر موجود کی خلقت خاص ہدایت و رہنمائی کے ساتھ ہوئی۔ اس کو حیوانات میں ''جبلت'' اور نباتات و جمادات میں راسخ خلقت قوانین کہتے ہیں۔ یہ رہنمائی اس ظاہری اور باطنی ہدایت کے علاوہ ہے جو عقل و خرد رکھنے والی موجودات کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک گروہ ہدایت یافتہ اور دوسرا منحرف اور گمراہ ہے۔

وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝۳

میں ایک گہرا نکتہ پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ خدا کی ہدایت قدر اور اندازہ مقرر ہونے کے بعد ہے۔ اس قدر سے مراد کسی موجود کو ان اسباب و وسائل کے ساتھ لیس کرنا ہے جو اس کے مقصد تخلیق تک اس کو پہنچائیں۔ اس طرح سے ان وسائل سے لیس ہونا پہلے ہے اور پھر بعد میں عمومی ہدایت پا کر اپنے کمال تک پہنچنا ہے۔

ایک دوسری آیت میں خداوند عالم ساری انفرادی و اجتماعی اور تشریعی و تکوینی ہدایت کو خدا کی طرف سے قرار دیتا ہے ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی ۝۱۲

''ہم پر لازم ہے ہدایت اور رہبری کرنی''۔ (لیل)

ہدایت و رہبری کی ان اقسام کی طرف نظر کرتے ہوئے ہم انسانوں سے مخصوص ہدایت کو تشریعی ہدایت اور ساری موجودات سے متعلق ہدایت کو تکوینی ہدایت کہتے ہیں۔

چنانچہ اس کمال و سعادت کی طرف، جو مقصد تخلیق ہے، ہدایت کا ذریعہ یہی امتحان اور آزمائشیں ہیں اگر یہ آزمائشیں نہ ہوتیں تو اہل افراد کمال کے ان درجات تک نہ پہنچ پاتے، ان کی مخفی صلاحیتیں مردہ رہ جاتیں اور کبھی بروئے کار نہ آتیں۔

اس تمہید کے بعد ہم اس امتحان کا حقیقی سبب استعداد کی نشوونما کے عنوان سے پیش کرتے ہیں۔

(الف) مخفی صلاحیتوں کی نشوونما

چونکہ انسان عقل و فہم میں پختہ نہیں ہوتا اس لیے اپنے سارے ابہام و شکوک کو رفع کے لیے آزمائش سے اس کا گزرنا لازم ہے، خدا کو اس کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے بندوں کو امتحان میں اس لیے ڈالتا ہے کہ وہ اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو عمل کے سانچے میں ڈھال سکیں اور ان کی استعداد اور صلاحیت نشوونما پا سکے۔ انسان کی داخلی قوتیں، دوسرے منبع اور سرچشمے کی طرح ظاہر نہیں ہو پاتیں، جب تک خاص وسائل میسر نہ ہوں۔ یہ استعداد کے مرحلے سے ''فعلیت'' کے مرحلے تک نہیں پہنچ پاتیں اور وہی وسیلہ اور ذریعہ، جو ان صلاحیتوں کو روبہ عمل لائے، امتحان کہلاتا ہے۔

یہ تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ دھات آگ کی بھٹی میں زیادہ آبدار اور مضبوط ہوجاتی ہے، اس کی عمر بھی زیادہ ہوجاتی ہے اور وہ خصوصی مضبوطی کی بھی

حامل ہو جاتی ہے۔

خدا کے امتحان کا ایک ذریعہ سختیاں، دشواریاں، پھلوں اور رزق کی کمی ہے، آدمی سوچتا ہے کہ ان دشواریوں کا، جس کو قرآن

الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ

کہتا ہے، مقصد کیا ہے مگر اور بھٹی کی مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سختیاں اور دشواریاں انسان کی شخصیت کو بناتی ہیں اور اس کو مستحکم کرتی ہیں۔ اس درخت کی مثال لی جائے جو سخت دھوپ اور تیز ہواؤں میں پرورش پا گیا، وہ یقیناً زیادہ پائیدار اور مضبوط درخت ہوگا۔ یہ نسبت اس درخت کے جو کسی نہر کے کنارے اُگا ہو یہ نازک درخت نہر کے خشک ہو جانے کا اور تیز آندھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور صالح بندوں کو مختلف النوع مصائب اور آفتوں سے کیوں آزماتا ہے۔ حتیٰ کہ کہا گیا ہے:

"البلاء للولا"

''دشواریاں اور سختیاں دوستی کی بناء پر ہیں۔''

اگر ایسی آزمائشیں نہ ہوتیں تو انسان میں ایسی اعلیٰ صفات بھی نہ پیدا ہوتیں، وہ شخص جو امتحان کی بھٹی سے گزرا ہوا اور اس نے نشیب و فراز دیکھے ہوں زندگی اس طور گزارتا ہے کہ راستے کی مشکلات اس کو معمولی لگتی ہیں۔ زندگی کے تجربات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ مشکلوں سے نجات کے لیے غور و فکر کرتا ہے اور اپنی ارتقائی منزلیں طے کر کے ان قوتوں کو جو اس میں مخفی ہیں فعلیت کامل تک پہنچاتا ہے

بیشک یہ ضروری نہیں کہ امتحان اور آزمائشیں سب انسانوں کے لیے مفید اور سودمند ہوں اور سبھی کامیاب ہو کر اس سے نکلتے ہوں ہم کو صرف یہی کہنا ہے کہ مناسب حالات میں امتحان کمالات کے بلند ہونے اور انسان کو چھپی ہوئی صلاحیتوں کے آشکار ہونے کا ذریعہ ہے

قرآن اسی سبب کی تصریح اس آیت میں کرتا ہے:

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿١٥٤﴾

''خدا سے جو تمھارے سینوں میں ہے آزماتا ہے اور جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے اس کو مصفا اور خالص کرتا ہے۔ اور جو تمھارے سینوں میں ہے خدا اس سے آگاہ ہے۔'' (آل عمران)

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ

کا فقرہ بتاتا ہے کہ امتحان سے خدا کا مقصد حقیقت کا انکشاف نہیں، بلکہ اس کا ہدف تربیت ہے اور ان استعدادوں اور قوتوں کو آشکار کرنا ہے، جو وجود انسانی کے مرکز میں موجود ہیں۔ اس کو عربی لغت میں تمحیص کہتے ہیں۔

امیر المومنینؑ اپنے حکیمانہ اقوال میں فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ سے کبھی یہ درخواست نہیں کرنی چاہیے کہ ہم کو آزمائش میں نہ ڈال۔ اس لیے عالم

خلقت دراصل آزمائش اور امتحان کا میدان ہے بلکہ خدا سے یہ درخواست کرنی چاہیے کہ ہم ایسے امتحان سے دو چار نہ ہوں جس میں ہم پورے نہ آتر سکیں۔ پھر امام اس خدائی آزمائش کی وجہ بیان فرماتے ہیں:

(ان آزمائشوں کا) مقصد انسان کی اچھی اور بُری صفات کو آشکار کرنا ہے، کیونکہ یہی انسان کی شخصیت کی مظہر ہوتی ہیں مثلاً! بعض لوگوں میں بعض حوادث کے سلسلے میں خاص حساسیت پائی جاتی ہے دوسروں میں بعض مسئلوں کے بارے میں یہ پریشانی لاحق ہوتی ہے، جیسے لڑکی پیدا ہو جانا یا مال میں کمی ہونا۔ بعض دوسروں میں یہ کیفیت اور ردعمل پیدا نہیں ہوتا، بلکہ وہ خدا کی رضا پر راضی اور اس کی تقدیر پر قانع ہوتے ہیں۔ جب تک یہ دونوں قسم کے لوگ امتحان اور آزمائش سے نہیں گزرتے ان کی یہ مخفی کیفیات ظاہر نہیں ہوسکیں گی اور یہ پوشیدہ قوتیں آشکار نہیں ہوں گی، مخفی توانائیاں فعلیت کا جامہ نہیں پہن سکتیں، نتیجہ یہ کہ ایسے راستے سے جہاں امتحان نہ ہو مکمل انسانی تربیت نہیں مل سکتی۔ [1]

گویا خدائی امتحان ایک طرح سے باغبان کا کام انجام دیتا ہے۔ باغبان اور کاشتکار جب صحیح دانے اور بیج زمین میں بوتا ہے تو یہ بیج فطری وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے نشوونما شروع کرتا ہے۔ جہاں وہ بے انتہا مشکلات سے دو چار ہوتا ہے، کبھی طوفان، کبھی سخت سردی اور گرمی سے لڑتا بھڑتا آخر کار خوشبودار پھول یا میٹھے پھل، جس کی استعداد اس کے بیج میں چھپی ہوئی تھی کی صورت میں ظاہر کر دیتا ہے اگر یہ دانہ اور بیج ان حوادث کی بھٹی کے امتحان میں نہ پڑتا تو کبھی اپنے اس کمال کو ظاہر نہ کر پاتا نہ اس کی چھپی ہوئی قوت ''فعلیت'' کے درجے تک پہنچتی

اب ہم اس سب کو حضرت ابراہیمؑ کے امتحانات کو مختصر پیش کر کے واضح کرتے ہیں۔

آزمائشوں کے ذریعے حضرت ابراہیم کی پیش رفت

قرآن مجید حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو ایک انسان کامل کے طور پر پیش کرتا ہے قرآن میں بہت کم انبیاء کی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی طرح تعریف ہوئی ہے۔ یہ ایک الگ گفتگو ہے، جس میں ابھی ہم نہیں پڑتے۔

حضرت خلیل اللہ کی ترقی اور ارتقاء کا سبب یہ ہے کہ وہ دو بارہا امتحان کے میدان سے گزرے اور ہمیشہ شایان شان طریقے اور باوقار استقامت کے ساتھ آزمائش سے کامیاب کامران نکلے اور کمال انسانی کے اعلیٰ ترین مقام یعنی امامت اور عالم انسانیت کی رہبری تک پہنچے۔ اگر وہ ان آزمائشوں سے نہ گزرتے تو ان روحانی کمالات کے حامل نہ ہو سکتے، جن کی بناء پر وہ امامت کے قابل بنے

حضرت ابراہیمؑ اپنی طویل زندگی میں بار بار امتحان میں ڈالے گئے۔ ہر ایک امتحان میں ان کے وجود میں ایک روحانی کمال چمکا۔ ان سارے کمالات کے حامل ہو جانے پر وہ امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔

خداوند عالم نے آپؑ کو حکم دیا کہ کمال جرأت سے اجرام فلکی کی پرستش کرنے والوں سے مذاکرہ کریں۔ ان کے خداؤں کی بے چارگی کو ان کے

---

[1] نہج البلاغہ، حکیمانہ اقوال نمبر ۹۳۔

سامنے فاش کریں اور اس سلسلے میں کسی قسم کی پرواہ نہ کریں۔ [۱]

آپؑ کو فرمان دیا کہ یکہ و تنہا بُت پرستوں سے نبرد آزمائی کے لیے قیام کریں اور ایک خاص دن بُت خانے میں جا کر ان کے سارے بتوں کو توڑ ڈالیں۔ باز پُرس ہو تو بے باکی سے حقیقت بیان کر دیں۔

اگر آگ کے ٹیلوں کے درمیان آپؑ کے جلائے جانے کا وہ حکم صادر کریں تو اس کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ [۲]

آپ کو حکم ملا کہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو قربان گاہ میں لے جائیں اور ان کو راہ خدا میں ذبح کر دیں، خدا کے حکم کو محبت پدری ان کو پر ترجیح دیں اور مقدم رکھیں۔ [۳]

آپ کو حکم دیا گیا کہ اپنی بیوی اور بچے کو بے آب گیاہ بیابان میں تنہا چھوڑ کر خود دوسرے علاقے میں چلے جائیں [۴]

ان میں سے ہر ایک حکم نے ان کی رُوح اور نفسیات میں ایک کمال پیدا کیا۔ پھر ان میں کمال مطلق خدا سے ایسا عشق پیدا کر دیا کہ وہ اس کی راہ میں سب کچھ چھوڑ بیٹھے۔ اپنے اندر ہر طرح کی کسی دوسری آواز کو ختم کر کے سراپا گوش اسی کے حکم کے لیے ہو گئے۔ اس کی رضا اور ارشاد کے سامنے فرمانبرداری اور تسلیم کی روح پیدا کر لی۔

یہ کمال یعنی کمال مطلق سے عشق اور ہر طرح کی خود غرضی سے اجتناب ان آزمائشوں سے پہلے حضرت ابراہیمؑ میں بطور صلاحیت اور استعداد موجود تھا۔ جیسے ایک نیا طالب علم اگر مدرسہ میں داخل ہو جائے تو کل کو عالم ہو جائے گا۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب یہ توانائی اور استعداد اپنی اس حالت سے نکل کر عملی صُورت اختیار کرے اور سعادت عطا کرے۔ یہ آزمائشوں ہی کے ذریعے ممکن ہوا ورنہ یہ کمالات ان میں بھی ظاہر ہوتے اور ان کو انسان کامل کی حیثیت سے پیش نہ کرتے۔

گویا امتحان اور آزمائش بھٹی کے مانند ہے جہاں خالص سونا پگھل کر اپنی اصل قدر و قیمت کا پتہ دیتا ہے۔ اگر سونے پر کچھ بھی میل کچیل ہوتا ہے تو وہ اس طرح صاف ہو جاتا ہے اور اس کی اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں امتحان کے جو اسرار ہیں ان میں سے اس راز کی طرف اشارہ بھی ہُوا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾

---

[۱] سورۂ انعام ۷۶ تا ۷۹۔

صافات۔ ۹۲ تا ۹۷

[۳] صافات ۱۰۳ تا ۱۰۵

[۴] ابراہیم۔ ۳۷۔

''ہم تم کو خوف سے، بُھوک سے، اموال، نفوس اور پھلوں کے نقصان سے آزمائیں گے۔ صاحب صبر و استقامت لوگوں کو بشارت دیں۔'' (بقرہ)

دشواریاں اور مشکلات بھٹی کی طرح ہیں جو لوہے کو سخت اور پائیدار بناتی ہے۔ انسان بھی حوادثات اور مشکلات کی بھٹی میں پڑ کر قوی اور مستحکم ہو کر اپنی زندگی اور سعادت کی راہ کی رکاوٹوں کو ہٹانے کے قابل ہو جاتا ہے۔

ایک شخص نے حضرت امام رضاؑ سے خدائی امتحان کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا اور درخواست کی کہ اس آیت:

احسب النّاس ان یترکوا.....

کی تفسیر فرمائیں اور اس آیت میں، فتنہ، کا لفظ جو آیا ہے اس کی وضاحت فرمائیں۔ امام نے جواب میں فرمایا:

''یفتنون کما یفتن الذھب، یخلصون کما یخلص الذھب۔''[1]

''انسان سُونے کی طرح آزمائش کی بھٹی میں ڈالے جاتے ہیں اور سونے کی طرح جو دوسری مخلوط دھاتوں سے الگ ہو جاتا ہے، انسان بھی پاک وصاف ہو جاتے ہیں۔''

اب تک خدائی امتحان کا پہلا سبب واضح ہُوا اب دوسرے اسباب کی وضاحت کی جائے گی۔

(ب) اجر و ثواب اور سزا و عذاب کا معیار

بلاشبہ انسان کی صرف باطنی صفات ہی اجر و ثواب اور سزا و عذاب کا معیار نہیں ہوسکتیں۔ جب تک انسان کی اچھی یا بری صفات ظاہر نہ ہوں کبھی بھی کسی کو اندرونی صفات کی بنا پر سزا یا جزا نہیں دی جاسکتی۔ یہ صفات انسان کے افعال و اعمال کے ذریعے ظاہر ہوتی ہیں مگر یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب انسان امتحان کی بھٹی میں ڈالا جائے۔ یہ بھی خدائی امتحان کا ایک سبب ہے جو امیر المومنینؑ کے ارشادات میں آیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں

''وان کان سبحانہ اعلم بھم من انفسھم، ولکن لتظھر الافعال الّتی بھا یستحق الثواب والعقاب۔''[2]

''خدا انسان کو خود اس سے بہتر طور پر جانتا ہے، مگر اس لیے کہ وہ افعال جو جزاء اور سزا کا معیار ھیں۔ اس سے ظاہر ہوں اس کو امتحان کی بھٹی میں سے گزرنا پڑتا ہے۔''

---

[1] کافی جلد۔ص۔۳۹۰۔

[2] نہج البلاغہ، حکیمانہ اقوال شمارہ۔۹۳۰۔

(ج) نیکوں کو بُروں سے الگ کرنا

خدائی آزمائشوں کا تیسرا سبب اچھے کو بُرے سے اور بُرے کو اچھے سے جدا کرنا ہے۔ ایسے معاشرے میں جہاں سبھی اپنے آپ کو انقلابی کہتے ہیں اور بظاہر اس کی حمایت بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کچھ منافق اور ضد انقلاب بھی ہیں۔ تو ان میں شناخت پیدا کرنے اور صالح و مفسد اور مومن و منافق افراد کے پہچاننے کا بہترین ذریعہ یہی خدائی آزمائشیں ہیں ورنہ سبھی انقلاب کی نقاب چہرے پر ڈالے ایک ہی صف میں ہوتے اور ان میں کسی طور تمیز نہ کی جاسکتی۔ قرآن اس موقع پر فرماتا ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ

''خداوند تعالیٰ کبھی بھی مومنین کو جس حالت میں ہیں نہیں چھوڑتا، جب تک ناپاک کو پاک سے جُدا نہ کرلے۔''

(آل عمران۔۱۷۹)

ایک دوسری آیت میں فرمایا:

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

''تاکہ ناپاک کو پاک سے جدا کرے۔ اور ناپاکوں کو ایک دوسرے کے اُوپر قرار دے اور سب کو جمع کر کے جہنم میں ڈال دے۔ وہ زیاں کار اور خسارے میں ہیں۔'' (انفال)

قرآن کا دائمی منشور 2

اٹھارھواں اصول

انسان

کی خود فراموشی

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾

"ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے خدا کو بھلا دیا اور خدا نے ان کو اپنے آپ کو بھول جانے سے "دو چار کیا"۔ وہ فاسق لوگ ہیں جو فطرت انسانی اور خدا کی اطاعت سے نکل گئے ہیں" (حشر)

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿١٩﴾

''ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے خدا کو بھلا دیا اور خدا نے ان کو اپنے آپ کو بھول جانے سے ''دو چار کیا''۔ وہ فاسق لوگ ہیں جو فطرت انسانی اور خدا کی اطاعت سے نکل گئے ہیں'' (حشر)

نسیان اور خود فراموشی اور اس کے مدمقابل تذکر اور یاد رکھنا دو ایسی نفسانی حالتیں ہیں جن سے نفس اور روح انسانی دو چار ہوتی ہے۔ فراموشی اور بُھول جانا یہ ہے کہ نئے معاملات اور نکات کی طرف رجوع کرتے وقت ذہن انسانی اس سے خالی ہو، جس کو وہ پہلے یاد کیے ہُوئے تھا اور دوسری طرف رجوع کے وقت ذہن انسانی پر پہلے کا کوئی اثر باقی نہ ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ذہن کے کسی گوشے میں اس کی تفسیر موجود ہو۔ مگر کسی وجہ سے ذہن اس سے ربط نہ رکھ رہا ہو۔

اس کے برعکس تذکر اور یاد رکھنا یہ ہے کہ نئے معاملات یا نکات کی طرف رجوع کرتے وقت پہلے کے مفاہیم یا گذشتہ تصویریں انسانی ذہن میں مجسم اور تازہ ہوں۔

فراموشی اور بھول چوک کی کئی ایسی وجوہات ہیں جن کا ذکر علم نفسیات کی کتابوں میں ملتا ہے ان میں اہم یہ ہیں: قوت حافظہ کی کمزوری، فراموش شدہ چیز کو اہمیت نہ دینا توجہ مرکوز کرنے concentration میں کمی اور دوسرے پہلوؤں سے غفلت وغیرہ۔

ان اسباب کی وجہ سے نسیان اور فراموشی انسان کے خواص میں شمار ہوتی ہے اور معدودے کے سوا کوئی اس سے مستثنٰی نہیں۔ مگر یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ نسیان کی ایک کیفیت خود اختیاری بھی ہوتی ہے، جس کو انسان کو روکنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ نسیان کی بعض کیفیت اپنے بُرے نتائج کی بناء پر قرآن میں قابل مذمت ٹھہری ہیں۔

قرآن میں جو نسیان مذموم قرار دیئے گئے ہیں ان میں سے درج ذیل کا نام لیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جرائم کا بُھول جانا

گذشتہ جرائم کو بُھول جانے کی قرآن مذمت کرتا ہے۔ گناہ کو بُھول جانے کا مطلب یہ ہوا کہ گنہگار نے اپنے اس گناہ کو معمولی اور بے اہمیت سمجھا ہے۔ یہی سبب بنتا ہے کہ وہ دوبارہ اس گناہ کا مرتکب ہو۔ حالانکہ وہ گناہ جو انسان کی رُوح میں ظلمت اور تاریکی لے آئے، اس کا دوبارہ ارتکاب

نہیں ہونا چاہیے۔قرآن اس موقع پر فرماتا ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ

''اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جس کو آیات خداوندی یاد دلائی جائیں تو وہ ان سے روگردانی کرے اور پہلے جن بُرے کاموں کو اس نے انجام دیا تھا، ان کو بھول جائے'' (کہف۔۵۷)

گناہ کے بُھول جانے کا معمولی نتیجہ یہ ہے کہ وہ شخص اس گناہ کی طرف پھر باآسانی پلٹ آتا ہے۔اسی لیے قرآن نے ایسے شخص کو ظالم ترین کہا ہے، کیونکہ اس ذریعے سے دوسروں سے پہلے وہ اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھتا ہے۔

۲۔خدا کو بُھول جانا

جرائم کو بُھول جانے سے زیادہ خطرناک خدا کو بُھول جانا ہے۔وہ خدا جو انسان اور کائنات کا سرچشمہ ہے اور جو اپنے بندوں کو ان کے نیک اور بد اعمال کے بدلے جزا یا سزا دے گا اس کو بُھول جانے والے میں تمام حیوانی جبلت زندہ ہو جاتی ہے۔نتیجۃً وہ ہر قسم کی حُدود و قیود کو توڑ دیتا ہے۔ بعض قرآنی آیات میں اس طرف اشارہ ہُوا ہے جن میں سے چند کو ہم یہاں درج کرتے ہیں:''

ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْۤا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ

جب اس کو خدا کی نعمت نے گھیر لیا تو جس خدا کو وہ پہلے پکارتا تھا، اس کو اس نے بھلا دیا۔''(زمر۔۸)

اس آیت میں فراموشی کا سبب نعمتوں کی فراوانی اور ان میں کھو جانا بتایا گیا ہے۔ایک دوسری آیت میں اسی بات کو دوسرے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔قرآن انسان میں احساس غنا اور احتیاج سے بے نیاز ہونے کو سرکشی اور انسان کی خدا فراموشی کا سبب سمجھتا ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۙ﴿۶﴾ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ؕ﴿۷﴾

''انسان اس وقت سرکشی کرتا ہے جب وہ احساس غنا و بے نیازی میں مبتلا ہوتا ہے''۔ (علق)

نعمت اور ثروت خدا فراموشی اور حدُود اور پابندیاں توڑنے کا سبب اس وقت بنتی ہے جب انسان خود اپنی ذات میں مادی نعمتوں اور دنیاوی وسائل کو اہم سمجھے اور خیال کرے کہ بغیر منشائے ایزدی کے یہ چیزیں اس کی تکالیف اور غم و رنج دُور کر سکتی ہیں۔جب کہ قرآن دُنیا کے مضبوط سے مضبوط وسائل اور مادی بند و بست کو مکڑی کے جالے سے بھی کمزور قرار دیتا ہے اور نا قابل اعتبار جانتا ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

''وہ جنہوں نے اپنے لیے خدا کے علاوہ اولیاء بنا لیے ہیں (تاکہ وہ زندگی کی سختیوں اور دشواریوں میں ان کی مدد

کریں) مکڑی کی طرح ہیں جو اپنے لیے جالا بنتی ہے اور اس پر اعتماد کرتی ہے) حالانکہ اگر تم جانو تو کمزور ترین گھر مکڑی کا جالا ہے۔" (عنکبوت)

۳۔ اپنے آپ کو بُھول جانا

بدترین فراموشی اپنے آپ کو بُھول جانا ہے۔ اگر انسان اوّل اپنے کیے ہوئے گناہوں کو بُھول جائے اور پھر اپنے پیدا کرنے والے کو بُھول جائے تو اس کی بدبختی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھی بُھول جاتا ہے۔ اپنے آپ سے اس طور بے گانہ ہو جاتا ہے کہ اپنی سعادت اور خوش بختی کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ ہر روز فساد اور گناہ میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے اپنی بتاهی اور نابودی کے لیے اپنے ہاتھوں خود کوشاں رہتا ہے۔

قرآن مجید میں ایسی خودفراموشی کی طرف بعض آیات میں ارشاد ہوا ہے۔ چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ

"ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو خدا کو بُھول گئے ہیں۔ آخر کار خدا نے بھی ان کو اپنے آپکو فراموش کرا دیا۔"

(حشر۔۱۹)

خدا کو بُھول جانا خودفراموشی کا سبب کیسے ہے؟

اس آیت میں اہم نکتہ یہ بیان ہُوا کہ خودفراموشی براہ راست خدافراموشی سے پیدا ہوتی ہے، یہ دیکھا جائے کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔

اس کو دو طریقوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے:

(ا) خدا کی یاد انسان کو فساد اور گناہ سے دور رکھتی ہے۔ اس کے برعکس خدافراموشی انسان کے گناہ میں ملوث ہونے کا باعث ہوتی ہے۔ اور جو گناہ میں ڈوبا وہ حیوانی جبلت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر اپنی انسانیت اور انسانی حیثیت کو بھول کر محض حیوان رہ جاتا ہے، جس کو کھانے پینے، سونے اور شہوت رانی کے سوا دوسری کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ ظاہر ہے یہ انسانی شکل میں ایک حیوان ہوتا ہے۔

حضرت علیؑ ایسے لوگوں کے بارے میں جو اپنی انسانیت کو فراموش کرا چکے ہیں اور محض حیوان رہ گئے ہیں، فرماتے ہیں:

"قبيح على العاقل ان يكون بهيمة وقد امكنه ان يكون انسانا۔"[1]

"عقل مند کے لیے بری بات ہے کہ وہ خود میں خوئے حیوانی پیدا کرے اور حیوانی شکل اختیار کر لے جب کہ وہ

---

[1] شرح حدیدی۔ج۱۰۔ص۔۴۰۶۔

انسان بن سکتا ہے (اور اپنے آپ کو انسانی اخلاق اور خوبیوں سے آراستہ کر سکتا ہے)۔''

مختصر یہ کہ یاد خدا کے ذریعے نفس انسانی صفات حمیدہ سے آراستہ ہوسکتا ہے۔ اس طرح خود بخود انسانیت کی حقیقی شان کی حفاظت ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس خدا فراموشی اس کا سبب بنتی ہے کہ انسان گناہ میں ملوث رہے اور حیوانی عنصر اس پر غالب آ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں خدا فراموشی کو خود فراموشی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ فطری طور سے خدا کی یاد سبب بنتی ہے احیاء انسانیت اور انسانی خصائل کے فروغ کا۔

اگر آپ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ان لوگوں کو دیکھیں جو خدا کو بُھول چکے ہیں اور اس کی طرف متوجہ نہیں وہ ایسے ہوں گے جن کی صورت توانسان کی ہوگی مگر سیرت درندوں کی، جو چیز انسان کو درندے سے ممیز کرتی ہے وہ اس کی صفات انسانی ہیں اور اس کے فضائل اخلاقی ہیں اور اس کے پیچھے یاد خدا ہوتی ہے اور اولیاء اللہ کے مقامات کی یاد اور دوزخیوں کے عذاب کی یاد ہوتی ہے۔ اگر انسان سے یہ انسانی صفات لے لی جائیں تو وہ محض ایک جانور رہ جائے گا۔ قول شاعر

آدمی زاده طرفه معجونی است
گز فرشته سرشته وزحیوان :
گر کند میل این ،شود کم ازاین
درکند میل آن ،شودنه ازآن:

آدمی زادہ بھی عجیب وغریب معجون مرکب ہے۔ فرشتہ سرشت بھی ہے اور حیوان بھی۔ اگر حیوانیت کی طرف مائل ہو تو اس سے بھی گر جائے۔ اور اگر فرشتے کی صفات کی طرف مائل ہو تو اس سے بھی بڑھ جائے۔

روح انسانی عقل اور نفس کی دو مختلف قوتوں سے مرکب ہے، جن میں سے ایک کو سیٹرنگ اور دوسرے کو انجن کہہ سکتے ہیں۔ ایک رہنمائی کے کام آتا ہے اور دوسرا تحریک پیدا کرتا ہے جہاں نفس انسانی جبلت اور حیوانی خواہشات کے پورے ہونے میں کوئی روک ٹوک نہیں رکھتا وہاں عقل ووجدان کے کنٹرول کی طاقت کم ہو جاتی ہے ایسے آزاد اور بے روک ٹوک ماحول میں نفس پر چہار طرف ہاتھ مارتا ہے اور اپنی قسمت اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی زندگی کی مہاران کے نفس اور خواہشات حُدود سے نا آشنا نفس امارہ کے ہاتھ میں پہنچ جائے تو ان کا مستقبل آشکار ہے۔ ایسے لوگ اپنی سعادت اور خوش بختی کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ انسان اپنے آپ کو بُھول کر خواہشات نفسانی کو قبلہ جان کر وہاں سجدہ کرے گا: بقول شاعر:

تابه دیو خشم و شهوت مام نفس آبستن است
عمر مارا عاقبت سوز آتشی در خرمن است
خود چه خواهی کرو باخصی که در پهلوی تو

ہر بدی راکان وہر شور دشری رامعدن است

جب تک غصّے اور شہوت کے دیو کے ساتھ نفس کی ماں حاملہ ہے۔ ہماری زندگی کو جلانے والی آگ خرمن کے اندر ہے: اس دشمن کے ساتھ تو کیا معاملہ کرے گا جو تیرے پہلو میں ہے! جو ہر بدی کی کان اور ہر شور و شر کا معدن ہے!

قرآن کی نظر میں یہ لوگ اپنے آپ کو دھوکا دینے والے، اور خود کو گمراہ کرنے والے ہیں اور یہ عمل اپنے آپ سے بدترین خیانت ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَمَا يَخْدَعُونَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ

''وہ اپنے آپ ہی کو دھوکا دیتے ہیں'' (بقرہ۔۹)

وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴿۶۹﴾

''صرف اپنے آپ کو گمراہ کرتے ہیں، جب کہ اس کا شعور بھی نہیں رکھتے۔'' (آل عمران)

(ب)۔ خدا کی یاد انسان کا قیمتی سرمایہ ہے جو اس کی سرشت میں موجود ہے۔ یہی خدا کی یا داس کے وجود کے مختلف پہلوؤ ں اور ابعاد (Dimension) کو تشکیل دیتی ہے۔ قرآن اور اسلامی احادیث میں اس کو فطری معرفت کہا گیا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ فطری خداشناسی کی حس روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ انسان بچپن ہی سے اپنے اطراف وجوانب کے اسرار جاننے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ یاد خدا فطری ہے اس کے معنی یہ ہُوئے کہ اس کی جڑیں ہمارے وجود کی گہرائیوں میں موجود ہیں۔ جیسے ہماری بہت سی جبلتیں اور داخلی میلانات ہماری خلقت کے ساتھ ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ فطری معرفت خدا بعض وجوہات کی بناء پر اپنا اثر کم کر دے۔ لیکن بالکل ختم ہرگز نہیں ہوتی۔ تجربے سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ ہم نے اس مسئلے کی تفصیل اپنی کتاب ''راہ خداشناسی میں''[1] بیان کی ہے۔

ایک دانش وراس ضمن میں کہتا ہے:

''ایمان ایک طبیعی اور فطری امر ہے۔ یہ ہمارے اندرونی احتیاجات اور احساسات کی براہ راست پیداوار ہے۔ تجربے کے طور پر دین کو سو سال تک دبائے رکھو اور پنپنے نہ دو۔ پھر اس پر دباؤ کم کر دو تو دیکھو گے کہ ایک ہی سال کے اندر وہ کس طرح پھلتا پھولتا ہے۔[2]

یہی وجہ ہے کہ خدا فراموشی اور اس کو بُھول جانا ایک طرح کی خود فراموشی ہے۔ کیونکہ یاد خدا اور (ماہرین نفسیات کے بقول) حس مذہبی، ہماری

---

[1] اس کتاب کے صفحات ۶۲ تا ۷۳ ملاحظہ کریں۔

[2] لذات فلسفہ۔ص۔۴۷۶۔

سرشت کا حصّہ ہے۔ٹھیک اسی طرح جیسے جستجو اور تحقیق کی حس بھی ہماری سرشت میں داخل ہے۔

اگر انسان سے اس کی جستجو کی حس، چھین لی جائے تو اس کی انسانی شخصیت اس سے متاثر ہوگی۔اسی طرح اگر انسان خدا کو بھول جائے تو وہ دراصل اپنی ذات اور شخصیت کو بھول جائے گا۔اس تاریک دل آدمی کی طرح ہو جائے گا جو اپنی شناخت اور پہچان کھو چکا ہو۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"من نسی الله سبحانه انساه نفسه و اعمی قلبه۔"[1]

''جو خدا کو بُھول جائے خدا اس کو خود فراموشی میں مبتلا کر دے گا اور اس کے دل سے بصیرت کو لے لے گا۔''

خدا فراموشی میں مبتلا ہونے والے دو قسم کے ہوتے ہیں:

ا۔بعض لوگوں میں زیادہ عرصہ گزرنے کی وجہ سے ان کے دلوں میں معرفت خدا کی جڑیں اس قدر کمزور ہو جاتی ہیں کہ دوبارہ شجر ایمان کا بار آور ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ

''خداوند عالم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، اب خدا شناسی کا نور ان کے دل میں نہیں اترتا اور ان کے کانوں اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، جس کی وجہ سے وہ حق بات نہیں سُن سکتے اور اس کے وجود کی آیات اور نشانیاں وہ نہیں دیکھ پاتے۔'' (بقرہ۔۷)

اا۔کچھ دوسرے لوگ ہیں کہ شیطانی وسوسوں کے زیر اثر کچھ دیر کے لیے وہ یاد خدا سے غافل ہو جاتے ہیں اور سرکشی اور گناہ میں پڑ جاتے ہیں۔مگر زیادہ دیر نہیں ہوتی کہ ایمان کی روشنی ان کے دلوں کو دوبارہ منور کر دیتی ہے۔دل کی تاریکی روشنی میں بدل جاتی ہے۔چنانچہ وہ دوبارہ خدا کی یاد سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور اس کو یاد کرنے لگتے ہیں۔قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝۲۰۱

''متقی اور پرہیزگار لوگ اگر کبھی شیطانی وسوسوں سے دوچار ہوں تو خدا کو یاد کرنے لگتے ہیں اور پھر بصیر د بینا ہو جاتے ہیں۔'' (اعراف)

---

[1] فرست غرر الحکم۔ص۔۳۸۱۔

بعض اوقات شیطانی وسوسوں پر عمل درآمد کر بیٹھتے ہیں۔ مگر دیر نہیں لگتی کہ ان کو ندامت اور پشیمانی گھیر لیتی ہے اور وہ خدا کی طرف لوٹ آتے ہیں ۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ

وہ لوگ کوئی بڑا کام کرتے ہیں یا اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں تو فوراً خدا کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کے لیے بخشش طلب کرتے ہیں۔'' (آل عمران۔۱۳۵)

امیر المومنین علیہ السلام اس آیت کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ذکر اللہ دعامة الدین و عصمة من الشیطان۔"

''یاد خدا دلوں میں دین کا مستحکم ستون اور شیطانی افکار کی پیروی سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔''

ایک دوسری آیت سے پتہ چلتا ہے کہ نماز قائم کرنے کا مقصد یاد خدا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾

''میں اللہ ہوں، میرے علاوہ کوئی خدا نہیں۔ میری عبادت کرو اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو۔'' (طٰہٰ)

ایک اور آیت میں نماز جو درحقیقت یاد خدا ہے اس کو بڑے اور قبیح کاموں سے روکنے کا ذریعہ کہا گیا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ

''جو کچھ تم پر کتاب میں سے وحی ہوئی ہے۔ اس کی تلاوت کرو، نماز قائم کرو۔ کہ نماز برائیوں اور قبیح چیزوں سے روکتی ہے۔'' (عنکبوت۔۴۵)

نماز منکرات اور محرمات سے انسان کو اس طرح روکتی ہے کہ نماز خود خدا کی یاد اور ذکر ہے اور خدا کی یاد خدا کی طرف سے جزاء اور سزا کی یاد دہانی کرواتی ہے۔ ظاہر ہے جب ثواب و عذاب اعمال نظر میں رہے تو انسان گناہ اور برائیوں سے دُور رہے گا۔

اولیاء اللہ کی نظر میں یاد خدا دراصل کمال مطلق اور جمال حقیقی اور اس کی بے چون و چرا حاکمیت کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ آمادہ نفوس کی ایسی بے پایاں قدرت کی طرف توجہ اس کی جانب کشش کا سبب ہے جو انسان ایسے کمال کی طرف متوجہ ہو وہ فحشا اور منکر کے حجاب کو اپنے اور اس کمال

مطلق کے درمیان آنے نہیں دیتا۔

اسی لیے ایک آیت میں خدا کی یاد کو دل و جان کے اطمینان و سکون کا باعث کہا گیا ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾

''یادِ خدا اطمینان قلب کا باعث ہے۔'' (رعد)

جو دل قدرت مطلق، بے چون و چرا حاکمیت اور رحمت اور رحمانیت کے سرچشمے پر بھروسہ کرتا ہو، وہ مخالف حوادث کے سامنے پریشان نہیں ہوتا، ایسی توانا اور قوی ذات کی پشت پناہی رکھتے ہوئے اپنا سکون ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

انسان کی روحانی اور مادی زندگی میں یادِ خدا کی جو اہمیت ہے، اس کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''جو بھی فرائض ہیں ان کی ایک حد مقرر ہے، جہاں پہنچ کر وہ فریضہ مکمل ہو جاتا ہے جیسے رمضان کے روزے کی ایک حد متعین ہے کہ سال میں ایک ماہ روزے رکھے جائیں۔ اس طرح حج کا فریضہ ان اعمال دارکان کا مجموعہ ہے، جو مسلمان ایام حج میں انجام دیتا ہے، بجز خدا کی یاد کے۔''

"فان الله لم يرض منه بالقليل، ولم يجعل له حدا ينتهى اليه۔"

''جس کی کم مقدار پر خداوند عالم راضی نہیں ہوتا اور اس کے لیے اس نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔''

پھر امامؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿۴۱﴾ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۴۲﴾

''اے ایمان والو! خدا کو زیادہ یاد کیا کرو اور اس کی صبح و شام تسبیح کرو۔'' (احزاب)

اب ہم خدا فراموشی جو خود فراموشی (جس کو آج کے زمانے میں انسان کے اپنے آپ سے بے گانگی، کہا جاتا ہے) کے ساتھ لازم و ملزوم ہے، اس پر گفتگو ختم کرتے ہیں، قرآن میں یاد خدا کے بارے میں جو تفصیل ہے اس کو ہم پھر کسی موقع پر پیش کریں گے۔

دو نکات کی یاد دہانی

۱۔ آج مغرب کے فلسفیانہ مکاتب میں ایک اہم بحث جاری ہے جس کو ان ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

خود سے بے گانگی، اور خود پرستی یا اپنی طرف بازگشت کہا جاتا ہے۔

غور کرنا چاہیئے کہ قرآن میں یہ دونوں اصطلاحات صاف صاف آتی ہیں۔ قرآن نے، خود سے بے گانگی کے بارے میں اس آیت میں اشارہ کیا ہے۔ جس پر گفتگو ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"فأنساهم انفسهم"

اسی طرح اپنی طرف بازگشت کے موضوع کی طرف اس موقع پر اشارہ کرتا ہے۔ جہاں حضرت ابراہیم کے بارے میں جو عدالت قائم ہوئی تھی ،اس کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

فَرَجَعُوٓا اِلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ فَقَالُوۡۤا اِنَّكُمۡ اَنۡتُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۶۴﴾

''عدالت کے فیصلہ کرنے والے، جو بُت پرست تھے ابراہیم کی بات سُننے کے بعد اپنے نفسوں کی طرف پلٹے اور کہا کہ تم ہی لوگ ظالم ہو۔'' (انبیاء)

جو لوگ لکڑی اور دھات کے بنے ہوئے بتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کی تقدیر اور بہبود انھی سے وابستہ ہے وہ دراصل اپنی انسانیت کر فراموش کو بیٹھے ہیں اور عقل وخرد سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، مگر جب خدا شناسوں کے محکم دلائل کے سامنے عاجز ہوجاتے ہیں تو حقیقی فطرت انسانی کی طرف جس سے سالہا سال دور رہے ہوتے ہیں لوٹ آتے ہیں اور اس بات کا احساس کرتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے برسا برس ایسے خیالات میں زندگی بسر کی ہے، کہ جن کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے نہ وہ طبع انسانی سے مطابقت رکھتے ہیں۔

قرآن اس بیداری کو فطرت کے مطابق سمجھتا ہے اور اس کو اپنی طرف بازگشت کہتا ہے:

فَرَجَعُوٓا اِلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ

''وہ اپنی فطرت سلیم اور عقل کی طرف لوٹے۔''

۲۔ مارکسزم، انسان مسلک، اور خود کی طرف جھکاؤ، یعنی (Humanism) کا قائل ہے۔ مارکس کا کہنا ہے کہ:

''انسان کا مال ودولت اور خدا سے لگاؤ اس کو اپنے سے بے گانہ کر دیتا ہے، کیونکہ وہ ایسی چیزوں سے دل لگالیتا ہے جو اس کی ذات سے خارج اور جدا ہیں، چنانچہ اقتصادی خود فراموشی اور مذہبی خود فراموشی سے چھٹکارا پانے کے لیے خصوصی ملکیت اور خدا اور مذہب سے وابستگی ختم ہوجائے۔ اس طرح انسان خود فراموشی سے نکل کر خود اپنی طرف واپس آجائے گا۔''

مارکس کے نظریے پر تنقید کی فی الحال گنجائش نہیں۔ اس وقت ہم صرف دو نکات کا ذکر کرتے ہیں:

اوّل یہ کہ مارکس انسان اور انسانی معاشرے کی ارتقاء کو پیداوار کے آلات کی ترقی پر منحصر سمجھتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ پیداوار کے وسائل کی لازمی پیش رفت کے ساتھ جو ارتقاء کی بنیاد ہے انسان اور معاشرہ بھی ارتقاء اور نشوونما سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اس نکتے پر غور کرنا چاہیے کہ وہ مکتب فکر جو انسانی ارتقاء کا حامل انسان کے اندر تلاش نہیں کرتا، بلکہ اس کی ذات سے خارج کسی چیز کو اس کی ارتقاء کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ کس طرح (Humanism) اور انسانی مسلک کا دم بھر سکتا ہے؟

دوسرے یہ کہ ذاتی ملکیت اس وقت خود فراموشی کا سبب بنتی ہے، جب مال ودولت حاصل کرنا ہی مقصد بن جائے اور اسی کو محض زندگی گزارنے کا

وسیلہ سمجھا جائے۔ اگر ایک فقیر اپنے معمولی لبادہ سے تعلق پیدا کرے تو وہ بھی اپنے آپ سے بیگانہ ہو جائے گا اس کے برعکس ایک مالدار آدمی اپنی دولت کو بس وسیلہ اور ذریعہ سمجھے اور دنیا کو ٹھہرنے اور قیام کی جگہ کے بجائے گزرگاہ سمجھے تو وہ سو فیصد زاہد اور اپنی حیثیت کو یاد رکھنے والا شمار ہوگا ۔اس لیے کہ اس نے اپنے مال دولت کو سردی گرمی سے بچنے اور بھوک و پیاس دور کرنے کا وسیلہ جانا ہے۔

خدا اور مذہب سے وابستگی ایک دوسری بحث ہے۔اس لیے کہ غیر سے ہر قسم کا لگاؤ اور رغبت قابل مذمت اور باعث تنزل نہیں ہوتا۔بعض اوقات غیر سے اور اپنے سے برتر اور کامل تر سے وابستگی ترقی اور ارتقاء کا سبب بنتی ہے۔جیسے شاگرد کا استاد سے لگاؤ۔

انسان کا خدا سے تعلق فقر مطلق کا غنائے مطلق سے اور نقص محض کا کمال محض سے تعلق ہے۔اس رشتے اور تعلق کو بھی مذہبی خود فراموشی نہیں کہا جا سکتا۔[1]

استاد عالی قدر حضرت علامہ طباطبائی نے یہ اشعار ایک دن مولف کے سامنے پڑھے۔ان کا مضمون اس گفتگو سے مطابقت رکھتا ہے۔اس لیے یہاں کیے جاتے ہیں۔

مہر خوباں‌دل ودیں ازہمہ‌بی پروا برد
رخ شطرنج نبرد آنچه رخ زیبابرد
تو پسندار که مجنون،سر خود مجنونشد
ازسمک ،تابه سماء کش ،کشش ،لیلیٰ برد
من به سرچشمه خورشید نه خود بردم راه!
ذره ای بودم و عشق تو مرا بالا برد
خم ابردی تو برد ،وکف مینوی تو بود
که دراین بزم بگر وید و دل شیدا برد

اچھوں کی محبت ہر چیز سے بے پرواہ کر کے دل اور دین دونوں لے گئی۔شطرنج کا رُخ وہ نہ لے جا سکا جو خوبصورت چہرہ لے گیا۔تو یہ خیال نہ کر کہ مجنوں خود بخود مجنوں ہو گیا تھا۔اس کو لیلیٰ کی کشش زمین سے آسمان تک لے گئی۔ مجھے خود سے سرچشمہ خورشید تک راہ نہیں ملی۔ میں تو ایک ذرہ تھا تیرا عشق مجھے بالا لے گیا۔ تیرا خم ابرو تھا اور تیری بلوریں ہتھیلی تھی۔جس نے اس بزم میں گردش کی اور شیدا کا دل لے گئی۔

---

[1] مذہبی میلانات کے سلسلے میں مارکسزم کے دعوی کی بے مائگی کے بارے میں مزید آگاہی کے لیے کتاب، مارکسیم و مذہب، صفحات ۔۱۶ تا ۲۰ ملاحظہ فرمائیں۔

قرآن کا دائمی منشور 2

اُنیسواں اصول

قرآنی قصّے اور انسانی اصلاح

لَقَدۡ کَانَ فِیۡ قَصَصِہِمۡ عِبۡرَۃٌ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ؕ

''گذشتہ اقوام کے واقعات میں صاحبانِ عقل کیلئے عبرت ہے۔''

(یوسف۔۱۱۱)

لَقَدۡ کَانَ فِیۡ قَصَصِہِمۡ عِبۡرَۃٌ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ؕ

”گذشتہ اقوام کے واقعات میں صاحبان عقل کیلئے عبرت ہے۔“

(یوسف۔۱۱۱)

قرآنی قصّے بہت دلچسپ بھی ہیں اور اپنے اندر اصلاح کا پہلو بھی رکھتے ہیں۔لوگوں کی صاف کھلے الفاظ میں تنقید اور ان کے عیوب کی نشان دہی بعض اوقات سودمند ہوتی ہے۔مگر بعض موقعوں پر فائدہ نہیں دیتی۔ بلکہ اس کے برعکس نتیجہ نکلتا ہے۔کچھ لوگ اپنے اعمال و کردار سے اس طرح مطمئن ہوتے ہیں کہ وہ سچی بات اور حقیقی تنقید برداشت نہیں کر سکتے۔ان کا کہنا یہ ہے کہ تنقید بے شک اچھی چیز ہے۔لیکن اگر دوسروں پر کی جائے۔چنانچہ اس مزاج والوں کے لیے جو سرکش طبیعت کے مالک ہوتے ہیں اور امر و نہی کو قبول نہیں کرتے۔بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان سے حدیث دیگران بیان کی جائے۔

گذشتہ قوموں کی عبرت ناک داستانیں جو دراصل آج کے بعض ان قصوں کے سننے والوں کی خود کی کیفیت بیان کرتی ہیں۔اس کڑوی دوا کے مانند ہوتی ہیں،جن پر چینی لپیٹ دی گئی ہو،تاکہ دوا کی تلخی محسوس نہ ہو۔

دوسروں کے بارے میں کڑوی اور تکلیف دہ باتوں کی ضرب چونکہ خود پر نہیں پڑتی اس لیے سننے والے کا ردعمل بھی تیز نہیں ہوتا۔عین ممکن ہے کہ واقعات کی حقیقت اور معنویت شعور اور لاشعور کو جھنجھوڑ کر انسان کے ضمیر کو بیدار کر دے۔

قرآنی قصّوں میں تربیت کے انداز کے کچھ خاص رُخ ہیں جن کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) قرآن میں جو قصّے بیان ہُوئے ہیں ان کے کردار خیالی اور فرض نہیں ہوتے بلکہ حقیقی ہوتے ہیں

آج جو فرضی کہانیاں ناول اور افسانے کی صورت میں چھپتے اور پڑھے جاتے ہیں وہ اگر نقصان دہ نہ بھی ہوں اور گمراہ نہ بھی کرتے ہوں، پھر بھی ان میں حقیقی قصّوں کا تربیتی اثر نہیں ہوتا۔سبھی جانتے ہیں کہ یہ خیالی اور گھڑے ہُوئے قصّے ہیں۔ناول نویس اپنی بھرپور کوشش کرلے کہ جو کچھ اس نے بیان کیا ہے، وہ حقیقی ہے۔مگر پڑھنے والا خوب جانتا ہے کہ یہ حقیقت سے واسطہ نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس کا اثر بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔

ان فرضی داستانوں کے ہیرو اگر بُرا کردار بھی رکھتے ہوں، پھر بھی وہ لوگوں کے لیے اچھے ماڈل اور نمونے نہیں بن سکتے۔ پڑھنے والا یقین نہیں رکھتا کہ یہ سب کچھ حقیقی ہے۔ بلکہ اس کی نظر میں یہ سارے اتفاقات مصنف کے خیال کی پیداوار ہیں جن کا سرچشمہ اس کے تصورات ہیں۔

اس کے برعکس قرآن کے قصص کا منبع تلخ و شیریں واقعات اور خالص حقائق ہیں۔حقیقی واقعات ہیں جنھوں نے الفاظ کا جامہ پہن لیا ہے۔

قرآن اس نکتے کا کئی جگہ اشارہ کرتا ہے۔مثلاً حضرت یوسفؑ کے قصّے کے آخر میں کہتا ہے:

مَا کَانَ حَدِیۡثًا یُّفۡتَرٰی وَلٰکِنۡ تَصۡدِیۡقَ الَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡہِ

''یہ بناوٹی بات نہیں، بلکہ ان کتابوں کی تصدیق ہے جو قرآن سے پہلے تھیں۔ (یُوسف۔۱۱۱)

اگر تاریخ زندگی کی سب سے بڑی آزمائش گاہ ہے تو قرآن کے سچّے قصّے زندگی کی سب سے زیادہ اثر آفریں اور معتبر ترین تجربہ گاہ(Laboratorty) ہے جو ہم کو دُنیا کی قوموں اور معاشروں کے حقیقی کردار اور رفتار سے آشنا کرتی ہے۔

(ب)۔قرآن جب اپنے قصّے بیان کرتا ہے تو اس کے سامنے اعلیٰ مقاصد ہوتے ہیں۔وہ چاہتا ہے کہ اس ذریعے سے انسانی معاشرے کو فلاح درستگاری یا شقاوت و بدبختی کے اسباب سے آشنا کرے۔ان داستانوں میں غورو مطالعہ سے بآسانی یہ اسباب نگاہ میں آسکتے ہیں۔

قرآن میں قدیم ترین واقعہ شیطان کو حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کا ہے۔اس قصے کے اصلاحی اور تربیتی پہلو سب پر عیاں ہیں۔جدید ترین داستان قرآن میں ہاتھوں کے لشکر سے متعلق ہے۔جس میں عمدہ اجتماعی اور اعتقادی نکات پنہاں ہیں۔

اگر کبھی ایک واقعے کو قرآن میں بار بار دہرا گیا ہے تو وہ اس واقعے کے مختلف پہلوؤں اور نئے نکات کو پیش کرنے کے لیے ہے یا کبھی ایسی ضرورت ہوتی ہے کہ اس قصّے کو ایک بار پھر بیان کیا جائے۔

یہ آسمانی کتاب گذشتہ قوموں کی زندگی کی سرگزشت پیش کرنے اور انبیاء کی جدوجہد اور جہاد کے واقعات بیان کرنے میں ایک خاص انسانی اور اجتماعی مقصد پیش نظر رکھتی ہے، جو ذرا سے غورو وض سے واضح ہو جاتا ہے۔

قرآن عشق درد مان اور جاسوسی کے قصوں کو پیش کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔بیان میں ایسی عفت و پاکیز گی ملحوظ رکھتا ہے کہ اگر گفتگو جنسی اور عشقی مسائل تک پہنچ جائے،تب بھی اصول عفت سے ہلکا سا انحراف بھی نہیں ہو پاتا۔

آج کے دور میں لکھنے والے اس کوشش میں رہتے ہیں کہ چہرے کی خوبصورتی کو زیادہ سے زیادہ بیان کریں۔آبرو باختہ کردار پیش کریں۔ہیرو کے چوڑے چکلے سینے کا ذکر کریں اور پولیس اور جرائم کے قصّوں میں مجرم کے فرار کی سرگزشت پیش کریں ان میں پولیس کے جال میں نہ پھنسنے کی تربیت دی جاتی ہے۔تاکہ مجرم اپنے جرائم کو ایسا چھپائے کہ سزا سے بچ سکے۔قرآن ایسے قصّوں کے پاس بھی نہیں جاتا کہ جن سے برائی کی ترویج ہو۔اس آیت میں غور کرنے سے قرآن کے بیان کی متانت اور عفت کا اندازہ ہوتا ہے:

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ ۖ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٣﴾

''اس خاتون نے یوسف جس کے گھر میں تھے ان سے اصرار سے خواہش کی اور تمام دروازے بند کردیئے اور کہنے لگی جلدی آؤ اس چیز کی طرف جو تمھارے لیے مہیا کی گئی ہے۔یوسفؑ نے کہا اس کام سے میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔عزیز مصر ہمارا بزرگ اور مالک ہے جس نے مجھے عزت دے رکھی ہے۔ظالم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے'

(یوسف۔۲۳)

اب ہم اس آیت کے نکات کا ذکر کرتے ہیں:

ا۔لفظ 'اراودت'،عربی زبان میں ایسی درخواست کو کہتے ہیں جس پر بہت اصرار کیا گیا ہو۔اس لفظ سے اندازہ ہوتا ہے عزیزمصر کی بیوی اپنی درخواست میں بہت اصرار کرتی تھی۔لیکن بیان میں متانت اور عفت اس طرح برقرار رکھی گئی کہ اصرار کا جوموقع ہے،یعنی جنسی خواہش کا پورا کرنا اس سے بچا گیا۔

۲۔اصرار کرنے والی کا نام کہیں نہیں لیتا۔یہ نہیں کہتا کہ زلیخا یا عزیزمصر کی بیوی نے یوسفؑ سے اصرار کرتے ہُوئے درخواست کی، بلکہ اس کو ''التی هو فی بیتها'' سے تعارف کرواتا ہے۔یعنی وہ خاتون جس کے گھر میں حضرت یوسفؑ رہتے تھے۔یوسفؑ پر اصرار کرنے والی کا تسلط تھا۔یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پامردی اور استقامت کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔غلقت الابواب،اس نے دروازے بند کر دیئے کا جُملہ عشق کی خلوت گاہ کی تصویر کشی کرتا ہے۔مگر ڈھکے چھپے الفاظ میں۔

۴۔قالت هیت لك۔آؤ اس چیز کی طرف جو تمھارے لیے آمادہ ہے کا جُملہ وہ انتہائی ترغیب ہے۔جو وہ عورت حضرت یوسف سے وصال کے لیے کہتی ہے۔مگر اس میں متانت اور سنجیدگی کا اندازہ ایسا ہے کہ تحریک ہیجان سے خالی ہے۔

اس آیت اور اس سورہ کے دوسرے جملے بھی متانت اور سنجیدگی لیے ہُوئے ہیں تا کہ گفتگو کی عفت اور پاکدامنی اپنی جگہ قائم رہے۔

(ج)۔قرآن میں درج قصّوں کی تیسری خوبی ان کے اصلاحی پہلو ہیں۔یعنی ان کے ذریعے عبرت پذیری اور زندگی کے لیے گونا گوں درس و تعلیم کے مواقع مہیا ہوتے ہیں۔بعض اوقات ایک ہی داستان جیسے حضرت یوسفؑ کے قصّے میں چالیس درس عبرت ہیں۔اس وقت ان میں سے صرف ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اس قصّے میں غور کرنے سے ہم پر ایک اہم حقیقت واضح ہوتی ہے کہ راہ خداوندی سارے شیطانی منصوبوں سے قوی اور بالا ہے۔جب کوئی شخص اپنے ساتھی انسان کی نابودی کے لیے تدبیریں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسی تدبیر کو اس شخص کی ترقی کا وسیلہ بنا دیتا ہے،جس کی نابودی کے منصوبے ہو رہے ہوتے ہیں۔

حضرت یوسف کے بھائیوں نے ان کو کنوئیں میں ڈالا اور چند درہم کے عوض ان کو فروخت کر دیا۔[1] مگر یہی بات یوسفؑ کی کامیابی کا وسیلہ بن گئی اور انہوں نے عزیزمصر کے بڑے بڑے محلوں میں نعمت فراوان میں پرورش پائی۔پھر زلیخا نے ان پر الزام لگایا اور قید خانے میں ڈلوا دیا۔لیکن وہی زندان ان کے اعلیٰ منصب کا سبب بنا اور وہ فراعنہ مصر کے مُلک کے امین بن گئے۔[2]

برادران یُوسف ان کی خون آلود قمیص باپ کے پاس لے آئے جس کو دیکھ کر وہ بہت پریشان ہُوئے۔ان کو اس کا اتنا غم ہوا کہ اپنی بینائی تک کھو

---

[1] سورۂ یوسف۔۱۵۔۲۰

[2] سُورہ یوسف۔۵۴۔۵۶

بیٹھے۔[1] مگر ایک موقع پر حضرت یوسف کا پیراہن ہی حضرت یعقوب کی بینائی واپس آ جانے کا سبب بنا۔[2]
گویا ایک سکے کی طرح دنیا کے مادی وسائل کے دو رخ ہوتے ہیں۔ اگر شیطان صفت لوگ اس کے ایک رُخ سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو ارادہ خداوندی اس کا اثر ختم کر کے ان کے وسائل کا دوسرا رُخ ظاہر کر دیتا ہے۔
(د) قرآن جس موضوع پر بات کرتا ہے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اس سے متعلق بڑے بڑے کردار پیش کرے جو اس موضوع میں نمونہ کہلا سکیں۔ مثلاً خداوند عالم جب چاہتا ہے کہ دُنیا کے ظالموں جابروں کا ذکر کرے کہ ارادہ خداوندی نے کس طرح ان کی ناک رگڑوادی تو وہ دُنیا کے سب سے بڑے صاحب اقتدار کی بات کرتا ہے اور فرعون و نمرود کے حالات کو پیش کرتا ہے، جو خدائی کا دعوٰی کرتے تھے۔ فرعون کہتا تھا:

"انا ربکم الاعلیٰ۔"[3]

''میں تمھارا اعلیٰ رب ہوں۔''

چھوٹے بچوں کو قتل کرتا تھا اور عورتوں کو قیدی بناتا تھا۔[4] سرزمین مصر کا مالک ہونے، ملک میں دریائے نیل اور نہر اور نہروں کے جال اور بھرے ہُوئے خزانوں پر فخر کرتا اور اپنی قوم اور درباریوں کو استعماری انداز فکر کی دعوت دیتا۔[5]
دوسرا نمرود بھی الوہیت کا دعوٰے کرتا تھا۔ اور اس زعم میں تھا کہ وہ زندہ کر سکتا ہے اور مار سکتا ہے اور تاریخ انبیاء کے مطابق پیغمبر خدا حضرت ابراہیمؑ کو اس نے آگ میں زندہ پھینکا تھا۔
جب قرآن عقل اور نفس کی کشمکش کا ذکر کرتا ہے اور ان دو انسانی قوتوں کی جنگ کی منظر کشی کرنا چاہتا ہے تو حضرت یوسفؑ اور زلیخا کا قصہ پیش کرتا ہے جو عقل و نفس میں کشمکش کا واضح نمونہ ہے۔
اور جب قرآن چاہتا ہے کہ پرہیز گار خواتین کا اعلیٰ نمونہ پیش کرے تو حضرت مریم بنت عمران کی زندگی کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ جنھوں نے حضرت زکریاؑ جیسے عظیم الشان پیغمبر کی زیر نگرانی پرورش پائی تھی۔[6] قرآن کئی موقعوں پر ان کے انسانی فضائل اور اخلاقی خوبیوں کا ذکر کرتا ہے۔ ان کو اپنے دور کی افضل ترین خاتون قرار دیتا ہے۔[7]

---

[1] سورہ یوسف ۸۴۔
[2] سورہ یوسف ۹۳۔
[3] النازعات۔ ۲۴۔
[4] يُذَبِّحُ أَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيِ نِسَآءَهُمْ ؕ
[5] زخرف۔ ۵۱ تا ۵۴ دیکھیں۔
[6] آل عمران۔ ۳۷۔
[7] آل عمران۔ ۴۲۔

قرآن کی ایک سورہ ان کے نام سے موسوم ہے۔[1]

عورتوں کو راہ حق میں ایثار اور قربانی کی حوصلہ افزائی کے لیے اور زندگی کے پُرفریب مظاہرے سے ان کی نظریں ہٹانے اور جاہ جلال کو ٹھوکر مارنے کی ترغیب دینے کے لیے ایک خدا کار خاتون کا مختصر مگر پُر مغز تذکرہ کرتا ہے اس خاتون نے معنویت اور دینی عقیدے کی راہ میں باقی ہر چیز کو ٹھکرا دیا اور مقدس مقصد کی خاطر اپنے لیے موت کو آسان سمجھا۔

یہ ایثار و قربانی کا نمونہ خاتون، مصر کی ملکہ آسیہ ہیں جو فراعنہ کے دربار کے جاہ و حشم کی مالک تھیں۔ مگر جب انھوں نے اپنے مادی جاہ جلال کو اپنی مقدس آئیڈیالوجی اور خدا پرستی کے عقیدے کے راستے میں حائل دیکھا تو ان ساری چیزوں کو چھوڑ کر خدا کی طرف متوجہ ہوئیں اور دُعا کی کہ ان سب کی جگہ پرودگار عالم ان کو جنت میں گھر عطا کرے اور فرعون اور اس کے ظالم ساتھیوں سے نجات دے۔[2]

جب قرآن چاہتا ہے کہ ذہین اور باصلاحیت خواتین کا نمونہ پیش کرے تو ملکہ سبا کا واقعہ پیش کرتے ہُوئے فرماتا ہے:

''وہ ایسی عورت تھی جو ساری مادی اور معنوی نعمتوں سے مالا مال تھی۔[3] اس کی ذہانت کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے حضرت سلیمانؑ کے خط کا جواب دینے کے لیے مجلس شورٰی بلائی۔ خودرائی اور مطلق العنانی کے طور پر جواب میں جلد بازی نہیں کی۔ ایسے اجتماع میں جہاں بڑی شخصیتیں جمع تھیں اس نکتے کو بیان کیا کہ میں کسی بھی موضوع میں بغیر تمھارے مشورے، تصدیق اور گواہی کے اٹل کرتی۔[4]

غلط تربیت اور بُرے لوگوں کی صحبت کے نتائج کو اجاگر کرنے کے لیے قرآن تاریخ کی گمراہ عورتوں کی مثال پیش کرتا ہے۔

یہ عورتیں آخرکار خدا کے غضب سے دوچار ہوئیں وہ خدا کے رسولوں کی بیویاں ہونے کے اعزاز سے سرفراز تھیں۔ مگر غلط تربیت اور غیر پسندیدہ اور گمراہ لوگوں کی صحبت کے زیر اثر نور نبوت بھی ان کے دلوں کو روشن نہیں کر سکا۔ حالانکہ اس نے ان کے ماحول کو بے شک نورانی کیا ہوا تھا۔ مگر یہ عورتیں خواہشات کی قید دہوس کی غلامی سے آزاد نہ ہو سکیں حتٰی کہ انھوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی اور خود اپنی خیانت کی آگ میں جل مریں۔[5]

قرآن ایسی متضاد شخصیتوں کی زندگی کے نمونے پیش کر کے یہ بتانا چاہتا ہے کہ یہ عورت کی فطرت ہی میں نہیں کہ وہ انسانیت کے بلند مقام تک جا پہنچے یا پھر اس قسم کے گڑھے میں گر جائے، بلکہ یہ تربیت اور صحبت کے صحیح یا غلط ہونے پر بھی منحصر ہے کہ ایسی مختلف شخصیتیں وجود میں آئیں۔

انسانی معاشرت کی تربیت اور اصلاح کرنے والوں کو یہ راستے نشاندہی کرتے ہیں کہ ہر جگہ ہر زمانے میں اور ہر قسم کے حالات میں عورتوں کے

---

[1] سورۂ مریم۔ قرآن کی ۱۹ ویں سُورت۔

[2] اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ وَنَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝۱۱ (تحریم)

[3] وَاُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ (نمل ۲۳)

[4] مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰی تَشْهَدُوْنِ ۝۳۲ (نمل ۳۲)

[5] سورۂ تحریم۔ آیت ۱۰، جیسا کہ فرمایا۔ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا وَّقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ ۝۱۰

طبقے میں پرہیز گار ایثار کرنے والیاں اور باتدبیر اور ذہین خواتین معاشرے کو میسر آسکتی ہیں اور انسانی معاشرے کا یہ دوسرا رُکن لامتناہی کیفیات کا حامل ہے، جس سے مختلف شخصیات وجود میں آسکتی ہیں۔

قوموں کی تاریخ کے مطالعہ کی حدود

آج کے دور میں تاریخ دانوں کے نقطہ نگاہ سے قوموں کی تاریخ کا مطالعہ مادی رُخ اختیار کر گیا ہے اور محققوں کی تاریخ سے وابستگی یہ رہ گئی ہے کہ وہ دُنیا کی قوموں کی زندگی کے صرف سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی پہلوؤں کو اہمیت دیں حالانکہ گذشتہ قوموں کے اخلاقی اور دینی پہلو خود اپنی جگہ بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

بلاشبہ اخلاقی پہلو اور دینی احکام کو اہمیت دیئے جانے کو قوموں کی سرنوشت سے براہ راست تعلق ہے۔ وہ لوگ جو اصول اخلاقی اور ضوابط دینی کے پابند ہیں، وہ وسیع رحمت خداوندی کے سائے میں رہتے ہیں۔ مجرموں اور گناہ گاروں کو انجام اس کے بالکل برعکس ہے۔ چنانچہ رحمت خداوندی اور اس کا قہر و غضب محض قوموں کے خوب یا بداعمال اور رفتار و کردار کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ قرآن نے اسی نکتے پر انگلی رکھی ہے کہ باشعور دل اور عبرت حاصل کرنے والے ذہن اس طرف متوجہ ہوں جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٦٩﴾ [1]

''کہیں کہ زمین میں چلو پھرو اور مجرموں کے انجام کو دیکھو۔'' (نمل)

معاشرے کی تاریخ جو انسان کو حرکت عطا کرتی ہے وہ کتاب ہے، جہاں قوموں کی زندگی کے سارے رُخ اور پہلو لکھے جاتے ہیں۔

تاریخ محض سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی زاویہ نگاہ پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ اخلاقی امور اور احکام الٰہی کی اطاعت یا اس سے سرکشی کو بھی قوموں کی زندگی کی بنیاد ٹھہراتی ہے۔ ان پہلوؤں میں تبدیلی سے سرنوشت بھی تبدیل ہو جاتی ہے اور تاریخ کا راستہ بدل جاتا ہے۔

جنگ عظیم دوم کے شروع میں فرانس کی فوجی شکست لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث بنی اور تعجب کا سبب ہوئی کہ ایک ترقی یافتہ قوم جو سائنس اور صنعت کا گہوارہ تھی کس طرح نازیوں کے حملے کے نتیجے میں چند دنوں ہی کے اندر ہتھیار ڈال بیٹھی۔ اس پر غور کیا گیا تو پتہ چلا کہ ایک قوم کی اخلاقی پستی اس کی سیاسی اور فوجی شکست کا پیش خیمہ بنی کہا جاتا ہے کہ جب فرانس کے صدر نے نازی فوجوں کے مقابلے میں حملے یا دفاع کا حکم دینا چاہا تو اس کی شوخ و شنگ معشوقہ نے جو درحقیقت نازیوں کی جاسُوس تھی اپنے نازنخروں سے اس کی توجہ اس کی بھاری ذمہ داریوں سے ہٹا دی

---

[1] یہی مضمون ایک حد تک سورہ نحل کی آیت ۳۶ میں بھی آیا ہے۔

نبوت کا گواہ اور رسالت کی برہان

عہد نامہ قدیم وجدید میں انبیاء اور گذشتہ قوموں کی جو تاریخ ہے ان میں واضح تحریفات اور غلطیاں نظر آتی ہیں۔قرآن کے قصص ان کتابوں کی غلطیوں کو آشکار کرتے ہیں۔اسی کے نتیجے میں قرآن اپنے آسمانی کتاب ہونے پر گواہ ہے۔

عصر حاضر میں ''فقہ مقارن'' کے نام سے ایک فقہ ہے اور ''حقوق تطبیقی'' کے نام سے حقوق کا سلسلہ موجود ہے۔جہاں ایک فقہ کا موازنہ دوسری فقہ سے اور کچھ حقوق کا دوسرے حقوق سے مقابلہ کر کے دو مکاتب فکر کے کمزور اور مضبوط نکات معلوم کیے جاسکتے ہیں اس طریقے سے دونوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اگر دو مکاتب فقہی مختلف ادوار سے تعلق رکھتے ہوں تو ایک فقہ پر قدیمی فقہ کے اثرات ہونے یا اثرات کے نہ ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اگر حقوق انسانی کا ایک محقق حقوق اسلام کا اس زمانے میں ایران اور روم میں رائج حقوق سے موازنہ کرے تو بآسانی فیصلہ کرسکتا ہے کہ اس زمانے کے معاشرے کے قوانین نے قوانین اسلامی کو متاثر نہیں کیا تھا اور ان سے کوئی بھی چیز مستعار نہیں لی گئی تھی۔چنانچہ ان دونوں میں اس قدر تفاوت اور دوری ہے کہ مشکل ہی سے دونوں میں کوئی قدر مشترک مل سکے گی۔

ٹھیک اسی طرح قرآنی قصص کا موازنہ عہد عتیق اور عہد جدید میں درج داستانوں سے کیا جا سکتا ہے۔اور پتہ چل سکتا ہے کہ قرآن نے گذشتہ پیغمبروں اور امتوں کے بارے میں توریت اور انجیل سے کچھ نہیں لیا۔بلکہ ان میں اس قدر خصوصاً پیغمبروں کی صفات کے بارے اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اصلی کتاب ہے اور باقی اس کی نقل اور کاپی ہے۔اگر یہ نظر آئے کہ قرآن کے جو قصّے ہیں ان کا ذکر توریت اور انجیل میں بھی ملتا ہے تو وجہ یہ ہے کہ موضوع سخن تو تینوں کتابوں میں بہر حال ایک ہے۔

اس کے علاوہ توریت وانجیل ایسی آسمانی کتابیں ہیں کہ جن میں ہر ہر موضوع میں تحریف نہیں کی جاسکی۔بعض مضامین میں احبار کی خیانت کی وجہ سے تحریفات ہوئی ہیں۔چنانچہ ان میں بعض مشترک چیزیں موجود ہیں اور بعض ایسے رُخ ہیں کہ دونوں میں فرق کیا جا سکتا ہے۔مشترک باتیں تو معلوم ہیں۔جو فرق ہے وہ ان ہی گھڑے ہُوئے افسانوں کی وجہ سے ہے جن سے یہ دونوں کتابیں بھری پڑی ہیں۔مگر قرآن اس سے ذرا متاثر نہیں ہوا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ قرآن کے معجزہ ہونے کا ایک ثبوت اس کے یہی قصص اور داستانیں ہیں۔ایک اُمی شخص جس نے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا ایسے ماحول میں جہاں ان قصوں کا چرچا بھی نہیں تھا اور نہ وہ خود اور نہ اس کے ارد گرد کے لوگ ان واقعات سے واقف تھے،غیبی مدد کے بغیر ناممکن تھا کہ انبیاء اور گذشتہ قوموں کے احوال جو عقل قبول بھی کرے اور انبیاء کے شایان شان بھی ہوں (نہ کہ افسانہ اور گھڑی ہوئی باتیں ہوں) کوئی شخص ان کو مربوط شکل میں ''احسن القصص'' یا حدیث دیگراں کے طور پر بیان کرے۔

یہ جو ہم نے کہا کہ خرافات اور گھڑی ہوئی باتوں سے قرآن پاک ہے تو اس کی وجہ یہ ہے عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید میں انبیاء کے واقعات

اوران کا کردار اس طرح افسانہ گوئی سے دوچار ہوا ہے، کہ عقل تسلیم نہیں کرتی کہ یہ باتیں انبیاء سے منسوب بھی کی جاسکتی ہیں۔

یہی کافی ہے کہ آپ عہد نامہ عتیق میں حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیم، حضرت لوطؑ، حضرت یعقوب، حضرت داؤداور حضرت سلیمان کے قصوں کو پڑھیں اور پھر جو کچھ قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے اس سے مقابلہ کریں۔ پھر خود ہی فیصلہ کرلیں کہ ان میں سے کون سی کتاب آسمانی ہوسکتی ہے اور کس کے مضامین اور مطالب عقل کے مطابق ہیں۔

خدا توریت میں حضرت آدم علیہ السلام کو (نعوذ باللہ) ایک جھوٹا شخص، حضرت نوح علیہ السلام کو شراب خور، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی بیوی سے لاپرواہ، حضرت لوط علیہ السلام کو خود اپنی بیٹی سے گناہ آلودہ، حضرت یعقوب علیہ السلام کو مکار اور حیلہ جو، حضرت داؤد علیہ السلام کو ایک سفاک خون بہانے والا جو کسی کی بیوی کو حاصل کرنے کے لیے اس کو قتل کردیتا ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک بُت پرست کے طور پر پیش کرتا ہے۔[1]

اس کے برعکس قرآن ان برگزیدہ بندوں کو انسانیت کا نچوڑ معصوم اور گناہ سے پاک ہستیاں گردانتا ہے، جو عمدہ صفات اور فضائل اخلاق کی حامل تھیں۔ اس بحث کی تفصیل آپ کتاب برہان رسالت، میں مطالعہ فرماسکتے ہیں۔

---

[1] بیشک حقیقی توریت اور انجیل اور دوسری آسمانی کتب جو خدا کی طرف سے اپنے پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔ ان خرافات اور گھڑی ہوئی باتوں سے مبرا تھیں، جن کا اوپر ذکر ہوا اور آسمانی کتب ہیں جن میں تحریف کی گئی ہے۔

قرآن کا دائمی منشور 2

بیسواں اصول

قرآن میں

قلب اور فؤاد

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٨﴾

''اور اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے یوں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے البتہ تمھیں کان آنکھیں اور دل عطا کیے کہ شاید تم شکرگزار ہو جاؤ''(نحل)

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

''اور اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے یوں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے البتہ تمھیں کان آنکھیں اور دل عطا کیے کہ شاید تم شکر گزار ہو جاؤ''(نحل)

قرآن میں لفظ ''قلب'' اپنے سارے صیغوں اور مشتقات کے ساتھ ۱۳۲ مرتبہ اور فؤاد جس کو کسی حد تک لفظ ''قلب'' کا مترادف اور ہم معنی سمجھا جاتا ہے، اپنی مختلف شکلوں میں ۱۶ مرتبہ آیا ہے۔

''قلب'' عربی زبان کا لفظ ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے فارسی الفاظ کی طرح مستعمل ہو گیا ہے۔

''قلب'' کے اصلی معنی انقلاب اور دگرگونی ہے۔ اگر انسانی جسم میں اس عضو کو (جو سینے میں بائیں طرف خون کی گردش جاری رکھتا ہے) قلب'' کہتے ہیں تو اس لیے کہ یہ ہر وقت حرکت اور دگرگونی کی کیفیت میں ہے اور اپنی منظم حرکت سے انسانی حیات کی تنظیم کرتا ہے۔

ڈاکٹروں کی زبان میں ''قلب'' سے مراد بیضوی شکل کا وہ عضو ہے جو زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مگر قرآن میں یہ لفظ مختلف النوع معانی میں استعمال ہوا ہے۔ ان معانی کے سلسلے میں ہر ایک کے لیے ہم ایک آیت سے استدلال کریں گے۔

ا۔ وہ گوشت کا ٹکڑا جو سینے کے بائیں جانب واقع ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾

''کافروں کی وہ آنکھیں جو ان کے سر میں ہیں۔ اندھی نہیں ہیں بلکہ وہ دل جو ان کے سینے کے اندر ہیں وہ اندھے ہیں۔''(حج)

قرآن اس ''قلب'' (دل) کو جو سینے میں دھڑکتا ہے، کس طرح اندھا قرار دیتا ہے اس کی ایک وجہ آپ حاشیہ میں پڑھیں گے۔[1]

۲۔بعض اوقات قرآن اس لفظ کو عقل اور قوائے مدرکہ کے لیے استعمال کرتا ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ہُوَ شَہِیۡدٌ ﴿۳۷﴾

''اس واقعے میں ان لوگوں کے لیے جو قلب (عقل) رکھتے ہیں اور حضور قلب کے ساتھ کان دھرتے ہیں، ذکر اور یاددہانی ہے۔'' (ق)

یہ تو ظاہر ہے کہ یہاں قلب سے مراد وہ گوشت کا عضو نہیں۔کیونکہ پھر یہ نہیں کہا جائے گا کہ اگر وہ قلب رکھتا ہو۔سارے ہی انسان یہ عضو رکھتے ہیں۔چنانچہ قرآن کی لغت لکھنے والے ''قلب'' کو ''عقل خرد، علم اور فہم کے معنی میں لیتے ہیں۔[2] بلا شبہ قرآن عقل اور ادراک کو قلب کہہ کر پکارتا ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَتَکُوۡنَ لَہُمۡ قُلُوۡبٌ یَّعۡقِلُوۡنَ بِہَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ یَّسۡمَعُوۡنَ بِہَا ۚ

''کیا انھوں نے زمین میں سیر نہیں کی کہ ان کے دل ہوں جن سے وہ تعقل کریں۔''

(حج۔۴۶)

قرآن ایک دوسری جگہ قلب کو فہم وفراست اور سمجھنے کا ذریعہ بتاتا ہے۔چنانچہ فرماتا ہے:

لَہُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا یَفۡقَہُوۡنَ بِہَا ۫ وَ لَہُمۡ اَعۡیُنٌ لَّا یُبۡصِرُوۡنَ بِہَا ۫

''ان کے دل ہیں لیکن ان کے ذریعے وہ سمجھتے نہیں۔آنکھیں ہیں، لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔''

(اعراف۔۱۷۹)

قرآن کی آیات میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آسمانی کتاب اکثر ''قلب'' کی طرف رُوح ونفس کے حالات کو نسبت دیتی ہے۔ساری

---

[1] اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں لفظ ''قلب''، عقل ورُوح کے لیے بطور کنایہ استعمال ہوا ہے۔یہ قلب جو سینے میں ہے زندگی کا مظہر شمار ہوتا ہے۔دل کے کام کرنے یا رک جانے سے زندہ اور مردہ میں فرق کیا جاتا ہے، دل کی دھڑکن کا اعتدال اور تیزی اکثر اوقات صحت وبیماری کی نشانی ہے۔ہر حادثے کے روحانی، اثرات پہلے دل پر ظاہر ہوتے ہیں اس لحاظ سے وہ لفظ جو ایک عضو کے لیے بولا جاتا ہے۔زندگی کے سارے ظاہری آثار وہیں محسوس ہوتے ہیں۔اسی لیے یہ لفظ، رُوح، نفس اور عقل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے

[2] مفردات راغب کی طرف رجوع کیا جائے: راغب کہتا ہے: ''و یعبر عن المعانی التی تختص بالانسان من الروح والعلم والشجاعۃ''

آیات کو ظاہر ہے یہاں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ ''قلب'' سے مراد کیا ہے:

جیسا کہ عرض کیا گیا اس سے مراد وہ گوشت کا لوتھڑا ہی نہیں کیونکہ وہ تو چوپاؤں میں بھی ہوتا ہے۔ یہاں ایک نظریہ بیان کیا جاتا ہے:

۳۔ بعض عرفاء اور مفسرین قرآن انسان کے لیے فکر و نظر کے علاوہ ایک اور حقیقت اور جوہر کے بھی قائل ہیں۔ جہاں تصفیہ اور تزکیہ کی بناء پر کچھ حقائق منعکس ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اس کو ایک خاص شناخت حاصل ہو جاتی ہے یہ تو طے ہے کہ یہ حقیقت اور جوہر رُوح اور نفس انسانی سے جدا نہیں ہے، پھر بھی وہ تفکر اور تعقل کی استعداد کے علاوہ ہے جو انسان کو فکری غور و خوض سے کسی حقیقت تک پہنچاتا ہے۔ انسان اس موقع پر بجائے فکری اور تعقل کی کاوش کے رُوح و نفس کی صفائی اور اس کی پاکی سے کام شروع کرتا ہے۔ آئینہ دل کو صاف اور ضمیر باطن کو پاک کر کے جہان مادی کے حقائق سے بھی آشنا ہو جاتا ہے۔ اور زندگی میں روشن، بینا اور زیرک بھی ہو جاتا ہے ساتھ ہی ساتھ دوسرے جہان کے حقائق بھی اس میں نقش ہو جاتے ہیں۔[1]

بعض مفسرین رُوح کے اس مقام کو قلب و فؤاد کا نام دیتے ہیں۔ فؤاد تو اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اگر قلب گوشت کے لوتھڑے یا عقل کے معنی میں استعمال ہُوا ہے۔ تو لفظ 'فؤاد' عارفوں کی اصطلاح میں صرف دل کے معنی میں استعمال ہُوا ہے۔

اشراقی فلسفیوں میں سے بعض خواہ یونانی ہوں یا مسلمان اس قسم کے ذرائع شناخت کے بارے میں راسخ اعتقاد رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آدمی کا قلب'' آئینے کی طرح ہے۔

پروگرام عالم اور دوسرے موجودات نورانی کا وجود آفتاب عالمتاب کے مانند ہے۔ اگر ہوا و ہوس کا زنگ آئینہ دل کو تیرہ تاریک کر دے تو اس میں یہ نور منعکس نہیں ہوتا۔ مگر جب یہی آئینہ دل تقوٰے اور پرہیزگاری سے صیقل کیا جائے اور اس کا زنگ صاف ہو جائے تو اس روشن آفتاب کا آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا نور اس میں منعکس ہوتا ہے اور خانۂ دل کو روشن کر دیتا ہے۔

تاریخ میں ایسے روشن بین اور روشن ضمیر مرد اور عورتیں رہی ہیں جن کو یہ خوبیاں علم کے ذریعے حاصل نہیں ہوئی تھیں، جو بہت سی باتوں کی اصلیت اجتماعی فتنہ انگیزیوں میں سمجھتے تھے اور حق کے دشمنوں کے مکروہ چہرے ہزار ہا پرفریب پردوں کے پیچھے دیکھ لیتے تھے۔

---

[1] بقول جلال الدین مولوی: آئینہ دل چون شود صافی و پاک — نقش ہا بینی بردن از آب و خاک

ھم ببینی نقش و ھم نقاش را — فرش دولت را ہم فراش را

جب دل کا آئینہ صاف و پاک ہو، دنیائے آب گل سے ماوراء تجھے نظر آئے۔

نقش و نقاش کو بھی تو دیکھے — اور سلطنت کا فرش و فراش بھی تجھے نظر آئیں

اس سلسلے میں افراط اور تفریط

مندرجہ بالا نکات کی قرآن اور حدیث سے تائید ہوتی ہے، ان میں سے بعض کا ذکر ہم کریں گے، لیکن پہلے ایک نکتے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ کچھ لوگوں نے شناخت اور معرفت کے ذرائع کی حیثیت کے بارے میں راہ افراط اختیار کی اور اس کو واحد شناخت و معرفت کا ذریعہ خیال کیا۔ عرفا اسلامی میں مولوی رومی وہ شخص ہیں جنھوں نے استدلال کرنے والوں کو بے قدر و قیمت جانا اور پاک قلب پر صرف عالم بالا سے اشراق پر بھروسہ کیا ہے۔

اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں:

پا ی استدلالیان چو بین بُود
پای چوبین سخت بی تمکین بود
غیر آن قطب زمان دیده ور
کزثباتش کو ه گرد و خیره سر[1]

استدلال کے پاؤں لکڑی کے تھے اور لکڑی کے پاؤں میں پائیداری نہیں ہوتی بجز اس دیدہ ور قطب کے جس کے ثبات سے پہاڑ بھی خودسر ہو جائے۔ وہ چینی اور رُومی مصوروں کے درمیان مقابلے کا قصہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

رومیان آن صوفیا نند ای پسر
نی زتکرار و کتاب دنی ہنر
لیک صیقل کرده اند آن سینه ہا
پاک ز آزو حرح و بخل و کینه ہا

اے لڑکے رومی وہ صوفی ہیں، جنہوں نے بحث مباحثے اور کتاب اور آرٹ سے کچھ نہیں سیکھا۔ انہوں نے اپنے سینوں کو صیقل کیا ہے اور طمع، حرص، بخل اور کینے سے پاک کیا ہے۔

مغربی دانش وروں میں ہنری برگساں (۱۸۵۹۔۱۹۴۱) ان لوگوں میں سے ہے جو کہتا ہے کہ: ''حس اور عقل میں سے کوئی بھی حقیقت کے منکشف کرنے کا ذریعہ نہیں۔ کشف حقیقت کا ایک اور وسیلہ ہے جس کو ''شہود باطنی'' کہتے ہیں اور اس کو عقل کے اعلیٰ ترین مراتب کا نام دیتے ہیں

[1] مثنوی دفتر اوّل۔ ص۔ ۵۶

۔اس کا کہنا ہے کہ انسان اپنے آپ میں ایک نوع تفکر سے اور شہود باطنی کے ذریعے حقیقت مطلق تک پہنچتا ہے۔''
بلاشبہ اس افراط پسندی کے پیچھے تفریط بھی موجود ہے۔ چنانچہ غیر آگاہ لوگ قلب اور دل کی صفائی کو تصوف کہتے ہیں اور راہ حق وحقیقت کے پیروؤں کو خیال مست (Visionery) پکارتے ہیں۔

صرف ایک وسیلہ شناخت کا ہونا غلط ہے

اسلام ان دونوں مکتب فکر کے مقابلے میں ایک ذریعہ شناخت کو غلط سمجھتا ہے حواس اور عقل کو شناخت کے ذرائع سمجھتا ہے۔ مگر فؤاد اور قلب و روح کی صفائی اور تزکیہ کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اس کو بھی شناخت کا ذریعہ جانتا ہے۔ قرآن ایک آیت میں دونوں (حواس اور دل) کا ایک جگہ ذکر کرتا ہے:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝۷۸

''خدا نے تم کو ماؤں کے شکم سے باہر نکالا جب کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمھارے لیے کان آنکھیں اور دل قرار بنائے، تاکہ تم اس کے شکر گزار ہو۔'' (نحل)

بعض کے نظریے کے مطابق ''افئدۃ'' جو فؤاد کی جمع ہے، سے مقصود انسانی جوہر ہے جس کا تقوٰی کے ذریعے تزکیہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح پاک ہو جاتا ہے کہ اس میں حقائق خود بخود منعکس ہو جاتے ہیں۔
قرآن اس قسم کے ذرائع کے اعتراف کے باوجود ہم کو تعقل وتفکر اور حواس سے فائدہ اٹھانے کی دعوت دیتا ہے۔ لفظ ''عقل'' کا مادہ قرآن میں ۴۹ مرتبہ اور تفکر کا مادہ ۱۸ مرتبہ آیا ہے، اور اس طرح تنہا ذریعہ شناخت ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

تزکیہ کا حساب کتاب حال مست سے جدا ہے

اپنے آپ میں گم ہونا اور کائنات سے بے رخی اسلام میں منع ہے قرآن انسانوں کو اپنے سے خارج جہاں کو اور عالم ہستی کے اسرار ورموز کو کشف کرنے کی دعوت دیتا ہے اور فرماتا ہے:

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ

''کہہ دیں کہ نظر کرو اور دیکھو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا ہے۔'' (یونس۔۱۰۱)

مسلمان کئی صدیوں تک حال مست تھے اور اپنے سے خارج دُنیا سے بے اعتنائی برتتے تھے۔ اس افراط کا ردعمل یہ ہوا کہ خارج سے وابستگی کی

دعوت میں شدت آ گئی ہے اور اب اس میں افراط پیدا ہو گیا ہے۔ اور باطن کی طرف توجہ سے منہ پھیر لیا گیا ہے۔ جبکہ اسلام ہم کو باطنی توجہ کے ساتھ خارجی ربط اور خارجی ربط کے ساتھ داخلی توجہ کی بھی دعوت دیتا ہے اور مسلسل فرماتا ہے:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ

''ہم اپنی نشانیاں عالم طبیعی اور ان کے ارواح ونفوس میں دکھائیں گے۔'' (حٰم السجدہ۔ ۵۳)

چنانچہ حقائق کی شناخت کے لیے محض داخلی توجہ یا خارجی رابطہ اختیار کر کے دوسرے سے غفلت نہیں برتی جا سکتی۔

اب تک ہم قرآن میں موجود ''قلب'' کے معنی اور خصوصی معنی اور ساتھ ساتھ ''فؤاد'' کے بھی خصوصی معنی کا ذکر کر چکے ہیں۔

اب ایسی آیات کو پیش کیا جائے گا جو واضح کریں گی کہ انسان کے لیے شناخت اور معرفت کے ذرائع حواس اور عقل کے علاوہ اور بھی ہیں۔ اور شناخت و پہچان کے منابع سے تقوے اور پرہیزگاری کے سائے میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

قرآن کے مطابق تزکیہ، تقوے اور پرہیزگاری انسان کو ایک خاص بصیرت اور مخصوص آگاہی عطا کرتی ہے جو عام طریقوں سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے کی بعض آیات درج کی جاتی ہیں:

۱۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا[1]

''اے ایمان والو! اگر گناہوں سے پرہیز کرو تو خدا تمھیں ایک قوت مرحمت فرمائے گا جس کے ذریعے تم حق کو باطل سے جدا کر سکو گے۔''[1] (انفال۔ ۲۹)

اس آیت میں تقویٰ کو حقیقت کی پہچان اور صحیح ادراک کا وسیلہ بتایا گیا ہے اور تقوے کا نہ ہونا ناآگاہی اور غلط شناخت کا سبب شمار ہوا ہے۔ ممکن ہے اس میں یہ نکتہ پنہاں ہو کہ قوتوں اور توانائیوں کے بیکار ہو جانے، گناہ کے راستے میں سرمائے کے ضائع ہو جانے، فتنہ وفساد اور بے راہ روی پھیلنے اور ہوا و ہوس کی پیروی سے انسان کی بصیرت اور حق و باطل سے آگاہی اس قدر کم رہ جاتی ہے کہ پست اور گھٹیا خیالات اس کو گھیر لیتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس دوران میں دُنیاوی علوم میں وہ پیش پیش ہو۔

حق و باطل کی پہچان عملی تقویٰ کے ساتھ ساتھ فکری اور عقلی تقوے کی بھی محتاج ہے، دراصل حقیقت تک رسائی کے لیے اپنے آپ کو ہر اس چیز سے نجات دلانی چاہیے جو انسان کو جادہ حقیقی اور صراط مستقیم سے ہٹا دے متقی اور پرہیزگار لوگ جو ہوا و ہوس پر قابو رکھتے ہیں اس مقصد کو بہتر طریقے سے حاصل کر سکتے ہیں۔

۲۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ

---

[1] ''فرقان'' مبالغہ کا صیغہ ہے جو ''فراق'' کے مادہ سے ہے۔ اس سے مراد روشن بینی اور بصیرت کی ایک خاص قوت ہے۔ جس کے ذریعے حق کو باطل سے جدا کیا جا سکتا ہے۔

''تقوٰے اختیار کرو، خداوند عالم تم کو علم عطا کرے گا۔'' (بقرہ۔ ۲۸۲)

اس آیت سے وضاحت ہوتی ہے کہ پرہیز گاری اور خدائی تعلیم میں ایک محکم رشتہ ہے، یہاں وہی نکتہ پیش کیا گیا ہے، جو پچھلی آیت کی تفسیر میں پیش کیا گیا تھا۔

۳۔ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾

''جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں (اور انھوں نے حقیقت کی طرف پیش رفت کی ہے) ان کی ہدایت میں اہم اضافہ کریں گے (ہدایت کے راستے میں جب بندہ اپنے خدا کی طرف ایک قدم اٹھائے تو خدا اس کی طرف کئی قدم اٹھاتا ہے)۔ (محمد)

۴۔ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾

''وہ اصحاب کہف) ایسے جوان تھے جو خدا پر ایمان لائے اور ہم نے بھی ان کی ہدایت اور راہنمائی میں اضافہ کیا۔'' (کہف)

اس آیت میں خدا پر ایمان لانا ہدایت اور انسان کی بصیرت کی افزونی کا سبب بتایا گیا ہے۔ گویا اللہ پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں استقامت دکھانا انسان کو بصیرت اور روشنی بخشتا ہے۔ یہ صرف روشنی کا سبب ہی نہیں بلکہ انسان کے قلب کو قوی کرتا ہے اور روح کو سطوت عطا کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ شرک کے تکلیف دہ نظام کے خلاف قیام کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

۵۔ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾

''ہم نے ان کے دلوں کو قوت اور قدرت بخشی جس وقت انھوں نے کھڑے ہو کر کہا: ہمارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے اس کے علاوہ ہم کسی کو اپنا خدا نہیں تسلیم کرتے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم باطل کی طرف جُھک جائیں گے۔'' (کہف)

یہ قوت قلب اور روحانی طاقت جو طاغوتی نظام کے خلاف قیام کا سبب بنتی ہے نتیجہ ہے ایمان، تزکیہ نفس محاسبہ اور مراقبہ کا۔

۶۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾

جو لوگ راہ خدا میں مجاہدہ کرتے ہیں ان کو ہم اپنے راستے کی طرف ہدایت کرتے ہیں اور خدا نیکوکاروں کے ساتھ

ہے۔''(عنکبوت)

یہاں جہاد سے مراد داخلی دشمن اور نفس انسانی کی غلط خواہشات سے جہاد ہے، خارجی دشمن سے نہیں۔ اگر وہ بھی مقصود ہو تو یہ عرفانی اور معنوی جہاد سے جدا نہیں، اس لیے کہ بغیر باطنی جہاد کے ظاہری جہاد کی کوئی قیمت نہیں۔

وہ جہاد جو خدا کی راہ میں نہ ہو اور وہ حکومت جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے قوانین کے نفاذ اور عدل وانصاف پھیلانے کے لیے قائم نہ کی جائے اس کی ایک پیسہ بھی قیمت نہیں۔ جہاد اسی وقت عبادت اور عمل نیک شمار ہوگا جب اس کا سرچشمہ خلوص اور اس کا مقصد فرمان خدا کا اجراء ہو۔ اگر مذکورہ آیت کو اصطلاحی جہاد کے معنی میں بھی لیں تو اس وقت عبادت شمار ہوگا جب خلوص کے ساتھ ہوا اور اہل معرفت کی اصطلاح میں محاسبہ اور مراقبہ کے ساتھ ہو۔

انقلابی جوانوں کی آگاہی کے لیے جو راہ خدا میں جہاد وشہادت سے محبت کرتے ہیں اور جنہوں نے مشرق ومغرب کے شیطانوں اور سپر طاقتوں سے مبارزہ کرنے کو زندگی کا مقصد بنایا ہے یہاں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے جو اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ ظاہری جہاد سے الگ نہیں۔ پیغمبرؐ گرامی فرماتے ہیں:

"من کان ھجرته الی الله ورسوله فھجرته الی الله ورسوله ومن کان ھجرته الیٰ مال یصیبه فھجرته الیٰ ماھاجر الیھا۔" [1]

''جو لوگ دنیا کے مختلف علاقوں سے مدینے کی طرف ہجرت کرتے ہیں۔ اگر ان کی ہجرت خدا اور رسول کی طرف ہو (یعنی خدا کے احکام اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے انجام پائے) تو یہ ہجرت اور گھر بار چھوڑنا خدا کے لیے ہے مگر وہ لوگ جو کسب مال اور غنائم حاصل کرنے کے لیے ہجرت کرتے ہیں ان کی ہجرت اسی چیز کی طرف ہے جس کے لیے انھوں نے ہجرت کی۔''

اس حدیث میں جن لوگوں کا پہلے ذکر ہوا وہ لوگ ہیں جن کی ہجرت کا آغاز مادی ہے۔ یعنی گھر بار چھوڑتے ہیں جب کہ مقصود ان کا روحانی ہے، یعنی خدا کی رضا کو حاصل کرنا اور پیغمبرؐ کے احکامات کی پیروی۔ مگر دوسرے لوگوں کا آغاز اور انجام دونوں مادی ہیں۔ پہلے لوگوں کا سفر تعجب خیز ہے کہ سفر کا آغاز مادی ہے، مگر اس کا اختتام روحانی ہے۔

قرآن مجید ایسے روحانی سفر کا اس طرح ذکر کرتا ہے:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ

---

[1] صحیح بخاری۔ جلد:۱ کتاب ایمان'' باب ۴۲ ص ۱۶

يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ

''جو شخص خدا کی طرف ہجرت کرتے ہُوئے اپنے گھر چھوڑے مگر آدھے راستے میں اس کو موت آجائے تو اس کا اجر خدا کے پاس ہے۔'' (نساء۔۱۰۰)

اس آیت میں آغاز سفر مادی ہے یعنی گھر چھوڑ کر نکل پڑنا مگر اس کا انجام معنوی و روحانی ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت کرنا احکام الٰہی سے آگاہی اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے اپنے وطن سے چلے تو اس ارادے سے پہلے وہ پستیوں ،انحراف اور نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈال چکا ہے۔ چنانچہ جس قدر وہ شہر مدینہ سے قریب ہوگا وہ خدا اور اس کے رسول سے قریب تر ہوتا جائے گا۔

قلب معرفت کا سرچشمہ اور اس کا ذریعہ تزکیہ ہے

معرفت اور شناخت کی بحث کے دوران ہم نے ذکر کیا کہ عرفانی معنی میں قلب عقل کی طرح شناخت کا منبع بھی ہے اور ذریعہ بھی۔قلب الہام اور ادراک کے ایک سلسلے کا منبع ہے ،جس کا ذریعہ تصفیہ اور تزکیہ ہے ،جیسے عقل وخرد شناخت کا منبع ہے اور اس کا ذریعہ منطقی استدلال اور عقلی قیاس ہے جو ذہن اور فکر کا عمل کہا جاتا ہے۔مثلاً ان قوانین کی پہچان کے لیے جیسے :ہر معمول کے لیے ایک علت ضروری ہے یا دور اور تسلسل باطل ہے ایک منبع کی ضرورت ہے جو عقل وخرد ہی ہوسکتا ہے اور اس کا ذریعہ منطقی استدلال اور عقلی قیاسات ہیں۔

ٹھیک اس طرح عرفانی معنی میں قلب کی کیفیت ہے یعنی قلب الہام ،مکاشف اور مخصوص آگاہی کے ایک سلسلے کا منبع ہے اس کا حصول دوسرے منابع سے ممکن نہیں۔اس کا واحد ذریعہ رُوح اور نفس کے گرد و پیش کی پاکیزگی اور قلب کا آلودگیوں اور غیر مشروع باتوں سے تزکیہ ہے۔

مادہ پرست اس منبع اور ذریعے کے شدت سے منکر ہیں۔ان کے برعکس مردان الٰہی اس منبع اور اس ذریعے کے وجود پر راسخ اعتقاد رکھتے ہیں۔
مادہ پرستوں کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ اس منبع اور ذریعے کے معتقد ہوجائیں (جو حقیقت الہام اور محسوسات سے خارج آگاہی کے ایک سلسلے کا سبب ہے)تو خودبخود اس کے مکتبہ فکر کی عمارت دھڑام سے گر جاتی ہے۔وہ مادہ اور فطرت سے باہر کی دُنیا کی سختی سے انکار کرتے ہیں ۔اگر وہ اس منبع اور ذریعے سے لگاؤ پیدا کرلیں اور اس کے قائل ہوجائیں تو مادہ کی اصلیت خودبخود ختم ہوجائے گی اور اس سے عالم کا وجود ثابت ہوجائے گا۔

قلب کی میکینزم

مسلمان عارفوں نے سیر وسلوک سے متعلق کتابوں میں دل کی میکینزم اور اس منبع اور شناخت و معرفت کے ذریعے کی فعالیت اور کارکردگی کی وضاحت کی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ کسی اللہ والے اُستاد کے زیر نظر رہ کر رُوح انسانی روحانی منازل طے کرکے دیدہ دل اور صحیح بصیرت کے ذریعے اشیاء کے چہرے سے پردے اٹھا سکتی ہے۔

کارخانہ خلقت میں آنکھ دیکھنے کے لیے ہے مگر بعض اوقات فضا گردوغبار سے اس قدر مکدر ہو جاتی ہے کہ انسان اپنے قریب تک نہیں دیکھ پاتا ۔اگر فضا اور آلہ بینائی صاف ہو تو وہ دور تک کی چیزیں بھی بآسانی دکھائی دے جاتی ہیں۔

اہل صفا کی نگاہ میں ان روحانی مراحل اور منازل کے طے کرنے سے جو کم سے کم اثر مرتب ہوتا ہے وہ یہ کہ محبت و بغض اور ہوا و ہوس کے پردے عقل کے سامنے سے اُٹھ جاتے ہیں۔انسان اس روشنی سے حقائق کو بخوبی پہچان لیتا ہے۔

تصفیہ اور تزکیہ کا اثر صرف دل کی نگاہ سے حقائق دیکھنے کی رکاوٹیں دور کرنا نہیں۔ بلکہ تصفیہ کبھی الہام اور غیبی آگاہوں کا بھی سبب بنتا ہے جو عام انسانوں کو میسر نہیں آتیں۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ تزکیہ نفس دو اثر رکھتا ہے۔

I انسان کی نظر اور بصیرت کے سامنے سے رکاوٹیں ہٹا دیتا ہے اور اس میں ایسی آمادگی پیدا کرتا ہے کہ وہ حقائق کی حقیقت کو درک کر لیتا ہے ۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے اگر ہم اس نکتے کو بھی نظر میں رکھیں جو ہم پہلے کہہ چکے ہیں ۔یعنی معرفت کے سامنے سب سے دبیز پردہ نفسانی خواہشات ہیں۔

II الہام کے ایک سلسلے کا سرچشمہ ہو جاتا ہے۔انسان ایسی صورتوں اور چہروں کا مشاہدہ کرتا ہے۔جن کا مشاہدہ عام افراد کے لیے ممکن نہیں۔

اخلاق سے متعلق کتابوں میں ہم دو قسم کے اوصاف سے متعارف ہوتے ہیں۔ان میں سے ایک پر کاربند ہونا چاہیے اور دوسرے سے پرہیز کرنا چاہیۓ،مثلاً ایثار،شجاعت،سخاوت،استقامت قابل تعریف اوصاف ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو اپنانا چاہیۓ۔خود غرضی خوف اور بخل کی مذمت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے دوری اختیار کرنی چاہیۓ۔ یہ کتابیں یہ نہیں بتاتیں کہ انسان اپنے آپ کو اچھی صفات سے کس طرح آراستہ کرے اور بُری صفات سے کس طرح پرہیز کرے۔انسان کن عوامل کے ذریعے اپنے آپ کو ایثار اور شجاعت سے آراستہ کر سکتا ہے اور ان کی برعکس صفات سے پرہیز کر سکتا ہے۔ عارف اور اہل درک انسان سے کہتے ہیں کہ تو ایک پودے کے مانند حرکت کی حالت میں ہے۔ تجھ کو کچھ متعین منازل طے کرکے بلند انسانی مقصد تک پہنچنا ہے تاکہ آخر کار تو اپنے آپ کو تمام انسانی صفات سے آراستہ کرے اور بُری صفات سے پرہیز کرے۔مگر بغیر ان مراحل کو طے کیے نفس کو ان صفات سے آراستہ کرنا اور ان کی برعکس صفات سے پاک کرنا ممکن نہیں۔

شاید یہ مختصر گفتگو دل کی کارکردگی کی حقیقت سمجھنے کے لیے کافی ہو۔ابتداء میں جو نکتہ ہم نے بیان کیا تھا اس کے متعلق عرض ہے کہ یہاں یہ مقصد نہیں کہ فطرت کی شناخت اور کائنات میں غور و خوض ہم نہ کریں اور ایک گوشے میں بیٹھ کر خود شناسی اور خودسازی میں لگ جائیں۔ بلکہ فطرت کے

راز ہم کو حقیقت کی شناخت ،قوانین جہاں کے ادراک کے ساتھ ساتھ خودشناسی بھی کریں۔ چنانچہ جب قرآن اور حدیث ہم کو فطرت اور مادہ کے مطالعہ کی دعوت دیتی ہے تو اس سے مراد یہ نہیں کہ ماوراء مادہ سے منہ موڑ لیا جائے۔

انسان کامل وہی ہے جو افراط وتفریط سے پرہیز کرے۔خودشناسی کے ساتھ فطرت شناسی بھی کرے اور فطرت شناسی کے ساتھ خودشناسی بھی جاری رکھے۔پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کی پس ماندگی صنعت اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے یہی تھی کہ انہوں نے خودشناسی کی طرف زیادہ توجہ دی اور فطرت کی شناخت اور تسخیر کے لیے بہت کم کام کیا۔آج مغربی دُنیا اس سے برعکس کیفیت سے دوچار ہے۔یعنی فقط فطرت اور مادہ میں غلطاں پیچاں ہے اور خودشناسی کے لیے کچھ نہیں کررہی۔

نہج البلاغہ اور خودشناسی

بلاشبہ نہج البلاغہ خارج شناسی کی کتاب ہے اور ہم کو حقائق فطرت وکائنات اور معاشرے،تاریخ اور سیاست کی صحیح پہچان کی طرف دعوت دیتی ہے ۔مگر ساتھ ہی ساتھ مناسب موقعوں پر خودشناسی کی طرف بھی مائل کرتی رہتی ہے۔اس زمین میں ہر عارف اسلامی سے زیادہ پختگی سے گفتگو کی ہے۔چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں: امامؑ کی نگاہ میں خدا کی عبادت اور اس کی یاد دلوں کو جلا بخشتی ہے اور ان کو تجلیات کے لیے تیار کرتی ہے۔ جیسا کہ امامؑ نے فرمایا:

۱۔ان اللہ تعالیٰ جعل الذکر جلاء للقلوب ،تسمع ،بہ بعد الوقرۃ،و تبصر بہ بعد العشوۃ،و تنقادبہ بعد المعاندۃ،وما برح اللہ عزت الائہ ۔فی البرھۃ بعد البرھۃ وفی ازمان الفترات و رجال ناجاھم فی فکرھم و کلمھم فی ذات عقولھم۔"[1]

''خداوند تعالیٰ نے اپنی یاد کو دلوں کے لیے صیقل قرار دیا ہے اس کے ذریعے دل بہرے پن کے بعد سننے والے ،اندھے پن کے بعد دیکھنے والے اور سرکشی کے بعد رام ہو جاتے ہیں۔ ہر زمانے میں ہمیشہ خدا کے کچھ مخصوص بندے تھے اور ہیں،خدا جن کے ضمیر کے ساتھ گفتگو کرتا ہے اور ان کی عقل وخرد کے ساتھ کلام کرتا ہے۔''

''ناجاھم فی فکرھم '' کا فقرہ دل کے الہام پذیری کی طرف اشارہ ہے جو عبادت تزکیہ اور تصفیہ کا براہ راست نتیجہ ہوتا ہے دوسرے خطبے میں اس برق اور درخشانی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جو مجاہدے کے زیر اثر سالک کے دل میں کوندتی ہے اور اس کی دنیا کو

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۰

روشن کرتی ہے۔ان منازل کا ذکر کرتے ہیں، جن کو راہ حق کا سالک بالترتیب طے کرتا ہے۔حتیٰ کہ منزل مقصود یعنی روحانی بلندی کی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے۔جیسا کہ فرماتے ہیں:

۲۔قد احیی عقله وامات نفسه م،حتیٰ دق جلیله ولطف غلیظه وبرق له لا مع ، کثیر البرق ،فابان له الطریق وسلك به السبیل وتد افعته الا بواب الیٰ باب السلامۃ و ثبت رجلاه بطمانینة بد نه فی قرار الامن والراحة:[۱]

''اس نے اپنی عقل کو زندہ کیا ہے اور اپنے نفس کو مار دیا ہے یہاں تک کہ بدن کی سختیاں نازک اور رُوح کی خشونتیں نرم ہوگئی ہیں۔اس کے دل پر انوار کی بجلی کوندتی ہے اور راہ کو روشن کرتی ہے اور منزل پہ منزل اس کو راہ نمائی کر کے آخری منزل تک پہنچاتی ہے یہ سلامتی کی منزل ہے۔حتیٰ کہ آرام و مطمئن بدن کے ساتھ اس کے پاؤں قرارگاہ امن و آسائش میں محکم اور ثابت ہو گئے۔''

۳۔امام اپنے ایک مختصر کلام میں تہذیب نفس کے نتیجے میں جو واردات قلبی اور علوم افاضی داشراقی سے واسطہ پڑتا ہے،اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''هجم بهم العلم علی حقیقة البصیرۃ و باشروا روح الیقین۔''[۲]

''وہ علم جو بصیرت کامل کے پائے پر ہے،اس نے ان کے دلوں پر حملہ کیا ہے اور انھوں نے روح یقین کو لمس کیا ہے۔''

امامؑ نے اپنے خطبات اور حکیمانہ ارشادات میں بار بار انسان کو عبادات اور تزکیہ کے تعجب خیز اثرات کی طرف توجہ دلائی ہے۔مندرجہ بالا تین اقتباسات بھی ان ہی میں سے ہیں۔

ہم نے کتاب ''مفاہیم القرآن'' میں اس بارے میں تفصیلی گفتگو کی ہے، کتاب ''اصالت روح'' کے دسویں باب میں پیغمبروںؑ اور اولیاء الٰہی کی روحانی قوتوں کے بارے میں واضح اور تفصیل سے بحث کی ہے۔یہ زیادہ تر عبادت تزکیہ اور تصفیہ کی پیداوار ہیں۔جو حضرات دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس بحث کو مزید ان دونوں کتابوں میں دیکھ سکتے ہیں۔اب دامن سخن کو یہاں سمیٹتے ہیں اور دوسرے اصول کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۲۱۸

[۲] نہج البلاغہ،حکیمانہ اقوال شمارہ ۱۴۷۔

قرآن کا دائمی منشور 2

اکیسواں اصول

انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ

''وہی ہے جس نے پانی سے بشر کو پیدا کیا پھر اس نے اسے نسب اور سبب کے رشتے عطا کیے'' (فرقان۔ ۵۴)

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ

”وہی ہے جس نے پانی سے بشر کو پیدا کیا پھر اس نے اسے نسب اور سبب کے رشتے عطا کیے“ (فرقان۔ ۵۴)

قرآن کے ان موضوعات میں سے جن پر گذشتہ زمانوں میں بہت کم توجہ دی گئی، معاشرے اور تاریخ کے موضوعات ہیں۔ان سے متعلق آیتوں میں انسان دو رُخ سے پیش کیا گیا ہے۔

۱۔انسان کسی خاص زمانے اور دور میں حرکت کو نگاہ میں لائے بغیر اور سکوت کی حالت میں اسی کو معاشرہ کہتے ہیں۔

۲۔انسان زمانوں کی حرکت کے ساتھ جس کو تاریخ کہتے ہیں۔

یہ آیات اس زمانے میں نازل ہوئیں جب فلسفہ تاریخ کی تدوین ہوئی تھی نہ عمرانیات کا کہیں ذکر تھا۔انسان قوموں کی تاریخ سے بے پرواہ صرف شخصیتوں اور بادشاہوں کی تاریخ کے بارے میں سوچتا، لکھنا اور محفل سجاتا تھا۔

یہ قرآن تھا جس نے ایسے زمانے میں قوموں کی اور امتوں کی تاریخ پیش کر کے تحقیق اور جستجو کرنے والوں کے لیے قوموں کی زندگی پر غور و خوض کرنے کا ایک نیا باب کھولا۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ قرآن نہ فلسفہ تاریخ کی کتاب ہے اور نہ عمرانیات کی۔مگر قوموں سے متعلق مسائل سے پُر ہے۔کہ ہم کو اپنے نقطہ نگاہ سے معاشرے اور تاریخ سے متعلق بہت سے مسئلوں سے آگاہ کرتی ہے۔

مگر قرآن میں دیئے ہوئے معاشرے، تاریخ سنن اور قوانین کی تشریح و تفصیل سے متعلق نظریات کو پیش کرنے کے لیے ایک کتاب چاہیے جو اس مضمون کے ماہرین ترتیب دے سکتے ہیں۔

وہ لوگ جو تفسیر بالرائے سے پرہیز کرتے ہوئے قرآن ہی کو اس سلسلے میں اپنا رہنما بنائیں اپنے افکار اور معلومات کو نہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ آج کل قرآن تحریف تفسیری سے محفوظ نہیں کچھ لوگ ہیں جو بجائے اس کے کہ قرآن کی شاگردی اختیار کر کے اس کے نقطہ نگاہ کے مطابق اس کی بات آگے بڑھائیں خود استاد کا رول اختیار کر کے اپنی رائے اس پر ٹھونستے ہیں۔

اس باب میں ہم معاشرے اور اس سے متعلق جو مسائل قرآن میں آئے ہیں ان کو مختصراً قارئین کرام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔امید ہے کہ دوسرے حضرات اس گفتگو کو آگے بڑھائیں گے اور قرآن مجید کے قیمتی انداز فکر کو دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یکجا کریں گے۔

اس باب میں جو موضاعات ہم پیش کریں گے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے۔

۲۔معاشرہ انفرادی اور اجتماعی پہلو کے علاوہ عالمی یا الہیٰ جہت بھی رکھتا ہے۔

۳۔فرد کی حقیقت معاشرے کی حقیقت اور فرد اور معاشرے کے روابط کی حقیقت۔

۴۔معاشرے کی ترکیب میکانکی ہے یا نامیاتی؟

۵۔معاشرہ سنت اور قانون کا حامل ہے۔

۶۔تاریخ میں اتفاق (Chance) سے کیا مراد ہے۔

۷۔خدائی سنتیں معاشرے کے اعمال کا ردعمل ہوتی ہیں

۸۔معاشرے پر جاری قوانین وسنن کے چند نمونے

۹۔گذشتہ معاشروں کی زندگی آئینہ عبرت ہے

۱۰۔تاریخ کی کتابیں کس حد تک علمی معیار رکھتی ہیں۔[1]

فلسفہ تاریخ کیا ہے؟

معاشرے اور تاریخ کے قوانین کلی سے آشنائی معاشروں کے مرحلہ بہ مرحلہ تغیرات اور تبدیلیوں سے واقفیت اور ان تبدیلیوں سے متعلق قوانین کا علم فلسفہ تاریخ کہلاتا ہے۔پہلا شخص جس نے تاریخ کے قوانین کُلی سے پردہ اٹھایا اور اس علم کی بناء رکھی وہ معروف مغربی عالم عبدالرحمن ابن خلدُون (۸۰۷ھ) ہے۔اس نے سات جلدوں پر مشتمل ایک تاریخ ''العبر وویوان المبتدو والخبر'' کے نام سے لکھی۔یہ زیادہ مشہور نہیں ہے مگر اس کتاب کا مقدمہ علمی حلقوں میں خاص شہرت کا مالک ہے اس کا دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ابن خلدون کے بعد محققین اس نہج پر کام کرتے چلے گئے اور آگے چل کر یہ ایک خاص علم کی شکل اختیار کر گیا۔

اس کے ساتھ علم عمرانیات (sociology) بھی ہے۔یہ دونوں یعنی فلسفہ تاریخ اور علم عمرانیات ایک دوسرے سے بہت نزدیک ہیں۔مگر ان دونوں میں جو فرق ہے وہ بھی واضح ہے فلسفہ تاریخ معاشرے پر حاوی قوانین کُلی اور تاریخ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔وہ مجبور ہے کہ ساری تاریخ انسانیت کا یکجا مطالعہ کرے اور پھر اس سے قوانین کُلی اخذ کرے۔یہ نہیں کرسکتا کہ کسی خاص معاشرے کے حالات کو ماضی اور مستقبل سے جدا کر کے اس کا مطالعہ کرے۔

علم عمرانیات کی کیفیت اس کے برخلاف ہے۔عمرانیات میں حوادث یا کسی معاشرے کی مشکلات کا کسی مخصوص خطے اور زمانے کے تناظر میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔قوانین کُلی کو نہیں جو فلسفہ تاریخ کا شعبہ ہے۔

---

[1] جگہ کی کمی مدنظر رکھتے ہوئے ان دس مباحث کو ہم چار عنوان کے تحت پیش کریں گے: حالانکہ اس کتاب کی ترکیب اور نظم کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ضروری تھا کہ ہر بحث کو آزادانہ الگ الگ پیش کیا جاتا۔

مثلاً انقلاب اسلامی سے پہلے یا انقلاب کے بعد ایرانی معاشرے کی کیفیت معلوم کرنا ماہر عمرانیات کی ذمہ داری ہے۔اس علم کے مسائل معاشرے میں دہقان، کاشتکار اور کاریگروں کی مشکلات اور پڑھے لکھے بے روزگار افراد کی ضروریات وغیرہ ہیں۔

تاریخ کے محرک عوامل جو اصول اور قوانین تاریخ مرتب کرتے ہیں وہ فلسفہ تاریخ کا شعبہ ہیں۔

جب دونوں علوم میں فرق کا اندازہ ہو گیا، اب ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ معاشرے سے کیا مراد ہے۔

معاشرہ کیا ہے؟

معاشرے اور تاریخ سے متعلق گفتگو میں پہلی چیز انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کی پہچان ہے۔ان دونوں کی شناخت کے بعد معاشرے کا معنی خود بخود واضح ہو جائے گا۔

انفرادی زندگی اجتماعی زندگی کے مقابل ہے۔فردی زندگی نظم وضبط قانون اور کسی پروگرام سے عاری ہوتی ہے اور احتیاجات اور فوائد کے حصول کی تقسیم کے بغیر جاری رہتی ہے۔ہر شخص اپنی حاجت دُور کرنے کی فکر میں تمام زندگی کا بار اپنے کندھے پر بغیر کسی اور کی مدد اور کمک کے خود ہی کھینچتا ہے۔

ایسی زندگی ماہرین اور دانشوروں کی نظر میں انسانی فطرت اور طبع کے خلاف ہے۔انسان جلد یا بدیر اس سے اکتا کر اجتماعی زندگی کا رُخ کرتا ہے یہاں زندگی ایک اجتماعی مزاج رکھتی ہے یعنی افرادی زندگی تقسیم کار اور تقسیم احتیاج کی بنیاد پر قائم ہے۔اسی سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔اس تقسیم اور تعاون کے طور طریقے اور نظام وضع ہو چکے ہیں جو افراد کی ذمہ داری کا تعین کرتے ہیں کہ وہ اس کے مطابق عمل کریں

ضروریات پورا ہونے اور قائدے کی تقسیم کے تحت ان افراد کے درمیان فکر ونظر میں اور ان کی خواہشات اور اخلاق وعادات میں یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔یہ ان کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ایک مشترک زندگی میں مربوط کر دیتی ہے۔ایک کشتی میں سوار مسافر کی طرح یہ ایک منزل (Destiny) کے حامل ہو جاتے ہیں ایک ساتھ مقصد کے حصول کی طرف بڑھتے ہیں اور خطرات کے موقعوں پر قریب سے قریب تر آ جاتے ہیں یہی اجتماعی زندگی ہے جو افراد کو مل کر تشکیل دیتے ہیں اس کی اساس تقسیم کار اور تقسیم منافع، آداب اور ضوابط کی حکمرانی، اخلاق وآداب میں ہم رنگی اور فرہنگ وتمدن کی یگانگت ہے۔اس اجتماعی زندگی کی اساس ایک آب وہوا میں زندگی بسر کرنا، ایک علاقے میں رہنا اور ایک طرح کی غذا کھانا نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ یکسانیت تو جانوروں اور نباتات میں بھی پائی جاتی ہے۔مگر ان کی زندگی اجتماعی نہیں کہلا سکتی اور نہ ہی وہ جانور اور وہ درخت کسی معاشرے کو تشکیل دیتے ہیں۔

انفرادی زندگی میں کوئی فرد دوسرے فرد یا افراد کے لیے اپنے سر کوئی ذمہ داری نہیں رکھتا۔ان کے درمیان کوئی معمولی سا معمولی بھی معاہدہ نہیں ہوتا اور ہر فرد دوسرے سے آزاد ہوتا ہے۔جبکہ اجتماعی زندگی عملی طور پر ذمہ داریاں اور جواب دہی لاتی ہے۔چنانچہ انسان کی آزادیوں کی حُدود مقرر ہو جاتی ہیں۔اور معاشرے کے اراکین کی مصلحتوں کی حدود میں آزادی محترم شمار ہونے لگتی ہے۔

اسی سرنوشت کی یکسانیت کی وجہ سے جو معاشرے کے تمام افراد کے لیے ایک ہے اسلام میں گناہ اور شر کا ارتکاب عمومی طور سے سخت منع ہے۔ امر بالمعروف کا کام اس نقطہ نظر سے بھی ضروری ہے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم فرماتے ہیں:

"ان المعصیة اذا عمل بها العبد سرّا لم یضر الا صاحبها و اذا عمل بها علانیة ولم یغیر علیه اضرت العامة"[1]

"جب گناہ پوشیدہ طور پر انجام پائے تو وہ صرف گناہ کرنے والے کو آلودہ کرتا ہے اگر اعلانیہ انجام پائے تو پورے معاشرے کو گندا کرتا ہے۔"

عمومی نگرانی کا فلسفہ

یہاں عمومی نگرانی کا فلسفہ جس کا "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کے طور پر قرآن مجید میں دس مرتبہ ذکر ہوا ہے واضح ہو جاتا ہے، معاشرے کے افراد جس رشتے سے ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور جو ایک ہی حکم ان سب پر لاگو ہوتا ہے، اس کی بناء پر عمومی نگرانی جو عامتہ الناس کے ہاتھوں ہوتی ہے اور قانون شکنوں کے بارے میں قوت مجریہ کے ذریعے جو اجراء قوانین ہوتا ہے وہ انسانی حریت اور آزادی کے برخلاف نہیں سمجھا جا سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ اسی صورت میں اجتماعی زندگی ممکن ہے اور اس اجتماعی زندگی کو قبول کر کے ہر شخص کو ان پابندیوں کو بھی ماننا پڑتا ہے۔

اس وقت ہم "عمومی نگرانی" کی طویل بحث میں نہیں پڑیں گے۔ ہمارا مقصد قرآن میں درج ان طور طریقوں کا ذکر ہے جو معاشرے اور تاریخ پر حاوی ہیں۔

اسلام میں معاشرے کے ایک مسلمان پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اس لیے کہ اجتماعی زندگی کا مطلب ہی ذمہ داریاں قبول کرنا ہے۔ فقہ اسلامی کا ایک بڑا حصہ اسلام کے اجتماعی اور معاشرتی طور طریقوں اور نظام کی تشریح پر مشتمل ہے۔

ہمارے یہاں فرد کے لیے احکام کے مقابلے میں انسان کے اجتماعی قوانین کہیں زیادہ ہیں۔

انسان ایک مدنی الطبع وجود کیوں ہے؟

بلا شک وشبہ آج انسان معاشرتی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کی زندگی خواہ منصفانہ طور پر یا غیر منصفانہ طور پر تقسیم کار اور تقسیم فوائد کے طریقے پر جاری ہے اب سوال یہ ہے کہ معاشرتی زندگی اس کی فطرت کے مطابق بھی ہے یا نہیں اور کیا یہ وہی خاکہ اور زندگی کی سکیم ہے جو اس کی خلقت میں موجود ہے اور کیا اس کے علاوہ کوئی طریقہ اختیار کرنا گویا اپنی خلقت کے خلاف چل پڑنا ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ ج۔ ۱۱ باب ۴۔ ابواب امر بالمعروف ص۔ ۴۰۷۔

یا پھر یہ بات ہے کہ انسان کے وجود میں اجتماعی زندگی کا کوئی رجحان نہیں۔ یہ محض زندگی کی مجبوریوں اور جبر کی وجہ سے اس نے اختیار کیا ہوا ہے اگر وہ تنہا اپنی زندگی کا بوجھ اپنے کندھے پر اُٹھا سکتا، تو کبھی اس اجتماعی وسائل سے بھرپور فائدہ اجتماعی زندگی میں ممکن ہے، جہاں سب کی شراکت اور تعاون سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے یا پھر کیا حقیقی زندگی اپنی اصل سادہ شکل میں اجتماعی زندگی پر موقوف نہیں۔

ان تینوں نقطہ ہائے نظر پر غور کرنا چاہیے۔ پہلے نظریے کے مطابق ایک اندرونی اور باطنی میلان اور رجحان انسان کو اجتماعی زندگی کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ مثلاً عورت مرد ایک دوسرے کی طرف فطری تقاضے کے مطابق کشش رکھتے ہیں۔ اور ایک گھرانے کو تشکیل دیتے ہیں۔ انفرادی زندگی گویا کُل سے ایک جزو کی علیحدگی ہے کہ جس کے لیے ضروری ہے کہ جتنا جلدی ہو سکے اپنے کل سے مل جائے۔

دوسرے نظریے کے مطابق وجود انسانی سے باہر ایک سبب ہے۔ جس کو جبر کہہ سکتے ہیں جو اس کو اجتماعی زندگی کی طرف کھینچتا ہے اور کسی بھی قسم کا اندرونی اور داخلی سبب موجود نہیں۔ جیسے وہ پیاسے جو ایک جنگل بیابان میں پھنس گئے ہوں مجبور ہیں۔ کہ سب مل کر کنواں کھودیں اور اس سے پانی نکال کر اپنی پیاس بجھائیں۔ ان میں سے کچھ کنوئیں کے اندر مٹی کھود رہے ہوں گے اور دوسرے اوپر رہ کر اس مٹی کو باہر پھینک رہے ہوں گے۔

تیسرے نظریے کے مطابق بہتر زندگی گذارنے اور اس کے وسیلے پیدا کرنے کے لیے انسان کی سوچ اور فکر دوسروں کو شرکت اور تعاون کی دعوت دیتی ہے۔ مثال کے طور پر دو تاجر جو بہتر منافع کے لیے ایک بڑی کمپنی تشکیل دے لیتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

انسانی مدنی الطبع ہے

قرآن کی آیات پہلے نظریے کی تائید کرتی ہیں۔ ان کے مطابق اجتماعی زندگی انسان کی فطرت میں مضمر ہے گویا یہ طرز زندگی اس کی خلقت میں گندھی ہوئی ہے اور جب تک انسان ہے اس کی فطرت باقی ہے اور وہ ایسی زندگی کی طرف ہی رجحان رکھتا ہے۔ اس مضمون کی کئی آیات ہیں جن میں سے یہاں تین پیش کی جاتی ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

”اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو قوموں اور قبائل کی شکل دی تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو (نہ کہ نسل اور قومیت پر ایک دوسرے پر فخر کرو) تم میں سے زیادہ مکرم اور معزز وہ ہے جو تم میں سے زیادہ تقوٰے رکھتا ہے۔“ (حجرات)

اس آیت میں خلقت کا فلسفہ اور اس بات کی نشان دہی ہے کہ افراد انسانی مختلف قوموں اور قبائل کی صورت میں کیوں وجود رکھتے ہیں۔ یعنی انسان کی خلقت کوئی اور صورت میں ہوتی تو پہچان ممکن نہ ہوتی، جب کہ شناخت اور پہچان ہی اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے۔ افراد انسانی ایک

کارخانے کے یکساں مال اور پیداوار کی طرح ایک دوسرے سے پہچانے نہ جاتے۔
زیادہ واضح الفاظ میں جس طرح رنگ اور شکل اور قد قیافہ پہچان کا ذریعہ ہے، ویسے ہی مختلف قومیتوں اور مختلف قبائل سے نسبت پانے سے انسان ایک دوسرے میں امتیاز کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کو پہچان سکتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ شناخت اور پہچان اجتماعی زندگی کے لیے لازم ہے۔ اگر اجتماعی زندگی فطرت انسان میں مضمر نہ ہوتی تو کوئی طریقہ نہیں تھا کہ افراد بشر ایک دوسرے کو پہچان سکتے۔
خلقت انسان میں قومیت اور قبائل کا بھی عنصر شامل تھا تا کہ اس کے ذریعے ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

"وجعلنا کم شعوباً وقبائل لتعارفوا"

''تو کہا جا سکتا ہے کہ اس خاکے کے لیے اجتماعی زندگی دوسری غایت وسبب ہے''

دوسرے لفظوں میں افراد کی شنائی کے لیے قومیت اور قبائل کا اختلاف لازمی ہے اور اجتماعی زندگی کے لیے شناسائی ضروری ہے تو خود بخود خلقت انسان میں اجتماعی زندگی اس کی حقیقی اور اس کے اندر مضمر غرض وغایت ہوئی۔ اوّل روز سے یہ ضرورت نظر میں رکھتے ہُوئے انسان کی آفرینش کی ابتداء کی گئی اس کو کہا جاتا ہے کہ اجتماعی زندگی فطرت وآفرینش کا تقاضا ہے۔

ب۔ وَهُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ مِنَ الۡمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهۡرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیۡرًا ﴿۵۴﴾

''وہ ہے جس نے پانی سے انسان پیدا کیا اور انسانوں کے درمیان نسبی رشتے اور سببی رابطے قائم کیے۔ تمھارا پرودگار قادر وتوانا ہے۔'' (فرقان۔ ۵۴)

اس آیت سے واضح ہے کہ نسبی اور سببی قرابت کا رشتہ فطرت انسان میں ایک سکیم کے تحت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلقت انسانی کو ''خلق'' کے لفظ سے بیان کر کے رشتہ داری کے ذکر کو حرف ''فائ'' کے ساتھ خلقت بشر پر عطف کرتا ہے اور فرماتا ہے:

جَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهۡرًا ؕ

جب رشتہ داری کا جوڑ اور روابط خلقت کے پروگرام میں منظور اور مقصود ہو تو یقیناً اجتماعی زندگی بھی نظر میں ہوگی۔ سببی اور نسبی روابط سے اجتماع کی تشکیل کرتے ہیں اور یہی اجتماعی زندگی ہے۔

ج۔ اَهُمۡ یَقۡسِمُوۡنَ رَحۡمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَیۡنَهُمۡ مَّعِیۡشَتَهُمۡ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَرَفَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِیًّا ؕ وَرَحۡمَتُ رَبِّكَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ﴿۳۲﴾

''کیا وہ تمھارے پرودگار کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں ہم نے ان کی معشیت کے اسباب ان کے درمیان دنیاوی زندگی میں تقسیم کیے ہیں۔ بعض کو بعض پر وسائل اور استعداد کے لحاظ سے برتری دی ہے تاکہ بعض، بعض دوسروں کو مقابل والوں کی حیثیت سے تسخیر کریں اور آخر کار سب ایک دوسرے کو مسخر کرلیں۔ تمھارے پرودگار کی رحمت اس سے جس کو وہ جمع کرتے ہیں بہتر ہے'' (زخرف۔ ۳۲)

چونکہ اس آیت کا مفہوم کچھ لوگوں کی نگاہوں سے پنہاں ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام چونکہ ایک گردہ کی دوسرے گردہ کے ہاتھوں تسخیر کا طرف دار ہے اور کچھ کے ہاتھوں دوسروں کے استحصال کا حامی ہے اس لیے موضوع بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے اس آیت میں ''تسخیر'' کے مفہوم کی وضاحت کی جائے گی۔

آیئے وہ ابہام جو بعض لوگوں کی نگاہ کے مطابق آیت میں موجود ہیں ان کو دور کریں۔ آیت کا مطلب واضح کرنے کے لیے آیت کے تین فقروں پر الگ الگ غور کریں۔

۱۔ ''نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوٰۃ الدنیا۔''

''ہم نے اسباب زندگی ان کے درمیان تقسیم کیے۔''

دیکھنا یہ ہے کہ خدا کی طرف سے تقسیم شدہ معیشت سے کیا مراد ہے؟

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے مراد مال و دولت اور محل اور جھونپڑی ہے جو خدا نے اوّل روز سے لوگوں کے لیے مقرر کردی ہے کہ یہ محل نشیں ہے اور وہ جھونپڑی میں رہنے والا ہے۔ مگر یہ تفسیر ''تفسیر بالرائے'' کہلائے گی۔ آیت یہاں انسان کی خلقت پر گفتگو کررہی ہے۔ چنانچہ یہاں معیشت سے مراد خلقت انسانی میں پوشیدہ متاع زندگی ہے مثلاً استعداد، لیاقت اور صلاحیت اس لیے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے انسان کی خلقت میں صلاحیتوں کا اختلاف رکھا ہے اور انسانوں کو گوناگوں استعداد کے ساتھ پیدا کیا ہے تاکہ لوگوں کے درمیان احتیاج اور ضرورت پیش آئے اور ایک دوسرے کی خدمات کے طرف وہ کھنچیں۔ اگر انسان کی خلقت اس طور نہ ہوتی تو پھر مندرجہ ذیل دو صورتیں ممکن تھیں۔

یا تو سب لوگ ہی ایک استعداد اور لیاقت کے ساتھ ہُوتے اور ہر فرد ان ہی صلاحیتوں کا حامل ہوتا جس کا دوسرا حامل ہو۔ اس میں وہی کمی ہوتی جو دوسرے میں ہوتی۔ یا پھر ایک کو ساری حلاحیتیں دے دی جائیں اور دوسرے کو کُچھ بھی نہ دیا جاتا۔ ان دونوں صورتوں میں معاشرے میں رشتہ اور خدمت وجود میں نہ آئے یہی وجہ ہے کہ ایک آیت میں فرمایا گیا ہے:

وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ﴿١٤﴾

''تم کو مختلف اطوار کا پیدا کیا گیا ہے۔'' (نوح)

امیر المومنین فرماتے ہیں:

"الناس بخیر ما اختلفوا فاذا ستووا ھلکوا"

''لوگ جب تک مختلف استعداد رکھتے ہیں، خیر و خوبی ہیں۔ اگر مساوی اور برابر ہو گئے تو نابود ہو جائیں گے۔''

یہ آیت کے ایک حصے کی وضاحت کی گئی۔ اب دوسرے فقرے کی طرف توجہ کی جاتی ہے:

۲۔ ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات۔"

''بعض کو بعض دوسروں پر ہم نے برتری عطا کی۔''

یہاں ایک دوسرا نکتہ بیان ہُوا ہے خداوند عالم نے پہلے حصّے میں اگر صلاحیتوں اور قابلیتوں کی تقسیم کا ذکر کیا تو اس حصّے میں ذکر کرتا ہے کہ ہم نے افراد کو یہ عطایا یکساں نہیں دیئے، بعض کو بعض پر صلاحیتوں میں برتری دی یعنی کسی نے ٹیکنیکل صلاحیت دوسروں نے زیادہ پائی تو اس دوسرے کو کسی دوسری استعداد میں پہلے پر برتری عطا فرمائی گئی۔ مثلاً انتظام و انصرام میں یہ دوسرا ماہر ہو اس طرح ان دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت درپیش ہو گی اور ان میں ایک رابطہ پیدا ہو جائے گا۔

۳۔ "لیتخذ بعضھم بعضاً سخریاً۔"

''بعض دوسرے کو اپنا مسخر کریں گے۔''

آیت کا یہ حصہ بعض افراد کی کچھ دوسرے افراد پر برتری کی علت بیان کرتا ہے۔ اس کی صورت وہی ہے، جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ یعنی اس کا مقصد باہمی تسخیر اور خدمت وجود میں لانا ہے تاکہ سب ہی فطری طور پر ایک دوسرے کے ضرورت مند ہو جائیں اور رشتے اور روابط پیدا ہوں۔ آیت کے اس فقرے کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ بعض لوگ دوسروں کا استحصال کریں اور ان سے بے جا فائدہ اٹھائیں۔ ایک گروہ ہمیشہ حاکم اور دوسرا ہمیشہ محکوم رہے اور اس طرح طبقہ بندی وجود میں آئے (جس کی اسلام سخت مذمت کرتا ہے)،

ایسی تفسیر اس بنیادی نکتے سے بے توجہی کی بناء پر ہے، جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا آیت کا یہ حصہ باہم برتری کا سبب بیان کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ باہم تسخیر کا وجود میں آنا ہوگا۔ تینوں حصوں کی توضیح کی جا چکی۔ معلوم ہوا کہ یہ آیت واضح طور سے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اجتماعی زندگی انسان کی خلقت و فطرت میں سموئی گئی ہے اور روز اوّل سے اس کی آفرینش کی اساس اسی پر رکھی گئی ہے۔

کیونکہ آیت استعداد اور صلاحیت کے بارے میں گفتگو کرتی ہے اور مزید کہتی ہے کہ صلاحیتوں اور لیاقتوں میں ہم نے بعض کو بعض پر برتری دی ہے۔ پھر ان دونوں کو باہم تسخیر کے مسئلے سے مربوط کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ استعداد کی تقسیم روز اوّل سے باہم تسخیر کو وجود میں لانے کے لیے ہے۔ اور یہ باہمی تسخیر اجتماعی زندگی کے سوا کوئی مطلب نہیں رکھتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجتماعی زندگی غایت خلقت اور ہدف آفرینش تھی اور ضروری ہے کہ یہ خلقت فطرت میں مضمر ہو۔ چنانچہ اجتماعی زندگی کسی جبر کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی نفع اور آرام طلبی کا نتیجہ ہے۔ بلکہ ایک داخلی اور اندرونی عامل جو روز اوّل سے اس کی فطرت میں موجود تھا اور یہ چیز ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

قرآن کا دائمی منشور 2

بائیسواں اصول

انسان کا عالمی یا الٰہی رُخ

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝۹۶

"اگر کسی آبادی کے لوگ ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو رحمت کے دروازے آسمان و زمین سے ہم ان پر کھول دیں گے۔ لیکن وہ تو آیات خدا کی تکذیب کے لیے اُٹھ کھڑے ہُوئے، تو ہم نے بھی انھیں ان کے اپنے کردار کی سزا دی۔" (اعراف)

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾

''اگر کسی آبادی کے لوگ ایمان لے آئیں اور تقوٰی اختیار کریں تو رحمت کے دروازے آسمان و زمین سے ہم ان پر کھول دیں گے۔ لیکن وہ تو آیات خدا کی تکذیب کے لیے اُٹھ کھڑے ہُوئے، تو ہم نے بھی انھیں ان کے اپنے کردار کی سزا دی۔'' (اعراف)

فلسفہ تاریخ اور عمرانیات سے متعلق کتابوں میں عام طور پر فرد کی ''اصلیت'' یا معاشرے کی اصلیت پر بحث ہوتی ہے ان میں معاشرے کے لیے دو بعد (Dimensions) سے زیادہ کا تصور نہیں ملتا۔ یعنی:

۱۔ بُعد انفرادی کہ جہاں فرد کی اصلیت پر اعتقاد ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام جس کی حمایت کرتا ہے۔ اور

۲۔ بُعد اجتماعی کہ سوشلزم جس کا حامی ہے۔

ان دونوں کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر ہم بعد میں واضح کریں گے۔ اس کے عمل کے جوہر کی مناسبت اس کے کردار اور رفتار کا ایک ردعمل ہوتا ہے نیک کردار کا اچھا ردعمل اور برے کردار کا بُرا ردعمل ہوتا ہے۔ اس کی توضیح اس طرح کی جا سکتی ہے:

اس جہان کے لیے جابروں اور قاہروں کا ظلم و ستم اور نیک و متقی افراد کی منصف مزاجی اور نیکی دونوں یکساں ہیں اس کے برعکس قرآن مجید پوری کائنات اور عالم امکان کے لیے مخصوص شعور ادراک کا قائل ہے اور اس کو انسان کے اعمال کی مناسبت سے بے پرواہ اور غیر متعلق نہیں سمجھتا، اس کا کہنا یہ ہے کہ معاشرے کا یہ بُعد اور رُخ عام حساب و کتاب سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس کا صرف دل کی نگاہ سے ادراک ہو سکتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ

''تمام اجزائے عالم خدا کی ہر نقص و عیب سے پاکی بیان کرتے ہیں لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں پاتے۔''

(بنی اسرائیل۔ ۴۴)

یہ شعور کس قسم کا ہے جو عالم میں موجود ہے اور یہ رابطہ کیسا ہے جو انسان کی اچھی بُری رفتار اور عالم کے اچھے اور بُرے ردعمل کے درمیان موجود ہے، یہ اس خاکی انسان سے قطعی پوشیدہ ہے۔ اور

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

(بقرہ۔ ۳)

کے حکم کے تحت اس پر ایمان رکھنا چاہیے اگر چہ اس کی حقیقت ہم پر واضح نہیں۔
اس جہت پر جو آیات گواہی دیتی ہیں وہ اتنی زیادہ ہیں کہ یہاں سب پیش نہیں کی جاسکتیں۔ان میں سے چند آیات کا ہم ذکر کریں گے۔

۱۔وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴿۹۶﴾

''جب ایک آبادی کے لوگ ایمان لے آئیں اور تقوٰے اختیار کریں۔تو ہم رحمت و برکت کے دروازے آسمان اور زمین سے ان پر کھول دیتے ہیں۔لیکن وہ تو آیات الہیٰ کی تکذیب کے لیے کھڑے ہو گئے،ہم نے بھی انھیں انکے اعمال کی سزادی۔'' (اعراف)

یعنی ہمارے اچھے اور بُرے اعمال آسمان و زمین کی رحمت کے دروازوں کے کُھلنے اور بند ہونے میں اپنا اثر رکھتے ہیں مگر چونکہ کائنات کے سارے علل واسباب انسان پر منکشف نہیں ہوئے،اس لیے ضروری نہیں کہ وہ اپنے اعمال کی تاثیر سے انکار کر دے۔
ایسے عمل اور ردعمل پر اعتقاد ویسا ہی ہے جیسا اولیاء اللہ کے معجزات اور کرامت پر اعتقاد رکھا جائے۔معجزہ اور کرامت کسی سبب کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہوتے مگر اس سبب اور علت سے آگاہ نہیں ہوتے ہم ان اسباب کو جن کو سمجھ سکتے ہیں اور ان کو جن کو ہم سمجھ نہیں سکتے الگ الگ نہیں کر سکتے اگر کسی نیک آدمی سے ایک غیر معمولی فعل سرزد ہوتا دیکھیں جو عام معیار سے مطابقت نہیں رکھتا تو اس کے انکار کے لیے نہ کھڑے ہو جائیں اور یہ نہ کہنے لگیں کہ یہ ناممکنات میں سے ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ فعل جو سرزد ہوا اس کا سبب اور علت ہم نہیں سمجھ سکتے۔
حضرت نوحؑ جیسے اولی العزم پیغمبر جو پہلے صاحب شریعت نبی ہیں۔استغفار اپنے ساتھ یہ بارش،مال اولاد،افزائش پھلوں کی کثرت اور چشمے ابلنے کا سبب سمجھتے ہیں۔اب یہ استغفار اپنے ساتھ بارش،مال،اولاد،پھلوں کی کثرت کس طرح لاتی ہے،اور گناہوں سے ندامت اور ان فطری مظاہر میں کیا رابطہ ہے،ظاہر ہے کہ یہ انسان سے پوشیدہ ہے۔ہمارا علم ان سارے روابط پر دسترس حاصل نہیں کر سکتا۔اس سلسلے کی آیات یہ ہیں:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴿۱۰﴾

۲۔''اپنے رب کے حضور استغفار کرو وہ گناہوں کو بخشنے والا ہے۔'' (نوح)

يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿۱۱﴾

''اچھی بارش والے بادل بھیجے گا۔'' (نوح)

وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ

'مال واولاد کے ذریعے تمھاری مدد کرے گا۔'' (نوح۔۱۲)

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ

''تمھیں باغات عطا کرے گا۔'' (نوح۔۱۲)

وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴿۱۲﴾

''اور تمہارے لیے چشمے نکالے گا۔'' (نوح۔۱۲)

اس ضمن کی آیات بہت سی ہین۔ مگر یہاں سب پیش نہیں کی جاسکتیں۔ بس اس کی نشاندہی کی جاتی ہے کہ معاشرے کے اس بُعد و جہت پر اعتماد معاشرے کی اصلاح میں بہت ہی عمدہ اثر رکھتا ہے۔

وہ مکتب فکر جس کا کہنا ہے کہ اس عالم ہستی میں انسان کے ہر چھوٹے بڑے عمل کے لیے اس عمل کی مناسبت سے ردعمل موجود ہے اور انسان کا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی کبھی بے اثر نہیں ہوتا، کیا اصلاح آفرین نہیں، یہ مکتب فکر انسان کو نیک عمل کی ترغیب دیتا ہے یا وہ مکتب فکر جو اس عالم کو اندھا اور بہرہ سمجھتا ہے جس کے نزدیک یہ عالم نہ سننے والے کان رکھتا ہے اور نہ دیکھنے والی آنکھ، انسان کے اعمال پر کوئی ردعمل نہیں رکھتا۔ اس کے لیے جابر و ظالم اور منصف اور عادل دونوں ہی ایک ہیں۔ آپ خود ہی فیصلہ کر لیں کہ ان دو مکاتب فکر میں سے کونسا معاشرے کی اصلاح کر سکتا ہے اور اس کی پاکیزگی اور تقوے کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔

چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاشرے پر ایسے لوگوں کو حکومت کرنی چاہیے جو ان روابط سے آگاہ ہوں اور قوانین کے وضع کرنے میں معاشرے کے لیے صحیح پروگرام دیتے وقت اس بُعد اور جہت سے غافل نہ ہوں۔

پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں:

''اذا كثر الزنا، كثرت الفجاة۔''

''اگر معاشرے میں ناپاکی زیادہ ہو جائے تو سکتہ کی بیماری کی کثرت ہو جائے۔''

زنا اور سکتے کی بیماری میں ربط آج واضح نہیں ہے۔ یہ وحی ہے جو ایسی حقیقتوں سے پردہ اُٹھاتی ہے اور اس بیماری کے پھیلاؤ کے ان اثرات کی نشاندہی کرتی ہے جن پر انسانی علم نے ابھی تک دسترس حاصل نہیں کی آج بھی کتنے غیر مرئی عوامل موجود ہیں جو انسان سے پوشیدہ ہیں اس کے باوجود وہ اپنے ناقص علم پر مغرور ہے۔ یہ حدیث اور اس جیسی دوسری احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرہ ایک نامیاتی [1] رشتے سے منسلک ہے جس کے ذریعے ایک گروہ دوسرے گروہ پر اثر انداز ہوتا ہے، خواہ وہ اس سے بیزار ہی کیوں نہ ہو۔

اب جب معاشرے کے بُعد جہانی یا بعد الٰہی سے ہم آگاہ ہو گئے ہیں تو ہم اس بات کا اضافہ کرتے ہیں کہ معاشرہ دو دوسرے بعد و جہات بھی

---

[1] نامیاتی رشتہ یا جسمانی پیوند غیر نامیاتی رشتہ یا مشینی پیوند کے مقابل ہے، نامیاتی رشتے کی بدولت معاشرے میں ایک ہی روح کارفرما ہوتی ہے لیکن غیر نامیاتی رشتے میں معاشرہ اس سے خالی رہتا ہے آئندہ ابواب میں آپ ان دو قسم کے معاشرتی رشتوں کے بارے میں مزید تفصیل دیکھیں گے۔

رکھتا ہے، یعنی بُعد انفرادی اور بُعد اجتماعی، یہ دونوں بُعد اس صورت میں واضح ہوں گے کہ ہم اس بارے میں مختلف نظریات پر غور وغوض کریں۔

(۳) فرد حقیقی ہے یا معاشرہ

انسان کی اجتماعی زندگی اس بات کا سبب ہے کہ ہر فرد کی زندگی ایک خاص حد تک اس معاشرے سے وابستگی رکھتی ہو۔ جہاں وہ زندگی بسر کرتا ہے۔اس بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ان کے بارے میں مختصراً یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

الف۔ فرد حقیقی ہے:

اس سے مراد یہ ہے کہ ایک فرد اپنی زندگی سنوارنے میں آزادانہ رویہ اختیار کرے تو اجتماعی زندگی پر کوئی زد نہ پڑے، معاشرہ افراد کا مجموعہ ہے۔گروہی زندگی کا بنیادی محرک فرد کی خواہشات کی تکمیل اور شخصی تمناؤں کی رسائی ہے اور وہ بھی اجتماعی زندگی کے سائے ہیں۔

یہاں انسان اجتماعی نظام کے نام پر قوانین وضوابط کو اس لیے قبول کرتا ہے کہ جن مصلحتوں کو اپنانا چاہتا ہے ان کے ذریعے وہ ان تک پہنچ سکے۔

اس نظریے کے تحت معاشرے کی خرابی دراصل فرد کی خرابی ہے اور اس کی اصلاح فرد کی اصلاح کے ذریعے ممکن ہے۔

مختصر یہ کہ ایسے ماحول میں ہر جگہ فرد کا ارادہ اس کے میلانات اور مصلحتیں پیش نظر ہوتی ہیں۔آدمی ایسے نظام قائم کرتا ہے کہ ان کے تحت وہ اپنے مقاصد کو حاصل کرسکے۔

ب۔ معاشرہ حقیقی ہے:

اس سے مراد ہے کہ فرد کی زندگی اس کے اجتماعی ماحول کے تابع ہے۔اس لیے کہ اگر فرد زندگی میں کئی رُخ سے اپنے فطری ماحول کے تابع ہو جائے تو یقیناً دوسرے رُخ سے اپنے اجتماعی یا طبقاتی حالات کے چنگل میں گرفتار ہو جائے گا۔

زیادہ واضح الفاظ میں جو چیز خارج میں حقیقت رکھتی ہے وہ معاشرہ اور انسان اجتماعی ہے نہ کہ ایسا فرد جو دوسروں سے آزاد ہو۔ایسے معاشرے میں جو کچھ ہم کو نظر آتا ہے وہ آپس میں روابط رکھنے والے اور گروہی طرز پر زندگی بسر کرنے والے انسان ہیں۔

دوسرے لفظوں میں جس طرح نظام خلقت میں ہر وہ فطری وجود ظہور پذیر ہوا اور وہ ایک کُل کا جُزو ہے اور خود آزادانہ حیثیت نہیں رکھتا مثلاً زمین نظام شمسی کا ایک حصہ ہے۔زمین میں جو کچھ بھی پیدا ہوا وہ بھی ایک کل کا جزو ہے اور ایک نظام کے تابع ہے ٹھیک اسی طرح انسانوں میں سے ہر فرد معاشرے کا جزو اور اس کے تابع ہے۔اور اگر ایک فرد ارادہ بے نیازی اور سیری یا خواہش اور بصیرت رکھتا ہے تو یہ سب اس کے اجتماعی عناصر اور عوامل کا پرتو اور عکس Reflex ہے۔

اس نظریے کے مطابق معاشرے میں فرد کی حیثیت وہ ہے جو انسان کے جسم میں ایک سیل Cell کی ہوتی ہے اس سیل کی بھی اپنی زندگی اور نشوونما ہے۔مگر باقی سارے حالات وکیفیت میں جیسے صحت بیماری اعتدال یا بے اعتدالی ہر صورت وہ سیل اس بدن کا تابع ہے، جس کا وہ جزو ہے۔یہی

حال فرد کا معاشرے میں ہے وہ اسی طرف کھینچتا ہے جدھر معاشرہ کھینچتا ہے

اس نظریے کے حامی کبھی اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ فرد کو سو فیصد معاشرے یا اپنے طبقے سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ ایسا کہ گویا معاشرتی اور اپنے طبقاتی ماحول کی پیروی کے بغیر اس کو کوئی چارہ نہیں۔ فرد کی اصلاح جب ہی ہو سکتی ہے جب معاشرے میں انقلاب آئے۔ یعنی غلط اور فاسد نظام کا تختہ اُلٹ دینا چاہیے تا کہ فرد کی اصلاح ہو سکے۔

ایک تیسرا نظریہ بھی ہے جو ان دو شدید نظریوں کے درمیان راہ اعتدال کے مانند ہے۔ تعلیمات اسلامی کی رُوح اس نظریے کی تائید کرتی ہے۔ اس کو (فرد اور معاشرہ دونوں حقیقتیں ہیں) کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں دو نکات کو پیش کیا جائے گا جس سے یہ نظریہ واضح ہو سکے گا۔

ا۔ اس کو نظر میں رکھتے ہوئے کہ اجتماعی زندگی انسان کی فطرت میں مضمر ہے وہ پہلا نظریہ جو افراد کو محور قرار دیتا ہے اور اجتماعی زندگی کو فرد کی خواہشات کے پورا ہونے کا ذریعہ سمجھتا ہے، حقیقت سے دور ہو گا۔

انسان انتخاب کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایک با مقصد مخلوق ہے۔ اس کی فطرت میں حریت، آزادی اور اختیار مضمر ہے۔ اس لیے اس کو فطری ماحول اور معاشرے کی کیفیات سے سو فی صد منتھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اجتماعی عوامل کے چنگل کا اسیر ہے اور وہ اسی طرف جاتا ہے جدھر معاشرہ رواں دواں ہے، کیونکہ اجتماعی عوامل کا اثر فطری ماحول کے اثر بڑھ کر نہیں۔ جس کے مطابق انسان اپنی خواہش اور کوشش سے ماحول کے حالات پر کامیابی حاصل کر لیتا ہے اور فطرت پر کنٹرول حاصل کر لیتا ہے۔

انسان فطرت پر قابو پا کر اپنی مصلحتوں اور ضروریات کے تحت اس کی رہبری کرتا ہے یہاں تک کہ اپنی زندگی کے ماحول پر کامیابی حاصل کرتا ہے۔ اس میں اپنی ضروریات کی مناسبت سے تبدیلی بھی لا سکتا ہے۔ معاشرے پر حکمران قوانین کو پہچان کر اس کے راستے کو اپنے مفاد اور ہدف کی طرف موڑ سکتا ہے اور نہیں تو کم از کم اپنی بعض خواہشات کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔

بیشک معاشرے کے کچھ قوانین اور ضابطے ہوتے ہیں مگر ان میں سے بعض قوانین اور ضوابط معاشرے کے فعال افراد کی دانش و بینش سے متعلق ہیں۔ یہ لوگ ان قوانین اور ضوابط کو اچھی طرح سمجھتے ہُوئے ان کے طرز اور روش میں تغیر و تبدیلی لا سکتے ہیں۔

چنانچہ پہلے دونوں نظریات افراط و تفریط کے حامل ہیں۔ اور یہی فرد اور اجتماع دونوں ہی حقیقت ہیں کا نظریہ اپنانا چاہیے تعلیمات اسلامی سے بھی یہی تیسرا نظریہ مترشح ہوتا ہے۔ اسلام تزکیہ نفس تہذیب اخلاق اور انفرادی عبادت کی طرف دعوت دیتا ہے اور انسان کے انتخاب کی خوبی پر بھروسہ کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے:

لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ

''دوسروں کی گمراہی تمھارے لیے جو ہدایت کے خواہاں ہین ضرر اور نقصان نہیں پہنچاتی۔''

(مائدہ۔۱۰۵)

چنانچہ اس بہانے سے کہ فرد کی کیفیت معاشرے کی عمومی کیفیت کے تابع ہے انسان کو (ماحول آلودہ ہونے کے موقع پر) اپنی اصلاح اور تزکیہ

سے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔

قیامت کے روز ان لوگوں سے جو تسلط کے زیر اثر انحرافات کی طرف کھینچ جاتے ہیں، خطاب ہوگا:

''تم کہاں تھے کہ اس حد تک آلودہ ہو گئے''؟

تو وہ کہیں گے کہ ہم مستضعفین اور افراد زیر تسلط کے تھے۔ اس وقت خطاب ہوگا۔

اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ

''کیا اللہ کی زمین اتنی وسیع و عریض نہیں تھی کہ تم دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت کر جاتے''؟

(نساء۔۹۷)

یہ آیت اور اس جیسی دوسری آیات انسان کی اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں بنانے اور اس کی آزادی کی اور اپنا انتخاب خود کرنے کی نشاندہی کرتی ہیں:

چنانچہ فرد کو ہر لحاظ سے معاشرے میں ضم اور گم نہیں سمجھنا چاہیے۔

ساتھ ساتھ اسلام اجتماعی عوامل کو بھی فرد کی زندگی میں موثر سمجھتا ہے۔ ماحول کو پاکیزہ رکھنے کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کی دعوت دیتا ہے۔ خبردار کرتا ہے اور فرماتا ہے:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً ۚ

''عذاب اور بلا سے ڈرو جو صرف ظالموں کے لیے نہیں ہوتی بلکہ ان پر بھی نازل ہوتی ہے، جو ان ظالموں کے ہاتھ نہیں روکتے۔'' (انفال۔۲۵)

امام محمد باقر اس سلسلے میں فرماتے ہیں[1]

"فانکروا بقلوبکم والفظوا بالسنتکم و صکوبها جباههم ولا تخافوا فی الله لومة لائم ۔۔۔ فجاهدوهم بأبدانکم وابغضوهم بقلوبهم غیر طالبین سلطانا ولا باغین مالا۔"

''گناہگار شخص کے عمل کو دل سے بُرا سمجھو، زبان سے بھی کہو اور ان کی پیشانیوں پر مارو۔ راہ خُدا میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرو اپنے بدنوں سے راہ خدا میں جہاد کرو گنہگاروں سے اپنے دل کی گہرائیوں سے نفرت کرو۔ اس راستے میں طاقت اور مال کے حصول کے پیچھے مت پڑ جاؤ۔''

---

[1] کافی جلد ۵۔ ص ۵۶ ملاحظہ کریں۔

اگر فرد کا ارادہ اور عمل معاشرے کے ارادے کا اسیر ہو تو پھر ایسی کوششوں اور اصلاح کی دعوت دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اسلامی علم عمرانیات میں اس معاشرے کو جس میں افراد کے ارادے سے اُس کی خصوصیات تشکیل پاتی ہیں آزادی انتخاب کا حامل معاشرہ کہنا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ اس تشکیل میں اجتماعی، ثقافتی اور اقتصادی عوامل کا بھی بھرپور ہے۔ مگر ساتھ ساتھ افراد کی دانش و بینش اور سعی و کوشش بھی مقصد اور طریق کار کے انتخاب میں موثر ہوتی ہے انبیاء انسان کی اسی آزادی انتخاب کی صفت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہتے تھے:

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝٣٨

''ہر شخص اپنے اعمال کا گردی ہے۔'' (مدثر)

چونکہ افراد اپنے راستے کے انتخاب میں آزاد ہوتے ہیں اس لیے قرآن کی نظر میں معاشرے بھی مکمل طور پر آزاد و مختار ہیں اور اپنے اعمال اور فیصلوں کے ذمہ دار ہیں۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۖ

''یہ ہے حال گذشتہ اُمت کا اس کے لیے ہیں وہ کام جو اس نے کیے ہیں اور تمھارے لیے ہیں وہ کام جو تم نے انجام دیتے ہیں'' (بقرہ۔ ۱۳۴)

(۴) معاشرے کی ہیئت ترکیبی

مندرجہ بالا گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے فرد اور معاشرہ دونوں ہی حقیقی ہیں اور بنیادی کردار کے حامل ہیں۔ اسلام فقط فرد کی ایسی آزادی کا حامی نہیں ہے کہ معاشرے کے وجود حقیقی اور کسی قانون و ضوابط اور اس کے تشخص کا قائل نہ ہو اور جس میں ہر فرد کی ایسی آزادی کی سرنوشت سوفی صد دوسروں سے جدا سمجھی جائے۔

یہ بھی نہیں کہ صرف معاشرے کی اصالت کا قائل اور حامی ہو۔ یعنی صرف روح اجتماعی، شعور اجتماعی اور ارادۂ اجتماعی وجود رکھتے ہوں اور نہ فرد کا کوئی ارادہ کام آتا ہو نہ اس کو کسی قسم کی آزادی ہو کہ وہ خود مختار ہو۔

اسلام ان دونوں نظریات کے درمیان اپنا ایک الگ راستہ اور نظریہ رکھتا ہے، وہ معاشرے کے لیے حقیقی وجود اس کی سرنوشت اور الگ تشخیص کا بھی قائل ہے اور ساتھ ساتھ فرد کی آزادی اور اختیار کا بھی قائل ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ معاشرے کی حقیقت کیا ہے اور اس کا وجود کس قسم کا ہے۔

ا۔ حقیقی کیمیائی ترکیب

اس ترکیب حقیقی سے مراد ایسا مرکب ہے کہ کس کے اجزا ایک دوسرے پر اثر انداز ہوں اور ایک نیا وجود نئی ماہیت کے ساتھ پیدا ہو اور اجزاء

ایک دوسرے میں مدغم ہو جانے کی وجہ سے اپنی آزاد حیثیت اور اثرات کو کھو بیٹھیں اور سارے اجزاء کے اثرات مرکب کے وجود میں حل ہو جائیں۔ کیمیائی ترکیب میں مثال کے طور پر دو عناصر ''کلورین'اور''سوڈیم''مل کر ایک نیا مرکب بناتے ہیں۔ دونوں اپنی ذات اور اثر کو نئے مرکب کے وجود میں حل کر دیتے ہیں۔ کلورین اور اس کی خصوصیات آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

ب۔ ترکیب صنعتی

یہ ایک ایسی حقیقی ترکیب ہے جس میں ایک مشین کے اجزاء ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں اس کے ایک حصے کی خرابی دوسرے حصے کی خرابی کا سبب بن جاتی ہے اس فرق سے کہ کیمیائی مرکب میں بھی اپنی شخصیت کھو بیٹھتے ہیں اور فطراتاً ہر جز کے اثرات اپنی آزادانہ فعالیت ختم کر دیتے ہیں اور جُز کی ذات اپنے اثر کے ساتھ کُل میں ضم ہو جاتی ہے۔ مگر ترکیب صنعتی میں ہر جز کی شخصیت ایک واحد مصنوع میں اپنی جگہ محفوظ رہتی ہے۔ صرف ہر جز واپنی آزادی کھو بیٹھتا ہے۔ چنانچہ مرکب صناعی پر جو اثر مرتب ہوتا ہے، وہ ہر ہر جز و کے اثرات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔

مثلاً ایک موٹر کار کچھ لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ یہاں منتقل کیا جانا نہ اس کے کسی ایک جز و کا اثر ہے اور نہ سارے اجزاء کے جدا جدا اثرات کا مجموعہ ہے۔

ج۔ ترکیب اعتباری

اس سے مراد ایک طرح کی ذہنی وحدت ہے۔ ذہن امور کے ایک سلسلے کو ایک ہی چیز حساب کرتا ہے۔ مثلاً کسی دعوت میں چند افراد دستر خوان کے گرد بیٹھتے ہیں۔ مگر وہ ایک ہی ضیافت شمار ہوتی ہے۔ کسی جلوس میں ایک خاص مقصد کے تحت ہزاروں آدمی ایک ساتھ سڑکوں پر چلتے ہیں۔ مگر وہ ایک جلوس کہلاتا ہے اور شرکاء کو جن میں سے ہر ایک اپنا مستقل وجود رکھتا ہے ان کو کل کے ایک جز و کی حیثیت سے دیکھا جاتا۔

دیکھنا چاہیے کہ معاشرے کی ترکیب ان میں سے کونسی ہے۔

کبھی خیال کیا جاتا ہے معاشرے کی ترکیب ''ترکیب اعتباری'' ہے معاشرے کے افراد فوج کے دستے کے سپاہیوں کی طرح ہیں جو ایک دستے یا بریگیڈ کے نام سے ایک وحدت کے حامل ہین یا ان افراد کے مانند ہیں، جو کسی خطیب کی تقریر سنتے ہیں اور پھر منتشر ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ اجتماع اور دستے حقیقی وحدت نہیں رکھتے اور نہ ترکیب کیمیائی اور ترکیب صنعتی کا سبب بنتے ہیں۔ بلکہ ان کی ترکیب ذہنی اور فکری ہے۔

کبھی خیال کیا جاتا ہے کہ معاشرے کے افراد کی ترکیب میکینیکی ترکیب ہے۔ صنعتی مرکب ایک مرکب حقیقی ہوتا ہے گو مرکب کیمیائی میں فرق یہ ہے کہ مرکب کیمیائی میں اجزاء اپنی ماہیت کھو بیٹھتے ہیں اور وہ کُل میں ضم ہو جاتے ہیں۔ مگر مرکب صنعتی میں اجزاء اپنی ماہیت نہیں کھوتے۔ صرف اپنی آزادی اور اس کے ذریعے اپنا اثر کھو دیتے ہیں اور اجزاء ایک خاص طریقے سے ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ ان کے اثرات بھی ایک دوسرے میں پیوستہ ہو کر ایک اثر پیدا کر لیتے ہیں۔ جو اجزا کے اپنے اپنے آزادانہ اثرات کا بعینہ مجموعہ نہیں ہوتا۔ ساتھ ساتھ حصے میں تغیر اور تبدیلی دوسرے حصے میں تبدیلی کا سبب بنتی ہے۔ جیسے ایک ترازو جس میں ایک پلڑا زیادہ بھاری ہو جائے تو دوسرے پلڑے میں بھی

تبدیلی آجائے گی۔

بعینہ یہی تصور معاشرے کی ترکیب میں انجام پایا جاتا ہے۔

اس نظریے کے مطابق معاشرہ اصلی اور فرعی بنیادوں اور اساس سے تشکیل پاتا ہے۔

یہ بنیادیں اور افراد ایک دوسرے سے پیوستہ اور وابستہ ہیں۔ ہر بنیاد میں تغیر اور تبدیلی خواہ وہ ثقافتی نوعیت کی ہو یا مذہبی نوعیت کی یا پھر اقتصادی ،سیاسی ،عدالتی اور تربیتی نوعیت کی بہرحال دوسری بنیادوں میں تبدیلی کا سبب بنے گی۔ اجتماعی زندگی معاشرے کی پوری مشینری کے اثر کے تحت پیدا ہوگی۔ لیکن یہ نہیں ہوگا کہ افراد پورے معاشرے کے اندر اپنا تشخص کھودیں۔[1]

معاشرے کی وحدت سے قرآن کی مراد

معاشرے کی وحدت سے قرآن کا مقصد کچھ اور ہے۔ اس کی ترکیب ایک ترکیب حقیقی ہے مگر نہ ترکیب اعتباری ہے، نہ ترکیب صنعتی اور نہ ترکیب کیمیائی۔ وہ ان میں سے کسی ایک سے مشابہ نہیں۔ افراد سے جو ترکیب بنتی ہے وہ ان کے بدن کے عنصر سے نہیں۔ بلکہ ان کے خیالات، جذبات اور خواہشات کے ذریعے ایک مرکب ظاہر ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ثقافتی ،اقتصادی سیاسی ،مذہبی اور تربیتی ترکیب ہے اور اس ترکیب و مرکب کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ جب افراد اپنے فطری اور اکتسابی اثاثے کے ساتھ اجتماعی زندگی میں شریک ہوتے ہیں۔ تو ان میں سے ہر ایک اپنے روحی جہات میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس طرح سارے کا سارا معاشرہ ایک ہی رُوح میں ڈھل جاتا ہے۔ گویا افراد کے جذبے ایک دوسرے میں کم وبیش ہونے کے بعد ایک تازہ رُوح، نیا وجود اور خاص فرہنگ وتمدن پیدا ہوتا ہے۔ جو پہلے موجود نہیں تھا ۔ یہ نیا تمدن ہر فرد کے جذبوں کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اس کو ہم ترکیب حقیقی یا ترکیب نامیاتی پکارتے ہیں یعنی اس مرکب کے سارے عناصر ایک وحدت حقیقی کی خواہشات ،ارادوں وغیرہ سے لیس ہیں۔ اس کی مثال انسانی جسم کے سیل (Cell) کی ہے ہر سیل (Cell) اپنا ایک وجود اور شخصیت رکھتا ہے۔ ہر اکائی ایک آزاد زندگی شمار ہوتی ہے۔ لیکن مجموعے پر ایک ہی رُوح حکومت کرتی ہے۔

سارے سیل مل کر انسان کو تشکیل دیتے ہیں۔ اسی کو نامیاتی ترکیب کہتے ہیں۔ مگر اس وحدت اور یگانگی کے اعتراف کے باوجود معاشرے کی ترکیب ان میں سے کسی سے بھی نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے کہ معاشرہ ایک ہی رُوح اختیار کر لیتا ہے تو معاشرے کی ترکیب کو ترکیب حقیقی کہنا چاہیے ۔لیکن چونکہ افراد کی شخصیت اور ان کا تشخص نسبتاً محفوظ ہے اور معاشرے میں ختم نہیں ہوجاتا اس لیے اس کو ترکیب کیمیائی نہیں کہہ سکتے آزادی اختیار کی صلاحیت ہونے کی بناء پر فرد کا اثر سوفی صد کُل کے ساتھ وابستہ نہیں۔ پھر فرد اپنے وجود کی آزادی کسی حد تک محفوظ رکھ سکتا ہے اس لیے اس کی ترکیب، ترکیب صنعتی نہیں۔

دوسرے لفظوں میں قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ ایک جہت سے فرد اصالت کا حامل ہے اور دوسری جہت سے معاشرہ اصالت کا حامل ہے۔ اس لحاظ

---

[1] جامعہ وتاریخ۔ص ۱۷ اور ۱۸

سے کہ معاشرے کے اجزاء یعنی اس کے افراد خود معاشرے میں اور ہر جزو کا اثر معاشرے کے کل اثر میں ضم اور گم نہیں ہوتا اور معاشرے کے لیے قرآن ایسے وجود کا قائل نہیں جس میں اس کے اجزاء اپنا تشخص کھو بیٹھیں ۔ یہ اصالت فروی ہے ۔ معاشرے کی ترکیب طبیعاتی، کیمیائی یا صنعتی نہیں ہے ۔ لیکن افراد روحانی، فکری، جذباتی، ثقافتی اور تمدنی مسائل کی نظر سے ایک قسم کی وحدت اور نیا تشخص پیدا کر لیتے ہیں ۔ اس جہت سے اصالت اجتماعی ہوئی ۔ مسائل روحی کی ترکیب، ترکیب حقیقی ہوگی اور اجزاء کی تاثیر و تاثر کے زیر اثر جدید اور زندہ حقیقت پیدا ہو جائے گی ۔ چنانچہ معاشرہ جدید اور نئی رُوح، شعور، وجدان، ارادہ اور خواہش پیدا کر لے گا ۔ انفرادی شعور اور شخصی وجدان کے ساتھ ساتھ اجتماعی شعور و وجدان بھی پیدا کر لے گا ۔

ارشاد الہیٰ ہے:

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ط

''ہر امت کے لیے خاص وقت اور مدت ہے ۔'' (یونس)

انسانی معاشرہ اس اصول کے مطابق دراصل ایک نامیاتی ترکیب رکھتا ہے ۔ یعنی باوجود یکہ معاشرے کے افراد اس طرح آزاد ہیں کہ ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہو جائیں ۔ مگر معاشرے پر ایک ہی رُوح حاکم ہے، جو معاشرے کے افراد سے خدمت لیتی ہے ۔ ہر فرد سیل (Cell) کی سی کیفیت رکھتا ہے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ معاشرہ ایک زندہ موجود ہے جو اپنے لیے حیات و موت، عمر اور اجل رکھتا ہے ۔ اس کی وحدت اور حیات خود اسی کے ساتھ مخصوص ہے ۔ وہ دوسرے مرکب سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا ۔ اس اصالت اور وحدت میں مجاز کا چھوٹے سے چھوٹا شائبہ جیسا کہ سعدی کہتا ہے ''بنی آدم ایک دوسرے کے اعضاء ہیں'' نہیں ہے ۔

معاشرے کی حقیقت کے بارے میں قرآں کا نظریہ ماہر عمرانیات دورکیم جیسا ہے ۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ معاشرہ خود سے تشخص حیات و حقیقت رکھتا ہے ۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ وہ معاشرے کی اصالت کو اتنا بڑھا تا چڑھا تا ہے کہ فرد کو ایک اعتباری شے سمجھتا ہے کہ جس پر خاص توجہ کی ضرورت نہیں بلکہ اسکو دور رکھنا چاہیے ۔ اس کے برعکس قرآن معاشرے کی اصالت کے ساتھ ساتھ اصالت اور آزادی و اختیار کا بھی قائل ہے ۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس کی ترکیب حقیقی ہے کیمیائی اور صنعتی نہیں ۔

جب معاشرہ اصلیت رکھتا ہے تو لازماً معاشرے کی حیات رُوح حیثیت اور اس کی وحدت بھی محفوظ رہے گی ۔ انسانی جسم کے سیل (Cell) کی طرح جو ترتیب کے ساتھ مرتے اور ختم ہوتے ہیں ۔ لیکن فرد کا جسم اور اس کی شخصیت باقی رہ جاتی ہے ۔

خلاصہ یہ کہ ایک معاشرے کے اجزاء کی ایک دوسرے سے وابستگی کھلاڑیوں اور تماشائیوں کی طرح نہیں جو کچھ وقت ایک ساتھ ساتھ ہوتے ہیں اور چند کھیل تماشے دیکھ کر منتشر ہو جاتے ہیں یا کسی قافلے کے مسافروں کی طرح بھی نہیں جو سفر کی تکان اتارنے کے لیے ایک جگہ اتر پڑتے ہیں اور ادھر اُدھر گوشوں میں چلے جاتے ہیں ۔ اچانک سڑک پر کوئی وحشتناک حادثہ پیش آتا ہے تو وہ سب اکٹھے ہو جاتے ہیں ۔ ایسا نہیں بلکہ اس سے

کہیں بالاتر ایک وابستگی رکھتے ہیں جس میں ایک روح کی حکمرانی ہوتی ہے۔

معاشرے کے لیے قرآن اس حد تک حقیقت کا قائل ہے کہ اس کو اپنے کاموں کا ذمہ دار سمجھتا ہے جیسا کہ فرمایا:

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾

''یہ اُمت اور معاشرہ ہے جو گزر چکا وہ اپنے اعمال کا جواب دہ ہے اور تم اپنے اعمال کے جواب دہ ہو۔ گذشتہ لوگوں کے تم جواب دہ نہیں ہو۔''[1] (بقرہ)

استاد عالی قدر طباطبائی اس ضمن میں فرماتے ہیں:

''اسلام نے افراد کی تربیت میں فرد اور معاشرے میں رابطے کو نظر میں رکھا ہے''

اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۗ

''وہی تو ہے جس نے پانی سے بشر کو خلق کیا۔ پھر اس کی آفرینش میں نسب اور سبب کے پیوند لگائے''۔ (فرقان۔ ۵۴)

یہ حقیقی رابطہ جو فرد اور معاشرے کے درمیان برقرار ہے اس بات کا سبب ہے کہ فرد کی صلاحیتیں اور اس کے ادصاف معاشرے میں بھی ظاہر ہوں۔ جس انداز سے افراد اپنی استعداد اور توانائیوں سے اور اپنے وجود کے اثرات سے معاشرے کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اسی تناسب سے معاشرے کے خواص وآثار وجود بھی پیدا کرتے ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ''ملت'' کے لیے وجود اجل، کتاب، شعور۔ فہم۔ عمل، طاعت اور معصیت کا قائل ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٤﴾

''ہر امت کے لیے ایک اجل اور دور ہے۔ جو نہ ایک لمحہ پیچھے ہٹ سکتا ہے اور نہ ایک لحظہ آگے بڑھ سکتا ہے۔'' (اعراف)

قرآن یہ بھی فرماتا ہے:

---

[1] یہی مضمون سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۱ میں بھی آیا ہے

كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ

"ہر امت اپنی کتاب کی طرف پکاری جائے گی۔" (جاثیہ۔۲۸)

نیز فرماتا ہے:

زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪

"ہر امت کے عمل کو ہم نے اس کی نظر میں زینت دی ہے۔" (انعام۔۱۰۸)

یہ بھی فرماتا ہے:

مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ

"ان میں سے ایک اُمت میانہ رو ہے۔" (مائدہ۔٦٦)

مزید فرماتا ہے:

اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ

"معمم اُمت ہے جو آیات خدا کی تلاوت کرتی ہے۔" (آل عمران۔۱۱۳)

اور فرماتا ہے:

وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝

"ہر ملت کوشش کرتی تھی کہ اپنے رسول کو پکڑے اور اپنے باطل کی راہ میں اس سے جدال کرے تا کہ حق کو پامال کر دے، لیکن ہم نے ان کو پکڑا اور کیسا تھا ہمارا عقاب و سزا۔" (مومن)

اس آیت سے حق سے مبارزہ کرنے کے ایک اجتماعی منصوبے کا پتہ چلتا ہے۔ ایسے عمومی منصوبے کا نتیجہ عمومی عذاب ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

فَاَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝

"ہم نے سب کا مواخدہ کیا۔" (مومن)

نیز قرآن فرماتا ہے:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ

''ہر امت کے لیے رسول ہے۔ جب ان کے پاس رسول آیا تو عدل کے مطابق حکم ہوا اور پھر کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔''

(یونس۔ ۴۷)

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن جس طرح اشخاص اور افراد کے واقعات کو اہمیت دیتا ہے اس سے زیادہ وہ قوموں کی تاریخ کو اہمیت دیتا ہے۔ یہ آج سے ۱۴ سو سال پہلے کی بات ہے۔ جب لوگ محض افراد مثلاً بادشاہوں یا حملہ آوروں اور فاتحین کی تاریخ لکھتے یا یاد کیا کرتے تھے۔نزول قرآن کے زمانہ تک مورخین نے قوموں اور معاشروں کی تاریخ کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ یہ قرآن کے نازل ہونے کے بعد بعض مورخین جیسے مسعودی اور ابن خلدون نے اقوام وملل اور ان میں رونما ہونے والے واقعات کی طرف توجہ دی۔ یہ سلسلہ اسی طرح رہا یہاں تک کہ حال ہی میں تاریخ کے نقطۂ نظر میں ایسا انقلاب آیا ہے کہ اب تاریخ شخصی تذکروں کے بجائے اقوام ملل کی سائنٹیفک تاریخ میں بدل گئی ہے۔ مختصر یہ کہ جیسا عرض کیا گیا یہ جو فرد اور معاشرے کے درمیان حقیقی رابطہ موجود ہے اس کے ذریعے ایک معاشرتی اثرات اور خصوصیات کا سلسلہ وجود میں آجاتا ہے جو ہر رُخ سے فرد کی استعداد اور صلاحیتوں سے برابری رکھتا ہے۔ مگر موافقت نہ کرنے کی صورت میں اس پر غلبہ پا کر اس کو زیر کر لیتا ہے۔[1]

قرآن میں بعض اوقات کسی ایک شخص کے عمل کو پوری جماعت کا فعل کہا گیا ہے۔ مثلاً حضرت صالح علیہ السلام کے ناقے کی کونچیں قوم ثمود کے ایک شخص نے کاٹی تھیں۔ قرآن اس عمل کو ان سب کی طرف نسبت دیتے ہوئے کہتا ہے:

فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۪ۙ

''انھوں نے (صالح کی) تکذیب کی اور (ان کی) اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔'' (شمس۔ ۱۴)

کبھی قرآن کسی ایک نسل کے عمل کو بعد کی نسلوں سے نسبت دیتا ہے۔ چنانچہ پیغمبرؐ اکرم کو یثرب اور اس کے اطراف کے یہودیوں کے بارے میں حکم ہوا:

قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۹۱

''کہہ دیں: خدا کے پیغمبروںؑ کو گذشتہ زمانے میں تم کیوں قتل کرتے تھے۔ اگر تم صاحب ایمان تھے۔''

(بقرہ)

اس میں نکتہ یہ ہے کہ جب معاشرہ ایک اجتماعی فکر اور ایک خاص ارادے اور خواہش کا حامل ہو تو ان میں سے کسی ایک فرد کا کام سب کی خواہش کے مطابق سمجھا جاتا ہے اور ایک فرد یا ایک نسل کا عمل پورے معاشرے اور اگلی نسلیں جواب دہ شمار ہوں گی۔ اس لیے کہ ان میں ایک رُوح اور ایک ہی جذبہ حکمرانی کرتا ہے۔

---

[1] المیزان۔ ج۔ ۴۔ ۱۰۲۔

امیرالمومنینؑ قوم ثمود کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ایها الناس انما یجمع الناس الرضا والغضب وانما عقر ناقة ثمود،رجل واحد فعمهم الله بالعذاب لما عموه بالرضا ء فقال :فعقروها فاصبحوا انا دمین۔[1]

''اے لوگو! وہ چیز جو لوگوں کو یک جا کر دیتی ہے اور ان کو ایک انجام سے دو چار کرتی ہے وہ ان کا کسی عمل پر خوش یا غضبناک ہونا ہے، اگر کسی شخص نے کسی ایسے عمل کو انجام دیا جس پر دوسرے خوش ہُوئے تو ان سب کا ایک ہی انجام ہوگا قوم ثمود کے ناقے کی ایک شخص نے کونچیں کاٹی تھیں۔ لیکن عذاب نے سب کو گھیر لیا۔ کیونکہ وہ سارے لوگ اس کام پر راضی اور خوش تھے۔ اسی لیے خدا فرماتا ہے: انہوں نے کونچیں کاٹیں اور پھر پیشمان ہُوئے۔''

[1] نہج البلاغہ،خطبہ۔۱۹۶۔

قرآن کا دائمی منشور 2

تیئسواں اصول

معاشرہ اور تاریخ قرآن کی نظر میں

قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ ۙ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۱۳۷﴾

"تم سے پہلے بہتیرے واقعات گذر چکے ہیں، پس ذرا روئے زمین پر چل پھر کر دیکھو (اپنے اپنے پیغمبروں کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ (آل عمران)

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾

'تم سے پہلے بتیرے واقعات گذر چکے ہیں، پس ذرا روئے زمین پر چل پھر کر دیکھو (اپنے اپنے پیغمبروں کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ (آل عمران)

گذشتہ باب میں معاشرے کے بارے میں جو بحث کی گئی اس سے یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ اگر ہم نے معاشرے کی حقیقت کا انکار کیا اور فرد کی سوفی صد اصالت کے قائل ہوئے اور معاشرے کے لیے محض اعتباری وجود کے قائل ہُوئے تو پھر وہ معاشرہ ہر قسم کے قانون اور ضوابط سے خالی ہوگا۔مگر اس کے لیے اگر ہم حقیقت اور ترکیب کے قائل ہُوئے خواہ وہ ترکیب صنعتی یا مکینکی یا کسی اور شکل کی ہو تو لا زماً وہ اپنی ترکیب کے مطابق کسی قانون اور ضابطے کا حامل ہوگا۔عقل وخرد کے مطابق تاریخ کے سفر اور معاشرے کا طور طریقہ قانون کے تحت ہوگا۔

جس طرح ایک فرد کی پہچان کے لیے ضروری ہے کہ ہم نفسیات انسانی کے قوانین سے آگاہی رکھتے ہوں ویسا ہی انسانی معاشرے کی شناخت کے لیے ضروری ہے کہ ہم معاشروں پر حکمران قوانین سے مطلع ہوں۔

درحقیقت انسان پر دوطرح کے قوانین حاکم ہیں۔ایک وہ جو فرد پر حکمران ہیں یعنی مجھ پر بحیثیت رکن معاشرہ کے عمرانیات کا حقیقی ماہر وہ ہے جو اجتماعی ظہور پذیر ہونے والے مظاہر دنیا میں سارے مختلف موجودات ہیں۔

یہی وہ نکتہ ہے جس کے بارے میں دانشوروں کا کہنا ہے کہ معاشرے کے اپنے قوانین اور ضابطے ہوتے ہیں

یعنی تاریخ بشر میں کامیابیاں ترقیاں اور پیش رفت یا اوبار، زوال اور انحطاط کسی خاص قانون اور نظام سے مربوط ہے۔کوئی ترقی اور پیش رفت بلا سبب اور کوئی پس ماندگی اور تنزل بغیر کسی علت کے ظاہر نہیں ہوتا۔اقوام عالم کی تاریخ پر قطعی اتفاق (Chance) حکم فرما نہیں رہا۔

معاشرے اور تاریخ پر حکمران قوانین کے لیے قرآن ''سنت اللہ'' کے الفاظ استعمال کرتا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾

''یہ لوگ اس سُنت اور روش جو گذشتہ اقوام پر حکمران تھی، کے علاوہ کس چیز کی توقع رکھتے ہیں۔تم کبھی بھی خدا کی سنتوں میں تبدیلی اور تغیر نہیں پاؤ گے۔'' (فاطر:۴۳)

دوسری آیت میں قرآن فرماتا ہے:

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

''یہ ہیں خدا کی سنتیں گزشتہ امتوں کے بارے میں اور خدا کی سنتوں میں تم کسی قسم کی تبدیلی اور تغیر نہیں پاؤ گے۔''

(فتح۔۲۳)

ایک دوسری آیت میں معاشرے میں حکمران قوانین کے لیے لفظ ''سنن'' لایا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے:

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٣٧﴾

''تم سے پہلے معاشروں پر سنتیں اور قوانین حکمران تھے ان قوانین سے آگاہی کے لیے زمین میں چلو پھرو تاکہ واضح ہو جائے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو خدا کے انبیاء کی تکذیب کرتے تھے۔''

(آل عمران۔۱۳۷)

علماء اسلام میں پہلا شخص جو معاشرے اور تاریخ کے لیے، حقیقت، قانون اور سنت کا قائل ہوا وہ ابن خلدون تیونسی ہے جس نے تاریخ پر اس سلسلے کا مقدمہ لکھا۔ مغرب میں پہلا فرد اٹھارہویں صدی کا فرانسیی دانش ور منٹسکیو ہے جو مشہور کتاب ''روح القوانین'' کا مصنف ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ اس سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں:

ان الدھر یجری بالباقین کجریہ بالماضین

''زمانہ جس طرح گزشتہ لوگوں پر حکمران تھا اسی طرح تم پر بھی حکومت کرتا ہے۔''

(نہج البلاغہ خطبہ: ۱۵۲)

اس سے مراد وہی نقطہ نگاہ ہے جس کی تلاش میں ابن خلدون اور منٹسکیو ہے کہ ثابت کریں کہ سفر تاریخ پورے طور پر معقول اور کلیہ اور قانون کے تحت ہے۔ مختلف النوع اور بظاہر غیر مربوط واقعات کے پیچھے ایک معقول نظام اور مستقل ضوابط کارفرما ہیں جو تاریخ اور معاشرے کی بنیاد بنتے ہیں۔ یہی ہیں جو غیر مربوط معاملات اور واقعات کو ربط اور نظم عطا کرتے ہیں

قرآن دوسری آیات میں تاریخ کے قوانین کے تحت ہونے اور معاشروں پر سنن کی حکومت کی وضاحت کرتا ہے۔ ہم ان سے چند کا یہاں ذکر کرتے ہیں:

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٨﴾

''کافروں سے کہہ دیں کہ اگر وہ بُرے کاموں اور اپنی دشمنیوں سے دستبردار ہو جائیں تو خدا ان کے گذشتہ

گناہوں کو بخش دے گا اور اگر وہ انہی کاموں کی طرف واپس جائیں گے تو گزشتہ معاشروں پر حکم فرما قوانین ان کی نظروں کے سامنے ہیں۔'' (انفال۔۳۸)

یعنی وہی قوانین وسنن جو گذشتہ معاشروں پر حکومت کرتے تھے وہی ان پر بھی لاگو ہوں گے۔

قرآن سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۴ تا ۸ میں بنی اسرائیل کے دو مرتبہ بڑی سرکشی کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ پہلی بار کے سلسلے میں کہتا ہے:

''پہلی سرکشی کے جواب میں طاقتور اور جنگ جُو لوگوں کو تمھارے خلاف کھڑا کریں گے۔ تاکہ تمھارے گھروں کے اندر گُھس جائیں اور یہ خدا کا حتمی وعدہ ہے۔ جب تم پاکیزگی کی طرف واپس آؤ گے تو تم کو ان پر تسلط بخشیں گے اور مال ودولت اور افرادی قوت سے تمھاری مدد کریں گے

دوسرے موقع کے لیے قرآن کہتا ہے:

''تم بنی اسرائیل جب فساد کی طرف مائل ہو گے تو دوسرے لوگوں کو تم پر مسلط کر دیں گے اوت پہلی مرتبہ کی طرح وہ تمھارے چہروں کو غضب ناک کریں گے، مسجد میں داخل ہو جائیں گے اور جس پر قابو پائیں گے اس کو نابود کر دیں گے۔'' اس وقت طے شدہ خدائی قانون اور سنت کی تصریح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یَّرۡحَمَکُمۡ ۚ وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا ۘ وَجَعَلۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ حَصِیۡرًا ﴿۸﴾ (بنی اسرائیل)

شاید تمھارا پروردگار اپنی رحمت سے تم کو نوازے اور پہلے بار کی طرح اگر پاکیزگی کی طرف جھکو گے تو نئے سرے سے رحمت خداوندی میں شامل ہو جاؤ (یہ جان رکھو کہ گزشتہ طریقہ کار کے مطابق ''ہر فساد کے پیچھے انتقام'' اور ہر اصلاح کے بعد رحمت ہے۔ یہ ایک طے شدہ غیر متغیر سنت ہے جو ہمیشہ جاری رہے گی) خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر راہ راست کی طرف واپس آ جاؤ تو رحمت خدا کے زیر سایہ اگر فساد کی طرف مائل ہو گئے تو اس کے نتائج سے دوچار ہو گے۔''

اس فقرے سے زیادہ معنی خیز اور کون سا فقرہ ہو سکتا ہے:

''ان عدتم عدنا''

''اگر تم نے پھر وہی کیا تو ہم بھی وہی کریں گے۔''

یعنی یہ ایک مسلسل عمل ہے اور روئے سخن کسی ایک فرد کی طرف نہیں، بلکہ پوری بنی اسرائیل کی قوم کو مخاطب کیا گیا ہے۔

بعض دوسری آیات بھی اس ضمن میں آئی ہیں۔ آپ اس حقیقت کو ان آیات میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

جب میں ''سنت اللہ'' یاسنن الاولین'' یاسنن'' ''یاسنتنا'' کے الفاظ آئے ہیں۔
اگر معاشرے پر قوانین اور سنت کی حکمرانی ہے تو پھر تاریخ میں اتفاق (Chance) سے کیا مراد ہے:
اگر تاریخی واقعات سارے کے سارے ضوابط اور اصول کے تحت ہیں تو پھر بہت سے لوگ حتی کہ دانش ور حضرات بھی بعض واقعات کی توجیح ''اتفاق کہہ کر کیوں کرتے ہیں؟
کیا ''اتفاق'' پر عقیدے سے اسباب اور نتائج اور علت ومعلول کے قانون پر ضرب نہیں پڑتی؟

ان سوالات کا جواب یہ ہے

اتفاق کے مختلف معنی ہو سکتے ہیں اور بہتر الفاظ میں اس کے مختلف النوع مفاہیم ہوں گے۔جن میں سے ہر معنی اپنے لیے ایک خاص خاکہ رکھتا ہے ، جسے قارئین کرام ذیل میں ملاحظہ کریں گے۔
ا۔اتفاق اس معنی میں کہ وہ علت اور سبب کے بغیر نمایاں ہونے والا وجود ہو خواہ سبب طبعی ہو یا غیر طبعی۔ماہرین ''اتفاق'' اکے اس معنی کو رد کرتے ہیں اور کوئی دنش ور جس کو دانشور کہا جا سکے وہ ''اتفاق'' کی یہ توجیہ نہیں کرتا۔
دانش وروں میں ہیوم انگریز ہی ایسا گزرا ہے جو ایسے قانون عقلی کا منکر تھا۔وجہ یہ ہے کہ ہیوم چاہتا ہے کہ تمام مسائل کو حواس خمسہ اور تجربے کے ذریعے ثابت کرے جب کہ احساس وتجربہ ایسے قانون کو ثابت کرنے سے عاجز ہے۔تجربات سے جو ثابت کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر واقعہ کسی دوسرے کے بعد آتا ہے۔مگر پہلا واقعہ دوسرے واقعہ کے سبب ہوتا ہے اور دوسرا واقعہ پہلے کے وجود سے استنباط کرتا ہے اور پہلا دوسرے کا منشا ہے۔مگر اس کو حواس کے ذریعے قطعی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔اس لیے کہ امکان ہے کہ ان دونوں واقعات کے ساتھ ساتھ ہونا دو غیر مربوط واقعات کے یک جا ہونے کی طرح ہو۔جیسے ایک آدمی بات کر رہا ہو اور گھوڑا ہنہنائے تو ایک کو دوسرے کا سبب اور نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔
وہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ ہر ہر بات کو حواس کے ذریعے ثابت کریں وہ یقیناً ایسے قانون کو ثابت نہیں کر سکتے۔معرفت اور پہچان کے ذرائع حواس خمسہ تک محدود نہیں ہیں۔ان کے علاوہ عقل خود شناخت کا ذریعہ ہے جو دلائل کے ذریعے ایسے قانون کے وجود کی گواہ ہے ہم نے شناخت اور معرفت کے باب میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے چنانچہ علیت یعنی اسباب اور نتائج کے قانون اکا اثبات بہت ہی آسان ہے۔
اگر کوئی شخص طبعی یا تاریخی تغیرات اور تبدیلی میں لفظ ''اتفاق'' کو استعمال کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کوئی واقعہ خود بخود بغیر سبب اور علت کے وجود میں آجاتا ہے۔اس کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے جو ابھی واضح ہو جائے گا۔
فلسفہ اسلامی میں بخت اور اتفاق کے زیر عنوان اس پر بحث ہوتی ہے۔یہ دونوں الفاظ ایک خاص معنی رکھتے ہیں۔اگلے دو نکات کے ذریعے بخت اور اتفاق کا معنی بھی واضح کیا جائے گا
ب۔اتفاق: نظام کا بغیر شعوری اسباب اور عقل کے ادراک کے وجود میں آنا یعنی کائنات کے نظم کی مادی اسباب کے سلسلے کے ذریعے تفسیر کیا جانا

جوشعور وادراک سے عاری ہو۔ مادہ پرست اتفاق کو اسی معنی میں پیش کرتے ہیں۔
ان کا کہنا ہے کہ مادہ نے پھٹنے پھٹانے اوران گنت عمل اور ردعمل کے نتیجے میں یہ شکل اختیار کی ہے جو آج سامنے ہے اور پھر نظم وضبط پیدا کیا ہے ان چھوٹے چھوٹے مختلف نظاموں کے یکجا ہونے سے ایسا تعجب خیز نظم وجود میں آیا ہے۔ چنانچہ کائنات کا نظام سبب کے بغیر نہیں۔ یہ طے ہے کہ اس کا سبب ہے مگر آگاہ، باخبر بیدار اور قابل حساب سبب نہیں!
سوال یہ ہے کہ کیا ایسا اتفاق ایسے عمدہ اور تعجب خیز نظام کا سرچشمہ ہوسکتا ہے؟ اس وقت ہم اس گفتگو کی تفصیل میں نہیں جائیں گے۔ مختصراً یہ نکتہ پیش کریں گے کہ بے شمار ''اتفاقات'' موجودہ نظام کے ایک ارب کا ایک حصہ بھی وجود میں نہیں لا سکتے۔
یہ تو ممکن ہے کہ دریا کی روانی میں ایک پتھر یہاں وہاں گرتا پڑتا اور گھس گھسا کر ایک انسان کی صورت پیدا کر لے لیکن مادہ کسی دھاکے سے خواہ وہ داخلی طبیعی اسباب کی بنا پر کیوں نہ ہو۔ ایسا محیرالعقول نظام تخلیق کرنے سبب نہیں بن سکتا۔ یہ ایسا نظام ہے جس کے معمولی گوشے کی تحقیق اور مطالعے کے لیے خصوصی مہارت کی ضرورت ہے۔
ڈارون کے مفروضہ ارتقاء کے مطابق ایک اسفنجی وجود مختلف مراحل طے کرتے ہوئے ایک نوع سے دوسری نوع بنتا ہوا آخر کار انسان کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اگر یہ صحیح بھی ہو پھر بھی انسان کا ارتقاء محض بے شعور طبیعی اسباب سے ظہور پذیر نہیں ہوسکتا۔ اس ارتقاء کے مدراج جو ایک زنجیر کی طرح آپس مین پیوستہ ہیں، ان کے لیے ایک آگاہ آفرینندہ، دانا اور نگہبانی کرنے والا توانا سبب ہونا چاہیے، جو اس کی اس ارتقاء کی منزلوں کی طرف رہنمائی کر سکے۔
بہرصورت مادہ پرستوں کی توجیہ خواہ کائناتی نظام کے طور پر ہو یا ڈارون کے مفروضے کے ذریعے، بے شعور طبیعی اسباب کے ہاتھوں خود صحیح ہو یا نہ ہو ''اتفاق'' کا ایک معنی بیان ہوئی ہے۔
ج۔ اتفاق''، یعنی کسی شے کا ایسے عامل سے ظہور میں آنا جو کسی ضابطے اور کلیے کے تحت نہیں۔ ایسے وجود کو اس عامل کی وجہ سے ایک قانون کلی کے طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عمومی زبان میں رائج اصطلاح ہے مثلاً ہم کہیں کہ مشہد مقدس کے سفر میں اپنے ایک دیرینہ دوست سے جسے سالہا سال سے نہیں دیکھا تھا اتفاقاً ملاقات ہوگئی یا فلاں شخص کنواں کھود رہا تھا ابھی پانی تک نہیں پہنچا تھا کہ اس کو اتفاقاً خزانہ مل گیا یہ تو طے ہے کہ ایسی باتوں کے وجود میں آنے کا کوئی ضابطہ نہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ مشہد کے ہر سفر میں تیری ملاقات اپنے دوست سے ہو یا ہر دفعہ کنواں کھودنے پر خزانہ ملے۔ یہ خاص حالات اور اسباب تھے کہ جہاں کنواں کھودا گیا وہاں خزانہ ملا۔ مگر کنواں کھودے جانے اور خزانہ ملنے کے درمیان کوئی مستقل اور حقیقی رابطہ موجود نہیں۔ چونکہ رابطہ نہیں اس لیے ایسے ''اتفاق'' کا وجود کسی ضابطے اور قاعدے کے ماتحت نہیں ہوتا۔
اس بحث سے نتیجہ نکلتا ہے کہ سبب کا نہ ہونا ایک بات ہے اور اس کا کلیے اور ضابطے کے ماتحت نہ ہونا دوسری بات ہے۔ فلسفیانہ تعبیر میں یہ ظاہر ہونے والا امر اس سبب کا لازمہ نہیں۔ مطلب یہ کہ ہر کنواں کھودنا خزانے تک نہیں پہنچاتا حالانکہ اس مخصوص جگہ جہاں پہلے سے خزانہ چھپا ہوا ہے ، کنواں کھودنے کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا۔
یہاں تک سوال کے ایک حصے کا جواب واضح ہوا (یعنی تشریح معانی یا ''اتفاق'' کے لفظ کی مختلف اصطلاحات جو موجود ہیں۔

اب اس سوال کے دوسرے حصے کی وضاحت کی جاتی ہے۔(تاریخی حوادث کی تفسیر میں ''اتفاق'' کے کیا معنی ہیں)؟
اس تیسرے مفہوم میں ان تاریخی حوادث کی تفسیر ہوتی ہے۔مثلاً پہلی جنگ عظیم کی ابتداء کیسے ہوئی اس کے بارے میں مؤرخین کا کہنا ہے کہ آئریش ولی عہد شہزادے کے قتل سے یورپ میں جنگ کی آگ بھڑک اُٹھی یعنی ایک چھوٹا سا اتفاقی واقعہ اور ایک شہزادے کا قتل سبب بنا کہ اتنا بڑا عالمگیر حادثہ اور المیہ رونما ہو جائے۔
یہاں اس لفظ 'اتفاق'' کو انہی معنی میں استعمال کیا گیا۔یعنی کسی علاقے کے خصوصی حالات کے نتیجے میں ایک معمولی چنگاری سے جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور اس بہانے سے تیار طاقتیں میدان جنگ میں کود پڑیں۔مگر یہ ایک مستقل نتیجہ نہیں کہ ایک شہزادہ قتل ہو جائے تو عالمگیر جنگ چھڑ جائے گی اور یہ بات کسی مستقل ضابطے کے تحت نہیں ہے۔ممکن ہے دُنیا میں کئی شہزادے مارے جائیں مگر ایسا عالمی المیہ ظہور پزیر نہ ہو۔یہ ضرور ہے کہ جنگ کی آگ بھڑکنے کے وقت حالات، چپقلشیں اور سیاسی اقتصادی اور نظریاتی تضادات اس قدر زیادہ تھے کہ جنگ کے لیے زمین بالکل ہموار تھی۔شہزادے کا قتل تو بس ایک چنگاری تھی۔جو بارود کے ڈھیر میں رکھ دی گئی۔

تاریخ میں اتفاقات

قوموں اور امتوں کے واقعات میں بعض ایسی کامیابیوں کا ذکر ملتا ہے جو اتفاق کے اس تیسرے مفہوم کے ضمن میں آتی ہیں اور ایسے قصے بہت زیادہ ہیں۔نہ ان سب پر اعتبار کیا جا سکتا ہے اور نہ سب یہاں بیان کر سکتے ہیں۔
یہاں ان واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے۔تاکہ ضروری نکتہ واضح ہو سکے۔
۱۔عمادالدولہ دیلمی نے اصفہان اور فارس کا محاصرہ کر لیا اور خلیفہ کے نمائندے کو نکال باہر کیا۔ایک عرصہ گزارنے پر اس نے اپنا مال وخزانہ ختم ہوتا ہوا دیکھا جس سے اس بات کا ڈر ہوا کہ کہیں اس کے سپاہی خالی ہاتھ ہونے کی وجہ سے عام لوگوں میں لوٹ مار نہ شروع کر دیں اور وہ شہر کے عوام میں غیر مقبول نہ ہو جائیں۔یکایک اس کی نگاہ مکان کی چھت پر پڑی۔اس نے دیکھا کہ ایک سانپ چھت کے ایک سوراخ سے سر نکالتا ہے۔پھر واپس چلا جاتا ہے، یہ حرکت اس سانپ نے کئی دفعہ کی۔
عمادالدولہ نے حکم دیا کہ اس عمارت کی چھت ہٹا دی جائے اور سانپ کو مار دیا جائے۔اس کے سپاہیوں نے چھت اتار دی اور سوراخ کے پیچھے ان کو اشرفیوں سے بھرے ہوئے مٹکے ملے۔یہ خزانہ سابق حاکم نے اپنے مستقبل میں کسی بُرے دن کے لیے چھت میں چھپا رکھا تھا۔جب کہ اس سے فائدہ عمادالدولہ نے اٹھایا۔[1]
۲۔امیر اسماعیل سامانی اپنا تمام نقد مال ہرات میں کھو بیٹھا۔اس نے اس لیے کہ اس کے سپاہی عوام کے مال کو نہ لوٹیں، حکم دیا کہ سارا لشکر شہر سے باہر چلے۔وہ بغیر کسی مقصد کے اپنی فوج کو باہر لے چلا۔اچانک اس کے سپاہیوں کی نگاہ ایک کوے پر پڑی جو ان کے سروں پر سے گزرا۔اس کی

---

[1] از گوشہ وکنار تاریخ

چونچ میں ایک ہیرے کا گلو بند تھا۔انہوں نے اس کوے کا پیچھا کیا تو اس نے اس گلو بند کو سامنے کنویں میں گرا دیا۔امیر کے حکم سے چند آدمی اس کنویں میں اترے کہ وہ گلو بند نکال لیں۔اچانک وہاں زرد جواہر سے بھرا ہوا صندوق پانی میں ملا۔اس صندوق کو عمر بن لیث صفاری سابق حاکم کی گرفتاری کے وقت اس کے نوکروں نے چوری کر کے کنویں میں چھپا دیا تھا۔مگر اس کو باہر نہیں نکال پائے تھے۔[1]

یہ اور ایسی بیسیوں داستانیں استثناء ہیں اور ان کو معیار اور کسوٹی نہیں بنایا جاسکتا۔یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایسے اتفاقات کا اپنی زندگی میں آدمی انتظار کیا کرے۔زندہ قومیں مشکلات کو حل کرنے کے لیے کبھی اتفاقات کا انتظار نہیں کرتیں اور ''اولیاءاللہ کی کرامات '' کی منتظر نہیں رہتیں۔بلکہ اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے کوشش وسعی کر کے اپنی دشواریوں پر کامیابی حاصل کرتی ہیں۔وہ جانتی ہیں کہ عالم خلقت طبیعی اسباب کے ایک سلسلے پر استوار ہے اور انسانی معاشرہ اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے علل واسباب کا دروازہ کھٹکھٹائے اور انہی کے ذریعے اپنے ہدف تک پہنچے۔

پیغمبرؐ اعظم اسلام اور اولیاءاللہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں معجزات کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔وہ ہمیشہ خدا کے فضل وکرم پر بھروسہ کرتے ہُوئے کام اور سعی کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرتے تھے۔ایسے موقعوں پر بھی جب جان لبوں پر آئی ہوتی اور سانس سینے میں گھٹ رہی ہوتی اور سارے دروازے بند نظر آتے،پھر بھی وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھ جاتے،پوری توجہ اور دعاؤں کے ذریعے اپنی ذمہ داری ادا کرتے،کیونکہ دُعا خود بھی سبب خواہی ہے اور اسباب سے تمسک پیدا کرنا ہے۔عربی زبان میں ایک مثل ہے کہ:

"ماحك ظهري غير ظفري۔"

''میری پشت کو بجز میرے ناخن کے کوئی نہیں خراشتا۔''

فارسی میں اسی معنی میں ایک شعر ہے:

به غم خوارگی جز سر انگشت من
نخارد کس اندر جهان پشت من

''میری غم خواری کرتے ہوئے میری انگلی کے علاوہ کوئی پشت نہیں کھجلائے گا۔''

جو لوگ حریت اور آزادی حاصل کرنے میں اتفاقات کے انتظار میں بیٹھے ہیں،اور کہتے ہیں کہ کبھی تو راستہ کُھلے گا اور کوئی معجزہ ظاہر ہوگا۔ان کی کبھی بھی آرزو بر نہیں آئے گی۔

قرآن مجید میں ان لوگوں کو سعادت کی نوید دی گئی ہے،جن کا ایمان ان کے لیے ذمہ داریاں اور عمل میں پیش قدمی لے کر آئے:

"الا الذین اٰمنو او عملوا الصالحات۔"

---

[1] از گوشہ کنار تاریخ۔

یہ جُملہ قرآن مجید میں تریسٹھ بار آیا ہے اور ایمان وعمل کا ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے ایمان حقیقی وہ ہے جس کے ساتھ ساتھ کام اور کوشش ایمان کے مطابق وجود میں آئے۔

سنت الٰہی معاشرے کا اعمال کا ردّعمل ہیں

ممکن ہے کچھ لوگ کہیں کہ معاشرے اور قوم کے لیے سنت الٰہی سے مراد وہی نہ تبدیل ہونے والی اور طے شدہ قضاوقدر ہے پھر تاریخ اور مادہ کا ''جبر'' ہے جو انسانون کی حریت وآزادی کا مستقل مخالف ہے۔

قرآن ان مفاہیم کی رد میں اس پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ قوموں پر حکمران سنتوں سے مراد اختیار سے باہر کوئی قوانین نہیں۔ بلکہ ہر معاشرہ اپنے اعمال کے نتائج سے بندھا ہوتا ہے۔

زیادہ واضح الفاظ سنت الٰہی معاشرے کے اعمال کا ردعمل ہے اور کچھ نہیں۔ ہر انفرادی اور اجتماعی عمل اپنے پیچھے ردعمل کا ایک سلسلہ رکھتا ہے۔ ایک ایسے معاشرے کے لیے جو فساد اور شہوت میں ڈوبا ہوا، لاابالی، بے پرواہ اور بے شعور ہو ایک قسم کا ردعمل ہوتا ہے اور اس کے ذمہ دار، باشعور ،حریت پسند اور پاک صاف معاشرے کے لیے دوسرے قسم کا ردعمل ہوگا۔ خدا کی قطعی اور ''لا تیخلف'' سنتیں یہی ردعمل ہیں جو معاشرے کے ساتھ ہیں۔

تاریخ انسانی پر قطعی قواتین کا ایک سلسلہ حکمران رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود انسان آزاد کا نقش واثر ان سنتوں اور ردعمل پر رہا ہے اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسان آزاد ہے کہ اپنے اعمال وکردار کے ذریعے معاشرے کو دو میں سے کسی ایک طرف لے جائے یا تنزلی اور نابودی کے گڑھے میں گرا دے یا اس کو ترقی کی راہ پر بلندی کی طرف لے جائے۔

اسلام میں ایسی قضاوقدر اور سرنوشت طے شدہ موجود نہیں جو انسان کے مرکز ارادہ سے باہر ہو۔ صرف ایک خبری، مکتب ہے جو انسان کے لیے ایسی قطعی سرنوشت اور تقدیر کا قائل ہے۔ یہ مکتب ایسے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہے کہ اشتراکیت، جبر تاریخ'' کے پردے میں جس کے لیے کوشاں ہے۔

قرآن ایسے ہر قسم کے ابہام کو دُور کرنے اور واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ

''خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔'' (رعد۔۱۱)

ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ یَكُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا

بِاَنۡفُسِهِمۡ ؕ

''خدا کبھی بھی اس نعمت کو جو کسی قوم کو عطا کی ہے نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدل لیں ۔'' (انفال ۔ ۵۳)

تاریخ اور سرنوشت انسانی میں یہی انسان کا کردار اور اثر ہے جس کی وجہ سے قرآن معاشروں کو ہمیشہ ان کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۴﴾

''یہ گزشتہ امت کی سرگزشت ہے۔ اُن کے لیے وہ کچھ ہے جو انہوں نے انجام دیا اور تمھارے لیے وہ کچھ ہے جو تم نے انجام دیا ہے۔ تم ان کاموں کے قطعی ذمہ دار نہیں، جن کو وہ انجام دیتے تھے (بقرہ ۔ ۱۳۴)

ایک دوسری آیت میں انسان کو اپنے اعمال کا جواب دہ سمجھتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

كُلُّ امۡرِیءٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيۡنٌ ﴿۲۱﴾

''ہر شخص اپنے اعمال کا گروی ہے۔'' (طور)

اسلام میں قضا و قدر کے سلسلے میں مزید آگاہی کے لیے راقم کی کتاب ''سرنوشت از دیدگاہ علم وفلسفہ'' ملاحظہ فرمائیں۔

قرآن کا دائمی منشور 2

چوبیسواں اصول

تاریخ میں اللہ کی غیر مبدّل سنتیں

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿٤٣﴾

''یہ لوگ اس سنّت اور روش کے سوا جو گزشتہ اقوام پر حکمران تھی کس چیز کی توقع رکھتے ہیں تم خدا کی سنتوں میں ہرگز تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ (فاطر)

فَهَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ الۡاَوَّلِيۡنَ ۚ فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِيۡلًا ﴿۴۳﴾

''یہ لوگ اس سنّت اور روش کے سوا جو گزشتہ اقوام پر حکمران تھی کس چیز کی توقع رکھتے ہیں تم خدا کی سنتوں میں ہرگز تبدیلی نہیں پاؤ گے۔(فاطر)

اب تک بالکل واضح ہو چکا ہے کہ انسانی معاشرہ اور تاریخ قوانین اور سنتوں کی پیروی کرتے ہیں اور تاریخ میں تبدیلیوں اور انقلابات کی عقلی توجیہ وتفسیر موجود ہے۔

جیسے زمین اور کائنات میں رونما ہونے والے واقعات اور حوادث قوانین کے تحت ظہور پذیر ہوتے ہیں، اسی طرح ہر قسم کا تغیر وتبدل، توازن ،تنزل اور معاشرے کی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف حرکت سبھی علت ومعلول کے نظام پر قائم ہے۔

اب ہم ان سنتوں کے ایک گوشے کی طرف جو قرآن میں آئی ہیں، اشارہ کریں گے۔

قرآن معاشرے اور تاریخ پر حکم فرما جن سنتوں کا ذکر کرتا ہے، ان کا جمع کرنا عمیق اور دقیق مطالعہ کا طالب ہے۔یہ کسی اور وقت انجام پانا چاہیے، فی الحال ہم ان صفحات میں چند واضح نمونوں کی طرف اشارہ کر کے مزید تحقیق کے لیے راستہ کھول دیتے ہیں۔

ہر امت کا ایک دور اور اجل ہے

دانش وروں کا کہنا ہے کہ ہر معاشرے کے لیے ادج پستی اور ترقی وتنزلی کے دور ہوتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں معاشرہ ایک فرد کی طرح ہے جو جب تک سن بلوغ تک نہیں پہنچتا دوڑ دھوپ اور ہر چیز اور ہر شخص کے پیچھے تگ ودو میں رہتا ہے۔اپنی تگ ودو جاری رکھتا ہے۔

اس طرح اپنی جوانی تک پہنچتا ہے جہاں وہ اپنی بھرپور قوت وتوانائی اور صلاحیتوں کا حامل ہو جاتا ہے اس دور کے بعد آہستہ آہستہ ضعف اور کمزوری کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔یہ اس کے تنزل کا دور ہے، قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں۔اور وہ غذا اور دوا سے توانائی حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے۔اس عمر میں بجائے جارحانہ رویے کے اب اس کی کیفیت مدافعت کی ہو جاتی ہے جو کچھ اس کے پاس ہے اسی کی حفاظت میں لگا رہتا ہے مزید کوئی چیز طلب نہیں کرتا۔

معاشرے کا بھی ایک جارحانہ دور ہوتا ہے جس کے بعد اس کا مدافعتی دور شروع ہو جاتا ہے۔پوری تاریخ ''جارحانہ'' اور ''مدافعتی'' ان دو حالتوں کی اساس پر آگے بڑھتی ہے۔اسی جارحیت اور مدافعت کے نتیجے میں ایک طرح کی ثقافت تمدن اور معاشرہ وجود میں آتا ہے جو پھلتا پھولتا ہے اور پھر کمزور اور بوڑھا ہو جاتا ہے، چنانچہ ایک نئی ثقافت پیدا ہوتی ہے۔اور یہ اپنی باری میں نشوونما اور کمال کی طرف بڑھ کر بڑھاپے اور اپنی فنا

کی طرف روانہ ہو جاتی ہے کہ ایک تازہ دم اور جوان قوت پھر نمایاں ہو۔

یہ جارحیت اور مدافعت تاریخ میں علت اور عامل کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔ تاریخ کس طرح بنتی اور تشکیل پاتی ہے یہ امر بھی اس سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ قرآن جو انفرادی قدروں کی طرف توجہ دیتا ہے وہ اس بات میں حارج نہیں ہوتا، کہ معاشرے کی اصالت کا بھی اس کی اپنی حد تک اعتراف کرے۔ اس کے لیے وہ حیات وموت اور اصطلاح کے مطابق جارحیت اور مدافعت کا بھی قائل ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝٣٤

''ہر امت کی عمر ختم ہونی ہے۔ جب اس کی عمر کے ختم ہونے کا وقت آ پہنچتا ہے تو نہ ایک لمحہ کی تاخیر ہوتی ہے۔ اور نہ ہی ایک لحظہ پہلے وہ فنا ہوتی ہے۔'' (اعراف)

گویا جس طرح فرد کی حیات وموت ہوتی ہے ویسے ہی معاشرے کی بھی زندگی اور موت ہے۔

تمدنوں کا طلوع وغروب ضروری ہے

قرآن تمدنوں کے طلوع ہونے اور پھر ان کے غروب ہونے کو ایک یقینی امر جانتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی ایک گروہ انسانی کے پاس رہتی دُنیا تک کے لیے طاقت اور قدرت اور مالی وسائل نہیں رہ سکتے۔ بلکہ مختلف اسباب وعلل کی وجہ سے دست بدست منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ دنیا کی زندگی تمام ہو، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝١٣٩ إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ

''افسوس اور غم نہ کرو تم ہی برتر ہو۔ اگر مومن رہو۔ اگر کوئی زخم تم کو لگے تو تمھارا مدّ مقابل بھی زخم خوردہ ہے۔ ان ایام کو لوگوں کے درمیان ہم دست بدست پھیرتے رہتے ہیں۔ (آل عمران۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰)

اس سے بڑھ کر معنی خیز فقرہ اور کونسا ہوگا:

''وتلك الايام ندا ولها بين الناس''

ایک دوسری آیت میں گذشتہ اقوام کا ذکر ہے جو کبھی زمین پر طاقت ور شمار ہوتی تھیں۔ اور پھر یوں انحطاط پذیر ہوئیں، جیسے وہ کبھی بھی زمین، سمندر، اور ہوا پر فرمانروائی نہیں کرتی تھیں۔ اسی اصول (تمدنکے طلوع وغروب) کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے قرآن فرماتا ہے:

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾

''یہ لوگ اس سنت اور روش کے سوا جو گذشتہ اقوام پر حکمران تھی۔ کس چیز کی توقع رکھتے ہیں۔تم خدا کی سنتوں میں ہرگز تبدیلی نہیں پاؤ گے۔''　(فاطر)

چنانچہ تمدنوں کا عروج پانا اور پھران کا زوال وغروب یقینیً سنتوں میں سے ہے جو سبھی اقوام وملل کے لیے یکساں ہے۔ یہ ایسی ہیں جن میں تغیر اور تبدیلی نہیں آتی۔

ظلم و جبر فنا اور نابودی کا سبب ہے

قرآن ظلم وستم کو اور انصاف کی حد سے گزر جانے کو امتوں کی ہلاکت اور نابودی کا سبب جانتا ہے۔ اس کے برعکس تقوی اور پرہیز گاری کو حکومت اور قوم کی بقا کا ضامن سمجھتا ہے۔ ظلم وستم سے پرہیز کو انفرادی اور اجتماعی امن وسکون کا سبب جانتا ہے اس بات کی نہ صرف یہ کہ قوموں کی زندگی کے تجربات سے اور پے در پے آزمائشوں سے تائید ہوتی ہے۔ بلکہ عقلی اور اجتماعی معیار بھی پوری اترتی ہے

ظلم وتعدی قوموں میں بہت ہی چھوٹے پیمانے پر شروع ہوتی ہے جو وقت کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ بے قابو ہو جاتی ہے۔ کہ سکون واطمینان کا دریچہ نہ پا کر وہ پھٹ جاتا ہے اور گھر کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔

قرآن اس حقیقت کو ان دو آیات میں بیان کرتا ہے:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

''تمھارا پروردگار قوموں کو کبھی ظلم سے نابود کرنے والا نہیں جب کہ وہ قومیں صلاح اور پاکیزگی کی راہ میں قدم اٹھاتی ہوں۔'' (ھود)

یعنی قوموں کو جب وہ پاک اور صالح ہوں، نابود کرنا ظلم وستم ہے اور بارگاہ اقدس الٰہی ظلم وستم کرنے سے منزہ اور پاک ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ

''جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ایمان کو ظلم اور راہ حق سے تجاوز سے خلط ملط نہیں کرتے ان کے لیے امن وامان ہے (انفرادی اجتماعی اور عالمی)'' (انعام۔ ۸۲)

انسانوں کے کردار میں معاشروں کی مادی کیفیت کی تاثیر

قرآن کے مطابق معاشروں کی مادی کیفیت ان کے افراد کے طرز فکر اور ان کے شیوۂ زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے قرآن ان دونوں کو مربوط سمجھتا ہے۔ ایسا نہیں کہ مادی کیفیت کو اساس اور انسانوں کے طرز فکر اور طرز زندگی کو اس کی عمارت سمجھے۔ وہ صرف ان کے درمیان ارتباط کی تصدیق کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝

'جب انسان اپنے آپ کو بے نیاز اور مستغنی محسوس کرتا ہے تو طغیان اور سرکشی کرنے لگتا ہے۔'' (علق)

اس آیت کے مطابق احساس بے نیازی فکری اور عملی سرکشی کا سبب بن جاتا ہے۔ قرآن کئی ایک آیات میں ذکر کرتا ہے کہ خوشحال اور مسرفین طاغوتی لوگ انبیاء کی پیشرفت میں سدراہ ہوتے اور ان کی مخالفت پر ہمیشہ کمر بستہ رہتے۔ اس کے برعکس فقراء اور تہی دست ان صاحبان وحی اور خدائی معلموں کے حامی اور پشت پناہ ہوتے۔

اپنی اس بات کی تائید میں ہم دو آیات پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مختلف گروہ کے لیے آئی ہے۔ قرآن کا کہنا ہے کہ خوشحال اور ناز و نعم میں پلنے والے ہمیشہ انبیاء کے راستے میں حائل ہوئے جیسا کہ فرماتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

''کسی پیغمبر کو ہم نے کسی خطے میں نہیں بھیجا، مگر یہ کہ اس بستی کے عیاش ثروت مندوں نے کہا کہ ہم تمھاری رسالت کے منکر ہیں اور اس پر ایمان نہیں رکھتے۔'' (سبا۔ ۳۴)

جب کہ تہی دستوں اور فقراء کے بارے میں کہتا ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

''وہ فقراء جو راہ خدا میں ناتواں اور بے چارہ ہیں۔'' (بقرہ۔ ۲۷۳)

نیز فرمایا

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ

''وہ فقراء اور مساکین جنہوں نے ہجرت کی اور وہ اپنے گھروں اور مال و متاع سے محروم کر دیئے گئے۔'' (حشر۔ ۸)

گذشتہ امتیں ہمیشہ انبیاء پر اعتراض کرتیں کہ مٹھی بھر فقیر د تہی دست لوگوں نے تم کو گھیرا ہوا ہے۔ قوم نوحؑ اپنے پیغمبرؑ سے کہتی:

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''کیا تم پر ہم ایمان لے آئیں جب کہ تم پر فقیر اور تہی دست افراد ایمان لے آئے ہیں۔''[1] (شعراء)

مدینے کے مالداروں کے ایک گروہ نے پیغمبرؐ اکرم سے کہا کہ جب تک آپؐ فقراء اور مساکین کو اپنے سے دور نہ کریں گے۔ ہم آپؐ کی نشستوں اور خطبوں میں شریک نہیں ہوں گے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

''وہ جو صبح و شام خدا کو پکارتے ہیں اور جن کا مقصد صرف خدا ہے ان کو راندۂ درگاہ نہ کرو۔ نہ کوئی چیز ان کے حساب کی تم پر ہے اور نہ کوئی تمھارے حساب کی چیز ان پر ہے۔ اگر تم ان کو دھتکار دو گے اور اپنے سے دور کرو گے تو ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔'' (انعام)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ مال و دولت مادیت کے فلسفے یا مادی اخلاق سے لازم و ملزوم ہے یا فقراء اور احتیاج خدا کی طرف میلانات کی پرورش کرتا ہے۔ یا یہ اقتصادی اصول کہ دو قسم کے طرز فکر اور دو قسم کی روش پیدا ہوتی ہے۔

ایسا نہیں کہ وجہ اس کی یہ ہے کہ دونوں قسم کے لوگوں میں خدا کی طرف جھکنے کا رجحان اور استعداد موجود ہے۔ انسانی پاک فطرت دونوں کو خدا کی تلاش کی دعوت دیتی ہے۔ مگر دولت مندوں کے خدا کے سامنے جھکنے میں کچھ رکاوٹیں ہیں جو فقراء کے سامنے نہیں۔ یہ بے نیازی کا احساس چاہے خیالی ہی کیوں نہ ہو، غرور و تکبر اور سرکشی کا باعث ہوتا ہے۔ (اس بدبخت تاجر کی طرح جو اپنے مال کی فکر میں کسی اخلاقی اور قانونی حُدود کو نظر میں نہیں رکھتا)۔ چنانچہ اس کے فطری اور استدلالی رجحانات غرور کے پردے میں پرورش پاتے ہیں جب کہ فقراء ایسے فریب سے دو چار نہیں ہوتے

(۵) معاشرے کی ارتقاء اور صالح مؤمنین کی حکومت

ا۔ کیا سارے معاشرے، تمدن اور مختلف ثقافتیں ایک ہی معاشرے اور ایک ہی تمدن میں ضم ہو جائیں گی اور صلح و صفائی، جنگ جون ریزی کی جگہ لے لیں گی۔

---

[1] یہی مضمون سورہ ہُود کی آیت ۲۷ میں بھی آیا ہے۔

ب۔ اگر اس کو جواب ہاں میں ہے تو اس خیال کا اظہار کسی خوش فہمی کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ یہ انسانیت کی اجتماعی ارتقاء اور رشد کا لازمی نتیجہ ہوگا۔ اس لیے کہ انسان میں ارتقاء کا رجحان فطری ہے اور اس کی سرشت میں داخل ہے۔

ج۔ یہ دانش وروں کے اس نظریے کے عین مطابق ہے جو وہ معاشروں کی وحدت کے بارے میں رکھتے ہیں۔

د۔ قرآن انسانی معاشرے کی ارتقاء کی جو تصویر پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ سب کے سب توحید کے پرچم کے نیچے جمع ہو جائیں گے۔

ھ۔ احادیث اسلامی کے مطابق دُنیا میں انسان خوب پھلے پھولے گا۔ اس کی معلومات میں بے انتہا اضافہ ہوگا۔ صنعتوں میں کمال، وسائل اور دنیا کے خزانوں پر عبور حاصل کرے گا۔ دنیا میں عدل وانصاف کی فروانی ہوگی اور حضرت مہدی (ع) کے زمانے میں ایک واحد عالمی حکومت قائم ہوگی۔

انسان اجتماعی کا حقیقی چہرہ اس وقت اچھی طرح واضح ہوگا جب ہم اس کی جبلت اور داخلی سرشت سے آگاہ ہوں گے۔ کیونکہ اسی سے اس کی معاشرتی زندگی کی بنیاد پڑتی ہے۔

سطحی نظر ڈالنے سے ہم انسان کی سرنوشت سے واقف نہیں ہو سکتے۔ انسان دو رخوں والا موجود ہے اور کہا جاتا ہے کہ ”صورتی درز یر دارد آنچہ در بالاستی“۔

انسانی معاشرے کا ظاہری اور بیرونی رُخ بے انتہا مایوس کن ہے۔ اس کے معروف چہرے کے خطوط شقاوت و جنگ وجدال، لطف واحسان سے دوری، ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری اور اخلاقی اور فکری بے راہ روی پر مبنی ہیں۔

اگر ہم انہی ظاہری خطوط سے انسان کی سرنوشت اور حقیقت کو پہچاننے کی کوشش کریں اور انہی کے ذریعے کسی نتیجے تک پہنچیں تو ہم انسان کے ارتقاء اور اس کے اپنی فطرت کی طرف لوٹنے سے قطعی مایوس ہو جائیں بلکہ مصائب وآلام سے معمور مستقبل ہماری نظروں میں رہے۔ ایسا مستقبل جو انسان کے میکینکی اور صنعتی تمدن کو نگل جانے والا ہو اور اس کا نام ونشان تک مٹا ڈالنے والا ہو۔

مگر اس کریہہ اور مایوس کن چہرے کے نیچے انسان کا حقیقی چہرہ چھپا ہوا ہے جو ہمیں خوشیوں اور امیدوں کی نوید سناتا ہے یہی چہرہ ہم سے کہتا ہے کہ اس اندھیری اور تاریک رات کے پیچھے روز روشن موجود ہے۔ اس شب تاریک کے ختم ہوتے ہی روشنی ہی روشنی ہے۔

پر امید ہونے کا سبب

ہم انسان کے مستقبل کے بارے میں جو پُر امید ہیں اس کے دو وجود ہیں جن پر ہم ذیل میں گفتگو کرتے ہیں۔

ا۔ رشد اجتماعی میں ترقی

ہم کو جو بات انسان کے مستقبل کے بارے میں اور انسانوں کی زندگی میں گہرے تغیر وتبدل کے سلسلے میں پُر امید کرتی ہے وہ اس کی وہ عالی صفات اور اخلاقی خوبیاں ہیں جو اس کی سرشت میں موجود ہیں۔ ان اعلی صفات نے پوری تاریخ میں اپنے آپ کو عظیم جوانمردوں اور ان کے متقی

پیروکاروں کے ذریعے انصاف پسندی، حق پسندی، ایثار ظلم وستم کے خلاف قیام اعلیٰ مقاصد کے احیاء کی خاطر جان و مال کی قربانی کے طریقے سے منوایا ہے۔ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ انسان کے وجود میں حیوانی صفات اور نفسانی جبلت، جو شر اور خون ریزی کا سرچشمہ ہیں کے علاوہ پاکیزہ احساسات کا بھی ایک سلسلہ موجود ہے۔ یہ اگر فعال ہو جائیں تو ساری حیوانی جبلتوں کو کنٹرول کر کے ان کو اعتدال پر لے آئیں اور حق وحقیقت کے راستے پر چل پڑیں۔

بات یہ ہے کہ پوری تاریخ میں رشد اور نشوونما کے مواقع کی کمی کی وجہ سے انسان کی خودغرضیوں اور جاہ طلبی نے اس کے لطیف اور عمدہ احساسات کو دبائے رکھا ہے۔ اور اس کو اُبھرنے نہیں دیا۔ اور اس کی تاریخ کے صفحات کے ایک بڑے حصّے کو سیاہ کر دیا ہے مگر یہ غالب ہونا اور مغلوب ہونا کوئی مستقل نہیں۔ بعض اوقات انسان میں انفرادی اور اجتماعی طور سے رشد کی ترقی سے عقل وخرد کش انسانی جبلت کی مہار ہاتھ میں تھام لیتی ہے اور اس کو کنٹرول کر لیتی ہے دونوں کی حد مقرر کر کے ایک کو دوسرے پر غلبے سے روکتی ہے اس طرح حیوانی قوتوں اور توانائیوں کو انسانی ارتقاء کی خدمت میں لگا دیتی ہے۔

۲۔ ارتقاء کی لگن انسان کے اندر شعلہ زن ہے

انسان کے مستقبل سے پُرامید ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے مگر یہ محض خوش فہمی نہیں۔ علوم انسانی نے ثابت کیا ہے کہ انسان اپنے کمال کی طرف فطرتاً مائل ہے۔ اور کمال سے عشق اس کے وجود کے اندر شعلہ زن ہے انسان کو یہی ارتقاء کی لگن دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتی ہے۔ کمال کی طرف حرکت ہی نے انسان کی زندگی کو اس قدر رنگین اور متنوع بنایا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے جاندار لاکھوں سال سے ایک انداز کی زندگی گزار رہے ہیں اور ذرا نہیں بدلے۔

چونکہ کمال سے عشق انسان کی سرشت میں داخل ہے اور ہمہ وقت اس کے ساتھ ہے، اس لیے ایک دن یقیناً آئے گا کہ انسان کمال کے اوج پر ارتقاء کی آخری منزلوں میں نظر آئے گا۔ وہ دن دور نہیں جب اس کے معصوم اور حقیقی چہرے سے یہ مکر وہ نقاب ہٹ جائے گی اور ایک عالمی حکومت الٰہی کے زیر سایہ اس کا تابناک چہرہ دکھائی دے گا۔

انسان کی عام زندگی میں جو ارتقاء کا عمل جاری ہے اس سے اس کے کمال سے عشق کا پتہ چلتا ہے۔ وہ پچھلی چند صدیوں میں جھونپڑی کی زندگی سے فلک کوس عمارتوں، حیوانات کو تابع کرنے سے خلاء کی تسخیر اور پتھر اوٴ بارود کے ہتھیاروں سے جوہری توانائی تک پہنچ گیا ہے۔ آج اگر پہلے زمانے کے رہنے والے لوگ دوبارہ اس دُنیا میں پلٹ آئیں تو اس دُنیا کو بھی اجنبی اور کوئی نئی دُنیا خیال کریں اور آج کے انسانوں کو بھی اپنے سے جُدا کوئی نئی مخلوق تصور کریں۔

مگر ذہن میں رہنا چاہیے کہ مادی ارتقاء انسانی ارتقاء کا ایک پہلو ہے اس کو مکمل ارتقاء سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا یہ اسی وقت مکمل ہو سکتا ہے جب اس کے ساتھ روحانی پہلو بھی شامل ہو۔ صرف مادی پہلو میں پیش رفت انسان کی نابودی پر منتج ہو سکتی ہے۔ فوجی ماہرین کا کہنا ہے کہ دُنیا کے اسلحہ خانوں میں ایٹم بم کا اتنا انبار لگ چکا ہے کہ ان میں سے کچھ ہی کا استعمال پورے کُرہ ارض کو نابود کر سکتا ہے۔

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ارتقاء چونکہ انسانی سرشت کا جُز ہے اس لیے معاشرہ انسانی جتنا جلد ہو سکے۔ ہر پہلو میں اپنی ارتقائی منزلیں طے کرے۔ مادی اور معنوی دونوں پہلوؤں سے ارتقاء کی تکمیل کر کے اپنے حقیقی چہرے کو آشکارا کرے ورنہ ایک جہت کا ماوی ارتقاء حقیقی ارتقاء کے برعکس اور اس کی ضد ہوگا۔

یہاں دو سوال ابھرتے ہیں

پہلا سوال ہر تمدن اور ثقافت کے ایک ہونے اور سارے معاشروں کا ایک معاشرے میں ضم ہونے سے متعلق ہے دوسرا سوال ظلم و جبر کی جگہ انصاف کی حکمرانی سے متعلق ہے۔ ہم دونوں سوالوں کو پیش کر کے ان کے جواب وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔

کیا معاشروں تمدنوں اور ثقافتوں کی وحدت ممکن ہے

کیا ایک دن ایسا آئے گا جب یہ مختلف معاشرے اور یہ گوناں گوں ثقافتیں اپنی مخصوص طرز وروش کے باوجود ایک معاشرے، ایک ثقافت اور ایک تمدن کی شکل اختیار کر لیں گی اور ایک حکومت کے تحت ہو جائیں گی؟

اس سوال کا جواب معاشرے کے مزاج سے متعلق بحث سے ملتا ہے اور اس سے بھی کہ اجتماعی زندگی کی طرف انسان کا جھکاؤ کس حد تک ہے۔ کیا یہ رجحان اس طرح ہے، جیسے قرآن کہتا ہے کہ اجتماعی زندگی انسان کی فطرت میں مضمر ہے انسان جبلت سے مشابہ سبب کے ساتھ ساتھ زندگی کی طرف قدم اٹھاتا ہے[1]۔ اگر اس کی معاشرتی زندگی اسی اصول پر استوار ہے تو لازمی طور سے یہ معاشرتی رُوح آہستہ آہستہ مزید اختیار کر کے سارے معاشروں کو ایک معاشرے میں ضم کر دے گا۔

دوسرے لفظوں میں اگر انسانی زندگی پر معاشرتی رُوح سایہ فگن ہے اور یہ سایہ لحہ بہ لحہ پھیل رہا ہے اور وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے تو یہ مختلف معاشرے، ثقافتیں اور تمدن وحدت کی سمت بڑھ رہے ہیں اور مستقبل میں ثقافتی ارتقاء اور قربتوں کے وسائل کے زیادہ سے زیادہ ہونے کی وجہ سے اور معاشرون میں دوریاں کم سے کم ہونے کی بناء پر مختلف معاشرے یک رنگی پیدا کر کے ایک ہی معاشرے میں ڈھل جائیں گے۔ جو رُوح ان چھوٹے چھوٹے معاشروں کے پیدا ہونے کا سبب بنی، وہی ان معاشروں کو یکسانیت اور وحدت کے راستے پر ڈال دے گی۔

انسان کی اجتماعی زندگی کے سبب کے بارے میں مختلف نظریے پیش کیے گئے ہیں کبھی کہا گیا کہ یہ انسان کی استعماری حس اور مفاد پرستی ہے، جو اس کو اجتماعی زندگی کی طرف لاتی ہے، انسان نے با آسانی اندازہ کر لیا کہ وہ اکیلے آرام دہ اور پُر لطف زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس کے علاوہ دوسرے نظریے پیش کیے جاتے ہیں۔

صحیح اور معقول نظریہ جس کی تائید احساسات اور تجربات بھی کرتے ہیں۔ اور آیات قرآن سے بھی جس کی تائید ہوتی ہے۔ یہ ہے اجتماعی زندگی

---

[1] اکیسویں باب کے آخری عنوان انسان کی خلقت میں معاشرتی زندگی سموئی ہوئی ہے۔ کو ملاحظہ کریں۔

انسان کے لیے ایک فطری امر ہے اور یہ طرز زندگی پہلے ہی سے اس کی فطرت میں مضمر ہے۔ (جیسا کہ علماء کہا کرتے تھے کہ ''الانسان مدنی بالطبع'') یہ اجتماعی رُوح جو تاریخ انسانی میں پہلے بکھری صورت میں دکھائی دیتی رہی ہے رفتہ رفتہ کامل صورت میں سامنے آتی جا رہی ہے، مستقبل میں یقیناً یہ رُوح زیادہ وسعت پیدا کر کے سارے معاشروں م، ثقافتوں، تہذیبوں اور حکومتوں کو واحد معاشرے میں ضم کر دے گی۔ جہاں ایک ثقافت ایک تمدن اور ایک ہی حکومت ہوگی۔ اس وسعت اور پھیلاؤ کی نشانیاں بیسوی صدی کے انسان کی زندگی میں نظر آنے لگی ہے۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں کچھ لوگ نیشنلزم اور قومیت پرستی کے نظریے کا پرچار کر رہے تھے۔ اور بہت سے لوگ دوسرے مختلف ناموں سے اس کتب فکر کا دفاع کر رہے تھے کہ یکا یک انٹرنیشلزم کا خیال سر میں سما گیا۔ مغرب کے دانشوروں کی نظر میں ایک واحد عالمی حکومت کی تشکیل ضروری ہوگئی ہے۔ اس دوران پہلی اور دوسری جنگ عظیم نے بھی اس خیال کو تقویت دی۔ انھوں نے اندازہ کیا کہ قوموں کے درمیان یہ مصنوعی سرحدیں دراصل خونریزی اور جنگ وجدال کا باعث ہیں۔ اس مصیبت سے رہائی کی یہی صورت ہے کہ ان مصنوعی سرحدوں سے چھٹکارا پا کر ساری انسانیت کو ایک پرچم اور ایک حکومت کے زیر سایہ یک جا کر دیا جائے۔

پہلی جنگ عظیم کی بے تحاشا قتل وغارت گری کے نتیجے میں ایک بڑا اتحاد ''لیگ آف نیشنز'' کے نام سے وجود میں آیا۔ ۲۶ ممالک اس کے رکن بنے اور یکجا ہُوئے تاکہ خوں ریزیوں کو روکا جا سکے اور بین الاقوامی مسائل کو افہام وتفہیم سے حل کیا جائے مگر یہ اتحاد ناقص بنیادوں پر قائم ہوا تھا اس لیے یہ دوسری جنگ عظیم کی تباہیوں سے دنیا کو نہ بچا سکا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ایک عالمی معاشرے کے قیام کی حقیقت پسندانہ انداز میں فکر زیادہ زور پکڑ گئی۔ چنانچہ تنظیم اقوام متحدہ وجود میں آئی جس کے مقاصد اقوام متحدہ کے منشور کے نام سے واضح کیے گئے۔ عالمی مفکرین اور سیاستدان پیشین گوئی کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ آئندہ چل کر اقوام متحدہ جو درحقیقت ایک عالمی پارلیمنٹ ہے ایک واحد حکومت بن جائے اور انسانوں کی وحدت اور تمام نوع انسانی کی مساوات کا اعلان کرے۔

یہ سارے ادارے تنظیمیں اور نیشنلزم کی جگہ انٹرنیشنلزم کا پرچار اس بات کے گواہ ہیں کہ سارے مختلف معاشروں کا ایک معاشرے میں ضم ہونا اور ایک واحد عالمی حکومت کا قیام کوئی زیادہ دور اور غیر ممکن بات نہیں۔

بلکہ یہ انداز فکر یہاں تک آ پہنچا ہے کہ کچھ مفکرین عالم نے ۱۹۶۳ء میں ٹوکیو کے ایک سیمنار میں ایک اعلامیہ جاری کیا۔ اس کے مطابق ان کے پروگرام کے خاص نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی پارلیمنٹ

۲۔ شورائے عالیہ انتظامی

۳۔ عالمی فوج اور

بین الاقوامی عدالت۔ [1]

یہ طرز فکر اور ایسے سیمناروں کا قیام اس بات کی نشاندہی کرتا ہے۔ کہ خداوند تعالیٰ کی وہ منشا جو اس کے محترم انبیاء اور اولیاء انسانیت کے سامنے پیش کرتے رہے، اب وہ ظہور پذیر ہونے والی ہے۔ اور فلسفہ مہدیت میں مضمر نکتہ اب عالمی حکومت کی صورت میں، جو ثقافت و تمدن کی وحدت کے ساتھ ہو، مستقبل قریب میں ممکن نظر آتا ہے۔

(۱۱) خونریزی کے بجائے صلح و صفائی

ایک دوسرا سوال یہاں یہ ابھرتا ہے کہ تاریخ بشر تو جرائم جارحیت اور ناانصافیوں سے بھری پڑی ہے۔ جابر حکمرانوں، مستکبرین، سرمایہ داروں، مسرفین طاغوتوں سلطانوں اور امراء کا نام سنتے ہی خون ریزیوں قتل عام، جنگ و جدال اور جارحیت کی تصویر آنکھوں میں کھینچ جاتی ہے۔ انسان سوچنے لگتا ہے کہ کیا اس گھپ اندھیرے کے بعد کبھی صبح بھی ہوگی اور روشنی بھی نظر آئے گی۔ کیا دن بھی آئے گا جب انسان ایک دوسرے پر ظلم و ستم کرنے سے ہاتھ کھینچ لے اور بھائیوں کی طرح ایک ساتھ رہے۔

اس کا جواب اس باب کے آغاز میں دیا جا چکا ہے، جہاں کہا گیا تھا کہ فلسفیانہ اور معاشرتی انداز سے اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ انسان اعلیٰ ترین روحانی کمال کے درجے پر پہنچے، کمال کی طرف انسان کی حرکت صرف مادی رُخ پر نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کے ساتھ وہ روحانی جہت میں بھی کمال حاصل کرے۔ اجتماعی انسان کی صنعت اور سائنس میں ترقی اور وسعت سے کسی کو انکار نہیں۔ بلکہ اس کا سمندروں اور خشکیوں پر غلبہ سب پر واضح اور روشن ہے۔

مگر کیا اس کا مادی رُخ پر یہ کمال جو صرف ایک بعد اور جہت کا ارتقاء ہے۔ انسان کی سعادت اور خوش بختی کا ضامن ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا حقیقی ارتقاء اس وقت نصیب ہوگا سائنس اور صنعت خلائی راکٹوں مصنوعی سیاحوں، سمندر کی تہوں میں تحقیق اور فضائے بسیط میں انکشافات کے ساتھ ساتھ انصاف اور عدل ہمدردی اور احسان، اخلاق اور انسانیت کے ساتھ حکومت کی جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوسکا تو پھر معاشرہ ایک پَر والے پرندے کے مانند رہے گا جو جلد زمین پر گر کر ختم ہو جائے گا۔

اس سلسلے میں علامہ طباطبائی لکھتے ہیں:

نوع انسانی اپنی اس فطرت کے تحت جو خدا نے اس کی سرشت میں رکھ دی ہے۔

اپنی حقیقی سعادت کی خواہش مند ہے اور حقیقی سعادت اس میں ہے کہ انسان کے جسم و جان دونوں کی احتیاجات اور ضروریات پوری ہوں۔ اس کی نظر میں دُنیا اور آخرت دونوں ہی ہوں یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی کبھی انسان اپنی حقیقی سعادت کی راہ سے منحرف ہو کر بے راہ روی اختیار کر لیتا ہے، اس کی وجہ نہیں ہوتی کہ اس نے فطرت کی صدا سُنی ان سُنی کر دی یا اس فرمان پر کان نہیں دھرا، بلکہ یہ انحرافات اس کے اطلاق

---

[1] ان امور سے تفصیلی آگاہی کے لیے مصنف کی کتاب ''حکومت اسلامی در چشم انداز ما''۔ صفحات ۴۸ تا ۵۰ ملاحظہ کریں۔

Application میں غلط فہمیوں اور خطا سے پیدا ہوتے ہیں۔

انسان سعادت اور کمال کے ہی راستے پر چل رہا ہے، مگر اس کے خیال میں یہ انحراف اس کے کمال کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ کارخانہ خلقت اپنے اصلی ہدف و مقصد تک جلد یا بدیر پہنچ کے رہے گا۔[1]

قرآن اور معاشروں کا مُستقبل

قرآن نے معاشروں کے بارے میں وضاحت سے گفتگو کی ہے۔ اس سے متعلق آیات کے مطالعے سے اس کا نظریہ روشن ہوتا ہے۔ اس موضوع کی دس آیات ہم چند عنوانات کے تحت پیش کر رہے ہیں۔

ا۔ صالحین زمین کے وارث ہوں گے

انسان مستقبل میں جھانک کر دنیا کے آنے والے سلسلوں اور انسانی سرنوشت کو معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے تاریخ کے آغاز حق و باطل کے درمیان ہمیشہ جنگ رہی ہے۔ کامیابی دست بہ دست رہی ہے۔ قرآن کی تعبیر کے مطابق:

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ

''ہم کامیابی کے دنوں کو لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہے ہیں۔'' (آل عمران۔ ۱۴)

تاریخ انسانی کا طریقہ اب تک کامیابیوں کے ایک سے دوسرے کو منتقل ہونے کا رہا ہے۔ مگر قرآن کے مطابق مشیت الٰہی یہ ہے کہ مستقبل میں صرف صالحین زمین کے وارث ہوں اور سارے جہاں کی حکومت اور سارے امور کا انتظام وہ اپنے ہاتھ میں لیں وہ حق اور حقیقت کے اقتدار کا دور ہوگا۔ باطل اس پر غلبہ نہیں پا سکے گا۔ ساری دُنیا صالحین کی حکومت کے پرچم تلے ہوگی ایک ہی حکومت پورے جہان پر غالب ہوگی۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝۱۰۵

''ہم نے زبور میں ''ذکر'' کے بعد شاید ذکر سے تورات مراد ہے) اس طرح لکھ دیا ہے کہ آئندہ صالحین اور پاک زمین کے وارث ہوں گے۔ (اور صفحہ جہان ہمیشہ کے لیے غیر صالح افراد کے وجود سے پاک ہو جائے گا۔'' (انبیاء)

---

[1] المیزان جلد ۴ ص ۱۴۔

دوسری آیت میں بھی فرمایا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠

''خدا نے تم میں سے صاحب ایمان افراد میں سے جو عمل صالح بجالاتے ہیں قطعی وعدہ کیا ہے کہ ان کو روئے زمین پر اپنا خلیفہ اور جانشین بنائے گا۔'' (نور۔ ۵۵)

زمین میں ان کی جانشینی خدا کی طرف سے یا گذشتہ لوگوں کی طرف سے دراصل امور زندگی کا انتظام و انصرام اور معاشرے میں عدل و انصاف کا قائم کیا جانا اور زمین میں آبادی کی وسعت ہے۔

تیسری آیت میں تقوٰی اختیار کرنے والے کے لیے انجام کا یوں ذکر ہے:

وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾

''انجام کار تقوٰے اور پرہیزگاری سے مربوط ہے۔'' (طٰہٰ)

۲۔ دنیا میں دین خدا کا قائم ہونا اور امن و امان کا پھیلنا

قرآن کی رُو سے خدا اس دین کو جسے اس نے اپنے بندوں کے لیے پسند کیا ہے، روئے زمین پر قائم کرے گا ایسا دین جو ہر قسم کے شرک سے پاک ہوگا۔

اس دن ساری دنیا میں امن و امان ہوگا۔ حق کے پیروکار بغیر کسی خوف و خطر کے خداوند عالم کی عبادت کریں گے پھر تقیہ یا مخالفین اور باطل گروہوں کی خوش آمد درآمد وغیرہ کی ضروریات نہیں پڑے گی۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ؕ

''جس دین کو ان کے لیے پسند کیا ہے وہ قائم ہو جائے گا۔ ان کو خوف کے بعد امن عطا ہوگا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور کسی کو شریک قرار نہیں دیں گے۔'' (نور۔ ۵۵)

۳۔ پوری دنیا میں اسلام پھیل جائے گا

قرآن دنیا مین دین اسلام کے قائم ہونے ور دوسرے مذاہب پر اس کے غلبے کی دو موقعوں پر خبر دیتا ہے یہ غیبی پیشین گوئی ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ روایات کے مطابق اس کے پورا ہونے کا زمانہ ابھی تک نہیں آیا یہ وہ زمانہ ہوگا۔ جب پیغمبرؐ اکرم کے آخری وصی اور جانشین حضرت مہدیؑ امور و معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں گے اور اسلام سارے مشرق و مغرب میں پھیلا دیں گے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۳﴾

''وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایتوں اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ حق کو تمام دینوں پر کامیابی دے۔ اگر چہ مشرک لوگ اس کو پسند نہیں کرتے۔'' (توبہ۔۳۳ اور صف۔۹)

دوسری آیت میں یہی مضمون دوسرے انداز میں آیا ہے: جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔

یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوۡرِهٖ وَلَوۡ کَرِهَ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۸﴾

''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا۔ اگر چہ وہ کافروں کو بُرا لگے۔'' (صف۔۸)

۴۔ پیغمبروں کی کامیابی

پوری تاریخ میں انبیاء نے اپنے مکتب کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے کوششیں کی ہیں۔ مگر پوری دنیا میں اپنے مذہب کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔ ہر زمانے میں بے شمار گروہ انبیاء کی مخالفت میں کھڑے ہو گئے۔ اور ان کے راستے میں رکاوٹ بنے۔ مگر قرآن اہل باطل کے حق کے مقابلے میں قیام کو وقتی سمجھتا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ باطل کے مورچے آخر کار ڈھائے جائیں گے اور انبیاء کا پروگرام دنیا میں پھیل کر رہے گا۔ قرآن اس حقیقت کو چند آیات میں بیان کرتا ہے:

اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَیَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡاَشۡهَادُ ﴿ۙ۵۱﴾

''ہم اپنے انبیاء اور بھیجے ہوئے اور صاحب ایمان افراد کی دُنیا میں اور گواہوں کے قیام کے دن مدد کریں گے۔ (مومن)

قرآن ایک دوسری آیت میں آئندہ زمانے میں انبیاء کی کامیابی سے مشیت الٰہی کے تعلق کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧١﴾ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿١٧٢﴾ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿١٧٣﴾

''ہمارے ارادے اور مشیت کا انبیاء کی کامیابی سے تعلق ہے۔ وہ منصور اور مدد کیے ہوئے ہیں۔ اور ہماری فوج (سپاہِ توحید) کامیاب ہے۔'' (صافات۔)

ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ط

''خدا نے اپنے اوپر لازم کیا ہے کہ وہ اور اس کے انبیاء کفر کی قوت پر غالب آئیں گے۔''

(مجادلہ۔۲۱)

۵۔حق و باطل کی جنگ میں حق کامیاب ہے

قرآن کی آیات نہ صرف یہ کہ نظام تکوین کو نظام خیر سمجھتی ہیں اور خیر کو شر پر غالب جانتی ہیں، بلکہ انسان کے اجتماعی نظام کو ایسا استوار محکم سمجھتی ہیں جہاں نظام توحید آخر کار نظام شرک وطاغوت پر غلبہ حاصل کرے گا اور کامیابی صالحین اور سچوں کے لیے ہوگی۔ اسی لیے قرآن فرماتا ہے:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ط

''ہم حق کو باطل پر دے ماریں گے اور اس باطل کو نابود کردیں گے۔ وہ کھوکھلا اور تباہ ہوجائے گا۔'' (انبیاء۔۱۸)

قرآن ایک دوسری آیت میں حق و باطل کو پانی اور جھاگ سے تشبیہ دیتا ہے باطل جھاگ کی طرح حق کے دوش پر سوار ہوجائے گا اور حق کی حرکت کے ساتھ حرکت کرے گا۔ لیکن زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ باطل جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا حق اور حقیقت آب حیات کی طرح دلوں میں باقی رہ جائے گی۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ط

''جھاگ پانی کے اوپر سے نابود ہوجائے گی اور لوگوں کے لیئے جو کچھ مفید ہے وہ زمین میں باقی رہ جائے گا۔''

(رعد۔۱۷)

٦۔زمان آخر میں معاشروں کی اصلاح کے لیے غیبی امداد

قرآن کے مطابق زمانہ آخر میں معاشروں کے لیے ایسے جان نثار افراد پیدا ہوں گے جو اپنی پوری توانائی سے اسلام کی سربلندی اور کفر کی نابودی

کے لیے کوشاں ہوں گے۔ چنانچہ قرآن مختلف گروہوں کو خبردار کرتا ہے کہ اگر وہ توحید کے جادہ مستقیم سے منحرف ہو گئے۔ اور جاہلیت کی طرف پلٹ گئے تو ان کے اس انحراف کی وجہ سے دین حق کبھی نابود اور تباہ نہیں ہوگا۔ ساری تاریخ میں معاشرہ جو اپنے کمال کی طرف رواں دواں رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے افراد پیدا ہوتے رہے ہیں جو خدا کے دوست ہیں اور خدا بھی ان کو دوست رکھتا ہے وہ صاحب ایمان لوگوں کے سامنے متواضع اور منکسر المزاج ہیں۔ جبکہ کفار کے مقابلے میں پروقار اور بارعب ہیں۔ راہ خدا میں کوشش کرتے ہیں اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ ۭ

''اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو: (یاد رکھو) تم میں سے جو کوئی بھی اپنے دین سے پھر جائے گا تو عنقریب اللہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن کو وہ دوست رکھتا ہے اور وہ اس کو دوست رکھتے ہیں۔ (وہ) مومنوں پر نرم دل ہوں گے اور کافروں پر سخت ہوں گے وہ خدا کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ (مائدہ۔۵۴)

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ وعدے اور قرآنی خوش خبریاں دنیا میں ابھی تک علم گیر پیمانے میں عملی جامہ نہیں پہن سکی ہیں۔ تو یہ وعدے کب پورے ہوں گے۔ اس کا حل اسلامی مستند روایات سے مل سکتا ہے۔ یہ روایات اس کی نشاندہی کرتی ہیں، کہ یہ خوشخبریاں امام زمانہ کے ظہور کے وقت پوری ہوں گی۔

روایات سے صنعتی اور تکنیکی اعتبار سے عقل انسانی کے ارتقاء اور پیش رفت کا ذکر ملتا ہے جس طرح عدل اسلامی اور دین توحید کے عالمگیر ہونے کی خبر ملتی ہے۔ ان روایات کو اختصار کے ساتھ ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ ہر موضوع پر ہم صرف ایک حدیث کو نقل کریں گے۔

(۷) معاشروں کی ارتقائی صُورت احادیث اسلامی کی نظر میں

زمانے کی گردش تلخ وشیریں تجربات عقل انسانی میں وسعت کا باعث ہوتے ہیں۔ آخر کار انسان الطاف الہیٰ کے سایہ میں اس کا احساس کرے گا کہ اب مزید انسانی ادارے اور بشری تدابیر مسائل کی مشکلات اور تضادات کے حل پر قادر نہیں رہے، اس لیے وہ فوسری حضرت قائم کی پکار کو جواب دے گا۔ لوگ رضا ورغبت سے امام کے انقلاب میں شریک ہو جائیں گے۔

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔

"اذا قام قائمنا وضع الله یده علی رؤس العباد فجمع بها عقولهم وکملت به احلامهم۔"[۱]

''جب ہمارے قائم قیام کریں گے خدا اپنے لطف و رحمت کا ہاتھ اپنے بندوں کے سر پر رکھے گا۔ اس طرح ان کی عقلوں کو وحدت بخشے گا اور اس ذریعے سے ان کی عقل و خرد میں ارتقاء پیدا ہوگا۔''

۲۔صنائع کا ارتقاء

عالمی انقلاب صنعت اور ٹیکنالوجی کے ارتقاء کے بغیر ممکن نہیں۔ رہبر انقلاب کی آواز دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے کے لیے تکنیکی مہارت میں ممکن ترقی کی اشد ضرورت ہوگی۔ چنانچہ اسلامی احادیث یہ خوشخبری دیتی ہیں کہ امام کے ظہور کے زمانہ میں صنعت اور ٹیکنالوجی اس حد تک ترقی کر چکی ہوگی کہ پوری دنیا ایسی ہوجائے گی جیسے ایک شہر اور ایشیاء میں رہنے واے یورپ والوں کو دیکھ سکیں گے اور ان کی باتیں سُن سکیں گے۔ چنانچہ امامؑ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

"ان المومن فی زمان القائم وهوبالمشرق لیری اخاه بالمغرب وکذالذی فی المغرب یری اخاه الذی بالمشرق[۲]

''حضرت قائم کے زمانے میں جو مومن شخص مشرق میں رہتا ہوگا وہ اپنے بھائی کو جو مغرب میں ہوگا دیکھے گا۔ اسی طرح جو مومن مغرب میں ہوگا وہ اپنے مشرق والے بھائی کو دیکھے گا۔''

ایک دوسری حدیث میں یہی مضمون زیادہ واضح طور پر بیان ہوا ہے:

"ان قائمنا اذا قام مد الله لشیعتنا فی اسماعهم وابصارهم حتّٰی لا یکون بینهم وبین القائم برید یکلمهم فیسمعون و ینظرون الیه وهو فی مکانه۔"[۳]

''جب ہمارے قائم قیام کریں گے تو خدا ان کے پیروکاروں کی آنکھوں اور کانوں کو اتنی قوت بخشے گا کہ ان

---

[۱] منتخب الاثر۔ص۔۴۲

[۲] منتخب الاثر۔ص۔۴۸۳

[۳] منتخب الاثر۔ص۔۴۸۳

کے اوران کے امام کے درمیان کوئی چیز عائل نہیں ہوگی۔آن جناب ان سے گفتگو کریں گے اور وہ آپ کی باتیں سنیں گے اور آپ کو دیکھیں گے، جب کہ آپ اپنی جگہ پر ہوں گے۔''

۳۔ پوری دنیا اسلام کے سائے میں آجائے گی

قرآن مندرج خوش خبریوں کو دین اسلام کے عالمگیر وسعت حاصل کرنے کے سلسلے میں احادیث اسلامی امام قائم کے ظہور سے مربوط کرتی ہیں ۔چنانچہ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

''یبلغ سلطانه المشرق والمغرب ویظهر الله عزوجل به دینه علی الذین کُله ولو کره المشرکون۔''[1]

''آنجناب کی قدرت اور تسلط مشرق ومغرب پر ہوجائے گا۔خدا آپ کے ذریعے اپنے دین کو تمام مذاہب پر کامیابی عطا فرمائے گا خواہ مشرک اس کو بُرا جانیں۔''

۴۔اخلاقی ارتقاء

پچھلی بحث میں ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ارتقائے حقیقی یہ ہے کہ مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں پر ترقی ہوصرف ایک بُعد کا ارتقاء حقیقی ارتقاء نہیں کہلائے گا۔

احادیث اسلامی بارہویں امامؑ کے ظہور کے زمانے میں اخلاقی ارتقاء کا ذکر کرتی ہیں۔حتٰی کہ سارے اسلامی محدثین نے یہ جُملہ پیغمبرؐ اکرم سے نقل کرتے ہیں کہ امام قائم کی حکومت کی خصوصیات میں سے ایک عدل وانصاف کا پھلنا اور ظلم وستم کی بساط کا لپیٹا جانا ہے اور یہ جُملہ:

یملا الارض قسطاً وعدلاً۔''

اسی اخلاقی ارتقاء کو بیان کرتا ہے۔

۵۔ویرانوں کا آباد کیا جانا

اسلامی احادیث امامؑ کے ظہور کے زمانے میں واضح الفاظ میں کرّہ ارض کے بنجر اور غیر آباد علاقوں کے بسائے جانے اور زمین میں پیچھے ہُوئے سارے وسائل اور خزانوں پر انسان کے تسلط کو بیان کرتی ہیں چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ:

---

[1] منتخب الاثر۔ص۔۲۹۹۔

"وتظھر لہ الکنوز ولایبقی فی الارض خراب الایعمرہ۔"[۱]

''زمین کے اندر چھپے ہُوئے خزانے امامؑ کے اختیار میں ہوں گے آپ جو مادی اور روحانی طاقت اور نفوذ رکھتے ہوں گے اس کی وجہ ان موروث ویرانوں کو آباد کریں گے جو ظلم جور کی وجہ سے ویران پڑے ہوں گے۔''

چنانچہ جو کچھ عقل اور تحقیقاتی مطالعے اور تجزیے معاشروں کے مستقبل کے بارے میں نشاندہی کرتے ہیں ان کی تصدیق قرآن اور احادیث اسلامی سے بھی ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ احادیث اس ارتقاء کا وقت اور زمان بھی متعین کرتی ہیں یعنی یہ انقلاب امام قائم کے ظہور کے وقت آئے گا.

(۸) گزشتہ معاشرے آئینہ عبرت ہیں

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ

قرآن گزشتہ معاشروں کی تاریخ کو آئینہ عبرت اور تنبیہ و بیداری کا وسیلہ جانتا ہے۔ ان کی ترقی اور تنزلی کے اسباب سے شناسائی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے: (یوسف۔۱۱۱)

قرآن ان لوگوں کو جو غور و خوض کرتے ہیں اور باشعور بھی ہیں حکم دیتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی چھان بین کریں۔ ان کی طاقت اور کمزوریوں کے اسباب کو سمجھیں، تاریخ کے اس مطالعے کی اہمیت کو بار بار بیان کرتا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے:

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ؕ﴿۹﴾

''کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا انجام کیسا ہوا تھا۔ وہ ان سے قوت میں زیادہ تھے۔ انہوں نے زمین کو جوتا بویا تھا۔ ااسے انہوں نے اس سے زیادہ آباد کیا تھا جتنا انہوں نے آباد کیا ہے۔ ان کے پاس ان کے رسول کُھلی دلیلیں لے کر آئے۔ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ ان پر ظلم کرتا بلکہ وہ اپنے آپ پر

---

[۱] منتخب الاثر۔ص۔۴۸۲

خود ہی ظلم کیا کرتے تھے۔[1]

ایسی آیات کے مطالعے سے ہم درج ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں:

۱۔قرآن کی رُو سے تاریخ کچھ قوانین وضوابط کے تحت ہے اور تاریخ کی حرکت کبھی اتفاق اور بے ضابطہ بنیاد پر استوار نہیں ہوئی تاریخ کو پانی پر تیرتا ہوا تنکا نہیں سمجھنا چاہیے جو ادھر اُدھر بھٹکتا پھرتا ہے اور کسی قاعدے کا پابند نہیں۔

۲۔تاریخ انسانی کی حرکت کسی ''جبر'' کے تحت نہیں۔ایسا نہیں کہ اس کی تبدیلیوں اور نقلابات میں انسان کے ارادے اور خواہش کا کوئی دخل نہ ہو۔اس کے برعکس انسان اپنے ارادے اور خواہش سے تاریخ جس راستے پر گامزن ہے اس میں تبدیلی لا سکتا ہے اور ایک عامل اور محرک کو دوسرے کی جگہ رکھ سکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں تاریخ بنانے میں انسان کی حریت وآزادی کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔اسی لیے قرآن حکم دیتا ہے کہ گذشتہ قوموں کے حالات کو مطالعہ کیا جائے تاکہ قوموں کی سعادت اور بدبختی کے اسباب کو شناخت کیا جا سکے۔

امیر المومنین اپنے فرزند کو وصیت فرماتے ہیں:

اے بیٹے! اگرچہ میں نے تاریخ میں گذشتہ لوگوں کے ساتھ زندگی بسر نہیں کی لیکن میں نے ان کی زندگی کے واقعات کا مطالعہ کیا ہے اور جو کچھ ان کے آثار بطور یادگار رہ گئے ہیں ان پر بھی غور وخوض کیا ہے۔اس دوران گویا اس پوری مدت (تاریخ) میں میں ان کے ساتھ زندہ رہا ہوں۔اور زندگی کے تلخ وشریں حوادث کو میں نے قریب سے دیکھا ہے۔گویا میں عمر جاودانی رکھتا تھا۔[2]

چونکہ قرآن گزشتہ قوموں کی زندگی کے مطالعے کو باعث عبرت اور صاحب عقل افراد کے لیے بڑے دوررس نتائج اور تجربات کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔اس لیے اگر تاریخ کے بنانے میں خود انسان کا کوئی کردار نہ ہو اور تاریخ کی حرکت مثل سُورج کے گرد زمین کی حرکت کے انسان کے اختیار سے باہر ہو تو پھر گزری ہوئی قوموں کا مطالعہ اس کے لیے مفید اور باعث عبرت نہیں ہوگا۔بلکہ زیادہ سے زیادہ فطرت کے کچھ ایسے قوانین کا علم ہو سکے گا جو انسان کی زندگی پر اثر نہیں رکھتے۔

صرف وہی چیز عبرت کا سبب بن سکتی ہے جس کو انسان آگے پیچھے کر سکے اور اس کو بدلنے اور تبدیل کرنے پر اختیار رکھتا ہو۔

۳۔قرآن تاریخ کے بارے میں ان دو اصولوں کے علاوہ ایک تیسرے اصول کا بھی قائل ہے اول یہ کہ قرآن تاریخ کی حرکت کو قانون اور ضابطے کا پابند جانتا ہے۔دوسرے یہ کہ تاریخ کے آگے بڑھنے میں انسان کے ارادے اور خواہش کو پوری طرح مؤثر شمار کرتا ہے۔جو تاریخ کو اپنے فائدے یا نقصان کے راستے پر ڈال سکتا ہے۔

ان دو اصولوں کے علاوہ قرآن ایک تیسرے اصول کو بھی تاریخ پر حکمران جانتا ہے۔اس کا کہنا یہ ہے کہ محرک تاریخ ہمیشہ ظلم وزیادتی، مال وثروت

---

[1] یہ مضمون ان صورتوں میں بھی آیا ہے: آل عمران۔۱۳۷۔انعام۔۱۱۔یوسف۔۱۰۹۔نحل۔۳۶۔حج:۴۶۔نمل۔۶۹۔عنکبوت۔۲۰۔مومن:۲۱،۸۲۔محمد۔۱۰۔

[2] نہج البلاغہ۔خط شمارہ ۳۱

اور دوسرے پست عوامل نہیں ہیں۔ اگر ان پست و رذیل اسباب سے تاریخ کے پہیئے گردش میں آ سکتے ہیں تو دوسرے عوامل مثلاً عدل و انصاف پاکیزگی اور پرہیزگاری بھی تاریخ کی گردش میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تا کہ اچھے اور بُرے نمونے واضح ہوں۔ ان میں امتیاز پیدا کرنے کے بعد صالح اور پاکیزہ نمونوں کی پیروی کی جائے۔

اگر تاریخ کے محرک صرف فاسد اور گھٹیا عوامل ہوتے تو تاریخ کا مطالعہ صرف تباہ کاریوں اور بدبختوں کا ہی درس دیتا۔

مختصر یہ کہ محرک تاریخ غلط اور بُرے عامل تک محدود نہیں کی۔ نیکی و پرہیزگاری اور عدل و انصاف قائم کرنے کی خواہش بھی تاریخ کے آگے بڑھانے میں مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اسی لیے تاریخ کو بہت ہی اچھا استاد کہا گیا ہے تاریخ کے آئینے میں ہر عامل کا نقش نظر آتا ہے اور منعکس ہوتا ہے۔ قرآن حق و انصاف کے کردار کی اور یہ کہ کامیابی حق اور حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿٢١﴾

''خدا نے لازم قرار دیا ہے کہ وہ اور اس کے رسول کامیاب ہوں۔ خدا قدرت والا ہے۔'' (مجادلہ۔ ۲۱)

ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے:

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٥٦﴾ (مائدہ)

وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿١٧٣﴾

''ہماری حزب اور ہماری فوج کامیاب ہیں۔'' (صافات)

خدا اور اس کے پیغمبروں کی کامیابی سے مراد حق اور اس کے قانون کی کامیابی ہے۔

۴۔ خدائی نقطہ نگاہ سے تاریخ اپنے لیے قوانین اور ضابطوں کا ایک سلسلہ رکھتی ہے۔ مشتیت الٰہی کے طور سے تاریخ کی تفسیر کا مطلب یہ نہیں کہ تاریخ کے ان قوانین اور ضابطوں کی نفی کی جائے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ تاریخ قطعی روشن فطری قوانین وضوابط کی بنیاد پر حرکت کرے۔ ساتھ ساتھ یہ کہ وہ خوب جانتا ہے کہ کون سا معاشرہ کن سنتوں کی پیروی کر رہا ہے۔

اس لحاظ سے قضاوقدر اور مشیت الٰہی اور تاریخ کے قوانین وضوابط میں کوئی تضاد نہیں۔ اور اس سے ''جبر'' تاریخ کے نظریے کی تائید نہیں ہوتی۔

۵۔ تاریخ کا ایک ہدف ہے یعنی وہ ہمیشہ انسانی ارتقاء اور کمال کے راستے پر آگے بڑھ رہی ہے۔ اگر معاشرہ اپنے ارتقاء کی طف قدم بڑھائے تو دنیا اور فطرت کا مزاج بھی اس سے ہم آہنگ ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر معاشرہ کمال انسانی کے برخلاف قدم بڑھائے تو فطرت سخت ردّعمل دیتی ہے۔ گویا یہ سارا عالم فطرت، ساری موجودات ایک جسم کے مانند ہیں۔ انسانی معاشرہ بھی اس فطرت کے جسم کا ایک جزو ہے۔ اگر غلط غذا انسان کے معدے میں پہنچ کر زہر بن جائے تو باقی اجزائے جسم اس زہر کے مقابلے میں ردّعمل ظاہر کرتے ہیں تا کہ وہ زہر جسم سے خارج ہو

جائے اور انسان پھر صحت سے ہم کنار ہو۔اس طرح انسانی معاشرہ جو اس فطرت کا ایک جزو ہے اگر ارتقاء کے خلاف چل پڑے اور ظلم وستم ،شہوت اور بے رحمی کو اپنا شعار بنالے تو فوراً فطرت اپنا ردّعمل ظاہر کرے گی۔انسانی معاشرے کا فطرت سے تعلق کچھ اس قدر گہرا اور عمیق ہے کہ ابھی تک اس سے پردہ نہیں اٹھایا جاسکا ہے۔

قرآن فطرت اور انسانی معاشرے کے اس تعلق کو ارتقاء کے راستے میں دونوں کی ہم آہنگی کے سلسلے میں فرماتا ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴿۹۶﴾

''جب معاشرے کے افراد ایمان اور تقوٰے اختیار کریں تو آسمان وزمین کی رحمت کے دروازے ہم ان پر کھول دیتے ہیں۔لیکن جب تکذیب کریں تو ان کے کردار کی سزا کے طور پر ہم ان کی گرفت کرتے ہیں۔'' (اعراف)

اس آیت سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ معاشرے کی فطرت سے ہم آہنگی کی کیا صورت ہے اور ہم آہنگی پیدا نہ ہونے کی کیا صورت ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ انسان ایمان اور تقوٰی اختیار کرکے ارتقاء کے راستے پر گامزن ہوتا ہے اور آیات الٰہی کی تکذیب کرکے اس کے برعکس قدم اٹھاتا ہے۔فطرت بھی ان دونوں صورتوں میں ویسا ہی ردعمل دیتی ہے۔''[1]

(۹) تاریخ کی کتابوں کی قدروقیمت کیا ہے

سوال یہ ہے کہ تاریخی آثار اور جو کچھ ان پر لکھا گیا ہے وہ کس حد تک قابل اعتماد ہیں؟ مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کچھ لوگ تاریخ کی کتابوں پر ایسا پختہ اعتماد رکھتے ہیں کہ جو کچھ ان میں لکھا ہوتا ہے،اس کو وحی کی طرح سمجھتے ہیں۔اس کے برعکس کچھ لوگ اس پر بالکل ہی اعتبار نہیں کرتے۔ان کا کہنا ہے کہ انسان تاریخ لکھتے وقت تعصب،جانب داری اور ذہنی تحفظات سے بچ نہیں سکتا۔چنانچہ جو بھی تاریخ لکھتا ہے وہ ایک خاص مقصد کو نظر میں رکھ کر لکھتا ہے وہی کچھ تاریخ کا لباس پہن کر ہمارے سامنے کتاب کی صورت میں آیا۔

کچھ مورخین نے واقعی جھوٹ گھڑے ہیں۔خصوصاً وہ جنھوں نے بادشاہوں کی تاریخ لکھی ہے۔ان کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ تاریخ بادشاہوں کی مرضی کے مطابق ڈھالی جائے۔ایک مورخ عین اس زمانے میں جبکہ بادشاہ کے ہاتھوں سے ایران کے شہر یکے بعد دیگرے نکلتے جارہے تھے،خاقان فتح علی شاہ قاچار کی جہاں کشائی کا دم بھرتا ہے۔ناصرالدین شاہ نے امیر کبیر کو قتل کیا تو اس کی موت کا سبب ورم شکم کو ٹھہرایا۔ایسے تاریخ نویس کسی دربار سے وابستہ ہوکر حقیقت کو پس پشت ڈال کر قدرتی طور سے احمقانہ باتیں لکھتے چلے جاتے ہیں۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اخلاقی اور دینی اصول کے پابند ہیں چاہتے ہیں کہ سچی باتیں لکھیں اور غلط اور جھوٹ باتوں سے بچیں۔لیکن اس کے

[1] اس کی تفصیل اس کتاب کے ۲۲ ویں باب میں آپ پڑھ چکے ہیں۔

باوجود حقیقت اور حقائق تک ان کی رسائی نہیں ہوتی اور پڑھنے والا حقائق تک نہیں پہنچتا۔

فرض کریں ایک شخص کسی علمی سیاسی اور پرہیزگار شخصیت سے عقیدت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی ساری خوبیوں کے باوجود انسان ہونے کے ناطے یہ شخصیت کمزوریوں اور خامیوں سے خالی نہیں ہوگی۔ مگر اس کی سوانح حیات لکھنے والا وہ شخص اپنے عقیدے اور خلوص کی بنا پر صرف اس کی خوبیاں گنوائے گا اور اس کی کمزوریاں کبھی نہیں لکھے گا۔ ظاہر ہے اس کی لکھی ہوئی تاریخ واقعات اور شخصیات کی مکمل تصویر پیش نہیں کرسکتی۔

افسوس اس بات کا ہے کہ عام طور پر تاریخ نویسی ان ہی خطوط پر ہوتی رہی ہے اور تاریخ لکھنے والے اس خودفریبی میں مبتلا رہے ہیں وہ شخصیات کی مدح سرائی میں یہ بھول گئے کہ ان میں انسانی کمزوریاں بھی تھیں۔ اگر وہ سچ لکھنا بھی چاہتے تھا کہ واقعات کو جوں کا توں بیان کرتے۔

مگر بہرحال ایسے لوگ بھی ہیں جو ان باتوں سے دور ہیں۔ انہوں نے اچھا اور بُرا جو بھی تھا سب لکھا ہے اور خوبیاں اور کمزوریاں دونوں پیش کردی ہیں ہمیشہ واقعات اور روئداد اور شخصیات کو پیش کرنے میں غیر جانب دارای برتی ہے اور سارے رُخ پیش کیے ہیں۔ بیشک ایسے مؤرخوں کی تعداد کم ہے، مگر انھوں نے بےلوث محققین کی نظریں اپنی طرف مبذول کی ہیں۔

علاوہ ازیں کاوش کرنے والے ان تاریخ کی کتابوں میں سے بھی جو صحیح اور غلط باتوں سے بھری پڑی ہیں، اصلی حقیقت کو نکال لائے ہیں اور اسی نہج پر اپنی تاریخی تحقیق کو جاری رکھا ہے۔ آج ایسے محققین موجود ہیں جو واقعات کا ایک دوسرے سے موزانہ کرکے تاریخی حقائق کے ایک سلسلے کا استنباط کرسکتے ہیں اور حقیقی واقعات کو ان کی صحیح شکل میں پیش کرسکتے ہیں۔

(۱۰) تاریخ نویسی یا تاریخ کا ڈھونگ

عام طور سے تاریخ نویسی کے دو طریقے ہوتے ہیں:

۱۔ تاریخ نقلی اور

۲۔ تاریخ نظری

وہ لوگ جو تاریخ لکھنے میں صرف ان واقعات تک اپنے کو محدود رکھتے ہیں جنہیں انھوں نے سنا یا دیکھا اور محض ان واقعات کو لکھتے ہیں جو ان کو مل جاتے ہیں۔ یہ دراصل جامد تاریخ نویس ہیں۔ یہ لوگ اپنے نظریے کا اظہار نہیں کرتے اور ہرطرح محتاط رہتے ہیں۔ ان کے خیال میں واقعات کو بغیر تبصرے اور نتیجہ نکالے لکھ دینا چاہیے۔ قدیم نویسوں میں یہی طریقہ رائج تھا۔

تاریخ نظری میں مورخ صرف اس پر اکتفا نہیں کرتا کہ جو کچھ اس نے پڑھا۔ دیکھا یا سُنا لکھ دے بلکہ وہ ضروری اطلاعات کو فراہم کرتا ہے۔ پھر سارے واقعات کے علل واسباب کا تجزیہ کرتا ہے اور اس سے نتیجہ اخذ کرتا ہے

ایسے مؤرخ تاریخ اس پیرائے میں لکھتے ہیں کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو واقعات اور معاملات کے درمیان محسوس کرتا ہے۔ جب تاریخ کے کرداروں کی گفتگو نقل ہوتی ہے تو قاری سمجھتا ہے کہ گویا وہ سامنے کھڑا خود سن رہا ہے۔ ایسا مورخ کبھی علمی تحقیقاتی مواد پیش کرکے پڑھنے والے کو

درس اور سبق مہیا کرتا ہے اور اس کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔

وہ لوگ جو تاریخ میں گہری دسترس رکھتے ہیں اور واقعات اور صحیح وغلط, حق و باطل کے امتیاز میں اسناد اور دستاویزات سے مدد لیتے ہیں۔ متضاد باتوں میں سے حقیقت کو نکال لاتے ہیں، یہی وہ تاریخ نویس ہیں جو عقلی بحث ومباحث میں میدان جیت لیتے ہیں اور واقعات کے خام مال سے قیمتی مطالب اخذ کرتے ہیں۔

اب ہم دامن سخن کو سمیٹتے ہیں۔ اس کی یاددہانی کرائی جاتی ہے کہ معاشرہ اور تاریخ سے متعلق بحث جو قرآن میں آئے ہیں ایسے نئے موضوعات ہیں جن پر اسلامی محققین کو علمی سطح پر تحقیقات کرنی چاہیے۔ اسکے چند نمونے ہم نے یہاں پیش کیے ہیں۔

تمام شدہ

ایران، قم، میدان شہداء موئسہ تحقیقات اسلامی

جعفر سبحانی

۲۰ جمادی الآخر ۱۴۰۱ مطابق ۵۔۲۔۶۰ ہجری شمسی

الحمدللہ

فارسی زبان کی پہلی تفسیر موضوعی کی پہلی جلد کا ترجمہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مغربی ممالک کے پہلے حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر ۔۔۔۔۔۔مور پارک

گارسٹنگ روڈ سٹن، لنکا شائر، برطانیہ۔۔۔۔کے دفتر میں حوزہ

کے افتتاح کے دوسرے روز اختتام پذیر ہوا۔

بتاریخ: ۸ شعبان المعظم ۱۴۰۵ھ

بمطابق: ۲۹۔اپریل ۱۹۸۵ء

از دست: حقیر پُر تقصیر سید صفدر حسین نجفی

فرزند سید غلام سرور نقوی غفر اللہ لھما

الحمدللہ اوّلاً آخراً وصلی اللہ علی محمد والہ ابداً سرمداً

سید صفدر حسین نجفی

تفسیر موضوعی

جلد دوم

قرآن کا دائمی منشور

آیۃ اللہ استاد جعفر سبحانی

مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن
ہر زمانے کیلئے ہے۔

☆افراد کا مختلف حوادث کے مقابلے میں مختلف عکس العمل، ان کے عقیدہ اور ایمان کے اختلاف کا سبب بنتا ہے۔
☆حقیقی زندگی عزت کی موت، یعنی راہِ حق میں جہاد کرنے میں ہے۔
☆تفسیر موضوعی کا طریقہ کیا ہے؟
☆ قرآن کی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کس طرح کرتی ہیں؟
☆ زمانہ کا گزرنا اور افکار کی ترقی قرآنی حقائق کے چہرے سے پردہ اٹھاتے ہیں۔
☆ قرآن نامتناہی حقیقت کا حامل ہے۔
☆توحید کے چار مراتب
☆توحید کے سات مراتب
☆ کتاب کی بارہ فصول
☆توحید کے اصلاحی آثار اور شرک کے تباہ کن اثرات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

توحید وشرک سے مربوط مسائل، اپنے گوناں گوں مراتب واشکال کے ساتھ، اسلام کی بنیاد، بلکہ تمام آسمانی شریعتوں اور خدائی آیتوں کی بنیاد ہیں۔اور قرآن کی آیات پر مختصر سی نظر ڈالنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن نے جو اہتمام یکتا شناسی اور یکتا پرستی کے مسئلہ کی تشریح وتوضیح کے سلسلہ میں کیا ہے، عقائد ومعارف عقلی کے مسائل میں سے کسی مسئلہ کیلئے ویسا اہتمام نہیں کیا۔ یہاں تک کہ مسئلہ قیامت اور مردوں کا زندہ ہونا، جسکا قرآن کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور کوئی دین ومذہب، اس کا اعقادر کھے بغیر، ایک دینِ الٰہی کی صورت میں جلوہ گر نہیں ہوسکتا اور دلوں میں نفوذ نہیں کرسکتا۔اہمیت کے لحاظ سے دوسرے درجہ میں قرار پاتا ہے۔

اصولی طور پر، قرآن نے اصولِ دین کی تبلیغ، اور دلوں میں اس کے بیج بونے کا اہتمام، فروعی وعملی مسائل کے بیان کے اہتمام سے کہیں زیادہ کیا ہے، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ صرف قیامت کے موضوع پر بارہ سو سے زیادہ آیات وارد ہوئی ہیں جبکہ تمام فروع اور احکامِ دین کے بارے میں تقریباً تین سو آیات نازل ہوئی ہیں، اور یہ بات خود موضوع کی زیادہ سے زیادہ اہمیت اور فکری اور اعتقادی مسائل کے بیان کرنے میں، قرآن کی زیادہ سے زیادہ توجہ اور اہتمام کی ترجمان ہے۔

تھوڑے سے غور وفکر سے اس توجہ اور اہمیت کا سبب معلوم کیا جاسکتا ہے ، کیونکہ ہر شخص کا طرزِ عمل اس کے عقیدہ اور فکر کی پیداوار ہوتا ہے۔کیونکہ انسان کا کردار، اس کے فکر ونظر کا ایک رخ اور اس کے قلبی عقیدہ کا ایک اظہار ہوتا ہے اسی بنا پر اندر کی اور باطنی اصلاح ، باہر کی اور ظاہری اصلاح کا سرچشمہ ہوتی ہے۔اور جب تک اندر کی اصلاح نہ ہو واقعی حقیقی اصلاح نہیں ہوسکتی۔

طرز زندگی پر عقیدہ کا اثر

موجودہ حالات میں جبکہ اسلامی ممالک اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ غلامی اور قید وبند کی بیڑیاں اُتار پھینکیں تو اس راستے پر چلنے کے لئے پہلا قدم فداکاری اور جانبازی ہے، ہم ایک گروہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ مشروع آزادی کو پھیلانے، اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور استعمار اور استعمارگروں کو نکالنے کیلئے اپنا خون نثار کرتا ہے اور اس راستے میں مرجانے کو ایک قسم کا اعزاز سمجھتا ہے جبکہ دوسرا گروہ گوشہ نشینی، خاموش رہنے، منہ بند رکھنے اور جلدی گزر جانے والی زندگی اور زبوں حالی کو فضیلت کی راہ میں مرجانے پر ترجیح دیتا ہے۔طرزِ عمل کی یہ دورخی دوا لگ اور مختلف عقائد ونظریات کی بناء پر ہے جن کے دو مختلف عکس العمل ہوتے ہیں۔عالمِ اسلام کی بلندترین ہستی، امیرالمومنین علی علیہ السلام جیسی شخصیت ذلت کی زندگی کو موت، اور عدالت اور پاکیزگی پھیلانے کی راہ میں شہادت قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"الموت فی حیاتکم مقهورین والحیاة فی موتکم قاهرین" [1]

---

[1] ۔نہج البلاغہ خطبہ، ۵۰ طبع عبدہ

''تمہاری موت ذلت کی زندگی میں ہے، اور تمہاری واقعی حیات اور حقیقی زندگی فاتحانہ موت میں پوشیدہ ہے۔''

یہ گفتگو کرنے والا اس زندگی کو، جس میں غلامی ہو، موت اور نابودی سمجھتا ہے، جبکہ واقعی زندگی قید و بند کی زنجیروں کو توڑ ڈالنے میں سمجھتا ہے، چاہے اسے حاصل کرنے کیلئے شہادت کی قیمت دینا پڑے۔ اور اس اعتقاد کے ساتھ یہ کوشش کرتا ہے کہ موت کے ذریعہ اپنی زندگی کو حقیقی اور واقعی حیات میں بدل لے۔

جو شخص اس قسم کا عقیدہ رکھتا ہو وہ تو زمین کو خون سے رنگین بناتا ہے، اور حسین علیہ السلام کے عاشورہ کو ''خون کی عید'' قرار دیتا ہے، جبکہ دوسرا شخص مادی زندگی کو ہی اصل زندگی سمجھتا ہے، اور کھانے، سونے، سرکش خواہشات کو پورا کرنے اور پیٹ کے لئے غذا مہیا کرنے کو ہی زندگی خیال کرتا ہے اور خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کے سوا اور کسی چیز میں فضیلت نہیں سمجھتا، اور اگر قیامت اور معاد کے بارے میں گفتگو ہونے لگے تو موت کو زندگی کا اختتام اور عالم مادہ کو نقد اور ماوراء مادہ کو ادھار قرار دے کر اس طرح کہتا ہے: ''وما عاقل باع الوجود بدین'' کوئی عقلمند (دنیاوی زندگی کے) نقد کو (ماوراء مادہ کے) ادھار سے نہیں بیچتا۔

اب جبکہ واضح ہو گیا ہے کہ انسانوں کی زندگی میں عقیدہ اور نظریہ کے اتنے مختلف اور ایسے عظیم و وسیع عکس العمل ہوتے ہیں تو اسلام کے اصل مسائل اور بنیادی عقائد کو سب سے زیادہ قیمت دینی چاہئے۔ اور ان میں غور و فکر اور تدقیق کرنی چاہئے اور توحید و شرک کے مسائل کو، جو ہمارے اسلامی عقائد کی بنیاد ہیں۔ سب سے زیادہ اہمیت دینا چاہئے۔

قرآن کی تفسیر میں نئی روش

اسلام کے درخشاں عہد میں، اسلامی فلسفہ اور متکلمین نے توحید سے مربوط مسائل میں، ایک خاص طرز پر تحقیق کی ہے۔ اور توحید یا دو خدا ہونے سے مربوط مسائل کو عقلی دلائل کے ساتھ واضح کیا ہے۔ چونکہ وہ اس قسم کے مسائل کو صرف عقل کے زاویہ سے دیکھتے تھے لہٰذا ان کی توجہ توحیدی مفاہیم کے بیان کی طرف، جو قرآنی آیات میں وارد ہوئے ہیں، بہت کم رہی ہے، اور اس گروہ نے بھی، جس نے قرآن کی آیات کو، اپنی بحث میں شامل کیا ہے۔ پہلے سے قائم اعتقاد اور فیصلوں کی بناء پر آیات کو اپنے عقائد پر منطبق کر لیا ہے اور انہوں نے نہ چاہا یا وہ ایسا کر نہ سکے کہ آزادانہ طور پر اور پہلے سے کسی جھکاؤ کے بغیر ان کے بارے میں بحث اور گفتگو کرتے۔

کچھ اسلامی مفسرین نے توحید سے مربوط آیات کا حق ادا کیا ہے اور جہاں تک بحث کی روش انہیں اجازت دیتی تھی انہوں نے ان کے متعلق گفتگو کی ہے۔ لیکن چونکہ ان کی تفسیر کی بنیاد، قرآن کے ایک سورہ کے بعد دوسرے سورہ کی تفسیر کرنا تھا۔ لہٰذا انہوں نے ان سب آیات کے ساتھ، جو ایک موضوع سے مربوط تھیں، ایک جگہ بحث نہیں کی ہے۔ اسی وجہ سے بحث کے متفرق اور پراگندہ ہونے کے سبب ان کے کام کا نتیجہ بہت کم نکلا۔ اس لئے لازم ہے کہ (توحید سے متعلق) ان آیات اور اسی طرح دوسرے اعتقادی و اجتماعی موضوعات سے

مربوط آیات کے بارے میں، ایک دوسری طرز سے گفتگو کی جائے، اوران (مفسرین) کی زحمات اور تکالیف کو زیادہ سے زیادہ پھولنے پھلنے دیا جائے۔

یہ روش وہی ہے جو"تفسیر موضوعی" میں اختیار کی گئی ہے، یعنی موضوعات کے مطابق قرآنی آیات کی تفسیر، اس طریقہ میں ایک موضوع کی تمام آیات ایک جگہ جمع ہوجاتی ہیں۔ اس کے بعد تمام آیات کو ترتیب دیکر، ان سب سے، ایک ہی نظریہ اخذ کیا جاتا ہے۔

چونکہ ایک موضوع سے مربوط اکثر آیات مختلف سورتوں میں وارد ہوتی ہیں، اور قرآن نے ہر سورت میں کسی مناسبت کی وجہ سے، ایک موضوع کے مختلف حصوں میں سے کسی ایک حصہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اسی بناء پر کسی ایک موضوع کے بارے میں قرآنی نظریہ پر مکمل احاطہ، اسی صورت میں کامل طور پر ممکن ہوسکتا ہے۔ جبکہ ایک موضوع کی تمام آیات ایک دوسرے کے ساتھ قرار پائیں، تاکہ سب کو ایک جگہ جمع کرنے سے، اس کے بارے میں قرآن کا جامع اور دوٹوک نظریہ برآمد ہو۔

ایک موضوع کی تمام آیات کو جمع کرنے میں۔ علاوہ اس کے کہ ہم اس موضوع کے بارے میں قرآن کے ہمہ جانبہ نظریہ سے واقف اور آگاہ ہوجائیں گے۔ ایک دوسرا فائدہ بھی ہمیں حاصل ہوگا اور وہ یہ ہے کہ بسا اوقات کوئی آیت کسی خاص سبب سے ہمیں مبہم دکھائی دیتی ہے۔ اور ہم زمانہ وحی سے دوری کی بناء پر اور اس زمانہ کے اسلامی معاشرے پر حکم فرما کر حالات واوضاع کے قرائن سے بے خبری کی وجہ سے، اس آیت کے اصلی اہداف اور مقصد سے دور ہوتے ہیں لیکن آیات کا ایک جگہ جمع ہونا اور ان میں سے کچھ کا ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونا۔ بہت سے ابہاموں کو دور کردیتا ہے اور بہت سے احتمالات واوہام کا سلسلہ ختم ہو کر اصل حقیقت کا چہرہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ اپنی ایک حدیث میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

ان القراٰن یفسر بعضہ بعضاً [۱]

"قرآن کی بعض آیات بعض دوسری آیات کی تفسیر کرتی ہیں۔"

امیر المومنین علیہ السلام اس مطلب کی اپنے ایک ارشاد میں تصریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"کتاب اللہ تبصرون بہ، وتنطقون وتسمعون بہ وینطق بعضہ ببعض ویشھد بعضہ علی بعض" [۲]

"تم کتاب اللہ کو دیکھتے ہو، اسے پڑھتے ہو اور سنتے ہو، اسکی بعض آیات بعض کے ذریعہ بولتی ہیں۔ اور ان میں سے بعض دوسری بعض کی گواہی دیتی ہیں۔"

---

[۱]۔ کتب تفاسیر مین یہ حدیث پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے۔

[۲]۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۹ طبع عبدہ

آیات قرآن کے مختلف جہات

زمانہ کے گزرنے نے، کچھ لوگوں کو جدید اور نئی فکر و نظر بخشی ہے، اور ہر گروہ اپنے خاص موضوع سے متعلق قرآن سے ایک خاص مطلب اخذ کر رہا ہے اور اجتماعی، سیاسی اور اخلاقی امور میں قرآن سے استفادہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اور اسلامی محققین اس کام کے ذریعہ، اور نئے نئے طریقوں کی ایجاد سے ایسے ایسے حقائق قرآن سے معلوم کر رہے ہیں، جو ہرگز بھی پرانے مفکرین کے ذہن میں نہیں آتے تھے۔ کیونکہ ان کے پاس قرآن سے اس قسم کے عمدہ اور نئے معانی نکالنے کا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔

قرآن ایک دائمی اور ہمیشہ رہنے والی کتاب ہے، جو گوناگوں ابعاد و جہات اور مختلف بطون کی حامل ہے کہ ہر زمانہ میں انسان کی ترقی یافتہ فکر اس کی کسی ایک جہت تک پہنچ جاتی ہے اور قرآن کے شیفتہ محققین، معارف کے ہر سلسلہ میں اسکی کسی نہ کسی جہت کو کشف کر سکتے ہیں اور یہ انکشاف صرف عرفاء و فقہا، فلاسفہ و علوم قدیمہ و الٰہیات کے ماہرین میں ہی محدود نہیں ہے۔ یہ جو موجود زمانہ میں علوم طبیعی ور یاضی یا علوم انسانی ،مثلاً روانشناسی و جامعہ شناسی اور فلسفہ تاریخ کے ماہرین، اس سے نئے اور دقیق نکات کا استفادہ کر رہے ہیں، یہ خود اس بات کی نشانی ہے کہ یہ جاودانی اور ہمیشہ رہنے والا معجزہ، مختلف اور متنوع ابعاد و جہات کا حامل ہے جو ایک ہی طرح کے افکار و نظریات اور ایک ہی قسم کے تمدن و ثقافت اور کسی ایک ہی زمانہ کیلئے نہیں ہو سکتے۔

کمپیوٹر کے ذریعہ قرآن سے استفادہ

کچھ محققین نے کوشش کی ہے کہ ہمارے زمانہ کی انتہائی ترقی یافتہ علمی ایجاد کو، جو نئے انسانی تمدن کا مظہر ہے، قرآن کی ایک جہت کی تحقیق کیلئے کام میں لائیں، اور یہ ایک ایسا کام ہے جو علمی لحاظ سے بھی اور اسلامی لحاظ سے بھی قابل ستائش اور لائق تعریف ہے، اور اس لائق ہے کہ دنیائے اسلام کے مراکزِ علمی اس سے سنجیدگی کے ساتھ فائدہ اٹھائیں، اور اگر وہ قابل توجہ علمی قدر و قیمت کا حامل ہو تو ان محققین کی مادی اور معنوی تقویت کیلئے اقدام کریں۔ [۱]

اس مطلب کو نظر میں رکھتے ہوئے اس حدیث کا مفہوم، جو ''ابن عباس'' سے، زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ، تفسیر قرآن کی پیش رفت کے بارے میں نقل ہوئی ہے، واضح ہو جاتا ہے وہ اس طرح کہتے ہیں۔

''ان القراٰن یفسرہ الزمان'' [۲]

---

[۱] ۔نشریہ فلق ص ۱۸

[۲] ۔النوۃ فی حقل الحیاۃ تالیف مفتی موصل، ''شیخ عبیدین''

''مرور زمانہ قرآن کی تفسیر کرتا ہے۔''

ہم اس گذشتہ صدی میں ابن عباس کی گفتگو کی صداقت سے آگاہ ہو گئے ہیں، کیونکہ زمانے کے گزرنے نے نہ صرف طبیعی ماہرین کیلئے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ وہ زمین و آسمان کی خلقت اور دوسرے مادی موجودات کے بارے میں قرآن سے حقائق معلوم کریں، بلکہ مرور زمانہ نے جس میں انسانی علم کی دانش و بینش میں خوب ترقی ہو رہی ہے مفسرین کیلئے بھی یہ ممکن بنا دیا ہے کہ بہت سے قیمتی حقائق کو قرآن سے معلوم کر لیں۔

اب جبکہ کمپیوٹر کی مشینوں کے ذریعہ قرآن کے بارے میں عملی تحقیقات شروع ہوگئی ہے، امید ہیں کہ وہ حد تکامل اور شایان شان ارتقاء تک پہنچ جائیگی، اور آئندہ بہت سے چھپے ہوئے حقائق کو، جن کے حل کرنے پر عام انسان کا ذہن قادر نہیں ہے موجودہ اور آئندہ نسل کیلئے کھول کر رکھ دے گی۔ البتہ اس بات پر ہرگز تعجب نہیں کرنا چاہیئے اور اس طرح سے نہیں سوچنا چاہئے کہ کمپیوٹر کی مشین میں روح فکر و استدلال تو ہوتی ہی نہیں، لہٰذا وہ معانی قرآن کے سمجھنے اور اس کے اعجاز کی نشاندہی کرنے میں ہماری کس طرح سے مدد کر سکتی ہے۔ کیونکہ جو لوگ کمپیوٹر کی مشین کے کام کرنے کے سسٹم سے آشنائی رکھتے ہیں، وہ ہرگز اس قسم کا فائدہ اٹھانے سے تعجب نہیں کرتے۔

انشاء اللہ امید ہے کہ قرآن کے بارے میں قرآن شناس گروہ کے کام اور طاقت فرسا زحمتیں۔ جنہوں نے ایک مدت سے ایران میں کام شروع کیا ہوا ہے۔ جلد سے جلد نتیجہ خیز ثابت ہوں گی، اور نسل انسانی اس کتابِ آسمانی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے گی۔ اگرچہ پرانی نسل بھی کمپیوٹر جیسی مشین نہ رکھنے کے باوجود اعجاز قرآن کی بعض جہات کو کشف کرنے اور انسانی معاشرے کے سپرد کرنے پر قادر ہو گئی تھی۔

ہم نمونہ کے طور پر ایک بہت ہی سادہ اور عام سی مثال پیش کرتے ہیں جو ہمارے قدماء نے کشف کیا ہے۔ قرآن کے کچھ نسخے موجود ہیں۔ جو عام خط میں ایک ہی طرز ایک قلم سے لکھے گئے ہیں، قرآن کے آغاز سے لے کر قرآن کے آخر تک، تمام صفحات میں، ایک مشابہ نظم جاری ہے، ہر صفحہ کی گیارہ سطریں ہیں، ہر سطر اوپر کی طرف سے ایک حرف سے شروع ہوتی ہے۔ جس کا قرینہ نیچے کی طرف سے اسی کے ساتھ شروع ہوتا ہے، لیکن چونکہ ہر صفحہ کی سطروں کی تعداد طاق ہے تو ایک سطر درمیان میں (چھٹی سطر) بغیر قرینہ کے رہ جاتی ہے، یہی حالت اس کے سامنے والے صفحہ میں پائی جاتی ہے، یعنی ان دو صفحوں میں ایک دوسرے کے مقابل چھٹی سطر اکیلی رہ جاتی ہے، یہ دونوں ایک دوسرے کا قرینہ ہیں۔ اور دونوں ایک ہی حرف سے شروع ہوتی ہیں۔ اس قسم کے نظم کو کشف کرنے کیلئے اس کے لکھنے والے نے جو کام کیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس نے متن قرآن سے شروع کا نقط دریافت کیا ہے۔ اس کے بعد آخر قرآن تک خود بخود اس قسم کا نظم پیدا ہو گیا ہے۔ [1]

---

[1] ۔نشریہ ''فلق'' کے مطابق، (مولف جس قرآن کا ذکر رہے ہیں) اس کا ایک نسخہ مسجد گوہرشاد مشہد مقدس میں اور ایک نسخہ افغانستان میں موجود ہے، اور اس قرآن کا ایک نسخہ چھپ بھی چکا ہے۔ چار سال قبل ۲۱ رجب ۱۴۰۶ھ میں میں نے ایک نسخہ چھپا ہوا اپنے مدرسہ میں دیکھا ہے۔ سارا قرآن تیس اوراق پر لکھا ہوا ہے جس کی ہر سطر واؤ سے شروع ہوتی ہے۔ (مترجم)

اس قسم کے نئے استفادوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو انسان کو نصیب ہوئے ہیں، قرآن کے بارے میں پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علیہ السلام کے اشادات کی عظمت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

ظاھرہ انیق وباطنہ عمیق لہ تخوم وعلی تخومہ تخوم ،لاتحصی عجائبہ ولاتبلی غرائبہ[1]

قرآن کا ظاہر خوبصورت اور زیبا ہے، اور اس کا باطن عمیق اور گہرا ہے ،اس کیلئے جڑیں ہیں اور جڑوں کی پھر جڑیں ہیں۔ اس کے عجائبات قابل شمار نہیں اور اس کے غرائب پرانے نہیں ہوتے ۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"انزل علیه الکتاب نورًالاتطفأمصابیحه وسراجالایخبو توقده وبحرًالایدرك قعره ..."[2]

قرآن کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا، قرآن ایسا نور ہے جس کے شعلے خاموش نہیں ہوتے اور ایسی مشعل ہے جس کا جلنا کم نہیں ہوتا، اور ایک ایسا سمندر ہے جس کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے۔

اس بناء پر کتاب کے اس حصہ میں، ان تمام آیات پر، جو توحید و شرک کے ساتھ مربوط ہیں، ایسے دلپذیر انداز میں جو نو جوانوں کے افکار، ضرورتوں اور سوالوں سے مناسب ہو، بحث و تمحیص اور غور و خوض ہوگا، اور ہم خدائے بزرگ و برتر کے حضور میں دعا کرتے ہیں کہ وہ ہماری اس راہ میں مدد فرمائے۔

---

[1] اصول کافی ج۲ ص۵۹۹

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۳

مراتب توحید

محققین اسلام نے توحید سے مربوط مباحث کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جن کی طرف ہم مختصر طور پر اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ توحید ذات

اس سے مراد یہ ہے کہ خدا ایک یکتا اور اکیلا وجود ہے، جس کیلئے نہ تو کوئی مثیل ونظیر ہے اور نہ ہی کوئی اس کا شریک ہے۔ اس کیلئے کسی مثل ونظیر اور شریک کا تصور ہی نہیں ہوسکتا، نہ صرف یہ کہ اس کا کوئی نظیر و شریک نہیں ہے۔ بلکہ اس کی ذات بسیط مطلق ہے، جس کیلئے کوئی جزء یا اجزاء نہیں ہیں اور وہ کسی بھی چیز کے ساتھ مرکب نہیں ہوا۔ اس قسم میں توحید کی دو قسموں کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

۱۔ وہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

۲۔ وہ بسیط ہے اور وہ ایک یا کئی اجزاء نہیں رکھتا۔

۲۔ توحید صفات

خدا کی اگر چہ متعدد صفات ہیں۔ مثلاً عالم، قادر، اور حیّ وغیرہ، لیکن یہ صفات مفہوم کے لحاظ سے تو متعدد ہیں مگر واقعیت اور وجود خارجی کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک، ایک دوسرے کی عین ہیں اور سب کی سب عین ذات خدا ہیں۔ مثلاً علمِ خدا اسکی عین ذات ہے اور اس کی ساری ذات عین علم ہے اس کے باوجود اسکی ساری ذات عین قدرت بھی ہے اور اس طرح نہیں ہے کہ علم کی واقعیت وحقیقت خدا کی ذات میں ایک علیٰحدہ چیز ہے اور قدرت کی واقعیت دوسری چیز ہے۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک دوسری کی عین ہے، اور یہ سب مجموعی طور پر اس کی ذات کا عین ہے۔ ذہن میں لانے کیلئے درج ذیل مثال کی طرف توجہ فرمائیں۔

ہم میں سے ہر ایک خدا کا معلوم ہے اور ساتھ ہی ساتھ خدا کی مخلوق بھی ہیں، یہ درست ہے کہ ''معلوم'' کا مفہوم ''مخلوق'' کے مفہوم کا غیر ہے، لیکن مقام تطبیق میں ہمارا سارا وجود معلوم، اور اسی طرح ہمارا سارا وجود مخلوق خدا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہماری ذات کا ایک حصہ تو خدا کا معلوم اور دوسرا حصہ خدا کی مخلوق ہے۔ بلکہ ہمارا سارا وجود معلوم بھی ہے اور مخلوق بھی ہے اور مقام مصداق میں ہر ایک دوسرے کا عین ہے، اور مجموعی ہماری ذات کا عین ہے۔

۳۔ توحید افعال

عالم آفرینش میں ہمیں کچھ طبیعی علل و اسباب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جن کے مخصوص آثار ہوتے ہیں۔ مثلاً سورج کا روشنی دینا، آگ کا جلانا، اور آگ کا کاٹنا، جسطرح سے ان کا اصل وجود خدا کے ساتھ مربوط ہے اسی طرح سے ان کے آثار بھی خدا کی طرف سے ہیں۔ اس

گفتگو کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم طبیعی علل واسباب کی تاثیر کا انکار کردیں ،اور یہ کہنے لگیں کہ خدا ہی تمام علل طبیعی کا جانشین ہے،اوران کے آثار کا براہِ راست وہی سرچشمہ ہے۔

یہ نظریہ تو انسان کی فطرت اور عقل وخرد کے مطابق ہے اور نہ ہی خود نصوص قرآن کے، یہ مطلب جس کی ''اشاعرہ'' کی طرف نسبت دی گئی ہے، ضرورت حس ،عقلی دلائل ،اور کتاب آسمانی کے مخالف ہے ۔توحید درافعال علل طبیعی کا انکار کرنے کے معنی میں نہیں ہے ، بلکہ اس اعتراف کے ساتھ کہ سورج چمکتا ہے ، چاند روشنی دیتا ہے اور آگ جلاتی ہے، اور انکا روجود ان ظاہر ہونے والے آثار کی تجلی میں پورے طور پر مؤثر ہیں ،اس اعتراف کے باوجود ہمیں یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ عالم میں ایک مستقل موثر کے علاوہ کوئی نہیں ہے، اور باقی مؤثرین کی تاثیر اس کی قدرت اور فیض رسانی کے سایہ میں صورت پذیر ہوتی ہے۔وہی ہے کہ جو آفتاب کی فروزندگی ، چاند کو درخشندگی ،اور آگ کو سوزندگی بخشتا ہے اور اسی نے انہیں توانائی دی ہے کہ وہ اس قسم کے آثار کی اپنے آپ سے نشاندہی کریں

دوسرے لفظوں میں صرف ایک ہی بالذات موثر ہے ۔جو تاثیر کرنے ،ایجاد کرنے اور ابداع وابتکار میں کسی چیز اور کسی جگہ کا محتاج نہیں ہے،اور باقی علل واسباب کی تاثیر سب اسی کی عطا کردہ ہوتی ہے۔اس بیان سے دو مکاتب کا فرق واضح ہوجاتا ہے ۔''مکتب اشعری'' میں سورج ، چانداور آگ کا روشنی اور حرارت کے پیدا کرنے میں کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ ان کے عقیدہ کے مطابق خدا کی عادت اور طریقہ یہ ہے کہ سورج اور چاند کے طلوع کے بعد حرارت وگرمی اور نور وروشنی وجود میں لاتا ہے،اگرچہ ان کی ذات کا ان چیزوں سے کوئی دخل نہیں ہے۔جبکہ ''توحید درافعال'' کے مکتب میں ،ان کے دخل کا اعتراف کرنے کے باوجود تمام عالم ہستی میں واقعی اور حقیقی مؤثر ایک سے زیادہ نہیں ہے اور دوسرے علل واسباب کی تاثیر اس کے وجود کا پرتو ہیں۔[1]

اس لحاظ سے ایجاد وانجام کار میں انسان کے استقلال کا ہر قسم کا اعتقاد، یا ''ثنویت'' اور ''تثلیث'' وغیرہ کی صورت میں مستقل موثرین کا اعتقاد،اس مکتب میں غلط ہے۔وہ گروہ جو یہ خیال کرتا ہے کہ انسان اپنے وجود میں تو خدا کا محتاج ہے لیکن تاخر اور اپنی خلاقیت میں مستقل ہے اور اپنے ہی اوپر تکیہ کرتا ہے وہ شرک سے دوچار ہوگیا ہے اور وہ اصل اور مستقل موثرین کا معتقد ہوگیا ہے اور توحید درافعال کا منکر ہوگیا ہے۔اور وہ گروہ بھی جو''ثنویت'' کا عقیدہ رکھتا ہے یعنی وہ جہاں میں دو مبدؤں کا عقیدہ رکھتے ہیں''خیر'' کے پیدا کرنے والے کو''شر'' کے پیدا کرنے والا کا غیر سمجھتے ہیں،اور''یزدان''و''اھریمن'' کی مفروضہ کی پناہ لیتے ہیں وہ توحید درفعل کے راستے سے ہٹ گئے ہیں اور تاثیر میں شرک اور ثنویت سے دوچار ہوگئے ہیں۔

---

[1] توحید درخالقیت اور توحید درربوبیت ،توحید درافعال کی اہم ترین اقسام میں سے ہیں،ان اور دونوں قسم کی توحید کا فرق آئندہ واضح ہوجائیگا،اور وہابی مؤلفین کو''توحید درخالقیت'' میں اشتباہ ہوا ہے،اور اسے اور توحید درخالقیت کو ایک سمجھ لیا ہے حالانکہ''توحید درربوبیت''عالم آفرینش کی تدبیر اور ادارہ کرنے کے ساتھ مربوط ہے۔اور خالقیت کے ساتھ، جسکا معنی پیدا کرنا ہے کوئی ربط نہیں رکھتی۔اگرچہ مخلوق کی تدبیر انکی خلقت سے جدا نہیں ہے۔اور اس مطلب کی تفصیل اس مفہوم سے مخصوص فصل میں آئے گی۔

۴۔توحید در عبادت

عبادت و پرستش خداوند عالم کے ساتھ مخصوص ہے، اور خدا کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو عبادت و پرستش کے لائق ہو، چاہے وہ کمال و شرف کے لحاظ سے کتنا ہی بلند و بالا مقام رکھتا ہو۔ کیونکہ کسی کے سامنے خضوع و بندگی کرنے کی بنیاد ذیل کی دو بنیادوں میں سے ایک ہے اوران دونوں میں سے کوئی بھی غیر خدا میں موجود نہیں ہے۔[1]

۱۔معبود کمال کے لحاظ سے اس حد کو پہنچ جائے کہ اس میں کوئی نقص وعیب نہ ہو۔اوراس کی برتری کا تقاضا یہ ہو کہ ہر صاحب وجدان شخص اس کے سامنے خشوع وخضوع کرے اوراس کی بندگی کی حد تک پرستش کرے۔مثلاً موجود نامتناہی، جو بے پایاں علم وقدرت اور غیر محدود حیات و بینائی وشنوائی رکھتا ہو، ہر بیدار انسان کے وجدان کو تحریک کرتا ہے، کہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کرے، اوراپنے چھوٹے ہوئے کا اظہار کرے

۲۔کسی موجود کی ہم اس لئے پرستش کریں کہ وہ جہاں اور انسان کو جود بخشنے والا، جسم وجان دینے والا نعمت وبرکت عطا کرنے والا ہے۔ اور اگر ایک لمحہ کیلئے اس کے فیض کا رشتہ ٹوٹ جائے تو عالم ہستی کا نام ونشان ختم ہوجائے۔ خدا کے پاک انبیاء واولیاء کے عبادت کرنے کا سبب وہی معبود کا جمال وکمال ہے، انہیں عالم غیب سے جو برتر معرفت، عمیق تر شناسائی اور بیشتر آشنائی حاصل ہے، وہ خدا کی اسی نظر سے پرستش کرتے ہیں، کیونکہ وہ غیر متناہی کمال اور غیر محدود جمال کا مالک ہے .... لہٰذا وہ اس نظر سے تعظیم وتکریم اور پرستش وعبادت کے لائق ہے، یہاں تک کہ اگر دوسرا بنیادی سبب بھی درمیان میں نہ ہوتا تو پھر بھی وہ اس کے سامنے خضوع اور بندگی کرتے، جبکہ دوسرے لوگ خدا کی اس لحاظ سے پرستش کرتے تھے کہ وہ اس کو عالم ہستی کا سرچشمہ، قدرت وطاقت دینے والا اور نعمت وبرکت عطا کرنے والا اور جہاں ہستی کا کلید کا مالک ومختار سمجھتے ہیں۔

---

[1] وہابی مؤلفین توحید در عبادت کو''توحید در الوهیت'' کا نام دیتے ہیں، اوروہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ الوہیت ہے حالانکہ یہ صحیح ہے کہ توحید کی اس قسم کو ہم ''توحید در عبادت'' کا نام دیں۔نہ کہ ''توحید در الوهیت'' کا، اور''الله'' اور''اله'' دونوں خدا کے معنی میں ہیں نہ کہ معبود کے معنی میں۔ اور''توحید در الوهیت'' یہ ہے کہ ہم اسے یکتا جانیں اوراس کے لئے کسی مثل ونظیر کے قائل نہ ہوں، اوراس مطلب کے دلائل توجیہہ سے مخصوص فصل میں بیان ہونگے، خلاصہ یہ ہے کہ وہابی مؤلفین نے اصطلاحی طور پر دو جگہ اشتباہ کیا ہے۔

۱۔توحیدِ ربوبی کو توحید در خالقیت کے معنی میں سمجھ لیا ہے، جبکہ ''ربوبیت'' عام خلقت کے ادارہ کرنے کے ساتھ مربوط ہے۔اور عالم کو اردہ کرنا اس کے خلق کرنے سے الگ ہے۔اگرچہ دلائل فلسفی کے لحاظ سے تدبیر خلقت سے جدا نہیں ہے، لیکن مفہوم اور مراتب توحید کی تقسیم کے مقام پر دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں۔

۲۔''توحید الوهی'' جو ذات کی یکتائی اوراس کی بساطت کے معنی میں ہے اسکو انہوں نے توحید در عبادت کے معنی میں لیا ہے۔

اور وہ بار بار کہتے ہیں بہت سے مسلمان (غیر وہابی) توحید ربوبی تو رکھتے ہیں لیکن توحید الٰہی نہیں رکھتے۔ کیونکہ وہ اولیاء اللہ کے توسل کے ذریعہ ان کی پرستش کرتے ہیں، اورآپ کے دلائل کی تفصیل اورنکا جواب کتاب کے بارہویں حصہ میں پڑھیں گے۔

بہر حال چاہے عبادت کی علت معبود کا کمال ہو یا دوسرا سبب، دونوں ہی جہات خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، اور اس چیز میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہے۔ اور غیر خدا کی عبادت و پرستش عقل و شریعت کے لحاظ سے مذموم ہے۔ علماء اسلام کا توحید کے چار درجات سے مقصود یہی تھا، جو اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

لیکن ہم محققین اسلام کی قابلِ قدر خدمات کے شکریہ کے ساتھ ساتھ یہ یاددہانی کراتے ہیں کہ توحید کے مراتب و درجات قرآن کی نظر سے ان چار میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ آیات قرآنی سے توحید کے مفاہیم کا ایک اور دوسرا سلسلہ بھی معلوم ہوتا ہے جنہیں توحید کے ان چار مراتب میں شامل کرنے کی زحمت کرنی ہی پڑے گی، لہٰذا اب اس حصہ کی طرف توجہ فرمائیے۔

۱۔ توحید در حکومت

قرآن توحید در حکومت و ولایت کا ایک خاص اہمیت دیتا ہے، اور واضح کرتا ہے کہ حکومت و فرمانروائی صرف خدا کے ساتھ مخصوص ہے، اور اس کے علاوہ کسی کو حق نہیں ہے کہ لوگ پر حکومت و فرمانروائی کرے۔ اور دوسروں کی حکومت صرف اسی صورت میں قانونی اور رسمی ہو سکتی ہے جبکہ س کی حکومت و فرمانروائی کے زیر سایہ قائم ہو اور اس کا سرچشمہ خداوند تعالیٰ ہی کی ذات بابرکات ہو۔ اس صورت کے علاوہ ہر صورت میں انکی حکومت طاغوتی حکومت ہوگی اور قانونی طور پر اسکی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔

اور یہ جو ہم کہتے ہیں کہ حکومت خدا ہی کا مخصوص حق ہے، اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ بذاتہ لوگوں کے درمیان آ کر حکومت و فرمانروائی کرے، جس پر یہ کہا جائے کہ اس قسم کی حکومت ایک امر محال اور نہ ہونے والی چیز ہے، اور خوارج کے قول کے مشابہ ہے جو یہ کہتے تھے ''حکومت کرنا خدا کے ساتھ مخصوص ہے نہ کہ علی اور ان کے اصحاب سے''[1] بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہر فرد کی فرمانروائی اور ہر منصب و مقام اسی کے اذن و فرمان سے صورت پذیر ہو جا چاہئے، اور جب تک اس کے لئے فرمان الٰہی کی سند نہ ہو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، بعینہ یہی بات شفاعت کے بارے میں بھی درپیش ہے قرآن واضح طور پر کہتا ہے کہ:

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ

''کہہ دے: ساری شفاعت اللہ کیلئے ہے۔'' (زمر۔ ۴۴)

تو اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے، کہ صرف خدا ہی کو شفاعت کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے کہ خدا شفاعت کرے، بلکہ آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اس کے اذن کے بغیر کسی شفاعت کرنے والے کی، اور جس کیلئے شفاعت کی جائے، کوئی شفاعت صورت پذیر نہیں ہوگی۔

---

[1] خوارج کا نعرہ یہ تھا: ان الحکم الا للہ لا لك یا علی ولا لاصحابك حکومت کرنا خدا کا کام ہے نہ تیرا اور نہ تیرے اصحاب کا اے علیؑ

۲۔توحید در اطاعت

جس طرح حکومت وفرمانروائی فقط خدا کے ساتھ مختص ہے۔اسی طرح سوائے خدا کی اطاعت کے کسی فرد کی اطاعت لازم وواجب نہیں ہے۔اوراگر کچھ مواقع پر قرآن نے ایک گروہ: مثلاً انبیاء واولیاء کی اطاعت واجب قرار دی ہے،تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ انکی اطاعت بعینہٖ خدا کی اطاعت ہے۔دوسرے لفظوں میں چونکہ خدا نے ان کی اطاعت اوران کے فرمان کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے لہٰذا اس بنا پر ان کے فرمان کی پیروی کرنا چاہیے اوران کی بات کو دل سے قبول کرنا چاہیے اورحقیقت میں جہاں ہستی میں بالذات صرف ایک ہے مطاع ہے،اوروہ خدا ہے،اوردوسرے افراد کا مطاع ہونا،خدا کے مطاع اورواجب الاطاعت ہونے کے سائے میں ہے۔

۳ توحید در تقنین

قرآن کی نظر میں شریعت اور قانون سازی خدا کے ساتھ مخصوص ہے،اورکوئی بھی شخص کسی بھی موقع ومحل میں قانون سازی کا حق نہیں رکھتا،اہل کتاب کا ایک گروہ جنہوں نے قانون سازی کا کام احبار اور رہبانوں کے سپرد کردیا ہے۔انہوں نے ''توحید درتقنین'' کے دائرے سے باہر قدم رکھا ہے،اوروہ مشرکین کے زمرہ میں آگئے ہیں۔اس بناء پر دوسرے افراد: مثلاً انبیاء اورائمہ معصومین کی ذمہ داری صرف احکام کو بیان کرنا ہے۔اورفقہاء ومجتہدین عالی مقام کا وظیفہ قانون شناسی اور پروگرام دینا ہے نہ کہ حکم شریعت اورقانون کا بنانا۔

البتہ ہم ''توحید درتقنین'' کو''توحید درفعل'' کی قسم میں بھی داخل کرسکتے ہیں،لیکن مناسب یہی ہے کہ اس قسم کو اس سے جدا ہی رکھیں۔کیونکہ توحید درفعل سے مقصد افعال تکوینی ہیں،یعنی وہ افعال جو خلقت وآفرینش کے ساتھ مربوط ہیں،جبکہ قانون سازی اعتباری وجعلی کی ایک قسم ہے۔اس لحاظ سے ان دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنا ہی مناسب ہے۔''توحید درحکومت''،''توحید دراطاعت'' اور''توحید درتقنین'' کی تحقیق اورمطالعہ کرنے سے حکومت اسلامی کا طریقہ اوراس کا حقیقی چہرہ روشن ہوجائیگا،کیونکہ اس بناء پر حکومت اسلامی کا طریقہ نہ تو فرد کا لوگوں پر حکومت کرنا ہے،اورنہ ہی لوگوں کا لوگوں پر حکومت کرنا ہے۔بلکہ خدا کا لوگوں پر حکومت کرنا، یا خدا کے قانون پر حکومت کرنا، یا لوگوں کا لوگوں پر خدا کے اذن اور حکم سے حکومت کرنا ہے۔اورحکومت کے دوسرے تمام طریقے حکومت کے قرآنی طریقوں کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مباحث توحید کی تکمیل کیلئے توحید کی چار اقسام کے بارے میں بحث کرنے کے علاوہ توحید کی ان تین اقسام (حاکمیت ،اطاعت اور تقنین) کے بارے میں بھی اسی طرح بحث کرنی لازم ہے جس طرح سے قرآن رہبری کرتا ہے اورہم ہرگز اس بات کے مدعی نہیں کہ مراتب توحید انہیں سات درجات میں منحصر ہیں۔اگرچہ دوسرے درجات ومراتب توحید[1] کو انہیں سات مین سے کسی میں شمار کیا جاسکتا ہے ،لیکن قرآن کے مباحث توحید انہیں درجات میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ توحید وشرک سے مربوط مباحث ان مراتب سے کہیں زیادہ وسیع ہیں جن میں

---

[1] مثلاً: توحید دررزاقیت،توحید درہدایت وضلالت،توحید درشفاعت،توحید درمغفرت،جوکسی نہ کسی طرح توحید درافعال سے مربوط ہوکر اس کی طرف لوٹ سکتی ہے۔

سے زیادہ اہم حسب ذیل ہیں۔

۱۔خدا اور توحید فطری

۲۔''عالم ذر میں'' خدا کی یکتائی کا اعتراف

۳۔تمام ذرات عالم اسکی توحید کی گواہی دیتے ہیں۔اور اسکی تسبیح وتقدیس کرتے ہیں۔

۴۔وہ دلائل جو قرآن نے خدا کے وجود کے اثبات کیلئے قائم کیے ہیں۔

۵۔اسکی ذات یکتا ہے۔اور اس کا کوئی مثل ونظیر اور شریک نہیں ہے۔

۶۔اسکی ذات بسیط ہے۔اس کیلئے کوئی خارجی یا عقلی جز نہیں ہے،اور اس کے صفات اس کے عین ذات ہیں نہ کہ اسکی ذات پر زائد۔

۷۔توحید در خالقیت اور یہ کہ سارا جہاں ایک سے زیادہ خالق نہیں رکھتا ہے۔

۸۔توحید در ربوبیت اور یہ کہ عالم کا ایک ہی مدیر ومدبر ہے۔

۹۔توحید در حکومت اور یہ کہ حکومت اسی کے ساتھ مختص ہے۔

۱۰۔توحید در اطاعت اور یہ کہ اس کے علاوہ مطاع بالذات کوئی نہیں۔

۱۱۔توحید در تقنین اور یہ کہ شریعت وقانون سازی اسی کا کام ہے۔

۱۲ توحید در عبادت اور یہ کہ عبادت وپرستش اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔

ہم ان تمام مباحث میں قرآن کی آیات پر ہی تکیہ کریں گے اور کبھی کبھی مزید وضاحت کیلئے دلائل عقلی وفلسفی اور احادیث اسلامی کی تائید بھی پیش کریں گے۔

توحید کے مراتب ودرجات کی بحث کے بعد مناسب تھا کہ ہم توحید کے اخلاقی اور اجتماعی آثار کے بارے میں بھی قرآن کی نظر سے بحث وتحقیق کریں،لیکن چونکہ اس سلسلہ میں تفصیل سے بحث کرنے کیلئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔اس بناء پر توحید کے اصلاحی آثار اور شرک کے تباہ کن اثرات کی بحث کو ہم دوسرے وقت اور دوسری کتاب کے حوالے کرتے ہیں۔اگرچہ گذشتہ زمانہ میں بھی،ہم اس سلسلے میں،کچھ اختصار کے ساتھ کتاب ''بازگشت بہ عصر ایمان'' میں بحث کر چکے ہیں۔

قم حوزہ علمیہ،مؤسسہ امام صادق علیہ السلام

میدان شہداء،جعفر سبحانی

۶۰/۶/۱۱

مطابق ۲۸ شوال ۱۴۰۱ھ

اس حصہ میں

خدا شناسی اور فطرت انسانی

ماشینیزم کا دیوالیہ پن

مغرب کے آخری علمی انقلاب میں، نئے نئے انکشاف اور نئی نئی ایجادیں کرنے والے، دنیا کے لوگوں سے یہ وعدہ کررہے تھے کہ اگر وہ عالم مادہ پرحکم فرما تمام روابط کو کشف کرلیں، اور عالم ظہور میں آنے والی تمام چیزوں کے روابط کے معلوم کرلیں اور بشر پر بے رحمی کے ساتھ حملہ کرنے والے جہالت کے دیو کو قابو میں کرلیں۔تو نوع بشر اس مدینہ فاضلہ میں جسکا افلاطون نے وعدہ کیا تھا، اور وہ بہشت بریں جسکے بارے میں انبیاء نے گفتگو کی تھی قدم رکھ دے گی۔

لیکن بیسیوں صدی کی شروع اور وسط کے تباہ کن حوادث نے۔جس میں دونوں عالمی جنگوں میں مجموعی طور پر سولیین سے زیادہ انسانی نفوس ہلاک ومجروح اور ناپید ہو گئے۔مغرب کے شیخی بگھارنے والوں، لاف زنی کرنے والوں اور جھوٹے دعویداروں کی قلعی کھول کر رکھ۔ اور معلوم ہو گیا کہ ابھی تک دین ودیانت کا زمانہ ختم نہیں ہوا۔اور نوع بشر، دین اور خدا کیطرف توجہ کو چھوڑ کر، رفاہیت کی زندگی تک نہیں پہنچ سکتی ،اور اگر یہ فرض کرلیں کہ وہ پہنچ گیا، تو اس قسم کی زندگی، نئے مشکلات سے۔جو مادی اور صنعتی تمدن کی پیش رفتوں سے حل نہیں ہوتے روبرو ہوگی۔

کیونکہ ایسی حکومتوں کے زیر سایہ جو ''مذہب سے خالی'' ہونے کے باوجود علم ودانش پر تکیہ کیے ہوئے ہیں۔وہ کون سے علل واسباب ہوں گے جو خانمانسوز جنگوں کو روک سکیں گے، اور وہ کون سا حقوقی سسٹم ہوگا، جو انسان کے ایک دوسرے سے روابط کے مشکلات کو حل کر سکے گا۔ موجودہ زمانہ میں مکتب سازی اور خام افکار کے ایک سلسلہ کو ''ازم'' کے اضافہ کے ساتھ پیش کرنے کا، ہر ایک فکر ونظر کے ساتھ رواج اور فیشن ہو گیا ہے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ تمام ''مکاتب'' اور ''ازم'' میدان سیاست میں اجتماع واخلاق میں اور انسان کو راہ ورسم زندگی سے آشنا کرنے میں عاجز وناتواں ہو گئے ہیں، اور یکے بعد دیگرے نابود ہوتے اور تاریخ کے کوڑے کا ڈھیر بنتے چلے جاتے ہیں۔

مارکسنرم جو مادہ اور اقتصاد کو ہی معاشرے کے تحرک وانقلاب کی ابتداء وانتہا سمجھتا ہے، وہ ہرگز انسان کے معنوی مسائل کی پیاس کو نہیں بجھا سکتا، اور پھر بشر کے عام اور سادہ مسائل کے حل کرنے سے بھی عاجز ہے۔

انسان ہمیشہ یہ جاننا چاہتا ہے: وہ کہاں سے آیا ہے؟ کس لئے آیا ہے؟ اور اس نے کہاں جانا ہے؟ لیکن مارکسنرم کے مکتب نے اس سوال کے جواب میں اپنے لبوں پر مہر سکوت لگائی ہوئی ہے اور اس میں اس کا جواب دینے کی طاقت نہیں ہے۔ بلاشک وشبہ جب تک انسان زندگی کے انجام، اور اس کے ہدف ومقصد کا، تسلی بخش جواب معلوم نہ کرلے، اس وقت تک، زندگی کے دوسرے مسائل اس کے کیلئے قطعی ویقینی طور پر حل نہیں ہوں گے۔

یہی وہ منزل ہے جہاں عالم کے آزاد مفکریں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نوع بشر کو مذہب کی آغوش میں پلٹنا چاہیے۔اور مذہی عقائد کو انسانوں کی زندگی میں ،ایک اساسی عامل کی صورت میں محاسبہ کرنا چاہئے اور ہروہ مکتب جو انسان کو صرف طبیعت اور مادہ میں مشغول رکھنا چاہئے، آخرکار وہ ناقابل نفوذ بند رستوں کے ظاہر ہونے پر ٹھکرا دیا جائیگا۔

گفتگو کی روح وہی بات ہے، جو مشہور دانشمند جان ڈیورٹ کہتا ہے: ''امور مذہبی کی جس طرح بھی تشریح کرو اور جس شکل میں بھی تم اسکو سمجھو، مذہب ماضی میں بھی تھا، اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔[1]

الٰہی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم صرف ماوراء طبیعت کی طرف دیکھیں اور ماوراء طبیعت سے منہ پھیر لیں، بلکہ الٰہی و مادی میں فرق یہ ہے کہ ایک خدا شناس انسان، مادہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے تجربیات و معلومات کو ماوراء مادہ کی شناخت کا ذریعہ بناتا ہے۔ جبکہ ایک مادی شخص مادہ ہی کو اپنا مقصد قرار دیتے ہوئے خود کو مادہ اور طبیعت کا اسیر بنالیتا ہے۔

معاشرتی علوم کے ماہرین اور خدا کا اعتقاد

مغرب کے معاشرتی علوم کے ماہرین کہتے ہیں: خدا کا عقیدہ قدیم انسانوں کی زندگی کی گہرائیوں میں موجود رہا ہے۔ اور اس نے کسی بھی زمانہ میں مذہب کو اپنی زندگی کے پروگرام سے حذف نہیں کیا ہے۔ لیکن کیمونسٹ ممالک جنہوں نے خدا اور مذہب کو اپنی زندگی کے پروگرام سے حذف کر دیا ہے، اور بڑے پیمانہ پر کفر والحاد، اور خدا و ماوراء مادہ کا انکار کرتے ہیں۔ خود ایک وسیع اندوہناک منظر رکھتے ہیں، جس کی طرف ہم اس بحث کے آخر میں اشارہ کرینگے۔ اب ہم اس قسم کے اعتقاد کے ہمہ گیر ہونے کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔

وہ آواز جو ہم تمام انسانوں کے اندر سے سنتے ہیں

اس کرہ خاکی پر انسان کی زندگی، ایک ایسا قیمتی خزانہ ہے، جو موجودہ اور آئندہ کے انسان کے اختیار میں ہے۔ اور ہر فرد بشر ایک خاص نگاہ سے، اپنی معلومات اور علمی مہارت کے تناسب سے، اس خزانہ سے فائدہ اٹھاتا اور نتیجہ حاصل کرتا ہے۔ اس بناء پر ہم دیکھتے ہیں کہ عظیم پیغمبر، مصلحین جہاں، حکماء و فلاسفر، اخلاق کے مربی و استاد، جامعہ شناس اور نفسیات کے ماہرین وغیرہ سب ہی انسان کو گذشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کی طرف متوجہ کرتے ہیں، اور سب ہی اپنے اہداف و مقاصد کو آگے بڑھانے کیلئے اس راہ گذر سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک الٰہی و مذہبی انسان کیلئے۔ جو تاریخ بشر کی تنہائیوں میں، مذہب کی گہری بنیادوں کو تلاش کرنا، اور اس کی اصل بنیادوں سے مفید اور سودمند معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تاریخ کے اوراق الٹنا، اور گذشتہ اقوام جن پر اکیس[2] تمدن گذر چکے ہیں کی کامیابی کا مطالعہ کرنا، انسانوں کے دلوں میں انفرادی طور پر بھی اور انسانوں کی اجتماعی زندگی میں بھی، مذہب کی گہری جڑوں کی شناسائی کیلئے، ایک اطمینان بخش ذریعہ ہے۔

انسان نے چند ہزار برس کی زندگی کے عرصے میں اور مختلف اور گوناں گوں تمدنوں کے درمیان اپنے لئے دسیوں راستے اور طریقے

---

[1] مذہب در آزمائش ھاور وندادہائی زندگی ص ۹

[2] .... جہاں تک تاریخ نے محفوظ کیا ہے

انتخاب کئے ہیں، اور پھر ان سب کو الوداع کہہ کر سب کو اپنی زندگی سے حذف کر دیا ہے۔ بشر ہمیشہ نئی چیز کا خواہش منداورنئی چیز کا متلاشی رہا ہے اور تغیر و تبدل کی خاصیت کا حامل رہا ہے۔ اور اس نے عوامل طبیعی، ماحول اور خاندانی حالات کے زیر اثر سینکڑوں اصلاحات اور تبدیلیاں اپنی زندگی میں ایجاد کی ہیں اور ان امور کو جنہیں وہ ایک عرصہ تک اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا تھا، زندگی کی لغت سے حذف کر دیا ہے۔ لیکن اس ساری مدت میں صرف ایک مسئلہ اس کی زندگی کی لغت مین باقی رہا ہے، اور اس کی حفاظت اور بچانے میں، بلکہ اسے بڑھانے اور پھیلانے میں ہمیشہ کوشاں رہا ہے۔ اور وہ دین اور ماوراء مادہ کی طرف توجہ کا مسئلہ ہے کہ وہ اس سے کبھی بھی خستہ نہیں ہوا اور اس سے روگردانی نہیں کی۔

یہ قدامت اور اصالت اس بات کی ترجمانی کرتی ہے کہ دین و مذہب کی طرف توجہ، اس کی ذات کے عناصر میں شامل ہے اور اس کی بنیادی سرشت، اس کی روحانی ضرورتوں اور نفسانی خواہشات میں سے ایک ہے جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہی ہے اور اصلاح و تجدید کی روح اسپر اثر انداز نہیں ہوئی۔

ویل دورانٹ مورخ معاصر لکھتا ہے: یہ صحیح ہے کہ بعض ابتدائی قومیں ظاہراً کوئی دین و مذہب نہیں رکھتی تھیں۔ یعنی افریقہ کے رہنے والے بونے کسی قسم کی عبادت اور دینی شعائر نہیں رکھتے............

لیکن یہ حصہ ایک نادر حالت ہے، اور یہ پرانا عقیدہ ہے کہ دین ایک ایسی نمود ہے۔ جو تمام افراد بشر میں پائی جاتی ہے عین حقیقت ہے،............ یہ معاملہ فلسفی کی نظر میں تاریخ اور نفسیات کے بنیادی امور میں ہے، ''رفورم'' اور نئی تلاش کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے...... اور اس کی توجہ اس مسئلہ کی طرف ہے کہ دین قدیم الایام سے تاریخ کے ساتھ ساتھ رہا ہے [۱]

مشہور جامعہ شناس ''سموئیل کنیک'' اپنی گفتگو کے ایک حصہ میں، انسان کے اسلاف میں مذہب کی جڑوں کی تصریح کرتے ہوئے کہتا ہے، ''موجودہ انسان کے اسلاف جن کے آثار کھدائیوں سے ملے ہیں، مذہب رکھتے تھے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے مردوں کو ایک خاص طریقہ سے دفن کرتے تھے اور ان کے کام کاج کے آلات ان کے ساتھ رکھ دیتے تھے اور اس طریقہ سے وہ دوسری دنیا کے وجود کے ساتھ اپنے عقیدہ کو ثابت کرتے تھے۔'' [۲] یہ لوگ ایسے زمانے میں زندگی بسر کرتے تھے جب خط و کتابت ایجاد نہیں ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود مذہب کی طرف توجہ، جس کیلئے ماوراء مادہ قوت کا اعتقاد ضروری تھا، ان کی زندگی کا جز تھی۔ ویل دورانٹ ایک دوسری جگہ درج ذیل سوال پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

''اس تقویٰ کا منبع جو کسی طرف سے انسان کے دل سے نہیں جاتا، کہاں واقع ہے۔ [۳]

لیکن چند صفحات کے بعد ایک طرح سے اس سوال کا جواب دیتا ہے۔'' کاہن نے دین کو ایجاد نہیں کیا، بلکہ جس طرح ایک سیاسی

---

[۱] تاریخ تمدن ج ۱ ص ۸۸

[۲] جامعہ شناسی ص ۱۹۲

[۳] تاریخ تمدن جلد اول ص ۸۸

آدمی انسان کے فطری میلانات سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس نے بھی اپنے مقاصد کیلئے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ دینی عقیدہ عبادت خانوں میں ایجاد کردہ نہیں ہے، بلکہ اس کی موجد انسانی فطرت ہے۔[1]

کیا خدا کا وجود ایک بدیہی چیز ہے؟

عرفاء کی ایک جماعت عالمِ ہستی میں خدا کے وجود کو ایک بدیہی امر سمجھتی ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ اس حقیقت واقعیت کا ادراک ایک واضح اور روشن ادراک ہے اور اس کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے، عارف شبتری کہتے ہیں:

زہی ناداں کہ او خورشید تاباں
بنور شمع جوید در بیاباں
جہاں جملہ فروغ نورحق داں
حق اندروے زپیدائی است پنہاں[2]

وہ آدمی کتنا نادان ہے جو شمع کی روشنی سے بیابان میں چمکتے ہوئے سورج کو ڈھونڈتا پھرتا ہے
تو سارے جہاں کو حق کے نور کی روشنی سمجھ، حق اس کی اندر بالکل عیاں ہے اور واضح ہونے کی بناء پر چھپا ہوا ہے

گویا انگریز فلسفی ''تھامس کارلائل'' نے عارف شبستری کے شعر سے اثر لے کر یہ کہا ہے:

''جو لوگ خدا کو دلیل کے ساتھ ثابت کرنا چاہتے ہیں، وہ اس شخص کی مانند ہیں جو خورشید کا وجود ثابت کرنے کیلئے فانوس کی دلیل میں پیش کریں۔''

مولوی ''روم'' کہتا ہے:

آفتاب آمد ،دلیل آفتاب
گر دلیلت باید ازوی ، رومتاب
ازدی ار سایہ نشانی می دھد
شمش مردم ،نورجانی می دھد

---

[1] تاریخ تمدن، جلد اول ص ۱۰۴

[2] دعای عرفہ سید الشہداء علیہ السلام

سورج خود ہی سورج کے وجود کی دلیل ہے۔

اگر تجھ دلیل کی ضرورت ہے تو اس سے منہ نہ پھیر، اس سے اگر سایہ نظر آتا ہے۔لوگوں کا سورج اپنی جان کا نور پیش کرتا ہے۔آیات اور خاندان رسالت سے وارد شدہ دعاؤں میں بھی اس مطلب پر اشارے موجود ہیں:

أَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ

کیا اس اللہ کے وجود کے بارے میں شک وشبہ ہے، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے وہ تمہیں اس لئے دعوت دیتا ہے ،تا کہ تمہارے گناہوں کو بخشش دے۔(ابراہیم۔۱۰)

جو چیز خدا کے بدیہی ہونے کی طرف اشارہ ہوسکتی ہے وہ وہی ''أفي الله شك'' کا جملہ ہے ،جبکہ بعد والا جملہ (فاطر السموٰات) جیسا کہ ہم بعد میں وضاحت کریں گے۔خود خدا کے وجود پر ایک دلیل و برہان ہے۔جس طرح مذکورہ جملہ خدا کے وجود کے بدیہی ہونے کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے، اسی طرح آیت ذیل سے بھی جو خدا کو ظاہر وآشکار کہتی ہے اس کے وجود کے بدیہی ہونے کا استفادہ کیا جاسکتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

''وہی ہے اول وابتداء اور آخر وانتہا، ظاہر وآشکار اور باطن ونہاں، اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔(حدید۔۳)

اور آزاد لوگوں کے سردار حضرت سید الشہداء علیہ السلام کی دعا سے بھی اس مطلب کی طرف اشارہ معلوم کیا جاسکتا ہے جہاں آپ عرفہ کے دن کردگار جہاں سے اپنے راز و نیاز میں اس طرح کہتے ہیں۔

كيف يستدل عليك بماهو في وجود مفتقر اليك ايكون لغيرك من الظهور ماليس لك، حتىٰ تكون هو المظهر لك ؟ متى غبت حتى تحتاج الى دليل يدل عليك ،ومتى بعدت حتى تكون الاثار هى التى توصل اليك عميت ،عين لاتراك عليها رقيباً[1]

''جو چیز اپنے وجود میں خود تیری محتاج ہے ۔اس چیز کے ساتھ تجھ پر کس طرح استدلال کیا جاسکتا ہے۔وہ ظہور و آشکار جو تیرے غیر کے لئے وہ خود تیرے لئے کیوں نہیں ہے؟ کہ وہ تجھے آشکارا کرے؟ وہ دل کی آنکھوں سے پنہاں ہی کب ہوا تھا، کہ تو ایسی دلیلوں کا محتاج ہو جو تیری

[1] دعائے عرفہ سید الشہداءؑ

طرف راہنمائی کریں؟ تو ہم سے دور ہی کب ہوا ہے کہ تیرے آثار اور نشانیاں (ہمیں) تجھ تک پہنچائیں اندھی ہو جائے وہ آنکھ جو تجھے اپنے اوپر نگران اور نگہبان نہ سمجھے۔"

اور اس دعا کے آخر میں فرماتے ہیں:

یامن تجل بکمال بهائه...... کیف تخفی وانت الظاهر،ام کیف تغیب وانت الرقیب الحاضر

"اے وہ خدا جو اپنے فروغ نور سے اپنے ماسواء پر تجلی کیئے ہوئے ہے......تو کیسے چھپ سکتا ہے جبکہ تو ظاہر و آشکار ہے۔ اور تو کیسے غائب ہو سکتا ہے، جبکہ تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، اور بندوں پر نگران و نگہبان ہے۔"

لیکن اس بات پر توجہ رہے کہ خدا کے وجود کا بدیہی ہونا، اس کے اعتقاد کی فطری ہونے کی نفی نہیں کرتا، اور اس میں کوئی بات مانع نہیں ہے کہ خدا کا وجود بدیہی بھی ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ فطری بھی ہو، اور حقیقت میں اسکا بدیہی ہونا اسکے فطری ہونے کا معلول ہے۔ کیونکہ جیسا کہ منطق کی کتابوں میں، مواد قیاس کے حصہ میں بیان ہوا ہے۔[1] فطریات انسان، بدیہی کی قسموں میں سے ایک قسم ہے۔[2] اس بناء پر کوئی مانع نہیں ہے کہ خدا کا وجود بدیہی ہونے کی باوجود، فطری بھی ہو، اور چونکہ ہمارا وجود خدا کی طرف مائل رہنے سے خمیر ہوا ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے ایک امر بدیہی کی صورت میں تجلی کرتا ہے۔

انسان فطری طور پر خدا خواہ اور خدا جو ہے

بعض مفسرین نے قرآنی آیات سے، خدا کے اعتراف و اقرار کے مسئلہ کو، ایک فطری امر سمجھا ہے اور اس کو انسان کے اندر کے دوسرے سارے میلانات کا ہم ردیف قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان فطرتاً اچھائیوں کی طرف میلان رکھتا ہے اور برائیوں سے ڈرتا ہے، ذاتاً راستگوئی، امانت داری اور عدل و انصاف کا خواہاں ہے، اور جھوٹ، خیانت اور ظلم سے نفرت کرتا ہے، اس طرح اگر وہ خدا خواہ

---

[1] یہ حصہ منطق کے اہم حصوں میں سے ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ متاخرین، منطقیوں نے زیادہ توجہ نہیں دی صرف علامہ حلی متولد ۶۴۸ متوفی ۷۲۶ نے "الجوہر النضید" میں اس حصہ کو خوب لکھا ہے، اور آخری دنوں میں علامہ مظفر نے "کتاب المنطق" میں اس حصہ میں مبسوط بحث کی ہے۔ شکر اللہ مساعیھم

[2] شرح تہذیب ملاعبداللہ ص ۱۴۶ کی طرف رجوع فرمائیں۔ وہ کہتے ہیں: امور یقینی کے دو اصول ہیں، ۱۔ امور بدیہی۔ ۲۔ امور نظری جو بدیہیات کی طرف ہی لوٹتی ہیں، اس کے بعد کہتے ہیں: بدیھیات کی چھ قسمیں ہیں، اور وہ یہ ہیں: اولیات، مشاھدات، تجربیات، حدسیات، متواترات و فطریات۔ آپ نے دیکھ لیا کہ فطریات بدیھیات کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔

اور خدا جو ہے، اور ہمیشہ ماوراء مادہ کی طرف کھینچتا ہے تو یہ سب کچھ اسی بناء پر ہے کہ ان امور کی طرف میلان، اسکی خلقت میں خمیر شدہ ہے جو خواہ مخواہ خدا اور اچھائیوں کی طرف کھینچتا ہے، اور خدا کے انکار، اور برائیوں سے دور ہٹتا ہے۔

اس حصہ میں دو قسم کی آیات ہمارے سامنے آتی ہیں، ان میں سے ایک قسم تو یہ ہے، جو عقیدہ و عمل کے بارے میں تمام دینی تعلیمات کو فطری قرار دیتی ہے، اور ان تمام کو اس آواز کی صورت میں، جسے خود انسان اپنے اندر سے سنتا ہے۔ حکم فرما سمجھتی ہے، دوسری قسم ان آیات کی ہے، جن میں صرف بُرے اور خوفناک حوادث کے وقت، خدا کی طرف میلان کو ایک فطری امر قرار دیا گیا ہے، اب ہم ان دونوں قسم کی آیات کو پیش کرتے ہیں۔

دینی تعلیمات کے اصول فطری ہیں

(۱) فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ

''خلوص کے ساتھ [1] (خدا کے) دین کا رخ کرو (دین) وہی فطرت ہے۔ جسے خدا نے لوگوں میں خمیر کر کے پیدا کیا ہے، خدا کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ (کہ افراد کو گوناں گوں فطرتوں میں پیدا کرے) یہ ہے سیدھا دین لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (روم۔ ۳۰)

اس آیت میں نہ صرف ''خدا شناسی'' کے مسئلہ کو ایک فطری امر کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے، کہ انسان کی خلقت میں اس کے وجود کا اعتقاد خمیر کیا گیا ہے لیکن دین بھی جو وہی اصول اور خدا کے دین کے کلیات ہیں۔ ایک امر فطری معرفی ہوا ہے، آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین خواہ اصول ہوں یا فروع انسان کی فطرت اور خلقت میں گوندھا گیا ہے۔ اور خمیر ہوا ہے، اب اسلام کی تعلیمات کے اصول، خواہ وہ عقیدہ سے تعلق رکھتے ہوں یا عمل سے، فطرت انسانی کے ساتھ کیسے مطابق ہیں، خود ایک وسیع بحث ہے جن میں ہم سر دست وارد نہیں ہوتے اور خاتمیت کی بحث میں اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ بحث کی ہے اور دین کی حقیقت، راہ و رسم زندگی اور اس طریقہ اور راستہ کے سوا۔ جسے انسان کی سعادت تک پہنچنے کیلئے طے کرنا چاہئے۔ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

---

[1] خلوص کیساتھ، لفظ ''حنیفاً'' کا ترجمہ ہے جو عربی قواعد کے لحاظ سے اقم کے فاعل کی ضمیر سے ''حال'' ہے اور کچھ لوگ اسے للدین کے لفظ سے حال سمجھتے ہیں، اس طرح ترجمہ یوں ہونا چاہئے، خالص دین کی طرف رجوع کرو۔

عالم کے تمام موجودات کی ہدایت

انسان کی خلقت کا مقصد ممکن سعادت وکمال کا حصول ہے اور خدا نے ہر فرد انسانی، بلکہ موجودات عالم کی ہر نوع کو اس کمال ممکن کے حاصل کرنے کیلئے ہدایت ورہبری کی ہے، اوران وسائل کے ساتھ۔ جو افرادنوع کو مناسب ومطلوب کمال تک پہنچا ئیں، آراستہ کیا ہے ،قرآن نے اس ہدایت تکوینی کی، جو جنبہ ہمگانی رکھتی تھی، اورانسان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ دوسری آیات میں تصریح کی ہے۔ جہاں فرماتا ہے:

(۲) قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی

''ہمارا خدا وہ ہے جس نے ہر چیز کو وجود بخشا ہے، اور پھر اسے (کمال کی طرف) ہدایت ورہبری کی ہے۔'' (طٰہٰ۔۵۰)

(۳) الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَہَدٰی ۪ۙ﴿۳﴾

وہ خدا جس نے (انسان اور سارے جہاں کو) پیدا کیا اور پھر اسے ٹھیک ٹھاک کیا، وہی ہستی جس نے ہر موجود کی خلقت کی اندازہ گیری کی، پھر اسکو ہدایت ورہبری کی۔ (اعلیٰ ۲۔۳)

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ عالم خلقت کی تمام انواع، چاہے وہ جاندار ہوں یا غیر جاندار، اپنی خلقت میں ایک فطری ہدایت کی حامل ہیں، جو سب کو انکی راہ حیات وکمال متناسب میں رہبری کرتی ہے، اور جو چیزیں اسکی حالت کیلئے مفید یا مضر ہیں، ان سے اُسے آگاہ کرتی ہے۔ قرآن خصوصیت کے ساتھ انسان کی فطری ہدایت کے بارے میں یوں فرمایا ہے:

(۴) وَ نَفۡسٍ وَّ مَا سَوّٰىہَا ۪ۙ﴿۷﴾ فَاَلۡہَمَہَا فُجُوۡرَہَا وَ تَقۡوٰىہَا ۪ۙ﴿۸﴾

''قسم ہے نفس انسانی کی اور اس ذات کی جس نے اس کو پیدا کیا ہے، اور اسے ''مکتب آفرینش میں'' برائیوں اور اچھائیوں سے آگاہ کر دیا ہے۔ (شمس۔۷۔۸)

(۵) اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ عَیۡنَیۡنِ ۙ﴿۸﴾ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَیۡنِ ۙ﴿۹﴾ وَ ہَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ ﴿ۚ۱۰﴾

''کیا ہم نے اسے دو آنکھیں، ایک زبان، اور دو ہونٹ نہیں دیئے، اور اسے خیر وشر کے راستوں کی رہبری نہیں ہے۔'' (بلد، ۸۔۱۰)

ایک دوسری آیت میں، راہ سعادت طے کرنے کو، اس آواز کے سبب سے، جسے وہ اندر سے سنتا ہے،''آسان'' معرفی کراتے ہوئے کہتا ہے:

(۶) مِنۡ نُّطۡفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِيۡلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾

''اسکو نطفہ سے پیدا کیا پھراس کی اندازہ گیری کی اور اسکے بعد زندگی کی راہ کو طے کرنا اس کیلئے آسان کردیا ہے۔(عبس ۱۹۔۲۰)

یہ آیات بتاتی ہیں کہ تمام انواع: خاص طور پر جاندار اوران میں سے انسان، ایک اندرونی ہدایت ورہبری کے زیر سایہ اپنے کمال تک پہنچ سکتا ہے، اوراس راہ میں انسان کا ہادی ورہبر اس کی خلقت وآفرینش ہے۔اور تمام افراد اس معنوی نعمت اور فطری رہبری کے مقام میں یکساں اور برابر ہیں، اور کسی کو کسی پر ترجیح نہیں ہے اس لئے وہ اس طرح فرماتا ہے:

فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ

''سرشت اورفطرت جس پر انسان کی خلقت برقرار ہے۔خدا کی خلقت میں تبدیلی اور دگرگونی نہیں ہے۔(روم۔۳۰)

یعنی اس سلسلہ میں ہرگز کسی پر ترجیح نہیں ہے کہ ایک کی خلقت تو خیرونیکی کی طرف تمایل کی بنیاد پر اور دوسرے کی خلقت کو شر اور بدی کی طرف تمایل کی بنیاد پر استوار کرے۔کیونکہ جب معاشرہ کی خلقت میں اس قسم کی ترجیح پائی جائے گی، تو مسلمہ طور سے اس قسم کا معاشرہ صحیح وسالم اور بے عیب نہیں رہے گا اور اپنے مقصد خلقت کو نہیں پہنچ سکے گا۔کیونکہ جب تک معاشرے کے تمام افراد کے درمیان ایک واضح قدر مشترک نہ ہو تو ایسے معاشرے کے تمام افراد اجتماعی طور پر تکامل وارتقاء کی راہ پر ہرگز نہیں چلے سکتے۔جب دین کے اصول وکلیات فطری وسرشتی جذبہ رکھتے ہوں تو اس حالت میں یقینی طور پر خدا شناسی کا مسئلہ، جو تمام آسمانی تعلیمات کی اساس وبنیاد ہے۔فطری ونہادی ہونا چاہئے۔

شدائد میں فطرت کی تجلی

البتہ خدا پر اعتماد کے فطری ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان تمام واقعات و حالات میں بس اسی کی طرف توجہ کرے۔ کیونکہ بہت سے عوامل ایسے ہوتے ہیں جو اس بات کا سبب بن جاتے ہیں کہ اس قسم کی دریافت نہا نگاہ خلقت میں مستور و پوشیدہ رہ جائے، اور انسان کے خود آگاہ ذہن میں خودنمائی نہ کرے، لیکن جب کچھ عوامل، فطرت پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹا دیں تو انسان اپنی اندرونی آواز کو اچھی طرح سن لیتا ہے، انسان خوفناک حوادث سے دوچار ہونے کے موقع پر خود بخود اس سبب ساز موجود کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو مشکلات کو آسان کر دے۔

انسان کیلئے خطرناک حوادث کے ظہور کا موقع جیسے کشتی کا سمندر کی موجوں میں گھر جانا، ہوائی جہاز میں کسی فنی نقص کا پیدا ہو جانا، یا موٹر کے بریک کا فیل ہو جانا۔ اور شہروں اور دیہات میں سیلاب کا داخل ہو جانا۔ ایک عرفانی حالت اور خصوصی توجہ خدا کی طرف پھیر دیتا ہے جو اسے عالم کی تدبیر اور ادارہ کرنے والے کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ ایمان سے پٹرول کے ساتھ، بلکہ اپنے وجود کے تمام ذرات کے ساتھ خدا سے دعا کرتا ہے کہ وہ اسے اس مہلکہ سے نجات دیدے۔ یہاں خوف انسان کی اندرونی آواز اور فطری اعتقاد کو یاد دلاتا ہے خدا کا اعتقاد پیدا کرنے والا نہیں ہوتا۔

عمر کے ان لمحوں میں انسان کے خدا کی طرف متوجہ ہونے سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہئے، کہ انسان کا خدا کے بارے میں عقیدہ طبیعت کے خشمگین عوامل سے انسان کے خوف کا معلول ہے بلکہ اسے اس قسم کے اندرونی دریافت کیلئے توجہ کا ایک ذریعہ سمجھنا چاہئے۔

حالانکہ خوبصورتی کو پسند کرنا، ثروت اندوزی سے محبت اور علم حاصل کرنے سے لگاؤ۔ ہماری خلقت میں خمیر شدہ ہے لیکن یہ تمام حالات میں ظاہر نہیں ہوتا اور خود آگاہ انسان کے ذہن میں نہیں آتا اور جب تک حالات سازگار نہ ہوں اس قسم کے فطرتی آثار ہمارے وجود میں ظاہر نہیں ہوتے۔

قرآن یاد دلاتا ہے کہ مشرک لوگ سختی اور شدت کے موقعوں پر وہ موقع جب ان کی کشتی ناگوار حوادث میں پھنس جاتی ہے انہیں خدا کی یاد آجاتی ہے اور وہ صمیم قلب اور خلوص دل سے خدا کو پکارنے لگ جاتے ہیں اور دوسرے اسباب وعوامل کو یہاں تک کہ مقرب بتوں کو بھی بھول جاتے ہیں اور یہی بات خدا کے اعتقاد کے فطری ہونے کی نشانی ہے اب وہ آیات جو اس سلسلہ مین وارد ہوئی ہیں پیش کی جاتی ہیں:

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ لَىِٕنْ

اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ۝۲۲ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝۲۳

''وہی تو ہے جو تمہیں خشکی اور سمندر میں چلاتا ہے جس وقت تم کشتی میں ہوتے ہو اور وہ موافق ومناسب ہواؤں کے ساتھ انہیں لے کر چلتی ہے تو وہ بھی خوش ہوتے ہیں۔ یکا یک خوفناک ہوا چلنے سکتی ہے اور موج انہیں ہر طرف سے گھیر لیتی ہے اس وقت وہ گمان کرتے ہیں کہ بلا اور مصیبت نے انہیں گھیر لیا ہے اور (اب وہ) خالص اعتقاد کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اگر ہمیں اس خطرہ سے نجات دے دے تو ہم شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے۔ جب خدا انہیں نجات دے دیتا ہے تو وہی پھر زمین میں ظلم وستم کرنے لگ جاتے ہیں۔'' (یونس، ۲۲۔۲۳)

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ۝۶۵

''جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا کو خالص اعتقاد اور شرک سے پاک قرار دیتے ہوئے پکارتے ہیں لیکن جب وہ انہیں نجات دیکر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو فوراً ہی خدا کے ساتھ شرک کرنے لگ جاتے ہیں۔ (عنکبوت۔ ۶۵)

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ۝۳۲

''جس وقت سمندر کی کوہ پیکر موجیں ان کی کشی کو ڈھانپ لیتی ہیں تو خدا کو خلوص دل کیساتھ پکارنے لگ جاتے ہیں اور جب وہ انہیں نجات دے کر خشکی پر پہنچا تا ہے تو انہیں میں سے ایک گروہ معتدل اور میانہ روبھی رہتا ہے اور ہماری آیات کا حیلہ گر اور کفران پیشہ گروہ کے سوا اور کوئی انکار نہیں کرتا۔ (لقمان۔ ۳۲)

یہ آیات بتلاتی ہیں کہ خدا پر اعتقاد رکھنا انسان کی سرشت میں فطری صورت میں موجود ہے البتہ غیر سالم سرگرمیاں جلدی گزر جانے

والی لذتیں اور زندگی کی راہ کا ہموار ہونا اسے اندر کی آواز سے غافل کر دیتا ہے لیکن شدائد اور سختیوں کے وقت جب انسان زندگی کی یکساں روشنی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے تو پھر فطرت خدا کی یاد دلاتی ہے اور وہ اس کے سوا کسی کو بھی کارساز اور مشکل کشا نہیں سمجھتا۔[1]

ایک اعتراض کا جواب

کچھ علماء کا نظریہ ہے کہ ان آیات میں خدا کی وحدانیت کے فطری ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔ نہ کہ اس کے اصل وجود کو اور وہ اس سلسلے میں یوں لکھتے ہیں:

اگر یہ آیات امر فطری کی بات کرتیں ہیں تو پھر وہ خدائے متعال کے وجود کے بارے میں نہیں ہے بلکہ وہ اس کے یگانہ ہونے اور شرک کے بے پایہ و بے بنیاد ہونے کے بارے میں ہے۔

یہ آیہ مشرکین سے جو خدائے آفریدگار کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے درجہ کے خدا کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں یہ چاہتی ہے کہ وہ کچھ تو غور کریں تا کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ان دوسرے درجہ کے خداؤں سے کوئی کام نہیں ہوسکتا۔

اس اعتراض کا دو طریقہ سے جواب دیا جا سکتا ہے:

۱۔ اعتراض بفرضِ صحت ان آیات کے بارے میں ہوگا جو کشتی سواروں کے تلخ خطرہ کو بیان کرتی ہیں کہ وہ مصیبت کے موقع پر تو خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں لیکن دوسرے موقعوں پر خیالی خداؤں کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ لیکن وہ تمام آیات جو مجموعی دین کو ایک فطری امر قرار دیتی ہیں اور یہ بیان کرتی ہیں کہ تمام دینی تعلیمات چاہے وہ عقیدہ سے تعلق رکھتی ہوں یا عمل سے، ایک فطری امر اور انسان کے اندر کی آواز اور خواہش ہیں، ان پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا ان آیات میں نہ صرف مسئلہ توحید و یگانگی کا ایک فطری و نہاوی صورت میں تعارف کرایا گیا ہے بلکہ تمام اچھائیاں اور برائیاں اور قرآن کے قول کے مطابق "فجور و تقوا"[2] اور سورہ روم میں اس کی دوسری تعبیر کے مطابق (دین)[3] (اصول و فروع) امر فطری معرفی ہوا ہے۔ اس صورت میں کوئی منافات نہیں ہے کہ اصل وجود خدا اس کی وحدت و یگانگی کی طرح دونوں فطری امر ہوں۔

۲۔ اگر ہم اس جواب سے چشم پوشی کر لیں اور صرف دوسرے حصہ کی آیات کو ہی نظر میں رکھیں تو بھی یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کیونکہ مشرک لوگ خدا پر اعتقاد رکھنے کے ساتھ ساتھ عام موقعوں پر صرف شرکاء (بتوں) کی پرستش کرتے تھے اور کبھی بھی خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے لیکن

---

[1] اس سلسلہ میں دوسری آیات بھی ہیں جنہیں اختصار کی بناء پر نقل نہیں کیا گیا ہم صرف ان کے موارد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ "روم۔ ۳۳" "یونس۔ ۱۲" "نحل۔ ۵۳۔ ۵۴" "اسراء۔ ۶۷" ملاحظہ کیجئے۔

[2] فالهمها فجورها و تقواها (شمس۔ ۸)

[3] فاقم وجهك للدين حنيفاً فطرت الله............ (روم۔ ۳۰)

حوادث کے ظہور کے موقع پر معاملہ بالکل برعکس ہوجاتا تھا۔یعنی صرف خدا کی پرستش کرتے تھے اور بتوں کو بھول جاتے تھے۔

اس صورتِ حال سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جس طرح سے خدا کی وحدانیت اور یکتا پرستی ایک فطری امر ہے۔اسی طرح خدا پر اصل اعتقاد اوراس کے مدبرومدیر ہونے کا عقیدہ بھی ایک فطری امر ہے اسی طرح خدا پر اصل اعتقاد اورحوادث کے ظاہر ہونے کے موقع پر اس یکتا خدا کی طرف جس کی ذات وصفات کووہ بھول چکا تھا متوجہ ہوجاتا ہے اور غفلت کے بعد یہ توجہ اس بات کی نشانی ہے کہ ذات وصفات (خود خدا اوراسکی یکتائی) دونوں ایک فطری امر ہیں۔

دوسرے لفظوں میں اگر خدا کی ایک صفت فطری امر ہے تواسی طرح سے اس کے وجود کا اصل اعتقاد بھی انسان کیلئے بطریق اولیٰ فطری وذاتی ہے۔

چند نکات کی یاد آوری

گذشتہ تحقیق نے دین کے اصول اور بنیادی باتوں کے فطری ہونے کے بارے میں ہماری رہبری کی ہے اب ہم اس بارے میں چند نکات کی یاد آوری ضروری سمجھتے ہیں۔

۱۔توحید فطری اور توحید استدلالی میں کیا فرق ہے؟

خداشناسی کے بارے میں دو طریقے سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔

۱۔راہِ فطرت ودل ۲۔راہ برہان واستدلال

راہ فطرت سے مراد یہ ہے کہ انسان بغیر کسی دلیل وبرہان کے اور کسی کی تعلیم وتبلیغ کا اثر لئے بغیر خود بخود خدا کی طرف کھنچ جائے اور اس توجہ سے اس کی فطرت اور سرشت کے سوا اور کوئی عامل نہ ہو۔

دوسرے راستے سے مقصود یہ ہے کہ انسان دلیل واستدلال اور براہین عقلی وفلسفی کے طریق سے خدا کی طرف راستہ پیدا کرے اور خدا کے وجود کی طرف اس کے راہنما صرف یہی براہین ہوں اور بس بعض اوقات توحید کی ان دو انواع واقسام کے درمیان اشتباہ ہوجاتا ہے اور وہ آپس میں غلط ملط ہوجاتی ہیں۔[1]

۲۔ہم فطری کام اور عادی کام میں کیسے تمیز کریں؟

انسان سے زندگی میں دو قسم کے کام صادر ہوتے ہیں۔

---

[1] کتابوں میں توحید فطری کا توحید استدلالی سے اشتباہ بہت زیادہ نظر آتا ہے فخرالدین رازی بھی اس اشتباہ سے دوچار ہوا ہے۔تفسیر ''مفاتیح الغیب'' ج ۵ ص ۲۳۰۔۱۳۷ کی طرف رجوع کریں۔

۱۔فطری اور نہادی کام ۲۔عادی اور معمول کے کام

فطری کام وہ ہیں جن کا سرچشمہ ہماری ذات ہے،مثلاً سانس لینا،خطرے کی طرف متوجہ ہونے کے موقع پر اپنا دفاع کرنا۔اس قسم کے کام شہد کی مکھی کے چھتے اور چیونٹیوں کے گھروں کے مانند ہیں جو اپنے وجود سے باہر کے عوامل سے متاثر ہوئے بغیر حیرت انگیز کام انجام دیتی ہیں۔

عادی اور عام کام وہ ہیں جن کی کوئی فطری بنیاد نہیں ہوتی اور انسان انہیں اپنی ذات سے باہر کے عوامل سے متاثر ہو کر انجام دیتا ہے اب ہم مزید تشریح کیلئے فطری کاموں کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

۱۔حس جنسی : دو مخالف جنسوں کا ایک دوسرے کی طرف میلان امور فطری میں سے ہے جو افراد میں عمر کے مختلف حصوں میں ظاہر ہوتا ہے اور تمام صحیح وسالم اور تندرست انسان عمر کی اس فصل میں شادی کرنے اور جنسی ملاپ کی طرف مائل ہوتے ہیں جبکہ کوئی انہیں اس کام کی دعوت نہیں دیتا۔

۲۔منصب سے محبت:اور اجتماعی مرتبوں کی خواہش فطری امور میں سے ہے جس کا سرچشمہ فطرت انسانی ہے اور لوگوں پر حکومت کرنا اور فرمانروائی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی کسی کو خواہش نہ ہو یا جس کیلئے کسی وصیت تذکر یا یاد دہانی کی ضرورت ہو۔

۳۔ دولت وثروت اور مال جمع کرنے کی محبت: بھی فطری امور میں سے ہے اور انسان مال ودولت جمع کرنے سے کبھی عاجز وناتواں نہیں ہوتا گویا اس کی سرشت دنیا خواہی کے ساتھ خمیر کی گئی ہے۔ان امور کے مقابلہ میں ہم عادی امور کا ایک سلسلہ رکھتے ہیں جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں مثلاً اگر انسان کیلئے تن کا ڈھانپنا ایک فطری امر ہو لیکن لباس کی کیفیت اور وضع قطع کبھی بھی فطری امر نہیں ہوتی اسی وجہ سے لباس کی شکل وصورت مختلف اقوام میں مختلف ہوتی ہے اور اب جبکہ مختلف قوموں کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات میں اضافہ ہو رہا ہے تو دنیا کے مختلف علاقوں میں لباس کے فیشن ہر سال بدلتے رہتے ہیں اور ہمیشہ نیا فیشن پرانے فیشن کی جگہ لیتا رہتا ہے۔عورتوں اور لڑکیوں کی آرائش اور گھروں ،دکانوں اور بازاروں کی زیبائش ہر سال بدلتی رہتی ہے اور ہر قوم اپنے لیے ایک نئی طرز انتخاب کرتی ہے۔ان مثالوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو دونوں انواع کیلئے بیان ہوئی ہیں ذیل کے عوامل کے ذریعہ امور فطری اور امور عادی میں تمیز دی جا سکتی ہے۔

۱۔فطری مسائل چونکہ سرشتی ونہادای ہوتے ہیں لہٰذا وہ کلی اور عمومی ہوتے ہیں اور وہ تمام انسانوں میں موجود ہوتے ہیں۔

۲۔امور فطری ،فطرت کی رہبری سے انجام پاتے ہیں اور ان کی اصل پڑھنے پڑھانے کی محتاج نہیں ہے اگر چہ انحراف سے بچنے کیلئے صحیح تعلیم وتربیت موثر ہے۔

۳۔ ہر وہ فکر عمل جس کی اصل فطری ہو اس پر سیاسی اقتصادی اور جغرافیائی عوامل اثر انداز نہیں ہوتے اور اس کے کام کی شعاع ان عوامل سے دور ہے۔

۴۔ یہ تو ممکن ہے کہ فطرت کے خلاف پروپیگنڈے اس کی نشوونما میں کمی کر دیں لیکن وہ اس کی بیخ کنی ہرگز نہیں کر سکتے اور اس کے خلاف پروپیگنڈے کا اثر سست رہے گا لیکن امور عادی ان چیزوں میں ٹھیک فطری امور کے مدمقابل ہوتے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ جس مذہبی

اور خدا جوئی میں یہ شرائط کیسے پائی جاتی ہیں۔

۱۔خدا جوئی کی حِس ایک عالمی حِس ہے

اس حصہ کے شروع میں جو کلی تحقیق پیش کی گئی ہے اس نے (اس حس کے جہانی ہونے) سے پردہ اٹھادیا ہے اب ہم اس میں مزید اضافہ کرتے ہیں کہ آثار قدیمہ کی کھدائی میں ہمیشہ عبادت خانے ،بت اور بت کدے کشف ہوتے ہیں ایسے بت جو معبودوں کی خوبصورت شکلوں کے اعتقاد کے ترجمان ہوتے ہیں۔

فرید وجدی لکھتا ہے طبقات زمین کی کھدائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بت پرستی ،بشر کے روشن ترین اور نمایاں ترین ادراک میں سے رہی ہے گویا مبدٗ کا اعتقاد ،بشر کی پیدائش کے ساتھ ہی ظہور پذیر ہو گیا تھا[۱]

جان ایورث،کولمبیا کی دانشگاہ کا استاد مذہب کے بارے میں لکھتا ہے:

کسی بھی قوم میں کوئی بھی تہذیب وتمدن ایسا نہیں مل سکتا کہ اس تہذیب وتمدن میں مذہب کسی نہ کسی شکل میں موجود نہ ہو۔مذہب کی جڑیں تاریخ کی گہرائیوں سے لیکر زمانہ قبل از تاریخ کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی ہیں۔

۲۔خود فطرت خدا کی طرف ہدایت ورہبری کرتی ہے

تمام اندرونی احساسات کی مانند خدا جوئی کی حِس بھی کسی فرد کی تعلیم ورہبری کے بغیر انسان کے اندر بیدار ہوجاتی ہے جس طرح سے افراد انسانی عمر کے ایک خاص حصہ میں مسائل کے ایک سلسلہ مثلاً منصب ومقام مال ودولت خوبصورتی اور امور جنسی کے ساتھ لگاؤ پیدا کر لیتے ہیں اور ان کے اندر کسی کی تعلیم وتربیت کے بغیر غیر شعوری طور پر ان امور کی طرف توجہ پیدا ہوجاتی ہے اسی طرح خدا جوئی انسان میں بالغ ہوتے ہی زیادہ سے زیادہ نمایاں اور آشکار ہوجاتی ہے یہاں تک کہ تمام ماہرین نفسیات کا عقیدہ یہ ہے کہ:

تکلیفوں کے بحران اور مذہبی احساسات کی ناگہانی حرکت کے درمیان کوئی نہ کوئی ربط ہوتا ہے اس قسم کے اوقات میں ایسے لوگوں تک میں بھی جو اس سے پہلے مذہب وایمان سے مربوط مسائل میں بے قید وبند اور بے اعتنا ہوتے تھے ایک قسم کا مذہبی انقلاب نظر آتا ہے ۔(استانلی ہال) کے نظریہ کے مطابق یہ احساسات زیادہ سے زیادہ ۱۶ سال کی عمر میں پیدا ہوتے ہیں۔

اس موضوع کو جوان شخصیت کی توسیع کی ایک مختصر صورت سمجھ سکتے ہیں یہ احساسات جوان کو جو مختلف قوتوں کے زیر اثر ہوتے ہیں اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ اپنی علت اصلی کو خدا کے وجود میں تلاش کرے۔[۲]

تعلیم کے بغیر مذہب کی طرف اچانک میلان کا پیدا ہوجانا۔اس کے فطری ہونے کی ایک نشانی ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے

---

[۱] مزید وضاحت کیلئے دائرۃ المعارف ''الہ''و''وثن'' سے رجوع کریں۔

[۲] بلوغ از سری چہ میدانم ص ۱۱۸

کہ یہ حس انسان کے دوسرے احساسات کی طرف خاص حالات اور ایک خاص عمر میں پیدا ہوتی ہے لیکن ایک بات سے غافل نہیں رہنا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ اگر اس حس کی یا دیگر احساسات کی صحیح نگرانی نہ ہوئی تو ممکن ہے بلکہ حتمی صورت میں انحرافات کا ایک سلسلہ اس میں پیدا ہو جائے۔

۳۔ مذہب کا احساس جغرافیائی، اقتصادی یا سیاسی عوامل کی پیداوار نہیں ہے

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ خدا جوئی کا احساس سارے جہاں کے تمام خطوں اور تمام زمانوں میں موجود رہا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ حس ایک باطنی آواز ہے اور اس کا فطرت کے سوا اور کوئی محرک نہیں ہے کیونکہ اگر یہ جغرافیائی حالات یا دوسرے عوامل کی پیداوار ہوتی تو اسے صرف دنیا کے کسی ایک حصہ یا لوگوں کے صرف ایک طبقہ میں جو اقتصاد و سیاست کے لحاظ سے ایک جیسے حالات رکھتے ہوتے پایا جانا چاہئے تھا جبکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔

۴۔ مسلسل پروپیگنڈا اسکی نشوونما میں کمی تو کرسکتا ہے لیکن وہ اسکی بیخ کنی نہیں کرسکتا

اس میں شک نہیں کہ پروپیگنڈہ بہت سی اندرونی نہ اوس کی نشوونما اور انسانی سرشت کو کم کر دیتا ہے لیکن اس کی بیخ کنی نہیں کرسکتا۔ مثلاً اس وقت بائیں طرف کے افکار ونظریات نے دنیا کے لوگوں کی ایک تہائی پر سایہ ڈالا ہوا ہے۔ اور ایک گروہ کی کوشش ہے کہ مذہبی احساس کو ان اقوام وملل میں جو کیمونسٹ استعمار کی زنجیر میں کھنچے ہوئے ہیں نابود کر دیں اس کے باوجود اس میدان میں ان کی کامیابی نہ ہونے کے برابر ہے ابھی تک وہ عام لوگوں کے دلوں کو اس احساس سے خالی نہیں کرسکے۔

باوجود اس کے کہ اب تک جموری روس میں کیمونسٹ انقلاب کو پنیسٹھ سال گذر چکے ہیں مذہبی احساس اور مذہب خواہی اور معنویت کی طرف توجہ ابھی بھی اپنی قدرت وطاقت کو روس کے لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں محفوظ کئے ہوئے ہے اور اسی بناء پر ان آخر دنوں میں روس کے مسلمانوں اور عیسائیوں کو ادھوری قسم کی آزادی دے دی گئی ہے کہ وہ چند شرائط کے ماتحت اپنے مذہبی مراسم کو ادا کرلیا کریں۔

مذہبی احساس روح انسانی کا چوتھا بُعد

اگر قرآن مجید اور رہبران اسلام کی احادیث خدا جوئی کو ایک فطری امر کے طور پر تسلیم کرتی ہیں جو انکی خلقت اور آفرینش کے ساتھ خمیر شدہ ہے تو مغربی ماہرین، خصوصاً نفسیات کے عالم حس مذہبی کو روح انسانی کے چوتھے بعد کے طور پر تعارف کراتے ہیں۔ اگر مغرب میں نظریہ نسبیت کی پیدائش نے اجسام کے تین بعد کے مفروضہ کو درہم برہم کر دیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اجسام ابعاد ثلاثہ (طول و عرض و عمق) کے علاوہ ایک چوتھا بُعد ''زمان'' نامی رکھتے ہیں اور یہ بعد دوسرے تین ابعاد کی طرح جسم کی حقیقت کے ساتھ آمیختہ شدہ ہے اور دنیا میں کوئی بھی جسم زمان سے خالی جو حرکت و تحول کی بنیاد نہیں ہے۔

اسی طرح انسان میں حس مذہبی کے کشف ہونے کے ساتھ اور یہ کہ دینی حس روح انسانی کے ابتدائی ثابت اور طبیعی عناصر میں سے ایک ہے انسان کے روحی ابعاد ثلاثہ کا حصار بھی درہم برہم ہو گیا ہے اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ انسان روح درواں اور سرشت میں تین مشہور طبیعتوں کے علاوہ ایک اور حس بھی موجود ہے، جسکا نام ''حس مذہبی'' ہے جو اصالت کے لحاظ سے دوسری سرشتوں سے کسی طرح کم نہیں ہے اب ہم چاروں غرائز میں سے ہر ایک کا اجمالی طور پر بیان کرتے ہیں۔

ا۔ جستجو اور تحقیق کی حسِ

اور خود ان کی اپنی اصطلاح کے مطابق ''حس راستی''، لیکن چونکہ یہ تعبیر ان کے مقصود کیلئے کافی نہیں تھی لہٰذا ہم نے راستی کے لفظ کے بجائے کنجکاوی (جستجو اور تحقیق) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ وہی حس ہے جس نے پہلے دن سے ہی فکر بشر کو اہم اور نامعلوم مسائل کے بارے میں بحث و تمحیص اور تحقیق و جستجو کیلئے آمادہ کیا ہے اور اسی کی بدولت علوم وضائع ظہور میں آئے ہیں یہ وہی حس ہے جس نے گذشتہ زمانہ سے انکشافات کرنے ایجادات کرنے اور علوم کی بنیاد رکھنے والوں کو یہ قوت بخشی ہے کہ چھپے ہوئے رازوں سے پردہ اٹھائیں اور طبعیت کے کشف کرنے کی راہ میں تکلیفات اور سختیاں جھیلیں۔

۲۔ ''حس نیکی'' جس سے اخلاق کا ظہور ہوتا ہے اور جو فضائل انسانی خوبیوں اور بلند روحانی صفات کی تکیہ گاہ ہے یہ وہی حس ہے جو انسان کو دوستی اور انصاف پسندی کی طرف چلاتی ہے اور انسان میں نیک اخلاق کی طرف ایک قسم کی فطری اور ذاتی میلان اور بُری عادات وصفات سے نفرت پیدا کرتی ہے۔

۳۔ ''حس زیبائی'' حس سے ہنر کا ظہور ہوتا ہے اور جو انواع و اقسام کے ذوقیات کے ظاہر ہونے کا سبب بنتی ہے۔

۴۔ ''حس مذہبی'' افراد انسانی میں سے ہر فرد فطری طور پر خدا خواہ و خدا جو رہا ہے اور ماوراء طبعیت کی طرف ایک قسم کا میلان اور کشش رکھتا ہے جو اس کے وجود پر اور اس جہان پر جسمیں وہ زندگی بسر کرتا ہے حاکم ہے اور اس کی ہستی اور وجود اس کی ہستی اور وجود کی ہے اور وہی اس کی

مشکلات اور بد بختیوں کو برطرف کرسکتا ہے۔[1]

اس حس نے علمی محفلوں میں قابل توجہ انقلاب برپا کر دیا ہے اس حس کے انکشاف نے بیسویں صدی کے مادئین کے غرور کو اس حد تک خاک میں ملا دیا ہے کہ اگر کسی زمانے میں علمی محفلوں میں ماوراء حس کے انکار کو علم و تحقیق کی نشانی سمجھا جاتا تھا تو اس کے بعد اب جمود و تعصب کی نشانی سمجھا جانے لگا ہے۔

اگر کسی زمانہ میں مذہب کے بارے میں (مذہب قوموں کے لئے افیون ہے) لینن کی گفتگو، ایک گروہ کی نظر میں ایک خلل ناپذیر اصل شمار ہوتی تھی اور سادہ لوح عوام یہ خیال کرتے تھے کہ اس نے ایک چھپے ہوئے راز کو کشف کیا ہے، تو انسان کی سرشت میں ''حس مذہبی'' کے ثبوت کے بعد خدا اور مذہب کے بارے میں اس کا نظریہ ایک افسانہ بن گیا ہے۔

روح انسانی میں چوتھے بُعد کا ثبوت ثابت کرتا ہے کہ انسان میں تمام تمائلات مذہبی کی ایک ذاتی جز موجود ہے اور انسان کی زندگی کے تمام ادوار میں یہاں تک کہ ان علاقوں میں بھی جہاں ''مالک و رعیت'' اور ''کارفرما و کاریگر'' کا مسئلہ درپیش نہیں تھا، حس مذہبی ایک خاص جلوہ رکھتی تھی اور ان علاقوں کے لوگوں کو ماوراء حس مسائل اور خدا کی طرف لے جاتی تھی اور جن ادوار میں انسان پہاڑوں کے غاروں میں اور جنگلوں میں زندگی بسر کرتا ہے ان میں بھی مذہبی حس اپنا جلوہ دکھا رہی تھی۔

گویا ماوراء طبعیت مسائل اور خدا کی طرف توجہ ایک قسم کی ندائے غیبی ہے حس کا سرچشمہ فطرت انسانی ہے اور اس فطرت کی تجلیات بلوغ کے زمانہ میں زیادہ نمایاں اور زیادہ آشکار ہوتے ہیں۔

مارکسزم مذہب کے قالب میں

مادئین مذہب سے مبارزہ کی راہ میں جو پروپیگنڈے کر رہے ہیں اور مذہب کو فکری اور اجتماعی اصلاح کے سلسلے میں جمود و پسماندگی کا ایک ذریعہ اور انسانی آزادی سے مزاحم سمجھتے ہیں اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ مذہبی خیالات و تصورات کو انسانی دماغ سے باہر نکال پھینکیں اس کے باوجود مارکسزم کے اصولوں اور اس کے بانیوں کے بارے میں ان کی روش و رفتار بعینہ ویسی ہے جیسی کہ مذہبی افراد کی آسمانی کتابوں اور ان کے لانے والوں کے ساتھ روش و رفتار ہے۔

وہ مارکسزم کے اصولوں کو سو فیصد صحیح ہر قسم کی غلطی واشتباہ سے پاک قطعی و یقینی اور خلل ناپذیر سمجھتے ہیں یعنی وہی طرز فکر جو خدا شناس وحی اور انبیاء کی تعلیمات کے بارے میں رکھتے ہیں وہ وہی طرز فکر مارکس، انگلس، لینن کی تالیفات کے بارے میں رکھتے ہیں۔

وہ ہر قسم کی تجدید نظر کرنے کو حرام اور تجدید نظر کرنے والے گروہ کو مرتد جزبی خیال کرتے ہیں بالکل خدا شناس لوگوں کی مانند

---

[1] حس مذہبی ترجمہ مہندس بیانی ص ۸۰ سے بعد

ہیں جو انبیاء کی تعلیمات سے انحراف اور انکی تعلیمات کی کچھ ضروریات سے انکار کو ارتداد کا سبب جانتے ہوئے انکا کرنے والے کو مذہبی مرتد اور اس کے خون کو حلال سمجھتے ہیں۔

افکار مارکسنرم کے بانیوں کا ان کے پیروکار جو احترام کرتے ہیں وہ بالکل اسی احترام سے مشابہ ہے جو خدائی ادیان کے پیروکار اپنے عالیقدر پیغمبروں کا کرتے ہیں۔

وہ تفاوت جو انکے اور مذہبی گروہ کے درمیان ہے وہ یہ ہے ان کے سیاسی رہبروں کا وقتی طور پر احترام کیا جاتا ہے جب تک وہ صاحب اختیار ہوتے ہیں تو ان کا آسمانی فرشتہ، استعمار واستبداد کی زنجیروں کو توڑنے کے طور پر اور دکھی اور زحمت کش عوام کو پناگاہ کے طور پر تعارف ہوتا ہے لیکن جب وہ حکومت اور اپنے کام سے ہٹ جاتے ہیں ''یا موت انہیں آلیتی ہے اور وہ زمین میں دفن ہوجاتے ہیں تو پھر اس کا ایک رجعت پسند، ضد انسانیت، ضدِ عوام خونریز وآدم کش رہبر جس نے مارکسنرم کے اصول کو پایوں تلے رونڈ ڈالا اور جس نے انسان ورنہ اور عوامی افکار کا احترام نہ کیا کے طور پر تعارف ہوتا ہے۔ اور ہم نے اپنی زندگی میں ''اسٹالن'' کے بارے میں یہ دونوں متضاد تعارف مشاہدہ کئے ہیں جو ایک دن تو فرشتہ اور دوسرے وقت سفاک اور خونریزی کرنے والا متعارف ہوا۔ اور اس کی موت کے بعد اس کے مجسمے میدانوں سے ہٹا دیئے گئے اور ان چین میں بھی ''ماؤ'' کی مخالفت شروع ہوگئی ہے اور زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ وہ بھی ''اسٹالین'' کی سرنوشت سے دوچار ہوگا۔[1]

ایک ماہر نفسیات کی نظر میں مارکسنرم کے اصول اور اس کے بانیوں مثلاً مارکس، انگلس وغیرہ...... کے ساتھ اس قسم کی رفتا وسلوک، مفاہیم مقدسہ کے ایک سلسلہ کے فطری ہونے پر گواہ ہے مثلاً ابدیت وجاودانی کے سو فیصد جاوداں اور خلل ناپذیر ہونے پر جسے مارکسسٹ غلط طور پر بے محل استعمال کرتے ہیں بجائے اس کے کہ وحی الٰہی کو جاود اور خلل ناپذیر سمجھیں اور اس سے انحراف کو ارتداد خیال کریں ، مارکسنر کے اصول کو جاودانی اور خلل ناپذیر سمجھتے ہیں۔

مارکسسٹوں میں تجدید نظر کا مطالبہ اتنا عارونگ اور شرمناک ہے کہ ڈاکٹر انور خامہ ای کتاب ''تجدید نظر طلبی از'' مارکس تاماؤ'' کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے مارکسسٹی اور لینینسٹی وجدان کی تمام قوتوں کے ساتھ ''تجدید نظر طلبی'' کا شرمناک لیبل اپنے دشمن سے بدتر دوسرے کے اوپر چسپاں کر دیتا ہے اور اپنی نوبت پر یہی لیبل اسی شدت اور انقلابی حدت کے ساتھ اس کی جانب سے خود حاصل کر لیتا ہے۔

روس کا سیاسی تمدن ہمیں یہ بتا تا ہے کہ تجدید نظر کا مطالبہ، مزدور انقلاب کا ایک ایسا میلان ہے جو سرمایہ داری نفع کیلئے کوشش کرتا ہے تا کہ مارکسنرم کی قدر و قیمت اور اثر کو تجدید نظر کے ذریعہ نیست و نابود کر ڈالتے۔ یہاں تک کہ لینن خود اپنی ایک تحریر میں نظر طلبی کو نیا پرچم لہرانے

---

[1] کتاب کے اس حصہ کا تعلق تالیف کتاب کی تاریخ یعنی ۱۳۵۷ شمسی کے ساتھ ہے اس وقت جبکہ یہ اوراق چھپنے کیلئے جارہے ہیں حالات اتنے بدتر ہوچکے ہیں کہ ''ماؤ'' کی بیوہ گرفتار کر لی گئی ہے اور اس کے پر مقدمہ چلایا جارہا ہے۔

سے تعبیر کرتا ہے۔

اگر چہ خود لینن نے کئی نئے پرچم لہرائے تھے اور اپنے زمانے میں رائج بہت سے مارکسسٹی مفاہیم میں کئی نظریاتی تبدیلیاں کی تھیں۔ لیکن تجدید نظر کے مطالبہ کی تہمت سے وحشت خود مارکسسٹ گروہ میں ایک قسم کی روح قداست وابدیت کے وجود کی ایک نشانی ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اسے وہ اس کے واقع محل کو چھوڑ کر استعمال کرتے ہیں۔ اصولی طور پر مارکسسٹوں کی منطق میں معاشر کے درمیان عدالت اجتماعی کو وسعت دینے اور آزادی بشر کی راہ میں ''فداکاری'' اور ''جانبازی'' کا لفظ بہت زیادہ نظر آتا ہے حالانکہ اس قسم کے مفاہیم مارکسزم کے اصول کے ساتھ جو ہستی کو مادہ میں منحصر سمجھتے ہیں اور اس کے ماوراء کسی اصالت کے قائل نہیں ہیں۔ سازگار نہیں ہیں کیونکہ اس معاشرے کے لئے کوشش کرنا جس میں خود کوشش کرنے والا موجود نہیں رہے گا ایک امر معنوی کیلئے کوشش کرنے کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی

دین کے فطری ہونے کے بارے میں ایک دوسرا نظریہ

بعض اوقات خداشناسی کے مسئلہ کے فطری ہونے کے بارے میں ایک اور نظریہ پیش کیا جاتا ہے جس کی اس طرح سے وضاحت کی جاسکتی ہے۔

ہر انسان کی فطرت اور سرشت میں کمال مطلق اور خیر مطلق کا عشق موجود ہے اور انسان مسلسل اس کی طرف کھینچتا رہتا ہے۔ اگر وہ اپنے اندر علم و دانش یا اخلاق اور نیک عادت یا ہنر اور زیبائی سے لگاؤ کو محسوس کرتا ہے تو یہ جذبہ اور کشش کمال مطلق سے عشق کی ایک شاخ اور اس کا ہی جلوہ اور ایک پرتو ہے۔

اس قسم کے عشق کے وجود کا واضح ترین گواہ یہ ہے کہ کوئی بھی مادی کمال انسان کی پیاس کو نہیں بجھاتا ایک پرقدرت انسان چاہے جس منصب اور مقام تک پہنچ جائے پھر بھی وہ یہی کوشش کرتا ہے کہ خود کو اس سے بالاتر اور برتر مقام تک پہنچائے جس وقت وہ اس کو بھی حاصل کر لیتا ہے تو پھر کمالات کی کسی دوسرے چوٹی کو سر کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے اور اسی طرح .... جتنا وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اس کی پیاس بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور خود کو اپنے گمشدہ مقصد سے نزدیک پاتا ہے۔ یہ سب اس بات کی نشانی ہیں کہ اس کی کوئی چیز گم ہے اور شروع شروع میں وہ یہ خیال کرتا ہے کہ مادی کمالات جو شرور کی آمیزش رکھتے ہیں اس کی پیاس کو بجھا سکتے ہیں لیکن وہ جتنا آگے کو قدم بڑھاتا ہے اس کے برخلاف مشاہدہ کرتا ہے۔ کمال مطلق سے عشق، اس قسم کے کمال کی نشانی ہے اور یہ کہ ان دونوں (انسان وکمال) کے درمیان ایک رابطہ قائم اور برقرار ہے۔

اس کمال کے ظہور کیلئے تفکر ومراقبت، سیر وسلوک اور ریاضیت وتمرین کی ضرورت ہے جو انسان کی ضمیر میں چھپی ہوئی آگ کو زیادہ سے زیادہ شعلہ ور کر کے سالک انسان میں حال اور جوش پیدا کر دے اور اس کو جو آغاز میں خداجو ہے خدایابی میں تبدیل کر دے اور اس کی خداجوئی مرحلہ شہود پر پہنچ جائے اور ایسا یقینی پیدا ہو کہ اس میں شک کا نفوذ محال وممتنع ہو جائے۔ یہ شہود اور رویت ظاہری آنکھوں کے سامنے نہیں

ہوتی بلکہ دل کی نگاہ سے ہوتی ہے جس کی طرف امیر المومنین علیہ السلام کے ارشادات میں اشارہ ہوا ہے جہاں آپ فرماتے ہیں:

لم یدرکه العیون بمشاهدة العیان بل تدرکه القلوب بحقایق الایمان [1]

وہ یقین جو عارف و سالک کو خدا یائی کے سلسلہ میں حاصل ہوا ہے وہ اس یقین سے بالاتر ہے جو حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے وہ ایک ایسی روشنی ہے جس میں تاریکی کا نام نہیں ہے اور ایسا یقین ہے جو ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک ہے۔

اب اس قسم کے کمال یقین مطلق اور شہود خارجی تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہے؟ قرآن ایک آیت میں اس طریقہ کی طرف ایک طرح کا اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝۹۸ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝۹۹

''اپنے پروردگار کی تسبیح کر اور سجدہ گزاروں میں سے ہو جا اور اپنے رب کی عبادت کر تا کہ یقین تجھ تک آ پہنچے۔ (حجر ۹۸-۹۹)

اس آیت میں تسبیح وحمد اور عبادت و ریاضت کو یقین تک پہنچنے کی ایک راہ بتائی گئی ہے یہ یقین اس یقین سے الگ ہے جو تمام حمد ہے جو تمام حمد وثنا کرنے والوں کو خدا کی عبادت و پرستش کی حالت میں ہوتا ہے یہ وہی حالت شہود اور محسوسات کے آمنے سامنے ہونے سے پیدا ہونے والے یقین کی مانند ہے جو طاقت وقوت کے لحاظ سے ہر قسم کے شک وشبہ کے نفوذ سے پاک ہے۔ اس قسم کی راہ کو طے کرنا سب لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ اس کو طے کرنے کیلئے ایسے آمادگیوں کی ضرورت ہے جو صرف ایک مخصوص گروہ میں ہی پائی جاتی ہیں۔

---

[1] ۔ نہج البلاغہ عبدہ خطبہ ۱۷۵

احادیث میں حسِ مذہبی کا بیان

اس اہمیت کی بناء پر جو حس مذہبی انسانی علوم میں رکھتی ہے ہم پیغمبر گرامی اوران کے سچے جانشینوں سے واردشدہ چند احادیث یہاں پر بیان کرتے ہیں۔

ا۔(صحیح بخاری میں آیہ فطرت اللہ کی تفسیر میں) ذیل کی حدیث نقل ہوئی ہے۔

مامن مولودا لایولد علی الفطرة ثم ابواه یهودانه اوینصرانه اویمجسانه.........ثم یقول "فطرت الله التی فطر الناس علیها......... [۱]

''ہر پیدا ہونے والا پیدا نہیں ہوتا مگر فطرت (توحید واسلام) پر، اس کے بعد اس کے ماں باپ اس کو یہودی، عیسائی اور مجوسی بنا لیتے ہیں (اور جادہ توحید سے ہٹا دیتے ہیں) اس کے بعد پیغمبر نے آیہ فطرت کی تلاوت فرمائی۔''

ان احادیث میں جو خاندان رسالت سے آیہ فطرت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں۔تقریباً ۱۵ احادیث ''فطرت'' کی توحید کے ساتھ تفسیر کرتی ہیں اور یہ بتلاتی ہیں کہ خدا اور اسکی صفت یکتائی کا اعتقاد ایک فطری امر ہے۔[۲]

اور چند ایک احادیث میں لفظ فطرت جو آیہ میں ہے''اسلام''اور''معرفت خدا'' سے جو درحقیقت گذشتہ تفسیر کی طرف ہی لوٹتے ہیں ـتفسیر ہوئی ہے۔[۳]

اب ہم یہاں پر چند روایات پیش کرتے ہیں۔

۲۔ہشام بن سالم نے حضرت صادق علیہ السلام سے''فطرت اللہ'' کا معنی پوچھا تو امامؑ نے فرمایا:

فطرهم علی التوحید

انسانوں کو توحید کی خصوصیت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

۳۔زرارہ نے اسی آیت کے معنی کے بارے میں سوال کیا تو امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

---

[۱] ـالتاج الجامع للاصول جلد۴ ص۸۱،ت،تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۶۲ حدیث ۵۔

[۲] ـتفسیر برہان ج۳ص ۶۲۰، ۲۶۳ـتوحید صدوق۔ص ۳۲۸ـ ۳۳۱ـاصول کافی ج۱ص ۸۵ـ ۱۶۳ـ۱۶۵ سے رجوع کریں۔

[۳] ـتفسیر برہان ج۳ص ۶۲۰، ۲۶۳ـتوحید صدوق۔ص ۳۲۸ـ ۳۳۱ـاصول کافی ج۱ص ۸۵ـ ۱۶۳ـ۱۶۵ سے رجوع کریں۔

فطرھم علی المعرفة

انسان کی خلقت کو معرفت خدا کے ساتھ خمیر کیا ہے۔

۴۔محمد بن حلیم نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا: خدا شناسی انسان کے اندر کس کی ساختہ پرداختہ ہے امامؑ نے فرمایا:

من صنع اللہ لیس للعباد فیھا صنع

یہ کام خدا کی خلقت کے ساتھ مربوط ہے، بندوں کا اس بارے میں کوئی دخل نہیں۔

۵۔ایک شخص نے امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا: آپ نے خدا کو کیسے پہچانا؟ آپؑ نے فرمایا:

بما اعرفنی نفسه

اسی وسیلہ کے ساتھ جس سے اس نے اپنے آپ کو مجھے پہنچوایا ہے۔

۶۔ابو بصیر نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا خدا کی معرفت ایک اکتسابی چیز ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ''نہیں! راوی نے پوچھا تو پھر کیا یہ خدا کا کام اور اس کا فیض ہے؟ امامؑ نے فرمایا:

نعم ولیس للعباد فیھا صنع

ہاں! اور خدا کے بندوں کا اس شناخت میں کوئی دخل نہیں ہے۔

۷۔امیر المومنین علیہ السلام ''نہج البلاغہ'' کے پہلے خطبہ میں خدا کے پیغمبروں کو یاد آوری کرانے والے سمجھتے ہیں جنہیں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ جو کچھ ہمارے وجود کے اندر چھپا ہوا ہے اسے بیدار کریں جیسا کہ آپؑ فرماتے ہیں:

فبعث اللہ فیھم رسله وواتر الیھم انبیائه لیستأدوھم میثاق فطرته ویذکرھم منسی نعمته ویحتجوا علیھم بالتبلیغ ویثیروا لھم دفائن العقول [1]

''خدا نے لوگوں میں ایسے پیغمبر مبعوث کئے اور پے در پے بھیجے جو نوع بشر کو پیمان فطرت ادا کرنے پر آمادہ کریں اور خدا کی فراموش شدہ نعمتیں یاد دلائیں اور اپنی تبلیغ کے ذریعہ ان پر حجت تمام کریں، اور ان کی عقلوں میں چھپے ہوئے حقائق کو ابھاریں۔

[1]۔نہج البلاغہ عبدہ طمصر ج ا خطبہ ا

امیرالمومنینؑ کے ارشادات کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آیہ فذ کر انما انت مذ کر (عاشیہ۔۲۱) سے مقصود یہ ہے کہ جو کچھ بشر کی سرشت میں موجود ہے پیغمبر انہیں یاد دلائیں یا کم سے کم یہ معنی، اس آیت کے ابعاد میں سے ایک ہے۔

۸۔ایک شخص نے امام صادق علیہ السلام سے عرض کیا: مجھے خدا کی طرف راہنمائی کیجئے، کیونکہ مناظرہ کرنے والوں کی باتون نے مجھے حیران کررکھا ہے امامؑ نے اس سے فرمایا:

کیا تونے آج تک کبھی سمندر میں سفر کیا ہے اور کشتی میں بیٹھا ہے؟ اس نے کہا کیوں نہیں؟ فرمایا کیا کبھی ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ کشتی ٹوٹ گئی ہو اور وہاں نہ تو کوئی کشتی ہو جو تجھے نجات دے اور نہ ہی تو تیرانا جانتا ہو، اس نے کہا کیوں نہیں اے فرزند رسول اس قسم کا اتفاق ہوا ہے فرمایا کیا اس موقع پر تیرے دماغ میں یہ بات آئی کہ کوئی چیز ایسی ہے جو تجھے اس مہلکہ سے نجات بخشے اس نے کہا کیوں نہیں فرمایا وہ وہی خدائے توانا ہے کہ جہاں تمام مادی وسائل بیکار ہو جائیں اور نجات بخش اور دادرس کوئی نہ ہو تو وہ تجھے نجات دے سکتا ہے اور تیری فریاد کو پہنچ سکتا ہے۔[1]

[1] ۔بحارالانوار ج ۳ ص ۴۱ مطابق نقل معانی الاخبار شیخ صدوق

دُوسرا حصہ

پیمان ''الست'' یا ''عالم ذر'' سے کیا مراد ہے؟

۱۔''ذریت'' سے کیا مراد ہے؟

۲۔آدم کی صلب سے لیا یا اولاد آدم کی صلب سے

۳۔عالم ذر کے بارے میں مشہور نظریہ جسکی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے۔

۴۔اس نظریہ کی نارسائی۔

۵۔آیت کی تفسیر کے بارے میں دوسرا نظریہ جو توحید فطری پر منطبق ہے۔

۶۔تیسرا نظریہ علامہ طباطبائی کا نظریہ اور اس کی وضاحت۔

۷۔اس بارے میں سوالات۔

۸۔چوتھا نظریہ سید مرتضیٰ کا نظریہ آیت کی تفسیر میں۔

۹۔مرور زمانہ آیت کے مفاد کو منکشف کرے گا۔

۱۰۔ان احادیث پر غور اور تحقیق جو پہلے نظریہ پر دلالت کرتی ہیں۔

عالم ذر

یا پیمان ''الست'' کیا ہے؟

اس سے پہلے کہ ہم اس عالم کی حقیقت اور اس عہد و پیمان کی واقعیت کے بارے میں اظہار نظر کریں ہر قسم کی پہلے سے کی گئی تقلید اور پہلے سے کئے ہوئے فیصلہ سے پرہیز کرنے کیلئے اس موضوع سے مربوط آیات کو ان کے متن اور ترجمہ کے ساتھ ذکر کر دیں تا کہ خود پڑھنے والا آیت کے مفاد کے سلسلے میں غور و فکر کرے اس عہد و پیمان سے مربوط آیات یہ ہے۔

وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤى اَنۡفُسِهِمۡ‌ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ‌ ؕ قَالُوۡا بَلٰى‌ ۛۚ شَهِدۡنَا‌ ۛۚ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِيۡنَ ۙ﴿۱۷۲﴾ (اعراف)

''اس وقت کو یاد کرو جب تیرے پروردگار نے اولاد آدم کی صلب سے ان کی ذریت اور نسل کو نکالا اور انہیں اپنے نفسوں پر گواہ بنایا اور کہا کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا ہاں! (ہے ہم نے یہ عہد و پیمان لیا) تا کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم اس بات سے غافل تھے۔''

اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنۡۢ بَعۡدِهِمۡ‌ ۚ اَفَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ‏ ﴿۱۷۳﴾ (اعراف)

''اس قسم کا عہد و پیمان ہم نے اس لئے لیا کہ کہیں تم یہ نہ کہنے لگ جاؤ کہ ہمارے آباؤ اجداد نے پہلے سے شرک کیا تھا (اور وہ بت پرست تھے) اور ہم انکی اولاد تھے کیا تو ہمیں باطل پرستوں کے کاموں کی بناء پر ہلاک کر کے سزا دیتا ہے۔''

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ‏ ﴿۱۷۴﴾ [1]

---

[1] ۔اعراف۔ ۱۷۲ تا ۱۷۴

''اور ہم آیات کو اسی طرح کھول کھول کر بیان کرتے ہیں اور شاید وہ شرک کی راہ سے توحید و یکتا پرستی کی راہ کی طرف پلٹ آئیں۔''

قابل توجہ نکات

۱۔ذریت کا لفظ قرآن میں انیس بار آیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد نسل انسانی ہے اس بارے میں کہ یہ لفظ کس اصل سے لیا گیا ہے۔ اختلاف ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں: ذریۃ''لفظ''ذراء'' بہ معنی ''خلق''(خلق کیا) سے لیا گیا ہے اس صورت میں ''ذریۃ'' مخلوق اور پیدا شدہ کے معنی میں ہوگا۔

دوسرا گروہ کہتا ہے: یہ لفظ ''ذر'' کے مادہ سے لیا گیا ہے، جو باریک موجودات کے معنی میں ہے، جیسے کہ غبار کے ذرات اور چیونٹیاں

کچھ لوگ اس کو''ذرو'' یا ''ذرہ'' سے لیتے ہیں جو تفرق و پراگندگی کے معنی میں ہے اور اگر اولاد آدم کو ذریت کہتے ہیں تو ان کے روئے زمین میں پراگندہ ہونے کی بناء پر ہے۔[1]

۲۔لفظ ذریۃ عام طور پر کم سن انسانوں کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ (بقرہ۔۲۶۶) اس کی کم سن اور کم عمر اولاد ہے اور بعض اوقات مطلق نسل کے بارے میں استعمال ہوتا ہے مثلاً ومن ذریۃ داود وسلیمان (انعام۔۸۴) ابراہیم کی ذریت میں سے داؤد و سلیمان وغیرہ۔اسی طرح یہ لفظ کبھی ایک فرد کے بارے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

مثلاً هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ (آل عمران۔۳۸) ذکریا نے کہا: مجھے پاکیزہ بیٹا عطا فرما[2] اور کبھی جمع کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً: و کنا ذریہ من بعدھم (اعراف۔۱۷۳) اور ہم ان کے بعد ان کی اولاد تھے۔

۳۔آیت کی عبارت میں زیادہ سے زیادہ غور کرنا چاہئے اس آیت کے معنی کے بارے میں عام طور پر مشہور یہ ہے کہ خدا نے اولاد آدم کو حضرت آدم کی صلب سے باہر نکالا اور انہیں اپنی توحید و یگانگی پر گواہ بنایا جب کہ آیت کا ظاہری معنی ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اولاد آدم کی پشت سے انکی ذریت اور نسل کو نکالا، (نہ کہ خود آدم کی پشت سے) جس پر یہ آیت گواہ ہے۔ واذاخذ ربك من بنی اٰدم اور وہ ہرگز یہ نہیں کہتا۔ واذاخذ ربك من اٰدم اس بناء پر آیت کا مفاد وہ نہیں ہوگا جو مفسرین کے درمیان مشہور ہے۔

۴۔آیت صراحت کے ساتھ یہ کہتی ہے کہ خدا نے ہمیں اپنے نفس پر گواہ بنایا اور ہم سب نے یہ اعتراف کیا کہ وہ ہمارا پروردگار ہے جیسا کہ

---

[1] ۔مفردات راغب مادہ''ذرو'' مجمع البیان ج ا ص ۱۹۹ آیہ قال ومن ذریتی (بقر ۱۲۴)

[2] ایک اور آیت میں اس موضوع میں ذریۃ کی جگہ لفظ (ولیا) استعمال ہوا ہے مثلاً فھب لی من لدنك ولیًّا یرثنی ویرث من اٰل یعقوب (مریم ۵۔۶) اپنی طرف سے ایسا ولی دے جو میرا اور آل یعقوب کا وارث ہو۔

فرماتا ہے: **واشهدهم علیٰ انفسهم**

جبکہ یہ شہادت اور اعتراف باطل پرستوں اور شرک کرنے والوں پر قیامت کے دن عذر کے دروازوں کو بند کردے گا اور انہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہوگا کہ ہم تو اس اعتراف سے بے خبر تھے۔ (بگواہی آیہ۔ ۱۷۳ از یر بحث)

یہ وہ مقام ہے جہاں آیت کا مفہوم اپنے لئے ایک خاص شکل اختیار کر لیتا ہے ایک طرف تو اس گواہی لینے کی کوئی یاد اور جہان میں ہماری روح ورواں میں موجود نہیں ہے اور دوسری طرف ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ہم اس وقت کے عہد و پیمان سے غافل و بے خبر تھے جیسا کہ فرماتا ہے:

ان تقولوا یوم القیامة انا کنا عن هذا غافلین

کہیں قیامت کے دن تم یہ نہ کہنے لگ جاؤ کہ ہم تو اس قسم کے عہد و پیمان سے بے خبر تھے۔

اس صورت میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ کیسا عہد و پیمان ہے کہ جس سے آگاہ نہ ہونے کے باوجود ہم پر عذر کے دروازوں کو بند کر رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس میں شک نہیں کہ ہم اس قسم کے عہد و پیمان سے علم حصولی کی صورت میں (روائدادِ پیمان کی دل میں یاد آوری) غافل ہیں جبکہ وہ زیر بحث آیت میں دوٹوک طریقہ سے کہہ رہا ہے کہ تمہیں یہ حق نہیں ہے کہ یہ کہنے لگو کہ ہم تو اس قسم کے عہد و پیمان سے غافل تھے یہ غفلت اور اس عہد و پیمان کا یاد نہ ہونا اس حکم الہی کے:

ان تقولوا یوم القیامة انا کنا عن هذا غافلین

کے ساتھ کیسے جمع ہو سکتا ہے؟

۵۔اس میں شک نہیں کہ یہ آیت یا تو پیغمبر سے خطاب ہے یا تمام انسانون سے اور اگر آیت کے آغاز میں پیغمبر کو ہی خطاب ہو تو بھی اس کے ذیل کو میں (ان تقولوا.................. تم کہو) تمام لوگوں سے خطاب ہے۔

قرآن اس خطاب کے ذریعہ ہمیں اس واقعہ کی طرف جو خطاب سے پہلے انجام پا چکا ہے متوجہ کرنا چاہتا ہے نہ کہ اس وقعہ کی طرف جو خطاب کے موقع پر انجام پا رہا ہے یا جو اس کے بعد انجام پائے گا اور اس کا گواہ یہ ہے کہ لفظ ''اذ'' آیت کے شروع میں آیا ہے اور اس قسم کا جملہ ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے جبکہ واقعہ کا ظرف گزر چکا ہو۔

اس عہد و پیمان کے بارے میں علماء کے نظریات

یہ آیت اس سے زیادہ نہیں بتائی کہ اولاد آدم سے خدا کی ربوبیت پر عہد و پیمان لیا گیا ہے لیکن اس بارے میں کہ یہ پیمان کس طرح اور کس زمانے میں لیا گیا کوئی وضاحت نہیں کرتی، اس بناء پر مفسرین اسلامی اس عہد و پیمان کے بارے میں اختلاف نظر رکھتے ہیں۔

١۔ وہ نظریہ جس کی بنیاد احادیث پر ہے

وہ مشہور نظریہ جس ے حدیثی تائید حاصل ہے یہ ہے کہ خداوند عالم نے آدم کی خلقت کے وقت اس کی آئندہ ہونے والی ساری اولاد کو باریک موجودات کی صورت میں باہر نکالا اور ان سے کہا: الست بربکم کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں انہوں نے کہا: بلیٰ ہاں! کیوں نہیں اس کے بعد سب کو آدم کی پشت میں لوٹا دیا۔ اور وہ خطاب الٰہی کے وقت کافی عقل وشعور رکھتے تھے۔ انہوں نے خدا کی بات کو سنا اور اس کے سوال کا جواب دیا اور یہ عہد و پیمان اس بناء پر ان سے لیا گیا تا کہ قیامت کے دن عذر کے دروازوں کو بند کر دے۔[1]

اس نظریہ کی خامیاں

١۔ اس نظر کی خامی کا واضح ترین ثبوت یہ ہے کہ یہ آیت کے ظاہری مدلول کے ساتھ موافق نہیں ہے، کیونکہ جیسا کہ ہم نے تیسرے نکتہ میں بیان کیا ہے آیت کا ظاہر یہ ہے کہ ہم نے آدم کی تمام اولاد کو پشت سے ان کی ذریت کا نکالا، نہ کہ صرف آدم کی پشت سے، اور اسی بناء پر کہتا ہے: من بنی ادم ''(آدم کی اولاد سے) نہ کہ آدم سے، اس لئے ضمیریں جمع کی لاتا ہے اور کہتا ہے: من ظهورهم (اولاد کی پشت سے) ذریتهم (ان کی اولاد و نسل)۔ اس بنا پر یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے خود آیت کے ساتھ مطابق نہیں ہے۔

٢۔ اگر یہ عہد و پیمان (مکمل آگاہی) کی صورت مین لیا گیا ہے، تو پھر اب اس وقت، کسی بھی شخص کو، اس عہد و پیمان کی خبر کیوں نہیں ہے، اس نظریہ کے کچھ طرفدار، اس اعتراض کو رفع کرنے کیلئے جو ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: وہ چیز جو بھول گئی ہے وہ میثاق و پیمان کا وقت ہے، نہ کہ خود پیمان اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کا اثر، جو خداشناسی کی طرف کشش و میلان ہے وہ ہماری روح میں باقی ہے، یہ بات کچھ زیادہ جالب نظر نہیں آتی۔ کیونکہ یہ ہرگز معلوم نہیں ہے، کہ ہماری روح میں خداشناسی کی جو حس موجود ہے، وہ اس قسم کی عہد و پیمان سے مربوط ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ یہ امر خداشناسی کے فطری ہونے کے ساتھ مربوط ہو۔

یہ تصور کہ زمانہ کا گذرنا، اس فراموشی کا سبب ہوا ہے، صحیح نظر نہیں آتا، کیونکہ اس مدت کا طول انسان کی قیامت کے ساتھ فاصلہ سے کئی مراتب کم ہے اور قیامت کے دن اس جہان کے واقعات ان کے دلوں میں محو نہیں ہوں گے۔ اور جنت والے دوزخ والوں سے کہیں گے

---

[1] ۔ مجمع البیان ج ٣ ص ٤٩٧ طصیداد۔ تفسیر فخر رازی ج ٤ ص ١٢٠ ط ١٣٠٨ مصر

: اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ (اعراف۔۴۴) ہم نے تو جو کچھ ہمارے پروردگار نے ہم سے وعدہ کیا تھا اسے حق پایا ہے۔ کیا تم نے بھی جو کچھ تمہارے پروردگار نے تم سے وعدہ کیا تھا اسے حق پایا ہے۔ تو وہ کہیں گے۔ ہاں!

۳۔ اصولی طور پر عہد و پیمان لینے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس کے مطابق عمل کریں اور اس پر عمل کرنا اس کے یاد رہنے کی فرع ہے اگر کسی کو یہ پیمان بالکل یاد ہی نہ رہے تو خدا بھول جانے والے لوگوں پر حجت کیسے تمام کرے گا۔ اور انہیں ان کے اعمال کی سزا کیسے دے گا۔[1]

۴۔ اس قسم کی تفسیر ایک طرح سے تناسخ کی طرف جھکاؤ ہے جس کا باطل اور بے بنیاد ہونا ضروریات دین اسلام سے ہے۔ کیونکہ اس طرح تو تمام انسان ایک مرتبہ اس جہاں میں قدم رکھ چکے ہیں اور ایک مختصر سی زندگی کے بعد اس جہان سے رخصت ہو گئے ہیں اور پھر دوبارہ تدریجی طور پر اس جہان کی طرف لوٹے ہیں۔ یہ وہی تناسخ ہے جسے محققین اسلام نے رد کیا ہے۔ اس مقام پر ایک سوال کا جواب باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر اس قسم کی تفسیر کو اس قسم کی خامیوں کا سامنا ہو تو پھر ان روایات کا کیا بنے گا، جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں؟ ہم اس سوال کا جواب اس بحث کے آخر میں دیں گے۔[2]

دوسرا نظریہ

مفسرین کا ایک گروہ جن کے راس و رئیس "رمانی" اور "ابو مسلم" اور کچھ دوسرے حضرات ہیں انہوں نے اس آیت کو توحید فطری پر حمل کیا ہے اور اس کی اس طرح سے تفسیر کی ہے:

وہ کہتے ہیں: انسان خواہشات و استعدادات کے ایک سلسلہ، اور طبیعی و فطری تقاضوں اور ضرورتوں کے ساتھ اس دنیا میں آتا ہے، انسان تولد اور باپ کے صلب سے نکلنے اور ماں کے رحم میں داخل ہونے اور انعقاد نطفہ کے وقت ایک ذرہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔

لیکن اس ذرہ میں فراواں استعدادیں اور قابل توجہ لیاقتیں موجود ہوتی ہیں۔ ان ہی میں سے ایک خدا شناسی کی استعداد بھی ہے۔ اور اس ذرہ کے تکامل اور ارتقاء کے ساتھ، شکم مادر سے باہر، اس کی تمام استعدادیں پھل پھول کر مرحلہ کمال اور فطیت تک پہنچ جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں: انسان کی سرشت میں خدا شناسی کی فطرت اور ماوراء طبیعت کی طرف توجہ ایک سر الٰہی اور خدائی راز کی صورت میں

---

[1]۔ وہ آیات جو اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ انسان کو قیامت کے دن جہان کے واقعات یاد رہیں گے۔ وہ متن میں بیان کردہ آیت میں ہی منحصر نہیں ہے بلکہ اور دوسری آیات بھی اس مطلب پر گواہ ہیں۔ مثلاً: قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ اِنِّیۡ كَانَ لِیۡ قَرِیۡنٌ ﴿۵۱﴾ یَّقُوۡلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الۡمُصَدِّقِیۡنَ ﴿۵۲﴾ (صافات۔۵۱۔۵۲) اور مثلاً آیہ: وقالو امالنالانری رجالاً کنانعدھم من الاشرار (ص۔۶۲)

[2]۔ یہ چاروں اعتراض مرحوم طبرسی نے مجمع البیان ج ۴ ص ۴۶۷ چاپ صیدر پر محققین اسلام نے نقل کیے ہیں، جبکہ یہی نظریہ فخر رازی میں بارہ اعتراضات کیساتھ نقل ہوا ہے ج ۴ ص ۲۲۱۔۲۲۲ کی طرف رجوع کریں۔ اور المیز ان میں بھی یہ اعتراضات نقل ہوئے ہیں ج ۸ ص ۳۲۵۔۳۲۷ کی طرف رجوع کریں۔

بطور ودیعت رکھی گئی ہے، اور اگر باہر سے کوئی ہاتھ اس سرالٰہی کو دگر گوں نہ کرے تو انسان خداشناسی کو روح کے ساتھ نشو ونما پاتا ہے اور جادہ توحید سے منحرف نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ نفسیات کے ماہرین نے ''حس مذہبی'' کو انسانی روح کے ابعاد میں سے ایک شمار کیا ہے، اور اسکی، اس قسم کے بعد کیساتھ توصیف کی ہے اور درحقیقت انسان کی سرشت میں دوسرے احسانات وغرائز کی طرح، اس طرح کی ایک حِس تکوینی طور پر نقش کر دی گئی ہے، اور وہ بھی انسان کی نشو ونما کے ساتھ ساتھ پرورش پاتی رہتی ہے۔

اور تیسری عبارت میں: خدا نے انسانوں کو ان کے بالوں کو پشت اور ماؤں کے رحم سے باہر نکالا، اور ان کی خلقت اور پیدائش کو اسی خصوصیات کے ساتھ ترکیب دیا کہ وہ ہمیشہ اپنے پروردگار کو پہچانتے ہیں اور اپنی حاجت اور ضرورت کا اس کے ساتھ احساس رکھتے ہیں، جس وقت انسان اپنی حاجت کے لئے خداوند کریم کی طرف توجہ کرنے میں اور خود کو احتیاج میں ڈوبا ہوا پاتے ہیں، تو گویا ان سے کہا جاتا ہے: کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں؟ تو وہ بے ساختہ بول اٹھتے ہیں: کیوں نہیں! ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو ہمارا خدا ہے۔ [1]

خلاصہ یہ ہے کہ انسان خدا کی پاک فطرت کے سایہ میں جو خداشناسی کی بنیاد پر خلق کیا گیا ہے، اور عقل وخرد کی مدد سے جو خدا کی طرف اس کی رہنمائی کرتی ہے ہمیشہ خدا خواہ وخدا جو ہے۔

اس بنا پر، یہ پیمان، ایک تشریعی پیمان نہیں ہے اور سوال وجواب کی صورت میں نہیں ہوا ہے بلکہ یہ ایک تکوینی اور فطری پیمان ہے اور اس کا جواب بھی اسی طرح سے دیا گیا ہے۔ قرآن میں بھی اور ہماری روزمرہ کی گفتگو میں بھی اس قسم کی گفتگو کرنے اور پیمان باندھنے کا عام رواج ہے، مثلاً کہتے ہیں کہ خدا نے آنکھیں دے کر ہم سے یہ پیمان لیا ہے کہ ہم گڑھے میں نہ گریں، اور عقل وخرد دے کر ہم سے یہ پیمان لیا ہے، کہ حق وباطل کی تمیز کریں۔ قرآن مجید زمین اور آسمان کے بارے میں کہتا ہے:

فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴿۱۱﴾

''اس نے آسمان وزمین سے کہا، میل ورغبت کے ساتھ آؤ یا جبر واکراہ سے آؤ، تو انہوں کہا کہ ہم میل ورغب کے ساتھ آتے ہیں۔'' (حم السجدہ۔۱۱)

آسمان وزمین کے ساتھ اس قسم کی گفتگو، جن میں شعور وادراک نہیں ہوتا، تو تکوین وآفرینش کے سوا اور کسی طرح سے نہیں ہوسکتی۔ عرب کے کچھ خطباء کا قول نقل کرتے ہیں، کہ وہ اس طرح کہتے تھے:

سل الارض من شق انهارك؟ وغرس اشجارك؟ واينع ثمارك؟ فان لم تجبك حواراً، اجابتك اعتبارا۔

---

[1] تفسیر رازی ج ۴ ص ۴۲۳ ومجمع البیان ج ۳ ص ۴۹۷ وفی ظلا القرآن ج ۹ ص ۵۸۔ ۵۹ اور آخری مدرک میں اس پیمان کا ظرف وہ وقت معرفی ہوا ہے۔ جب انسان سلول کی شکل میں رحم مادر میں قرار پاتا ہے۔

''زمین سے پوچھ، تیری نہریں کس نے جاری کی ہیں؟ اور تیرے درخت کس نے بوئے ہیں؟ اور تیرے پھل کس نے پکائے ہیں؟ اگر وہ بطورِ خطاب تجھے جواب نہ دے، تو زبانِ حال سے جواب دے گی۔''[۱]

اس نظریہ کی قرآن اور احادیث گواہی دیتی ہیں۔ اس کا قرآنی گواہ تو وہی آیہ ''فطرت اللہ''[۲] ہے جو اس آیت کا بیان ہو سکتی ہے، ان دونوں آیات میں فرق صرف یہ ہے کہ آیہ ''فطرت اللہ'' اجمالی طور پر بیان کرتی ہے کہ خداشناسی کی حس انسان کی خلقت کے ساتھ خمیر ہوئی ہے، لیکن اس کے زمانے کو معین نہیں کرتی، جبکہ زیر بحث آیت پیدائش اور خلقت کے وقت سے رازِ الٰہی کو بیان کرتی ہے اور یہ بتلاتی ہے کہ انسان اسی وقت سے جبکہ وہ ایک انتہائی باریک موجود کی صورت میں رحمِ مادر میں قرار پاتا ہے۔ اس قسم کے رازِ الٰہی کا حامل ہوتا ہے، گویا انسان کا پہلا سلول جو رحمِ مادر میں قرار پاتا ہے وہ اس سرِ الٰہی کو ساتھ لیے ہوئے ہوتا ہے۔

اور اگر اس بحث کو علوم طبیعی کے مسائل کے ساتھ تطبیق کرنا پڑے، تو ہم کہیں گے کہ ہر انسان کے سلول کے ذرے اس روحی خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں، جو سلول کے رشد اور نشوونما کے ساتھ ساتھ پرورش پاتے رہتے ہیں۔ اس سے قطع نظر، اس تفسیر کی تائید، اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جو سند معتبر کے ساتھ نقل ہوئی۔

عبداللہ بن سنان کہتا ہے: میں نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ ''فطرت اللہ'' سے کیا مراد ہے؟ آپؑ نے فرمایا:

هی الاسلام فطرهم الله حين اخذ ميثاقهم على التوحيد فقال الست بربكم[۳]

''فطرت سے مراد اسلام ہے، خدا نے تمام انسانوں سے توحید پر میثاق لیا ہے اور فرمایا ہے کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں سب نے کہا ہاں! کیوں نہیں۔''

اس نظریہ کی خامیاں

یہ نظریہ اگرچہ پہلے نظریہ کی نسبت کہیں زیادہ درست ہے لیکن یہ بھی کئی خامیوں سے پُر ہے جن میں سے بعض کی ہم یاد آوری کراتے ہیں۔

---

[۱] ۔ مجمع البیان ج ۴ ص ۴۹۸ ط صیدا

[۲] ۔ روم۔ ۳۰

[۳] ۔ تفسیر برہان ج ۲ ص ۴۷ حدیث ۸

ا۔آیت کا ظاہر یہ کہتا ہے کہ یہ واقعہ گذشتہ زمانہ میں انجام پایا ہے،اور اس کا گواہ "واذاخذ ربك" اور لفظ "اذ" ماضی کیلئے آتا ہے۔[1]

دوسرے لفظوں میں پیغمبرؐ سے یا تمام لوگوں سے قرآن کا یہ خطاب نزولِ قرآن کے وقت میں ہے جبکہ عہد کا ظرف اور پیمان لینے کا وقت گذشتہ زمانہ میں تھا، جہاں پر وہ کہتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب تیرے پروردگار نے بنی آدم کی پشت سے اس کی نسل کو نکالا۔اگر چہ آیت چند ایک شائستہ استعدادوں کے ساتھ، جو انسان کی طرف رہبری کرے اس کی تدریجی خلقت سے متعلق ہو تو اس صورت میں، پیمان لینے کا وقت، اور خطاب کے وقت پیغمبرؐ کے زمانہ میں رہنے والے لوگوں کا زمانہ ایک ہوگا۔اور یہ آیت کے ظاہر کے برخلاف ہے۔

۲۔اگر آیت کا مقصد یہ ہو کہ انسان فطری وعقلائی استعدادوں کے ایک سلسلہ کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے جن کے ذریعے وہ اسے اپنی طرف رہبری کرتا ہے،تو اس صورت میں خدا یہ کیوں کہتا ہے: "واشهدهم علیٰ انفسهم" ان کو خود ان کے نفسوں پر گواہ بنایا۔حالانکہ مناسب تھا کہ وہ یہ کہے: "فعرف نفسه علیهم" انہیں اپنی معرفت کرائی۔پھر آیت کے آخر میں یہ کہتا ہے: "بلیٰشهدنا" جبکہ مناسب یہ تھا کہ کہے : "بلیٰ عرفناك" ہاں ہم نے تجھ پہچان لیا۔

۳۔قطع نظر اس کے کہ گو "الست بربکم قالوا بلیٰ" کے جملہ کی تفسیر خطاب تکوینی کے طریقہ سے صحیح ہے لیکن قطعی طور پر خلاف ظاہر ہے ،اور جب تک کوئی واضح دلیل اس پر دلالت نہ کرے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔یہ نظریہ (کہ انسان فطری اور عقلائی استعدادوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے جو اسے خدا کی طرف رہبری کرتی ہیں) توحید فطری کا اختصار ہے ،اور اگر آیت کا مقصد اس قسم کے مطلب کو بتانا تھا تو اس مطلب کو واضح ترین عبارت کے ساتھ بیان کرتا۔

تیسرا نظریہ

اُستاد عالی قدر حضرت طباطبائی دامت برکاۃ نے آیت کی ایک اور تفسیر کی ہے اور ایک خاص نظریہ کا انتخاب کیا ہے،جس کی گہرائی کو سمجھنے کیلئے وضاحت کی ضرورت ہے،اب ہم ان کے نظریہ کی وضاحت کرتے ہیں۔

ا۔ظہور اور خلقت کا زمانہ تدریجی ہے، کیونکہ انسان کے تمام اجزاء ایک ہی جگہ جمع نہیں ہوتے ، یہ خصوصیت نہ صرف اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے جس میں تدریج و تقطیع پوشیدہ ہے، بلکہ ہر حادثہ اور روئداد جو کسی زمانہ میں رونما ہوتی ہے وہ تدریج اور تجزی کی واقعیت کو اپنا لیتی ہے۔

۲۔اس میں شک نہیں کہ عالم کے واقعات ہمارے نزدیک گذری ہوئی کل ،آج اور آنے والے کل میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔اور ہر روئداد اپنے لئے ایک مخصوص زمانہ اور مکان کو مخصوص کر لیتی ہے اور اس انسان کیلئے جو زمانہ کی حد بندیوں میں زندگی گزارتا ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام حوادث وواقعات کو ایک ہی جگہ اور ایک دوسرے کے ساتھ مشاہدہ کرے اور وہ سب کے سب اس کے پاس حاضر ہوں لیکن اگر حوادث کو دیکھنے

---

[1] ۔اور اگر کبھی مستقبل کیلئے ہو تو وہ بصورت مجاز از روئے عنایت ہوتا ہے۔مثلاً "وَإِذْ قَالَ اللهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ" (مائدہ ۱۱۶) مسلمہ طور پر خدا نے ابتک عیسیٰ سے اس قسم کی گفتگو نہیں کی ہے اور وہ قیامت کے دن پر گفتگو کریگا۔یہاں لفظ "اذ" اور جملہ "قال" کے جواز کی وجہ وہی اس واقعہ کا یقینی طور پر واقع ہونا ہے

والا، زمان ومکان سے برتر افق پر ہو۔ اور تمام اجزاء زمانہ کو، ایک ہی ظہور کے عنوان سے دیکھے، تو پھر اس کیلئے گزری ہوئی کل اور آج اور آنے والی کل کا کوئی مفہوم نہیں ہوگا۔ آپ کو سمجھانے کیلئے چند مثالیں، جو حقیقت کو ذہن سے قریب کر سکتی ہیں، پیش کرتے ہیں:

(الف)......فرض کریں ایک انسان کمرے کے اندر بیٹا ہوا ہے، اور بہت ہی باریک اور تنگ سوراخ سے کمرے سے باہر کی طرف دیکھ رہا ہے، اور اسی وقت اونٹوں کی ایک قطار اس سوراخ کے سامنے سے گزر رہی ہے، مسلمہ طور پر وہ دیکھنے والا ایک وقت میں ایک سے زیادہ اونٹ نہیں دیکھے گا، لیکن وہ انسان جو اس وقت اس کمرے کی چھت پر موجود ہے اور باہر کی طرف دیکھ رہا ہے، وہ ایک ہی لحہ میں تمام اونٹوں کو ایک ہی جگہ مشاہدہ کر رہا ہے۔

اس انسان کی مثال بھی جو زمانہ کے زندان میں ٹھہرا ہوا ہے، اس انسان ہی کی مانند ہے جو تنگ اور باریک سُوراخ سے باہر کی طرف دیکھے، لیکن وہ ذات جو زمانہ بلند تر مقام پر قرار رکھتی ہے، اس انسان کی طرف ح ہے جو کمرے سے چھت سے اور وسیع منظر سے باہر کے حوادث وواقعات کا مطالعہ کر رہا ہے۔

(ب)......وہ چیونٹی جو رنگ برنگے قالین پر چل رہی ہے وہ ایک وقت میں ایک قسم کے نقش اور رنگ سے زیادہ مشاہدہ نہیں کرتی، لیکن وہ شخص جو وسیع وعریض نگاہ رکھتا ہے، تمام نقش ونگار اور رنگوں کو ایک ہی جگہ اور ایک ہی نظر میں دیکھ لیتا ہے۔

(ج)......آپ دریائے نیل کے کنارے بیٹھے ہوئے ہیں اور پانی اور اس کی بل کھاتی ہوئی لہروں کا نظارہ کر رہے ہیں تو اس نظارہ میں، آپ صرف دریا کے ایک حصہ کی چلی اور سرٹپکتی ہوئی لہروں کا مشاہدہ کر سکیں گے، لیکن وہ شخص جو ہوائی جہاز سے آسمان کی بلندی سے دریائے نیل کو دیکھ رہا ہے وہ موجوں کے ایک بہت بڑے حصہ اور پانی کے بہاؤ کا مشاہدہ کرتا ہے اور اسی طرح دوسرے موراد ہیں۔ اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ حوادث وواقعات کی دوری ونزدیکی ان افراد پر ہی صادق آتی ہے جو زمانہ کے اندر قرار پاتے ہیں، اور زمانہ کا گزرنا انہیں عالم کے حوادث سے دور یا نزدیک کر دیتا ہے لیکن وہ ہستی جو زمان ومکان سے بالاتر ووالاتر مقام یہ ہے اس کے بارے میں زمانی یا مکانی فاصلہ کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

۳۔انسان اوعالم کے تمام اجزاء جن کا تعلق زمانہ سے ہے، دورُخ رکھتے ہیں۔ ایک رُخ خدا کی طرف اور دوسرا رخ زمانہ کی طرف، اور دوسرے لفظوں میں وہ دونسبتیں اور دورابطے رکھتے ہیں۔

اس لحاظ سے کہ وہ خدا سے رابطہ رکھتے ہیں۔ اور اخدا ان پر محیط ہے ان کی کوئی جز دوسری جز سے غائب نہیں ہوگی نہ خداا ان سے غایئبت، اور نہ وہ محضر خدا سے غائب، بلکہ تمام موجوداتِ عالم (نہ انکا ماضی ہوگا اور نہ ہی مستقبل) اس کے سامنے موجود ہیں، اواس کے سوا ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ سارا جہاں اس کا فعل ہے اور کوئی فعل اس لحاظ سے کہ وہ فاعل کے ساتھ قائم ہے، اس سے غائب و پنہاں نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس لحاظ سے کہ تمام موجودات زمانہ کے اندر ہی ہوتے ہیں، اور زمانہ اور تدریج کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اس لیے متفرق حوادث اور اس طرح کے واقعات کی صورت میں جو ایک دوسرے سے گونا گوں فاصلہ رکھتے ہیں جلوہ گر ہوتے ہیں، اور اس مقام پر عوامل اُسے خدا کی حضور سے بے خبر کر کے اس کے دل کی نگاہ اور خدا کے درمیان حجاب پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں محاسبے ’’حضرت اُستاذ‘‘ کی نظر میں اس طرح کے ہیں جو جہاں

کو دونشانوں: باطن وظاہر، یا اندرواور باہر میں تقسیم کر دیتے ہیں اور جہاں کا جمعی وجود باطن اوراس وجود کا اندر متفرق ہے۔حضرت استاد نے ان دونشانوں کے وجود کا آیات سے استفادہ کیا ہےاور کہتے ہیں کہ جملہ ''کن فیکون ''ان دو جمعی اور تدریجی نشانوں کی طرف اشارہ ہے۔

لفظ ''کن'' وجود جمعی کی طرف خاص طوور پراگرہم اس آیت کو،سورۃ القمر کی آیۃ ۵۰ کے ساتھ ملادیں جس میں فرماتا ہے: ''وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ''ہمارا امراورفرمان صرف ایک ہے،مثل ایک آنکھ جھپکنے کے،امر کا ایک ہونا،اس کے سوانہیں ہوسکتا،کہ فرمان ''کن'' کے ساتھ ہی تمام حوادث وواقعات تفریق وتدریج کے بغیرایک ہی جگہ وجود میں آجائیں، اورتمام چیزیں ''کن'' کے خطاب کے ساتھ ہی عالم میں ظہور میں آجائیں اور ''فیکون'' کا جملہ جوتدریج کو ظاہر کرتا ہے،اس جہان کے دوسرے رُخ کی طرف جوتدریجی سے اشارہ ہے۔

وہ اس آیت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں، کہ آی انسانوں کے خدا کے حضور میں وجود جمعی کی طرف اشارہ ہے ایسا حضور جس میں غیب کا تصور ہی نہیں ہے، گویا تمام اولادِ آدم ایک ہی جگہ اپنے باپوں کی پشت سے لی گئی ہے،ایک دوسرے گرد جمع ہوئی ہے،اورخدا کے سامنے حاضر ہیں۔اس حالت میں ہرانسان اپنے پیدا کرنے والے کوحضوراً پالیتا ہےاوراسکا پایا ہوا خدا کے وجوداوراس کی خداوند پرایک واضح گواہ ہے۔لیکن انسان کا زمانہ کے خول اورتبدیلیوں میں پھنس جانا آدمی کوایسا مشغول اورخود سے بے خبر کر دیتا ہے کہ وہ اس علم حضوری سے جووہ اپنے پروردگار کا رکھتا تھا غافل ہوجاتا ہے۔[1]

اس نظریہ کے بارے میں سوالات

اس نظریہ کے بارے میں کئی سوال ہیں، کہ جب تک ان کے یقینی جواب نہ دیئے جائیں ان پراعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ان میں سے چند یہ ہیں۔

ا۔اس میں شک نہیں کہ زمان ومکان سے برتروبالااور ہرشے پر محیط فرد کوتو جہاں ایک طرح سے دکھائی دیتا ہےاورزمان وماکن میں ڈوبے ہوئے اور ہرطرف سے گھرے ہوئے فرد کودوسری طرح سے،دوسرے لفظوں میں عالم کودودریچوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔

(الف)......زمان ومکان پر محیط ایک فرد کے دریچہ سے،اس صورت کے تمام اجزا اکٹھے اورایک طرح سے ہوں گےاورجدائی اورعلیحدگی کیلئے اس میں کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

(ب)......زمانے میں گھرے ہوئے فرد کے دریچہ سے،اس صورت میں تمام موجودات اورظہور میں آنے والی چیزیں متفرق اور پراگندہ صورت میں ہوں گی۔لیکن یہ اختلاف آیا دیکھنے والے کی وسعت اورتنگی کے ساتھ مربوط ہے،کہ ایک میں دیکھنے کی قدرت وطاقت نہیں ہے، یا یہ خود حوادث اورعالم وجود میں آنے والی چیزوں کے ساتھ مربوط ہے۔

---

[1] ۔المیزان جلد ۸ ص ۳۳۴۔۳۳۶

اس میں شک نہیں کہ یہ اختلاف اور دوگانگی، جہاں کی ذات، اور خود حوادث، اور عالم وجود میں آنے والی چیزوں کے ساتھ مربوط نہیں ہے بلکہ یہ اختلاف اور دوگانگی فرد محیط کی وسیع نگاہ کے ساتھ مربوط ہے جو قالین کے تمام نقش ونگار یا سمندر کی لہروں کی پیچ وخم، یا ریل گاڑی کے تمام ڈبوں کو ایک ہی جگہ دیکھتا ہے، جب کہ وہ شخص جو گھِرا ہوا ہے، دیکھنے کی قوت وطاقت کی کمی کی وجہ سے ایک وقت میں صرف ایک ہی واقعہ کو ایک ہی پیچ وخم کو دیکھتا ہے۔ اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں کیلئے دونشا تیں نہیں ہیں ایک نشاۃ باطن اور جہاں کے اندر کے نام کی اور دوسری نشاۃ ظاہر اور عالم کے باہر کے نام کی۔

دوسرے لفظوں میں جہان اور اس کی موجودات کیلئے وجود کے دو مرحلے ہیں، ایک وجود جمعی اور دوسرا وجود تدریجی بلکہ موجودات کیلئے ایک حقیقت اور ایک وجود کے سوا کچھ نہیں ہے، جو کبھی تو مجتمع صورت میں دکھائی دیتے ہیں اور کبھی متفرق صورت میں نظر آتے ہیں اگر وجود میں کوئی اختلاف ہے تو وہ دیکھنے والے کی طاقت کی زیادتی اور کمی کے ساتھ مربوط ہے، نہ کہ خود حوادث اور موجودات سے۔

۲۔ تمام حوادث اور موجودات کا خدا کے ہاں حضور، تمام حوادث وواقعات پر خدا کے علم کی دلیل ہے کیونکہ علم کی حقیقت معلوم کے عالم کے پاس حضور کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور چونکہ عالم کی تمام موجودات خدا کا فعل ہیں لہٰذا قہراً اسکے ساتھ قائم اور اس کے پاس حاضر ہیں، دوسرے لفظوں میں موجودات کا خدا کے ہاں حضور موجودات کے بارے میں خدا کا علم ہے نہ خدا کیلئے موجودات کے علم کا سبب ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ موجودات پر خدا کے علم کا سبب تمام جہان پر اس کا احاطہ قیومی ہے اور چونکہ احاطہ ایک طرف سے ہے اور صرف خدا محیط ہے اور باقی دوسرے سب کے سب محاط اور گھرے ہوئے ہیں۔ لہٰذا قہراً علم وآ گاہی اسی شخص میں منحصر ہوگی جو محیط ہے اور فرد محاط (گھر ہوئے شخص) کا علم اور آ گاہی میں کوئی حصہ نہیں ہوگا اور اس قسم کے حضور کا نتیجہ خدا کا اشیأ کا عالم ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن اس قسم کا حضور، موجودات کی خالق یکتا سے علم وآ گاہی کی ہرگز دلیل نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں، آیت کا مقصد یہ ہے کہ خدا انسان سے اپنی ربوبیت کا اقرار واعتراف لے اور بندے اس کی گواہی دیں لیکن موجودات عالم کے اللہ کے ہاں حضور کا نتیجہ، حوادث وواقعات کے متعلق خدا کے علم کا اثبات ہے، نہ کہ موجودات کی خدا سے آ گاہی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تصور ہو کہ جس طرح خدا کے ہاں اشیاء کا حضور، ان پر خدا کے علم کا سبب بنتا ہے، اسی طرح اشیاء کے لئے بھی، خدا کے بارے میں علم وآ گاہی کا سبب بنتا ہے۔

لیکن یہ مطلب تصور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ حضور اس لحاظ سے موجب علم وسبب آ گاہی بنتا ہے کہ وہ کسی چیز کے قیام کے ہمراہ خدا کے ساتھ ہے، اور نتیجہ میں خدا کا اس چیز پر احاطہ ہے اور اس قسم کی صفت اور خصوصیت صرف خدا ہی میں پائی جاتی ہے وہ سارے جہاں پر قیوم اور محیط ہے، جب کہ دوسرے موجودات میں اس قسم کی صفت اور خصوصیت نہیں ہے۔ وہ محاط (گھرے ہوئے) ہیں اور خدا کے ساتھ قائم نہیں۔

۳۔ یہ تفسیر سب لوگوں کے ذہنوں سے بہت دور ہے اور اس کو ہرگز تفسیر نہیں کہہ سکتے، بلکہ یہ تفسیر کی نسبت تاویل سے زیادہ نزدیک ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ نظریہ آیت کے معنی کے العادو جہات میں سے ایک بعد و جہت ہے، نہ کہ بعد منحصر۔ اس کے علاوہ

آیت کے الفاظ جیسے: ”واشهدهم علىٰ انفسهم “اور انہی کے مانند دوسرے الفاظ جو گواہی لینے کے معنی میں ہیں اس تفسیر کے ساتھ ساز گار نہیں ہیں۔

نظریہ چہارم

شریف مرتضےٰ (علم الهدیٰ) نے کتاب ”غررالفوائد“ میں جو امالی کے نام سے مشہور ہے ج ا ص ۲۸-۳۹ پر آیت کے بارے میں ایک عمدہ بحث کی ہے اور پہلے نظریہ پر تنقید کرنیکے بعد، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ ایک جدید نظریہ پیش کرتے ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتراف واقرار حضرت آدمؑ کی ساری اولاد سے نہیں لیا گیا تھا۔ بلکہ یہ اقرار ان افراد سے لیا گیا تھا جن کے آباؤ اجداد کا فرد مشرک تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آیت ۱۷۳ میں کہتا ہے:

او تقولوا انما اشرك اٰباؤنا من قبل

”یا یہ کہنے لگو کہ ہمارے آباؤ اجداد نے پہلے سے شرک کیا تھا۔“

اس صورت میں یہ کہنا ہوگا کہ آیت اس گروہ کے ساتھ مربوط ہے جو اس جہان میں بالغ وکامل ہوا ہے اور جو خدا کے انبیاء ان کیلئے لائے تھے وہ اس سے آگاہ ہوئے، اور اس کا اقرار واعتراف کیا، اور ایک طرح سے یہ اپنے اوپر گواہی دی۔ اس کے بعد مزید فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے پہلا معنی اپنایا ہے، انہوں نے یہ تصور کر لیا ہے کہ لفظ ”ذریه“ کا صرف غیر کامل اور نابالغ پر ہی اطلاق ہوتا ہے جب کہ یہ لفظ قرآن میں افراد کامل پر بھی بولا گیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

ربنا وادخلهم جنات عدن التی وعدتهم ومن صلح من ابائهم وازواجهم وذریاتهم

”بار الہا تو ان کو اپنی جاودانی جنت میں داخل فرما۔ وہ جنت جس کا تو نے ان سے اور ان نیک وصالح آباء، ازواج اور اولاد سے وعدہ فرمایا ہے۔“

مرحوم شریف اس نظریہ کے بعد ایک اور نظریہ پیش کرتے ہیں، جسے ہم نے گزشتہ بحث میں ”دوسرے نظریہ کے عنوان کے تحت پیش کیا ہے۔ یہ نظریہ بھی کچھ زیادہ محکم اور استوار نہیں ہے، کیونکہ

اولاً: اس نظریہ کا لازمہ یہ ہے کہ ”من بنی اٰدم“ کے جملے میں لفظ من تبعیض کیلئے ہو نہ کہ بیان کیلئے جبکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ ”من“ بیانیہ ہے ”تبعیضیہ“ نہیں ہے۔

ثانیاً: یہ جو وہ کہتے ہیں کہ آیت ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جن کے آباواجداد مشرک تھے جن پر بعد والی آیت گواہ ہے، یہ بھی کچھ

استوار اور مضبوط دلیل نہیں ہے، کیونکہ بعد والی آیت اس گواہی کے لینے کی حکمت کو بیان کر رہی ہے، نہ کہ اس کی علت کو۔ یعنی چونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ باپ کا مشرک ہونا آخرت میں ایک عذر بن جائے، لہٰذا ہم نے عذر کا دروازہ بند کرنے کیلئے اس کام کو انجام دیا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ حکمت ہر ہر فرد میں موجود ہو۔

ثالثاً: اگر مقصود یہ ہو کہ وہ گروہ جن کے آباواجداد مشرک تھے، لیکن وہ انبیاء کی تعلیم کے سائے میں توحید کی آغوش میں پلٹ آئے تھے، اور انہوں نے خدا کی وحدانیت کا اقرار کرلیا تھا تو پھر اس مطلب کو اس طرح سے کیوں ادا نہیں کیا گیا کہ وہ اپنے مقصود میں صریح اور واضح ہوتا۔ یہ وہ نظریات ہیں جن کا بزرگ مفسرین کی طرف سے اظہار ہوا ہے، اُمید ہے کہ آئندہ کاوش کرنے والے لوگ اس آیت کیلئے ایسے واضح وروشن معنی جو اس کے الفاظ کے ساتھ منطبق ہوں، پیش کریں گے، اور آیت کی حقیقت کو روشن کریں گے۔ ہم گذشتہ بحث میں بیان کر چکے ہیں کہ پہلے نظریہ کی بنیاد وہ روایات ہیں جو احادیث کی کتابوں میں وارد ہوئی ہیں اب ان روایات کا کوئی حل سوچنا چاہیئے۔ مثلاً مرحوم بحرانی (سید ہاشم) نے تفسیر ''البرہانُ میں آیہ ۳۷ کی تفسیر کے ذیل میں ایک روایت نقل کی ہے۔[1]

نور الثقلین نے بھی جو تفسیر برہان کی طرح، حدیث کے ساتھ قرآن کی تفسیر کی بنیاد رکھی گئی آیہ ۲۷ کے ذیل میں ایک حدیث نقل کی ہے۔[2]

لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان روایات کا مضمون ایک دوسرے سے مختلف ہے اور وہ سب کے سب پہلے نظریہ کے مطابق نہیں ہیں بلکہ کئی جہت سے ان کے ذریعے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ

اولاً: ان روایات میں سے بعض توصریحاً دوسرے قول کے مطابق ہیں، یا قابل انطباق ہیں، مثلاً وہ روایات جو ۶، ۷، ۲۰، ۲۲، ۳۵ شمار پر آئی ہیں۔[3]

ثانیاً: ان میں چند روایات صراحت کے ساتھ یہ بتلاتی ہیں کہ یہ اعتراف واقرار ارواح سے لیا گیا ہے۔ مثلاً روایت شمارہ ۲۰ وہ احادیث جو پہلے نظریہ پر دلالت کرتی ہیں وہ شمارہ نمبر ۳، ۴، ۸، ۱۱، ۱۴، ۱۷، ۱۸، ۲۷، ۲۹، ہیں۔ اوران کی تعداد بحسب ظاہر ۹ ہے۔ لیکن اگر ہم غور کریں، تو پھر ہم دیکھیں گے کہ ان کی واقعی تعداد ۵ سے زیادہ نہیں ہے کیونکہ ان ۹ روایات میں سے ۵ روایات زرارہ سے نقل ہوئی ہیں۔ یعنی امام سے نقل کرنے والا آخری راوی حدیث زرارہ ہے، اور مسلمہ طور پر ایک راوی ایک ہی مطلب کو پانچ مرتبہ امام سے نہیں پوچھتا اور اگر زرارہ کی روایت پانچ احادیث کی صورت میں نقل ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کو متعدد افراد نے زراہ سے روایت کیا ہے اس وجہ سے اس حدیث کی تعداد بڑھ کر، مختلف عبارات پیدا ہوگئی ہیں اور اس بناء پر ایک روایت کو پانچ روایت نہیں کہہ سکتے، اور چونکہ احادیث

---

[1] ۔ ج:۲، ص:۶۴۔۱۵

[2] ۔ ج۲، ص۳۹، ۔۱۰۱

[3] ۔ احادیث کا نمبر شمار برہاں کے مطابق ہے۔

نمبر ۳، ۴، ۱۱، ۲۷، ۲۹، ایک ہی شخص (زرارہ) سے نقل ہوئی ہیں، انہیں پانچ احادیث شمار نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ سب کو ایک ہی حدیث سمجھنا پڑے ا۔ اصل صورت میں احادیث کی تعداد ۹ سے ۵ رہ گی۔ دوسری احادیث میں سے بعض مبہم اور مقصود میں صریح نہیں ہیں۔ اور بعض احادیث میں اس میثاق کو وہی میثاق قرار دیا گیا ہے جو خدا نے خاص طور پر انبیاء سے لیا تھا اور جو آیہ:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ

''اور اس واضح اختلاف کے ہوتے ہوئے ان پانچ احادیث سے استناد نہیں کیا جا سکتا۔'' (آل عمران۔۸۱)

ثالثاً: شیعوں کے معصوم پیشواؤں نے صحیح حدیث کو پہچاننے کیلئے ایک معیار بیان فرمایا ہے، اور ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ اس معیار کے مطابق ہم صحیح اور غیر صحیح حدیث میں تمیز کیا کریں، اور وہ یہ ہے کہ جو حدیث قرآن کے مخالف ہو اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ گزشتہ بحث میں ہم نے بیان کیا تھا کہ احادیث کا یہ حصہ آیت کے ظاہر کے خلاف ہے بہتر یہی ہے کہ ہم ان احادیث کیلئے وظیفہ ''تسلیم'' پر عمل کریں، یعنی: بالفرض اگر یہ احادیث انہیں نے بیان فرمائی ہوں، تو ان کی واقعیت وحقیقت کا علم خود ائمہ کے سپرد کریں۔

مولف پر اس وقت تک جب کہ قلم کاغذ پر جاری ہے، آیت کے معنی منکشف نہیں ہوئے ہیں، اور اُمید ہے کہ ابن عباس کے قول: ''القراٰن یفسرہ الزمان'' کے مطابق، آئندہ آنے والے اس کا صحیح مطلب جان جائیں گے۔ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ وجود انسانی کے مراحل میں سے کسی مرحلہ میں جو ہمارے لئے ابھی تک کشف نہیں ہوا ہے انسان سے ایک عہد و پیمان لیا گیا ہے لیکن یہ مرحلہ کب آیا، اور کس زمانہ میں انجام پایا، ابھی تک معلوم نہیں ہے۔

اِس حِصہ میں

۱۔ ''سجدہ'' اور خدا کی ''تسبیح'' اور ''حمد'' سے کیا مراد ہے؟

۲۔ عالم کے تمام ذرات خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔

۳۔ ان کے سجدہ سے کیا مراد ہے؟

۴۔ اختیاری اور اجباری سجدے۔

۵۔ سارا جہان خدا کی تسبیح کرتا ہے۔

۶ وہ آیات جن میں فرشتوں، پرندوں اور پہاڑوں کی تسبیح کا بیان ہے۔

۷۔ موجوداتِ عالم کی تسبیح کے بارے میں مفسرین کے نظریات

۸۔ الف: تسبیح سے مراد خضوع اور موجودات کی آفرینش پذیری ہے۔

۹۔ ب: ہر موجو کا نظم و نسق اس کے پیدا کرنے والے کے علم و حکمت اور پا کی پر گواہ ہے۔

۱۰۔ ج: صدر المتالھین کا نظریہ، اور یہ کہ موجوداتِ عالم کی تسبیح آ گاہانہ ہے۔

۱۱۔ قرآن اپنی چودہ آیات کے ساتھ، تمام موجودات میں شعور کے وجود کی گواہی دیتا ہے۔

۱۲۔ وجود کے ساتھ شعور کے ہونے میں فلسفہ کے دلائل قرآن کے مطابق ہیں۔

تمام ذراتِ جہان خدا کی حمد و تسبیح کرتے ہیں

قرآن کے بلند حقائق اور معارف میں سے ایک یہ ہے کہ عالم کے تمام ذرات خدا کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کی حمد وثنا اور تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے ہیں اور یہ حقیقت اس وسعت کے ساتھ قرآن کے سوا کسی مکتب نے پیش نہیں کی ہے۔اور زیادہ واضح الفاظ میں: تمام ذرات وجود ایٹم کی گہرائیوں سے لے کر کہکشانوں اور بادلوں کے اندر رہنے والی مخلوق تک سب ہی یہ تین بڑی ذمہ داریاں انجام دیتے ہیں۔

۱۔تمام موجوداتِ عالم خدا کو ''سجدہ'' کرتے ہیں۔

۲۔سراسر جہان ہستی خدا کی ''حمد وثنا'' کہتا ہے۔

۳۔تمام موجودات خدا کی ''تسبیح'' کرتے اور پاکی بیان کرتے ہیں۔

گویا سارا جہان خضوع وخشوع، کان اور زبان، روح واحساس، ادراک ومسئولیت، نور روشنی اور علم ودانش ہے سجدہ میں اور حمد و تسبیح میں واضح فرق ہے جس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سجدہ خضوع اور چھوٹا ہونے کا اظہار ہے، جبکہ حمد و تسبیح خدا کے کمال و جمال اور اس کے نقص و عیب سے پاک ہونے کا بیان ہے۔

حمد و تسبیح کا فرق

جب ہم خدا کی اس لحاظ سے تعریف کریں، کہ وہ صفات کمال و جمال کا حامل ہے اور اچھے اور سودمند کاموں کا منبع ہے، تو اس صورت میں ہمارے تعریف کرنے کو''حمد'' کہتے ہیں لیکن اگر ہم اس کی ذات کو ہر قسم کے عیب ونقص سے مبرا سمجھیں اور اس کی پاکی کا اظہار کریں، تو اس کو''تسبیح'' کہتے ہیں دوسرے لفظوں میں خدا کی''حمد'' اس کے کمال (صفات ثبوتیہ اور اعمالِ نیک) کے مقابلے میں چاہے یہ کمال اس کی ذات میں ہو جیسے علم وقدرت یا اس کے افعال میں ہو جیسے رازقیت اس کی تعریف وتوصیف کو کہتے ہیں، جب کہ خدا کی تسبیح عیوب ونقائص سے اس کی پاکی کا بیان ہے۔(صفات سلبیہ)

اب جب کہ ان دونوں کا فرق معلوم ہو گیا، تو اب ہم تینوں مطالب کے بارے میں جو قرآن کی ایجادات میں سے ایک ہے کسی حد تک بحث کرتے ہیں۔

۱۔تمام ذراتِ جہاں خدا کے سامنے خضوع اور سجدہ کرتے ہیں

قرآن نے موجودات جہاں کے سجدہ اور خضوع کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے بعض آیات، صرف ذی شعور موجودات کے سجدہ کرنے کو بیان کیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

۱۔وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ

وَالْاٰصَالِ۝۱۵

''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی طرح ان کے سائے صبح اور شام میل ورغبت اور جبر واکراہ سے خدا کیلئے سجدہ کرتے ہیں۔'' (رعد۔۱۵)[۱]

اس آیت میں ''وللہ یسجد من فی السماوات'' کے جملہ میں لفظ ''من'' کی گواہی سے صرف ذی عقل موجودات کے خضوع کو بیان کیا گیا ہے۔[۲]

بعض آیات میں ''سجدہ'' کے دائرہ کو مزید بڑھا دیا گیا ہے اور تمام جانداروں کے ''سجدہ'' کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

۲۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۝۴۹

''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں چلنے پھرنے والوں میں سے ہیں، اور فرشتے خدا کیلئے سجدہ کرتے ہیں اور ہر گز تکبیر نہیں کرتے۔'' (نحل۔۴۹)

تیسری مرتبہ نباتات اور درختوں کے سجدہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

۳۔ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ۝۶

---

[۱] ۔ عاقل ومدرک موجودات کے بارے میں سجدہ کی جو بات اس آیت میں بیان ہوئی ہے وہ دوسری آیات میں بھی آئی ہے۔ مثلاً نحل۔۴۹ ملائکہ کے سجدہ کے عنوان سے اور حج۔۱۸۔ ''من فی السماوات'' کے عنوان سے۔

[۲] ۔ اس آیت میں سجدہ سے مراد۔ جس میں تمام عاقل موجودات کے سجدہ کا بیان ہوا ہے۔ سجدہ اختیاری نہیں ہے کیونکہ اس میں شک نہیں ہے کہ بہت سی عاقل موجودات (مثلاً کافر انسان) اختیاری سجدہ کے تارک ہیں۔ اور خدا کی عبادت سے روگردان ہیں۔ اور اس مطلب کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ کہنا پڑے گا کہ اس سے مقصود سجدہ تکوینی ہے یعنی وہ تمام قوانین خلقت اور سنن آفرینش کی پیروی کرتے ہیں اور ان کیلئے مطیع وفرمانبردار ہیں۔

یہاں ایک سوال سامنے آسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر اس سے مراد سجدہ تکوینی ہے یعنی یہ کہ بندے فرمانِ خلقت ''کن'' کے لئے خاضع ومطیع ہیں تو پھر اس صورت میں اس قسم کے سجدہ کی تقسیم سجدہ ''طوعی'' اور سجدہ کرہی میں کس معنی میں ہوسکتی ہے البتہ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کا جواب ہم اثناء بحث میں دینگے اور یہ بیان کرینگے کہ فرمانِ خلقت کو قبول کرنا کبھی تو موجود مادی کے مزاج وطبیعت کے مطابق ہوتا ہے اور کبھی اسکے برخلاف مثلاً درخت کا پھلنا پھولنا اور تکامل تو اس کی طبیعت کے مطابق ہے لیکن اس کا خشک ہوجانا اور سردی کی وجہ سے نابود ہوجانا اس کی طبیعت کے برخلاف ہے۔ اس بنا پر پہلے فرمان اور حکم کے قبول کرنے کو سجدہ ''طوعی'' اور دوسرے کو سجدہ ''کرہی'' کہتے ہیں۔

''سر سبز پودے اور درخت اس کو سجدہ کرتے ہیں۔'' (الرحمٰن۔۶)

پھر ایک وسیع نظر کے ساتھ اجسام کے سایوں کے خضوع و سجود کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

۴۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

''کیا وہ ان اجسام کی طرف نہیں دیکھتے جنہیں خدا نے پیدا کیا ہے کہ ان کے سائے (صبح و شام) دائیں بائیں حرکت کرتے ہیں، اور خدا کو سجدہ کرتے ہیں جب کہ خود اجسام خضوع اور اطاعت کی حالت میں ہوتے ہیں۔'' (نحل۔۴۸)

۵۔ پانچویں مرتبہ خدا نے سورج، چاند، ستاروں، پہاڑ، درخت اور چوپاؤں کے بارے میں گفتگو کی ہے، جہاں فرماتا ہے:

۵۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ط

''کیا تو دیکھتا نہیں کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت چوپائے اور بہت سے انسان خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔'' (حج۔۱۸)

اس بناء پر موجودات کے سجدہ کرنے کا یہ مسئلہ ایک عمومی مسئلہ ہے جو سارے عالم ہستی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور کسی ایک موجود کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ وہ بات جو سب سے اہم ہے وہ ''سجدہ'' کی حقیقت کو سمجھنا ہے، اور یہ کہ ہر موجود، خواہ وہ ذی شعور ہو یا غیر ذی شعور عظمتِ حق کے سامنے اپنے خضوع و خشوع کا کس طرح سے اظہار کرتا ہے؟

موجودات کے سجدہ سے کیا مراد ہے؟

عام طور پر انسان کا سجدہ کچھ اعضاء کو جن میں سے پیشانی ہے اور بعض اوقات ٹھوڑی [1] کو بھی زمین پر رکھنے سے انجام پاتا ہے۔ یہ سجدہ کی ظاہری ہیئت ہے، لیکن اس کی روح وہی معبود کے سامنے تذلل و فروتنی اور خضوع کا اظہار کرنا ہے۔

یہاں یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ کیا ''سجدہ'' کو حقیقت کا جامہ پہنانے کیلئے ......جس کا مقصد کمال خضوع و تذلل ہے......ضروری ہے

---

[1] ۔قرآن اس عضو کی طرف اس آیہ میں اشارہ کرتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا (اسراء۔۱۰۷) گزشتہ لوگوں میں ذی علم افراد کے سامنے جس وقت (آیات خدا) کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل زمین پر گر جاتے ہیں۔

ہے کہ اس کی کوئی مخصوص ہیئت ہو کہ جب تک وہ ہیئت وصورت اختیار نہ کی جائے، اس لفظ کا استعمال نہیں کیا جا سکتا، یا اس کا معیار و میزان خضوع وفروتنی کا اظہار ہے، اور جہاں بھی یہ امر محقق ہو، وہاں ہی ہم اس لفظ کو استعمال کر سکتے ہیں، چاہیے وہ مخصوص ہیئت موجود نہ بھی ہو اور اگر ہم اس خاص ہیئت کو سجدہ کہتے ہیں تو وہ بھی اس لحاظ سے ہے کہ اس قسم کی ہیئت، لوگوں کی نگاہ میں انتہائی تواضع اور خضوع کی ترجمان ہے اور حقیقت میں وہ تذلل وفروتنی اور خضوع کے اظہار کا ہی ایک طریقہ ہے۔

قرآن اس مسئلہ میں دوسرے راستے کو اختیار کرتا ہے اور ہر قسم کے تذلل وخضوع وفروتنی کو...... خواہ وہ کسی صورت مین بھی انجام پائے ......سجدہ ہی کا نام دیتا ہے، نام رکھنے اور الفاظ کے استعمال کرنے میں عرف وعقل کی روش بھی یہی ہے۔ مثلاً کسی زمانے میں چراغ کا لفظ معمولی قسم کے چراغوں کیلئے استعمال ہوتا تھا، جن کی ایک خاص شکل وصورت ہوتی تھی، اور کسی لحاظ سے بھی انکا موجودہ زمانے کے روشن چراغوں پر قیاس نہیں ہوتا تھا لیکن چونکہ انہی قدیم چراغوں کی خاصیت اور اثر، موجودہ زمانہ کے چراغوں میں زیادہ کامل صورت میں پائی جاتی ہے اس لحاظ سے، ان قوی اور طاقت ورنور بکھیرنے والے چراغوں پر کسی قسم کا تغیر اور تبدیلی کے بغیر، مذکورہ لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

موجوداتِ عالم میں سجدہ کی حقیقت

عالم کے تمام موجودات، مقام ربوبیت کیلئے، اپنی فروتنی تواضع اور تذلل کا، ایک خاص طرز پر اظہار کرتے ہیں اور معبود جہان کے سامنے فروتنی اور تعظیم کے اظہار کیلئے، اعلیٰ ترین مظہر یہی ہے کہ سارا جہان اسی کے قبضہ قدرت میں ہے اور سب کے سب اسی کے فرمان اور ارادہ مطلقہ کے مطیع ہیں۔ دوسری لفظوں میں ایک ہی ارادہ پورے عالم پر حکومت کر رہا ہے، اور تمام موجودات اسی کی پیروی کر رہے ہیں اور اس کے سامنے کسی قسم کی مخالفت کا اظہار نہیں کرتے۔

اس بناء پر سجدہ میں اسی معنی (موجودات کی خدا کے ارادہ نافذ کے سامنے بے چون وچرا اطاعت) کے لحاظ سے کس قسم کا جبر تصور نہیں ہوگا، کیونکہ جبر واکراہ، وہاں ہوتا ہے کہ جہاں کوئی موجود از خود اپنی طرف سے کوئی ارادہ واختیار رکھتا ہو جس سے وہ دوسرے کے مقابلے میں مخالفت کا اظہار کرے، لیکن اس صوررت میں جب کہ کوئی موجود، خدا کی قدرت سے مدد حاصل کئے بغیر وجود ہی نہیں پاتا، اس کا اپنی طرف سے مخالفت کا ارادہ رکھنا، کجا! اور عظمت خدا کے سامنے سجدے کا ناپسند کرنے کی بات کہاں۔

رغبت اور کراہت کر کے سجدے

اس کے باوجود مشاہدہ یہ ہے کہ ''طوعاً وکرھًا'' (رعد۔ ۱۵) کا جملہ انسان اور ہر ذی عقل موجود کیلئے دو قسم کے سجدے ثابت کر رہا ہے ایک میں ورغبت کا سجدہ۔ اور دوسرا ایک کرامت ومجبوری کا سجدہ اس صورت میں ہم مجبور ہیں کہ ان دونوں قسم کے سجدوں کیلئے ایک خاص تفسیر کو اپنائیں اور یہ نہیں کہ رضا ورغبت کے سجدے سے مراد قبول کرنے کی وہ نوع ہے جو انسان یا ہر دوسرے موجود کی طبیعت اور مزاج سے موافق ہو، مثلاً نشوونما ورشد خون کی گردش اور دل کی حرکت اور کراہتی وجبری سجدے سے مراد ان حوادث کے ایک سلسلہ کو قبول کرنا ہے جو موجود کے

مزاج اور طبیعت سے ساز گار نہ ہو، مثلاً موت اور وہ مصائب جو انسان کو آخر عمر تک پہنچنے سے پہلے نابود کر دیتے ہیں۔

قرآن مجید میں ایک دوسرے آیت میں بھی طوعاًو کرھًا کے الفاظ آسمانوں اور زمین کے بارے میں استعمال ہوئے اور طبعاً اس سے مقصود وہی معنی ہیں جو بیان ہو چکے ہیں۔جیسا کہ فرماتا ہے۔:'' فَقَالَ لَهَا وَلِلۡاَرۡضِ ائۡتِيَا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيۡنَا طَآٮِٕعِيۡنَ ۝ ''(حمٰ السجدہ۔۱۱) آسمان اور زمین سے خطاب کیا اور کہا کہ (آو)اور ہر قسم کی تبدیلیوں اور تغیرات کے قبول کرنے میں میرے فرمان کو میل وارادہ کے ساتھ، یا کراہت و ناپسندیدگی سے قبول کرو، انہوں نے کہا ہم نے میل ورغب کے ساتھ قبول کیا۔''

اس بناء پر وجود کو بھی قبول کرنا، اور ہر قسم کے تصرف کو بھی قبول کرنا چاہیئے وہ طبیعت ومزاج کے موافق ہو یا اس کے مخالف، خدا کے سامنے خضوع اور فروتنی کا اظہار ہے۔البتہ یہ تمام قسم کی قبولتیں ،ایک معنی کے لحاظ سے میل ورغیب کے ساتھ ہیں ،اور ایک معنی کے لحاظ سے حوادث کی اس قسم میں جو مسیر طبعی کے برخلاف واقع ہوا ایک قسم کی کراہت پائی جاتی ہے۔ نہ صرف ہر موجود کا وجود اسکے قبضہ قدرت میں ہے ، بلکہ جسموں کے سائے بھی اپنی گردش وتغیرات میں اس کے ارادے اور مرضی کے تابع ہیں اور صبح وشام جسم کے دونوں طرف ، واضح اور صاف دکھائی دینے والے سائے نظر آتے ہیں۔ جو سب کے سب اسی کے ارادہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔

کیا یہ بات مناسب ہے کہ عالم کے تمام اجسام تو اپنے سایہ کے ساتھ خدا کے سامنے خضوع وفروتنی کا اظہار کریں ،لیکن انسان خدا کے سامنے سجدہ تشریعی نہ کرے، جب کہ وہ تکوینی لحاظ سے ہمیشہ خاضع وخاشع ہے، خاص طور پر جب کہ خدا نے زمین وآسمان کے مختلف موجودات کو انسان کے سامنے جھکا دیا ہے۔[1] تو پھر کیا یہ مناسب ہے کہ وہ خود اپنے پروردگار کے سامنے خضوع نہ کرے؟

ہمہ از بہر تو سرکشتہ و فرمانبردار
شرط انصاف نباشد کہ توفرماں نبری

''ساری کائنات تو تیرے لیے گردش میں ہو اور فرمانبرداری کرے، یہ تو انصاف کی بات نہیں کہ تو فرمانبرداری نہ کرے۔''

اب ہم جبکہ موجودات کے سجدہ کے معنی سے آگاہ ہو گئے ہیں اور یہ بات واضح ہوگئی ہے کو موجودات کے سجدہ سے مراد ان کا وہی سجدہ تکوینی ہے، تو اب ضروری ہے کہ ہم موجوداتِ عالم کی حمد وتسبیح کے بارے میں کچھ تفصیل کے ساتھ بحث کریں۔

۲۔تمام موجوداتِ عالم کی تسبیح

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حمد وثناء، اس کی صفات اس کی صفاتِ کمال یعنی صفات ثبوتیہ کیلئے ہے، اسی طرح اس کی تسبیح، اس کی نقائص ومصائب سے پاک، اور مبرا و منزا قرار دینا ہے اور ہر صفاتِ سلبی کے ساتھ خدا کی توصیف اس کی تسبیح وتنزیہ کہلاتی ہے

چونکہ بعض زیر بحث آیات میں، دونوں موضوع اکٹھے وارد ہوئے ہیں لہٰذا ہم بھی ان دونوں مباحث کو اکٹھا ایک ہی جگہ پیش کرتے

---

[1]۔انسان کیلئے آسمان اور زمین کی تسخیر سے مربوط آیات کی طرف رجوع کریں۔

ہیں اور آیات کی تقسیم میں ہر قسم کی ایک آیت کا بیان کافی سمجھتے ہیں۔

ا۔کبھی تو قرآن نے موجودات کی تسبیح کو ایک وسیع دائرے میں بیان کیا ہے اور اسے ایک امر عمومی کے طور پر جو عالم موجودات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔پیش کرتے ہوئے فرمایا:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ①

''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کی تسبیح وتنزیہ کرتا ہے اور وہی عزیز وحکیم ہے۔''(حدید۔ا)

لفظ''ما''بعض کے خیال کے برخلاف۔عاقل وغیر عاقل دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے اور یہاں اس سے مراد وہ تمام موجودات ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔اور سورہ حشر کی آیہ ا و ۲۴ سورہ صف کی آیہ ا۔سورہ جمعہ کی آیہ ا،اور سورہ تغابن کی آیت ا،اسی مضمون کی ہیں اور اس سلسلہ میں صریح ترین آیت،سورہ اسراء کی آیت ۴۴ ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۚ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۚ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ④④

''ساتوں آسمان اور زمین اور ان میں موجود ہر عاقل،خدا کی تسبیح وتنزیہ کرتا ہے اور عالم ہستی کی ہر شے خدا کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو،بے شک وہ حلیم وغفور ہے۔''

قابلِ غور نکتہ،جسے ہم بعد میں اپنی گفتگو میں سند کے طور پر کرینگے،یہ ہے کہ وہ کہتا ہے:ہم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔

۲۔کبھی فرشتوں کی تسبیح کے بارے میں صراحت کے ساتھ یا کنایہ کے طور پر کہتا ہے اور فرماتا ہے۔:

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۚ

''فرشتے اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں ،اور زمین پر رہنے والوں کیلئے طلب مغفرت کرتے ہیں۔''(شوریٰ۔۵)

فرشتوں کی تسبیح دوسری آیات میں بھی وارد ہوئی ہے،سورہ اعراف کی آیت ۲۰۶ رعد کی آیہ ۱۳،انبیاء کی آیہ ۲۰ مومن کی آیہ ۷،حٰم السجدہ کی آیہ ۳۸،اور زمر کی آیہ ۵ کی طرف رجوع کریں۔

۳۔کبھی ایک عمومی بیان کے بعد،فضا کے پرندوں کی تسبیح کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں، وہ خدا کی تسبیح کرتے ہیں، اور پروں کو پھیلائے ہوئے پرندے بھی تسبیح کرتے ہیں، اور ہر ایک اپنی دعا اور تسبیح سے آگاہ ہے۔''(نور۔۴۱)

غور فرمائیں کہ اس آیت میں اس گروہ کی طرف جو خدا کی تسبیح کرتے ہیں ''علم'' کی نسبت دیتا ہے اور ان کا اپنی تسبیح سے عالم آگاہ ہونے کے ساتھ تعارف کراتا ہے، اور اصطلاح کے مطابق فرماتا ہے: ''كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ'' ہر ایک اپنی دعا اور تسبیح سے آشنا ہے۔

پرندوں کی تسبیح دوسری آیات میں بھی وارد ہوئی ہے مثلاً سورہ سبا کی آیت ۱۰ اور سورہ ص کی آیت ۱۹

۴۔ بعض آیات میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ پہاڑ خاص اوقات میں خدا کی تسبیح کرتے ہیں، جیسا کہ فرماتا ہے:

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ﴿۱۸﴾

''ہم نے داؤد کیلئے پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا اور وہ شام کے وقت بھی اور صبح کے وقت بھی خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔''(ص۔۱۸)

پہاڑ کا تسبیح کرنا دوسری آیات میں بھی وارد ہوا ہے۔ مثلاً سورہ انبیاء کی آیہ ۷۹ اور سورہ سبا کی آیہ ۹۔

۵۔ پانچویں مرتبہ رعد (بادل کی کڑک کی) تسبیح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ

''رعد (بادل کی گرج) حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتی ہے۔''(رعد۔۱۳)

اب یہ دیکھنا ہے کہ تسبیح سے کیا مراد ہے؟

تسبیح لغت میں نقائص سے پاکی کے معنی میں ہے جب ہم کسی موجود کی نقائص وعیوب سے پاک بیان کرتے ہیں اس کو تسبیح کہتے ہیں، اس بناء پر ''تسبیح کی حقیقت میں نقص وعیب سے پاکی چھپی ہوئی ہے لہٰذا تسبیح'' کی چاہے جو بھی تفسیر کی جائے اگر اس میں خدا کی تقدیس اور عیب ونقص سے اس کی پاکی کا بیان نہ ہو اس کو تسبیح کی صحیح تفسیر نہیں کہہ سکتے۔

موجودات کی تسبیح کے بارے میں مفسرین کی آراء

بعض مفسرین نے جو تمام موجودات کی تسبیح کو نہ سمجھ سکے......اس اشکال سے فرار کیلئے جو تمام موجودات کی تسبیح کے بارے میں ظاہر طور پر نظر آتا ہے، یہ کہا ہے "مافی السماوات" کے "ما" سے مراد موجودات عاقل ہیں، جو شعور رکھتے ہیں مثلاً انسان اور فرشتہ جو خدا کی پورے ادراک وشعور کے ساتھ تقدیس کرتے ہیں۔[1]

جب کہ بہت سے مفسرین نے اس نظریہ کو قبول نہیں کیا ہے اور انہوں نے یہ کہا ہے کہ "ما" سے مراد عام ہے چاہے وہ عاقل ہو یا غیر عاقل، باشعور ہو یا بے شعور اور ظاہر آیت بھی ان کی نظریہ کے موافق ہے کیونکہ لفظ "ما" عام طور پر مطلق موجودات پر بولا جاتا ہے "من" کے برعکس جو زیادہ تر صاحبان عقل وشعور کیلئے استعمال ہوتا ہے۔اس گروہ نے تسبیح کیلئے گونا گوں معنی بیان کیے ہیں لیکن ان میں سے اکثر کا صحیح ودرست ہونے کے باوجود تسبیح کے معنی کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے، اب ہم کچھ دوسرے نظریات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

پہلا نظریہ

تسبیح سے مراد، ہر موجود کا، خدا کے فرمان اور ارادہ کے سامنے وہی خضوع تکوینی ہے اور سارا عالم ہستی خدا کے ارادہ ومشیت کے سامنے خاضع ہے اور وجود کو قبول کرنے اور ان قوانین کی پیروی کرنے میں جو خدا نے اس کیلئے معین کیے ہیں مطیع وفرمانبردار ہیں۔

اس نظریہ کی بناء پر ان آیات سے......جو عالم موجودات کے حق تعالیٰ کے ارادہ نافذ کرنے کے سامنے مطیع وفرمانبردار ہونے کو بیان کرتی ہیں......استدلال ہوسکتا ہے، مثلاً:

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴿۱۱﴾

"پھر آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا جب کہ وہ گیس کی صورت میں تھے اور ان سے اور زمین سے خطاب کیا کہ رضا ورغبت کے ساتھ یا کراہت سے میرے فرمان کی تعمیل کرو انہوں نے انتہائی رغبت کے ساتھ اس کی مشیت کی اطاعت کے سامنے گردن جھکا دی۔" (حٰمٓ السجدہ)

اس بناء پر وہ آیات جن میں ان تمام چیزوں کی طرف جو زمین وآسمان میں ہیں، سجود وخضوع کی نسبت دی گئی ہے اس نظریہ کی تائید میں پیش کی

---

[1] ۔یہ جواب بفرض صحت بعض آیات میں تو صحیح ہوسکتا ہے۔مثلاً وہ آیات جن میں لفظ "ما" وارد ہوا ہے لیکن ان آیات کے بارے میں جن میں صراحت کے ساتھ پرندوں، پہاڑوں اور رعد کی تسبیح کا بیان ہوا ہے، صحیح نہیں ہے۔

جاسکتی ہیں۔[1]

لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ نظریہ درست نہیں ہے کیونکہ خضوع وسجود اور ارادہ خدا کے آگے سارے عالم ہستی کے سر تسلیم خم کرنے کے مسئلہ کا حق تعالیٰ کی نقص وعیب سے پاکی اور تنزیہ وتقدیس کے مسئلہ کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے اور ان دونوں مطالب کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانا نہیں چاہیئے اگر چہ ان میں سے ہر ایک اپنے مقام پر درست اور صحیح ہے۔

دوسرا نظریہ

بہت سے مفسرین موجودات عالم کی تسبیح کی اس طرح تفسیر کرتے ہیں۔

ہر موجود کا حیرت انگیز اور تعجب خیز نظم وترتیب......اس رمز وپختگی کے ساتھ جو اس کے بنانے میں عمل لائی گئی ہے۔اس کے بنانے والے کی غیر انتہا ہی قدرت اور بے پایاں عقل وشعور اور حکمت پر شاہد وگواہ ہے۔ ہر موجود کی دقیق اور پیچیدہ اسرار والی ساخت جس طرح اپنے بنانے والے کے وجود کی گواہی دیتی ہے اسی طرح اپنی تکوینی زبان کے ساتھ یہ گوائی دیتی ہے کہ اس کا پیدا کرنے والا دانا وتوانا ہے اور ہر قسم کے عجز وجہالت سے پاک اور مبرا ہے۔

مثلاً حق تعالیٰ کی شرک سے پاکی کیلئے اس طرح گواہی دیتا ہے: وہ واحد نظام، جو ایک ''ایٹم'' سے لے کر نظام شمسی تک کو چلا رہا ہے اس بات پر گواہ ہے کہ سارا ساز مان ہستی ایک ہی خالق کا ساختہ پرداختہ ہے اور عالم ہستی کو وجود میں لانے کیلئے اس کے سوا اور کسی کا کوئی دخل نہیں ہے۔اور ایک ہی اثر اور یگانہ نظام، وحدت موثر اور ہر قسم کے شرک اور شریک کے نہ ہونے کا ترجمان ہے، اس بناء پر وحدتِ نظام، خدا کی شرک سے پاکی اور تنزیہ وتقدیس بیان کرتا ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح تمام جہانِ آفرینش پر ایک ہی نظم وقانون کی حکمرانی اس بات کی گواہ ہے کہ اس جہاں پر ایک ہی یکتا ویگانہ ناظم حکومت کر رہا ہے۔

اسی طرح موجودات کے اندازہ شدہ اور دقیق اسرار اس بات کی ترجمانی کرتے ہیں کہ ان کا پیدا کرنے والا دانا وتوانا ہے یہ نظریہ جس پر بہت سے مفسرین نے اظہارِ اعتماد کیا ہے کئی لحاظ سے قابلِ غور ہے۔

ا۔اگر تمام موجوداتِ عالم کے تسبیح کرنے سے خدا کی مراد یہ ہو، جو اس نظریہ میں بیان ہوا ہے تو یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے سب سمجھتے ہیں لہٰذا پھر تو اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے کہ قرآن سورہ اسرار کی آیہ ۴۴ میں یہ کہے۔''ولکن لاتفقھون تسبیحھم ''تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔'' کیونکہ اس قسم کے تنزیہم کو ہر فرد اپنے حالات سے مناسبت سے جانتا ادراک کرتا اور سمجھتا ہے۔بعض علماء اس نظریہ کی اصلاح کیلئے ''لاتفقھون ''کو عدم توجہ کے معنی میں لینے پر مجبور ہو گئے ہیں اور یہ کہنے لگے کہ اکثر لوگ اس مطلب کی طرف توجہ نہیں کرتے یا انہوں نے یہ کہہ دیا خدا کی تسبیح وتنزیہہ پر دلالت اتنی عظیم ہے کہ انسان اس کی واقعی مقدار سے واقف نہیں ہو پاتا لیکن یہ بات کہے بغیر ہی ظاہر ہے کہ مذکورہ

---

[1] ۔یہ تمام آیات سجود والے حصہ میں پیش ہو چکی ہیں اور وہاں ان پر غور وخوض ہوا ہے۔

توجیہہ اُوپر والے جملہ کے ظاہر کے خلاف ہے اور اگر خدا کی مراد یہی تھی تو مناسب تھا کہ وہ یہ فرماتا ہے"انتم عنه غافلون" یا اس قسم کا کوئی اور جملہ۔

۲۔اگر موجودات عالم کی تسبیح اس معنی میں ہے کہ چیزوں کی وجودی ساخت میں غور وفکر کرنے سے ہم اس قسم کی تکوینی تسبیح کو معلوم کر لیتے ہیں تو پھر قرآن سورہ نور کی آیت ۴۱ میں یہ کیوں فرماتا ہے سارے آسمان وزمین اور پرندے اپنی دعا اور تسبیح سے آشنا ہیں اور دوسرے لفظوں میں ان کی طرف آشکارا علم اور جاننے کی نسبت دیتے ہوئے یہ کیوں کہتا ہے:"کل قد علم صلاته وتسبیحه" ہر ایک اپنے راز و نیاز سے آشنا ہے جب کہ اس نظریہ کے مطابق تو ان میں سے کسی کو بھی اپنی تسبیح وتنزیہہ کی کوئی اطلاع نہیں ہے بلکہ یہ تو صرف ہم ہیں جو غور وفکر سے تکوینی زبان اور ان کی حمد وثنا کو معلوم کرتے ہیں۔ورنہ انہیں تو اپنے کام کی طرف معمولی سے معمولی توجہ بھی نہیں ہے۔

اگر کائنات کی تسبیح سے مراد یہی ہے جسے اکثر مفسرین نے اپنایا ہے تو اس قسم کی تسبیح کیلئے کوئی وقت معین نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ انسان جب بھی کسی موجود کی ساخت میں غور وفکر کرے گا،اس کو معلوم کرے گا جب کہ قرآن نے پہاڑوں کی تسبیح کو شام اور صبح کے ساتھ مقید کیا ہے جیسا کہ سورہ ص کی آیہ ۱۸ میں اس امر کی تصریح کرتے ہوئے فرماتا ہے۔"یسبحن بالعشیّ والاشراق"[۱]

ان ملاحظات کی رو سے، باوجود اس کے کہ خود تسبیح تکوینی اور ہر موجود کا اپنی تکوینی زبان کے ساتھ اپنے خالق کی ہر قسم کے عیب ونقص سے پاکی بیان کرنا، ایک صحیح مطلب ہے لیکن کائنات کے تسبیح کرنے سے مربوط آیات کو اس قسم کی تسبیح سے ہی متعلق نہیں سمجھا جا سکتا۔

تیسرا نظریہ

یہ نظریہ اسلام کے گرامی قدر فلسفی صدر المتالہین سے مربوط جو الٰہیات اور مابعد طبیعت امور سے مربوط مسائل کے بارے میں بہت سے اونچے اور بلند نظریات رکھتے ہیں اور فلسفہ اسلامی کے اصول کے بہت بڑے محققین اور موسسین میں سے ہیں کہ چشم فلک نے اس قسم کا وسیع الذہن، بلند بینش اور گہری معلومات والا کم ہی دیکھا ہوگا۔[۲]

---

[۱] ۔لیکن اگر یہ صبح وعصر، رات اور دن کے مجموعہ کی طرف کنایہ ہو تو اس صورت میں انکی تسبیح مطلق اور غیر محدود ہوگی۔

[۲] ۔یہ مرد بزرگ ۹۷۹ء میں شیراز میں پیدا ہوئے اور ۱۰۵۰ء میں بیت اللہ کی زیارت کیلئے جاتے ہوئے راستے میں بصرہ کے مقام پر وفات پائی۔مرحوم سید حسین بروجردی نے کتاب تحفۃ المقال میں ان کے بارے میں کہا ہے:

ثم ابن ابراہیم صدر الاجل — فی سفر الحج مریضا ارتحل

قدوۃ اہل العلم والصفاء — یروی عن الداماد والبھائی

پھر عالم اجل صدر بن ابراہیم ہے جس نے سفر حج میں رحلت کی، اہل علم اور باصفا لوگوں کے قائد ہیں جو سید داماد اور شیخ بہائی سے روایت کرتے ہیں۔"مریضا" کا لفظ ابجد کے حساب سے ۱۰۵۰ء بنتا ہے جو ان کی تاریخ وفات ہے۔

وہ فرماتے ہیں: عالم کے تمام موجودات علم وشعور، آگاہی وادراک کے ساتھ خداوند تعالیٰ کی حمد وثنا اور تسبیح وتنزیہی میں مشغول رہتے ہیں اور ہر موجود وجود کی جس منزل میں ہے اور اس کے پاس عالم ہستی کا جس قدر حصہ ہے وہ اسی مقدار میں اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کا علم وآگاہی رکھتا ہے اور اس کی اس طریقہ سے حمد وثنا کرتا ہے اور نقائص وعیوب سے پاکی بیان کرتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

علم وادراک وجود کے تمام مراحل ومراتب میں واجب الوجود سے لے کر عام نبات وجماد تک ،سب میں پایا جاتا ہے۔ اور ہر موجود، خواہ وہ وجود کے کسی بھی رتبہ میں ہو عمومی صفات، مثلاً علم وشعور وحیات وغیرہ............ کا کچھ نہ کچھ حصہ رکھتا ہے اور کوئی بھی اس سے خالی نہیں ہے البتہ کبھی ان صفات کے کمزور اور ضعیف ہونے کی بناء پر ان کا وجود ہمارے سامنے منکشف نہیں ہوتا، موجوداتِ عالم ، مادہ اور اس کے آثار سے جس قدر دور ہوتے جاتے ہیں اور ایک مجرد وجود کی صورت اختیار کرتے ہین یا تجرد کا راستہ اپناتے ہیں اسی قدر یہ صفات ان میں واضح تر اور قوی تر ہوتی جاتی ہیں اور وجود کے لحاظ سے وہ جتنا مادہ کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں یہ صفات ان میں اتنی ہی کم ہوتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ ان میں علم وادراک ہے ہی نہیں، حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے بلکہ ان صفات کی اصل ان میں کمزور حالت میں موجود ہوتی ہے چاہے وہ ہمیں دکھائی نہ دیتی ہوں۔

وہ اس مطلب کو عقلی برہان اور نفسانی مکاشفات کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں۔

وہ قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں قرآن کا یہ کہنا کہ تم موجودات کی تسبیح وتحمید سے آگاہ نہیں ہو، عام لوگوں کے ساتھ مربوط ہے کیونکہ لوگوں کی اکثریت کو ان کی تسبیح کا ادراک نہیں ہے لیکن اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ بعض روشن دل، وہ لوگ جن کی روح اور جان نے موجودات کے حقائق کے ساتھ ربط پیدا کر لیا ہے دل کے کانوں کے ساتھ انکی تسبیح وتنزیہہ کو سن لیں اور فرمان خدا کے آگے کائنات کی تسبیح سے آگاہ ہو جائیں۔ وہ دل جو مادی وسوسوں اور علائق سے خالی ہو، اور انوارِ حق اور برکات معنوی کے اترنے کا مرکز ہو، وجدانی مکاشفہ کے طریقہ سے ان تمام حقائق کو دیکھتا اور ان کا ادراک کرتا ہے۔

مولوی رُومی نے اپنی خاص بصیرت سے اس حقیقت کو معلوم کر لیا تھا لہٰذا وہ اس بارے میں یوں کہتا ہے:

گر ترا از غیب چشمے باز شد

جملہ ذرات جہاں ہمراز شد

نطق آب ونطق خاک ونطق گل

ہست محسوس حواس اہل دل

فلسفی کو منکر ”حنانہ“ است

از حواس انبیاء بیگانہ است[1]

---

[1] ۔مثنوی ج ۱ ص ۸۶: خط میر فانی

جملہ ذرات عالم درنہاں

باتومی گویند روزاں وشباں

ماسمیعیم وبصیریم وخوشیم

باشما نامحرماں ماخامشیم

چوں شماسوی جمادی می روید

محرم جان جمادات کے شوید

فاش تسبیح جمادات آیدت

وسوسہ تاوتلھا بربایدت

چوں ندارد جان توقندیلھا

بھر بنیش کردہ اے تاؤیلھا [1]

ترجمہ:

اگر تیرے لئے چشم غیب کھل جائے تو تمام ذرات عالم تیرے ہمراز بن جائیں۔ پانی مٹی اور گل کا بولنا اہل دل کے حواس میں محسوس ہوتا ہے۔ فلسفی جو ''حنانہ [2] '' کا منکر ہے وہ انبیاء کے حواس سے بیگانہ ہے۔ تمام ذراتِ عالم پوشیدہ طور پر صبح وشام تجھ سے کہتے ہیں کہ: ہم سنتے ہیں، دیکھتے اور خوش ہیں لیکن تم جیسے نامحرموں کے لئے خاموش ہیں۔ چونکہ تم مادیت کی طرف جھکاؤ رکھتے ہو، تو تم جمادات کی روح کے محرم کب بن سکتے ہو۔ تجھے جمادات کی تسبیح کی آواز واضح طور پر آرہی ہے لیکن تاویلوں کا وسوسہ تجھے اُچک لیتا ہے۔ چونکہ تیری روح میں معرفت کی قندیلیں روشن نہیں اس لیے تو نے ان کے دیکھنے کی تاویلیں کی ہیں۔

اب جب کہ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے تو ضروری ہے کہ اس قرآنی حقیقت کو ان آیات قرآنی میں غور وفکر کر کے جو تمام موجودات کے علم وشعور کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ معلوم کریں کیونکہ اگر قرآن تمام موجودات عالم کو تسبیح گو اور ثنا خواں کہتا ہے، تو دوسری طرف سے

---

[1] ۔مثنوی ج ۳ ص ۲۲۷

[2] ۔مسجد نبوی کا وہ ستون جس کو ٹیک لگا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ دیا کرتے تھے جس نے منبر کے بن جانے اور حضورؐ کے اس پر بیٹھنے پر گریہ کیا تھا۔

تمام ذرات ِ عالم کو باشعور و آگاہ اور صاحب گوش وہوش بتاتا ہے۔ اگر ہم ان دونوں قسم کی آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھیں تو صدر المتالہین کا نظریہ یقینی طور پر واضح ترین صورت میں ثابت ہو جائے گا اب ہم وہ آیات پیش کرتے ہیں جو ایٹم سے لے کر کہکشاں تک سارے عالم کیلئے شعور و ادراک کے وجود کی گواہی دیتی ہیں۔

تمام موجوداتِ عالم میں شعور کا وجود

اس نظریہ کو دو طریقوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وہ آیات جو عالم کے تمام موجودات کے بارے میں چاہے وہ جاندار ہوں یا غیر جاندار شعور کے وجود کی گواہی دیتی ہے۔

۲۔ عقلی دلائل جو تمام ذراتِ عالم میں شعور کے وجود کو ثابت کرتی ہیں۔

اب ہم پہلے طریقے کو لیتے ہیں۔

قرآن واضح طور پر گواہی دیتا ہے کہ چیونٹیاں ایک خاص شعور رکھتی۔ کیونکہ جس وقت حضرت سلیمانؑ اپنے سپاہیوں اور فوج کے ساتھ ایک بیاباں کو عبور کر رہے تھے تو ایک چیونٹی نے بیابان کی چیونٹیوں سے اس خوف کے سبب سے کہ کہیں سب کی سب سلیمانؑ اور ان کے لشکر کے پاؤں تلے نہ روندی جاویں، پکار کر کہا:

حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ⑱

''اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں سلیمانؑ اور ان کا لشکر تمہیں نابود نہ کردے اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔'' (نمل۔۱۸)

چیونٹے کی یہ ندا اور پکار ایک حقیقی اور واقعی پکار تھی، اور اس کو ہرگز مجازی معنی اور زبان حال پر محمول نہیں کیا جا سکتا جس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن کی نقل کے مطابق اس گفتگو کو سن کر سلیمانؑ مسکرانے لگے اور انہوں نے خدا سے دعا کی کہ وہ انہیں ان نعمتوں کیلئے جو اس نے ان کو اور ان کے والدین کو عطا فرمائی ہیں، شکر ادا کرنے کی توفیق دے، جیسا کہ فرماتا ہے:

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ

''سلیمانؑ چیونٹے کی بات سن کر حیران رہ گئے اور خدا سے دعا کی کہ وہ اسے اس نعمت کی شکر گزاری کی توفیق دے جو اس پر اور اس کے والدین پر کی ہے۔ (نمل۔۱۹)

قرآن مجید نے ایک پرندے ''ہُدہُد'' کے بارے میں داستان بیان کی ہے جو اس کے خاص شعور کی ترجمان ہے اس طور پر کہ وہ موحد کا مشرک سے تشخص کرتا ہے، اور سلیمانؑ اس کا مختلف امور سرانجام دینے کیلئے مامور کیا کرتے تھے۔ایک دن اسے غائب دیکھ کہ کہا: اگر اس کے پاس اپنے غائب ہونے کا کوئی معقول عذر نہ ہوا تو میں اسے سزا دوں گا۔ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ہُدہُد آ گیا اور اس نے کہا مجھے ایک ایسی بات معلوم ہوئی ہے جس کا آپ کو علم نہیں ہے۔ میں ''سبا'' کی حکومت کے بارے میں ایک حیران کن خبر لا یا ہوں ایک عورت ان پر حکمران ہے اور اسے ہر طرح کی نعمت حاصل ہے اور اس کا ایک بہت بڑا تخت ہے میں نے انہیں دیکھا کہ وہ خدا کی بجائے سورج کی پرستش کر رہے تھے۔شیطان نے ان کے اعمال کو ان کیلئے خوب صورت کر کے دکھایا ہے انہیں راہ حق سے باز کر رکھا ہے اور انہیں گمراہ کر دیا ہے۔

وہ اس خدا کو جس نے ہر امر پنہاں کو وجود بخشا ہے، سجدہ کیوں نہیں کرتے، جب کہ وہ ان کے پنہاں و آشکار عملوں سے واقف و آگاہ ہے وہ خدا کہ جس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے۔حضرت سلیمانؑ نے کہا میں تحقیق کروں گا اور یہ دیکھوں گا کہ تو اس میں سچا ہے یا نہیں، میرا یہ خط لے جاؤ اور انہیں پہنچا دو اور ان سے دور رہ کر دیکھتے رہو، اور یہ دیکھو کہ وہ میرے خط کے بارے میں کیا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔[1]

قرآن سلیمان کے اعزازوں میں سے ایک یہ سمجھتا ہے کہ وہ پرندوں کے زبان جانتے تھے لہٰذا کہتا ہے:

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوُدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ

''سلیمانؑ داؤدؑ کے وارث ہوئے اور انہوں نے کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی زبان کا علم دیا گیا ہے۔'' (نمل۔۱۶)

حضرت سلیمانؑ نے انسان، جن اور پرندوں سے ایک لشکر تیار کیا تھا اور وہ سب ان کے زیر فرمان تھے جیسا کہ فرماتا ہے:

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ

''حضرت سلیمانؑ کا لشکر تین گروہوں، جن و انس اور پرندوں پر مشتمل تھا۔'' (نمل۔۱۷)

ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ پرندے خاص طور پر اور باقی جانور عام طور سے ایک خاص علم و آگاہی رکھتے تھے اور اگر کوئی انسانِ کامل صفحہ عالم پر حکومت کرے تو وہ ان سے بات کر سکتا ہے اور ان سے نظامِ توحید کو مستحکم کرنے اور بت پرستی کے مظاہر کر توڑنے کیلئے استفادہ کر سکتا ہے۔

---

[1] نمل آیات۔۲۰۔۲۸

جمادات میں علم وآ گاہی کا ظہور

آیاتِ قرآنی نے اس موضوع کے بارے میں ایک خاص طرز پر گفتگو کی ہے اور جمادات کی طرف کچھ افعال کی نسبت دی ہے جن سے ادراک وآ گاہی کا پتہ چلتا ہے۔

بعض پتھروں کے ایک جگہ سے گرنے کوان کے ''خشیت'' اور خداترسی کا معلول سمجھتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

۵۔ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ‌ؕ

''کئی پتھر خدا کے خوف سے اپنی جگہ سے گر پڑتے ہیں۔ (بقرہ۔ ۷۴)

ایک آیت میں یہ بیان کرتا ہے کہ ''ہم نے امانت کوآسمانون ،زمین اور پہاڑوں پرپیش کیاتوانہون نے امانت کابار اٹھانے سے انکار کردیا، اور وہ ڈر گئے اور انسان نے اسے اپنے کاندھے پر اُٹھالیا...... جیسا کہ فرماتا ہے:

۶۔ اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ‌ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ۙ‏ ﴿۷۲﴾

(احزاب۔ ۷۲)

بعض مفسرین نے اس آیت اور اس جیسی آیات کو مجازی معنی پر جسے اصطلاح میں ''زبان حال'' کہتے ہیں محمول کیا ہے، حالانکہ اس قسم کی تفسیر پہلے سے کیا ہوا ایک فیصلہ ہے اور ہرگز کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس قسم کی حقیقت کو جسے قرآن پیش کررہا ہے اس کے غیر پر حمل کریں اور یہ جو کہتے ہیں کہ اس قسم کا شعور وآ گاہی، علمی طور پر منکشف نہیں ہوا ہے۔ تو یہ بات اس قسم کے شعور وآ گاہی کے موجودات میں نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے کیونکہ علم کی ذمہ داری صرف کسی چیز کا ثابت کرنا ہے اور بس اور علم کبھی بھی اس چیز کی نفی وسلب کا جس کے وجود وعدم سے وہ آ گاہ نہیں ہے حق نہیں رکھتا ہے۔

۷۔ لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ‌ ؕ وَتِلۡكَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ‏ ﴿۲۱﴾

''اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کردیتے توتم اسے خدا کے خوف سے خضوع وخشوع کے ساتھ پھٹتاہوادیکھتے اور ہم یہ توصیف لوگوں کیلئے اس لیے بیان کررہے ہیں ،تاکہ شاید وہ غوروفکر کریں۔'' (حشر۔۲۱)

اگر ہم آیات قرآنی کے بارے میں ہرقسم کے پہلے سے کیے ہوئے فیصلے کوایک طرف رہنے دیں تو پھر ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ

پہاڑوں میں اس قسم کی لیاقت وشائستگی ہے کہ اگر خدا ان سے خطاب کرے تو وہ خطاب کی عظمت سے آگاہی کرنے تمام چیزوں کو قوتِ گویائی عطا کی ہے، اسی نے ہم سے بات کرائی ہے۔

قرآن وضاحت کے ساتھ گواہی دیتا ہے کہ قیامت کے دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی اور خدا کی طرف سے اسے وحی ہوگی ،جیسا کہ فرماتا ہے۔:

۱۳۔ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝

''اس دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی کیونکہ اس کے پروردگار نے اسے وحی کی ہے۔'' (زلزال۔ ۴،۵)

قرآن وضاحت کے ساتھ آسمان وزمین کی اطاعت اور فرمانبرداری کی خبر دیتا ہے اور فرماتا ہے:

۱۴ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ۝

''ہم نے آسمان وزمین سے کہا میل ورغبت کے ساتھ یا جبر وکراہت سے فرمانبرداری کرو، انہوں نے کہا ہم از روئے اطاعت فرمانبردار ہیں۔ (حٰم السجدہ)

یہ آیات اور انہیں جیسی دوسری آیات اس گروہ کی نظر میں جو قرآن سے سبق لینا چاہتے ہیں اور قرآن کے معانی کو سمجھنے مین پہلے سے کیئے ہوئے فیصلوں کو سامنے نہیں رکھتے سارے جہاں میں ادراک وشعور کے وجود کی وضاحت کے ساتھ خبر اور آگاہی دیتی ہیں اب اس شعور اور آگاہی کی حقیقت کیا ہے اور کس حد تک ہے ہمارے لئے واضح نہیں ہے۔

اسلامی دعاؤں میں بھی اس مطلب کی طرف اشارے ملتے ہیں جن میں سے نمونہ کے طور پر دو موارد نقل کرتے ہیں۔

"تسبح لك الدواب فی مراعیها والسباع فی فلواتها والطیر فی وکورها وتسبح لك الجار بامواجها والحیتان فی میاهها"

''چار پائے اپنی چراگاہوں مین، درندے بیابانوں میں، اور پرندے اپنے آشیانوں میں تیری تسبیح کرتے ہیں اور سمندر اپنی متلاطم موجوں کے ساتھ مچھلیاں اپنے پانیوں میں تیری تسبیح کرتی ہیں۔صحیفہ سجادیہ میں یوں آیا ہے: امام سجادؑ رویتِ ہلال کے موقع پر چاند کو ذیل کے جملوں کے ساتھ خطاب کیا کرتے تھے۔

"ایها الخلق المطیع الدائب السریع المتردد فی منازل التقدیر"

اے فرمانبردار تیز رو مخلوق جو ہمیشہ ان منازل میں ،جو تیر ے لیے اندازے کے ساتھ مقرر کر دی گئی ہیں بنا پر، پھٹ کر بکھر جائیں۔''

بعض آیات سے بطور اشارہ اس قسم کی آگاہی کے وجود کا علم ہوتا ہے جہاں فرماتا ہے:

۸۔ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

''قریب ہے کہ ان کے حیلہ سے پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے۔'' (ابراہیم۔۴۶)

۹۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾

''قریب ہے کہ آسمان اس کی ہولناکی سے پھٹ پڑے اور زمین شگافتہ ہو جائے اور پہاڑ درہم برہم ہو جائیں۔ (مریم۔۹۰)

اگر واقعاً پہاڑوں میں اپنے سے خارج اوصناع و کیفیات سے آگاہی کی لیاقت نہ ہوتی تو ان کے بارے میں اس قسم کی توصیف اور بیان بلاغت سے دور ہوتا، اور اس صورت میں ہم آیت کیلئے مبالغہ وتمثیل جیسے مجازی معنی فرض کرنے پر مجبور ہو جاتے ،جیسا کہ کئی ایک مفسرین نے اس موقع پر اس قسم کے کام کا ارتکاب کیا ہے۔ روز قیامت سے مربوط آیات اس قسم کی آگاہی سے پردہ اٹھاتی ہیں کیونکہ اس دن ہاتھ، پاؤں اور جلد انسان کے جرائم کے خلاف شہادت دیں گے اور حکمِ خدا سے مجرم انسان کو اس کی زندگی کی خصوصیت اور اس کے کاموں کے بارے میں جو اس نے انجام دیے ہیں مطلع کریں گے۔ اس موضوع سے متعلق آیات یہ ہیں:

۱۰۔ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲۴﴾

''ایک دن ایسا آئے گا کہ ان کی زبانیں ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے برخلاف گواہی دیں گے۔'' (نور۔۲۴)

۱۱۔ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۶۵﴾

''ایک دن ایسا آئے گا کہ ہم ان کی زبانوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے گفتگو کریں گے اور ان کے برے کردار پر گواہی دیں گے۔ (یٰس۔۶۵)

۱۲۔ وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ

''اپنی جلد سے کہیں گے: تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی ہے وہ کہیں گے کہ وہی خدا جس نے ہر شئی کو نطق عطا کیا اسی نے ہمیں نطق عطا کیا۔'' (حٰم السجدہ۔۲۱)

ان آیات اور روآیات کی موجودگی میں جو سارے موجوداتِ عالم میں شعور وادراک کا پتہ دیتی ہیں، تسبیح موجودات کی تفسیر کے سلسلہ میں مرحوم صدر المتالہین کے نظریہ کو اپنانا پڑے گا اور یہ کہنا پڑے گا کہ یہ تسبیح واقعی اور حقیقی تسبیح ہے اور موجوداتِ عالم اپنی مخصوص زبان میں خدا کی تسبیح کرتے ہیں نہ کہ زبانِ حال سے جیسا کہ گزشتہ نظریات میں موجود تھا۔

اس نظریہ پر عقلی دلیل

اس نظریہ کو عقلی دلیل اور حکمت متعالی[1] کے اصول کے ساتھ ثابت کیا جاسکتا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے۔ وجود وہستی کے ہر مقام ومرتبہ میں، ضروری ولازمی علم وشعور موجود ہوتا ہے اور ہر چیز کا جتنا بھی وجود وہستی ہے اتنا ہی اس میں علم وشعور پایا جائے گا اور فلسفی دلائل اس نظریہ کی مکمل تائید کرتے ہیں اور ان کے فلسفی برہان کی بنیاد دو چیزیں ہیں۔

۱۔ عالم ہستی میں جو چیز اصل اور آثار وکمالات کا سرچشمہ ہے وہ ''وجود'' ہے اور ہر قسم کا معنوی ومادی فیض اسی کے ساتھ مخصوص ہے اگر عالم میں علم وادراک، قدرت وتوانائی اور زندگی وحیات ہے تو یہ سب کچھ اشیاء کے وجود کا پرتو ہے اگر وجود ہی ختم ہوجائے تو یہ سارا جوش وخروش اور سعی وکوششیں ختم ہوجائیں۔

۲۔ وجود کیلئے تمام مراحل ہستی میں، خواہ واہ واجب ہو، یا ممکن، مجرد ہو یا مادی، عرض ہو یا جوہر ایک حقیقت کے سوا کچھ نہیں، اور اگر چہ وجود کی حقیقت ہمارے لیے واضح نہیں ہے لیکن ہم اس حقیقت کی طرف ذہنی مفاہیم کے ایک سلسلہ کے ساتھ اشارہ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک ایسی چیز ہے جو عدم اور نیستی کو دور کرتا ہے اور حقیقت وعینیت بخشتا ہے۔ اس بناء پر جہاں بھی ہمیں وجود مل جائے وہاں ہی ہم ان دوصفات (عدم کو دور کرنا اور حقیقت خارجی وعینی کی صورت بنانا) کو موجود پاتے ہیں، اس لحاظ سے ہم کہتے ہیں کہ وجود اپنے تمام مراحل میں ایک حقیقت سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور وہ یہ کہ اس میں تمام مراحل میں مذکورہ دوصفحات جن کی حقیقت بھی ایک ہی ہے پائی جاتی ہیں۔

اس بیان کی رو سے کہ ہم وجود کو تمام کمالات کا منبع سمجھیں اور اسے ایک ہی حقیقت مانیں ہمیں یہ نتیجہ نکالنا پڑے گا جب وجود میں ہستی کے مراتب میں سے کسی مرتبہ میں بھی مثلاً: جاندار موجودات میں، (علم ادراک کا) کوئی اثر پایا جائے تو یقیناً یہ اثر وجود کے تمام مراحل میں اس حصہ کی نسبت سے جو وجود کا رکھتا ہے پایا جانا چاہیے اور اس صورت کے علاوہ یا تو پھر وجود کو کمالات کا سرچشمہ تصور کریں اور اس کی اس حقیقت کو جو جانداروں کے مرتبہ میں ہے اس حقیقت سے جو کیا اور معدن میں پائی جاتی ہے۔ مختلف سمجھیں کیونکہ اس کا کوئی معنی ہی نہیں ہے کہ ایک حقیقت ایک مرتبہ میں تو ایک اثر رکھتی ہے اور دوسرے مرتبہ اس اثر سے محروم ہو۔ دوسرے لفظوں میں: جب وجود میں مختلف حقائق پائے جائیں گے تو اس بات کی گنجائش

---

[1] ۔ حکمت متعالی، صدر المتالہین کے فلسفہ کو کہتے ہیں جو فلسفہ اسلامی میں اپنے لیے ایک خاص مکتب رکھتے ہیں۔

ہے کہ اس کے ایک لفظ میں تو ایک اثر پایا جائے اور دوسرے لفظ میں اس کا نام ونشان بھی نہ ہو،لیکن جب اس کے لئے ایک سے زیادہ حقیقت نہ ہواوراس کے مصادیق کا فرق مراتب کے شدت وضعف کی بناء پر ہو،تواس صورت میں ایک ہی حقیقت کے ایک مرحلہ میں ایک اثر رکھنے اور دوسرے مرتبہ میں ویسا ہی اثر نہ رکھنے کا کوئی معنی ہی نہیں ہے۔اس برہان فلسفی کا خلاصہ ہے جس کے بارے میں،مرحوم صدرالدین نے،اسفار[1] میں مختلف مقامات پر بحث کی ہے وہ فرماتے ہیں،قرآنی آیات کا ظاہر اس حقیقت کی تائید کرتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ

''تمام موجودات اپنی حمدوثنا کے ساتھ خدا کی تسبیح کرتے ہیں لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔''(اسراء۔۴۴)

مرحوم صدرالدین نے اس فلسفی اور قرآنی حقیقت کو شہود اور مکاشفہ کے طریق سے بھی درک کیا ہے اورانہوں نے اپنے رسالہ سیروسلوک میں اس مضمون کے اشعار بھی کہے ہیں:

برعارف همه ذرات عالم
ملک وارند در تسبیح هردم
کف خالی که دررویِ زمین است
برعارف کتاب مستبین است
بهرجادرانه ای درباغ وراغی است
دردن مغزاوروشن چراغی است
به فعل ایدزدقوه هرنهالی
زهرخاکی یکی عقلی وجامی
بودمامحرماں راچشم دل کور
وگرنه هیچ ذره نیست بے نور
بخواں توآیه نورالسمٰوات
که چوں خورشید یابی جمله ذرات
که نادانی که درهرذره ای خاک

[1] اسفارج اص ۱۱۸ وج ۶ ص ۱۳۹ و ۱۴۰

یکی نوریست تاباں گشت زاں پاک

ترجمہ:

عارف کے سامنے عالم کے تمام ذرات فرشتے کی مانند تسبیح کر رہے ہیں۔ عالم کیلئے روئے زمین میں خالی سطح ایک روشن کتاب ہے۔ کسی باغ یا سبزہ زار میں جہاں بھی کوئی دانہ ہے، اس کے مغز کے اندر ایک روشن چراغ موجود ہے۔ ہر پوشیدہ چیز قوۃ سے فعل میں بدل جاتی ہے، ہر خاک سے ایک فلسفی اور ایک جامی پیدا ہوتا ہے ۔ نامحرموں کے دل کی آنکھ اندھی ہوتی ہے ورنہ کوئی ذرہ بھی نور کے بغیر نہیں ہے۔ تو اللہ نور السمٰوات (اللہ آسمانوں کو منور کرنے والا ہے) والی آیت کو پڑھ تو تجھے سب ذرات سورج کی طرح نظر آئیں گے۔ تاکہ تجھے معلوم ہو کہ خاک کے ہر ذرہ میں ایک ہی نور چمک رہا ہے جس کی وجہ سے وہ پاک وصاف ہے۔

موجودہ زمانے میں شعور وعلوم کی وسعت

خوش بختی سے موجودہ زمانے کے علوم نے ماہرین کی تحقیق کے زیر اثر عالم نباتات میں علم وادراک کے وجود کو ثابت کیا ہے یہاں تک کہ روسی ماہرین کا نظریہ یہ ہے کہ نباتات میں بھی اعصاب ہوتے ہیں اور وہ چیخ وپکار کرتے ہیں۔ ''ماسکو'' کی کھیتی باڑی کے علامات کی لیبارٹری نے ایک گھاس کی جڑ کی چیخ وپکار، جو گرم پانی میں رکھی گئی تھی ریکارڈ کیا ہے، عالمی خبر رساں انجنسیوں نے ماسکو کے ریڈیو سے نقل کیا ہے کہ نباتات کے اعصاب ہوتے ہیں اور وہ چیختے چلاتے بھی ہیں۔

ماسکو ریڈیو نے کل رات کی نشریات میں نباتات اور گیاہوں کے بارے میں روسی ماہرین کی تحقیقات کے نتیجہ کے ایک گوشہ کا انکشاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ ماہرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ گیاہ اور سبزے میں بھی جانداروں کے اعصاب کے جال سے مشابہ ایک کارخانہ لگا ہوا ہے۔ یہ ایک ماہر کی آزمائش کا نتیجہ ہے جس نے کدو کے تنے اور اس کے چھلکے کی دست گاہوں کے ساتھ آواز ریکارڈ کرنے والے آت نصب کر دیے اور پھر جڑوں اور گیاہ کے سلسلے میں مسلسل تحقیقات کیں اور گیاہ کی جڑ کاٹتے وقت اس گیاہ کے عکس العمل کو مشاہدہ کیا۔

اس آزمائش کے زمانہ میں ہی ''انگلستان کے کھیتی باڑی سے متعلق علوم نباتات کی فزیالوجی'' کی لیبارٹری میں ایسی ہی تحقیق وآزمائش نے اس کی مشابہ نتیجہ دکھایا ہے اس آزمائش اور تحقیق میں انہوں نے گھاس کی جڑ کو گرم پانی میں رکھا تو انہوں نے سنا کہ اس گیاہ کی داد وفریاد کی صدا بلند ہوئی۔ البتہ گھاس کی چیخ وپکار اس طرح نہیں تھی، جو کانوں تک پہنچ جائے لیکن اس گیاہ کی غیر مرئی آوازِ گریہ وبکا کو انہوں نے دقیق الیکٹرونکی مشین کے ذریعہ ایک وسیع اور چوڑی ریل پر ضبط کر لیا۔[1]

---

[1] ۔ اطلاعات ۱۶ بہمن ۵۲ ۱۳

اِس حِصّہ میں

۱۔علم کلام کی کتابوں میں، وجود خدا کے علمی و فلسفی دلائل کے اصول

۲۔ وہ دلائل یہ ہیں :۱۔برہان فطرت ۲۔برہان حدوث ۳۔برہان مکان ۴۔برہان حرکت ۵۔برہان نظم ۶۔برہان محاسبہ احتمالات

۷۔برہان موازنہ وکنٹرول ۸۔برہانِ راہ یابی جانداران ۹۔برہان ہم آہنگی موجودات ۱۰۔برہان صدیقین

۳۔خدا کے بارے میں عرب معاشرے کا عقیدہ

۴۔قرآن میں وجودِ خدا کے براہین (انسانوں کے فقر و فاقہ اور احتیاج کے امکان کی برہان)

۵۔کیا خدا کے وجود میں شک ہے؟ (مسئلہ بداہت وجود خدا)

۶۔کیا وہ بغیر کسی علت کے وجود میں آئے ہیں (برہان دور) یا کوئی اور خدا رکھتے ہیں؟ (بطلان شرک)

۷۔نطفہ کی تکوین، اور مٹی میں چھپے ہوئے دانوں سے سرسبز فصلوں کا پیدا ہونا اسمان سے میٹھے پانی کا برسنا اور سرسبز درختوں سے ضروری انرجی کا حاصل ہونا خدا کے وجود پر گواہ ہیں۔(برہان امکان یا برہان نظام)

۸۔اجرام آسمانی کی ربوبیت کے بارے میں ابراہیم کی منطق اور اس کی تشریح۔

۹۔خدا کے وجود کے آفاقی اور انفسی دلائل

۱۰۔خداشناسی اور صفحہ آفرینش اس کے وجود کی نشانیاں

۱۱۔ابن سینا کے نظریہ کے مطابق صدیقین کی برہان۔

۱۲۔صدر المتالہین کی نظر میں صدیقین کی برہان۔

وجودِ خدا کو ثابت کرنے کے براہین کے اصول

علمائے عقائد نے علم کلام میں وجود خدا کے ثابت کرنے کیلئے بہت سے عقلی دلائل بیان کیے ہیں اور ہم اس حصہ میں راہ فطرت [1] کے سوا جو دل کی راہ ہے نہ کہ عقل کی ان براہین کے اصول کی طرف اختصار کے ساتھ اشارہ کریں گے۔ علماء کے درمیان ایک قول مشہور ہے کہ ''الطرق الی اللہ بعدد انفاس الخلائق ''خدا کی شناخت کی اتنی دلیلیں ہیں جتنی جاندار موجودات کی سانسیں۔

شاید یہ بات ان لوگوں کے لئے جنہوں نے علوم الٰہی میں غور وفکر اور تحقیق ومطالعہ نہیں کیا حیرانگی اور تعجب کا باعث ہو اور وہ خود سے یہ کہیں کہ جانداروں کی سانسوں کے برابر، خدا کے وجود کی دلیلیں کس طرح سے موجود ہیں لیکن اگر ہم صرف خداشناسی کی دلیلوں کے اصول سے جو علم کلام اور فلسفہ کی کتابوں میں ہیں۔ آشنا ہو جائیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس قسم کی بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ یہ عین حقیقت ہے، کیونکہ ان دلیلوں میں سے بعض جن کے اصول کی طرف ہم بھی اشارہ کریں گے اس قدر مضبوط اور وسیع ہیں کہ ہر ذرہ اور ہر ایٹم کے نظام کو وجود خدا پر واضح دلیل قرار دیتے ہیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ عالم کے ایٹموں کی تعداد کس قدر ہے اب ہم ان رائج دلیلوں کے اصول اور اس بنا پر کہ توحید کے دلائل کے تمام اصول ایک ہی جگہ آ جائیں۔ دلیل فطرت کو بھی یہاں پر بیان کرتے ہیں، اگرچہ ہم پہلے حصہ میں اس کے بارے میں تفصیلی طور پر بحث کر چکے ہیں۔

۱۔ دلیلِ فطرت

دلیلِ فطرت جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، قلب و دل کا راستہ ہے، نہ کہ عقل واستدلال کا، اور ہر شخص خواہ مخواہ اپنی عمر کے کسی حصہ میں یا ساری عمر خدا کی طرف کھینچتا رہتا ہے اور خدا خواہ وخدا جو ہو جاتا ہے دوسرے لفظوں میں خدا اور انسان کے درمیان ایک قسم کا رابطہ ہے کہ انسان ہمیشہ خود کو ذاتِ حق کا مجذوب اور اس کا نیاز مند سمجھتا ہے۔

۲۔ بُرہانِ حُدوث

برہان حدوث اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عالم علمی وفلسفی دلائل کی بنا پر حادث (عدم سے وجود میں آیا) ہے یعنی اس کا ایک آغاز ہے اور عدم سے وجود میں آیا اور جو چیز عدم اور نیستی کے بعد ہو یقیناً اسے وجود میں لانے والے کی ضرورت ہے اور علماء ومتکلمین اسلام نے اثبات صانع کے بارے میں زیادہ تر حدوث عالم پر تکیہ کیا ہے۔

---

[1] ۔ راہِ فطرت اس کتاب کے پہلے حصہ میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔

۳۔ بُرہان امکان

عام طور فلاسفہ اسلامی چیزوں کو واجب ممکن اور ممتنع میں تقسیم کر کے وجودِ خدا کو ثابت کرتے ہیں کیونکہ ہر موجود چیز جو ذہن میں آتی ہے وہ تین حالتوں سے خارج نہیں ہے یا تو وہ خود اپنی ذات سے وجود کا تقاضا کرتی ہے اور اس کا وجود خود اسی میں خود بخود ہوتا ہے اور اصطلاح میں وہ ''واجب الوجود'' ہوتا ہے، یا وہ اپنے اندر سے عدم کا تقاضا کرتا ہے اور اصطلاح کے مطابق ممتنع الوجود ہوتا ہے یا وجود وعدم کے ساتھ اس کی نسبت یکساں ہوتی ہے اور وہ اپنے اندر سے نہ وجود کا تقاضا کرتی ہے اور نہ عدم کا اور وہ اصطلاح میں ممکن الوجود کہلاتی ہے۔

پہلا حصہ یعنی وہ چیز جس کا وجود خود اپنے لئے خود بخود ہوتا ہے اور اس کے لئے ہستی و وجود ایک لازم وضروری امر کی صورت میں ہوتا ہے وہ ہر قسم کی علت سے بے نیاز ہوتا ہے کیونکہ ''علت کی احتیاج'' کا سبب کسی وجود کا نہ ہونا ہے۔ وہ چیز جس کیلئے وجود وہستی لازم وضروری ہو، اسے علت کی کوئی نیاز وحاجت نہ ہوگی، تقریب ذہن کے لئے یہ بات نظر میں رکھیں، کہ ''چار'' کا عدد ''جفت ہوتا'' ہے، چار کا عدد جفت ہونے میں کبھی بھی کسی علت کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ اس قسم کی حالت اس کیلئے ضروری ہے اور یہ بات ممکن نہیں ہے کہ چار کا عدد محقق وثابت ہو لیکن اس میں جفت کی حالت نہ ہو۔

جب عالم میں کوئی ایسا وجود نظر آئے جس کیلئے وجود وہستی وہی ''چار'' کے عدد کیلئے ''جفت'' ہونے کی حالت رکھتی ہو تو قہراً ایسا موجود علت سے بے نیاز ہوگا۔

اسی طرح ہر وہ چیز جو مقام امتحان وآزمائش میں ہستی کو قبول نہ کرے اور اس کو دور کر دے، اور ہستی اس کیلئے ایسی ہو جیسے کہ ''چار'' کے عدد کو ''طاق'' کہنا تو اس قسم کی چیز کے لئے ''ہستی کو طرد'' کرنے کی بنا پر مسئلہ ''علت'' پیش نہیں آئے گا کیونکہ وہ چیز جو ہستی کو قبول ہی نہیں کرتی اس کی ہستی کی علت کے بارے میں بحث کرنا بے معنی ہوگا۔

اب بحث صرف بیان کردہ تقسیم کی تیسری قسم کے بارے مین ہے وہ چیز جو اپنے اندر سے وجود وعدم کا تقاضا نہ رکھتی ہو اور دونوں اس کیلئے مساوی ہوں اس قسم کی چیز اسی صورت میں ہستی کو قبول کرے گی جب باہر سے کوئی عامل اسے برابر ہونے کی حالت سے باہر نکال دے اور اسے ہستی کا لباس پہنائے اس قسم کے وجود کی ہستی کسی ''ہستی بخشنے والے'' کے وجود کی نشانی ہوگی جس نے اسے ہستی بخشی ہے اور متفقہ طور پر جہاں طبیعت اور عالم مادہ تیسری قسم کے زمرہ میں ہے کیونکہ:

جب ہم اس جہاں کی چیزوں اور وجود میں آنے والی اشیاء کو اپنے ذہن میں وجود اور عدم کے ساتھ ناپتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی نسبت وجود اور عدم کے ساتھ یکساں ہے یعنی ان کے اندر نہ وجود چھپا ہوا ہے اور نہ عدم کیونکہ اگر ان کی ذات کے اندر سے وجود خود بخود موجود ہوتا ہے تو پھر انہیں ہمیشہ موجود ہونا چاہیے اور کبھی بھی معدوم نہیں ہونا چاہیے جب کہ ہم اس کے برخلاف مشاہدہ کر رہے ہیں، اور ان کی ذات کے اندر عدم ابھرتا ہے۔ تو پھر انہیں کبھی موجود نہیں ہونا چاہیے حالانکہ ہم انہیں موجود دیکھ رہے ہیں اب جب کہ انہوں نے لباس وجود پہن رکھا ہے یقیناً ان سے خارج کی کسی قوت نے انہیں حد وسط، تساوی اور وجود عدم سے بے طرفی کی حالت سے باہر نکالا ہے اور انہیں موجودات کی

صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

یہ خارج از ذات قوت، اگر خود انہیں چیزوں کی طرح ممکن الوجود ہو تو پھر خود اسے بھی کسی دوسرے عامل کی احتیاج ہوگی، جو عدم و نیستی کو اس سے دور کر کے اسے وجود بخشے اور اگر وہ تیسرا عامل بھی جو دوسرے عامل کی مدد کیلئے آگے آیا ہے وجود کے لحاظ سے دوسرے کی طرح ہی ہو، تو قہراً تسلسل لازم آئے گا، اور چونکہ تسلسل عقل کی نگاہ میں باطل ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تمام حوادث ایک مستغنی بالذات اور قائم بنفسہ موجود تک پہنچیں، جو وجود کو حقیقت کا لباس پہنانے میں ہر جگہ اور ہر چیز سے بے نیاز ہو اور وہی دانا و توانا ذات واجب الوجود ہے۔

۴۔ برُہانِ حرکت

گزشتہ زمانے میں علوم طبیعی کے ماہرین مثلاً ارسطو اور اس کے مکتب کے پیروکار آسمان میں نورانی اجسام میں حرکت کے موجود ہونے سے کسی محرک (خدا) کے وجود پر استدلال کیا کرتے تھے، ایسا محرک جس نے ان میں تو حرکت پیدا کی ہے لیکن خود حرکت سے پاک و مبرا ہے مرحوم صدر المتالہین نے ستارہ چاند اور سورج کی ربوبیت کے بارے میں ابراہیمؑ کی منطق کو اسی برہان کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔[۱]

۵۔ عالمِ آفرینش میں نظم وضبط کی برہان

ایٹم سے لے کر کہکشاں تک موجودات عالم کا حیرت انگیز اور تعجب خیز نظام، عقل مندوں، غور وفکر کرنے والوں اور بیدار دل[۲] لوگوں کو خدا کی طرف رہبری کرتا ہے ہے کیونکہ اس قسم کا نظام و ترتیب ایک عقل کل اور عظیم فکر و نظر کی مداخلت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور وہ آیات جو قرآن میں عالم خلقت میں اس کی نشانیوں کو بیان کرتی ہیں اگر وہ اثبات صانع کی طرف ناظر ہوں تو ان کا تکیہ برہان نظام پر ہے کیونکہ اگر انواع عالم میں سے ہر نو، یا درختوں کے پتوں میں سے ہر پتہ، یا ذراتِ عالم میں سے ہر ذرہ، اس کے علم وقدرت اور ارادہ وحکمت کو بیان کرتا ہے تو قہراً وہ اس کے اصل وجود پر بھی گواہ ہوگا اور اس حصہ کا تفصیلی بیان اس کے اپنے مقام پر ہوگا۔

مذہبی پیشواؤں، خصوصاً امام صادق علیہ السلام اپنے ان مناظروں میں جو آپ اپنے زمانہ میں مادیین سے کیا کرتے تھے برہان نظم پر ہی تکیہ کیا کرتے تھے اور اس برہان کے بارے میں امام ششم کی ساری گفتگو کتاب توحید مفضل میں جو امام کی املاء اور مفضل کی تحریر ہے آئی ہے اور یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔[۳]

---

[۱] ۔ مبداء و معاد ص ۱۱۔ ۱۲ اور ہم آئندہ اس بارے میں اپنے نظریہ کو بیان کریں گے۔

[۲] ۔ یہ تین عبارتین قرآن سے ماخوذ ہیں اور یہ کتاب آسمانی خدا کی قدرت اور علم کی نشانیوں کو بیان کرتے وقت اپنی گفتگو کو ''اولوا الالباب'' ''قوم یتفکرون'' کے جملوں پر ختم کرتی ہے اسی لئے ہم بھی ان تینوں تعبیروں کو یہاں لائے۔

[۳] ۔ مرحوم علامہ مجلسی نے توحید مفضل کا سارا رسالہ جلد ۲ ص ۵۷، ۱۵۱ میں نقل کیا ہے۔

۶۔ برُ ہان محاسبہ احتمالات

یہ برہان مغرب کے ماہرین کی ایجاد ہے اوران میں سے مشہورامریکی عالم نے اسے اپنی کتاب ''رازآفرینش'' میں واضح طور پرتفصیل سے بیان کیا ہے اوراس کتاب میں اس برہان کی تحلیل وتجزیہ کے علاوہ اورکوئی چیزنہیں ہے اور یہ برہان ''برہان نظم'' کی صرف ایک علمی صورت ہے اور یہ کوئی نئی چیزنہیں ہے اوراس کا خلاصہ یہ ہے:

اس کرہ خاکی میں حیات وزندگی کا استقرار بے شماراور گوناگوں عوامل کی پیدائش کی وجہ سے ہے جن کا اتفاقی اورحادثاتی طور پر مختلف شکلوں میں اکٹھا ہوجانا عقلاً محال ہے۔

دوسرے لفظوں میں: شرائط وعوامل جواس کرہ خاکی میں حیات وزندگی کے وجودکوممکن بناتے ہیں اتنے زیادہ ہیں کہ یہ احتمال کہ یہ شرائط کسی پہلے سے بنائے گئے منصوبہ کے بغیر، اتفاقاً حادثاتی طور پر مختلف شکلوں میں اکٹھے ہوگے ہوں گے۔اربوں احتمالوں میں سے ایک احتمال ہی ہے اورکوئی عقل مند کسی پیدا ہونے والی چیز کی تفسیر کیلئے اس قسم کے احتمال پر تکیہ نہیں کرتا۔

اگرروئے زمین میں حیات وزندگی کی پیدائش، ابتدائی مادہ کے اتفاقاً اورحادثاتی طور پر پھٹنے کا معلول ہوتواس کا یہ پھٹنا، کروڑوں اربوں صورتیں اختیار کرسکتا ہے لیکن ان صورتوں میں سے صرف ایک ہی صورت، اس کرہ خاکی میں حیات وزندگی کوممکن بناتی ہے، اوردوسری صورتوں میں حیات وزندگی ممکن نہیں ہے۔اب یہ کس طرح ہوگا کہ مادہ کے پھٹنے کی ان تمام مختلف صورتوں اورشکلوں میں سے صرف ایک ہی صورت ایسی وجود میں آئی کہ جس میں حیات امکان پذیر ہے؟ اس صورت میں تصادف اوراتفاق کے علاوہ اس کا کوئی اور جواب دینا پڑے گا، اورخوداسی دانشمند کے قول کے مطابق ان تمام شرائط ولوازم کا، جوحیات کے ظہوراوراس کے دوام کیلئے ضروری ہیں۔صرف اتفاق اورحادثاتی طور پرفراہم ہوجانا ممکن نہیں ہے۔[1]

۷۔ برُ ہان موازنہ وکنٹرول

برُ ہان موازنہ جہانِ خلقت میں ''نظم'' کے برُ ہان کی ایک شاخ ہے اوراس سے مراد وہی کنٹرول ہے جوجانداروں اورعالمِ گیاہ میں نظرآتا ہے، نمونہ کے طور پر ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

جانوروں اورگیاہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہرایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے، اگرصفحہ ہستی میں صرف جاندار ہی ہوتے، اورنباتات نہ ہوتے، تواسے زوال آجاتا اوروہ فنا ہوجاتا، اوراس کے برعکس اگرصرف گیاہ اورنباتات ہی ہوتے توزیادہ دیرنہ لگتی کہ وہ بھی زوال کا رخ کرتے اورنابود ہوجاتے، کیونکہ نباتات سانس کے ذریعے ''ایسڈ کاربونک'' حاصل کرتے ہیں ، اورآکسیجن ہوا میں چھوڑتے ہیں، اورنباتات کے پتے انسان کے پھیپھڑوں کی طرح ہیں، جن کا بس یہی کام ہے جب کہ حیوانات

---

[1]۔ اس برُ ہان کی تفصیل کتاب راہِ خداشناسی کے صفحہ ۱۹۳۔ ۲۱۲ میں پڑھ سکتے ہیں۔

''کاربن'' خارج کرتے ہیں اور آکسیجن حاصل کرتے ہیں اس لحاظ سے ہر ایک کا عمل دوسروں کے تکمیل کرتا ہے، اور اگر عالم میں صرف نباتات ہی نباتات ہوتے تو کاربن کا تمام مواد ختم ہو جاتا، یا اگر صرف جاندار ہی جاندار ہوتے تو تمام آکسیجن خرچ ہو جاتی اور توازن بگڑ جاتا، اور دونوں کی نسل بڑی تیزی سے ساتھ ختم ہو جاتی۔

۸۔ جانوروں کی راہ یابی

جانداروں کی خود اپنی زندگی کے سلسلہ میں راہ یابی اس بات کی گواہ ہے کہ ان کیلئے ماوراء طبیعت کوئی ہادی ورہنما ہے، جو زندگی کو ان کیلئے واضح کرتا ہے اور ان کے تمام کام عالم بالا کی وحی والہام سے انجام پاتے ہیں اور چونکہ یہ بُرہان خود قرآن نے پیش کی ہے لہٰذا ہم اس سلسلے میں آئندہ تفصیل سے بیان کریں گے۔ اور یہ برہان۔ جیسا کہ مفصل بیان کیا جائے گا ''بُرہانِ نظم'' کے علاوہ ہے۔

۹۔ عالم کی تمام چیزوں کا کوئی نہ کونہ مقصد ہے۔

اس عالم کی تمام چیزوں میں ہم آہنگی کا موجود ہونا، مثلاً بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی ماں کے پستان میں مناسب غذا کا پیدا ہو جانا، خود ایک دانا و توانا فاعل کی دخالت پر، جو ایک خاص پروگرام کے ساتھ اس جہان کو ادارہ کر رہا ہے، گواہ ہے۔

موجودہ زمانہ میں بہت سے ماؤتین، جو خدا پرستوں کی منطق کے مقابلہ میں عاجز و ناتواں ہو جاتے ہیں اور عالم کے عجیب وغریب نظم کی ''تصادف'' یعنی حادثاتی اور اتفاقیہ طور پر موجود ہو جانا کے طریقہ سے توجیہہ نہیں کر سکتے تو اس کو ایک مضحکہ خیز اور غیر علمی منطق قرار دے کر فوراً ہی ہگل کی منطق سے استفادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ''تز اور اینٹی تز اور سنتز'' کے فارمولہ کے مطابق ہر قسم کی تخلیق نظام مادہ کی خاصیت کا معلول ہے، مثلاً کسی گیاہ یا حیوان کے سلول کی شکل میں آجائے لیکن قابل توجہ بات یہ ہے کہ خاصیت کی طرف جھکاؤ اور میلان بھی، تصادف اور اتفاق کی طرف جھکاؤ اور میلان کی طرح سے ہی، جہان مادہ کی اجزا کے نظم و ہم آہنگی کی توجیہہ کرنے سے کاملاً عاجز و ناتواں ہے۔ ہم ہرگز مادی اشیاء کے ذاتی خواص کے منکر نہیں ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ہر مادی موجود اپنے لئے ایک خاص اثر رکھتا ہے لیکن اگر عالم مختلف ساز وسامان کے ایک بہت بڑے انبار کی طرح ہوتا، جس کی ہر جز اپنا ایک اثر رکھتی ہوتی، اور دوسرے موجودات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا تو اس صورت میں اس جہاں کی اس طریقہ سے توجیہہ ہوسکتی تھی، مثلاً ایک عطار کے سٹور میں فلفل، کاکاؤ، زرد چوبہ، قند وشکر، زعفران، ہلیلہ، نبات، عناب، گُل بہار، نارنج موجود ہیں اور ان مادی اشیاء میں ہر ایک اپنے لئے ایک طبعی اثر رکھتی ہے اب اگر کوئی پوچھے کہ مرچ تیز، شکر میٹھی، عرق بہار نارنج معطر کیوں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آثار ان چیزوں کے ذاتی آثار شمار ہوتے ہیں۔ لیکن اگر عالم میں اشیاء اور انکے خواص کے علاوہ ایک قسم کی ترکیب وتنظیم ایک قسم کا دقیق ارتباط اور مختلف چیزوں کے درمیان ایک قسم کا حساب شدہ جچا تلا پیوند اور نظم نظر آئے اور انکے مختلف خواص اس طرح ہم آہنگ اور ملے ہوئے ہوں کہ انکے مجموعہ سے ایک خاص ہدف اور مقصد وجود میں آئے، تو اس صورت میں ہم آہنگی، نظم اور معین ہدف ومقصد کی تکمیل کو مادہ کے اجزاء کے خواص کے طریق سے ہرگز توجیہہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہر چیز کی ذاتی

خاصیت، اجزا کے الگ الگ اثر کا تقاضا کرتی ہے، نہ کہ نظم وانجام، اہم آہنگی اور ہدف کی تامین اور مقصد کی تامین وتکمیل کا جب کہ ہم اس جہاں میں مادہ کے ذاتی آثار کے علاوہ ایک اور چیز کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں جو ہم آہنگی اور مخصوص ہدف ومقصد کی تامین وتکمیل ہے اور اس کا مادہ کے ذاتی اثر کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔ (اس بناء پر اس کی کسی دوسرے طریقہ سے توجیہ کرنا ہوگی) بلکہ وہ ایک ایسے فاعل کی معلول ہے جس نے مادہ کے خواص کو جانتے ہوئے ایک خاص حساب کتاب کے ساتھ ترتیب دے کر، اپنے ہدف ومقصد کے مطابق بنایا ہے، اس بناء پر ہدف ومقصد کی طرف جھکاؤ کی راہ سے توجیہہ کرنا چاہیے، نہ کہ مادہ کے ذاتی خواص کے طریق سے، اور از یادہ واضح الفاظ میں: معین ہدف ومقصد اور نظم وہم آہنگی تین حالتوں میں سے باہر نہیں ہے:

ا۔ یا ان مادی اشیاء میں سے ہر ایک کا اثر ہے۔

۲۔ یا مادی اشیاء کے مجموعہ کا اثر ہے، وہ جس صورت میں بھی ترکیب وترتیب پا جائیں۔

۳۔ یا اشیاء کے مجموعہ کا اثر ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ایک خاص طریقہ سے اور ایک معین شکل میں ہی آپس میں ترکیب وترتیب پائیں۔

پہلے مفروضہ کو ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ بات بدیہی ہے کہ ایک مادی چیز کے ساتھ دوسری مادی چیزوں کے ملے بغیر وہ خاص اثر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح دوسرے مفروضہ کو بھی درست نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ان مادی اشیاء کی ہر صورت اور ہر شکل میں ترکیب، مشخص ومعین ہدف ومقصد کی تامین وتکمیل نہیں کر سکتی، اس طرح صرف ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اجزا کی ایک خاص شکل میں ترکیب ہو جس سے مخصوص ہدف ومقصد کی تکمیل ہو سکے، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیا ہو گیا کہ ان تمام مادی اشیاء نے جن میں سے ہر ایک کا ایک خاص اثر ہے، لاکھ، کروڑوں شکلوں میں سے، صرف ایک ہی شکل اختیار کر لی، کہ صرف وہی شکل، معین وہدف ومقصد کی تکمیل کر سکتی ہے، جب کہ ہدف خاص کی تکمیل، اور اجزاء کا معین صورت میں نظم وانجام، مادہ کا ذاتی اثر نہیں ہے۔ وضاحت کیلئے ذیل میں بیان کردہ دو مثالوں میں غور کیجئے۔

(الف)......ہم کہتے ہیں: ''سقراط پرشک بود'' یہ جملہ کسی حرف کی تکرار کے بغیر بارہ حروف سے مرکب ہے جو یہ ہیں: س، ق، ر، ا، ط، پ، ز، ش، ک، ب، و، اور د، ان میں سے ہر ایک اپنی خاص آواز رکھتا ہے۔

......................، جو اس کے اثر ذاتی میں سے شمار ہوتی ہے ان مفردات کی صرف ایک ہی صورت ہمارے مقصد کو پورا کر سکتی ہے اور وہ اسی صورت میں ہے جب کہ ان کی گزشتہ صورت میں ترکیب ہو اور بس اور اس صورت کے علاوہ ہدف اور مطلوبہ نظم وانجام ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ ان حروف میں سے ہر ایک حرف اپنے لئے ایک خاص اثر او ایک خاص آواز رکھتا ہے اور جب تک یہ سارے حروف اپنی مخصوص آواز کے ساتھ میدان میں قدم نہ رکھیں، مذکورہ گفتگو درست نہیں ہوتی تو یقیناً اس نے صحیح بات کہی ہے لیکن اگر اس شخص سے یہ پوچھیں: کہ ان سینکڑوں ممکن ترکیبوں میں سے اس کی صرف ایک ہی صورت کیوں وجود میں آئی ہے اور دوسری ترکیبیں جو حروف کو پس وپیش کرنے سے پیدا ہو سکتی ہیں، کیوں وجود میں نہیں آئی اور وہ جواب یہ کہے: کہ ہر حرف کی ذاتی خاصیت کا تقاضا یہی ہے کہ یہ حروف صرف یہی صورت اختیار کریں تو یقیناً اس کا یہ جواب ٹھیک نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر حرف کی ذاتی خاصیت اس کے

سوا اور کچھ تقاضا نہیں کرتی کہ ہر حرف کی آواز سے جدا نہ ہو۔لیکن یہ حرف (س۔ق) حتمی طور پر (ردا) کے ساتھ قرار پائیں حروف کی ذاتی خاصیت اس قسم کی ترکیب وانجام کا ہرگز تقاضا نہیں کرتی ۔ بلکہ ''مقصدیت'' اور کسی غائیت کی تکمیل کرنے کی'' اس صورت کی خاصیت حروف کے علاوہ کسی اور طریقہ سے توجیہہ کرنا ہوگی اور یہ کہنا پڑے گا کہ: کسی عقل مند انسان نے جو ایک خاص ہدف اور مقصد رکھتا تھا، اور چاہتا تھا کہ مخاطب تک اسے پہنچائے کہ:

یونان کا مشہور حکیم سقراط طبابت کرتا تھا، اور وہ حروف کی آواز اور ایک حرف کو دوسرے کے ساتھ ترکیب کی خاصیت اور مفردات کی وضع اور جملہ کی دلالت سے آگاہ تھا، خاص پروگرام اور منصوبہ کے تحت اس نے کئی سوشکلوں میں سے صرف ایک ہی ترکیب کو انتخاب کیا اور کہا ''سقراط پرشک بود'' (سقراط طبیب تھا) نہ یہ کہ حروف کی خاصیت اس قسم کی ترکیب کا تقاضا کرتی تھی۔

بعینہ یہی منطق ایک درخت اور ایک انسان کے وجود کے اجزا کے بارے میں حکم فرما ہے اور ان دونوں چیزوں کے وجود کے تمام اجزا کی اس طرح ترکیب ہوئی ہے، جو انسان اور درخت سے مطلوبہ اثر کی تکمیل کرتے ہیں اور ان دونوں چیزوں کی ہم آہنگ ترکیب انکے ہر ایک یا تمام اجزا کے ذاتی خواص کی معلول نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ اجزا دوسری ہزار ہا صورتوں میں بھی ترکیب پاسکتے ہیں اور کسی بھی صورت میں مطلوبہ اثر پیدا نہیں کر سکتے تھے تو اس صوت میں کیا بات کہ (ان اجزا میں سے ہر ایک کے ذاتی اثر کے اعتراف کے باوجود) صرف ایک ہی صورت جسے ہم انجام ہم آہنگی ہدف داری اور مقصدیت کا نام دیتے ہیں وجود میں آئی کیا اس کے سوا کوئی اور بات ہے کہ ہمیں مخصوص ہدف کی تکمیل کو کسی دوسرے عامل کے طریق سے جو فاعل ودانا وتوانا ہے توجیہہ کرنا چاہیے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں واضح ہوجاتا ہے کہ مادی خاصیت گرائی بھی، اس کی تصادف گہرائی کے مانند ہی بے بنیاد اور بے گواہ ہے۔

(ب) دوسری مثال: نومولود بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی ماں کے پستان میں دودھ آجاتا ہے، اماں کی چھاتیوں سے دودھ کا پیدا ہونا سلولوں ، بافتوں اور ماں کے بدن میں موجود ''ہارمونوں'' اور خون کے ترشح کا معلول ہے اور کسی بھی شخص کو اس مطلب کے درست ہونے میں شک وشبہ نہیں ہے کلام اس بات میں ہے کہ یہ انس جام وہم آہنگی (یعنی یہ بافتیں، رگیں اور ہارمون، اس کیفیت اور کمیت کے ساتھ جو ایک حلقہ زنجیری کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں ، عین اسی موقع پر جب کہ نومولود پیدا ہوتا ہے اور وہ صرف ماں کے دودھ کے ساتھ ہی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ انہیں مادی چیزوں سے ماں کے پستان کے راستے سے دودھ ترشح کرے جو مکمل طور پر ماں کے ہاتھ اور آغوش اور بچے کے ذہن اور گلے کے ساتھ مناسبت رکھتا ہوا اور ترشح کی شدت ومقدار بھی پورے طور پر بچہ کی غذا کے مجاری کے ساتھ مناسب ہو کس کا کام ہے؟ کیا اس انس جام اور ہم آہنگی کو خاصیت گہرائی کے ساتھ اور ہر ایٹم اور ہر سلول کے اپنے لئے ایک خاص اثر رکھنے سے تفسیر وتوجیہ کی جاسکتی ہے؟ مسلمہ طور پر ایسا نہیں ہے کیونکہ ہر جز کا اثر ذاتی اپنے اثر کا تقاضا کرتا ہے نہ کہ اجزا کے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا اور وہ ہرگز اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ لاکھوں ، کروڑوں اجزا نے جو ایک دوسرے سے جدا ہیں اپنے خواص کو ہم آہنگی کی صورت میں ایک ہی خط میں کیوں قرار دے لیا ہے تاکہ وہ اپنے معین اور مفید مقصود وہدف تک پہنچ جائیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خاصیت گیرائی کی منطق بھی تصادف کی منطق کی طرح ہی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتی اور وہ عقل وخرد کی

منطق سے مغلوب ہو جاتی ہے۔

ہمیں چاہیے اس منطق کو زیادہ کامل صورت میں ''برہان نظم'' قرار دیں یا ہم اسے صانع خالق کائنات کے اثبات کیلئے ایک مستقل برہان سمجھیں، ہر حالت میں ماویئیں کی منطق کو باطل کرنے کیلئے جو اللہ والوں کی منطق سے غافل ہیں خود گواہ اور دندان شکن دلیل ہے۔ یہ خداشناسی کے بارے میں رائج براہین کے اصول ہیں اور ہر شخص اپنے ذوق و ادراک کے مطابق ان براہین سے استفادہ کر سکتا ہے اور اسی بناء پر قرآن کہتا ہے: **ولكل وجهة هو موليها** ''(بقرہ۔ ۱۴۸) ہر شخص خدا تک پہنچنے کی ایک راہ رکھتا ہے کہ وہ اسی راستے سے اس کی طرف راہ پیدا کرتا ہے اور ان سب میں سے، برہان نظم، دوسرے براہین میں سے زیادہ ہمہ گانی ہے اور اس برہان میں صانع کا اثبات آسان اور واضح معلومات پر استوار ہوا ہے۔ یہاں کچھ اور براہین بھی ہیں جو عامتہ الناس کی فہم سے بالاتر ہے اور ان کیلئے تدبر و دقت اور خدائی استاد کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

۱۰۔ برہان صدیقین

ان براہین میں سے ایک ''برہان'' (صدیقین) کی برہان ہے، کہ خود ''وجود کے مطالعہ سے خدا تک پہنچا جا سکتا ہے اور درحقیت صانع کے اثبات کیلئے، خود وجود ہستی کے بارے میں تحقیق و مطالعہ کے سوا اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

اور اس برہان کی اصل قرآن میں ہے اور شاید آیہ ''اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۝ ''(حم السجدہ۔ ۵۳) اس برہان کی طرف اشارہ ہو، اور ائمہ معصومین کی دعاؤں میں اس دلیل کی طرف اشارے نظر آتے ہیں اور امیر المومنینؑ اس دعا میں جو آپ نے کمیل کو تعلیم فرمائی تھی اس طرح کہتے ہیں۔ (**یامن دل علی ذاته بذاته وتنزه عن مجانسة مخلوقاته**) ''اے وہ ذات جس نے اپنی ذات سے اپنی ذات پر دلیل قائم کی ہے اور وہ اپنی مخلوقات کی مجانست سے بے نیاز ہے۔'' اور جلال الدین رومی اس بارے میں اس طرح کہتا ہے۔[۱]

آفتاب	آمد دلیل	آفتاب
گر دلیلت	باید از دی	رومتاب

''سورج خود ہی سورج کے وجود کی دلیل ہے اگر تجھے دلیل کی ضرورت ہے تو اس سے منہ نہ پھیر۔''

اور فیلسوف اسلامی، ابن سیمان نے اس برہان کو اپنی کتاب ''الاشارات'' میں ایک خاص طرز پر تفصیلات بیان کیا ہے۔[۲] اور مرحوم نصیر الدین

---

[۱]۔ الاشارات ج ۳ ص ۱۸۔ ۲۸

[۲]۔ الاشادات ج: ۳ ص، ۱۸۔ ۲۸

طوسی نے اسے کتاب ''تجرید الاعتقاد'' میں نقل کیا ہے اور اس کے شارح علامہ حلی [1] نے انکی پیروی کی ہے اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، کہ اس برہان کی اصل قرآن میں ہے اور ہم اس کے اپنے مقام پر اس کی توضیح وتشریح میں جس کی ایک صورت، صورت سینائی کے نام سے ہے کوشش کرینگے۔

پھر کچھ اور براہین بھی موجود ہیں مثلاً برہان ''وجوب'' برہان ''ترتیب'' اور برہان ''اسد واخفر'' جن کے بارے میں بحث وگفتگو کرنا ہماری بحث کے دائرے سے باہر ہے کیونکہ اس کتاب میں خدا کے وجود کے براہین اس سلسلہ کے بارے میں ہیں جن کی اصل قرآن میں ہے۔ [2]

ہم ہرگز یہ وعدہ نہیں کرتے کہ ہم اس کتاب کے صفحات میں تمام دس کے دس براہین کے بارے میں دوسرے براہین کے بارے میں گفتگو کریں گے کیونکہ اس قسم کی بحث ہماری کتاب کے ہدف اور مقصد سے باہر ہے ہم جس چیز کا وعدہ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم ان تمام دلائل پر جو قرآن میں صانع عالم کے اثبات کے سلسلہ میں وارد ہوئے ہیں بحث وتمحیص کرینگے، خواہ وہ گزشتہ براہین کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔

اور ہر قسم کے پہلے سے قائم کیے ہوئے اعتقاد اور فیصلوں کو چھوڑ دینگے دوسرے لفظوں میں ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کی شاگردی کریں اور اس کو اپنا امام وپیشوا قرار دیں، نہ کہ عالم کے بزرگ حکماء اور علماء کی، اب اگر ان میں سے کسی کا قول وگفتگو قرآنی گفتگو سے مطابق ہوئی تو ہم بحث کے دوران اس کی طرف اشارہ کریں گے، مثلاً ہم کہیں گے: یہ آیت برہان نظم یا برہان امکان کی طرف ناظر ہے، اور ہم خداوند بزرگ وبرتر سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہماری اس راستے کو طے کرنے میں مدد فرمائے اور آیات کے مفاد کے سمجھنے میں ہر قسم کے خلل اور لغزش سے باز رکھے لیکن پہلے ہم ایک مقدمہ بیان کرتے ہیں۔

---

[1] ۔تجرید الاعتقاد: ۲۷۱

[2] ۔مرحوم صدر المتالہین نے براہین ''وجوب'' اور برہان ''اسد واخفر'' کے بارے میں کتاب اسفار کے ص ۱۶۵۔۱۶۶ میں بحث کی ہے اور راقم نے بھی برہان ''وجوب'' کے سلسلہ میں کتاب راہ خدا شناسی کے ص: ۳۸۱۔ ۲۸۴ پر بحث وتحقیق پیش کی ہے۔

نزولِ قرآن کے زمانے میں عربو کا عقیدہ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے لوگوں کے درمیان مبعوث برسالت ہوئے جن کی اکثریت [1] بت پرست تھی، اور وہ خدا پر اعتقاد رکھنے کے باوجود کئی چہروں کی عبادت کیا کرتے تھے جو ان کے نظریہ کے مطابق مقربان بارگاہِ الٰہی تھے، اور خدا کے ہاں انسان کا واسط اور ذریعہ تھے، اسی بناء پر قرآن یکتا پرستی پر زیادہ زور دیتا، نہ کہ وجود صانع کے اثبات پر، وہ آیات جو خدا کے بارے میں زمانہ رسالت کے دور کے بت پرستوں کے عقائد کو بیان کرتی ہیں، اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ ان کو یہاں پر بیان کیا جائے، اس لیے ہم خلاصہ کے طور پر چند ایک کو متن میں تحریر کرینگے، اور دوسری آیات کے قرآن میں حوالہ کی طرف، حاشیہ میں اشارہ کریں گے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝۹

''اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ کہیں گے خداوند عزیز و دانا نے انہیں پیدا کیا ہے۔'' (زخرف۔۹)

اس آیت اور ان آیات کے مضمون کو، جن کی طرف حاشیہ میں اشارہ ہوا ہے۔ [2]، ملاحظہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف خدا کے وجود کے معتقد تھے، بلکہ اسے یکتا و یگانہ خالق عالم بھی تسلیم کرتے تھے اور اصطلاح کے مطابق ان کی توحید در خالقیت مکمل تھی۔

وہ بتوں کو نہ تو آسمانوں اور زمین کا خالق سمجھتے تھے اور نہ ہی عالمِ آفرینش کا مدبر و رہبر بلکہ وہ انہیں بارگاہ الٰہی کے مقرب اور شفیع جانتے تھے اور وہ یہ خیال کرتے تھے کہ ان کی پرستش سے خدا کے نزدیک ہو سکتے ہیں۔ اور کئی آیات ان کے اس عقیدہ کی گواہی دیتی ہیں مثلاً

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَاۤءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ

''وہ خدا کے علاوہ ایسی موجودات کی پرستش کرتے ہیں جو نہ انہیں ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی فائدہ

---

[1] ۔ البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تمام عرب ہی بت پرست تھے، یا دنیا میں تمام بت پرست گروہ اسی قسم کے عقیدہ کی پیروی کرتے تھے بلکہ ان کے درمیان ثنویت و تثلیث کا اعتقاد اور متعدد مدبرین و مدیرین کا اعتقاد بھی پایا جاتا تھا، اور ان کے تفصیلی عقائد بارہویں حصہ میں بیان ہونگے۔

[2] ۔ اس آیت کا مضمون سورہ عنکبوت کی آیہ ۶۱،۶۳ میں اور لقمان کی آیہ ۲۵ میں اور سورہ زمر کی آیہ ۳۸ میں بھی وارد ہوا ہے۔

اور وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کے نزدیک ہمارے شفیع ہیں۔"[1] (یونس۔۱۸)

لیکن اس اعتراف کے باوجود ہرگز یہ نہیں کہہ جاسکتا کہ زمانہ رسالت میں کوئی ملحد و منکر خدا تھا ہی نہیں، اور یا یہ کہ قرآن نے اصل ہستی خدا کے بارے میں گفتگو ہی نہیں کی بلکہ (اس نظریہ کے برخلاف) کچھ آیات واضح طور پر عصر رسالت میں ملحد کے وجود کی طرف ناظر ہیں جیسا کہ براہین علمی کا ایک سلسلہ قرآن میں اصل ہستی خدا کے بارے میں وارد ہوا ہے جسے ہم ترتیب کے ساتھ لکھیں گئے، اب ہم وہ آیت پیش کرتے ہیں جو عصر رسالت میں انسان اور موجوداتِ عالم کے بارے میں مادیت کے عقیدے کو بیان کرتی ہے۔

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٢٤﴾

"زندگی اس دنیاوی زندگی کے سوا، جس میں ہم مرتے اور زندہ ہوتے ہیں، اور کوئی چیز نہیں ہے، اور سوائے مرورِ زمانہ کے کوئی چیز ہمیں نابود نہیں کرتی، انہیں اس کا علم ہی نہیں ہے بس یہ ان کا گمان ہی گمان ہے۔" (جاثیہ۔۲۴)

کیا ان افراد کی منطق جو یہ کہتے تھے کہ مرورِ زمانہ کے علاوہ اور کوئی نابود کرنے والا ہے ہی نہیں، اس کے سوا کچھ اور تھی کہ وہ اس جہان کا ادارہ کرنے والے، بلکہ خدا نامی کسی خالق کے معتقد نہیں تھے، اور حیات و موت کو آج کی اصطلاح ہیں، اجزاءِ مادہ کے اجتماع کا فزکسی اور کیمیائی اثر سمجھتے تھے، جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ فرسودہ ہو کر دیار عدم کے راہی بن جاتے ہیں۔

استاد عالی قدر حضرت آیت اللہ طباطبائی دامت برکاۃ اپنے علمی مذاکرات میں اصرار کے ساتھ یہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن میں ذات خدا کے بدیہی ہونے یا ذات خدا کے فطری ہونے کی وجہ سے، یا ذات خدا کے اس بات سے بالاتر ہونے کے سبب کہ اس کیلئے کسی برہان کی ضرورت ہو، ذات خدا کے اثبات کیلئے کوئی برہان وارد نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ قرآن میں ذاتِ خدا کے اثبات کیلئے کئی برہان وارد ہوئے ہیں کہ جنہیں ہم یہاں پر ایک عنوان کے تحت بیان کر رہے ہیں۔

---

[1] ۔ سورہ انعام کی آیہ ۹۴ اور سورہ زمر کی آیہ ۳، ۴۳ کی طرف بھی رجوع کریں۔

قرآن میں صانع کے اثبات کے براہین

انسان اور جہان میں فقر و نیاز خدائے غنی کے وجود کی نشان سے

يَآيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾

"اے لوگو! تم خدا کے محتاج اور اس کے نیازمند ہو اور خدا بے نیاز اور قابل تعریف ہے۔"

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾

"اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے۔"

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۱۷﴾ [1]

"یہ کام خدا کیلئے سنگین اور گراں نہیں ہے۔" (فاطر ۱۵ تا ۱۷)

ایک چیز کا فقر و نیاز، اس کی کسی توانا کی طرف احتیاج کی نشانی ہے۔ جو اس کے نیاز کو برطرف کرے اور فقر کا غبار اس کے چہرے سے دور کرے، اور جب تک خارج سے کوئی ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھے گا، اس کا فقر و نیاز برطرف نہیں ہوگا۔

ایٹم سے لے کر کہکشاں تک، عالم کے تمام موجودات فقر ذاتی رکھتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ سب کے سب عدم اور نیستی کے بعد وجود میں آئے ہیں، لہٰذا اپنی پیدائش اور وجود میں آنے کیلئے انہیں ایک غنی کی ضرورت ہے، جس کے زیر سایہ وہ اپنے سے عدم و نیستی کو دور کریں۔ آپ جس موجود کو بھی فرض کریں وہی لباس ہستی پہننے سے پہلے، عدم و ظلمت اور نیستی کی تاریکی کے پردے کے نیچے ڈوبا ہوا ہے، پھر وہ علت کی طاقت و قدرت کے زیر سایہ ہی نیستی کی تاریکی کے پردے کو چاک کر سکتا ہے۔ عدم کی ظلمت کو ہٹا سکتا ہے اور ایک موجود کی صورت میں صحن ہستی میں خودنمائی کر سکتا ہے۔ اور اگر کسی غنی کا ہاتھ بطور علت کے درمیان میں نہ ہو، تو وہ ہرگز جلوہ و تجلی نہیں کرے گا۔ عالم میں جو چیز بھی آپ تصور کریں، وجود و عدم کے ساتھ اس کی نسبت یکساں ہے۔ اور اس مساوات اور برابری کو علماء کی اصطلاح میں، امکان، کہتے ہیں اور اس مساوات کو سمجھنے کیلئے ایک ایسے بیان کی ضرورت ہے جو ہمیں قانع و مطمئن کرے۔

فلاسفہ اس مساوات و برابری کی تصویر کشی کیلئے ایک بیان رکھتے ہیں جس کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں، وہ ایک دائرہ فرض کرتے ہیں دائرے کے واسط میں اپنی زیر نظر چیز کو جو صرف انکے ذھن میں موجود ہوتی ہے، قرار دیتے ہیں اور دائرے کے ایک طرف ہستی و وجود اور اس کے مقابل میں دوسری طرف نیستی اور عدم فرض کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ زیر نظر موجود اپنی ذات کے اندر سے ان دونوں (ہستی

---

[1] ۔قرآن زیر بحث آیت میں خدا کی "غنی و حمید" کی صفات کے ساتھ توصیف کرتا ہے، اس بنا پر بعد والی آیات میں دونوں کے نتیجہ کو پیش کرتا ہے چونکہ غنی ہے لہٰذا تمہیں نابود کر سکتا ہے تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اسے تمہاری ضرورت نہیں ہے، اور اگر وہ چاہے تو نئی مخلوق پیدا کر دے (آیہ۔۱۶) اور چونکہ وہ حمید اور قابل تعریف ہے لہٰذا وہ اس کام پر قادر توانا، (آیہ۔۱۷) کیونکہ عجز کی صورت میں قابل ستائیس و تعریف نہیں ہوگا۔

ونیستی) میں سے کسی کا تقاضا نہیں رکھتی، نہ اس کے اندر سے عدم جوش مارتا ہے کہ وہ بالذات اپنی نیستی اور عدم کی خواہاں ہو، ورنہ وہ ممتنع بالذات ہوگی، اور نہ ہی وہ وجود وہستی کی خواہاں ہے، ورنہ وہ واجب الوجود شمار ہوگی۔ اور عدم ونیستی ہرگز اس کی طرف راہ پیدا نہیں کرے گی اور اس قسم کی چیز کے وجود کیلئے وجود وہستی کی خواہش کرنا، تحصیل حاصل اور امر لغو کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوگی۔

اس بناء پر وہ تمام چیزیں جو کسی زمانہ میں معدوم تھیں، اور پھر بعد کے زمانوں میں انہوں نے لباس ہستی کو زیب تن کیا ہے وہ حقیقت میں ایسے مفاہیم کا ایک سلسلہ ہیں جو وجود وعدم سے مجرد ہیں، جو دائرہ کے وسط میں قرار پائی تھیں اور ان کی نسبت وجود وعدم سے یکساں تھی، اور اگر انہوں نے کسی وقت دائرے کے وسط سے ایک طرف قدم رکھا ہے اور دو نقطوں ہستی ونیستی میں سے کسی ایک کی طرف جھکی ہیں، تو وہ اس علت کی وجہ سے ہیں جس نے انہیں دو میں سے ایک کی طرف چلایا ہے۔ علت کا وجود انہیں وجودِ ہستی کی طرف کھینچتا ہے جیسا کہ عدم اور علت وجود کا نہ ہونا انہیں عدم ونیستی کی طرف دھکیلتا ہے۔

اس بناء پر خود اس شے میں، اور اس موجود کی ذات میں، علت وجود یا علت عدم کے بغیر نہ وجود چھپا ہوا ہے، اور نہ عدم، بلکہ یہ قوت جاذبہ اور وضع خارج ہے جو اُسے کسی ایک جانب چلاتی ہے، اگر کوئی ہستی بخش بروے کار رہو، اور موجود غنی اس کے ہمراہ ہو تو وہ قہراً وجود کی طرف کھینچ جائے گی، اور اگر وہ علت کے نہ ہونے سے روبرو ہو گیا تو وہ قطعی طور پر عدم کی طرف جذب ہو جائے گا۔

البتہ کسی چیز کے ہونے اور نہ ہونے میں یہ فرق ہے کہ ایک چیز کے وجود کے ظہور میں آنے کیلئے کسی علت کا ہونا ضروری ہے، جو خاص حالات وشرائط میں اسے ہستی بخش دے۔ لیکن کسی چیز کے فقدان ونیستی کیلئے کسی قسم کے فعل وانفعال کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس علت کا نہ ہونا ہی اس چیز کے فقدان کیلئے کافی ہے، موجودہ زمانہ کی وہ چیزیں جو صدیوں تک ظلمت کے پردے میں پڑی رہی ہیں اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اس قسم نیستی کی بالذات خواہاں تھیں کیونکہ اگر وہ ایسی ہوتی تو پھر کبھی بھی وجود کا لباس زیب تن نہ کرتیں، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے وجود کیلئے کوئی مقتضی موجود نہیں تھا اور اس کا نہ ہونا اس بات کیلئے کافی تھا کہ کوئی چیز عدم کی طرف جذب رہے اور خارج میں اس کا جلوہ نہ ہو، یہ جو ہم کہتے ہیں کی چیزیں علت کے وجود کے زیر اثر وجود کی طرف کھنچتی چلی جاتی ہیں، اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ موجود علت کے انضمام کے بعد، فقر ذاتی کو دور کر دیتا ہے اور ایک غنی موجود کی صورت اختیار کر لیتا ہے، کیونکہ یہ مطلب ایک بے بنیاد چیز ہے اور جو چیز بالذات فقیر ونیاز مند ہے اس کیلئے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ بالذات غنی اور بے نیاز ہو جائے بلکہ مقصود یہ ہے ایک چیز فقر ذاتی کے ہوتے ہوئے بھی لباس ہستی زیبِ تن کر لیتی ہے، دراں حالیکہ اس کا ذاتی فقر ونیاز بھی ختم نہیں ہوتا۔ [1]

اس فقر ونیاز کی وجہ سے ایک چیز کی علت کی طرف احتیاج ونیاز ایک دائمی اور جاودانی احتیاج ونیاز ہے اور یہ نیاز واحتیاج کبھی بھی اس سے برطرف نہیں ہوتی اور اگر ایک لحہ کیلئے بھی علت سے اس کا ارتباط منقطع ہو جائے تو اس میں ہستی ووجود کا کوئی اثر باقی نہیں رہے گا، اواس حقیقت کو دو مثالیں بیان کر کے اور زیادہ واضح کیا جا سکتا ہے۔

---

[1]۔ فلسفہ کی اصطلاح کے مطابق علت کے انضمام کے بعد بالفرض ''غنی'' ہوئی ہے۔ اور اس قسم کا غنی ہونا، ذاتی فقر کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔

(۱)ایک عظیم محل مختلف اور قسم قسم کے چراغوں اور بلبوں کے ساتھ نور اور روشنی میں ڈوبا ہوا ہے ،اور ایک شخص جواس کے حقیقت کو نہیں سمجھتا،خیال کرتا ہے کہ ان چراغون کا نور خود انہیں کے ساتھ مربوط ہے،حالانکہ اس روشنی کا ربط بجلی پیدا کرنے والے کارخانہ کے ساتھ ہے،کہ اگر ایک لحہ کیلئے بھی یہ روشنی دینے کا ربط اس سے منقطع ہوجائے تو سارے کا سارا محل تاریکی میں ڈوب جائے ،اس بناء پر اُسے ہمیشہ وہ قوت پہنچتی رہنی چاہیئے تاکہ وہ اپنے گردو پیش کو روشن رکھے رہے۔

(۲)ایک شورزار مقام ہے جس پر جلانے والے سورج کی شعاعین پڑ رہی ہیں،اورہم یہ چاہت رکھتے ہیں کہ اس جگہ کو ہمیشہ مرطوب رکھیں ،تواس صورت میں ضروری ہے کہ اس پر پانی کے قطرات مسلسل ٹپکتے رہیں اس طور پر کہ پہلے قطرہ کا اثر بھی ختم نہ ہوا ہو کہ دوسرا قطرہ اس کی مدد کو آپہنچے،ورنہ مٹی کا شوراور سورج کی گرم اور جلانے والی شعاعین پہلے قطرہ کے اثر کو ختم کردیں گے۔

اگر طبیعت اور موجودات مسلسل تگ ودواور کوشش میں ہیں ،مثلاً سورج ہمیشہ چمکتا رہتا ہے،اور چاند روشنی دیتا ہے،آگ جلاتی ہے اور پھول باغ میں کھلتا ہے،تو یہ سب کچھ اس بناء پر ہے کہ ''جہاں فقر'' کا ''جہاں غنی'' کے ساتھ ربط وتعلق قائم ہے،اور اگر ان دونوں کا آپس میں رشتہ وتعلق ٹوٹ جائے تو سائے ظلمت وتاریکی کے کوئی چیز باقی نہ رہے گی۔اس بیان سے مندرجہ ذیل نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ:

۱۔کسی موجود کا فقرو نیاز،اس کی ذاتی صفت ہونے کی بناء پر اس کا ''لاینفک'' لازمہ ہے،جو کبھی بھی،نہ تو عدم کی حالت میں،اور نہ ہی وجود کی حالت میں،اس سے جدا نہیں ہوگی۔

۲۔نیازمند اور محتاج چیز کی جب تک غنی اور بے نیاز کی طرف سے تائید نہ ہو،اوراس سے اسے قوت وطاقت نہ پہنچے،اس کی وضع وکیفیت میں ہرگز کوئی تغیر وتبدیلیس پیدا نہیں ہوگی۔

۳۔لوگ اور دوسرے تمام موجودات عالم اپنی ذات کی حد تک فقرو نیازمند تھے،اور وجود میں آنے کے شرائط کے جمع نہ ہونے کی بناء پر غیر متناہی مدت تک عدم ونیستی کے پردے کے نیچے چھپے رہے ہیں اور اگر ان کا وجود ونیستی ان کی ذات کا جز ہوتی تو وہ ایک لحہ کیلئے بھی معدوم نہ ہوتے۔

۴۔اگر کوئی ایسا غنی بالذات جو غنی ہی ہو نہ کہ فقیر،اوراس کا وجود خود اسی کے اندر سے ابھرے نہ کہ کسی دوسری جگہ سے،ان کی مدد نہ کرتا اور انہیں ہستی کا لباس نہ پہناتا،تو یہ ہرگز دنیا میں قدم نہ رکھتے،اور اپنی طرف سے کوئی تجلی نہ دکھاتے۔

۵۔چونکہ فقرو نیاز ذات کے لوازم اوراس کے اجزاء میں سے ہے،تو قہراً تمام حالات میں،یہاں تک کہ وجود میں آنے کے بعد بھی ،وہ ہمیشہ فقیر اور نیازمند ہی رہے گا۔

اس بناء پر موجودات عالم کی وضع وکیفیت کے مطالعہ سے ان کی فقرو نیازمندی کو نظر میں رکھتے ہوئے ،اوراس بات پر توجہ دیتے ہوئے کہ فقیرو نیازمند موجودات ،ایک اصیل وغنی تکیہ گاہ کے بغیر،اپنی وضع وکیفیت کو نہیں بدل سکتے ،ایک غنی واصیل خدا کے وجود پر،جو کون مکان کو ہستی بخشنے والا اور زمان ومکان کو وجود دینے والا ہے استدلال کیا جاسکتا ہے اوراس کے وجود کو ثابت کیا جاسکتا ہے ،اور ممکن الوجود اور فقیر بالذات کی غنی بالذات موجود کے ساتھ احتیاج کو تمام لحات اور زمانوں میں (وجود کے پہلے لحہ سے لے کر آخر عمر تک) ثابت

کیا جا سکتا ہے۔

يَاۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ

''اے لوگو! تم خدا کی طرف نیاز منداور محتاج ہواور خدا بے نیاز اور لائقِ حمد ہے۔''

اس آیت میں علت (خدا) کے ساتھ، انسان کی احتیاج و نیاز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ فقرو احتیاج ذاتی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: ''اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ'' اور وہ اکیلا اور تنہا موجود جو فقیر انسان کی مدد کر سکتا ہے، وہی خدا ہے، اور خدا کے علاوہ تمام موجودات ممکن ہونے کی بناء پر نیاز مند اور محتاج ہیں، جو نہ تو خود اپنی ہی اور نہ ہی کسی دوسرے موجود کی مدد کر سکتے ہیں، اور یہ حقیقت: ''اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ'' کے جملہ کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

قرآن کی نظر میں انسان نہ صرف وجود سے پہلے خدا کی طرف فقیر و محتاج ہے، بلکہ لباس ہستی پہننے کے بعد بھی اسی سے فقر و نیاز رکھتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: ''اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ'' یعنی اب بھی تم فقیر اور نیاز مند ہو۔ حکماء اسلام نے پیغمبر اکرم ﷺ سے ایک حدیث اس طرح نقل کی ہے:

الفقر سواد الوجه فی الدارین

''فقرو احتیاج دونوں جہانوں کی روسیاہی ہے۔''

وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ مقصد ہے کہ انسان کی خدا کی طرف احتیاج و نیاز دونوں جہانوں میں محفوظ و مسلسل ہے مشہور عارف شیخ محمود سبستری گلشن ذار میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سیاہ روئی زممکن در دو عالم
خدا ہرگز نہ شد واللہ اعلم

''ممکن ہے دونوں جہانوں میں سیاہ روئی اور بدبختی کبھی بھی جدا نہیں ہوئی، خدا بہتر جانتا ہے۔''

قرآن کی وہ آیات جو خداوند بزرگ و برتر کے غنا پر تکیہ کرتی ہے ''ہوسکتا ہیں کہ وہ اس برہان کی طرف اشارہ ہوں''۔ لہٰذا ہم ان میں سے چند آیات کو پیش کرتے ہیں:

وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴿٤٨﴾

''اور وہی ہے جس نے اپنے غنائے ذاتی سے ہمیں غنی کیا ہے۔ (ہستی و وجود بخشا ہے) اور سرمایہ ہے۔'' (نجم۔۴۸)

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿٤٢﴾

''تم ایسے موجود کی جو نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے اور نہ ہی تمہیں کسی چیز سے بے نیاز کرتا ہے، پرستش کیوں کرتے ہو۔'' (مریم۔ ۴۲)

حضرت موسےٰ خود کو............ان نعمتوں کیلئے جو خدا نے انہیں عطا کی تھیں، اور جن میں سے ایک ان کا وجود ہے...... نیاز مند اور محتاج سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں:

رَبِّ إِنِّي لِمَآ أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ

''پروردگار! میں اس چیز کا جسے تو نے نازل کیا ہے، نیاز مند و محتاج ہوں۔'' (قصص۔ ۲۴)

اور خدا نے اٹھارہ مواقع [1] پر اپنی غنی کے لفظ کے ساتھ توصیف کی ہے، اور ایک آیت میں زیر بحث آیت کی طرح کہتا ہے:

وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ

''خدا بے نیاز ہے اور تم نیاز مند و محتاج ہو۔'' (محمد۔ ۳۸)

---

[1] ۔سورہ بقرہ آیہ ۲۶۳، ۲۶۷۔ اور آلِ عمران کی آیہ ۹۷۔ اور انعام کی آیہ ۱۳۳۔ اور یونس کی آیہ ۶۸۔ اور ابراہیم کی آیہ ۸، اور سورہ حج کی آیہ ۶۴ اور نمل کی آیہ ۴۰ و............کی طرف رجوع کریں۔

چیزوں کا فقر یا برہانِ امکان

ممکن ہے کہ یہ آیت برہانِ امکان کی طرف ناظر [1] ہو کیونکہ اس آیت میں انسانوں کے فقر و نیاز پر تکیہ ہوا ہے، یہاںتک کہ وجود و پیدائش کے بعد بھی وہ فقیر و نیاز مند ہیں۔ فقر و نیازمندی عین امکان یا اس کا لازمہ ہے کیونکہ ایک ''ممکن'' چیز میں ''واجب الوجود'' اور ''ممتنع الوجود'' کے مقابلہ میں اپنی ذات کی حد تک، وجود و عدم نہیں ہوتا۔ اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ متصف ہونے میں ایک علت کی احتیاج ہے جو اسے موجود یا معدوم کرتی ہے۔

اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ''انسان ممکن الوجود ہے، تو یہ ایسا ہے جیسا کہ ہم کہیں کہ اس میں اپنی ذات کی حد تک اور مقامِ تصور میں، وجود و ہستی مفقود ہے، اور وجود کو قبول کرنے، اور ہستی کے ساتھ متصف ہونے میں، ایک غنی و بے نیاز کا نیازمند و محتاج ہے، جو اسے موجود و محقق کرے اور اسے وجود بخشے۔ اس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں استدلال کی بنیاد برہان ''امکان'' ہے۔

آسمان و زمین کی خلقت خالق کے وجود پر گواہ ہے

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ⑩

''ان کے پیغمبروں نے کہا کیا تم کو خدا کے وجود میں شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، تمہیں دعوت دیتا ہے کہ تمہارے گناہوں کو بخش دے، اور معین مدت تک تمہیں مہلت دے گا (ان کی قوموں نے) پیغمبروں کی دعوت کے جواب میں کہا کہ تم تو ہماری طرح بشر ہو تم

---

[1] ۔ اس حصہ میں امکان سے مراد امکان ''ماھوی'' ہے جو ماہیت اور مفاہیم ذہنی کی کیفیت ہے، نہ کہ وجود کا امکان جو خود ایک دوسرا معنی رکھتا ہے اور اس کا خلاصہ موجودات عالم کا قائم بالذات خدا کے ساتھ تعلق و قیام ہے، خلاصہ یہ کہ بابِ ''ماہیت'' میں امکان، اس امکان کا غیر ہے جو ''وجود'' کے باب میں ہے پہلے میں امکان یہ ہے کہ ''انسان'' کا مفہوم وجود و عدم کی نسبت یکساں ہے جبکہ وجود میں امکان یہ ہے کہ اس شئے کا وجود خدا کے ساتھ قائم ہے اور خود سے کوئی استقلال نہیں رکھتی، اور وجود میں امکان کی امکان ''ماھوی'' کے ساتھ ہرگز تفسیر نہیں کی جا سکتی کیونکہ وجود کی نسبت وجود و عدم کے ساتھ یکساں نہیں ہو سکتی، بلکہ وجود کی اپنی طرف نسبت ضروری ہے لیکن ضروری ہونے کے باوجود وہ غیر کے ساتھ قائم ہے، اور اکثر نا سمجھ لوگ، امکان کی ان دونوں قسموں کو آپس میں مخلوط کر دیتے ہیں۔

چاہتے ہو کہ جن کی ہمارے آباؤ اجداد عبادت کیا کرتے تھے، ان سے روک دو، پس تم (اپنی حقانیت کی) کوئی واضح اور غالب آنے والی دلیل پیش کرو اس آیت سے استدلال کی نوعیت واضح ہے۔'' (ابراہیم۔۱۰)

قرآن خدا کے وجود میں شک کے مسئلہ کو استفہام انکاری کی صورت میں پیش کرتا ہے: ''اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ'' خدا کے وجود میں شک اور تردد کو رد کرنے کیلئے، آسمان وزمین کے وجود میں آنے کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' فطر عربی زبان میں چیرنے کے معنی میں ہے اور اگر خلقت وآفرینش کی ''فطرت'' کہتے ہیں تو وہ بھی اسی مناسبت کی بناء پر کہتے ہیں کہ گویا خالق نے عدم کے دل کو چیز کر پیدا ہونے والی چیز کو اس کے دل سے باہر نکالا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی خلقت اور ان کا عالمِ ظہور میں آنا، ان کے ظاہر اور پیدا کرنے والے کے وجود پر بہترین گواہ ہے جو انہیں عدم ونیستی کے دل سے نکال کر وجود میں لایا ہے، اس بناء پر اس بارے میں شک وتردّد کو اپنے اندر جگہ نہیں دینی چاہیئے۔ اور یہ آیت مصنوع کے وجود سے صانع کے وجود کا پتہ چلانے کی کیفیت کے بارے میں بیان کر رہی ہے، جسے اصطلاح میں برہان ''انی'' کہتے ہیں۔

اس آیت کے بارے میں ایک سوال

خدا کے پیغمبر اپنی قوموں مثلاً قوم نوح، عاد اور ثمود کی ہدایت کیلئے بھیجے گئے تھے، جب کہ وہ خدا کو ہی عالم کا خالق مانتے تھے اور خدا کا قرب حاصل کرنے یا دوسرے علل واسباب کے بناء پر بتوں کی پرستش کرتے تھے تو اس صورت میں خدا کے وجود میں شک کے موضوع کو، استفہامِ انکاری کی صورت میں کس لئے پیش کیا گیا ہے؟ دوسرے الفاظ میں: وہ خدا کے وجود کے منکر نہیں تھے بلکہ وہ تو اپنے بتوں کی عبادت اور پرستش کے طرفدار تھے۔ لہٰذا خدا کے پیغمبروں کو جو غیر خدا کی عبادت سے انہیں منع کرنے کیلئے آئے تھے، یہ چاہیئے تھا کہ مذاکرہ کے موقع پر اس کے غیر کی پرستش کے بے بنیاد ہونے کے بارے میں گفتگو کرتے، اور اس کے خیالی ہونے کے مذاکرہ کے بارے میں دلیل قائم کرتے، نہ یہ کہ خدا کے وجود کے اثبات کے بارے میں بحث کرنے لگ جائیں۔

اس سوال کا جواب زیر بحث آیت کے ماقبل اور مابعد میں غور وفکر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ جب خدا کے رسول انہیں خدائے واحد ویکتا کی پرستش کی دعوت دیتے تھے، اور بتوں کی عبادت سے روکتے تھے تو وہ جواب میں یہ کہتے تھے:

اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ

''ہم اس چیز سے جس کی تبلیغ کیلئے تم بھیجے گئے ہو کفر کرتے ہیں، اور جس چیز کی تم دعوت دیتے

ہو، اس میں ہمیں شک اور تردد ہے۔" (ابراہیم۔۹)

خدا کے رسولوں کی دعوت دو مطالب سے مرکب تھی۔(۱) خدا کی عبادت کرنا (۲) بتوں کی عبادت کو ترک کرنا، یہ گروہ آیت ۹ کی گواہی کے مطابق، دونوں کا، یا کم از کم دوسری کا انکار کرتے تھے، اور خدا کے رسولوں نے خدا کے خالق ہونے کا مسئلہ بیان کرکے، اور اس نسبت کو پیش کرکے، جو اسے آسمان و زمین کی خلقت کے ساتھ ہے، اپنی دونوں دعوتوں پر دلیل قائم کر دی ہے کیونکہ انہوں نے ان سے یہ کہا:

"اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ" کیا تمہیں خدا کے وجود میں شک ہے، تم اس کے وجود میں کیسے شک کر سکتے ہو، حالانکہ اس کے وجود کی نشانیاں واضح و روشن ہیں، اور اس کے وجود کی عظیم ترین نشانی یہ ہے کہ وہ: "فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" ہے اور اگر وہ نہ ہوتا تو اس قصر بلند کا نام ونشان تک نہ ہوتا، اور اس مطلب کا اعتراف کرانے کے بعد جو ان قوموں کیلئے قابل قبول تھا، دونوں مطلب ثابت ہو جاتے ہیں۔

۱۔ اگر تم ایسے خدا پر اعتقاد رکھتے ہو، جو خالق جہاں، اور جسموں اور جانوں کا مالک ہے تو پھر اس کی برتری و رفعت کی بناء پر اور اس بنا پر کہ وہ جہاں اور انسان کا مالک ہے، اسی کی پرستش کرنا چاہیے اور اس کے سامنے بندوں اور غلاموں کی طرح خضوع کرنا چاہیے۔

لہٰذا آیت کے ذیل میں کہتا ہے: "یَدْعُوْكُمْ لِیَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ" تمہیں دعوت دیتا ہے تاکہ تمہارے گناہوں کو جو اس کی عبادت چھوڑ دینے پر تم سے ہوئے ہیں بخش دے۔

۲۔ اگر تم ایسے خدا کا عقیدہ رکھتے ہو تو پھر ان بتوں کی جو اس جہاں کا ایک جز ہیں عبادت کیوں کرتے ہو تمہیں تو احسان کرنے والے اور نعمتیں عطا کرنے والے خدا کی عبادت کرنی چاہیے نہ کہ اس کی عاجز و ناتواں مخلوق کی [1]۔ اس بناء پر خدا کے خالق ہونے کو بیان کرنے کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ عبادت اسی میں منحصر ہے اور اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کرنا چاہیئے۔

اور زیادہ مختصر عبارت میں: ان قومون کے وجدان میں ایک ضمنی مقدمہ موجود تھا، اور وہ یہ ہے کہ جو ہستی خالق ہے وہی مدبر بھی ہے اور اگر خدا کے۔ "فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" ہونے سے اس کی خالقیت تسلیم ہو جائے تو پھر اس کی مدبریت بھی ثابت ہو جاتی ہے اور جب اس کے علاوہ کوئی مدبر نہیں ہے تو پھر تمام خیرات کی کلید بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور پرستش بھی اسی کی کرنی چاہیئے۔ اور اس کے غیر کی پرستش سے (کوئی فائدہ نہ ہونے کی بناء پر) پرہیز کرنا چاہیئے، اس استدلال کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص ایک ادارہ میں جا کر اپنا دکھ درد ایسے شخص سے بیان کرتا ہے جو کوئی کام نہیں کر سکتا تو آپ اس شخص کو اس کی طرف رجوع کرنے سے روکنے کیلئے کہتے ہیں کیا اس ادارہ کا کوئی مالک اور رئیس نہیں ہے؟ اس جملہ کے بیان کرنے کا مقصد جو اس شخص کیلئے بھی قابلِ قبول ہے۔ یہ ہے کہ اسے دوسرے افراد کی طرف رجوع کرنے سے روکیں۔

اس صورت میں خدا کے وجود کے بارے میں شک کو انکار کی صورت میں پیش کرنا، اور اس کی ذات پر دلیل قائم کرنا (جسے مخاطب بھی قبول کرتا ہے) کسی فرد کو غیر خدا کی عبادت سے روکنے اور عبادت کی اس کو ذات میں منحصر کرنے کیلئے ایک مقدمہ اور تمہید ہے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی ج:۵ ص:۲۲۹ ط ۱۳۰۸

برہان امکان برہانِ اِمتناع ”دور“ (صانع کی مصنوع کی طرف احتیاج) کی برہان [۱]

اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَيۡرِ شَىۡءٍ اَمۡ هُمُ الۡخٰلِقُوۡنَؕ‏ ﴿۳۵﴾

”کیا وہ بغیر کسی علت کے وجود میں آئے ہیں یا وہ خذ دہی اپنے خالق ہیں۔“ (طور۔ ۳۵)

اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ‌ۚ بَلْ لَّا يُوۡقِنُوۡنَؕ‏ ﴿۳۶﴾

”یا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے بلکہ وہ اپنی کہی ہوئی بات پر یقین نہیں رکھتے۔“ (طور۔ ۳۶)

اَمۡ لَهُمۡ اِلٰـهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ‌ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ‏ ﴿۴۳﴾

”یا ان کیلئے خدا کے علاوہ کوئی اور خدا ہے، خدا کی ذات ان کے اس شرک سے پاک اور مبرا ہے [۲]۔“ (طور)

پیغمبر گرامیؐ اسلام کی دعوت کے اصول تین مطالب پر مشتمل تھے۔

۱۔ معاد، ۲۔ خدا کی طرف سے آپ کی رسالت۔ ۳۔ توحید، ایک وسیع اور جامع معنی میں کہ جس کی شاخوں میں سے ایک واحد و یکتا و یگانہ خالق وصانع کے وجود کا اعتقاد ہے، اس سورہ میں تینوں موضوع انوکھے پیرائے میں بیان کیئے گئے ہیں۔

آیت ۱ یک لے کر ۲۸ تک انسان اور جہاں کی معاد اور دوبارہ اٹھنے کا مسئلہ بیان ہوا ہے، اور آیہ ۲۹ سے لے کر ۳۵ تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت پر بحث کی گئی ہے اور زیر بحث آیات میں خدا کے وجود کا مسئلہ پیش ہوا ہے۔ [۳]

---

[۱]۔ ان تینوں برہانوں کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ معلول علت کے بغیر محال ہے ۲۔ خود آفرینی جو (دور) کو مستلزم ہے، محال ہے۔ ۳۔ آسمانوں اور زمین کا وجود بھی خالق توانا کے وجود پر گواہ ہے۔

[۲]۔ آیات کے مقصد کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے بہتر ہے کہ ۷ ۳ سے لے کر ۴۳ تک، تمام آیات کا مطالعہ کیا جائے ہم نے اختصار کیلئے صرف تین آیات جن میں اصل استدلال کا بیان ہوا ہے، نقل کی ہیں۔

[۳] تفسیر رازی ج: ۲۸، ص ۲۵۹ طبع جدید

قرآن احتمالات اور سوالات کا ایک سلسلہ پیش کر کے جستجو کے عادی انسان کی خدائے واحد و یکتا کی طرف رہبری کرتا ہے، اگر چہ یہ احتمالات، آیات کے متن کی طرف توجہ کرتے ہوئے، بالکل واضح ہیں لیکن ہم نتیجہ اخذ کرنے کیلئے ان کے مضمون اور مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ وہ کسی علت کے بغیر (چاہے وہ مادی علت ہو، جیسے ماں باپ اور تناسلی سلول یا ایسی علت ہو جو مادہ سے پاک و منزہ ہو جیسے [1] خدا) وجود میں آئے ہوں اور وہ معلول بلا علت ہوں۔ یہ بات ''امر خلقوا من غیر شی'' کے جملہ کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

۲۔ وہ خود ہی اپنے آپ کو وجود میں لائے ہوں اور خود ہی اپنے بنانے والے شمار ہوں۔ یہ احتمال ''امر ھم الخالقون'' کے جملہ کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

۳۔ بالفرض اگر یہ قبول کر لیا جائے کہ وہ خود ہی اپنے آپ کو وجود میں لائے ہیں۔ پھر بھی اس سوال کی گنجائش باقی ہے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور اس سوال کی طرف ''امر خلقوا السماوات والارض'' کے جملہ کے ساتھ اشارہ ہوا ہے۔

۴۔ ان کیلئے خدا کی علاوہ کوئی اور خدا ہو جس کے وہ عبادت و پرستش کریں اور یہ احتمال ''امر لھم الہ غیر اللہ'' کے جملہ کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہ وہ احتمالات ہیں جنہیں قرآن ان کی خدائے یکتا کی طرف رہبری اور ہدایت کے لئے پیش کرتا ہے، اور یہ تمام احتمالات بیدار و ہوشیار وجدان کے سامنے غلط ہیں۔ لہٰذا اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے کہ خدائے یکتا و یگانہ کے وجود کو قبول کر لیں اور عبودیت و بندگی کو اسی کیلئے خالص کر دیں۔

پہلے احتمال کا بے بنیاد ہونا تو بہت ہی واضح و روشن ہے کیونکہ یہ قانون کہ ''ہر پیدا ہونے والے کا کوئی پیدا کرنے والا ہے'' ایک واضح اور روشن مسئلہ ہے، اور انسان کی سرشت، بیدار وجدان، تجربہ اور عقلی برہان و دلیل اس پر گواہی دیتی ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اس بات کا مدعی ہو کہ کوئی معلول بلا علت کے یا کوئی وجود میں آنے والی چیز بغیر وجود میں لانے والے کے ہے تو تمام انسان اس کی بات پر ہنسیں گے، اور برہان امکان اور یہ کہ ہر ممکن کسی علت اور سبب کا محتاج ہے، آیت کی تائید کرتا ہے۔

دوسرے احتمال کا بے بنیاد ہونا بھی پہلے احتمال کی نسبت کم نہیں ہے کیونکہ کوئی پیدا ہونے والا خود آپ ہی اپنا پیدا کرنے والا ہوا ایک معنی کے لحاظ سے اسی پہلے احتمال کی طرف لوٹتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی مخلوق موجود کسی ایسے وجود میں لانے والے کے بغیر ہی جو خارج میں واقع ہو وجود میں آ جائے۔

تیسرا احتمال پہلے دونوں احتمالوں سے بھی زیادہ بے بنیاد ہے اور ان میں سے کوئی بھی اس کا مدعی نہیں ہے کہ سارے آسمان اور زمین

---

[1]۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو پرانٹز کے درمیان قرار پاتی ہے آپ بہت سے ان احتمالات کو جو مفسرین نے لفظ ''من غیر شی'' کے بارے میں بیان کیے ہیں۔ ایک جامع معنی کی طرف پلٹا سکتے ہیں۔ برائے مہربانی ان احتمالات کے بارے میں تفسیر رازی جلد ۲۸ ص ۲۱۰ اور المیزان ج ۱۹ ص ۱۶ کی طرف رجوع کریں۔

ان کی بنائی ہوئی ہے اس صورت میں یقیناً کوئی تو ان کا خالق اور بنانے والا ہے اور وہی خدا ہے جس کو ہم ''اللہ'' کہتے ہیں اور مصنوع کا صانع کی طرف محتاج ہونا، اس برہان کی تائید کرتا ہے۔

ان تینوں احتمالوں کے بے بنیاد ہونے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے: چونکہ وہ علت کے بغیر وجود میں نہی آ سکتے اور خود بھی اپنے وجود کی علت نہیں بن سکتے اور تیسرے طرف سے زمین اور آسمانون کے خلق کرنے میں بھی ان کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا، پس ضروری ہے کہ انسان اور زمین اور آسمانوں کا کوئی خالق ہو اور اسی کی طرف ہم لفظ ''اللہ'' کے ساتھ اشارہ کرتے ہیں اور اسی نے سب کو پیدا کیا ہے۔

دوسرے اور زیادہ علمی الفاظ میں اگر کوئی موجود بالذات وجود نہیں رکھتا اور اس کا وجود خود اپنے اندر سے ہی موجود نہیں ہے، پس وہ ایک مخلوق ہے، اور پہلے احتمال کے بے بنیاد ہونے کی وجہ سے ان کیلئے کسی پیدا کرنے والے کا ہونا ضروری ہے۔ اور اگر وہ بالذات وجود و ہستی کا مالک ہے اور وجود اس کے اندر سے ظاہر ہوتا ہے تو پھر اسے حادث اور مخلوق نہیں ہونا چاہیے اور اس کا وجود ازلی و ابدی ہوگا، جب کہ وہ خود اپنی ہی تصدیق کے مطابق ایک مخلوق وجود سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور ان کا وجود عدم کے بعد ہے۔ اور خود اپنے آپ کو آپ ہی پیدا کرنا وہی ''دور'' ہے جس کا بطلان روشن ہے کیونکہ خود اپنے آپ کو خود ہی پیدا کرنے کا نتیجہ تو یہ ہے کہ وہ چیز پہلے سے وجود رکھتی ہو اور پھر وہ اپنے آپ کو پیدا کرے، اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ کسی چیز کا وجود خود بخود اپنے وجود سے پہلے ہو یعنی اس لحاظ سے کہ وہ اپنی علت ہے اُسے مقدم ہونا چاہیئے اور اس لحاظ سے کہ وہ معلول ہے اسے موخر ہونا چاہیئے

آیات کے مفہوم کا خلاصہ

پہلی آیت میں یہ سوال بیان ہوا ہے کہ کیا خدا کا انکار کرنے والے انسان خود بخود وجود میں آ گئے ہیں؟

لیکن چونکہ وہ ایک ممکن وجود ہیں اور ہر ممکن اپنی پیدائش میں علت کا محتاج ہے، لہٰذا طبعاً اس سوال کا جواب منفی ہے اور آیت برہان ''امکان'' کی طرف ناظر ہوگی۔ دوسری آیت جس میں ''خود آفرینی'' کو بیان کیا گیا ہے، اس سے بطلان ''دور'' کی بُرہان قائم ہوتی ہے کیونکہ اس بناء پر کہ وہ خود ہی اپنی علت ہیں، لہٰذا انہیں خود اپنے آپ سے پہلے موجود ہونا چاہیئے اور یہ وہی چیز ہے جیسے یہ کہتے ہیں کہ ''کسی چیز کا اپنے آپ سے پہلے ہونا'' محال اور عین دور ہے۔

دو سوالوں کا جواب

ان تین احتمالوں کا باطل ہونا اس سے زیادہ نہیں بتاتا کہ انسان اور جہان کسی وجود دینے والے کے محتاج ہیں باقی رہی یہ بات کہ ان سب کا خالق، خدائے واحد و یگانہ ہے کہ جس کا کوئی شریک نہیں ہے، ان تین احتمالوں کے باطل ہونے سے ہرگز یہ مطلب ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ انسان کا خدا، زمین و آسمانوں کے خدا کے علاوہ کوئی اور ہو، اور کئی خدا، انسان اور جہان کے خالق و مدبر و مدیر ہوں۔

جواب

قرآن اس احتمال کو باطل کرنے کیلئے ان آیات کے آخر میں ایک چوتھا جملہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''الم لهم اله غير الله سبحان الله عمّا يشركون'' کیا خدا کے علاوہ ان کیلئے کوئی اور خدا ہے، خدا کی ذات اس سے پاک منزہ ہے کہ جسے وہ خدا کا شریک بناتے ہیں اور اصطلاح کے مطابق ''توحید در خالقیت'' جو آئندہ مباحث میں تفصیل کے ساتھ بیان کی جائے گی ،اس احتمال کو بے بنیاد بنا دیتی ہے کیونکہ توحید در خالقیت ،کے حکم کی بنا پر صفحہ ہستی پر ایک سے زیادہ خالق موجود نہیں ہے اس بیان سے واضح ہوجاتا ہے کہ آیت میں ''الہ'' سے مراد وہی خدا ہے اور شفیع ومقرب کے عنوان سے ہرگز مطلق معبود نہیں ہے۔

۲۔زیر بحث آیات میں مشرکین مکہ سے خطاب ہے اور وہ عام طور پر خدائے واحد و یکتا کے وجود کا اعتقاد رکھنے کے علاوہ صرف اسی کو جہاں وانسان کا خالق بھی سمجھتے تھے اور اس صورت میں ان احتمالات کو پیش کر کے انہیں باطل کرنے کیا ضرورت تھی ان کا جرم تو صرف یہ تھا کہ وہ خداوند عالم کی پرستش سے روگردانی کر کے شفیع ومقرب بتوں کی پوجا کرتے تھے ،کیا بلاغت کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ ان کے اعتقادات پر بحث کا زور ہوتا۔نہ کہ خدائے واحد و یکتا کے وجود کو ثابت کرنے پر۔

جواب

اس سوال کا جواب بھی وہی ہے جو''افي الله شك''......والی آیت میں بیان ہوا ہے خدا ان کے وجدان کو بیدار کرنے کیلئے ،سوالات کا ایک سلسلہ پیش کر کے ان کے وجدان سے اعتراف کرا رہا ہے کہ انسان اور جہان کا ایک سے زیادہ خالق نہیں ہے،اور اس کے علاوہ سب کچھ اس کے نور کے پرتو اور سائے میں عالم وجود میں آیا ہے اور اس اعتراف کے ساتھ ان کے عقیدہ اور عمل پر ایک مضبوط ومحکم ضرب لگاتا ہے کیونکہ اب جب کہ انسان اور جہان کا ایک کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے تو پھر اسی کی پرستش کرو،اور حقیر و بیچارہ مخلوق کی پرستش سے پرہیز کرا ور شرک و دوگانہ پرستی کو چاہے جس عنوان سے بھی ہو اسے چھوڑ دو۔

درحقیقت قرآن نے اہلِ علم کو یکتا پرستی کی منطق سے آشنا کرنے کے ساتھ ساتھ توحید در عبارت کو بھی جس کی اس زمانہ میں قرآن کے مخاطبین کو ضرورت تھی ثابت کیا ہے کہ اس میں ہرگز کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ایک علمی مطلب اہم ہوتے ہوئے کسی دوسرے مسئلہ کا مقدمہ بھی ہو۔

برُہانِ امکان یا بُرہانِ نظم

''سلول انسانی کا اسرار آمیز وجود گیاہ کی پرورش، بادل کا آسمان سے برسنا اور درختوں کی خلقت ان کے خالق کے وجود پر گواہی دیتے ہیں۔''

هٰذَا نُزُلُهُمۡ يَوۡمَ الدِّيۡنِ ؃ۭ

''یہ ہے وہ جو جزا کے دن ان کیلئے آمادہ ہے۔''

نَحۡنُ خَلَقۡنٰكُمۡ فَلَوۡلَا تُصَدِّقُوۡنَ ؃

''ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے پس تم (معاد کی) تصدیق کیوں نہیں کرتے (کیونکہ وہ ذات جو پہلی خلقت پر قدرت رکھتی ہے وہ اسے واپس لوٹانے پر بھی قادر ہے)۔''

اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا تُمۡنُوۡنَ ؃ؕ

''کیا تم نے اس نطفہ کو دیکھا ہے جو تم نے ڈالا ہے''

ءَاَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخٰلِقُوۡنَ ؃

''تم نے اسے پیدا کیا ہے یا ہم اس کے پیدا کرنے والے ہیں۔''

اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ ؃ؕ

''تم جو کچھ بوتے ہو کیا تم نے اسے دیکھا ہے۔''

ءَاَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ ؃

''کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم اس کو اگانے والے ہیں۔''

لَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنٰهُ حُطٰمًا فَظَلۡتُمۡ تَفَكَّهُوۡنَ ؃

''اگر ہم چاہیں تو اسے ریزہ ریزہ کر دیں اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ۔''

اِنَّا لَمُغۡرَمُوۡنَ ؃ۙ بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ؃

''ہمیں تو چٹی پڑ گئی، بلکہ ہم محروم ہو گئے۔''

أَفَرَءَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ﴿٦٨﴾

''کیا تم اس پانی کو دیکھتے ہو جسے تم پیتے ہو۔''

ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ﴿٦٩﴾

''کیا تم نے اسے بادل سے اُتارا ہے یا ہم اسے اتارنے والے ہیں۔''

لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ﴿٧٠﴾

''اگر ہم چاہیں تو اسے کڑوا بنا دیں، تم شکر کیوں نہیں کرتے۔''

أَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ﴿٧١﴾

''کیا تم اس آگ کو دیکھتے ہو جسے تم روشن کرتے ہو۔''

ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ﴿٧٢﴾

کیا تم نے اُن کے درختوں کو پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرتے ہیں۔''

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٧٤﴾ [1]

''پس تم اپنے عظیم پروردگار کی تسبیح کرو۔''

اس سے پہلے کہ ہم آیات کے مفاد کو بیان کریں، ہم تین نکات کا بیان ضروری سمجھتے ہیں۔

ا۔قرآن کی آیات کا اصلی ہدف معاد کی دعوت اور جہان وانسان کے دوبارہ لوٹنے کے اعتقاد کا لازمی ہونا، اور خدا کی پرستش اور ستائش کا ضروری ہونا ہے اور خدا کے وجود کے اثبات کا مسئلہ جیسا کہ بیان ہوگا، ضمنی طور پر ہے۔ بلکہ اس سورہ کی آیات میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سورہ کا اصلی ہدف جو''اذا وقعت الواقعة'' کی آیت سے شروع ہوتی ہے اور زیر بحث آیات بھی جو''هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّينِ'' کی آیت سے شروع ہوتی ہے۔امکان معاد کا اثبات ہے، یہاں تک کہ خدا کی پرستش کے لازم ہونے کا مسئلہ بھی دوسرے درجہ میں آتا ہے، اور اس ہدف ومقصد (خدا کی پرستش) کی طرف زیر بحث آیات کے آخر میں''فسبح باسم رب العظیم'' کے جملہ سے اشارہ ہوا ہے لیکن اس کے باوجود زیر بحث آیات میں وجود صانع کے براہین کی طرف اشارے مل سکتے ہیں۔

چونکہ اس سورہ کی آیات، سوال کرنے کے لحاظ سے، سورہ طور کی آیات کے مشابہ ہیں، تو اس سورہ کی آیات اور سورہ طور کی آیات میں

---

[1] ۔سورہ واقعہ: ہم نے صرف زیر بحث آیات کو نقل کر کے ان کے ترجمہ پر اکتفا کی ہے، لیکن زیادہ آگاہی کیلئے ۵۶ سے لے کر ۷۴ تک تمام آیات کا متن قرآن سے مطالعہ فرمائیں۔

غور وخوض کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن "سقراط" کی طرز پر انسان کے سامنے سوالات کا ایک سلسلہ پیش کرتا ہے تا کہ اس کے وجدان کو بیدار کرے اور ان کے اندر حق کو باطل سے تمیز دے تا کہ انجام کار اان کیلئے حق کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار باقی نہ رہے۔

۲۔قرآن ان آیات میں چار موضوعات کو پیش کرتا ہے۔

(الف) انسان کے سلول کا پیدا کرنا۔

(ب) نباتات کی پرورش اور نشوونما اور انہیں آفات سے محفوظ رکھنا۔

(ج) بادل سے پانی کا برسنا اور اس کا تلخی سے محفوظ رہنا۔

(د) آگ کو درخت کے اندر سے نکالنا۔

درحقیقت موضوع بحث انسان ہے کہ جس کی حیات وزندگی تین عظیم نعمتوں ،مواد غذائی ، پانی اور آگ کے بغیر امکان پذیر نہیں ہے۔[1]

ان آیات میں طرز استدلال ،وجودِ مصنوع (انسان کے مبداء(نطفہ) کی خلقت ،نباتات کی پرورش ،بادل سے پانی کا برسنا اور درختوں کا پیدا ہونا) سے وجود صانع پر استدلال ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان ان پیدا ہونے والی کچھ چیزوں میں جزئی طور پر (مثلاً انسان کی خلقت میں جنسی تعلق اور زمین کے اندر دانہ کے ڈالنے کا) دخل رکھتا ہے لیکن یہ دخل اور جزئی تاثیر ان پیدا ہونے والی چیزوں کی پیدائش میں کافی نہیں ہے اور جب تک ایک عظیم قدرت اس میں کام نہ کرے ،جو ان مقدمات کو بارور کرے اس وقت تک ان کی پیدائش امکان پذیر نہیں ہے۔

اس مطلب کی وضاحت

ا۔"اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ" والی آیات ہیں۔

وجودِ انسانی کے مبدءِ "نطفہ" کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور انسان کے پیدائش میں ماں باپ کو سہیم اور حصہ دار سمجھتا ہے لیکن ان کے حصہ کو ایک عمل انتقالی اور حرکت میکانکی کی حد تک معرفی کراتا ہے اور وہ عمل انتقالی اس سے زیادہ نہس ہے کہ وہ اپنے وجود کی ایک جز کو ایک مقام سے ماں کے رحم کی طرف منتقل کرتا ہے اور بس لیکن خود نطفہ کس کی مخلوق ہے؟ اسے ہرگز باپ کی تخلیق نہیں کہہ سکتے ،لہٰذا طبعاً اس کیلئے ایک خالق معین کرنا پڑے گا، ایسا خالق جس نے اپنی دانش وتوانائی سے نطفہ کو یہ قدرت وتوانائی بخشی ہے کہ وہ ماں کے رحم میں رشد اور نشوونما کرے اور آخر کار اپنی حرکت سے انسان ہوجائے۔مسلمہ طور سے اس اسرار آمیز ذرہ کی خلقت انسان سے بالاتر قدرت کے وجود کی ترجمانی کرتی ہے، جس نے اس مبدءِ حیات کو پیدا کیا ہے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی۔۲۹ص ۱۸

۲۔''اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ'' کی آیات میں زراعت اور کھیتی باڑی کے مسئلہ کو پیش کرتا ہے ،اور زراعت اور کھیتی باڑی کے کام میں کسانوں کیلئے ایک حصہ کا قائل ہے لیکن یہ حصہ دانے کو مٹی کے اندر ڈالنے سے تجاوز نہیں کرتا اور اس بناء پر اجازت دیتا ہے۔ اسے زارع وحارث (کاشت کرنے والا) کہیں لیکن کاشت کار کا کام اس سے آگے نہیں بڑھتا کہ وہ دانہ کو مٹی کے اندر چھپا دے، جب کہ یہ عمل اکیلا کھیتی باڑی کے مسئلہ میں کافی نہیں ہے کیونکہ:

سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ اس دانہ کو کس نے پیدا کیا ہے ایک پر قدرت وتوان دانہ جو ایک مدت کے بعد ایک سنبل (بالی) کی صورت اختیار کر لیتا ہے ،اور سیکڑوں دانوں کو پیدا کرنے والا بن جاتا ہے ،یقیناً اس دانہ گندم کیلئے بشر کے علاوہ کوئی اور پیدا کرنے والا ہونا چاہیے۔

پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ دانہ کو مٹی کے اندر چھپا دینا اس کی پرورش کیلئے کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ عوامل وعلل کا ایک خارجی سلسلہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے گیاہ وسنبل کو سوکھنے سے بچائے۔اور یہ کام انسان کے اختیار سے باہر ہے، یہ یا تو براہ راست خدا کا کام ہے اور یا ان عوامل کا کام ہے جو اس کی مخلوق اور پیدا کئے ہوئے ہیں اور اس حقیقت کی طرف ''لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ'' ''اگر ہم چاہتے تو اس کو خشک کر دیتے ،اس صورت میں تم تعجب کرتے ،اور خود کو مجرم اور خطا کار اور گھاٹے میں سمجھتے'' کی آیت سے اشارہ کرتا ہے۔اس استدلال میں وجود مصنوع ،مثلاً سرسبز زراعت کے ،اس کے خشک ہونے سے حفاظت کرنے سے ،صانع کے وجود پر استدلال ہوا ہے۔

۳۔ بعینہ یہی استدلال تیسرے اور چوتھے حصہ میں بھی حکم فرمایا ہے اور وہ پانی کا بادل سے برسنا ہے جو مسلمہ طور پر ایک مخلوق ہے اور اس کیلئے خالق اور پیدا کرنے والا لازمی ہے اور اگر عوامل طبیعی کے ایک سلسلہ مثلاً سمندر کے بخارات کا اس کی پیدائش میں دخل ہو تو آخر کار اس کا بھی ایک قادر وتوانا پر تکیہ ہوگا جو ان منظم عوامل کو پیدا کرے اور سب کو منظم کرے ،اور پیدا ہونے والے کو ہر قسم کی آلودگی اور تلخی سے روکے ،جیسا کہ فرماتا ہے :''اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ'' اس موقع پر ایک پیدا ہونے والے کے وجود، بادل سے پانی برسنے ،اور اس کے تلخی سے محفوظ رہنے ے، پیدا کرنے والے پر استدلال ہوا ہے۔

اس طرح آگ کا جلنا ہے کیونکہ انسان جو کام انجام دیتا ہے، وہ ماچس کے شعلہ اوران لکڑیوں کو جو چولہے میں ہیں ایک دوسرے سے قریب کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے ،اس جہت سے انسان کا اس پیدا ہونے والی چیز میں ایک حصہ ہے ،لہٰذا آگ کے جلانے کی خود انسان کی طرف نسبت دیتا ہے۔

''اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ'' کیا تم نے اس آگ کو دیکھا ہے جسے تم روشن کرتے ہو۔لیکن مسلمہ طور پر اس پیدا ہونے والی چیز کی پیدائش میں ،اکیلا انسان کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ کوئی قادر وتوانا اس جلانے والے مواد کو تر وخشک درخت میں پیدا کرے ،اور ایک مرموز طریقہ پر اس کو ذخیرہ کرے تاکہ وہ مخصوص حالت میں شعلہ ور ہو کیا درختوں کی پیدائش میں جو جلانے والے مواد کا مخزن ہیں

۔ایک مافوق قدرت کی دخالت کا انکار کیا جا سکتا ہے اسی لئے فرماتا ہے:

ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ

''کیا تم نے ان کے درختوں کو پیدا کیا ہے، یا ہم ان کے پیدا کرنے والے ہیں۔''

ان چاروں حصوں میں مصنوع مرموز کے وجود کو دانا و توانا صانع کے وجود پر گواہ بنایا گیا ہے اور آخر میں ہم پھر یاد دلاتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ ان آیات میں بُرہان ''انی[1]'' کے طور پر خدا کے وجود پر استدلال ہوا ہے لیکن ان آیات کا ہدف خدا نے قادر و توانا کے وجود کو ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ اصل ہدف اس طریقہ سے معاد اور انسان و جہان کے دوبارہ لوٹنے کے امکان پر استدلال کرنا ہے تو پھر ہم انسان کے معاد کا انکار کیوں کریں اور خود ''قرآن کی تعبیر میں: ولقد علمتم النشاة الاولیٰ فلولا تذکرون[2] ''اب جب کہ تم پہلے خلقت کو جان چکے ہو تو پھر اس سے عبرت اور نصیحت حاصل کیوں نہیں کرتے۔'' اب جب کہ اس کی قدرتوں اور توانائیوں کو دیکھ چکے ہو تو پھر انسانوں کے اعادہ اور دوبارہ زندہ کرنے کے بارے میں کیوں انکار کرتے ہو؟

ہر حال میں اگر آیات میں مبدأ برہان یہ ہو کہ یہ اشیاء موجود نہیں تھیں، اور یہ اپنی پیدائش میں علت و سبب کی محتاج ہیں تو پھر یہ آیات ''برہان امکان'' کی طرف ناظر ہونگی۔ اور اگر مبدأ برہان ان کا ''نظم'' ہو تو پھر برہان کی اساس ''نظام بدیع'' (انوکھا نظام) ہوگا۔ لہٰذا ہم نے عنوان بحث میں کہا تھا، برہان امکان یا برہان نظم۔

---

[1] ۔پیدا ہونے والے کے وجود سے پیدا کرنے والے کے وجود پر اور پیدا ہونے والے کی صفت اور خصوصیت سے پیدا کرنے والی کی خصوصیت پر استدلال کرنے کو ''برہان انی'' کہتے ہیں۔

[2] ۔سورہ واقعہ آیہ ۶۲

اجرامِ آسمانی کا مسخر ہونا، مسخر کرنیوالے کی نِشانی ہے

وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ

''ہم اسی طرح سے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت دکھاتے رہے تاکہ وہ اہل یقین میں سے ہوجائے۔''

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ

''جب رات کی تاریکی نے اسے ڈھانپ لیا تو اس نے ایک ستارے کو دیکھا تو کہا یہ میرا پروردگار ہے، جب وہ ڈوب گیا تو اس نے کہا کہ میں غروب کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔''

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ

''جس وقت اس نے چاند کو دیکھا تو کہا یہ میرا پروردگار ہے جب اس نے غروب کیا تو کہا، اگر پروردگار میری رہنمائی نہ کرتا تو میں گمراہ لوگوں میں سے ہوجاتا۔''

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ

''جب اس نے سورج کو دیکھا تو کہا یہ میرا پروردگار ہے یہ تو سب سے بڑا ہے لیکن جب وہ بھی غروب ہوگیا تو کہا: اے قوم! میں ان شریکوں سے جنہیں تم نے خدا کیلئے اختیار کیا ہے بیزار ہوں۔''

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ [1]

''میں نے تو اپنا رخ اسی کی طرف کیا ہوا ہے جس نے آسمان اور زمین کو خلق کیا ہے میں تو اس پر خالص ایمان رکھتا ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔''

ہم ان آیات کا ہدف بیان کرنے سے پہلے وہ نکات جو آیت کے مفہوم کو سمجھنے میں معاون ہیں بیان کرتے ہیں۔

ا۔لفظ ''ملکوت'' کی اصل وہی ''ملک'' ہے، سوائے اس کے کہ ''واؤ'' اور ''تا'' اس میں مبالغہ کیلئے بڑھادی گئی ہے جیسے ''جبروت'' جس کی اصل ''جبر'' ہے اور ''طاغوت'' جس کی اصل ''طغیان'' ہے، تو اس صورت میں ملکوت کا معنی مبالغہ اور تاکید کے اضافہ کے ساتھ، وہی ''ملک'' ہوگا۔

ہم ابراہم کے استدلال کی تشریح میں واضح کریں گے کہ انہون نے نظامِ آفرینش کی تدبیر اور انسانی حیات میں ستارہ، چاند، سورج کے دخل اور حکومت کو کیسے باطل کیا، اور اس کے نتیجہ میں ایک اصیل مدبر و مدیر کے جو تمام اجزاء کے نظام کو چلا رہا ہے معتقد ہوئے ہیں۔

۲۔بعض مفسرین ''را کو کبًا فلما را القمر بازغ......... '' کے جملوں سے یہ مطلب مراد لیتے ہیں کہ انہوں نے یہ جملہ اس وقت کہا جب انکی نگاہ پہلے مرتبہ ستارہ اور چاند پر پڑی تھی اور اس سے پہلے انہوں نے ستارہ، چاند اور سورج کو بالکل نہیں دیکھا تھا۔ کچھ روایات بھی اس نظریہ کی تائید کرتی ہیں، ان میں یہ بیان ہوا ہے کہ وہ بچپنے سے ہی غار میں تھے، اور ان کو والدہ نے انہیں جبار زمانہ ''نمرود'' کے خوف سے اس میں چھپا رکھا تھا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ وہ غار سے باہر نکلے، اور معاشرے میں آکر تحقیق و جستجو شروع کی۔

لیکن یہاں ایک دوسرا احتمال بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے ستارہ اور چاند کو پہلے سے دیکھا ہوا تھا، مگر تحقیق کی نظر اور جستجو کے طور پر نہیں اور یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے ایک محقق کی نظر سے ستارہ اور چاند پر نگاہ ڈالی اور اس سے توحید کا نتیجہ اخذ کیا، اسی وجہ سے قرآن اس نگاہ میں اس سے پہلے کی نگاہوں میں فرق رکھتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: فلما را کو کبًا...... جب اس نے ایک ستارے کو دیکھا، گویا اس سے پہلے اس قسم کی رویت نہیں ہوئی تھیں۔

۳۔''یاقوم انی بریٔ مّما تشرکون'' کا جملہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ انہوں نے اپنی تحقیق و جستجو کا آغاز ایسی قوم کے درمیان کیا جو ان اجرامِ نورانی کو ''رب'' مانتے تھے اور وہ بھی ان تینوں مراحل میں ابراہیم کے ساتھ تھے، اور ان کی ''رب'' کے بارے میں تشخیص کے سلسلہ میں تحقیق و جستجو کو دیکھ رہے تھے اور ان کی باتیں سُن رہے تھے، اور اگر معاملہ کچھ اور ہوتا، تو پھر اپنی قوم کو اچانک خطاب کرنا صحیح نہ ہوتا اور وہ یہ نہ کہتے:

''یاقوم انی بریٔ'' میں تمہارے شرک اور دوگانہ پرستی سے بیزار ہوں، کیونکہ اس خطاب کا ہدف یہ ہے کہ ان کی قوم بھی اس کے

[1] ۔الانعام ۷۵ تا ۷۹۔زیر بحث ابعاد کے مفاد سے مزید آگاہی حاصل کرنے کیلئے آیہ ۸۰ تا ۸۳ کا بھی قرآن سے مطالعہ کریں۔

ساتھ مل جائے اور شرک اور دوگانہ پرستی کے راستے پر نہ چلے اور یہ تکلیف اور ذمہ داری اسی صورت میں صحیح ہے، کہ وہ ابراہیم کی محکم اور استوار منطق کو سن چکے ہوں۔

۴۔ جب ابراہیم کی نگاہ ستارہ، چاند اور سورج پر پڑتی تو وہ کہتے "ھٰذا ربی" "یہ میرا پروردگار ہے"۔ یہ جملہ ان دلائل کی بنا پر جو بیان ہونگی، ستارے کی ربوبیت کے اظہار اور قلبی تصدیق کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد ایک مفروضہ کو پیش کرنا ہے، تاکہ اس کی صحت اور بطلان واضح ہو۔

ایک جستجو کرنے والا انسان کسی حادثہ کے علل و اسباب کے تمام احتمالات کو یکے بعد دیگرے اپنی نگاہ سے گزارتا ہے اور ہر ایک کی وضع وکیفیت کے بارے میں اس طرح سے مطالعہ کرتا ہے، کہ وقت میں اسے علت فرض کرلیتا ہے، اور جب تک نتیجہ واضح نہ ہوجائے، اپنے مفروضہ سے دست بردار نہیں ہوتا۔ لیکن جب پہلے مفروضہ کا بے بنیاد ہونا واضح ہوجاتا ہے تو پھر پہلے مفروضہ کی جگہ دوسرا مفروضہ قائم کرتا ہے، اور تمام حالات میں ایک جستجو کرنیوالے کی طرح تمام مفروضوں کا حکم لگاتا ہے، بغیر اس کے اذعان وتصدیق درمیان میں ہو۔ اس سے قطع نظر آیہ "و کذالك نری ابراهیم"

یہ بتلاتی ہے کہ ابراہیمؑ تمام مواقع میں خدا کے خاص لطف سے بہرہ مند تھے اور اس سے مدد حاصل کرتے تھے اور خدا سے دعا کرتے تھے کہ وہ ان مراحل کو طے کرکے، اور ایک مفروضہ کے بعد دوسرے مفروضہ کو (یکے بعد دیگرے) باطل کرکے آسمانوں اور زمین کے ملکوت، یعنی ان پر خدا کی حاکمیت و مالکیت مطلقہ سے مکمل طور پر آگاہ ہوجائیں اور شک کو دور کرنے والے برہان کے ساتھ اس بات کا یقین اور اطمینان حاصل کرلیں کہ انسان کی تدبیر خدا کے ہاتھ میں ہے، نہ کہ ان نورانی اجرام کے ہاتھوں میں، جو خود قوانین طبیعت کے جنگل میں اسیر اور محکوم ہیں، اور اس مفروضہ کے ہوتے ہوئے کوئی معنی نہیں ہے کہ "ہذا ربی" کا جملہ تصدیق قلبی اور ان اجرام کی ربوبیت کے معنی میں ہو۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ چاہتے تھے کہ آسمانوں اور زمین کی ملکوت اور قدرت خدا کے ساتھ ان کی وابستگی اور تعلق کا یقین کی نگاہ سے مشاہدہ کریں تاکہ "یقین رکھنے والے" گرہ میں اور قرآن کی تعبیر "موقنین" کا جز بن جائیں، البتہ یہ گفتگو اس معنی میں بھی نہیں ہے کہ آپ اس وقت تک اس موضوع کے بارے میں یقین نہیں رکھتے تھے، ایسا نہیں ہے، بلکہ وہ فطری طریقہ سے جانتے تھے کہ انسان اور جہان کا رب اور مدیر و مدبر خدائے آفریدگار ہے لیکن وہ جانتے تھے کہ استدلال کے راستے سے بھی جس بات کی فطرت انہیں دعوت دیتی ہے پہنچ جائیں۔ اور یہ مطلب ابراہیمؑ کے بارے میں کوئی نئی بات نہیں ہے اور انسان وجہان کی معاد اور دوبارہ زندہ ہونے کے بارے میں بھی مکرر بیان ہوا ہے۔ [1]

اس سے قطع نظر جیسا کہ بیان ہوچکا ہے کہ ابراہیمؑ کی تحقیق وجستجو ایسی حالت میں صورت پذیر ہوئی جب ان کی مشرک قوم، ستارہ، چاند اور سورج کی پرستش کررہی تھی اور ان کے ساتھ موجود تھی تو اس صورت میں اس جستجو اور تحقیق کے اہداف میں سے ایک ان کی ہدایت

---

[1] ۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ط بقرہ۔۲۶۰ والی آیت کی تفسیر کی طرف رجوع کریں۔

اور رہنمائی بھی تھی، اور رہنمائی کے طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ رہنما شخص مد مقابل کی فضول بات کو بھی وقتی طور پر قبول کرے اور پھر محکم اور مضبوط دلیل کے ساتھ ایک اس کے بے بنیاد ہونے کو مدلل اور واضح کرے اور ابراہیمؑ کا واقعہ اس قانونِ کلی سے مستثنیٰ نہیں تھا۔

۵۔ زیر بحث آیات کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ نے چاند، ستارے اور سورج کی ربوبیت کے بارے میں اپنی تحقیق اور جستجو ایک ہی جگہ اور یکے بعد دیگرے انجام دی ہے کہ ستارے کے غروب ہوتے ہی چاند نکل آیا، اور چاند کے ڈوبتے ہی سورج نکل آیا۔ اور اس قسم کی بات کہ ستارے کے ڈوبنے کے ساتھ ہی لازمی طور پر چاند نکل آئے زیادہ تر زہرہ ستارہ میں امکان پذیر ہے۔ کیونکہ زہرہ ستارہ اپنے مدار کی بنا پر سورج سے ۴۷ درجہ سے زیادہ دور نہیں ہو سکتا اس بناء پر ہمیشہ سورج کے ساتھ ہی رہتا ہے کبھی وہ سورج کے طلوع سے پہلے آسمان پر نمایاں ہوتا ہے اور عوام کی زبان میں اسے صبح کا ستارہ کہتے ہیں کچھ دیر نہیں گزرنے پاتی کہ سورج کے طلوع ہونے کے بعد وہ افق میں پنہاں ہو جاتا ہے اور یکا یک سورج کے غروب ہونے کے بعد مغرب کی طرف نمایاں ہوتا ہے اور زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ وہ ڈوب جاتا ہے۔ اس بناء پر مہینہ کے دوسرے نصف میں ۱۷، ۱۸، اور ۱۹ کی راتوں میں زہرہ کا غروب چاند کے طلوع کے تقریباً ساتھ ہوتا ہے تو اس صورت میں بعید نہیں ہے کہ ان کا مورد نظر ستارہ ''ولما رای کوکبا'' کے جملہ میں وہی زہرہ ستارہ ہو۔[1]

اس سے قطع نظر وہ لوگ جو عراق میں رہتے تھے اور ابراہیمؑ بھی انہیں کے درمیان تھے زمین کی مخلوق کی تدبیر کو سات ستاروں کی طرف ہی نسبت دیتے تھے اور اجرام آسمانی کے درمیان صرف انہیں سات ستاروں ہی کو محترم شمار کرتے تھے، ہندوؤں کے برعکس جو زمینی موجودات کی تدبیر کی ثوابت ستاروں کی نسبت دیتے تھے اور صرف انہیں کو محترم سمجھتے تھے۔

۶۔ یہ آیہ ''اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ'' اس بات کی ترجمانی کرتی ہے کہ آپ کے اور آپ کی قوم کے درمیان خدا کی خالقیت کا مسئلہ زیر بحث نہیں تھا، اور آپ کے قبیلہ والوں کو بھی یہ بات قبول تھی کہ اس کے علاوہ کوئی اور خالق وآفریدگار موجود نہیں ہے آپ کی بحث ایک اور مطلب کے گرد گھومتی ہے اور وہ یہ تھی کہ زمینی موجودات کا مدبر ومدیر کون ہے؟ کیا وہی خدا جو خالق وآفریدگار ہے وہی مدیر وکارگزار بھی ہے یا یہ ہے کہ موجودات زمینی کی تدبیر اس کی بعض مخلوق کے سپرد ہوئی ہے جیسا کہ آپ کی قوم جو عراق میں تھی یہی خیال کرتی تھی، وہ یہ تصور کرتے تھے کہ حوادث اور زمینی کائنات کی تدبیر ستارہ چاند اور سورج کے سپرد کی گئی ہے۔ اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ بحث کا زور، صانع کی اثبات، یا اس کی ذات کی یکتائی، یا خالقیت کی توحید، اور یہ کہ اس کے علاوہ کوئی خالق نہیں ہے پر نہیں تھا، بلکہ بحث کا زور، حوادث زمینی کے مدبر ومدیر کی تشخیص وتعین پر تھا تاکہ واضح ہو جائے کہ ان مخلوقات وموجودات کا مدبر ومدیر کون ہے؟

اور ایک معنی کے لحاظ سے بحث کا زور ''توحید افعالی'' پر تھا یعنی پورے عالم کے تدبیر یا اس کے ایک حصہ مثلاً زمینی موجودات کی تدبیر پر جو توحید در افعال کا ایک حصہ ہے اور آپ کی قوم تدبیر کے مسئلہ میں مشرک تھی، اور ابراہیمؑ یہ چاہتے تھے کہ انہیں اس مسئلہ میں یکتا مدبر کا معتقد بنائیں۔ اسی بناء پر آیت کے آخر میں ''اِنِّیْ وَجَّهْتُ... وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ'' کہتے ہیں یعنی میں مشرک گروہ میں سے

---

[1] ۔ اور اہل بیت رسالت کی روایات میں بھی تصریح ہوئی ہے کہ یہ ستارہ ہی زہرہ ستارہ تھا۔

نہیں ہوں، اور آسمانوں اور زمین کے خالق خدا کو ہی یکتا و یگانہ مدبر و مدیر سمجھتا ہوں۔

ے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام تینوں مواد میں ان اجرام کے ڈوبنے اور غروب ہونے کو اس بات پر گواہ بناتے تھے کہ یہ اجرام حوادثِ زمین اور بالخصوص انسان نامی مخلوق کی تدبیر و کارکردگی کی لیاقت و شائستگی نہیں رکھتے۔اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان اجرام کا ڈوبنا، اور غائب ہوجانا، ان کے مدبر نہ ہونے کا گواہ کیوں ہے؟

اس مطلب کو مختلف صورتوں میں بیان کی جاسکتا ہے اور ان میں سے ہر ایک گروہ کیلئے مفید اور سودمند ہے، اجرام آسمانی کی مدبریت کو گونا گوں صورتوں میں باطل کرنے میں حضرت ابراہیمؑ کے منطق کی تفسیر اس بات کی گواہ ہے کہ قرآن مختلف الابعاد جہات کا حامل ہے اور ہر بعد و جہت ایک الگ گروہ کیلئے پیش کی جاتی ہے۔اس ستدلال کی گونا گوں تفاسیر یہ ہیں۔

(الف)......کسی کو رب اور پروردگار بنانے کا مقصد یہ ہے کہ ضعیف و ناتواں مخلوق اس کی قدرت و توانائی کے زیر سایہ درجہ کمال کو پہنچ جائے اور ایسے مربی کا زیر تربیت موجودات کے ساتھ نزدیک کا تعلق و رشتہ ہونا چاہیے۔اس طرح سے کہ وہ ہمیشہ ان کے حالات سے آگاہ رہے اور اس سے جدا نہ ہو اور اس کے پاس حاضر رہے۔ایسا موجود جو گھنٹوں گھنٹوں زیر تربیت فرد سے غائب رہے اور کلی طور پر اس سے بیگانہ ہوجاتا ہے اور نور و برکت کو اس کے سر سے ختم کردیتا ہے وہ موجودات زمینی کا مربی اور پروردگار کیسے ہوسکتا ہے اس بناء پر ستارے کا ڈوبنا اور اس کا غروب ہوجانا اور حوادث زمینی سے اس کی بیگانگی کی نشانی ہے اس بات پر گواہ ہے کہ زمین کے موجودات کا مربی اور پروردگار کوئی اور ہے جو اس نقص سے پاک اور مبرا ہے۔

(ب)......آسمانی اجرام کا طلوع و غروب اور ان کی منظم حرکت اس بات پر گواہ ہے کہ وہ سب کے سب زیر فرمان ہیں اور خود ایسے قوانین کے چنگل میں جو ان پر حکومت کرتے ہیں۔گرفتار ہیں اور منظم قوانین کی پیروی خود ان کے ضعف و ناتوانی پر گواہ ہے اور اس قسم کے ضعیف موجودات وسیع عالم ہستی جو حوادث زمینی پر حاکم نہیں ہوسکتے اور اگر زمینی موجودات ان کے نور اور روشنی سے بہرہ مند ہوتے ہیں تو یہ انکی ربوبیت کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس امر پر گواہ ہے کہ یہ موجودات بالاتر مقام کے فرمان سے زمینی حوادث کیلئے انجام وظیفہ اور اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہیں اور دوسرے الفاظ میں: یہ مطلب موجودات عالم کے ایک دوسرے کے ساتھ انسجام ہم آہنگی ہونے اور انکی آپس میں وابستگی پر گواہ ہے۔

(ج)......ان موجودات کی حرکت کا مقصد کیا ہے؟ کیا یہ ہدف ہے کہ نقص سے کمال کی طرف جائیں یا اس کے برعکس، دوسرا تو قابل تصور نہیں ہے، اور یہ فرض تصور اس کا کوئی معنی نہیں ہے کہ موجودات کا مربی اور مدبر مرحلہ کمال سے نقص و نیستی کی طرف جائے اور پہلا فرض خود ایک دوسرے مربی کے وجود کا گواہ ہے جو ان موجودات کو جو بظاہر طاقتور ہیں، ایک مرحلہ سے اور زیادہ کامل مرحلہ تک پہنچاتا ہے اور حقیقت میں وہی رب اور پروردگار ہے جو ان اجرام کو اور جو کچھ انکے نیچے موجود ہے سب کو کمال تک پہنچاتا ہے۔

کیا ابراہیمؑ کا ہدف ان کی خدائی کی نفی ہے؟

کچھ مفسرین کا یہ خیال ہے کہ ابراہیمؑ کا مقصد ان اجرام کی الوہیت اور خداوندی کی نفی ہے نہ کہ مدبریت و مدیریت اور اس مطلب کو انہوں نے مختلف شکلوں میں پیش کیا ہے اور ہم بھی ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ ڈوبنا اور غروب ہو جانا اجرام میں حرکت کی نشانی ہے اور متحرک میں حرکت کا لازمہ تغیر و تبدیلی اور تبدیلی متحرک کے حادث ہونے کی دلیل ہے کیونکہ متحرک موجودات حرکت کے بعد کسی کمال تک پہنچی ہیں جو پہلے ان میں موجود نہیں ہوتی اس بناء پر حرکت حدوث کا لازمہ ہے اور موجود حادث اس بناء پر کہ وہ ازلی وابدی نہیں ہے وہ اللہ اور خدا نہیں ہوسکتا۔[۱] اس استدلال پر اشکال واضح ہے۔

اوّلاً: اگر غروب وافول حدوث کی نشانی ہے تو پھر ابراہیمؑ نے صرف غروب کو ہی حدوث کی دلیل کیوں قرار دیا ہے حالانکہ غروب وطلوع حدوث پر دلالت کے لحاظ سے بالکل یکساں ہے۔

ثانیاً: اگر وہ اجرام سماوی کو خدائے واجب الوجود خیال کرتے تھے کہ جس تک پہنچ کر سلسلہ موجودات کو منتہی ہونا چاہیے تو حدوث قطعی طور پر اس کی ساحت قدس کیلئے سازگار نہیں تھا، چونکہ وہ تمام علتوں کی علت (علت العلل) ہونے کی وجہ سے ازلی وابدی ہے لیکن ابراہیمؑ کی قوم ان اجرام کو مخلوقِ خدا جانتے ہوئے یہ تصور کرتی تھی کہ حوادث ارضی اور موجودات زمینی کی تربیت اور پرورش انہیں تفویض ہوئی ہے اس قسم کے مربی کے لئے نہ تو حدوث مضر ہے اور نہ ہی ازلی وابدی ہونا شرط ہے اس بناء پر حدوث اور ازلی وابدی نہ ہونے کے مسئلہ کو پیش کرنے کا ابراہیمؑ کی برہان کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔

۲۔ اگر حرکت دلیل حدوث ہے تو وہ دلیل امکان بھی ہے اور اس امر کا گواہ یہ ہے کہ ہر حادث ممکن ہے اور ہر ممکن کو وجود کے لحاظ سے کسی ایسے موجود تک منتہی ہونا چاہیے کہ جو امکان سے مبرا ہو اور اس کا وجود خود اسی سے مربوط ہو اور اصطلاح کے مطابق واجب الوجود ہو۔ اس استدلال پر اشکال بھی واضح ہے۔

کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم، چاند، ستارہ اور سورج کو، خدائے بزرگ اور خالق عالم، جس کے ساتھ جہاں کا وجود وہستی مربوط ہے نہیں جانتے تھے تا کہ اس کا امکان ان کے عقیدے کے بطلان کی دلیل ہے۔

۳۔ مرحوم صدر المتالہین نے ابراہیمؑ کے استدلال کو صانع کے اثبات سے مربوط سمجھا ہے اور علماء طبیعی کی طرح[۲] جو عالم کے حرکت سے محرک کی

---

[۱] تفسیر فخر رازی ج ۴ ص ۸۰ ط ۱۳۰۷ مصر

[۲] ۔علوم طبیعی کے علماء اپنے علم کے مناسبت سے جو اجسام کے خواص سے بحث کرتے ہیں حرکت کے وجود سے خدا کے وجود پر استدلال کرتے ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ حرکت کے لئے کسی محرک کا ہونا لازمی ہے اور آخر کار وہ ایک ایسے محرک تک جو غیر متحرک ہو منتہی ہو جاتا ہے تا کہ دور اور تسلسل کا اعتراض پیدا نہ ہو، حکیم سبزواری کہتا ہے: ثم الطبیعی طریق الحرکة یاخذ للحق سبیلا سلکه (شرح منظومہ ص ۱۴۲) پھر طبیعی حرکت کے طریق کو حق تک پہنچنے کا راستہ بنا کر اس پر چلتا ہے۔

طرف جاتے ہیں آیت کی تفسیر کی ہے انہوں نے کئی مقدمات سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان اجرام کی حرکت نہ تو طبیعی ہے اور نہ ہی قسری بلکہ ارادی ،اختیاری اور آ گاہانہ ہے اور اس آ گاہانہ حرکت کے لئے ایک عامل کی ضرورت ہے اور یہ عامل وہی واجب الوجود ہے ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے:

ان کی حرکت نہ تو طبیعی ہے جو ان کی طبعی سے مربوط ہو اور جسم متحرک کی خود طبع سے پیدا ہوئی ہو اور نہ ہی قسری ہے یعنی ایسی حرکت جو جسم متحرک کے طبیعی میلان کی جہت کے مخالف ہو، اور اس کے پیدا ہونے کا سبب کوئی اور جسم ہو جو اس پر اثر انداز ہوتا ہو۔ بلکہ ان کی حرکت آ گاہانہ اور شوق وارادہ کی بناء پر ہے اور غضب وشہوت بھی اس کے محرک نہیں ہوتے کیونکہ (ان کی نگاہ میں) یہ موجودات اس سے بالاتر ہیں کہ غضب وشہوت رکھتے ہوں بلکہ ان کی حرکت آ گاہانہ ہے اور انکا عامل ایسا امر ہے جو مادہ سے پاک اور منزہ ہے اور یہ عامل قدسی اگر واجب الوجود ہو تو وہی خدا ہے، اور اگر یہ صورت نہ ہو تو دفع تسلسل کی بناء پر اُسے واجب الوجود تک منتہی ہونا پڑے گا۔[1]

یہ استدلال، قطع نظر اس سے کہ اس کے مقدمات باطل اور بے بنیاد معرفی ہوتے ہیں اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ان کی حرکت آ گاہانہ نہیں ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کلام کے ظاہر کے مطابق نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے وہ صانع کا اثبات نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ تو شرک اور زمینی موجودات کی ربوبیت اور کارگردانی میں دوگانہ بینی سے دوری و بیزاری کو ثابت کر رہے ہیں۔

ان آیات کے سلسلہ میں آخری بات

یہ آیات براہِ راست شرک سے مبارزہ کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں لیکن بالواسطہ طور پر اثبات صانع سے بھی مربوط ہو سکتی ہے مثلاً ہم کہیں: ان کا ڈوبنا اور غروب ہونا ان کے مسخر ہونے کی نشانی ہے اور یہ کہ کوئی ان کا پیدا کرنے والا ہے اس صورت میں خدائے جہان ان فرمانبرداری کرنے والوں میں سے نہیں ہے بلکہ وہ ،وہ فرمان دینے والا ہے جو ان پر حاکم ہے تو اس صورت میں ان اجرام کا غروب ہونا اور نا پائیداری جہاں ان کے رب نہ ہونے کی نشانی ہے وہاں ایک ایسے موجود کی ربوبیت پر گواہ بھی ہے جس نے انہیں مسخر کیا ہوا ہے۔

انسان اور جہان میں خدا کی نشانیاں

قل ارء یتم ان کان من عنداللہ ثم کفرتم بہ من اضل ممن ھو فی شقاق بعید

”کہہ دے، مجھے بتاؤ، اگر (قرآن) خدا کی طرف سے ہو اور تم اس کا انکار کر رہے ہو، تو اس سے زیادہ گمراہ اور کون ہے جو حق کے ساتھ شدید عناد رکھتا ہے۔“ (حٰم السجدہ۔ ۵۲)

---

[1] ۔مبدء و معاد ص، ۱۱

سنریھم اٰیاتنا فی الاٰفاق وفی انفسھم حتّٰی یتبین لھم انه الحق اولم یکف بربك انه علیٰ کل شیء شھید

''ہم عنقریب اپنی آیات اور نشانیاں، آفاق میں اور خود انہیں میں انہیں دکھائیں گے تا کہ ثابت ہو جائے کہ وہ (قرآن) حق ہے کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (یا سب کیلئے حاضر و واضح ہے)'' (حٰم السجدہ۔ ۵۳)

علم کلام اور فلسفہ کی کتابوں [1] میں توحید کے مسائل پر چاہے وہ خدا کے وجود کا اثبات ہو یا توحید اور دوسرے صفات دوسری آیت سے استدلال ہوتا ہے اور لکھنے والے بھی بولنے والے بھی اس آیت پر تکیہ کرتے ہیں اور جن موقع پر انکی بحث توحید کے ساتھ مربوط ہو تو وہ اسی کے مضمون سے استشہاد کرتے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ آیت کا ہدف و مقصد کیا ہے؟ جو لوگ دوسری آیت کو مسئلہ توحید کے ساتھ مربوط جانتے ہیں وہ آیت کی اس طرح تفسیر کرتے ہیں۔ جہاں کے عجیب و غریب نظام، ثابت و سیار کے نظام اور زمین میں گونا گوں نباتات اور جانداروں کی انواع کے نظام خدا کے وجود پر آفاقی دلیل ہیں۔ جیسا کہ انسان کے وجود کے حیرت انگیز نظام اس کی تکوین و پیدائش سے لے کر موت کے لمحہ تک خدا کے وجود اور اس کی یکتائی پر ''دلیل انفسی'' ہیں۔

ابنِ سینا کی گفتگو

ابن سینا کتاب ''اشارات'' میں جو اس کی فلسفہ کی آخری تحریر ہے دوسری آیت کے مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

ا۔ پہلا حصہ ''سنریھم آیاتنا فی الاٰفاق وفی انفسھم'' کا جملہ ہے وہ کہتا ہے کہ جہان اور انسان میں خدا کی نشانیوں سے ہم خدا کے وجود کو پا لیتے ہیں اور چونکہ اس قسم کا استدلال معلول سے علت کے وجود پر استدلال ہے، لہٰذا اصطلاح میں اسے برہان ''انی'' کہتے ہیں جیسا کہ ہم بارش کے برسنے اور رعد و برق کی کڑکنے کی آواز سے تاریک بادلوں کے وجود پر استدلال کرتے ہیں۔

آیت کے دوسرے حصہ کا مضمون یہ ہے۔ ''اولم یکف بربك انه علیٰ کل شیء شھید'' کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا پروردگار ہر چیز پر گواہ اور دلیل ہے، اس حصہ میں خدا کا وجود تمام موجودات کے وجود کی دلیل اور اس پر گواہ ہوگا یعنی ہم علت کے وجود سے معلول کے وجود کو پاتے ہیں جیسا کہ ہم سیاہ اور پھیلے ہوئے بادلوں کے مشاہدے سے کسی علاقے میں بارش کے برسنے کو معلوم کر لیتے ہیں لہٰذا حقیقت میں خدائی شہود کی راہ سے ہم اس صفات کی شناسائی حاصل کرتے ہیں اور اس کی صفات کی شناسائی سے ہم اس کے افعال کو کم و بیش

---

[1]۔ اشارات ج ۳ ص ۱۶۶ اسفار ج ۳ ص ۲۶

معلوم کر لیتے ہیں۔[1]

مفاد آیت کی وضاحت

اگر ہم دوسری تمام آیت کو مجموعی طور پر پہلی اور اس کے ماقبل کی آیت کے ساتھ مربوط سمجھیں اور آیات کے سیاق اور پیوستگی کو نظر میں رکھیں تو پھر دوسری آیت ایک ایسے ہدف کو بیان کرتی ہوئی نظر آتی ہے جس کا توحید کے ساتھ کچھ ربط نہیں ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ پہلی آیت میں گفتگو کا محور ''قرآن'' ہے اور ''کان'' کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹتی ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

''قل ارایتم ان کان من عنداللہ'' کہہ دے، مجھے بتاؤ اگر قرآن خدا کی طرف سے ہو۔''

اسی بناء پر دوسری آیت میں ''انہ الحق'' کی ضمیر کو قرآں کی طرف لوٹنا چاہیے تو اس بنیاد پر وہ آفاقی اور انفسی نشانیاں جو خدا دکھائے گا وہ ان آیات ودلائل کے سلسلہ سے متعلق ہونگی، جو قرآن کی حقانیت اور اس کے استواری کی گواہی دیں گی نہ کہ خصوصیت سے خدا کے وجود پر اور نہ ہی خصوصیت سے اس کی ذات کی یکتائی پر۔ خلاصہ یہ ہے کہ خدا مشرکین کے ماحول اور خود انہیں کے نفوس سے مربوط آیات کا ایک سلسلہ دکھا کر قرآن کے مشمولات ومحتویات کی حقانیت کو کلی طور پر ثابت کر دے گا۔

جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کا بتدریج پھیلتے جانا اور مردان توحید کے ذریعے شرک کی دست گاہ کا سقوط اور اس علاقہ میں یکتا پرستی کی حکومت کا قیام، آفاقی اور انفسی آیات کا ایک سلسلہ ہے جو قرآن کی حقانیت کو جو بہت مدتوں پہلے اس قسم کی توسیع اور پیش رفت کی خبر دے چکا تھا ثابت کرتا ہے۔ قرآنی آیات میں اسی خوشخبریوں کا ایک سلسلہ ہے جو صراحت کے ساتھ یہ بیان کرتی ہیں کہ بس جلدی روئے زمین میں خدا اور اہل ایمان کی حکومت قائم ہوجائے گی، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

''خدا نے تم میں سے باایمان اور نیکوکار افراد کو یہ وعدہ دیا ہے کہ وہ انہیں روئے زمین پر اپنا خلیفہ قرار دے۔'' (نور۔ ۵۵)

رسولِ خدا ﷺ کے زمانہ میں اور اس کے بعد اسلام کی وسعت اور پھیلاؤ، قرآن کے غیبی اخبار کی حقانیت کی ایک آفاق نشانی تھی۔ بدر واحد اور احزاب میں قریش کے سرداروں کا مارا جانا اور قیصر کسریٰ کے نظام کا ختم ہوجانا، وہ ''انفسی'' نشانیاں ہیں جو قرآن کے اخبار کی حقانیت کی گواہی دیتی ہیں۔ اور ان دونوں قسم کی نشانیوں کے پورا ہوجانے کے بعد قرآن کی استواری اور دعوت میں کسی کو کسی قسم کا کوئی شک نہیں

---

[1] ۔ اس قسم کے استدلال وہی صدیقین (سچائی اور روشنی میں ڈوبے ہوئے) والا استدلال ہے جو ہستی بینی کے سلسلہ میں اپنی بحث اور تحقیق کو خود خدا سے شروع کرتے ہیں اور کائنات پر ختم کرتے ہیں اور ہم بعد والی فصل میں صدیقین کی برہان کیلئے ابن سینا اور صدر المتالہین کے دونوں طریقوں کی طرف اشارہ کریں گے لیکن صرف ابن سینا کے بیان کی تشریح وتفہیم کیلئے کئی مقدمات کی ضرورت ہے جو ہماری کتاب کے مقصد سے خارج ہے اور بہت سے پڑھنے والوں کیلئے دشوار ہے۔

ہونا چاہیئے۔ جب ہم نے آیت کے پہلے حصہ کی اس طرح تفسیر کی ہے تو پھر ہم مجبور ہیں کہ دوسرے حصہ کی اس طرح تفسیر کریں جو اس معنی کے ساتھ منطبق ہو۔ مثلاً ہم یہ کہیں:

خدا آیت کے ذیل میں قرآن کی دعوتوں سے ایک بہت ہی بنیادی دعوت کو بیان کر رہا ہے اور وہ خدا کا ہر جگہ حاضر ہونا ہے اور یہ کہ وہ ہر چیز پر دلیل و گواہ ہے اور وہ ہر چیز کا مشاہدہ کر رہا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

''اولم کیف بربك انه علیٰ کل شیءشهید [1] ''اس بنا پر آیت کے دونوں حصوں میں سے کوئی بھی حصہ مسئلہ ''توحید'' کے ساتھ کوئی ارتباط نہیں رکھتا۔ یہ نتیجہ اس صورت میں ہے اگر ہم ان دونوں آیات کو ایک دوسرے سے مربوط سمجھیں اور دونوں آیات کے سیاق کی حفاظت کریں۔ اور اگر ہم دوسری آیت کو پہلی آیت سے الگ کر کے مطالعہ کریں یا ہم یہ احتمال کریں کہ یہ آیت دو مرتبہ نازل ہوئی ہے (ایک مرتبہ پہلے آیت کے ضمیمہ کے طور پر اور دوسری مرتبہ بطور مستقل) تو اس صورت میں دوسری آیت کے دونوں حصے، نظام گیتی اور نفسِ انسانی میں خدا کے وجود کے دلائل کی طرف ناظر ہونگے اور ''انه الحق'' کی ضمیر خود خدا کی طرف لوٹے گی، آیت کا متن ''اولم یکف بربك انه علیٰ کل شیء شهید'' اس تفسیر کے ساتھ زیادہ مناسب ہے اور وہ ''صدیقین'' کے برہان پر جس کی ہم آئندہ تشریح کریں گے منطبق ہونے کی طاقت رکھتی ہے۔

خداشناسی اور دفترِ آفرینش

آیات قرآنی کا ایک حصہ، ہمیں کتاب خلقت میں خدا کی آیات اور نشانیوں کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور اسے عقلمندوں، غور و فکر کرنے والوں اور بیدار مغز لوگوں کا ایک عمدہ طریقہ قرار دیتا ہے۔ [2]

اور اس بارے میں اس قدر زیادہ آیات ہیں جن کے دسویں حصہ کو بھی ہم ان صفحات میں نقل نہیں کر سکتے ہم صرف چند نمونے پیش کرتے ہیں اور پھر اس قسم کی آیات کے اہداف و مقاصد میں بحث و گفتگو کرینگے۔

۱۔ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾

---

[1] ۔ ''باء'' ''بربك'' کے لفظوں میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔

[2] ۔ لقوم یعقلون بقرہ آیہ: ۱۶۴، لقوم یتفکرون سورہ رعد آیہ: ۳، یقوم یذ کرون سورہ نحل آیہ: ۱۳

''آسمان اور زمین کی خلقت میں اور رات اور دن کی گردش لوگوں کے فائدے کے لئے کشتیوں کا دریا میں چلنا اور وہ بارش جسے خدا آسمان سے نازل کرتا ہے اور مردہ زمینوں کو زندہ کرتا ہے اور قسم قسم کے چلنے پھرنے والے جانور جنہیں روئے زمین میں پھیلا دیا ہے اور ہواؤں اور بادلوں کا گردش کرنا جو زمین آسمان کے درمیان مسخر کئے گئے ہیں (ان امور میں) عقل مندوں کیلئے نشانیاں ہیں۔'' (بقرہ ۱۶۴)

یہ آیت ہمیں چند امور میں غور وفکر اور شناخت کی دعوت دیتی ہے۔

۱۔ آسمان وزمین اور رات دن کی گردش سے جہان کی شناخت۔

۲۔ دریا میں کشتی رانی کی صنعت میں اس کے اقتصادی منافع کے ساتھ غور وخوض

۳۔ ہوا، بادل، بارش اور ان کے پیدا ہونے کے علل واسباب کے ذریعہ کائنات جوئی کی شناخت

۴۔ روئے زمین میں پھیلے ہوئے جانداروں کی شناخت جو زیست شناسی کی اساس وبنیاد ہیں۔

ان مسائل میں غور وفکر کرنے سے کئی نتائج برآمد ہوتے ہیں اور یہ کسی دوسری چیز کی شناخت کا مبدا ہو سکتا ہے کیا ہمارے اس انوکھے نظام کی طرف توجہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس طریقہ سے اس عالم اور اس کے نظام کے صانع کو معلوم کریں۔ یا یہ کہ ہم اس طریقے سے اس کی دانائی وتوانائی جیسی صفات سے آشنا ہو جائیں۔

یا یہ کہ ہدف ومقصد کوئی تیسرا مطلب ہے اور وہ یہ ہے کہ دانا وتوانا اور مدبر ومدیر خالق وآفریدگار کی آشنائی کے بعد ہم زبوں حال موجودات اور ناتواں وعاجز مخلوقات کی پرستش کریں اور اس کی پرستش سے روگردانی کریں ایک بے معنی سی بات ہے اور حقیقت میں یہ دعوت دراصل عبادت وپرستش کی طرف دعوت ہے۔ یہ تینوں احتمال نہ صرف اسی آیت میں درپیش ہیں بلکہ ان تمام آیات میں جو طبیعت کے بارے میں نظام آفرینش اور خدائے عظیم کی قدرت کو بیان کرتی ہیں، حکم فرماہے:

۲۔ وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ۭ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ③

''وہی ہے کہ جس نے زمین کو کشش اور وسعت بخشی اور ان میں پہاڑ اور نہریں قرار دیں اور تمام پھلوں کے جوڑے جوڑے پیدا کئے رات اور دن ایک دوسرے کو ڈھانپ لیتے ہیں

اور امور میں غور وفکر کرنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں۔'' (رعد۔۳)

یہ آیت ہمیں چند امور میں غور وفکر کی دعوت دیتی ہے اور اس غور وفکر کے کئی مختلف نتیجے نکلتے ہیں وہ امور یہ ہیں۔

۱۔ زمین کیسے پھیلی اور وسیع ہوئی ہے؟

۲۔ پہاڑ زمین کی وسعت میں کیوں پیدا ہوئے؟

۳۔ پھل جوڑے جوڑے کس طرح پیدا ہوئے؟

۴۔ رات اور دن ایک دوسرے کے بعد کس طرح آتے ہیں؟

ان امور کی تدبیر جہان صانع کے وجود پر گواہ ہے وہاں مدبر عالم کے علم ودانش اور قدرت وتوانائی بلکہ اس کی وحدانیت ویگانگت پر بھی گواہ ہے کیونکہ نظام کی وحدت اور اس کے اجزاء کی ایک دوسرے سے وابستگی اس بات کی ترجمانی کرتی ہے کہ جہاں آفرینش پر ایک ہی ارادہ حکمرانی کررہا ہے۔اور اگر نظامِ آفرینش کی تدبیر میں متعدد خداؤں کا دخل ہوتا تو نظامِ خلقت ہرج ومرج اور فساد وخرابی سے دوچار ہوجاتا ہے جیسا کہ مرکز قدرت میں منبع تدبیر سے آگاہی ہمارے وجدان کو بیدار کرتی ہے کہ ہم عالم کے خالق اور اس کے مدبر اصلی کو پہچانیں اور اس کی پرستش کریں نہ کہ اس کے غیر کی۔

۳۔ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

''اور زمین میں پاس پاس قطعات ہیں جن میں انگور، زراعت اور کھجوریں ایک ہی جڑ سے کئی کئی اور علیحدہ علیحدہ اُگے ہوئے ہیں اور سب کے سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں اور ہم نے بعض کے پھلوں کو دوسرے بعض پر برتری دی ہے بے شک اس میں عقل مند لوگوں کیلئے نشانیاں موجود ہیں۔'' (رعد۔۴)

یہ آیت ہمیں ان امور میں غور وفکر کی دعوت دیتی ہے جواب بیان ہورہے ہیں۔

۱۔ زمین اگرچہ ایک پیوستہ پھیلی ہوئی چیز ہے لیکن اس کا ایک حصہ زراعت اور کھیتی باڑی کے قابل ہے اور دوسرا حصہ اس قسم کی لیاقت نہیں رکھتا انتہائی پیوستگی کے باوجود یہ دوگانگی کس چیز کی معلول ہے؟

۲۔ بہت سے باغات میں رنگارنگ کے پھول موجود ہیں، انگور اور کھجور اور دوسرے پھلوں کی شاخیں، شاخساروں سے لگی ہوئی ہیں باوجود اس کے کہ سب کی مٹی ایک ہے اور سب کے سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں اور سورج کی شعاعیں بھی سب پر یکساں طور پر پڑتی ہیں

پھر بھی ایک ہی جگہ سے جن کے حالات وشرائط بھی مساوی ہیں مختلف قسم کے پھل حاصل ہوتے ہیں۔

۳۔ اکثر ایک ہی باغ کے پھل، مرغوبیت کے لحاظ سے مختلف اور گونا گوں ہوتے ہیں ان مناظر میں غور وفکر کرنے سے تین قسم کے مختلف نتائج نکلتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

ا۔ باغات کے خوبصورت مناظر جو ایک سو فیصد طبیعی نگارستان ہے ایک ایسے صانع اور آفریدگار کے وجود کی حکایت کرتے ہیں جس نے اپنے غیر مرئی قلم سے صفحہ باغ پر یہ خوبصورت نقوش بنائے ہیں۔

۲۔ یہ نگارستان جو ایک مرئی نقاش آفرینش کی حکایت کرتے ہیں اس کے علم ودانش اور قدرت وہنرمندی کی حکایت بھی کرتے ہیں۔

۳۔ اگر واقعتاً ان مناظر کا حقیقی نقاش خدا ہے اور وہی ہے جو ان مناظر کو وجود میں لایا ہے تو پھر ہم اس کی عبادت کیوں نہ کریں اور دوسرے موجودات کی جو ہرگز اس جہان کے مدبر ومدیر نہیں ہیں عبادت کیوں کریں؟

اس آیت کا مضمون، سورۂ فاطر کی آیہ ۲۷۔ ۲۸ میں حسبِ ذیل طریقہ سے وارد ہوا ہے جہاں فرماتا ہے:

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهَا ؕ وَمِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيۡضٌ وَّحُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهَا وَغَرَابِيۡبُ سُوۡدٌ ۝۲۷ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالۡاَنۡعَامِ مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ غَفُوۡرٌ ۝۲۸

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے بارش برسائی اور اس کے ذریعہ گونا گوں انواع واقسام کے پھل نکالے، اور زمین میں پہاڑوں سے سفید سرخ اور سیاہ رنگ کے خطوط پیدا کیئے انسانوں رینگنے والے جانوروں اور حیوانات سے بھی رنگ برنگ کے پیدا کیے خدا سے صرف اس کے عالم بندے ہی ڈرتے ہیں بے شک خدا صاحب قدرت اور بخشنے والا ہے۔

ان دونوں مذکورہ آیات میں پھلوں کے رنگوں کے اختلاف اور زمین کے چہرے کو گونا گونی ،خصوصاً پہاڑوں کے ان حصوں میں جو سفید، سرخ اور سیاہ صورتوں میں (جلے ہوئے پتھروں کی طرح) دکھائی دیتے ہیں اور انسانوں رینگنے والے جانوروں اور حیوانات کے رنگوں کے اختلاف پر تکیہ ہوا ہے جب کہ یہ سب کے سب ایک ہی پانی سے پرورش پاتے ہیں۔

اب آیت کے ذیل میں یاد دلاتا ہے کہ صرف خدا کے عالم بندے ہیں اس سے ڈرتے ہیں کیونکہ عالم بندے ہی ان تمام اشیاء کی ترکیب کی حقیقت، اور اس اختلاف کی اصل بنیاد سے پورے طور پر آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ آیات جو خلقت کے انوکھے نظام آفرینش کے تبدیل نہ ہونے والے قوانین اور جہان آفرینش میں خدا کی سنتوں کو بیان کرتی ہیں اس قدر زیادہ ہیں جنہیں ان صفات میں بیان نہیں کیا جاسکتا لیکن اس

بناء پر کہ قارئین کرام ان آیات کے ایک حصہ سے آگاہ ہو جائیں وہ مہربانی کر کے ''المعجم الفہرس'' میں ''آیت'' کے مادہ کی طرف رجوع کریں ان کے کچھ نمونے یہ ہیں:

قرآن سورہ روم میں خدا کے وجود کی آیات اور نشانیوں کو چھ آیات ۲۰ تا ۲۵ میں بیان کرتا ہے اور ان سب کا ''ومن اٰیاتہ'' کے جملہ سے آغاز کرتا ہے، آیات کا متن انکے ترجمہ کے ساتھ یہ ہے:

۱۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ۝۲۰

''اور اس (خدا) کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے اور اب ایسے انسان ہو جو زمین میں پھیلے ہوئے ہو۔''

۲۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۝۲۱

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہیں میں سے تمہاری ازواج کو پیدا کیا تا کہ تم ان کے ذریعے آرام و سکون حاصل کر سکو، اور تمہارے درمیان اُلفت اور شفقت پیدا کی، بے شک اس کام میں، غور و فکر کرنے والوں کیلئے کئی ایک نشانیاں ہیں۔''

۳۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ۝۲۲

''اور اس کی آیات اور نشانیوں میں سے ایک آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ہے بے شک اس میں سارے جہان والوں کیلئے نشانیاں ہیں۔''

۴۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاۗؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ۝۲۳

''اور اس کی آیات میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور اس کے فضل و کرم سے تمہاری فعالیت اور روزی کا طلب کرنا ہے بیشک اس کام میں سننے والے لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں۔''

۵۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَيُحْيٖ بِهٖ

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴿۲۴﴾

''اوراس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں ڈرانے اورامید دلانے کیلئے بجلی دکھاتا ہے اورآسمان سے پانی برساتا ہے اورزمین کومردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے بیشک اس کام میں عقلمندلوگوں کیلئے نشانیاں ہے۔''

۶۔ وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ الْاَرْضِ ۖۗ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ﴿۲۵﴾

''اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ آسمان وزمین اس کے حکم سے قائم ہے پھر جب وہ تمہیں زمین سے پکارے گا توتم فوراً قبروں سے نکل کھڑے ہوگے۔''

اس میں شک نہیں کہ یہ آیات زیادہ تر انسان کے وجدان کو بیدار کرنے والی اوراسے خدا کی صفات کی طرف توجہ دلانے والی ہیں اور یہ کہ خداوندِعالم واحد و یکتاویگانہ داناوتوانا، مدبرومدبراوررحیم ومہربان ہے۔اور چندآیات کے ذیل میں ان نتائج کی طرف توجہ اوراشارہ ہواہے۔

کبھی خلقت کے انوکھے نظام کی یادآوری، معاد اورنئی زندگی کی راہ ہموارکرنے کیلئے ہوتی ہے تاکہ انسان خدا کی قدرت سے آشناہونے کے بعدمعادکاانکارنہ کرے۔[۱]

اس بناءپران آیات سے وجودخداپراستدلال ضمنی طورپرہوناچاہیے نہ کہ اصلی ہدف کی صورت میں کیونکہ جب عالم کے چھوٹے بڑے سب اجزاءاس کی صفات اورقدرت وعلم سے آگاہ کررہے ہیں اورہمیں اس کے صفات جمال وجلال سے آشنا کررہے ہیں تو یقیناًوہ ہمیں اس کے وجود سے بھی آشنا کریں گے خداشناسی کے لئے واضح راستہ جوتمام طبقات کی سوچ اورفکر کے ساتھ سازگارہے وہی خلقت کے انوکھے اوردقیق نظاموں کے بارے میں بحث وگفتگوہے جوزبان حال سے کہتے ہیں:

ایں ہم نقش عجیب بردرودیواروجود
ہرکہ فکرت نہ کندنقش بودبردیوار

''وجود کےدرودیوارپریہ سارےعجیب وغریب نقش ونگار(تیری ضاع کے گواہ ہیں) جو تیرے بارے میں غوروفکرنہ کرے وہ نقش بردیوار ہے۔''

---

[۱] ۔ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ الْاَرْضِ ۖۗ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ (روم۔۲۵)

وجود ہستی کی شناخت کے طریقہ سے خدا کی مکمل پہچان یا برہانِ صدیقین

فلاسفہ اسلامی آیات کے ایک سلسلہ کو ایک خاص برہان کی طرف ناظر سمجھتے ہیں جو ان کی اصطلاح میں صدیقین کی برہان کے نام سے مشہور ہے اور اس برہان کو عقلی علوم و دانش کی تحقیق کرنے والے دو افراد نے دو طرح سے بیان کیا ہے وہ دو افراد یہ ہیں:

۱۔شیخ الرئیس بوعلی سینا، جنہوں نے کتاب ''اشارات'' میں اس برہان کے مقدمات (دور و تسلسل کے بطلان) اور خود اس برہان کی چند فصلوں کے ضمن میں تشریح کی ہے۔[۱]

خواجہ نصیر الدین طوسی نے اپنی علم کلام کی کتاب میں جو تجرید الاعتقاد کے نام سے مشہور ہے اس برہان کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے اور متن کے شارح علامہ حلی نے اس کی کسی حد تک تفصیل و تشریح بیان کی ہے[۲]

۲۔صدر المتالہین (الاسفار الاربعہ) کے مولف نے اس برہان کو ایک اور طرح سے بیان کیا ہے جو اصلاً دور و تسلسل جیسے مقدمات کے بطلان کا محتاج نہیں ہے اور اسے مبداء شناسی کیلئے بہترین برہان قرار دیا ہے، انہوں نے اس طریقہ سے خدا شناسی کے مسئلہ میں ایک نقطہ عطفی پیدا کیا ہے۔[۳]

جیسا کہ ہم گذشتہ ایک حاشیہ میں بیان کر چکے ہیں کہ ہم اس برہان کی وضاحت کیلئے ابن سینا کے طریقہ پر اکتفا کریں گے اور صدر المتالہین کے طریقہ پر اس کی تشریح کسی اور وقت کیلئے اٹھا رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ آیات قرآن کے ایک سلسلہ کو اس برہان کی طرف ناظر سمجھتے ہیں ان کی مورد نظر آیات یہ ہیں:

۱۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِىْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّىٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِىْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ

---

[۱] ۔اشارات ج:۳ ص:۱۸۔۲۸۔چاپ جدید

[۲] ۔تجرید الاعتقاد ص ۱۸۲۔ط۔صیدا

[۳] ۔اسفار ج:۶ ص ۶۱

لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳۵﴾

''خدا آسمانوں اور زمین کا نور اور روشنی ہے اس کی روشنی اس چراغدان کی طرح ہے جس میں چراغ ہے، چراغ شیشہ کے اندر ہے، شیشہ گویا درخشاں ستارہ ہے، جو پر برکت زیتونی درخت سے روشن ہے جو نہ مشرق سے ہے اور نہ مغرب سے قریب ہے کہ اس کا تیل خود بخود روشن ہوجائے گو آگ اس کو نہ چھوئے وہ نور بالائے نور ہے جسے وہ چاہے اسے نور کی طرف ہدایت کردیتا ہے اور خدا لوگوں کیلئے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور خدا ہر چیز کا عالم ہے۔''

۲...اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ

''کیا یہ چیز کافی نہیں ہے کہ خدا ہر چیز پر دلیل وگواہ ہے یا ہر چیز کیلئے مشہور ونمایاں ہے۔''

۳۔شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

''خدا ملائکہ اور صاحبانِ علم گواہی دیتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے وہ عادل اور انصاف کرنے والا ہے اس کے علاوہ اور کوئی خدا نہیں ہے وہی صاحبِ اقتدار اور حکیم ودانا ہے۔''

اس کے علاوہ بھی ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں دوسری آیات بھی ہوں اب ہم اس برہان کیلئے ابن سینا کے بیان کو پیش کرتے ہیں۔

ا۔سوفسطائیوں کے گمان کے خلاف، اجمالی طور پر اصلی ہستی و وجود قابل انکار نہیں ہے اور ذہن وفکر سے خارج کے عالم میں وجود وہستی واقعیت کی صورت میں نا قابل انکار وجود رکھتے ہیں۔

۲۔ہر قسم کا وجود وہستی، دو اقسام سے خالی نہیں ہے یا وہ واجب ہے، یا ممکن، دوسرے الفاظ میں یا تو وہ ہستی و وجود خود سے رکھتا ہے اور اس کا وجود خود اسی سے ہے یا اس نے ہستی و وجود کسی دوسرے سے حاصل کیا ہے اور وہ دو اقسام سے خالی نہیں ہے اور تیسری شق نہیں رکھتی۔

۳۔ ہر وہ چیز جو وجود نہیں رکھتی یقینی طور پر وہ اپنے وجود کیلئے کسی علت کی محتاج ہے جو اسے وجود بخشے اور یہ مطلب (واجب کا محتاج ہونا) اس قدر واضح ہے کہ بدیہی اور ضروری امور کا جز شمار ہوتا ہے۔

۴۔ممکنات کا سلسلہ غیر متناہی علل ومعلولات کے ایک سلسلہ پر قائم نہیں ہے کیونکہ اس کا لازمہ تسلسل ہے اور تسلسل باطل ہے اور اسی طرح سے دو ممکن بغیر کسی واسطہ کے یا واسطہ کے ساتھ ایک دوسرے میں موثر نہیں ہوسکتے اور ایک دوسرے کو وجود نہیں بخش سکتے کیونکہ اس کا نتیجہ دور ہے

۔ جوعقلاً محال ہے ابن سینا کی برہان ان ہی چار بنیادوں پر ہے۔

اس کے استدلال کی وضاحت یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص چاہے جس چیز میں شک کرے لیکن اسے اس چیز میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارے ذہن سے خارج میں ایک واقعیت ایک حقیقت اور ایک جہان موجود ہے یہ موجودات یا ہر موجود مثلاً انسان یا آسمان وزمین کا وجود تو خود بخود ہستی و وجود رکھتا ہے اور اپنے وجود میں کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہے اور اصطلاح کے مطابق کسی دوسرے کا معلول نہیں ہے بلکہ وہ خود دوسرے موجودات کو موجود میں لانے والا ہے اور ان کی علت ہے یا اس مفروضہ کے برخلاف ہے۔

پہلی صورت میں ہم نے غیر شعوی طور پر ایک ایسے موجود کے وجود کا اعتراف کرلیا ہے جو علت تو ہے لیکن معلول نہیں ہے، غنی ہے فقیر نہیں اس کا وجود خود بخود ہے اور اس نے کسی دوسرے سے اپنا وجود حاصل نہیں کیا ہے اس قسم کا موجود وہی خدا ہے جو خدا شناسوں کا مطلوب ہے اور اصطلاح میں اُسے واجب الوجود کہتے ہیں۔

دوسری صورت میں جس میں اس کا وجود خود اسی سے نہیں ہے، گزشتہ مقدمات کے حکم کے مطابق ہر موجود ممکن اپنے وجود میں ایک علت کا محتاج ہے اس کیلئے کسی علت کا ہونا ضروری ہے جو اس کو وجود میں لانے والی شمار ہو، اب ہم اس دوسرے موجود (علت) کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ کیا اس کا وجود خود اسی سے ہے اور اصطلاح کے مطابق وہ واجب الوجود ہے تو اس صورت میں ہم نے ایک ایسے وجود کا اعتراف کرلیا ہے جسے مکتبِ الٰہی میں خدا کہتے ہیں اور اگر دوسرا موجود بھی پہلے ہی موجود کی طرح ہے یعنی وہ خود سے وجود نہیں رکھتا اور اس نے اپنا وجود کسی دوسرے سے حاصل کیا ہے تو اس صورت میں ہم سوال کو اس دوسرے (سوم) کی طرف منتقل کرتے ہوئے موجود دوم کی طرح اس کے بارے میں سوال کرینگے، و............تو اس صورت میں دو راستوں میں سے ایک اختیار کرنا پڑے گا۔

۱۔ یا تو یہ سلسلہ کسی نقطہ پر جاکر رک جائے گا اور کسی ایسے موجود تک پہنچ جائے گا، جو صرف علت ہے معلول نہیں ہے اور اس کی ہستی خود بخود اسی سے ہے کسی دوسرے سے نہیں ہے تو اس صورت میں خدا شناسوں کا مطلوب حاصل ہوجائے گا۔

۲۔ یا یہ علل ومعمولات کا سلسلہ کسی بھی نقطہ پر جاکر نہیں رُکے گا اور اسی ترتیب سے آگے بڑھتا چلا جائے گا اور عالم کو علل ومعلولات کا ایک غیر متناہی سلسلہ جن میں ہر ایک نے کسی دوسرے وجود کو حاصل کیا ہے بنائے گا اور کسی ایسے موجود تک جو واجب الوجود ہو ہرگز نہیں پہنچے گا، اس صورت میں تسلسل لازم لائے گا جس کا بے بنیاد ہونا محکم واستوار براہین سے ثابت ہو چکا ہے اور اگر یہ سلسلہ چلتے چلتے مثلاً دس تک چلا جائے تو پھر دسویں وجود نے اپنے وجود پہلے سے حاصل کیا ہو تو یہ وہی دور ہے جس کا بطلان بھی بیان کا محتاج نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان صورتوں کو چھوڑ کر جن سے دور وتسلسل لازم آتا ہے ہر وہ موجود جس کے وجود کا ہم اعتراف کرتے ہیں یا تو وہ خود واجب الوجود ہے (اس صورت میں جب کہ اس کا وجود خود اسی سے ہو) اس قسم کے وجود کو مستلزم ہے (جب کہ اس نے کسی دوسرے سے وجود حاصل کیا ہو)

ابن سینا اس برہان کے وجود پر فخر کرتا ہے اور اس کو سب سے اعلیٰ اور زیادہ استوار بتلاتے ہوئے کہتا ہے اس برہان میں وجود کے بارے میں تحقیق کے سوا ہم کسی دوسرے چیز کے محتاج نہیں ہیں۔ اور وجود کا مطالعہ ہمیں ایک واجب وجود کی رہبری کرتا ہے پھر اسے صدیقین

کے برہان کا نام دیتا ہے جس میں خدا کے ذریعہ استدلال ہوتا ہے نہ کہ خدا پر استدلال۔ اس بحث کی تکمیل کیلئے ہم دو مطلب بیان کرتے ہیں۔

ا۔ اس برہان میں دور و تسلسل کا...... باطل ہونا بتلایا گیا ہے، جو اشخاص ان اصطلاحات سے آشنا نہیں ہیں ہم ان کے لئے ان کی وضاحت کرتے ہیں۔

دور یہ ہے کہ ہم دو موجود الف و ب کے نام سے فرض کر لیں، اور ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کی علت سمجھیں جب ہم ''الف'' نامی موجود کے وجود پر غور کریں گے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وجود اس بات کا مرہون منت ہے کہ ''ب'' نامی ایک دوسرا موجود پہلے سے وجود رکھتا ہو، اور ''الف'' کے وجود کو وجود میں لائے اور اسی طرح اسکے برعکس ہے یعنی جب ہم ''ب'' نامی وجود کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وجود اس بات کا رہین منت ہے کہ ''الف'' اس سے پہلے موجود ہوتا کہ وہ اسے وجود میں آنے کے قابل بنائے اس قسم کا مفروضہ واضح طور پر باطل ہے کیونکہ ہر ایک کا وجود میں آنا دوسرے کے ساتھ مشروط ہے چونکہ ان میں سے کسی کا بھی پہلے سے وجود ثابت نہیں ہے تو اس قسم کے اشتراط کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان میں سے کوئی بھی وجود میں نہ آئے۔

فرض کریں دو شخص یہ چاہتے ہیں کہ وہ کسی بوجھ کو اٹھائیں اور ان میں سے ہر ایک اس بوجھ کے کونے کو پکڑ کر اٹھانا اس بات کے ساتھ مشروط کرتا ہے کہ وہ دوسرے اس سے پہلے اس کے کونے کو اٹھائے، تو اس صورت میں یہ بوجھ کبھی بھی نہ اٹھایا جائے گا کیونکہ وہ شرط جو ان میں سے ہر ایک بوجھ کے اٹھانے کیلئے کرتا ہے وہ موجود نہیں ہے۔

دور کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ان دونوں حادثوں میں سے ہر ایک کا جوود پہلے سے موجود کسی دوسرے وجود کے ساتھ مشروط ہو اور چونکہ ان میں سے کوئی بھی وجود قبلی نہیں رکھتا لہٰذا قہراً اس قسم کا مفروضہ معرض وجود میں ہی نہیں آئے گا۔

تسلسل کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ علت و معلول کا سلسلہ غیر متناہی حد تک چلا جائے اور حوادث کا سلسلہ کی ایسے نقطہ تک جو علت تو ہو معلول نہ ہو غنی تو ہو فقیر نہ ہو منتہی نہ ہو، اور اس قوم کا مفروضہ بھی اس بیان کے ساتھ جو ہم نے دور کے بارے میں پیش کیا ہے ممتنع ہے کیونکہ تسلسل کے مفروضہ میں آخری حادثہ اس سے پہلے کے حادثہ کا معلول ہے اور وہ اس سے قبل کے حادثہ کا معلول ہے اور اسی طرح...... یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور حقیقت میں وہ سب سے پہلے حادثہ جس سے ہم روبرو ہوتے ہیں اس بات کیساتھ مشروط ہے کہ (اس سے پیچھے کا) دوسرا حادثہ اس سے پہلے موجود اور............ (اس سے پیچھے کا) دوسرا حادثہ بھی اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ (اس سے پیچھے کا) تیسرا حادثہ اس سے پہلے موجود ہو اور ہم جتنا آگے بڑھتے جائیں گے ہرگز کسی ایسے موجود تک نہیں پہنچ پائیں گے جس کا وجود اور موجودگی کسی شرط کے ساتھ مشروط نہ ہو، بلکہ یہ کیفیت نا متناہی حد تک آگے بڑھتی رہے گی اس صورت میں نہ صرف وہ حادثہ جس سے ہم روبرو ہیں ثابت نہیں ہوگا بلکہ حوادث کے اس سلسلہ کا کوئی فرد بھی وجود میں نہیں آئے گا کیونکہ جس کسی کے بارے میں ہم تحقیق کریں گے وہ اپنی زبانِ حال سے یہی کہے گا کہ میں اسی صورت میں وجود میں آؤں گا جب کہ مجھ سے پہلے والا وجود موجود ہو ہم اس سے پہلے موجود سے سوال کرینگے تو وہ بھی یہی کہے گا کہ میں اسی صورت میں وجود میں کو قبول کرونگا جبکہ مجھ سے پہلے والا موجود وجود رکھتا ہو۔ اور چونکہ کوئی حادثہ اس شرط سے خالی نہیں ہے اور اس سلسلہ میں ہم کسی ایسے موجود تک نہیں پہنچتے جس کا وجود کسی شرط کے ساتھ مشروط نہ ہو تو قہراً یہ سلسلہ کبھی بھی عالم وجود میں نہیں آئے

گا۔اور اگر ان کے درمیان کوئی ایسا موجود پیدا ہو جائے اور یہ کہے کہ میرا وجود کسی شرط کے ساتھ مشروط اور اپنے سے پہلے کسی وجود کے ہونے کا محتاج نہیں ہے تو اس صورت میں وہ موجود، وجود مطلق اور علت سے بے نیاز اور اصطلاح کے مطابق واجب الوجود ہوگا اور اس کے نتیجہ میں یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اور تسلسل باقی نہ رہے گا۔

(بوجھ اٹھانے کے)اسی مسئلہ میں اگر کوئی شخص اپنی ہمکاری کو دوسرے فرد کی ہمکاری کے ساتھ مشروط کرے اور یہ مشروط ہمکاری غیر متناہی حد تک بڑھتی چلی جائے اور ان کے درمیان کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہو جو اپنی ہمکاری کو کسی شرط سے مشروط نہ کرے تو یقیناً ہم اس سے یہ کشف کریں گے کہ اس حلقہ میں کوئی ایسا جوانمرد پیدا ہو گیا ہے جس نے اپنی مساعدت اور مدد کو کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں کیا اور وہ اپنا ہاتھ بوجھ کے نیچے لے گیا اور دوسرے نے شرط کے پورا ہونے کو دیکھ کر اپنی ہمکاری کا آغاز کر دیا اور بوجھ کو اُٹھالیا ہے اور زیادہ مختصر الفاظ میں: چونکہ سلسلہ ہستی وجود میں آ گیا ہے اور آخری حادثہ بھی رونما ہو چکا ہے تو اس سے ہم کشف کریں گے یہ سلسلہ ایک ایسے نقطہ تک پہنچ گیا ہے جس کا وجود وہستی کسی شرط اور کسی ''اگر'' سے مشروط نہیں ہے اور وہ وہی واجب الوجود اور ہستی مطلق ہے۔

۲۔وہ آیات جنہیں ہم نے آغاز بحث میں بیان کیا ہے ایک طرح سے اس برہان پر قابل انطباق ہیں کیونکہ ہم جب وجود کی بہتر شناخت اور مطالعہ سے خدا تک پہنچ جائیں تو پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ (ان اللہ علیٰ کل شیء شھید) وہ سب پر دلیل و گواہ یا سب کیلئے مشہور و معلوم ہے اور اگر ہم مشہد کو شہود کے معنی میں لیں تو پھر اس برہان کے ساتھ زیادہ سازگار ہے جیسا کہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی اپنی یگانگی اور وحدانیت پر شہادت [1] اسی طرح ہے جس طرح کہ اپنے وجود پر شہادت ہے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم مسئلہ وجود کا مطالعہ کریں تا کہ اس حقیقت تک پہنچ جائیں کہ خود وجود کا مطالعہ اگر خدا کے وجود پر گواہی دیتا ہے تو اس کی وحدانیت پر بھی گواہ ہے لیکن یہ گواہی کس طرح سے ہے تو اس کا بیان ہم ''یکتائی ذات [2] '' کے حصہ میں بیان کرینگے۔

جیسا کہ سورہ نور والی آیت بھی اس برہان سے مطابقت رکھتی ہے اس سے مقصود کہ خدا آسمانوں اور زمین کا نور اور روشنی ہے اس کے سوا کچھ نہیں کہ وجود خدا اس جہان کی واقعیت و حقیقت ہے یا نظام امکانی کو واقعیت عطا کرنیوالا ہے اور اس کا مطالعہ ہمیں اس قوم کی واقعیت تک پہنچا دیتا ہے۔لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اس قسم کا معنی زیادہ تر تاویل، یا ابعادِ قرآن میں سے ایک بعد کے کشف کی حیثیت رکھتا ہے نہ کہ ظاہر آیات کی تفسیر، بہر حال اس برہان پر مفاد آیات کی تطبیق صحیح اور درست ہو یا تاویل کی صورت میں ہو اور معانی قرآن کے ابعاد میں سے ایک بعد کا کشف ہو برہان صدیقین برہان سینائی کی صورت میں ایک واضح اور قابل اعتماد برہان ہے۔

---

[1]۔شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ......... (آل عمران۔۱۸)

[2]۔پانچواں حصہ (آئندہ حصہ)

اس حصہ میں

١۔ہم اقسام توحید اور انواع وحدت سے آشنا ہوں،
٢۔خدا کی وحدت عددی نہیں ہے بلکہ مثل ونظیر کی نفی کے معنی میں ہے۔
٣۔الٰہ خدا کے معنی میں ہے معبود کے معنی میں نہیں ہے۔
٤۔وہ آیات جو خدا کی یگانگی پر دلالت کرتی ہیں۔
٥۔خدا، فرشتے اور علماء خدا کی یکتائی کی گواہی دیتے ہیں اور کچھ دوسری آیات
٦۔ذاتِ خدا کی یکتائی پر عقلی دلائل
٧۔خدا غیر متناہی وجود ہے اور اس قسم کا وجود متعدد نہیں ہوتا۔
٨۔قرآن میں لفظ ''واحد'' کے بعد لفظ ''القہار'' کیوں آیا ہے؟
٩۔خدا کی یگانگی کے بارے میں شیعوں کے آئمہ کی احادیث
١٠۔عیسائیوں نے تثلیث ہندو مذہب سے اخذ کی ہے۔
١١۔تثلیث کے بطلان پر قرآن دلائل
١٢۔مطلق طور پر ''اولاد قرار دینے'' کی سوچ اور فکر اور اس کے بے بنیاد ہونے پر قرآن کے چھ دلائل
١٣۔خاص طور پر حضرت عیسیٰؑ مسیح کے بیٹا ہونے کے بطلان پر قرآنی دلائل
١٤۔تثلیث موہومات کے چنگل میں اور اس کے بارے میں عقل کا فیصلہ

توحیدِ ذاتی یا خدا کی یگانگی

اس سے پہلے کہ ہم ذاتِ خدا کی یگانگت اور اس کی وحدانیت کے بارے میں آیات اور عقلی دلائل پیش کریں چند نکات کا بیان کرنا ضروری ہے۔

۱۔ہم بیان کر چکے ہیں کہ محققین اسلام نے توحید کے درجات کو چار مراتب میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔توحید ذاتی ۲۔توحید صفاتی ۳۔توحید افعالی ۴۔توحید عبادی[1]

توحید ذاتی: سے مراد یہ ہے کہ وہ یگانہ، لاشریک اور بے مثل ہے اور زیادہ واضح الفاظ میں اس کی ذات اس طرح ہے کہ اس میں تعدد اور "کتنے" نہیں کہے جاسکتے اور نہ تو عالم خارج میں اور نہ ہی ذہن میں اس کیلئے کسی دوسرے فرد کا تصور نہیں ہوسکتا اور اس کی ذات ایسی ہے کہ اس میں تعدد و کثرت نہیں ہے اور وہ کسی دوسرے فرد کو قبول نہیں کرتی۔

اس حصہ میں صرف آیات اور عقلی دلائل کے اس حصہ کو بیان کیا جائے گا، جو خدا کی یگانگی، اس کے لاشریک ہونے اور یہ کہ اس کی ذات متعدد نہیں ہے کو بیان کرتی ہیں لیکن دلائل و آیات کا وہ سلسلہ جو یہ بیان کرتی ہیں کہ وہ ایک بسیط ذات ہے وہ مرکب نہیں ہے یا یہ کہ وہ زمین وآسمان کو پیدا کرنے والا ہے نہ کوئی دوسرا، یا یہ کہ وہی عالم آفرینش کا مدبر و مدیر ہے نہ کہ اس کا غیر، تو یہ امور ہماری اس بحث کے موضوع سے خارج ہیں اور مطالب کے اس سلسلہ کو آئندہ کی فصلوں میں بیان کیا جائے گا۔

۲۔قرآنِ مجید توحیدی مباحث میں زیادہ تر توحید عبادت پر تکیہ کرتا ہے اور یگانگی ذات اور توحیدی صفات پر کم بحث کرتا ہے لیکن اس کے باوجود جب کوئی شخص واضح ذہن اور زیادہ سے زیادہ جستجو کے ساتھ قرآن کے اعلیٰ مفاہیم میں غور و غوض کرے تو اسے معلوم ہوجائے گا کہ مسائل کا یہ سلسلہ بھی قرآن کے مباحث میں موجود ہے اور کتاب الٰہی نے ان امور کی طرف بالاتر اور برتر سطح اشارہ کیا ہے۔

۳۔فلاسفہ اسلام نے وحدت کو چار اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔وحدتِ عددی ۲۔وحدتِ صنفی ۳۔وحدتِ نوعی ۴۔وحدتِ جنس، اور اس غرض سے کہ یہ بات واضح ہوجائے کہ خدا کی توحید اور اس کی ذات کی یکتائی ان وحدتوں میں سے کسی کی جنسی سے نہیں ہے، ہم مجبور ہیں کہ ان چاروں قسم کی وحدتوں کے بارے میں وضاحت کریں۔

---

[1] ۔جیسا کہ ہم پیش لفظ میں بیان کر چکے ہیں کہ مراتب توحید انہیں چار حصوں میں منحصر نہیں ہیں بلکہ اس کے اور مراتب بھی ہیں جو ان صفحات میں بیان ہوں گے اگر چہ باقی سب مراتب کو کسی نہ کسی طریقہ سے ان چار درجوں میں داخل کیا جاسکتا ہے، مثلاً توحید در خالقیت، توحید در ربوبیت، اور توحید در تقنین کو توحید افعالی میں اور توحید در عبادت کو ایک طرح سے توحید در اطاعت میں داخل کر سکتے ہیں۔

۱۔ واحد عددی یا شخصی

مفہوم کلی کے اس ایک فرد کو کہتے ہیں کہ اس کلی کیلئے دوسرے فرد کا امکان بھی ہو، مثلاً زید انسان کی نسبت سے، اور آفتاب عالم تاب ''خورشید'' کے مفہوم کی نسبت سے، خلاصہ یہ کہ واحد شخصی: ایک مفہوم کلی کا فرد اور مصداق ہے جس کے اور متعدد مصداق بھی ہو سکتے ہیں۔

۲۔ واحد صنفی

ایک ہی مفہوم کے دو افراد کو کہتے ہیں جو ایک ہی عنوان کے ماتحت ہوں اور وہ عنوان ان کی ذات اور حقیقت سے مربوط نہ ہو، مثلاً دو ایرانی افراد، دو طالبعلم اور تاجر کے عنوان کے ماتحت ہیں اور عنوانات ان کی ذات کا جز نہیں ہیں۔

۳۔ واحد نوعی

ایک نوع کے دو افراد یا دو صنفوں کو واحد نوعی کہتے ہیں کیونکہ وہ دونوں انسان کے عنوان کے تحت　جو ان کی ذات کو بناتا ہے ،قرار پاتے ہیں۔

۴۔ واحد جنسی

دو مفہومی ہے جیسے انسان اور گھوڑا جو حیوان کے مفہوم کے ماتحت جو ان دونوں انواع کی جنس ہے ،قرار پاتے ہیں اور نوع و جنس کا فرق ان لوگوں کیلئے جو علم منطق کے مسائل سے آگاہی رکھتے ہیں واضح ہے۔

۴۔ اس بیان کی رو سے خدا کی توحید عددی کے ساتھ ہرگز توصیف نہیں کی جا سکتی، اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کلی خدا کے مفہوم کا ایک فرد ہے کیونکہ یہ تعبیر وہاں استعمال ہوتی ہے، خارج یا ذہن میں دوسرے فرد فرض کر سکے اگر چہ اس کا ایک فرد سے زیادہ اور کوئی مصداق نہ ہو۔

لیکن اگر کسی ایک شے کا وجود اس طرح کا ہو کہ جس کیلئے دوسرے فرد کا تصور ممکن ہی نہ ہو: جیسا کہ خدا کے بارے میں معاملہ اسی قسم کا ہے تو اس صورت میں توحید عددی نہیں بنے گی، بلکہ اس قسم کی وحدت کو ''وحدتِ حقہ'' کہتے ہیں۔

عقلی دلائل جن میں سے بعض کو ہم بیان کریں گے ہمیں اس بات کی ہدایت کرتی ہیں کہ خدا کی ذات عینیت خارجی ہے جس میں کسی طرح سے بھی تعدد و کثرت نہیں ہے اور اگر اس کیلئے کسی دوسرے کو فرض بھی کر لیں تو ان میں سے پہلے عین ہوگا نہ کہ دوسرا۔[1]

اس سے قطع نظر ''وحدت عددی'' وہاں پر صحیح ہے جہاں کوئی فرد کسی کلی عنوان اور ماہیت کے ماتحت قرار پائے مثل انسان کے کسی فرد کے جو انسان کے عنوان کے ماتحت قرار پاتا ہے اور یہ تعبیر خدا کے بارے میں صحیح نہیں ہے کیونکہ خدا کسی طرح ایسے عنوان کے ماتحت قرار نہیں

---

[1] ۔ ہم آگے چل کر اس برہان کی وضاحت کریں گے۔

پا تا جو اس کی حقیقت و واقعیت کا مبین ہو اور اصطلاح کے مطابق اس کی ذات ماہیت سے پاک اور منزہ ہے۔

۵۔ ہم اس کتاب کے بارہویں حصہ میں ''الٰه'' اور ''الله'' کے لفظ کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے اور ہم یہ بتلائیں گے کہ لفظ ''الٰہ'' اسم عام اور لفظ ''اللہ'' اسم خاص ہے اور پہلا اس عام ہونے کی بنا پر بصورت ''الهه'' جمع باندھا جاتا ہے، جب کہ لفظ ''اللہ'' اس خاص یعنی ''اسم علم'' ہونے کی بنا پر ہرگز جمع نہیں باندھا جاتا البتہ فارسی زبان میں دونوں معانی کیلئے ایک ہی لفظ یعنی خدا سے زیادہ نہیں اور یہ لفظ کبھی عام معنی میں اور کبھی خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

جب لفظ خدا سے خاص معنی کا ارادہ ہو جو وہ عالم کا پیدا کرنے والا ہے تو پھر اس کی ہرگز جمع نہیں باندھی جاتی اور اگر اس سے عام معنی کا ارادہ ہو تو ''خدایان'' (خداؤں) کی صورت میں استعمال ہوتا ہے اس بنا پر وہ آیات جو قرآن میں ''لا الٰه الاّ الله'' یا اس کے مشابہ صورت میں وارد ہوئی ہیں، اس کی ذات کی یکتائی اور اس کے بے مثل و نظیر ہونے کو بیان کرتی ہیں اور وہ لوگ جو ان موارد میں، لفظ ''الٰہ'' کو معبود کے معنی میں لیتے ہیں اور ان آیات کو توحید عبادی کی طرف ناظر سمجھتے ہیں وہ سخت غلط فہمی کا شکار ہیں کیونکہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ لفظ ''الٰہ'' معبود کے معنی میں نہیں بلکہ خدا کے معنی میں عام معنی کی صورت میں ہے۔ اور اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بت پرست عربوں سے جن کا شرز یادہ تر عبادت میں تھا نہ کہ خالقیت و ربوبیت میں ''لا الٰه الاّ الله'' کہنے پر اکتفا کرتے تھے تو وہ اس بناء پر نہیں تھا کہ ''الٰه'' معبود کے معنی میں ہے اور پیغمبرؐ یہ چاہتے تھے کہ بت پرست عرب اس کے کہنے سے معبود کی یگانگی کا اعتراف کر لیں بلکہ بت پرستوں سے اس جملہ کے کہنے پر پیغمبرؐ کے اکتفا کرنے کی علت یہ تھی کہ تمام بت پرست ان مختلف عقائد کے باوجود، جو وہ بتوں کے بارے میں (خالقیت، ربوبیت اور عبادت وغیرہ میں شرک کے قبیل سے) رکھتے تھے اپنے بتوں کو خدا کے معنی میں ''الٰه'' سمجھتے تھے یہاں تک کہ وہ بت پرست عرب جو اللہ کو صرف عالم کا خالق اور مربی سمجھتا تھا وہ اس کے باوجود لکڑی اور لوہے کے بتوں کو الٰہ بمعنی خدا کہتا تھا البتہ وہ انہیں خدائے بزرگ و برتر نہیں کہتا تھا۔ .... بلکہ وہ انہیں ایسا چھوٹا خدا سمجھتا تھا جنہیں خدائے بزرگ کے کاموں میں سے ایک حصہ سپرد (تفویض) کر دیا گیا ہے مثلاً گناہوں کے مغفرت اور خدا کے ہاں شفاعت وغیرہ اور اس کے مطالب کی تفصیل بارہویں حصہ میں بیان ہوگی۔

٦۔ وہ واضح ترین آیت جو ذات خدا کی یکتائی اور اس کے بے مثل اور بے مثال ہونے پر دلالت کرتی ہیں ذیل کی آیت ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؕ﴿۱۸﴾

''خدا، فرشتے اور صاحبان علم گواہی دیتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے درآنحالیکہ وہ عدل کے ساتھ حکم کرتا ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے وہی غالب صاحبِ قدرت اور حکیم و دانا ہے۔'' (آل عمران۔۱۸)

اسی مضمون کی بہت سی آیات، گونا گوں عبارات کے ساتھ مثلاً ''لا الٰه الاّ الله''، ''لا الٰه الاّ هو''، ''لا الٰه الاّ انت''، ''لا الٰه

الاّانا'' وغیرہ وغیرہ قرآن میں وارد ہوئی ہیں جو''**المعجم المفهرس**'' کی طرف رجوع کرنے سے مفصل طور پر مل سکتی ہیں ۔ یہاں پر ہم کچھ اور آیات کو پیش کرتے ہیں:

۱۔ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۱۱﴾

''خدا آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے ،اسی خود تمہیں میں سے تمہاری ازواج کو خلق کیا اور چار پاؤں کے بھی جوڑے پیدا کیے تا کہ اس کے ذریعے سے تمہیں پیدا کرے اور کوئی چیز اس کے مانند اور مثل نہیں ہے وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔'' (شوریٰ ۔۱۱)

''لیس کمثلہ شی'' کا جملہ اس بات کی ترجمانی کرتا ہے کہ اس کی مانند و مثل نہیں ہے یا اس کی مثل کی بھی مثل نہیں [1] ہے۔''

۲۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ﴿۲﴾ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴿۳﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾

''کہہ دے وہی ہے خدائے یکتا، وہی ہے بے نیاز نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ ہی وہ کسی سے جنا گیا ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔'' (سورہ اخلاص)

پہلی آیت کے بارے میں کچھ وضاحتیں

پہلی آیت ،اس کی وحدانیت اور یگانگی پر خدا فرشتوں اور علماء کی شہادت اور گواہی کو وضاحت کے ساتھ بیان کر رہی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس موضوع پر ان کی شہادت کس طرح ہے۔خدا کی گواہی کو دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

ا۔گواہی قولی یعنی جس طرح ہم ''الا الہ الاّاللہ'' کہنے سے خدا کی وحدانیت پر گواہی دیتے ہیں خدا بھی قرآن کے ذریعہ جو خدا کی وحی کا کلام

[1] ۔یہ دو تفاسیر اس بات پر مبنی ہیں کہ کیا لفظ کاف زائد ہے یا نہیں اگر ہم یہ کہیں کہ لفظ کاف زائد ہے تو پھر ہمیں آیت کی اس طرح تفسیر کرنا ہو گی کہ اس کی مانند و مثل نہیں ہے، اور زائدہ نہ ہونے کی صورت میں دوسری طرح کی تفسیر ہو گی ،البتہ اس کی مثل کی مثل نہیں ہے تو یقیناً خود اس کیلئے بھی مانند و مثل نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں اس کی مثل کی مثل نہیں ہے اس سے مقصد اور ہدف خدا کے لئے شریک اور مثیل ہونے کی نفی ہے کیونکہ جب کسی چیز کی مثل کی مثل نہ ہو تو یقیناً خود اس کی بھی مثل و نظیر نہ ہو گی اور عرفی محاورات میں جب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فلاں شخص بے نظیر ہے تو کبھی اس طرح استفادہ کرتے ہیں۔

ہے کئی آیات میں اپنی یگانگی پر گواہی دیتا ہے اور کچھ آیات کو ہم نے اس حصہ میں نقل کیا ہے۔

''قائِمًا بالقسط '' کا جملہ قول وعمل میں خدا کی صفت عدل وداد کی طرف اشارہ ہے اور آیت کے آغاز میں وارد شہادت کو قبول کرنا ایک طرح سے اس کی عدالت اور راستگوئی پر گواہی دیتا ہے۔

۲۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس شہادت کو عملی شہادت سمجھا جائے کیونکہ خدا نے عالمِ آفرینش کو ایجاد کرنے کے ساتھ جس پر ایک ہی نظام حکومت کر رہا ہے اور اس کے تمام اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ منظم اور منجم ہیں۔ عملاً اس بات کی نشان دہی کر دی ہے کہ سارے جہان پر ایک ہی فکر ونظر ایک ہی ارادہ ومشیت حکمرانی کر رہی ہے اور اگر اس جہان پر دو خدا حکومت کرتے ہوتے تو نظم و پیوستگی موجود نہ ہوتی۔ اس صورت میں ''قائِمًا بالقسط '' کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نظام خلقت نظم واعتدال کی بنیاد پر پیدا کیا گیا ہے۔

ان دونوں میں سے پہلا نظریہ زیادہ استوار درست ہے کیونکہ دوسرے دوگرہوں (فرشتوں اور صاحبان علم) کی شہادت جیسا کہ ہم بیان کرینگے۔ قولی اور لفظی شہادت ہے اس بناء پر تمام شہادتوں کی وحدت کو محفوظ رکھنے کیلئے تینوں شہادتوں کی ایک ہی طرز پر تفسیر کرنی چاہیے، صرف یہی ایک آیت نہیں ہے جو خدا کی قولی اور لفظی شہادت کو بیان کرتی ہے بلکہ اور بھی کئی آیات میں اس قسم کی شہادت آئی ہے اور انہیں عملی شہادت پر ہرگز محمول نہیں کیا جا سکتا ہے مثلاً

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۱۶۶

''خدا اس چیز کی جو اس نے تجھ پر نازل کیا ہے، گواہی دیتا ہے کہ اس نے اسے اپنے علم وآگاہی کے ساتھ نازل کیا ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور گواہی کیلئے تو خدا ہی کافی ہے۔'' (نساء۔ ۱۶۶)

دوسری آیت میں فرماتا ہے:

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ

''کہہ دے میرے اور تمہارے درمیان خدا کی گواہی ہی کافی ہے اور اس شخص کی جس کے پاس علم کتاب ہے۔'' (رعد۔ ۴۳)

قرآن میں اس قسم کی گواہی کے ورود کی بناء پر مناسب اور شائستہ یہی ہے کہ ہم زیر بحث آیت میں شہادت کو لفظی شہادت پر جس کی وحی الٰہی ترجمانی کرتی ہے حمل کریں۔

ایک سوال

شہادت کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ سننے والا اس اعتقاد کی بناء پر جو وہ شاہد کی عدالت اور راست گوئی کے بارے میں رکھتا ہے ،حقیقت مطلب کو سمجھ لے ،مثلاً اگر شہادت والی بات کوئی اعتقادی امر ہے تو وہ اس کا معتقد ہو جائے اگر اس کے ضمن میں کوئی وظیفہ اور ذمہ داری ہوتو اسے انجام دے ۔اس میں شک نہیں ہے کہ کوئی شاہد خدا سے زیادہ عادل اور سچا نہیں ہے اور اگر وہ اپنی وحدانیت پر گواہی دے تو وہ ہر قسم کے شک اور تردد کو دور کر دیتا ہے لیکن یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ یہ قرآن جو خدا کی شہادت کی ترجمانی کر رہا ہے خدا کا کلام اور اس کی گفتگو؟

جواب

قرآن نے ''تحدی'' اور چیلنج کے طریقہ سے اور ساری کائنات کو مقابلہ کی دعوت دے کر اور یہ اعلان کر کے کہ اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ یہ کتاب انسانی ذہن کی اختراع ہے تو کھڑے ہو جاؤ اور اس کی مثل لے آؤ مقام ربوبیت سے اس کی نسبت کو ثابت کر دیا ہے اور ہر صدی اور ہر زمانہ میں قرآن سے مبارزہ کیلئے انسان کا عجز و ناتوانی اس کے وحی اور آسمانی ہونے کی واضح گواہی ہے تو ان تمام شہادتوں کو جو قرآن میں وارد ہوئی ہیں بطور کلی قبول کرنا چاہیے۔

دوسرے الفاظ میں: چونکہ انسان کسی زمانہ میں بھی قرآن کا مثل و نظیر نہیں لا سکا ہے خاص طور سے جبکہ قرآن کے لانے والا ایسے معجزات بھی رکھتا ہے جو اس کی گفتار کی صداقت کے ضامن ہیں تو اس صورت میں انسان قرآن کی مقامِ ربوبیت سے نسبت کا یقین پیدا کر کے ہر اس شہادت کو قبول کر لیتا ہے جو اس میں آئی ہے ۔شہادت دینے والوں کا دوسرا گروہ فرشتے ہیں ،یہ گواہ ہمیشہ خدا کی ہر نقص و عیب ،خاص طور سے شرک و ہمتائی سے پاکی بیان کرتے ہوئے اس کی تسبیح و تقدیس کرتا ہے اور قرآن ایک آیت میں ان کی شہادت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ

''فرشتے اپنے پروردگار کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح کہتے ہیں[1]۔'' (شوریٰ۔۵)

تیسرا گروہ جو خدا کی یگانگی پر گواہی دیتا ہے علماء اور دانش مند ہیں علماء اور دانش مند گوناگوں دلائل کی بناء پر خدا کی وحدانیت اور یگانگی کی گواہی دیتے ہیں ان میں سے ایک فطرت انسان ہے کیونکہ انسان شدائد و آلام کے ظہور کے موقع پر ہمیشہ خدائے یگانہ سے ہی پناہ مانگتا ہے ۔اس کے علاوہ عالم خلقت میں اس کی یگانگی کی نشانیوں کا مطالعہ اور تحقیق انہیں خالق عالم کے ایک ہونے کی دعوت دیتا ہے اور ہم اس حصہ کو توحید

---

[1]۔تیسرے حصہ میں فرشتوں کی تسبیح کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے۔

درخالقیت کے حصہ میں بیان کرینگے۔[1]

ہم قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس بارے میں فرشتوں اور علماء کے ساتھ ہم آواز ہونے کیلئے زیر بحث آیت کی ایک مرتبہ پھر تلاوت کرلیں اور اس کے مفاد و مطلب میں غور و خوض کرنیکے بعد اس کو لانے والے کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔

حضرت زبیر بن عوامؓ سے روایت ہے کہ عرفہ میں غروب کے وقت جب کہ تمام حجاج ''مشعر'' کی طرف جانے کیلئے آمادہ تھے میں نے دیکھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذکر الٰہی میں مصروف ہیں میں آپؑ کے قریب گیا تا کہ ان کے ذکر کو سنوں میں نے دیکھا کہ آپؑ اس آیت کی تلاوت فرما رہے ہیں۔ اب جب کہ پہلی آیت کے بارے میں ہماری بحث ختم ہوگئی ہے تو اب ضروری ہے کہ ہم دوسری اور تیسری آیت کے بارے میں اہم وضاحتیں پیش کریں۔

دوسری آیات کی وضاحت

سورہ شوریٰ کی آیہ ۱۱ میں اس طرح وارد ہوا ہے ''لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ''، ''اس کا کوئی مثل ونظیر نہیں ہے۔'' اور سورہ اخلاص کی چوتھی آیت میں اس طرح آیا ہے ''وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ''، ''اور اس کا کوئی ہمسر وشریک نہیں ہے۔''

خدا کا کوئی مثل ونظیر اور ہمتا وشریک کیوں نہیں؟ کیا اس بات کا امکان ہی نہیں ہے کہ اس کا کوئی شریک ہے؟ یا امکان تو ہے، لیکن اتفاق سے اس کا کوئی شریک پیدا نہیں ہوا ہے؟

عقلی اور قرآنی دلائل، اس قسم کے شریک کے محال ہونے کی طرف ہماری ہدایت اور رہنمائی کرتی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ہم یہاں تھوڑا سا توقف کریں اور اس بارے میں عقل کی گواہی سنیں۔ فلاسفہ اسلام نے دو طریقہ سے خدا کی ذات کی یگانگی پر استدلال کیا ہے:

۱۔ غیر متناہی ہستی متعدد نہیں ہوتی

۲۔ ہستی مطلق تعدد نہیں رکھتی۔

اب ہم پہلے برہان کی وضاحت کرتے ہیں کیونکہ اس برہان کی اصل قرآن میں ہے اور دوسرے برہان کی وضاحت ''صفات شناسی'' سے مربوط کتابوں سے معلوم کریں۔[2]

اور پہلی برہان کے دو مقدمے ہیں اب ہم ان دونوں کو پیش کرتے ہیں۔

---

[1] ۔ اس حصہ میں بحث کی بنیاد ذات خدا یگانگی ہے چاہے وہ کسی جہاں کو پیدا کرے یا نہ کرے جب کہ توحید درخالقیت کے حصہ میں بحث کی بنیاد خالق عالم کی وحدت ہے اور یہ کہ اس جہان کا ایک سے زیادہ خالق نہیں ہے۔

[2] ۔ مولف نے کتاب ''شناخت صفات خدا'' میں دونوں براہین کی وضاحت کی ہے، مہربانی کرکے اس کتاب کے صفحہ ۸۸۔۹۶ کی طرف رجوع کریں۔

۱۔ وہ غیر متناہی وجود کیوں ہے؟

موجود کے محدود ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ عدم اور ہستی کے ساتھ ملی ہوئی ہو آپ ایک کتاب کو نظر میں رکھیں جو جیبی صورت میں یا رقعہ کے سائز میں چھپی ہوئی ہے اس کتاب کی جس جہت اور بعد کو بھی آپ دیکھیں آخر کار وہ ایسے نقطہ پر پہنچ جاتی ہے جہاں کتاب کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور اس سے آگے کتاب کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اس بات کا معنی کہ کوہِ البرز یا سیلان اس بزرگی کے باوجود محدود ہے یہ ہے کہ ہم اس کا اندازہ کرنے میں ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ان دونوں پہاڑیوں کا کوئی نام ونشان ہے۔ اگر کوئی انسان حضرت نوح علیہ السلام جتنی عمر پائے اور جسم کے لحاظ سے بزرگ ترین بادل کے برابر ہو، چونکہ زمان ومکان کی سرحد سے اس کا احاطہ ہوا ہے اور اس کی سرحد کی لائن سے باہر اس کے وجود کی کوئی خبر نہیں ہے لہٰذا وہ محدود ہے۔

اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کسی حادثہ کے زمانہ کے لحاظ سے محدود ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس کا وجود ہستی عدم ونیستی کی آمیزش رکھتا ہے، اور محدود ہونا اور عدم کے ساتھ آمیزش ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ لہٰذا تمام موجودات اور اجسام جو زمان ومکان کے لحاظ سے محدود ہیں ان کا وجود ہستی عدم ونیستی کے ساتھ ملا ہوا ہے اور یہ کہنا صحیح ہے کہ فلاں حادثہ زمانہ میں نہیں ہوا ہے تھا، یا فلاں جسم، فلاں مکان میں نہیں ہے۔

اس بنا پر خدا کو محدود فرض اور تصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ محدود ہونے کا لازمہ اس کے وجود کی عدم اور نیستی کے ساتھ آمیزش ہے اور وہ وجود جو عدم کے آمیزش رکھتا ہوا ایک باطل موجود ہوگا اور اس میں مطلق حق کے مقام کی، جو سو فیصد حق ہو، شائستگی ولیاقت نہ ہوگی اور خدا کے بارے میں عقل وقرآن کا نعرہ یہ ہے:

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ هُوَ الْبَاطِلُ

''خدا ہی پائیدار واستوار وحق ہے اور جس کو وہ اس کے علاوہ پکارتے ہیں وہ باطل اور فضول ہے۔'' (حج۔ ۶۲)

ہم خدا کے نامحدود ہونے کو ایک اور دلیل سے بھی ثابت کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ:

خدا کی بارگاہ میں محدودیت کے موجبات واسباب غلط ہیں اس کی وضاحت یہ ہے کہ زمان ومکان، اجسام میں موجودات کے محدود ہونے کا سبب ہیں وہ حادثہ جو زمانہ کے کسی ایک حصہ میں ایجاد ہو، چونکہ اس کا وجود زمانہ کے ساتھ ملا ہوا ہے تو طبعی طور پر ایسا موجود دوسرے زمانوں میں نہ ہوگا یا وہ جسم جو ایک معین جگہ اور فضا کو پر کیے ہوئے ہے وہ قطعی طور پر کسی دوسرے جگہ اور فضا میں نہیں ہوگا تو اس صورت میں وہ خدا جو ہر زمان ومکان سے پاک ومنزہ ہے وہ ان محدودیت آفرین قیود سے بھی مبرا ومنزہ ہوگا اس بناء پر خدا کے وجود کے لئے زمان ومکان کا تصور کیا ہی نہیں جا سکتا، لہٰذا اس کی غیر محدود وجود کے ساتھ ہی توصیف کرنی ہوگی۔

دوسرے الفاظ میں: وہ چیز جس میں مخصوص کیفیت ومقدار پائی جائے وہ قہراً محدود ہوگی کیونکہ جب کسی موجود میں مخصوص کیفیت ومقدار پائی جائے گی تو قطعی طور پر اس میں اس کی مخالف کیفیت ومقدار موجود نہ ہوگی، جب کوئی موجود ہر قسم کی کیف وکم اور رنگ وشرط سے پاک ومنزہ ہو اور اس کا وجود ان عنوانات سے بالاتر مرتبہ قرار پائے تو وہ قطعی طور پر نا متناہی اور غیر محدود [1] ہوگا۔

۲۔نا محدود موجود میں تعدد نہیں ہوتا

یہ مطلب تھوڑے سے غور وفکر کے ساتھ خود بخود واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اگر ہم غیر محدود موجود کو متعدد سمجھیں تو ہم دوگانگی سے بچنے کیلئے اس بات پر مجبور ہونگے کہ ان میں سے ہر ایک کو ایک جہت سے یا کئی جہات سے کہیں پر منتہی ہونے والا سمجھیں تاکہ ہم یہ کہہ سکیں کہ یہ اس کا غیر ہے کیونکہ اگر دو چیزیں ہر جہت سے ایک دوسرے کے عین ہوتو یقیناً وہ دو نہیں ہوسکتیں۔

دوسرے لفظوں میں: ''یہ اس کا غیر ہے'' کے جملہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے باہر ہے جہاں پہلا موجود ہے وہاں دوسرا نہیں ہے اور اس کے برعکس وہی انتہا کو قبول کرنا اور محدود ہونا ہے جب کہ پہلے اصل میں خدا کا محدودیت کو قبول نہ کرنا ثابت ہو چکا ہے۔

مثال کے طور پر دو متوازی خطوط کو غیر متناہی فرض کر سکتے ہیں لیکن جب کوئی جسم اپنے تمام ابعاد وجہات میں غیر متناہی طور پر بڑا ہو تو پھر ہم کسی دوسرے جسم کو اس کے تمام ابعاد وجہات میں غیر متناہی فرض نہیں کر سکتے کیونکہ پہلے جسم نے تمام فضا اور جگہ کو پُر کیا ہوا ہے اور دوسرے جسم کیلئے کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے اور اس فرض کے ساتھ اگر دوسرے جسم کو بھی فرض کریں تو وہ جسم یقیناً یا تو پہلے کا عین ہوگا، یا پہلا جسم ایک جہت سے یا کئی جہات سے متناہی اور محدود ہوگا۔

ان دونوں بیانات سے واضح ہو گیا کہ قرآن ''لیس کمثله شيء'' اس کی کوئی مثل نہیں ہے۔کیوں فرماتا ہے اور یا یہ کیوں کہتا ہے ''ولم یکن له کفوًا احد''، ''اس کی کوئی نظیر نہیں۔''

جیسا کہ یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ خدا کی وحدت عددی اور ایک دانہ والی نہیں ہے کیونکہ اس قسم کی وحدت اسی صورت میں متصور ہوسکتی ہے جب اس کیلئے دو یا چند افراد فرض کیے جاسکیں، جب کہ غیر متناہی موجود کیلئے دو یا تین افراد فرض کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ دو فراد فرض کرنے کی صورت میں ہر ایک کو دوسرے کا غیر ہونا چاہیے اور ہر ایک کو دوسرے کی انتہا سمجھنا چاہیے، تو اس طرح کوئی بھی غیر متناہی نہیں رہے گا جب کہ ہم نے پہلے کو غیر متناہی فرض کیا تھا اس بنا پر خدا کے غیر متناہی ہونے کا تصور اس کے مقام کے لائق وحدت ویگانگی کے تصور کے لئے لازمی ہے۔

---

[1] ۔کیونکہ یہ ہمیشہ کیفیتیں اور کمیتیں مقداریں اور اضافتیں ہی ہوتی ہیں جو چیزوں کیلئے محدودیت پیدا کرتی ہیں تو اس بناء پر ان عناوین سے مبرا چیز میں کسی قسم کی محدودیت نہیں ہوگی، البتہ محدودیت کے علل واسباب انہیں میں منحصر نہیں ہیں بلکہ اصولی طور پر مخلوق ہونا خود محدودیت کا سبب ہے کیونکہ خلقت مقدار اور اندازہ کرنے کے ساتھ جو وہی محدودیت ہے، ہمیشہ ہمراہ ہوتی ہے، اس بنا پر ''ماسوی الله'' یہاں تک کہ وہ بھی جو مادہ سے مجرد ہیں، مخلوق ہونے کی بناء پر محدود ہوں گی۔

ایک سوال

قرآن مجید میں خدا کی صفت ''الواحد'' سے توصیف کے بعد صفت ''القہار'' آتی ہے، مثلاً

۱۔ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ [۱]

۲۔ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ [۲]

۳۔ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ [۳]

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یگانگی اور قاہریت کے درمیان کیا رابطہ ہے۔

جواب

خدا کا قاہر و غالب ہونا اس کی وحدت و یگانگی پر گواہ ہے کیونکہ ایک محدود اور انتہا کو قبول کرنے والا وجود اس حد کا مقہور و مغلوب ہے جو اس پر حکم فرما ہے اور اس کی مقہوریت کی نشانی، سلب و نفی کا وہی ایک سلسلہ ہے جو اس میں پایا جاتا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ وہ جسم فلاں جگہ نہیں ہے اور وہ موجود اس زمانہ میں نہیں تھا۔

اس بناء پر مقہوریت ہی وہ چیز ہے جو محدودیت کا سبب بنتی ہے اور اگر کوئی موجود ہر لحاظ سے قاہر و غالب ہو، تو کوئی خدا بھی اس پر حکومت نہ کرے اور وہ قطعی طور پر انتہا پذیر نہیں ہوگا، اور انتہا پذیر نہ ہونے کا لازمہ وہی تعدد کا نہ ہونا اور یگانگی ہے اور حقیقت میں اس قسم کی توصیف کا اسی دلیل عقلی کی طرف اشارہ سمجھا جاسکتا ہے جو ابھی ابھی قارئین کی نظر سے گزر چکی ہے۔

دوسرا سوال

اگر خدا کا وجود توحیدِ عددی سے پاک و منزہ و مبرا ہے تو اس صورت میں ان آیات کا جو اسے ''الٰہ واحد'' کہتی ہیں کیا معنی ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

''تمہارا خدا ایک ہے اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں، وہ رحمان و رحیم ہے۔'' (بقرہ۔ ۱۶۳)

---

[۱] ۔سورہ ص۔ ۶۵

[۲] ۔سورہ زمر۔ ۴

[۳] ۔سورہ رعد۔ ۱۶

اِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمۡ وَاحِدٌ

''ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہے۔'' (عنکبوت۔۴۶)

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ‌ۘ وَمَا مِنۡ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ

''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا تین افراد میں سے ایک ہے، وہ کافر ہو گئے ہیں، ایک خدا کے سوا اور خدا ہے ہی نہیں۔'' (مائدہ۔ ۷۳)

وَلَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنۡتَهُوۡا خَيۡرًا لَّـكُمۡ ؕ

''یہ نہ کہو کہ وہ تین ہیں، رُک جاؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے۔'' (نساء۔۱۷۱)

خصوصاً جب کہ یہ آیات مشرکین کے خیالات و نظریات کے مقابلے میں وارد ہوئی ہیں جو یہ کہتے تھے:

اَجَعَلَ الۡاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ اِنَّ هٰذَا لَشَىۡءٌ عُجَابٌ ۝

''کیا اس نے متعدد خداؤں کو ایک ہی خدا بنا دیا ہے، یہ تو ایک عجیب بات ہے۔'' (ص۔۵)

جواب

آن آیات کا ہدف و مقصد مشرکین کے غلط نظریہ کی سرکوبی ہے کہ ہر قوم وقبیلہ کا اپنا ایک الگ خدا تھا، اور وہ اسی کی پرستش کیا کرتا تھا، اور دوسرے خداؤں کے پرواہ نہیں کرتا تھا، مقصد یہ ہے کہ یہ تمام گونا گوں خدا مخلوق سے زیادہ نہیں ہیں، اور ان متعدد خداؤں کی طرف توجہ کرنے کی بجائے ایک ہی خدا کی طرف توجہ کرنا چاہیئے لیکن اس خدا کی یگانگی کیسی ہے اور اس کی وحدت کون سی وحدتوں میں سے ہے مذکورہ آیات اس حصہ کی طرف ناظر نہیں ہیں، بلکہ اس کو ان اشاروں سے جو اس وحدت کی طرف قرآن میں ہوئے ہیں استفادہ کرنا چاہیئے۔

خُدا کی یگانگی کے بارے میں شِیعہ احادیث

شیعوں کے ائمہ کی احادیث میں، دونوں مطالب، جو برہان عقلی میں پیش ہوئے تھے، وارد ہوئے ہیں، یعنی یہ بھی تصریح ہوئی ہے کہ خدا کے وجود کیلئے حد وانتہا نہیں ہے، تو اس لحاظ سے اس کیلئے کوئی نظیر نہیں ہے اور یہ بھی وارد ہوا ہے کہ اس کی وحدت، عددی وحدت نہیں ہے، ان دونوں مطالب کا بیان یہ ہے:

خُدا غیر متناہی موجود ہے

آٹھویں امامؑ نے اس خطبہ میں جو آپؑ نے بڑے لوگوں کے ایک مجمع کے سامنے دیا تھا، اس طرح فرمایا:

لیس لہ حد ینتھی الی حدہ ولا لہ مثل فیعرف بمثلہ۔ [۱]

''اس کیلئے کوئی حد نہیں ہے کہ اس کا وجود وہاں ختم ہوجائے، اور اس کا کوئی مثل ونظیر نہیں ہے کہ جس پر قیاس کر کے اُسے پہچانا جائے۔''

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ خدا سے حد کی نفی کرنے کے بعد مثل ونظیر کی نفی کا مسئلہ پیش فرماتے ہیں کیونکہ غیر محدود ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ اس کی کوئی مثل ونظیر نہ ہو جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

خُدا کی وحدت، عددی وحدت نہیں ہے

جنگ جمل میں جب تلواروں کی چمک نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی، اور طرفین کے واردلوں کو دہلا رہے تھے کہ وسط میدان میں ایک عراقی مجاہد نے امامؑ کی طرف رُخ کیا اور خدا کی یگانگی کی کیفیت کے بارے میں سوال کیا، امامؑ کے طرفداروں نے سائل کیلئے موقع پر ملامت کی، اور کہا: یہ سوال کرنے اور پوچھنے کا وقت نہیں ہے جو ہم گروہ مخالف سے چاہتے ہیں اس کے بعد امامؑ نے اپنی گفتگو کے دوران اس طرح فرمایا:

قول القائل: واحد یقصد بہ باب الاعداد، فھذا، مالا یجوز لان مالا ثانی لہ لا یدخل فی باا لاعداد۔ [۲]

''خدا کی یگانگی کی تعریف وتوصیف اس طور پر کہ اس سے واحد عددی کا ارادہ کیا جائے صحیح نہیں

---

[۱] ۔ توحید صدوق ص ۲۳ ط غفاری

[۲] ۔ توحید صدوق ص ۸۳

ہے کیونکہ وہ چیز جس کا اصلاً کوئی دوسرا اور مشابہ نہیں ہے، وہ عدد کے زمرہ میں نہیں آتا۔

اس کے بعد امامؑ نے خدا کی یگانگی کی اس طرح تفسیر فرمائی:

هو واحد ليس له في الاشياء شبه كذالك ربّنا

''وہ یکتا و یگانہ ہے اور اس کی کوئی چیز مثل و نظیر نہیں ہے اس طرح ہے ہمارا خدا۔''

یعنی خدا کی یگانگی سے مراد یہ ہے کہ اس کا کوئی ثانی اور دوسرا نہیں ہے وہ ایسا ہے نہیں جس کیلئے کسی دوسرے کے امکان کا گمان ہو۔

تین خدا

اب جب کہ خدا کی یگانگی اور وحدانیت سے مربوط آیات پر غور وخوض ہو چکا ہے، تو اب ضروری ہے کہ ہم قرآن کی نظر سے تثلیث اور تین خداؤں کے بارے میں آگاہی حاصل کریں، اور ان آیات کا جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں اچھی طرح سے تجزیہ تحلیل کریں۔ دنیا میں بہت کم مذاہب ایسے ہیں جو مسیحیت کی طرح ابہام، تاریکی اور پیچیدگی سے دو چار ہیں اور بہت کم مسائل ایسے ہیں جو اس دین میں ''تثلیث'' کی طرف مبہم، نا قابل فہم اور زیادہ صحیح تفسیر میں ''غیر معقول'' ہیں۔

مرور زمانہ، اور فکری تکامل وارتقاً اور مذہبی تعصّبات کی کمی نے علماء مسیحیت کے ایک گروہ کے افکار میں، دگرگونیاں اور انقلاب پیدا کر دیا ہے، جو اس بات کا سبب بنا ہے کہ علم و منطق اور انکے عقائد کے درمیان گہرا فاصلہ ہو جائے ایسا فاصلہ جسے کسی طرح بھی پُر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس خلاء کے مقابلہ میں دو طرح سے سوچتے ہیں اور ان دونوں طریقوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اپنے آپ کو راضی رکھتے ہیں۔

۱۔ایک گروہ کی کوشش تو یہ ہے کہ آسمان کو آپس میں بٹ کر مسیحیت کے تمام پرانے عقائد کو جنہیں موجودہ نوع بشر نے منطق شدت کے ساتھ رد کر چکی ہے، منطقی رنگ دیدیں اور انہیں زمانہ کے پسند کے مطابق بنا دیں، چنانچہ یہ کام تثلیث کے بارے میں انجام پا چکا ہے۔

۲۔ دوسرے گروہ نے اپنے آپ کو تاویلوں اور توجیہوں کے ایک سلسلہ کے چنگل سے آزاد کر لیا ہے اور ایک زیادہ غیر معقول اصل کی پیروی کرتے اور کہتے ہیں علم اور دین کا راستہ ایک دوسرے سے جدا ہے اور یہ ممکن ہے کہ دین تو ایک اصل کو قبول کرے لیکن علم اس کی تصدیق نہ کرے اور اسکے نتیجہ میں انہوں نے علم اور دین کے تضاد کو قبول کر لیا ہے۔

انہوں نے ایک نکتہ سے غفلت برتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ''علم و دین کے تضاد'' کو قبول کر لینے کا انجام، دین کے باطل ہو نیکے سوا اور کچھ نہیں ہے کیونکہ کسی بھی آئین و دین اور مسلک کے سلسلہ میں انسان کے اعتقاد کا سر چشمہ عقلی و علمی استدلالات ہی ہوتے ہیں تو اس صورت میں اصل عقلی کے ساتھ کسی دین کی حقانیت کو کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے اس کی بعض تعلیمات عقل و علم کے برخلاف ہیں۔

عیسائیوں میں تثلیت کس طرح وارد ہوئی

فرید وجدی دائرۃ المعارف ''لاروس'' سے نقل کرتا ہے کہ مسلمہ طور پر مسیحؑ کے پہلے شاگرد جنہوں نے آپ کو نزدیک سے دیکھا تھا، اس عقیدے سے (کہ مسیح تین خداؤں میں سے ایک ہے) دور تھے مثلاً پطرس حواری مسیحؑ کو صرف ایک ایسا مرد سمجھتا تھا جس پر وحی ہوئی تھی لیکن پولس نے مسیح کے پہلے شاگردوں سے ساتھ مخالفت کی اور یہ کہا کہ مسیح انسان سے بالاتر تھے، وہ ایک نئے انسان کا ایک ایسا نمونہ ہے جو خدا سے پیدا ہوا ہے۔

تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ سچے پیغمبروں کے دینا سے چلے جانیکے بعد یا انکی غیبت کے زمانہ میں ان کے پیروکاروں کا ایک گروہ، گمراہ کرنیوالوں کے اغوا سے بت پرستی کا رُخ کر لیتا تھا، اور توحید و یگانہ پرستی کو جو پیغمبروں کے بھیجنے کا بنیادی مقصد اور ہدف ہے ،ترک کر دیتا ہے۔ بنی اسرائیل کا گوسالہ پرستی کی طرف مائل ہو جانا اور یکتا پرستی کے دین کو ترک کر دینا اس موضوع کے واضح نمونوں میں سے ایک ہے جسے تاریخ اور قرآن [1] اور آنے والے لوگوں کیلئے ضبط کیا ہے۔ اس بناء پر ہمیں اس پر کوئی تعجب نہیں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اپنے پیرکاروں کے درمیان سے چلے جانے کے بعد عیسائیوں کی دینی محافل میں، تثلیث کے موضوع نے رواج پالیا اور ان کے خون اور گوشت کے ساتھ گھل مل گیا۔

مرورزمانہ نے موضوع تثلیث کو عیسائیوں کے دلوں میں اس طرح راسخ اور استوار کر دیا ہے کہ ان کے برگزیں مصلح (زیفورمسٹ) ''یوتر'' جس نے دین مسیحی کو بہت سے خرافات اور افسانوں سے پاک کیا ہے اور ایک فرقہ کی ''پروٹسٹنٹ'' کے نام سے بنیاد رکھی ہے وہ بھی دین مسیحی کی تثلیت (تین خداؤں) کے چنگل سے آزاد نہ کرا سکا۔

تثلیث کے بارے میں قرآن کا نظریہ

قرآن مجید تثلیث کے موضوع کو گزشتہ ادیاں سے مربوط سمجھتا ہے، اس کا نظریہ یہ ہے کہ مسیحؑ خدائے یکتا کی طرف دعوت دیا کرتے تھے، جیسا کہ فرماتا ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ

''وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ خدا وہی مسیحؑ بن مریمؑ ہے وہ کافر ہو گئے ہیں (حالانکہ) مسیحؑ یہ کہا کرتے

---

[1] ۔ سورہ طٰہٰ آیات ۸۵۔۹۹

تھے کہ اسی خدا کی پرستش کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے جو شخص بھی خدا کے ساتھ شرک کرے گا، اس پر جنت حرام ہے۔ (مائدہ۔ ۷۲)

یہ عیسائی ہی ہیں جنہوں نے دوسرے ادیان کی تقلید کرتے ہوئے اس کو دین مسیحؑ میں وارد کیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللهِ ۖ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللهُ ۚ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ ﴿٣٠﴾

''عیسائی کہتے ہیں، مسیح خدا کا بیٹا ہے یہ ایک ایسی بات ہے جسے وہ زبان سے کہتے ہیں، (اور باطن میں وہ اس پر ایمان ہی نہیں رکھتے) وہ ان ہی لوگوں کی گفتار کا مظاہرہ کرتے ہیں جنہوں نے ان سے پہلے (اس قسم کا عقیدہ رکھنے کی وجہ سے) کفر کیا تھا۔ وہ خدا کی رحمت سے دور ہوں، وہ خدا کی یگانگی کے دلائل دیکھ لینے کے باوجود کس طرح راہ حق سے منحرف ہو گئے ہیں۔'' (توبہ۔ ۳۰)

علماء اور دانش مندوں کی آخری تحقیق نے قرآن کے نظریہ کو واضح طور پر ثابت کر دیا ہے کیونکہ چھٹی صدی قبل از میلاد مسیح میں برہمنوں کے مذہب میں کچھ اصلاحات ہوئی تھیں، اور اس کے نتیجہ میں ہندو مذہب وجود میں آیا تھا، اس دین میں خدائے ازلی وابدی نے تین مظاہر اور تین خداؤں میں تجلی کی تھی، ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ برھما: (عدم سے وجود میں لانے والا)

۲۔ ویشتو: (نگرانی و حفاظت کرنے والا)

۳۔ سیفا: (قتل کرنے والا)

اور اب بھی (ہندوؤں) کی ثالوث مقدس، تین مجسموں کی صورت میں، ایک دوسرے سے ملی ہوئی، ہندوستان کی نمائش گاہ میں موجود ہے وہ اپنی مذہبی کتابوں میں ان تین اصولوں کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں۔

''برہمن'' عدم سے وجود میں لانے والا اور خلقت کا آغاز کرنے والا ہے، وہ ہمیشہ لاہوتی آفریدگار ہے اور وہ اس کو باپ کہتے ہیں۔

''یشتو'' نگاہداری اور حفاظت کرنے والا، جسے وہ خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں، جو باپ خدا کی طرف سے آیا ہے۔

''سیفا'' پیدا کرنے والا ہے نابود کرنے والا اور عالم کو بار بار لوٹانے والا ہے۔

کتاب ''العقائد الوثنیة فی الدیانُ النصرانیة''[1] کے مولف نے مسیحیت کے دوسرے خرافات کی مکمل تحقیق کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ثالوث مقدس، میلاد مسیحی سے سینکڑوں سال پہلے برہمنوں، ہندوؤں اور دوسرے بیہودہ مذہبوں میں موجود تھا، اور اس سلسلہ میں اس نے قیمتی کتابوں اور زندہ تصاویر کو سند کے طور پر پیش کیا ہے جو اب بھی پرستش گاہوں عبادت خانوں اور عجائب گھروں میں موجود ہیں اور یہ قرآن کی گفتار پر ایک زندہ سند ہے۔

گستاؤلبون لکھتا ہے: مسیحیت نے پہلی پانچ صدیوں میں، فلسفی، مذہبی، یونانی اور مشرقی عوامل کو اپنی زندگی میں جذب کر کے، اپنی زندگی کو جاری رکھا، اور اسی ترتیب سے وہ مشرقی عقائد، خصوصاً مصری و ایرانی عقائد کا جو پہلی صدی میلادی کے اوائل مین یورپ کی سرزمین میں منتشر تھے۔ ایک ایسا مرکب بن گیا جس کے نتیجہ میں لوگوں نے پرانی تثلیث ''نروپی تر'' و''ژنون'' اور''نرو'' کے بجائے ایک نئی تثلیث، باپ، بیٹا اور روح القدس کے نام سے قبول کر لی۔

---

[1] ۔تالیف محمد طاہر تنیر لبنانی جو فارسی میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے۔

قرآن کی نظر سے مسیحؑ کی الوہیت اور تثلیث کا بے بنیاد ہونا

قرآن استوار منطق ور محکم برہان کے ساتھ مسیحؑ کی الوہیّت کے مسئلہ کو باطل کرتا ہے اور اس بارے میں اس طرح کہتا ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَالْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ

''وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے، وہ کافر ہو گئے ہیں کہہ دے، اگر خدا چاہے کہ مسیح ابن مریم اور اس کی ماں اور ان تمام انسانوں کو جو روئے زمین پر ہیں ہلاک کرے تو خدا کو اس کام سے کون روک سکتا ہے۔'' (مائدہ۔١٧)

یہ ٹھیک ہے کہ اس آیت میں تین خداؤں کے بارے میں گفتگو نہیں ہوئی ہے اور بحث کا زیادہ تر زور مسیح کے خدا ہونے کے خیال کی طرف ہے لیکن دوسری آیات میں مسیح کی الوہیت کا تصور تثلیث کی صورت میں پیش ہوا ہے، تو اس طرح سے پیش ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کی الوہیت ''تین خداؤں'' کی صورت میں پیش ہوئی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

''وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ خدا تین ہیں سے ایک ہے، وہ کافر ہو گئے ہیں خدا تو خدائے یکتا و یگانہ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔'' (مائدہ۔٧٣)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مسیح کی ''الوہیت'' اور اس کے نتیجہ میں مسئلہ تثلیث کو کس طرح باطل کرتا ہے قرآن نے اس بارے میں دو واضح اور ہمہ گانی برہان پیش کی ہیں، جن کی ہم وضاحت کرتے ہیں۔

١۔ خدا مسیح کو نابود کر سکتا ہے۔

٢۔ مسیح دوسرے انسانوں کی طرح غذا کھاتا ہے وغیرہ..................

پہلی برہان کے بارے میں اس طرح کہتا ہے:

فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا

يَشَآءُ

''اگر خدا چاہے کہ مسیح ابن مریم اور اس کی ماں اور ان تمام افراد کو جو روئے زمین میں ہے ہلاک کر دے، تو اسے اس کام سے کون روک سکتا تھا، آسمانوں اور زمین اور ان چیزوں کی مالکیت جو ان دونوں کے درمیان ہیں خدا ہی کی ہے وہ جسے چاہتا ہے خلق کرتا ہے۔'' (مائدہ۔۱۷)

اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ تمام عیسائی عیسیٰؑ کو حضرت مریم کا بیٹا جانتے ہیں اور انہیں ہمیشہ ''مسیح ابن مریم کہتے ہیں، اب اگر وہ مریمؑ کے بیٹے ہیں تو یقیناً وہ دوسرے انسانوں کے مانند بشر ہونگے، کہ ان سب کی موت وحیات خدا ہی کے قبضہ قدرت میں ہے وہ چاہے تو تمام کو زندگی بخش دے اور چاہے تو سب کی حیات وزندگی ختم کر دے تو اس وضع وکیفیت کے ہوتے ہوئے وہ انہیں کس طرح سے خدا جانتے ہیں، جب کہ وہ اپنی بھی موت وحیات کے مالک نہیں ہیں۔اس آیت میں قرآن کی پوری توجہ ان کے بشر ہونے کی طرف ہے، اسی لئے ان کی مریم کا بیٹا ہونے کے ساتھ توصیف کی ہے، اس کے بعد ان کی والدہ اور روئے زمین کے تمام انسانوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے ''وامه ومن فی الارض'' تک کہ ثابت کرے کہ وہ تمام احکام میں دوسرے لوگوں کے ساتھ یکساں ہے اور نتیجہ اس کا یہ ہے کہ وہ ایک بشر سے زیادہ نہیں ہیں۔اس سے زیادہ اور واضح عبارت میں، فلسفہ اسلام میں ایک قانون ہے ''قانون حکم الامثال'' اور اس قانون کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔

حکم الامثال فیما یجوز وما لا یجوز واحد

''تمام نظیریں اور مثلیں، تمام احکام میں، جواز وامتناع کے لحاظ سے یکساں ہیں۔''

اگر دوسرے انسانوں کو نابود کرنا ممکن ہے تو پھر انہیں نابود کرنا بھی ممکن ہے، تو اس وضع وکیفیت کے ہوتے ہوئے انہیں کس طرح خدا جانتے ہو۔ اور مطلب کی تکمیل کیلئے آیت کو ''ولله ملك السماوات والارض ومابينهما'' کے جملہ کے ساتھ ختم کرتا ہے اور حقیقت میں یہ جملہ گزشتہ حکم کی علت ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا مسیحؑ ان کی والدہ اور تمام انسانوں کو ہلاک ونابود کر سکتا ہے کیونکہ وہ سب کے سب اس کے مملوک اور اس کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

۲۔ مسیح اور آثار بشری

قرآن کہتا ہے کہ مسیحؑ اور ان کی والدہ دوسرے پیغمبروں کی طرح غذا کھاتے تھے اور رفع ضرورت کرتے تھے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ...............

''مسیح ابن مریم گزشتہ پیغمبروں کی طرح ایک پیغمبر تھے، اوران کی والدہ سچی یا گذشتہ پیغمبروں کی تصدیق کرنے والی تھی وہ دونوں کے دونوں غذا کھایا کرتے تھے......'' (مائدہ۔۷۵)

یعنی مسیح اوران کی والدہ دوسرے پیغمبروں کے ساتھ کوئی فرق نہ رکھتے تھے، وہ بھوک کے وقت کھانا کھاتے تھے اوراپنی اس ضرورت واحتیاج کودور کیا کرتے تھے، اوراحتیاج ونیاز امکان کی نشانی ہے اورخدا کی ذات ہرقسم کے نیاز واحتیاج اورامکان سے پاک ومبرا ہے۔ مسیح ایک ممکن انسان ہیں، جوایک ممکن انسان سے پیدا ہوئے ہیں اوروہ دونوں خدا کی عبادت کیا کرتے تھے اوربھوک کودور کرنے کیلئے غذا سے استفادہ کرتے تھے، توان صفات کے باوجود انہیں کس طرح خدا سمجھتے ہیں۔

یہ آیت نہ صرف مسیح کی الوہیت کو باطل کرتی ہے بلکہ ان کی والدہ کی الوہیت کوبھی باطل کرتی ہے کچھ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی والدہ کے بارے میں بھی اس قسم کا باطل خیال تھا جب کہ فرماتا ہے:

ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِیۡ وَاُمِّیَ اِلٰـهَیۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ

''کیا تونے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اورمیری ماں کواللہ کے علاوہ خدا بنالو۔'' (مائدہ۔۱۱۶)

مسیحؑ کے بیٹا ہونے کا تصور

مسیح کے بیٹا ہونے کا مسئلہ شرک درذات کے مظاہر میں سے ایک ہے جوخدائے یگانہ کی واقعیت کوتین خداؤں کی صورت میں جلوہ نما کرتا ہے اورحقیقت میں مسیحیت کی تثلیث اسی پراستوار ہے۔ قرآن نے دوطریقے سے اسے باطل کیا ہے اوراس کے وہمی وخیالی ہونے کووضاحت کے ساتھ نمایا کیا ہے۔

الف...... چھ علمی دلائل کے طریق سے خدا کیلئے بیٹے کے خیال کومطلقاً محال جانا ہے، چاہے وہ بیٹا مسیح ہو یا ان کے علاوہ کوئی اور [۱]

ب...... مسیح کے ماں سے پیدا ہونے اوران کی بشری زندگی کی تشریح کے ساتھ، خصوصیت کے ساتھ مسیح کے بیٹا ہونے کوباطل کیا ہے۔

یہ صرف مسیحی ہی نہیں ہیں جوحضرت عیسیٰؑ کوخدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں بلکہ مشرکین عرب فرشتوں کوخدا کی بیٹیاں خیال کرتے تھے جیسا کہ فرماتا ہے:

وَیَجۡعَلُوۡنَ لِلّٰهِ الۡبَنٰتِ سُبۡحٰنَهٗ

''وہ خدا کے لئے بیٹیاں قرار دیتے ہیں خدا پاک ومبرا ہے۔'' (نحل۔۵۷) [۲]

---

[۱]۔ پہلے طریقہ میں چار آیات کے ضمن میں چھ دلیلیں بیٹے کی نفی میں وارد ہوئی ہیں اورہم نے سہولت کے لئے دلائل کی آیات اورعنوانات کوعلیحدہ علیحدہ شمار کیا ہے۔

[۲]۔ سورۂ اسراء آیہ ۴۰، صافات ۱۴۹، ۱۵۳، زخرف ۱۹، طور ۳۹ کی طرف رجوع کریں، اورقرآن کی نقل کے مطابق پیغمبرؐ کے ہم عصر یہودیوں کا ایک گروہ عزیزؑ کوخدا کا بیٹا سمجھتے تھے، جیسا کہ فرماتا ہے: ''وَقَالَتِ الۡیَهُوۡدُ عُزَیۡرٌ ابۡنُ اللّٰهِ'' ''یہودیوں نے کہا کہ عزیز خدا کا بیٹا ہے۔'' (توبہ۔۳۰)

ہر قسم کا بیٹا بنانے کی نفی پر قرآنی دلائل چاہے مسیح ہو یا غیر،

۱۔اس کی بیوی نہیں ہے

۲۔وہ اپنے علاوہ سب کا خالق ہے۔

بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ ؕ اَنّٰى يَكُوۡنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمۡ تَكُنۡ لَّهٗ صَاحِبَةٌ‌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ‌ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ‏ ﴿۱۰۱﴾

''وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اس کے بیٹا کیسے ہوسکتا ہے جب کہ اس کی بیوی ہی نہیں ہے اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا عالم و دانا ہے۔'' (انعام ۔۱۰۱)

اس آیت میں بیٹا بنانے کی امتناع اور محال ہونے پر دو براہین کے ساتھ استدلال کیا ہے،

۱۔''بیٹا ہونے'' کا معنی یہ ہے کہ ایک جز باپ سے ''سپر ماٹوزا'' Spernatozoa نامی جدا ہو، اور وہ ماں کے رحم میں قرار پائے اور زمانہ کے گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ تکامل اور ارتقاء کے عمل کو جاری رکھے، اس قسم کا عمل بیوی کے وجود کا محتاج ہے جب کہ سب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ اس کی بیوی نہیں ہے جیسا کہ فرماتا ہے: ''وَّلَمۡ تَكُنۡ لَّهٗ صَاحِبَةٌ'' اس کیلئے کوئی بیوی نہیں ہے۔

۲۔جب بیٹا بنانے کا معنی یہ ہے جو بیان کیا گیا ہے تو پھر اس قسم کا وجود خدا کی مخلوق اور مصنوع نہیں ہوگا بلکہ وہ اس کا معادل و شریک ہوگا، کیوں کہ باپ بیٹے کا خالق نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کا ایک جز ہوتا ہے جو کہ خارج میں اسی کی ذات سے نشوونما حاصل کرتا ہے جب کہ خدا ہر چیز کا خالق ہے ،جیسا کہ فرماتا ہے :وَخَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ'' سب چیزوں کو اسی نے پیدا کیا ہے ۔اور آیت کے آغاز میں فرماتا ہے:''بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ'' آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان میں ہے ان کا بھی)

۳۔وہ ہر چیز کا مالک ہے

الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَمۡ يَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ شَرِيۡكٌ فِى الۡمُلۡكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِيۡرًا‏ ﴿۲﴾

''وہ خدا جس کیلئے آسمانوں اور زمین کی مالکیت ہے اور اس نے ہر گز اپنے لئے بیٹے کا انتخاب نہیں کیا ہے ،اور عالم کی فرمانروائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے ، ہر چیز کو اسی نے پیدا کیا ہے اور ان کا صحیح صحیح اندازہ لگایا ہے۔'' (فرقان ۔۲)

اس آیت میں ایک اور برہان کے ساتھ بیٹے کی نفی پر استدلال ہوا ہے اور وہ خدا کی اس کے ماسویٰ کے لئے مطلق مالکیت تکوینی

کا مسئلہ ہے کیونکہ انسان کی اپنے اموال میں مالکیت، ایک اجتماعی اور معاشرتی قرارداد ہے جو زندگی کے پہیوں کی گردش کی بناء پر اس کے پاس آ گئی ہیں، جب کہ آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کیلئے خدا کی مالکیت، تکوینی مالکیت ہے جو اس کی خالقیت اور آفرینندگی سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے، اگر وہ ہر چیز کا مالک ہے تو پھر اس کیلئے کسی بیٹے کا تصور کیا ہی نہیں جا سکتا، کیونکہ انسان کا بیٹا چونکہ اس کی مخلوق نہیں ہے تو پھر وہ اس کا مملوک بھی نہیں ہوگا، جب کہ خدا تو ہر چیز کا مالک ہے اور اس برہان کی طرف زیر بحث آیت میں اس طرح اشارہ ہوا ہے۔

الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا

''اسی کیلئے آسمانوں اور زمین کی مالکیت ہے اور اس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا۔''

اور آیت کے ذیل میں اس مالکیت کی اصل بنیاد کی طرف جو وہی خالقیت ہے اشارہ ہوا ہے، اور فرماتا ہے: **وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ** اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

۴۔ وہ مادہ سے پاک اور مبرا و منزہ ہے۔

۵۔ تمام موجودات اسی کے ساتھ قائم ہیں۔

۶۔ وہ غنی اور بے نیاز ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ۙ سُبۡحٰنَہٗ ؕ بَلۡ لَّہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾

بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۱۱۷﴾

''وہ کہتے ہیں کہ خدا نے بیٹا بنا لیا ہے، پاک و منزہ ہے وہ بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا ہے اور وہ سب کے سب اس کے فرمانبردار ہیں۔''

''وہ آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے جب وہ کسی چیز کو وجود میں لانے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے وہ جا پس ہو ہو جاتی ہے۔''

اس آیت میں اولاد اور بیٹے کے نہ ہونے پر تین براہین کے ساتھ استدلال کیا ہے۔

۱۔ بیٹے کا معنی یہ ہے کہ باپ سے ایک جزا لگ ہو اور وہ ماں کے رحم میں قرار پائے، اور اس بات کا لازمہ یہ ہے کہ خدا جسم ہو اور وہ زمان و مکان وتجزیہ کے جسمانی آثار رکھتا ہو، حالانکہ وہ ان امور سے پاک اور منزہ ہے اور اس برہان کی طرف ''سبحانہ'' ''خدا اس سے پاک و منزہ ہے کہ وہ جسم وجسمانی ہو'' کے جملہ سے اشارہ ہوا ہے۔

۲۔ اس کا خدا اور پروردگار ہونا مطلق اور وسیع ہے تمام موجودات اسی کے ساتھ قائم ہیں اور اسی کے نیاز مند ہیں، اگر اس کے کوئی بیٹا ہوگا تو یقیناً وہ بھی اسی کے مثل اور مانند ہوگا وروہ بھی خدا کی طرح مستقل ہوگا اور اس میں بھی خدا کے تمام اوصاف واحکام، جن میں سے استقلال و بے نیازی

ہیں موجود ہونگے حالانکہ آسمانوں اورزمین میں جو کچھ بھی ہے وہ اسی کی ملکیت ہے اوراس کے ساتھ قائم اوراس کے فرمان کے ماتحت ہے،اوراس برہان کی طرف اس جملہ کے ساتھ اشارہ کرتا ہے:

لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ

''جو کچھ آسمانوں میں ہے اسی کا ہے اور وہ سب کے سب اس کے فرمانبردار ہیں۔''

خدا کی ذاتِ اقدس اولاد کی خواہش کے محرک سے پاک ومنزہ ہے کیونکہ اولاد کی خواہش یا تونسل جاری رکھنے کیلئے ہوتی ہے یا بڑھاپے کے زمانے میں اپنی ضرورتیں اور حاجتیں پوری کرنے کیلئے ،لیکن ان میں سے کسی کا بھی مقام الوہیت کیلئے جو قادروتوانا اور آسمانوں اوزمین کا خلق کرنے والا ہے،تصورنہیں ہوتا جیسا کہ فرماتا ہے:''بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ''''وہ آسمانوں اورزمین کا پیدا کرنے والا ہے اوراس قسم کا قادروتوانا آفریدگار ہر قسم کے احتیاج و نیاز سے پاک ومنزہ ہے۔[1]

ایک اورروایت میں اولاد سے خدا کے غنی وبے نیاز ہونے پر تکیہ ہوا ہے،جیسا کہ فرماتا ہے:

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ هُوَ الْغَنِيُّ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

''انہوں نے کہا کہ خدا نے اپنے لئے بیٹا بنالیا ہے وہ پاک ومنزہ ہے ،وہ غنی وبے نیاز ہے اور جو کچھ آسمانوں اورزمین میں ہے اسی کا ہے۔''(یونس۔۶۸)

قرآن اس طریقہ سے اولاد کے ہونے کے ہر قسم کے اعتقاد کو چاہے وہ مسیح ہوں یا غیر مسیح ۔جو یہودیوں عیسائیوں ،زرتشتیوں ،ہندوؤں اور مشرکین میں پایا جاتا ہے،غلط اور باطل قرار دیتا ہے۔

ب......دوسری دلیل ،جو خصوصیت کے ساتھ حضرت مسیحؑ کو بیٹا بنانے کی بے بنیادی پر ہے یہ ہے کہ مسیحؑ کی بشری زندگی کی مختلف سورتوں ،خصوصاًسورہ مریم میں واضح طور پر تشریح ہوئی ہے جس نے کسی باانصاف فردکیلئے ،ان کے بشر ہونے میں کوئی شک وتردد باقی نہیں چھوڑا،اورگزشتہ آیات میں سے بعد میں ان کی زندگی کے کئی نمونے وارد ہوئے ہیں۔[2]

قرآن کلی طور پر خدا کی ذاتِ مقدس کواس بات سے کہ وہ اس قسم کے رسول بھیجے جو لوگوں کو خدا کی بندگی کی طرف دعوت دینے کی بجائے اپنی طرف بلائیں،پاک اور منزہ سمجھتا ہے اور فرماتا ہے:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ

---

[1]۔تفسیر المیز ان میں اس برہان کی ایک دوسری طرح سے تفسیر کی گئی ہے۔ج۔۳،ص۔۳۱۶ کی طرف رجوع کیا جائے

[2]۔سورہ مائدہ کی آیہ ۷۵ او ۷۷ اورسورہ توبہ کی آیہ ۳۰ کی طرف رجوع فرمائیں،اور بحث میں بھی آیہ انما المسیح عیسی ابن مریم سورہ نساء آیہ ۱۷۱ کا بیان ہوگا۔

كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللهِ وَلٰكِن كُونُوا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ ﴿٧٩﴾

''کسی بشر کیلئے یہ مناسب نہیں کہ خدا تو اسے کتاب، فرمانروائی اور پیغمبری دے اور وہ لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ خدا کا بندہ ہونے کے بجائے میرے بندے ہو جاؤ بلکہ اس کے مقام کے لائق بات تو یہی ہے کہ وہ یہ کہے کہ تم خدا کے بندے بنو، جیسا کہ تم نے خدا کی کتاب سے سیکھا ہے اور سبق پڑھا ہے۔'' (آل عمران۔۷۹)

وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَن تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا ۗ أَيَأْمُرُكُم بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿٨٠﴾

''(نہ ہی اس کیلئے یہ بات سزاوار ہے کہ وہ تمہیں) یہ حکم دے کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو اپنا پروردگار بنا لو کیا وہ تمہارے مسلمان ہو جانے کے بعد تمہیں کفر کی دعوت دیتا ہے۔'' (آل عمران۔۸۰)

دوسری آیات میں حضرت مسیحؑ کی پرستش کا مسئلہ پیش ہوا ہے اور وہ اس طریقہ سے کہ مسیحؑ اپنے پرستش کرنے والوں کے سود وزیاں کے مالک نہیں ہیں ان کی پرستش کو باطل اور بے فائدہ قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۚ وَاللهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٧٦﴾

''کیا تم خدا کے سوا کسی ایسے کی پرستش کرتے ہو جو نہ تو تمہارے کسی نفع کا مالک ہے اور نہ ہی کسی نقصان کا اور وہ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔'' (مائدہ۔۷۶)

چونکہ یہاں بحث توحید در ذات کے بارے میں ہے اور توحید در عبادت کے بارے میں ہم بارہویں حصہ میں بحث کرینگے، لہٰذا اس حصہ سے مربوط آیات کی تحقیق کو ہم مذکورہ فصل کے لئے چھوڑتے ہیں۔

لیکن اس آیت اور اس سے مشابہ آیات میں غور کرنے سے ایک نکتہ واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگوں میں عام طور پر عبادت کا محرک اور سبب یہ ہوتا ہے کہ معبود پرستش کرنے والے کے سود وزیاں کا مالک ہے اور ہر قسم کی تعظیم اور خضوع کیلئے جھکنا جس کا سرچشمہ یہ نقطہ

ہو، وہ شرک در عبادت کا مصداق ہوسکتا ہے لیکن اگر انسان کسی انسان کے سامنے، اس محرک اور سبب کے علاوہ خضوع کے طور پر جھکے تو اس کا یہ عمل دوسری چیز کے احترام کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اور اس حصہ کی تفصیل آپ اس کتاب کے بارہویں حصہ میں ملاحظہ کرینگے۔

اور آخر میں ''قرآن'' مسیح کے بارے میں اپنا نظریہ جو سچا اور ہر قسم کے بیہود پن یا حق ناشناسی سے دور ہے اس طرح بیان کرتا ہے:

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ

''اے اہل کتاب اپنے دین میں بے ہودہ گوئی (اور غلو وزیادتی) نہ کرو، خدا کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو، مسیح عیسیٰ بن مریم صرف خدا کا پیغمبر اور اس کا کلمہ ہے۔ جو (رحم) مریم کی طرف القا کیا اور وہ اس کی طرف سے روح تھی تم خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ تین ہیں رُک جاؤ یہی بات تمہارے لئے بہتر ہے۔ (نساء۔۱۷۱)

یہ آیت۔ جو ایک بلند مرتبہ انسان کی واقعیت کو بیان کرنے والی ہے حضرت مسیح کی بہترین طریقہ سے معرفی کراتی ہے اور اس قدر موثر اور نفوذ کرنے والی ہے کہ جس وقت حبشہ کے فرمانروا نے جعفر بن ابی طالب سے مسیح کے بارے میں اسلام کے نظریہ کی خواہش کی تو انہوں نے اس آیت کی اس کے سامنے تلاوت کی جب ''نجاشی'' نے جعفر سے یہ گفتگو سنی، تو اس عود (خوشبودار لکڑی) کو جو اس کیلئے جلائی گئی تھی اٹھا کر کہنے لگے کہ حضرت مسیح کے بارے میں جو کچھ تم نے بیان کیا ہے وہ اس سے اس عود کی لکڑی جتنے بھی بالاتر نہیں تھے۔[1]

وہ اوصاف جو مسیح کیلئے اس آیت میں آئے ہیں حسبِ ذیل ہیں۔:

۱۔ انما المسیح: لفظ مسیح مبارک کے معنی میں ہے اور ایک دوسری آیت میں ان کا تعارف اس طرح ہوا ہے۔ ''وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ'' (آل عمران۔۴۵) دنیا وآخرت میں آبرومند اور خدا کے مقربین میں سے ہے۔

۲۔ عیسی ابن مریم: مریم کا بیٹا ہے اور وہ اس کے وصف کے ہوتے ہوئے خدا یا خدا کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے۔

۳۔ رسول اللہ: خدا کا پیغام لانے والا ہے۔

۴۔ کلمۃ اللہ: یہ ٹھیک ہے کہ عالم کے تمام موجودات کلمہ اور سارا جہان خدا کا کلام اور اس کی بات ہے اور (عالم کا) عجیب وغریب نظام خدا کے علم وقدرت کی بات کرتا ہے لیکن چونکہ یہ کلمہ اسباب عادی کے بغیر خلق ہوا ہے اس لحاظ سے اس پر خصوصیت کے ساتھ لفظ ''کلمہ'' بولا گیا ہے۔

---

[1] ۔ سیرۃ ابن ہشام۔ ج۱، ص۔۳۳۷ مصر مصطفٰے البانی

۵۔روح منه: خدا کی طرف سے ایک روح ہے اور اس اضافت اور نسبت میں ایک قسم کا اعزازی اور تشریفی پہلو ہے جیسا کہ خدا کا گھر،[1]

تین خداؤں کے بارے میں تحقیق

اب جب کہ تثلیث کے بارے میں ہماری بحث اختتام کو پہنچ چکی ہے تو ہم بحث کی تکمیل کیلئے تین خداؤں سے متعلق موضوع کو عقل کی میزان پر رکھتے ہیں۔

عیسائیوں کی گفتگو، خود ان کی اپنی کتب کلامیہ میں اس بات کی ترجمانی کرتی ہے کہ تثلیث کا عقیدہ تعبدی مسائل میں سے ہے جس کی صحت پر استدلال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں:

''بشر کے تصورات اس مطلب کے سمجھنے میں مد نہیں کر سکتے، اور عالم مادہ کی طرف سے جو قیاسات کیے جاتے ہیں وہ حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں اور وہ اس حقیقت کے درک کرنے میں ہماری مدد نہیں کرتے۔''

اس کے بعد مزید کہتے ہیں:

''ہمارا نا محدود کے بارے میں کوئی تجربہ نہیں ہے جب خدا خود کہتا ہے کہ اس کی غیر محدود طبیعت کلی طور پر تین اشخاص کے ہاتھ میں ہے، تو بحث کیلئے کوئی گنجائش باقی ہی نہیں رہتی، چاہے اس کیلئے کوئی بھی میزان نہ ہو کہ جس سے اس کے معنی کا ادراک کریں۔''

''اتنا اندازہ ہی کافی ہے، وحی ہوئی ہے کہ تین معین اشخاص اجتماعی طور پر خدا کی غیر محدود طبیعت کے مالک ہیں، اور یہ تین اشخاص معین اور مشخص ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں اور الوہیت میں شرکت نہیں رکھتے، بلکہ ان میں سے ہر ایک ''الوہیت'' کا مالکِ کل ہے، باپ تمام الوہیت کا مالک ہے، بیٹا تمام الوہیت کا مالک ہے، روح القدس تمام الوہیت کا مالک ہے۔''

یہ جملے، اور ان سے ملتے جلتے دوسرے جملے سب کے سب یہی بتلاتے ہیں کہ وہ موضوع تثلیث کو استدلال سے مافوق جانتے ہیں، اور انکا عقیدہ یہی ہے کہ اس کیلئے صحیح استدلال ہو ہی نہیں سکتا اس کا مدرک صرف وحی ہے اور نقل، تو اس صورت میں پہلے مرحلہ میں ان کے نقلی دلائل کی تحقیق اور مطالعہ ہی کرنا پڑے گا، لیکن تثلیث کو کوئی صحیح منقول مدرک بھی نہیں ہے، اور موجودہ انجیلیں کوئی معتبر مدرک نہیں ہیں، بلکہ ان کی تحریر کی سبکی اور ہلکا پن اس بات کی ترجمانی کرتا ہے کہ وہ پہلی اور دوسری صدی میلادی کے بچے کھچے ادبیات ہیں۔

یہ درست ہے کہ عالم مجرد اور ماوراء طبیعت کا امور مادی کے ساتھ قیاس نہیں ہوسکتا اور ہر ایک کا اپنے لئے ایک خاص پیمانہ ہے لیکن ہمارے پاس مسائل عقلی کا ایک ایسا سلسلہ ہے جس میں کسی طرح بھی اختلاف اور لغزش نہیں ہوتی اور وہ جہان مادہ اور عالم ماوراء طبیعت پر ایک ہی طرح سے حکمرانی کرتا ہے، مثلاً اجتماع نقیضین کا مسئلہ ایسے مسائل کے سلسلہ میں سے ہے جو کسی زمان و مکان میں اور کسی شکل و صورت میں صحیح نہیں ہوسکتا، یا دوسرے مسائل جو اسی قسم کے مسائل جیسے ہیں، اس بنا پر جب واضح عقلی دلائل، موضوع تثلیث کو باطل قرار دیتے ہیں تو اس

---

[1]

بارے میں نقل کی سند پیش نہیں کی جاسکتی، بلکہ عقل کی برکت سے اس قسم کی نقل کو غلط قرار دینا پڑے گا اور یہ کہنا پڑے گا کہ تثلیث خدا کی بات نہیں ہے۔اب ہم تثلیث کی حقیقت کو عقل کی نگاہ سے پرکھتے ہیں۔

وہ ایک بھی ہے اور تین بھی ہیں

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ''تثلیث'' سے مقصود جسے بعض اوقات ''ثالوث اقدس'' بھی کہتے ہیں کیا ہے، تثلیث کی حقیقت کیلئے سب سے زیادہ واضح تعارف کرانے والی بات وہی ہے جسے کتاب مقدس کے مولف، امریکہ کے مسٹر ہاکس نے بیان کیا ہے،

وہ کہتا ہے: ''خدائی طبیعت'' تین ''مساوی الجوہر'' اقانیم سے ہے یعنی باپ خدا، بیٹا خدا اور روح القدس خدا باپ خدا تمام کائنات کا خالق ہے بیٹے کے ذریعہ سے اور پسر فادی اور روح القدس اور روح القدس پاک کرنے والا ہے، لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ ان تینوں اقانیم کا ایک ہی رتبہ و عمل ہے۔[1]

اقنوم لغت میں ''اصل'' اور شخص کے معنی میں ہے اور جیسا کہ وہ تصریح کرتے ہیں، وہ ان تینوں خداؤں میں سے ہر ایک کیلئے ایک رتبہ، ایک درجہ اور ایک ہی عمل کے معتقد ہیں۔اب تثلیث کے پیروکاروں سے پوچھنا چاہیے، کہ تین خداؤں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ یہاں تثلیث کو دو صورتوں میں جن میں سے کوئی بھی مقام ربوبیت کے ساتھ مناسب نہیں ہے تصور کیا جاتا ہے۔

ا۔تینوں خداؤں میں سے ہر ایک مستقل وجود رکھتا ہے اور ہر ایک مخصوص وجود اور تشخص کے ساتھ خودنمائی کرتا ہے مثلاً جیسا کہ افراد انسانی میں سے ہر ایک اپنے لئے مستقل وجود رکھتا ہے اور ہر ایک الگ شخصیت کا مالک ہے، اسی طرح سے ''اقانیم'' ہیں اور ہر اقنوم اپنے لئے علیحدہ اصل شخصیت اور وجود رکھتا ہے، دوسرے لفظوں میں: طبیعت ایک ہے، لیکن اس کے افراد تین ہیں اور ہر فرد مکمل اور مستقل خدا ہے اور اس قسم کی تثلیث وہی جاہلیت کے زمانہ والا شرک ہے جو مسیحیت میں تین خداؤں کی ضرورت میں تجلی کیے ہوئے ہے۔جب کہ توحید اور یگانگی کے دلائل نے ہر قسم کے شرک اور دوبینی کو خدا کیلئے باطل کر دیا ہے اور گذشتہ دلائل کی بناء پر یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کیلئے نظیر اور شرک تصور کریں۔

ہنسی کی بات یہ ہے کہ کلیسا کی محفلوں کے بدعت گزاروں کا اصرار یہ ہے کہ اس قسم کی تثلیث کو توحید کے ساتھ ہم آہنگ کر دیں اور یہ کہیں، کہ وہ تین ہوتے ہوئے ایک ہے اور ایک ہونے کی حالت میں بھی تین ہیں کیا اس قسم کی توجیہہ تناقص گوئی، اور اصطلاح کے مطابق ''کوسہ وریش پہن۔(جس کی ٹھوڑی کے سوا داڑھی میں کہیں بال نہ ہوں، اور پھر بھی داڑھی گھنی ہو) کے سوا کوئی دوسری چیز ہے؟

کیا دنیا میں کوئی ایسا فرد پیدا ہوسکتا ہے جو یہ کہے کہ تین مساوی ہیں ایک کے؟

کیا اس قسم کی تاویل کی اس کے سوا کوئی اور علت ہے کہ وہ ایک عجیب و غریب تنگ مقام میں پھنس گئے ہیں؟ ایک طرح تو وہ یکتا پرستی کے قطعی اور یقینی دلائل پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ دلائل عقلی خدا کیلئے ہر قسم کی مثل و نظیر اور شریک کو غلط اور باطل قرار دے رہے

---

[1] ۔قاموس کتاب مقدس۔ص۔۳۴۴

ہیں دوسری طرف سے تثلیث کے موروثی عقیدہ کو نظر میں رکھتے ہیں، جس نے مسیحی معاشرے کے دل میں رسوخ کر رکھا ہے۔ اس صورت میں ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ اس قسم کی تناقص گوئی کی پناہ حاصل کریں اور یہ کہیں کہ ایک اور تین آپس میں مساوی ہیں۔

۲۔ خداؤں کی حصہ داری شرکت

تثلیث کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ تینوں اقانیم ہر ایک علیحدہ علیحدہ اپنا نا جداگانہ تشخص واستقلال رکھے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ترکیب وبہم پیوستگی کے زیر اثر خدائے جہان کی ذات کو تشکیل دیں اور حقیقت میں اس تینوں اجزاء میں سے کوئی بھی خدا نہیں ہے، بلکہ خدا جہاں تو وہی ہے جو ان تینوں کی ترکیب کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس قسم کی تفسیر میں مشکل یہ ہے کہ خدا اس کے نتیجہ میں مرکب ہوجاتا ہے اور اپنے تشخص وتحقیق میں (خدا بننے کیلئے) اپنی ذات کے اجزاء کا محتاج ہوجاتا ہے اور جب تک یہ اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ نہ ملیں، اور آپس میں گھل مل نہ جائیں اس وقت تک خدائے جہان وجود میں ہی نہیں آتا، اور اس صورت میں مسیحیت اور بھی زیادہ تنگی اور مشکل میں پھنس جاتی ہے۔

الف......خداوند عالم اپنے تحقیق (خدا بننے) میں غیر (تینوں اجزاء میں سے ہر ایک غیر خدا ہے، اور تینوں اجزاء مل کر خدا بنتا ہے) کا محتاج ہوگا، حالانکہ نیازمند اور محتاج کبھی بھی خدا نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ ممکن اور ایک مخلوق ہوگا جس کی احتیاج کو دوسرے ممکنات کی طرح کوئی دوسرا برطرف کرے گا۔

ب......اگر تینوں اجزاء میں سے ہر ایک ہستی کے لحاظ سے واجب الوجود اور ضروری ہو تو اس صورت میں وہ خدائے یگانہ کی بجائے تین واجب الوجود کے معتقد ہو گئے ہیں۔

اور اگر ہر ایک وجود کے لحاظ سے ممکن الوجود ہو اور اپنے تحقق میں کسی علت کے محتاج ہو تو اس صورت میں ان اجزاء کی ہستی کیلئے ایک خدا کا ہونا لازمی وضروری ہے جو انہیں تحقق بخشے اور اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ان اجزاء میں سے ہر جز بھی وہ خدا بھی جو ان تینوں اجزاء کی ترکیب سے وجود میں آیا ہے۔ اس خدا کی معلول ومخلوق ہو جس نے ان سب کو وجود بخشا ہے اور طبعاً اس خدا کی بسیط ہونا چاہیے اور اس کی کوئی جزء اور ترکیب نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اس صورت کے علاوہ بھی اسی مرکب خدا کی سرنوشت سے دوچار ہوجائے گا۔

ج......وہ کہتے ہیں، خدا کی طبیعت میں تین شخص وجود رکھتے ہیں اور ان تین اشخاص میں سے ہر ایک تمام الوہیت کا مالک ہے۔

تین اشخاص کا معنی یہ ہے کہ ان میں سے ہر فرد مستقل طور پر ایک دوسرے سے الگ وجود رکھتا ہے جب کہ یہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ تثلیث کی طبیعت کا تجزیہ نہیں ہوسکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان دونوں باتوں کے درمیان بہت واضح تناقض ہے کیونکہ اگر واقعی تین شخصیتیں ہیں تو پھر تثلیث کا تجزیہ ہوگیا ہے اور اگر وہ تجزیہ کے قابل نہیں ہے تو پھر اس صورت میں تین اشخاص کس طرح سے وجود رکھتے ہیں، بلکہ وہ تو تین چیزوں کا ایک مرکب ہوگا۔

د......اگر بیٹے کی شخصیت خدا ہے، تو پھر بیٹا باپ کی شخصیت کی عبادت کیوں کرتا ہے اور مساوی خداؤں میں سے کسی کو دوسرے کے سامنے

دستِ نیاز دراز نہیں کرنا چاہیے اور آپس میں ایک دوسرے کی پرستش نہیں کرنا چاہیے۔

ھ......عیسائی تینوں خداؤں میں سے ہر ایک کو تمام الوہیت کا مالک سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ عیسیٰؑ کی الوہیت نے جو مریمؑ سے پیدا ہوئے ہیں ایک جسد اور جسم کی صورت اختیار کر لی ہے اور موروثی گناہ سے نوعِ بشر کو پاک کرنے کیلئے مصلوب ہوئے اور سولی پر چڑھا دیئے گئے اور چند دنوں کے بعد زندہ ہو گئے۔

اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غیر محدود خدا کس طرح سے جسم کی شکل میں جو ہر لحاظ سے محدود ہے آ گیا ہ اور نا محدود اور تمام عوامل پر محیط خدا محدود و محاط فلسطین میں یہودیوں کے ہاتھ سے مصلوب و مقتول ہو گیا۔ اس عالم کے تمام کام وظائف اور ذمہ داریوں اور تمام ممکن الوجود چیزوں کے کام اور ذمہ داریاں، ان کے زندہ ہونے تک کیسے انجام پائیں کہ خلقت وآفرینش کے کارخانے میں کسی قسم کا خلل اور نقص ظاہر نہیں ہوا۔ یہ اور اسی قسم کے دسیوں سوال کلیسا کی تثلیث کے بارے میں موجود ہیں جنہوں نے مسیح کے پاک دین کو بت پرستی کے افسانہ کے ساتھ آلودہ کر دیا ہے۔ اور انسان اس قسم کے بیہودہ اور افسانوی ادیان کے مطالعہ اور تحقیق کے بعد ان آیات کی واقعی قدر و قیمت کو پالیتا ہے جو توحید کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔

چھٹا حصہ

توحید صفات

۱۔خدا ذات بسیط اور ہر قسم کی ترکیب سے منزہ ہے۔

۲۔اس کی صفات اس کی عین ذات ہیں نہ کہ غیر ذات،

اس حصہ میں

خُدا کی ذات ہر قسم کی ترکیب سے منزہ ہے

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ توحید ذاتی کے دو معانی ہیں۔

۱۔توحید ذاتی، یعنی خدا کیلئے کوئی مثل ونظیر نہیں ہے اور گزشتہ حصہ میں ہم اس کے عقلی اور قرآنی دلائل بیان کر چکے ہیں۔

۲۔توحید ذاتی، یعنی اس کی ذات بسیط ہے اور وہ ہر قسم کی خارجی اور عقلی ترکیب سے منزہ ہے۔

اب ہم یہاں پر دوسرے معنی والی توحید ذاتی کی تحقیق پیش کرتے ہیں۔

چونکہ ''توحید صفات'' کا مسئلہ اور یہ کہ خدا کی صفات عین ذات ہیں اور ذات وصفات کے درمیان کوئی سرحد نہیں ہے ،''بساطت'' اور ''نفی ترکیب'' کے مسئلہ کے ساتھ، مشترک دلائل رکھتا ہے اس بنا پر ہم نے دونوں مسائل کو ایک ہی حصہ میں قرار دے کر توحید ذاتی کو توحید صفاتی میں ادغام کر دیا ہے، حالانکہ بساطت ذات کا مسئلہ توحید ذات کی ایک شاخ ہے اور ذات وصفات کے اتحاد کا مسئلہ توحیدِ صفاتی کے ساتھ مربوط ہے اب ہم ''بساطت ذات'' کے بارے میں بحث کرتے ہیں، اور یہاں سے شروع کرتے ہیں۔

توحید ذاتی اور بساطت ذات

توحید ذاتی کی دو طرح سے تفسیر ہو سکتی ہے۔

۱۔خدا واحد و یکتا و یگانہ ہے اور اس کا نہ تو کوئی مثل ونظیر ہے اور نہ ہی کوئی شریک

۲۔اس کی ذات بسیط ہے اور ہر قسم کی ترکیب اور خارجی اور عقلی کثرت سے منزہ ہے۔

بعض علماء توحید ذاتی کو پہلے معنی کے لحاظ سے ''واحدیت'' اور توحید ذاتی کو دوسرے معنی کے لحاظ سے ''احدیت'' کہتے ہیں۔ اور شاید اس اصطلاح کی بنیاد یہ ہے کہ لغت عرب میں واحد بمعنی یکتا، ثانی کے مقابلہ میں ہے اور اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا واحد ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس کا کوئی ثانی اور نظیر نہیں ہے۔ لیکن ''احد'' ترکیب کے مقابلہ میں وحدتِ ذات کے معنی میں ہے اور اگر قرآن خدا کی لفظ ''احد'' کے ساتھ توصیف کرتا ہے اور ''ھو اللہ احد'' فرماتا ہے تو یہ تثلیث ترکیبی کے مقابلہ میں ہے جس کے عیسائی مدعی ہیں اور وہ مقام الوہیت کو تین ''اقنوم'' سے مرکب سمجھتے ہیں۔

اگر اس آیت میں احد سے مراد یہ ہوتا کہ وہ ایک ہے اور اس کا کوئی ثانی نہیں ہے تو پھر سورت کے آخر میں اس مضمون کا تکرار کرتے ہوئے ''وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ'' فرمانے کی ضرورت نہیں تھی۔

یہ مطلب اس صورت میں واضح وروشن ہو جاتا ہے جب ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سورت میں آیات عیسائیوں کے عقائد کی رد میں ہیں اگر چہ ان کا نام نہیں لیا گیا لیکن وہ ایک قسم کے مرکب واحد کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ بہر حال یہ اصطلاح چاہے ''واحد'' اور ''احد'' کے لغوی

معنی کے ساتھ مطابق ہو یا نہ ہو[1]۔ مذکورہ اصطلاح، توحید ذاتی کی دونوں اقسام کی ایک دوسرے سے جدائی اور علیحدگی کا سبب بن گئی ہے یعنی توحید کے اس معنی کو کہ اس کا کوئی ثانی نہیں ہے توحید کے اس معنی سے کہ وہ بسیط ہے اور اس کا کوئی جز نہیں ہے، الگ، جدا اور علیحدہ کرتا ہے۔

پہلی نظر میں انسان یہ تصور کرتا ہے کہ قرآن میں توحید کے اس حصہ کے بارے میں کوئی آیت یا آیات وارد نہیں ہوئی ہیں گویا قرآن نے اس قسم کے مباحث کو انسان کی عقل وخرد کے سپرد کر دیا ہے۔ لیکن جب فلسفی تحقیقات سے آگاہی کے بعد......جس سے انسان کی عقل وبصیرت میں اضافہ ہوتا ہے......ہم دوبارہ قرآن کے طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کی ایک ایسے سلسلہ صفات کے ساتھ توصیف کر رہی ہے جو ہرگز بھی خدا کی ذات کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ قرآن کی آیات میں معنی کے لحاظ سے مختلف ابعاد وجہات ہوتے ہیں، ممکن ہے کہ پہلی نظر اور لحہ میں آیت کے مفاد کا ایک بعد اور جہت ذہن میں آئے جب کہ آیت کے دوسرے اور تیسرے بعد اور جہت کا معلوم ہونا عمیق اور گہری بصیرت کا محتاج ہو۔

امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں: خدا کو علم تھا کہ آخری زمانہ میں گہری نظر والی اقوام اور گروہ پیدا ہونگے (اور وہ خدا کی توحید سے مربوط مسائل کو دقیق علمی موازین کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کرینگے) اور اسی لئے اس نے سورہ اخلاص اور سورہ حدید کی چھ آیات کو نازل فرمایا، اور جو شخص اس کے علاوہ کچھ اور چاہے وہ ہلاک ہوگا۔[2]

اس بناء پر ہمیں مبداء ومعاد سے مربوط معارف کو آیاتِ قرآن سے اخذ کرنے میں پہلی ہی نظر پر اکتفا نہیں کر لینا چاہیے بلکہ ہمیں عقل وبصیرت کی قوت اور غور وفکر کی کوشش کے ساتھ معارف قرآنی کے سمندر میں غوطے لگانا چاہیے، تب ہم دیکھیں گے کہ اس غواصی میں کیسے کیسے گرانبہا گوہر ہمیں نصیب ہوتے ہیں، اسی لئے ہم اس حصہ میں اپنی عقل وبصیرت کی تقویت کیلئے پہلے ذاتِ خدا کی بساطت، یا ترکیب کے مسئلہ کی اور اسی طرح توحیدِ صفات کے مسئلہ کی عقل وخرد کی نگاہ سے تحقیق پیش کر رہے ہیں پھر ہم اس حصہ سے مربوط آیات کو صحیح اسلامی احادیث کے ایک سلسلہ کے ساتھ پیش کرینگے۔

۱۔ ذاتِ خداوند خارجی ترکیب سے مُنزّہ ہے

خارجی ترکیب سے مراد یہ ہے کہ خدا کی ذات دوسرے موجودات کی طرح، اجزاء خارجی رکھتی ہو، اور خارجی قطعات اور اجزاء کے ایک سلسلہ سے ترکیب پائے، جیسے دھاتیں اور کیمیائی محلول ہوتے ہیں جو مختلف عناصر کے ایک سلسلہ کے آپ میں مل جانے سے، وجود میں آجاتے ہیں۔

---

[1] ۔قرآنی بحث میں یہ حصہ وضاحت کے ساتھ ثابت ہوگا کہ ''واحد'' اور ''احد'' کا لغوی معنی یہی ہے جو اس اصطلاح میں آیا ہے۔

[2] ۔توحید صدوق ۲۸۳۔ ۲۸۴ ط غفاری: ان اللہ عزوجل علم انه یکون فی اٰخر الزمانه اقوام متعمقون فانزل اللہ عزوجل "قل ھو اللہ احد" والایات من سورۃ الحدید الی قوله "وھو علیم بذات الصدور فمن رام ماوراء ھنالك هلك۔

اس قسم کی ترکیب کی ذات خدا میں کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ جب یہ فرض کیا جائے گا کہ خدا کی ذات اجزاء کے ایک سلسلہ سے ترکیب پائی ہے تو اس صورت میں وہ اپنی اور وجود کیلئے جوکل ہے۔ان (اجزاء) کی محتاج ہوگی اور نیاز مند موجود دوسرے کا معلول ہوتا ہے اور وہ الوہیت کی صلاحیت سے محروم ہوگا، اس سے قطع نظر وہ اجزاء جن کے ملنے سے خدا کی ذات بنتی ہے یا تو وہ سب کے سب واجب الوجود ہوں گے یا واجب الوجود نہ ہونگے، پہلی صورت میں ہم تعدد ''واجب الوجود'' کے اعتقاد کے گڑھے میں جا گرینگے اور دوسری صورت میں وہ اجزاء سارے کے سارے ممکن الوجود ہونگے اور طبعاً کسی دوسرے موجود کے معلول ہونگے اور وہی خدائی کے لائق اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان اجزاء سے مرکب وجود بھی جیسے ہم نے خدا فرض کرلیا تھا اس برتر وافضل موجود کا معلول ہوگا۔

۲۔اس کی ذات عقلی اجزا سے بھی منزہ ہے

اس قسم کی بساط کو واضح کرنے کیلئے چند امور کا بیان کرنا انتہائی ضروری ہے۔

(الف) ہر وہ چیز جو کسی موجود کے وجود کا تعارف کرانے والی اور اس کے وجود کی حد کو بیان کرنے والی ہے، وہی اس چیز کی ذات اور ماہیت ہے اور ہر موجود کی ماہیت اس کے علاوہ اور کوئی نقش واثر نہیں رکھتی کہ اشیاء کے وجود کا اندازہ لگا کر انکے مقام وحیثیت کو بیان کرے۔

(ب) اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان دو اجزاء ماہیت اور وجود سے مل کر بنا ہے تو اس سے مراد، دو خارجی اجزاء نہیں ہیں جو ایک دوسرے سے مل کر ترکیب پاتے ہوں۔ان عناصر کے مانند جو ایک دوسرے سے مل کر ترکیب پاتے ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ نقاد ذہن اپنی خاص لیبارٹری میں ایک خارجی چیز کو، دو چیزوں میں۔جن میں سے ایک چیز اس کے وجود کا تعارف کراتی ہے، اور دوسرے چیز اس کی ہستی کی ترجمانی کرتی ہے۔تجزیہ وتحلیل کرتی ہے۔اس قسم کی ترکیب کیلئے ذاتِ خدا میں کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اگر خدا کی ذات، دو چیزوں۔ایک ذات وماہیت نامی اور دوسری وجود وہستی نامی۔سے ترکیب پائی ہو تو اس صورت میں عقل اپنی مخصوص جستجو سے سوال کرے گی، کہ وہ خدا جس کی ذات میں وجود وہستی موجود نہیں تھی، اس نے اپنی ذات سے عدم کو دور کر کے لباس ہستی کیسے پہنا؟

اس موقع پر علت ومعلول کے قانون کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں کوئی علت فرض کرنا پڑے گی جس نے اس کی ذات کو ہستی بخشی ہے اور اپنے سے خارج علت کی طرف محتاج موجود باقی مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہی ہوگا۔اس بناء پر علماء کہتے ہیں کہ خدا کی ذات ماہیت سے بھی پاک ومنزہ ہے اور وہ عین ہستی مطلق ہے۔

۳۔صفاتِ خداوندی[1] اس کی عین ذات ہیں

اس میں شک نہیں کہ خدا عالم، قادر اور حیّ جیسی صفات کا مالک ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ صفات ازل سے خدا کے ساتھ تھیں یا یہ بعد میں وجود میں آئی ہیں؟

---

[1]۔اس بات پر توجہ رہنی چاہیے کہ اس حصہ میں زیر بحث ذاتِ خدا کی صافات ہیں، مثلاً علم وغیرہ نہ کہ صفات افعال جیسے رازقیت۔

اورازلی ہونے کی صورت میں کیااس کی صفات زائد برذات ہیں اوراصطلاح کے مطابق ذات اورصفات کے درمیان کوئی سرحد موجود ہے یااس کی صفات اس کی عین ذات ہیں؟

صفات کے ازلی یاحادث ہونے کے بارے میں اسلامی متکلمین کا''کرامیہ'' نامی صرف ایک گروہ ۔جو محمد بن کرام سبستانی کا پیرو ہے۔حدوث صفات کا معتقد ہےان کا کہنا یہ ہے کہ ابتداء میں ذات خدا میں یہ صفات موجود نہیں تھیں، بلکہ بعد میں پیدا ہوئی ہیں۔[1]

اگر ہم اس گروہ کونظرانداز کردیں تو باقی کے تمام فلاسفہ اوراسلامی متکلمین نے،صفات کی قدامت وازلیت کوقبول کرلیا ہے۔

یہ بات کہے بغیر ظاہر ہے کہ کرامیہ نامی اوراس کے جیسے بہت سے گروہ تمام کے تمام بنی عباس کی وقتی سیاست کے ساختہ وپرداختہ تھے،تاکہ مفکرین اسلام علماءکواس قسم کے مباحث میں مشغول رکھیں اورخود بےفکر ہوکر آرام وسکون کے ساتھ ملت اسلامی پرحکومت کرتے رہیں اوران گروہوں میں سے بہت سے جووقتی سیاست کی پیداوار تھے،ختم ہو چکے ہیں اوران کا کوئی اثراورنام ونشان سوائے علم کلام کی کتابوں اورتاریخوں کی تحریر کے باقی نہیں رہا ہے۔

کرامیہ کے عقیدہ کا بے تُکا پَن

اگرذات خدا میں ازلی سے یہ صفات موجود نہ ہوں تو یقیناًاس قسم کی صفات ممکن وحادث ہونگی اور ہرممکن الگ علت کا محتاج ہے لہٰذااب یہ دیکھنا پڑے گا کہ ان صفات کووجود میں لانے والاکون ہے یہاں پرکئی احتمال ہیں جوسب کے سب عقل وخرد کی نگاہ میں باطل اورغلط ہیں۔

۱۔خودبخود وجود میں آئی ہوں

۲۔خدا انہیں وجود میں لایا ہو

۳۔کوئی دوسرا فرد انہیں وجود میں لایا ہو

اور یہ تینوں احتمال باطل ہیں اب ہم ان تینوں کے بے بنیاد ہونے کو بیان کرتے ہیں۔

یہ بات ہرگزممکن نہیں ہے کہ کوئی چیزخودبخود وجود میں آجائے اور''علیت اورمعلولیت'' کا قانون،جوقوانین عقل میں سے انتہائی قیمتی اورمحکم واستوارترین قانون ہےاس احتمال کو باطل اورغلط قرار دیتا ہے۔

دوسرا احتمال بھی پہلے احتمال کے مانند ہے کیونکہ جس ذات میں علم وقدرت وحیات موجود ہی نہیں تھی اس نے اپنے اندران صفات کو پیدا کرکے کیسے ایجاد کیا۔

تیسرا احتمال بھی باطل ہےاور بے بنیاد ہے کیونکہ توحید ذات کے حکم کے مطابق اور یہ کہ اس کے سوااورکوئی خدا نہیں ہے لہٰذا دوسرا کوئی

---

[1] ۔الاسفارالاربعۃ۔ج۶ص۳۲۱

بھی ایسا نہیں ہے کہ وہ خدا کی صفات کا پیدا کرنے والا ہو۔اسی بناء پر فلاسفہ اور متکلمین اسلام نے اس بات کو قبول کیا ہے کہ خدا کی صفات اس کی ذات سے جدا نہیں ہیں اور ذات کی طرح قدیم اور ازلی ہیں۔

اب جب کہ صفات خدا کا قدم اور ازلیت ثابت ہوگئی تو یہاں ایک اور بحث باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا یہ قدیم اور ازلی صفات ،لازم اور زائد برذات ہیں، جیسا کہ مسلمان متکلمین کا ایک گروہ مثلاً ''اشاعرہ'' کہتے ہیں [1] یا یہ کہ یہ صفات عین ذات اور اسے تشکیل دینے والی ہیں اور ذات وصفات کا ایک سے زیادہ مصداق نہیں ہے۔تحقیق وجستجو کیلئے ہمیں یہاں تھوڑا سا ٹھہرنا پڑے گا تا کہ دونوں اقوال کا فرق واضح ہوجائے اس کے بعد ہم چراغ عقل کی روشنی میں راہ کو چاہ سے تمیز دیں۔

دونوں اقوال کا فرق

پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ دونوں اقوال میں فرق کہاں ہے؟ مطلب کی وضاحت کیلئے ہم چند امور بیان کرتے ہیں۔

۱۔جب ہم کہتے ہیں: خدا عالم ہے، تو لفظ ''خدا'' اس کی ذات کی ترجمانی کرتا ہے اور لفظ ''عالم'' اس کے اوصاف میں سے ایک صفت کو بیان کرتا ہے۔اس صورت میں ان لوگوں کا مقصد، جو یہ کہتے ہیں کہ اس کی صفات اس کی ذات کے ساتھ متحد ہیں یہ ہے کہ خدا کے مفہوم اور عالم کے مفہوم کا تحلیل ذہنی کے مقام میں اتحاد نہیں ہے یعنی وہ یہ کہنا نہیں چاہتے کہ خدا کا مفہوم عالم کے مفہوم کے ساتھ ایک ہے اور اسی طرح کی دوسری صفات ہیں کیونکہ اس میں شک نہیں ہے کہ خدا کا مفہوم عالم کے مفہوم کے غیر ہے۔ [2]

۲۔جب ہم کہتے ہیں''افلاطون عالم ہے'' پھر ہم پلٹ کر خارج پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ افلاطون کا علم ودانائی اس کے وجود سے جدا نہیں ہے یعنی ہم خود اس کی طرف کے علم سے الگ اور اس کے علم کی طرف اس کے وجود سے جدا اشارہ نہیں کر سکتے اور یہ نہیں کر سکتے کہ یہ افلاطون ہے اور یہ اس کا علم ودانش ہے بلکہ اس کی ذات وصفات خارج میں ایک دوسرے سے متحد ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا مقصد جو یہ کہتے ہیں کہ صفات خدا اس کی ذات کے ساتھ متحد ہیں کیا ہے؟ کیونکہ اس وضاحت سے جو بیان ہوچکی، مفہومی تحلیل کے لحاظ سے کسی بھی مورد میں ان کے درمیان اتحاد موجود نہیں ہے اور خارج اور عینیت کے لحاظ سے صفات کا ذات کے ساتھ اتحاد، خدا کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتا، بلکہ صفت کا موصوف کے ساتھ اتحاد تمام موجودات میں حکم فرما ہے چہ جائیکہ خدا میں۔مثلاً ہم کہتے ہیں کہ صدف سفید ہے، شہد میٹھا ہے اور اسی طرح دوسری چیزیں تو ان مثالوں میں صدف کی سفیدی خود اس کے ساتھ اتحاد و یگانگت رکھتی ہے اور شرینی کی طرف شہد سے ہٹ کر ہرگز اشارہ نہیں کیا جا سکتا ہے اور اس طرح ہے صدف کی سفیدی۔اس سوال کا جواب یہ ہے کہ خدا کی ذات کے،اس کے اوصاف کے ساتھ اتحاد کا مقصد صدف کے سفیدی کے ساتھ ، یا افلاطون کے اس کے علم ودانش کے ساتھ

---

[1] ۔کشف المراد ص ۱۸۱، اسفار ج ۶ ص ۱۲۳

[2] ۔اسی لئے فلسفہ اسلامی میں کہتے ہیں: موضوع اور محمول کی مفہوم کے لحاظ سے مغائرت ہے لہٰذا ان کے درمیان کوئی وحدت نہیں ہے۔

اتحاد سے مختلف ہے بلکہ یہ ایک خاص اتحاد ہے جو اس کے غیر میں موجود نہیں ہے اور اسی مطلب کی وضاحت آپ ابھی ملاحظہ کریں گے۔
۳۔ یہ ٹھیک ہے کہ افلاطون کا علم خود اس کی ذات کے ساتھ ایک قسم کا اتحاد رکھتا ہے لیکن اس کی ذات کے ساتھ تمام مراحل ذات میں ہرگز اتحاد نہیں رکھتا، بلکہ یہ اتحاد ذات کی سطحی اور ظاہری مراحل میں اتحاد ہے اس کا گواہ اور شاہد یہ ہے کہ افلاطون ایک زمانے تک معاشرے کے اندر رہتا تھا، لیکن وہ اس علم کا حامل نہیں تھا پھر اس کے بعد اس نے علم و دانش حاصل کیا یہ صحیح ہے کہ اس نے علم و دانش کی صفت کے حصول کے بعد اس صفت کے ساتھ ایک قسم کا اتحاد اور یگانگی پیدا کر لی، لیکن یہ اتحاد ایسا نہیں ہے کہ صفت نے اس کی ذات اور حقیقت میں نفوذ کر لیا ہو اور وہ خود اس کی ذات بن گئی ہو۔

دوسرے لفظوں میں: افلاطون کی انسانیت کا قوام اور اس کی ذات کو تشکیل دینے والے عوامل وہی ہیں جو دوسروں میں بھی پائے جاتے ہیں اور وہ وہی حیوان ناطق ہونا ہے لیکن اس کا علم و دانش اس کی انسانیت کے چہرے پر ایک ایسا زیور ہے جس نے اُسے برتری بخشی ہے۔ فرض کریں ایک عمارت ہے جس کی تعمیر کا کام اختتام کو پہنچ گیا ہے اس میں صرف نقاشی کی ضرورت ہے کہ اس کے ظاہری حصہ کو رنگ و روغن کریں تو اس موقع پر اس عمارت کے در و دیوار پر ہر قسم کا نقش و نگار اس کے جمال و زیبائی و خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے اس موقع پر یہ کہنا درست ہے کہ رنگ، در و دیوار سے جدا نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ گھر کی حقیقت یا در و دیوار کی حقیقت کو تشکیل دینے والا بھی نہیں ہے کیونکہ گھر بنانے والے عناصر وہی لوہا سیمنٹ، چونا اور اینٹ ہے نہ کہ رنگ و روغن۔

اس بناء پر در و دیوار کا رنگ و روغن کے ساتھ اتحاد جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ گھر کے دروازے نیلے رنگ کے ہیں یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ رنگ در و دیوار کی واقعیت میں نفوذ کیے ہوئے ہے اور اس کی واقعیت کو تشکیل دینے والا ہے بلکہ رنگ نے دروازے کے اُوپر کے چھلکے اور دیوار کے اُوپر کے حصہ سے اتحاد و یگانگی پیدا کی ہوئی ہے نہ کہ اس کی ذات اور حقیقت کے ساتھ اور اسی قیاس پر ہے صدف کی سفیدی، سیب کی سرخی اور گلاب کی زردی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان موارد میں اتحاد اس معنی میں نہیں ہے کہ عارض معروض کی ذات کا جزء بن جاتا ہے، بلکہ وہ معروض کے وجود کے کچھ مراحل کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے وہ اس کے ساتھ ایک ہے لیکن اس کی ذات اور حقیقت میں داخل نہیں ہے۔ اس بناء پر خدا کی صفات کے اس کی ذات کے ساتھ متحد ہونے سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ صفات ذات سے جدا نہیں ہیں اور بعض مراحل میں ذات کے ساتھ اتحاد رکھتے ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ صفاتِ خدا ذات کو تشکیل دینے والے اور اس کا متن ہیں نہ کہ وہ اس کو عارض ہیں، وہ اس طرح نہیں کہ خدا ایک ذات رکھتا ہو اور کچھ صفات بلکہ اس کے اوصاف وہی اس کی ذات اور واقعیت ہیں۔

اگر ہم ذات سے الگ علم رکھتے ہیں تو وہ زائد علم کی وجہ سے ہے کہ اس سے ہم خارج سے آگاہ ہوتے ہیں، مثلاً انسان دیکھنے والی اور سننے والی چیزوں کا ان ذہنی صورتوں کے ذریعے ادراک کرتا ہے جو حواس خمسہ کے ذریعہ اس کی روح تک پہنچتی ہیں، اور اگر صورت ذہنی اس سے سلب کر لی جائے تو پھر اس کی ذات اپنی ذات سے خارج چیزوں کے ادراک پر قادر نہیں ہوگی لیکن اس کے باوجود اس کی ذات محفوظ ہوگی۔
لیکن چونکہ خدا کی ذات عین علم ہے اور اس کا علم اس کی ذات پر زائد نہیں ہے وہ اسی ذات کے ساتھ تمام دیکھنے اور سننے والی

اور دوسری چیزوں سے واقف اور آگاہ ہوتا ہے اور خدا سے علم وقدرت کے سلب ہونے کا مفروضہ اس کی ذات کے عدم اور نفی کا مفروضہ ہے۔
اس بناء پر صفات کے ذات سے اتحاد کا مقصد، وہی ذات کی صفات کے ساتھ عینیت ہے تو اس صورت میں اس کی ذات عین علم ہے، عین قدرت ہے عین حیات ہے و......، یہ بات نہیں ہے کہ ذات اپنے لئے ایک الگ مقام رکھتی ہے اور یہ صفات ذات کو عارض ہوتے ہیں اور ذات کیلئے لباس کی مانند ہیں۔

اشاعرہ کے نظریہ پر تنقید

اس گروہ کے نظریہ پر۔ جو ذات وصفات کے درمیان ایک سرحد کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس کی صفات کو اس کی ذات پر زائد خیال کرتے ہیں۔ واضح ترین تنقید یہ ہے کہ اس نظریہ کی بناء پر یہ کہنا پڑے گا کہ قدیم اور واجب بالذات ہونا، خدا کی ذات میں منحصر نہیں ہے بلکہ ایک قدیم ازلی کے بجائے آٹھ قدیم وجود رکھتے ہیں اشاعرہ جیسے گروہ جو عیسائیوں کی تثلیث سے فرار کرتے ہیں بے خبری اور لاشعوری طور پر ''قدماء ثمانیہ'' (آٹھ قدیموں) کو ماننے لگ گئے ہیں حالانکہ توحید ذات ہمیں ایک قدیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

صفات کی خدا کے ساتھ وحدت کی دلیل

جب ہم کہتے ہیں کہ ذاتِ خدا اس کا عین علم وقدرت ہے تو اس صورت میں خدا اپنی آگاہی اور کسی چیز کے ایجاد کرنے میں غیر کا محتاج نہیں ہوگا لیکن اگر اس کے صفات زائد بر ذات ہوں تو وہ علم وآگاہی اور قدرت وتوانائی میں اپنے غیر کا محتاج ہوا اور احتیاج ونیاز مقام خدا کے لائق نہیں ہے، یہ ٹھیک ہے کہ اشاعرہ یہ کہتے ہیں کہ صفات خدا ہمیشہ ازلی اور ذاتِ خدا کے لیے لازم رہے ہیں لیکن اس کے لئے لازم ہونا اس کی عین ذات کا غیر ہونا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا خود اپنی ذات وآگاہی علم کا سے مدد حاصل کرے اور خارج میں کسی چیز کو ایجاد کرنے کیلئے اپنی ذات سے خارج کسی اور قدرت سے مدد حاصل کرے۔ ذات کے ساتھ صفات کی وحدت کے دلائل صرف اسی دلیل میں منحصر نہیں ہیں لیکن ہم صرف اسی پر اکتفا کر رہے ہیں۔

صفات کا تعدّد ذات کی بساطت کے ساتھ کس طرح سازگار ہے؟

گذشتہ دلائل نے ہمیں اس کی بساطت اور ہر قسم کی خارجی اور عقلی ترکیب سے پاک ومنزہ ہونے کی طرف رہنمائی کی ہے تو اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خدا کی صفات کا تعدد ذات کی بساطت کے سامنے کس طرح سازگار ہے کیونکہ صفات کے تعدد کا نتیجہ متعدد صفات سے ذات کی ترکیب ہے۔

جواب

اگر ان صفات میں سے ہر ایک خدا کی ذات کے ایک حصہ کو تشکیل دیتی تو اس صورت میں ذاتِ خدا کے مرکب ہونے کی گنجائش تھی لیکن اگر ان صفات میں سے ہر ایک اس کے سارے وجود کو تشکیل دیتی ہو تو پھر اس صورت میں اس مرکب ہونے کا خیال کرنے کی کوئی علت باقی نہیں رہتی ۔ کیونکہ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ کوئی چیز اپنے بے پایاں وغیر متناہی کمال کی وجہ سے اس حد پر ہو کہ اس کا سارا کا سارا وجود ہی علم وقدرت وحیات ہو اور اس کی ذات میں کوئی کثرت بھی پیدا نہ ہو، اگر کوئی کثرت ہے بھی تو وہ مفاہیم ذہنی کے مقام میں ہے خارج میں اور مقام عینیت میں نہیں ہے بلکہ خارج میں ،خدا میں علم کا مصداق ہی قدرت کا مصداق ہے اور وہ دونوں حیات کا مصداق ہیں۔عالم ممکنات میں اس کی مثال یہ ہے کہ ہمارا سارا وجود مخلوق خدا بھی ہے اور معلوم خدا بھی ہے، یہ بات نہیں ہے کہ ہمارا ایک جزء تو معلوم اور دوسرا جزء اس کی مخلوق ہے۔

تقریب ذہنی کیلئے نور روشنی پر نظر ڈالیں ،درخشندگی ،روشنی ،حرارت اور گرمی نور کے خواص میں سے ہے تو کیا کاشفیت اور روشنی دینا اس کے وجود کے کسی ایک گوشہ کے ساتھ مربوط ہے یا یہ بات ہے کہ نور روشنی کا سراپا کاشفیت اور درخشندگی ہے جیسا کہ اس کا سراپا حرارت وگرمی ہے۔

وہ آیات جو اِن مسائل پر گواہی دیتی ہیں

یہاں تک تینوں مسائل تحلیل عقلی کے لحاظ سے واضح طور پر ثابت ہو گئے اور معلوم ہو گیا کہ:

۱۔خدا کی ذات خارجی ترکیب سے پاک ومنزہ ہے۔

۲۔اس کی ذات عقلی ترکیب سے مبرا ہے۔

۳۔خدا کی صفات اس کی عین ذات ہے۔

تینوں مطالب کی تشریح میں ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ اگر حقیقت اس کے علاوہ ہو تو پھر اس صورت میں خدا کی پاک ذات کو احتیاج

و نیاز کی ضرورت پڑ جائے گی، حالانکہ واجب الوجود خدا کی پاک ذات ہر قسم کے نیاز و احتیاج سے منزہ و مبرا ہے اب ہم تینوں مطالب کیلئے قرآنی دلائل کو مطالعہ کیلئے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ وہ غنی مطلق ہے

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن خدا کی کس طرح توصیف کرتا ہے قرآن خدا کی سترہ موقعوں پر غنا و بے نیازی کے ساتھ توصیف کرتا ہے اور کہتا ہے۔

۱۔ وَاللهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۲۔ اللهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۳۔ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۴۔ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ۵۔ سُبْحٰنَهٗ هُوَ الْغَنِيُّ ۶۔ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ............[۱]

اور ایک آیت میں تمام لوگوں کو فقیر اور خدا کو غنی اور بے نیاز کہا ہے جہاں کہتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللهِ ۚ وَاللهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾

''اے لوگوں تم سب کے سب خدا کی طرف نیاز منداور محتاج ہو اور صرف اللہ ہی وہ ہے جو بے نیاز اور لائق حمد ہے۔'' (فاطر۔۱۵)

کیا خدا کے غنی ہونے کے لوازمات میں سے ایک یہ نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ وہ اپنے وجود و ہستی میں اپنے علم و قدرت میں اپنی ذات کے علاوہ کسی کا محتاج نہیں ہے اور ان مراحل میں نیاز و احتیاج، شدید ترین نیاز و احتیاج ہے اور ہم گذشتہ بیان میں واضح کر چکے ہیں کہ ذات کی عقلی اور خارجی اجزاء سے ترکیب کا لازمہ یہ ہے کہ وہ ذات ان اجزاء کی نیاز منداور محتاج ہو جیسا کہ اس کی صفات کا اس کی عین ذات نہ ہونا اپنی ذات سے خارج علم و قدرت کی طرف نیاز مند اور محتاج ہونے کی نشانی ہے اور چونکہ صفحہ ہستی میں صرف وہی دانا اور بے نیاز مطلق ہے لہٰذا سے اس قسم کے خیالات سے پاک و منزہ ہونا چاہیے۔

وہ ''احد'' ہے

اسلامی لغت شناس کہتے ہیں:

''احد'' اصل میں ''وحد'' تھا[۲] یہ لفظ ایک خاص معنی رکھنے کی بناء پر اس کے ساتھ خدا کے سوا کسی کی توصیف نہیں کی جا سکتی۔[۳]

---

[۱]۔ سورہ بقرہ ۲۶۳، ۲۶۷ آل عمران۔ ۹۷، انعام ۱۳۳۔ یونس، ۶۸، نمل ۴۰ وغیر کی طرف رجوع کریں۔

[۲]۔ المقدیبس ج، ا۔ ص ۶۷

[۳]۔ قاموس۔ ج، ا ص، ۳۴۳ ط مصر

جب یہ لفظ نفی کے سیاق میں استعمال ہو تو پھر اس کا اطلاق غیر خدا پر ہوتا ہے، مثلاً ''ما جائنی من احد''لیکن اگر یہ اثبات کی صورت میں استعمال ہو تو پھر یہ مضاف کی صورت میں استعمال ہوتا، مثلاً: ''احدھم. احدعشر ''اور غیر مضاف ہونے کی صورت میں اس کا صرف خدا کے بارے میں اطلاق ہوتا ہے، مثلاً: ''قل ھو اللہ احد''[۱]

مشہور لغت شناس ازہری کہتا ہے:

ان الاحد صفة من صفات الله استاثر بها فلا یشرکه فیها شیء من الکائنات ویأتی کلام العرب بمعنی الاول کیوم الاحد

احد خدا کی مخصوص صفات میں سے ہے اُس نے اسے اپنے ساتھ مختص کیا ہے کوئی موجود اس کے ساتھ اس صفت میں شریک نہیں اور بعض اوقات عربی زبان میں ''اول'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً وہ ہفتہ کے پہلے دن کو ''یوم الاحد'' کہتے ہیں۔

احد کیلئے کئی تفسیریں بیان کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ:

''الاحد'': الذی لا یتجزأ ولا ینقسم فی ذاته ولا فی صفاته [۲]

''احد اسے کہا جاتا ہے جس کی ذات وصفات میں تجزیہ وتحلیل کی گنجائش نہ ہو۔''

جزائری کتاب ''فروق اللغات'' میں ''واحد'' اور ''احد'' میں فرق کی وضاحت کرتے ہوئے اس طرح فرماتے ہیں: ''واحدُ اس موجود کو کہتے ہیں جس کا کوئی مثل ونظیر نہ ہو جب کہ ''احد'' اس موجود کو کہتے ہیں جس کا تجزیہ وتحلیل نہ ہو سکے۔[۳]

مرحوم شیخ حبیب اللہ ساوجی کاشانی نے سورہ اخلاص کی تفسیر میں تقریباً اُوپر والا مضمون ہی پیش کیا ہے۔[۴]

استاد عالی قدر حضرت علامہ طباطبائی دام ظلہ اس بارے میں اسی طرح فرماتے ہیں: صفت احد کے ساتھ ایسے موجود کی توصیف کی جاتی ہے جو نہ تو خارج میں اور نہ ہی ذہن میں کسی قسم کی کثرت کو قبول نہ کرے اور کسی گنتی اور شمار میں نہ آئے، لیکن لفظ واحد میں ہرگز یہ خصوصیات

---

[۱] ۔ مفردات راغب مادہ احد

[۲] ۔ ان الواحد الفرد الذی لم یزل وحدہ ولم یکن معه اٰخر, والاحد الفرد الذی الیتجزأ ولا یقبل لانقسام, فروق اللغات، ط نجف ص ۳۷

[۳] ۔ تفسیر سورۂ اخلاص ص۔ ۲۹

[۴] ۔ چونکہ واحد کا معنی ایسا ایک ہے جس کا دوسرا اور تیسرا بھی ہو، ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ توحید سے مراد توحید عددی نہیں ہے بلکہ یہاں وحدت اسی معنی میں ہے کہ وہ یگانہ ہے اور اس کا کوئی مثل ونظیر نہیں ہوسکتا، وہ ایک ہے یعنی اس کا دوسرا نہیں ہے۔

موجود نہیں ہیں، واحد اس چیز کو کہا جاتا ہے کہ جس کیلئے دوسرا اور تیسرا ہو،[1]

یہ حقیقت ''احد'' اور ''واحد'' کے الفاظ کے نفی کے سیاق میں استعمال پر غور کرنے سے واضح طور پر معلوم ہوجاتی ہے اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ ''ماجائنی من القوم احد'' تو اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص نہیں آیا نہ ایک نفر نہ دو نفر نہ تین نفر، اور اصطلاح کے مطابق یہ نفی جنس کے معنی دیتا ہے لیکن اگر وہ یہ کہے کہ: ماجائنی واحد منھم'' تو اس جملہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک آدمی نہیں آیا، لیکن یہ دو آدمیوں یا تین آدمیوں کے آنے کی نفی نہیں کرتا، چونکہ احد میں اس قسم کی خصوصیات پائی جاتی ہیں اس وجہ سے اسکو خدا میں منحصر صفت شمار کیا گیا ہے اور خدا کے علاوہ کسی کی بھی اس صفت کے ساتھ توصیف نہیں کی جاسکتی، اور اسی نکتہ کی بناء پر امام فرماتے ہیں۔

خدا کے علاوہ وحدت کے مصداق بہت کم ہیں۔[2]

آپ کے کلام کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ سورہ اخلاص میں خدا کی صفت ''احد'' سے توصیف کے بعد ''وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ'' کے جملہ کو لایا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ اس جملہ کا مفاد و مطلب خدا کی ذات میں بھی اور فعل میں بھی ''مثل و نظیر کی نفی'' ہے یعنی نہ تو کوئی موجود خدا کی مانند ہے اور نہ ہی کوئی خالق و مدبر اس کی مانند ہے۔

جب خدا کیلئے ہر قسم کے مانند و مثل کی اس جملہ کے ذریعہ نفی ہوگی تو پھر یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم ''هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' کے جملہ کی اس طرح تفسیر کریں اور یہ کہیں کہ وہ ایک ہے اور اس کا کوئی مثل و نظیر نہیں ہے کیونکہ اس کا نتیجہ ایک ہی مضمون کی ایک ہی سورت میں تکرار ہے اور وہ بھی بہت ہی مختصر سے فاصلہ میں۔ اس بناء پر یہ کہنا پڑے گا کہ پہلا جملہ تو ہر قسم کے تجزیہ و ترکیب کی نفی کے معنی میں ہے اور دوسرا جملہ مثل و نظیر کی نفی کے معنی میں ہے۔ اس تفسیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے ان تین مسائل میں سے جو ہم نے آغازِ بحث میں بیان کیے تھے وہ مسائل اس آیت سے معلوم ہوجاتے ہیں۔

کیونکہ ذات کی وحدت کا لازمہ یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی خارجی اور ذہنی ترکیب سے منزہ ہو لیکن تیسرا مسئلہ جو وہی صفات کا عین ذات ہونا ہے اس کے اثبات کا طریقہ وہی غنی مطلق ہونے کی صفت ہے جسے قرآن بہت سی آیات میں خدا کیلئے ثابت کرتا ہے اور سورہ توحید میں اس کی صمد ہونے کے ساتھ۔ جس کے معانی میں سے ایک ہر محتاج و نیازمند کا کعبہ مقصود ہے۔ توصیف کرتا ہے اگر وہ ہر سائل اور نیازمند کا کعبہ مقصود ہے اور اس کے سوا اور کوئی کعبہ مقصود نہیں ہے تو پھر اس کے صفات اس کے عین ذات ہونے چاہئیں، ورنہ وہ علم و آگاہی کے حصول اور امور کی انجام دہی کیلئے اپنی ذات سے خارج کے علم اور اپنے وجود سے باہر کسی قدرت کا نیازمند اور محتاج ہوگا اور اس صورت میں وہ علی الاطلاق غنی اور اُمیدوں کا کعبہ ہونے سے خارج ہوجائے گا، بلکہ خود اس کیلئے ایک دوسرے مقصود کی ضرورتی ہوگی۔

یہاں تک ہم واضح طریقہ سے آیات قرآنی سے ذات کی بساطت اور وحدت کو ثابت کرچکے ہیں اب تکمیل مطلب کے لئے

---

[1] ۔مجمع البیان، ج۵، ص ۵۶۴ طبع صیدا

[2] ۔المیزان ج ۲۰، ص ۵۴۴، کلام امام کا متن اس طرح ہے: کل مسمی بالوحدۃ غیرہ قلیل

خاندانِ رسالتؑ کی احادیث سے اس موضوع میں مدد لیتے ہیں اس سلسلہ میں احادیث اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ انہیں یہاں پیش کیا جائے ہم ان کے چند ایک نمونے یہاں پیش کرتے ہیں۔ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں: ہمارے پروردگار کیلئے دو قسم کی وحدت ہے:

۱۔ھو واحد لیس فی الاشیاء شبه

۲۔انه احدی المعنی یعنی به انه لا ینقسم فی وجود لا عقل ولا وهم [1]

۱۔خدا ایک ہے یعنی اس کیلئے کوئی مثل ونظیر نہیں ہے۔

۲۔خدا احد ہے یعنی اس کا وجود نہ خارج میں تقسیم ہوسکتا ہے، نہ ہی عقل میں قابل تجزیہ ہے اور نہ ہی وہم وخیال میں قابل تحلیل ہے آخری جملہ خدا کی بساطت کو واضح طور پر ثابت کرتا ہے اور ہر قسم کی ترکیب خارجی اور ترکیب وہمی وعقلی (جیسے حد وماہیت) کی نفی کرتا ہے، امام صادق علیہ السلام ایک حدیث میں خدا کی اس طرح توصیف فرماتے ہیں:

وصانع الاشیاء غیر موصوف بحد مسمی

اشیاء کو وجود میں لانے والا ہرگز کوئی حد اور معین اندازہ نہیں رکھتا۔

یہ حدیث ممکن ہے کہ حد اور ماہیت کی طرف ناظر ہو اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مقصود خدا کے انتہا کو قبول کرنے کی نفی ہو۔ آٹھویں امام علیہ السلام فرماتے ہیں۔

تبجهیره الجواهر عرف ان لا جوهر له

''جواہر کا پیدا کرنے والا ہر قسم کے جواہر اور جوہر نامی کوئی حد نہیں رکھتا۔''

ان حادیث سے ذیل میں بیان کردہ دونوں مسائل کا واضح طور پر استفاد کیا جاسکتا ہے۔

۱۔خارجی جزء کی نفی

۲۔عقلی جزء کی نفی

لیکن تیسرا مسئلہ کہ اس کی صفات اس کی عینِ ذات ہیں تو اس بارے میں ذیل کی احادیث کی طرف توجہ فرمائیں۔ امیر المومنینؑ ایک طویل خطبہ کے ذیل میں فرماتے ہیں:

وکمال الاخلاص له نفی الصفات عنه الشهادة کل صفة انها غیر الموصوف وشهادة کل موصوف انه غیر الصفة فمن وصف الله

---

[1] ۔توحید صدوق ص ۸۴۔۸۳

سبحانه فقدقرنه ومن قرنه فقدثناه ومن ثناه فقدجزأه ومن جزأفقدجهله

''توحید خالص یہ ہے کہ ''زائد برذات'' صفات کا جومخلوق کا شیوہ ہے اس سے سلب کریں کیونکہ ہرقسم کی ایسی صفت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے اور ہر موصوف بھی یہی گواہی دیتا ہے کہ اس کا وجود اس کی صفت کے وجود کا غیر ہے جب ہم خدا کی مخلوق کی طرح سے توصیف کرینگے اور اس کی صفات کو زائد برذات سمجھیں گے تو ہم نے اس کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے اس کو دو سمجھ لیا ہے اور جو شخص اُسے دوگانہ سمجھے اور یہ کہے کہ اس کی ذات اس کی صفت کا غیر ہے تو وہ اس کیلئے جزء کا قائل ہو گیا اور اس نے اسے مرکب سمجھ لیا ہے اور جس کی معرفت خدا کی نسبت اس طرح کی ہو تو مسلمہ طور پر اس نے خدا کو نہیں پہچانا۔

امامؑ نے اپنی اس حکیمانہ گفتگو میں ایک خاص برہان کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس موضوع میں اعلیٰ ترین فلسفی براہین میں سے ایک ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے۔

اگر ہم ذات وصفت کو ایک سمجھیں تو ہم نے خدائی ذات کو ہر قسم کے تجزیہ اور ترکیب سے جو احتیاج و نیاز کی طرف منتھی ہوتی ہے منزہ قرار دیا ہے لیکن اگر اس کی ذات اس کی صفت کا غیر ہو اور وہ ایک دوسرے کے عارض ومعروض ہوں تو پھر طبعاً دوئیت اور ترکیب ظاہر ہوگی اور ذات وصفت سے مرکب خدا اپنے اجزاء کا محتاج ہوگا حالانکہ وہ ہر قسم کی احتیاج و نیاز سے پاک ومنزہ ہے۔ اس بیان کی رو سے وہ آیت جس نے خدا کی بساطت پر گواہی دی تھی مثلاً: ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' وہ صفات کے عین ذات ہونے پر بھی گواہ ہوسکتی ہے کیونکہ ہر قسم کی زیادتی کے فرض کر لینے سے عارض ومعروض کے درمیان ایک قسم کی ترکیب وجود میں آجاتی ہے اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اللہ کا مصداق، ذات، علم اور قدرت کا مجموعہ ہے۔ اس سے قطع نظر ''اشاعرہ'' کے عقیدہ کے مطابق جو صفات خدا کو زائد برذات سمجھتے ہیں۔ ضروری ہے کہ خدا کے علاوہ بھی آٹھ اور قدیم ازلی ہمارے پاس ہوں تو اس صورت میں وہ آیات جو قدیم وازلی کی وحدت پر گواہی دیتی ہیں وہ اس نظریہ کی نفی کرنے والی بھی ہوسکتی ہیں۔

۲۔ امام صادق علیہ السلام نے ابوبصیر سے فرمایا:

لم یزل الله جل وعزربنا والعلم ذاته ولامعلوم واسمع ذاته لامسموع

وابصر ذاته ولا مبصر والقدرة ذاته ولا مقدور [1]

''ہمارا خدا ہمیشہ سے عالم تھا اور اس کا علم اس کا عین ذات تھا، باوجود یکہ معلوم (علم و جہان) نہیں تھا اور شنوائی و بنیائی و توانائی اس کے عین ذات تھی اگر چہ سنے جانے والی دیکھئے جانے والی اور مقدورات کا نام ونشان نہیں تھا۔

[1] ۔توحید صدوق ۔ص ۱۳۹

ساتواں حصہ

توحید در خالقیت

عالم میں ایک مستقل خالق کے علاوہ کوئی نہیں اور دوسرے علل واسباب کی آفرینندگی خدا کی طرف سے اکتسابی قدرت کا پرتو ہے۔

اس حصہ میں

۱۔ توحید افعالی سے کیا مراد ہے؟
۲۔ موجودات خصوصاً انسان کے آثار کے بارے میں معتزلہ کا عقیدہ کیا ہے؟
۳۔ معتزلہ کے عقیدہ پر قرآنی طریقہ سے تنقید۔
۴۔ موجودات عالم کی تاثیر کے بارے میں اشاعرہ کا نظریہ۔
۵۔ اشاعرہ کے عقیدہ پر آیاتِ قرآنی کے طریقہ سے تنقید۔
۶۔ قرآن علل طبیعی کے بارے میں تصریح کرتا ہے۔
۷۔ وہ آیات جو توحید در خالقیت کے بارے میں تصریح کرتی ہیں۔
۸۔ توحید در خالقیت کے بارے میں قرآن زیادہ زور کیوں دیتا ہے، حالانکہ زمانہ جاہلیت کے عرب اس بارے میں مخالف نہیں تھے۔
۹۔ توحید در خالقیت انسان کے اختیار وآزادی کے ساتھ کس طرح سازگار ہے؟
۱۰۔ خدا نے ارادہ ہی یہ کیا ہے کہ ہر معلول مخصوص علت سے، جو معلول کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو، صادر ہو۔
۱۱۔ اس بات پر قرآنی دلائل کہ عالم کا بس ایک ہی خالق ہے۔
۱۲۔ قرآنی براہین کی وضاحت
۱۳۔ بندوں کے برے افعال مخلوق خدا کس طرح ہو سکتے ہیں۔
۱۴۔ عالم کے لیے دو خدا بنانے کے لیے میدان ہموار کرنا۔
۱۵۔ بندوں کے برے اور قبیح کاموں کے دو جنبے ہیں۔
۱۶۔ شرور وآفات اور بلاؤں کے بارے میں ایک دقیق تجزیہ۔

توحید در خالقیت

توحید افعالی، کہ توحید در خالقیت اور توحید در ربوبیت بھی اسی کی شاخیں ہیں، کی حقیقت کے بارے میں کچھ بیان کرنے سے پہلے ہم ان نکات کا بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں، جو تمام مباحث توحید میں مفید ہیں۔

۱۔ توحید ذاتی، اس معنی میں کہ ذات پروردگار یکتا و یگانہ ہے اور اس کا کوئی مثل و نظیر نہیں ہے، اور اسی طرح سے توحید در عبادت ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی بھی عبادت و پرستش کے لائق نہیں ہے اور اس کے غیر کی پرستش شرک ہے اور توحید اسلامی کے دائرہ سے خروج کے برابر ہے اور اس پر ساری دنیا کے مسلمانوں کا اتفاق ہے اور توحید کی یہ دونوں اقسام، اسلامی اعتقاد کے اصول اولیہ کا جزء شمار ہوتی ہیں اور مسلمانوں میں سے کسی ایک شخص نے بھی، ان دونوں قسم کی توحید میں شک اور تردد نہیں کیا ہے۔

۲۔ ابن تیمیہ اور اس کے مکتب کے پیروکار مثلاً ''وہابی حضرات'' اولیاء خدا سے شفاعت طلب کرنا اور اسی طرح ان سے متوسل ہونے اور امداد طلب کرنے کو توحید در عبادت کی اصل کے ساتھ منافی سمجھتے ہیں، جب کہ دوسرے اسلامی فرقے اس قسم کی درخواستوں اور توسلات کو اصل توحید کے ساتھ منافی نہیں سمجھتے، اس بنا پر، ابن تیمیہ اور وہابی حضرات کا دوسرے اسلامی فرقوں کے ساتھ اختلاف، اصل توحید در عبادت میں نہیں ہے، یعنی یہ اصل سب کو یہ قبول ہے کہ غیر خدا کی عبادت نہیں کرنی چاہیے اور اس کے غیر کی پرستش شرک ہے اور توحید اسلامی سے خارج ہو جاتا ہے، بلکہ ان کا اختلاف عبادت و پرستش کے مصادیق میں ہے۔ ابن تیمیہ اولیاء خدا سے شفاعت طلب کرنے اور ارواح مقدسہ سے توسل اور مدد مانگنے کو ان کی عبادت خیال کرتا ہے، جب کہ اس گروہ کے علاوہ باقی مسلمان اس قسم کے کاموں کو ان کی عبادت نہیں سمجھتے، اور علمی اصطلاح کے مطابق، ان کا دوسرے تمام مسلمانوں سے اختلاف عبادت کے مصادیق میں ہے، نہ کہ اصل کلی میں (کہ غیر خدا کی عبادت شرک ہے)

۳۔ توحید صفاتی اور توحید افعالی کے بارے میں اہلسنت کے دو گروہ، معتزلہ اور اشاعرہ میں سے ہر ایک نے ان دو میں سے ایک کو لے لیا ہے اور دوسرے کا انکار کر دیا ہے، معتزلہ توحید صفات کے طرف دار ہیں اور کہتے ہیں کہ صفات خداوندی مثلاً علم، قدرت، حیات، ارادہ اور ادراک، ذات خداوندی کے علاوہ حقائق نہیں ہیں، بلکہ یہ اس کے عین ذات ہیں، جب کہ اشاعرہ صفات خدا کو غیر ذات اور زائد بر ذات سمجھتے ہیں۔

جب کہ توحید افعالی کے مسئلہ میں واقعہ اس کے برخلاف ہے۔ اشاعرہ خود کو توحید افعالی کے طرفدار سمجھتے ہیں اور معتزلہ اس کے منکر ہیں اور اشاعرہ توحید افعالی کی اس طرح سے تفسیر کرتے ہیں کہ جس سے ''جبر'' کا اظہار ہوتا ہے، اور وہ ''ماسوی اللہ کی علیت'' کی لغویت کا موجب بنتی ہے، جب کہ مکتب ''امامیہ'' میں توحید افعالی اس طرح سے ہے جو کسی طرح سے بھی انسان کی حریت، آزادی اور اختیار کے خلاف نہیں ہے، اور اس مطلب کی حقیقت، توحید در خالقیت کی بحث میں جو توحید افعالی کی ایک شاخ ہے، واضح ہوگی۔

اگر معتزلہ اپنے آپ کو اہل توحید کہتے ہیں تو وہ توحید ذاتی کی بناء پر نہیں، جو خدا کی یکتائی کے معنی میں ہے، اور نہ ہی توحید در عبادت کی

بنا پر اور نہ ہی توحید افعالی کی وجہ سے۔

کیونکہ پہلی دو قسم کی توحید میں تو مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہے ہی نہیں اور معتزلہ توحید در افعالی کے منکر ہیں اور اسے مانتے ہی نہیں، بلکہ اس توصیف کی وجہ و ہی توحید صفاتی کی طرفداری ہے کہ وہ خدا کی صفات کو اشاعرہ کے مقابلہ میں خدا کی عین ذات سمجھتے ہیں۔

معتزلہ توحید افعالی کے منکر کیوں ہیں؟

باوجودیکہ معتزلہ اپنے آپ کو اہل توحید جانتے ہیں لیکن وہ توحید افعالی کے منکر ہیں اور ان کے انکار کا سرچشمہ ان کے اصل ''عدل'' کا عقیدہ ہے، معتزلہ کہتے ہیں کہ کچھ کام ذاتی طور پر عدل اور کچھ کام بالذات ظلم ہیں، مثلاً مطیع وفرمانبردار کو جزاء دینا اور گنہگار کو سزا دینا عدل ہے جیسا کہ مطیع وفرمانبردار کو سزا اور گنہگار کو جزاء دینا ظلم ہے اور خدا عادل ہے ظالم نہیں ہے اس بناء پر وہ پہلی راہ کو اختیار کرتا ہے، دوسری راہ کو نہیں۔

بندہ کو گناہ پر مجبور کرنا، یا اس کو عاجز و ناتواں خلق کرنا اور اس کے ہاتھ پر گناہ کو خلق کرنا اور پھر اس کی سزا دینا ظلم ہے اور خدا ہرگز اس قسم کے عمل کا مرتکب نہیں ہوتا، کیونکہ ظلم قبیح ہے اور وہ ہرگز کوئی قبیح کام۔ جو اس کی خدائی کے شئون کے خلاف ہے، نہیں کرتا۔

اس اصل کی رو سے معتزلہ توحید افعالی کے منکر ہیں، کیونکہ وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ توحید افعالی کا لازمہ یہ ہے، کہ انسان اپنے افعال کا خود خالق نہ ہو، بلکہ خدا اس کے افعال کا خالق ہو، تو وہ اس صورت میں وہ انسان جس نے کسی کام کو انجام ہی نہیں دیا، کیسے جواب وہ اور سزا کا مستحق قرار پائے گا۔

چونکہ اشاعرہ نے اس بارے میں ان کی مشکل کو حل نہیں کیا ہے اور انہوں نے توحید افعالی کی خود اس طرح سے تفسیر کی ہے جس سے جبر لازم آتا ہے، اسی بناء پر گروہ معتزلہ اپنے انکار پر باقی رہے ہیں، لیکن اگر توحید افعالی کی توضیح اس طرح سے کی جائے جو خاندان رسالت کی احادیث اور صدر المتالہین کے مکتب فلسفی میں وارد ہوئی ہے، تو اس سے ہرگز جبر کا اظہار نہیں ہوتا اور وہ انسان کے اختیار اور آزادی کے بھی منافی نہیں ہوگی اور یہ حقیقت ابھی ابھی واضح ہو جاتی ہے۔

علمی اور فلسفی نکتہ نظر سے، نظام آفرینش، اسباب ومسببات کے ایک سلسلہ کی بنیاد پر استوار ہے اور جہان میں ہر موجود ایک علت کا مولد ہے، جو اسے اپنے پیچھے لے کر آتی ہے۔

چونکہ نظام عالم نظام امکانی ہے، اس طرح سے کہ امکان اور احتیاج و نیاز اس کی ذات کے ساتھ خمیر ہوا ہے اس بناء پر فقر و نیاز کبھی بھی اس سے منقطع نہیں ہوگا اور نتیجہ میں ہی نظام امکانی جو علتوں اور معلولات کے ایک سلسلہ سے مرکب ہوا ہے، اشیاء کی ذات اور ان کے آثار کے لحاظ سے، خدا کے ساتھ ہی قائم ہے اور اس میں کسی قسم کا استقلال نہیں ہوگا۔

اس صورت میں ''توحید افعالی'' کا معنی، ان نظاموں اور اسباب ومسببات کی خداوند عالم کے ساتھ وابستگی اور کام کی نوعیت کی شناخت وادراک ہی ہے اور یہ کہ ان علل کے کام، خدا ہی کے کام ہیں اور یہ اسی کی قدرت وارادہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں: موجوداتِ عالم، جس طرح اپنی ذات اور اصل ہستی میں استقلال نہیں رکھتے اور سب کے سب خدا کے ساتھ

قائم اور اسی کے ساتھ وابستہ ہیں، اسی طرح علیت و تاثیر میں بھی خود سے استقلال نہیں رکھتے اور خدا کی ''حول'' قوت اور ارادہ ومشیت سے کام کرتے ہیں، تو نتیجہ کے طور پر خدا نہ تو ذات میں کوئی شریک رکھتا ہے اور نہ ہی فاعلیت وعلیت میں، بلکہ مجموع ہستی میں ایک ہی مستقل فاعل اور ایک ہی علت قائم بہ نفس وجود رکھتی ہے اور وہ خدا ہے، اور دوسرے سارے اسباب اور فاعل، اپنی ذات اور وجود میں بھی اور تاثیر و فاعلیت میں اسی کے ساتھ قائم ہیں اور ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ'' کا جملہ ایک موحد کے عقیدہ کو بیان کرتا ہے۔

گروہ معتزلہ کا عقیدہ

توحید افعالی کا مسئلہ گروہ معتزلہ کے مقابلہ میں ہے جنہوں نے یہ تصور کرلیا ہے کہ تمام چیزیں خصوصیت سے انسان اپنی ذات میں اور وجود میں خدا کے ساتھ قائم ہے، اور وہی اس کے وجود و ہستی کا سرچشمہ ہے، جب کہ وہ اپنے فعل و تاثیر میں خود سے استقلال رکھتا ہے اور اس کا فعل اور کام خود اسی کے ساتھ مربوط ہے اور اس کا خدا کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔

اس گروہ کے نظریہ کے مطابق فاعل کا فعل اور اسباب کی تاثیر خود انہیں کو تفویض ہوئی ہے اور انہی کے سپرد کردی گئی ہے اور موجودات امکانی مقام تاثیر میں، خود ''اپنے آپ پر چھوڑ دیئے'' گئے ہیں اور حصہ میں انسان اور غیر انسان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس بات کی علت کہ اس گروہ نے ''توحید افعالی'' کے واضح دلائل کے برخلاف، اس قسم کا عقیدہ اپنایا ہے، یہ ہے کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ خدا کی مقدس ذات کو بندوں کے قبیح اور برے کاموں، مثلاً ظلم و ستم، قتل اور مار دھاڑ، زنا کاری اور ہر ناشائستہ کام سے پاک اور منزہ مانیں اور اس قسم کے کاموں کو خود بندوں کے ساتھ مربوط سمجھیں اور ان کا خدا سے تعلق منقطع کردیں اور آخر میں ان کا عذاب اور سزا عدل و دادِ الٰہی کے مطابق ہو۔

وہ یہ خیال کرتے تھے کہ اگر کسی سبب کی تاثیر اور سببیت، خدا کے ارادہ سے اور اسی سے پیدا ہوتی ہو تو اس صورت میں گنہگار افراد کو سزا دینا اور انہیں عذاب کرنا ''عدل الٰہی'' کی اصل کے برخلاف ہوگا۔ درحقیقت انہوں نے ایک اصل بنام ''عدلِ الٰہی'' کی حفاظت کے لیے، اس قسم کے عقیدہ کو۔ جو دلائل علمی، بہ بنیش فلسفی اور آیات و احادیث اسلامی کے برخلاف ہے۔ اپنا لیا ہے اور انسانوں اور دوسرے تمام عوامل کو ایک ایسے فاعل کے طور پر معرفی کرایا ہے جسے خود کو کوئی کام سپرد اور تفویض کردیا گیا ہو اور ایک مستقل فاعل کے بجائے لاکھوں مستقل فاعل اور ایک شریک کی جگہ لاتعداد شریک خدا کے فعل میں خیال کرلیے ہیں اور خدا کی عدل والی اصل کی حفاظت کرتے ہوئے شرک خفی اختیار کر بیٹھے ہیں۔ [1]

---

[1] معتزلہ کا تاثیر و سببیت میں علل و اسباب کے استقلال کا عقیدہ ایک قسم کا خفی اور پنہاں شرک ہے اور صرف علماء و محققین ہی اس کے شرک ہونے کو جان سکتے ہیں عوام الناس نہیں، اس بناء پر اس قسم کا اعتقاد توحید اسلامی سے خروج کا باعث نہیں بنتا مگر جب صاحب عقیدہ اس کے واضح مفاسد سے۔ جو اصل ہستی اور ذات میں علل کا استقلال ہے۔ آگاہ ہو اور اپنے عقیدہ پر ڈٹا رہے، تو اسلامی توحید سے خروج کا باعث ہوگا۔

معتزلہ کے عقیدہ پر تنقید

ان لوگوں کے لیے جو علمی بصیرت اور قرآن و حدیث سے آگاہی رکھتے ہیں، اس عقیدہ پر تنقید بہت ہی واضح و روشن ہے اور ہم اس سے پہلے کہ ''توحید در خالقیت'' سے مربوط آیات کے سلسلہ میں جو توحید در فعل کا ہی حصہ ہیں۔ بحث کریں، اختصار کے ساتھ اس نظریہ پر تنقید پیش کرتے ہیں۔

۱۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک موجود اپنی ذات اور ہستی میں تو غیر مستقل اور خدا سے وابستہ ہو، لیکن تاثیر و سببیت میں اپنے لیے استقلال رکھتا ہو، کیونکہ ذات میں وابستگی کی صورت میں وہ فعل و سببیت میں وابستگی کا موجب ہوگا۔

لیکن اگر فاعل اپنے فعل اور تاثیر میں کامل طور پر مستقل ہو، تو پھر اسے ذات اور اصل ہستی میں بھی مستقل ہونا چاہیے اور اشیاء کی اصل ذات اور ہستی میں استقلال کا اعتقاد رکھنا، ان کے واجب الوجود ہونے کا اعتقاد رکھنے کا موجب ہوگا اور اس قسم کا اعتقاد اصل توحید ذاتی کے ساتھ منافات رکھتا ہے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، انہوں نے خدا کو بندوں کے ناشائستہ افعال سے منزہ رکھنے کے لیے، اس قسم کا عقیدہ اپنایا ہے اور ایک قسم کے پہلے سے کیے ہوئے فیصلہ کی بناء پر شرک خفی کے بھنور میں پھنس گئے ہیں۔

۲۔ اس گروہ کو ذیل میں بیان کردہ آیت کے مفاد میں غور کرنا چاہیے:

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا﴿۱۱۱﴾ (اسراء)

''سب تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جس نے اپنے لیے بیٹا نہیں بنایا اور جہانداری اور ملک میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور نہ ہی ناتوانی کی وجہ سے تدبیر جہاں میں کوئی مددگار ہے، اسی کو بزرگ و برتر سمجھو۔''

''لم یکن له شریك فی الملك'' اس کے لیے تدبیر و جہانداری میں کوئی کمک اور مدد نہیں ہے'' کا جملہ، اس بات کا واضح ترین گواہ ہے کہ جہان آفرینش میں، کوئی فاعل اور کوئی سبب، چاہے وہ کسی بھی مرتبہ و حیثیت پر فائز ہو، اپنے فعل اور کام کو مستقل طور پر انجام نہیں دے سکتا، کیونکہ اس صورت میں وہی فاعل، تدبیر ملک اور جہانداری میں خدا کا شریک ہو جائے گا۔

قرآن جہان ہستی کی تدبیر میں، تدبیر کرنے والوں اور امور کے سرانجام دینے والوں کے ایک سلسلہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴿۵﴾ (نازعات)

''قسم ہے ان موجودات کی جو امر آفرینش کی تدبیر کرتے ہیں۔''

اب یہ مدبر اور مدیر کار کون ہے، کیا یہ وہی جہان خلقت کے علل طبیعی اور اسباب مادی ہیں، یا وہ فرشتے ہیں جو خدا کے حکم سے تدبیر

عالم میں مشغول ہیں، بہر حال قرآن کی تصریح کے مطابق یہ مدبرین امر اور کارگردان تدبیر میں مشغول ہیں، اب اگر وہ تدبیر عالم میں استقلال رکھتے ہوں اور ان کا کام خدا کے ساتھ مربوط اور اس کی مشیت سے قائم نہ ہو تو اس صورت میں یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے: "ولم یکن له شریك فی الملك ولم یکن له ولی من الذل"، وہ جہانداری میں کوئی شریک نہیں رکھتا، ان مدبرین سے بالاتر اور کون سا شریک ہوگا جو اس پر تکیہ کیے بغیر عالم کی تدبیر اور کارگردانی میں مشغول ہیں۔

۳۔ یہاں ایک لطیف نکتہ ہے، جو شیعوں کے عظیم آئمہ میں سے ایک امام حضرت موسیٰ بن جعفرؑ نے معتزلہ کے عقیدہ پر تنقید کے طور پر بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"القدریة ارادوا ان یصفوا الله عزوجل بعدله، فاخرجوه من قدرته وسلطانه"۔ [1]

''تفویض کے قائلین نے چاہا کہ خدا کی عدل و دادگستری کے ساتھ توصیف کریں، لیکن انجام کار اس کو قدرت و سلطنت سے ہٹا دیا۔''

امام نے مکتب معتزلہ کے قیام کے آغاز میں ہی، اس قسم کا عقیدہ اپنانے کے سبب سے پردہ اٹھا دیا اور اس کی خرابی اور بے بنیاد ہونے کو، جو وہی قدرت خدا اور اس کے تسلط کو محدود کرنا ہے۔ واضح کر دیا۔

اگر اس مکتب کے پیرو کار خاندان رسالت کے علوم سے فائدہ اٹھاتے اور اسی زمانہ میں، جب معتزلہ کے مکتب کلامی کی بنیاد رکھی جا رہی تھی، آئمہ معصومینؑ کی طرف رجوع کرتے، تو وہ بزرگوار اصلی ''توحید افعالی'' کو محفوظ رکھتے ہوئے، انسان سے فعل کے صدور اور اس کی فاعلیت کے طرز اور طریقہ کو واضح کر دیتے اور ثابت کرتے کہ انسان کا ہر فعل اور کام باوجودیکہ خدا کا فعل ہے، انسان کا بھی فعل ہے اور خدا کی مخلوق ہوتے ہوئے خود انسان کی بھی مخلوق ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ خدا کی فاعلیت تسبیبی فاعلیت ہے اور انسان کی فاعلیت مباشری فاعلیت ہے۔

امام ہشتم اپنے ایک صحابی کو ایک خط میں اس طرح فرماتے ہیں:

"قال الله یا بن آدم بمشیتی کنت انت الذی تشاء لنفسك ماتشاء و بقوتی ادیت الی فرائضی و بنعمتی قویت علی معصیتی جعلنك سمیعاً بصیراً قویا" [2]

''اے فرزند آدم! تو نے اپنے لیے جو کچھ چاہا وہ میرے ارادہ اور مشیت سے چاہا اور میری دی ہوئی

---

[1] (بحار الانوار ج ۵ ص ۵۴)

[2] (بحار الانوار ج ۵ ص ۵۷)

قدرت وطاقت کے ذریعہ تو نے میرے واجبات کوادا کیا اور میری عطا کردہ نعمت کے ذریعہ تو گناہ کرنے پر قادر ہوا، میں نے تجھے سننے والا، دیکھنے والا اور قوی وطاقتور بنایا۔''

اس حدیث میں اگر چہ انسان کو، ارادہ کا مالک، فرائض کوادا کرنے والا اور گناہ کا ارتکاب کرنے والا کہا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ وہ ایک طرف تو خدا کے ارادہ اور اس کی قدرت ونعمت سے اور دوسری طرف اپنی کمال بینائی، وشنوائی وحریت وآزادی کے ذریعہ ان کاموں کو انجام دیتا ہے، مشیت ونعمت وقدرت تو خدا کی طرف سے ہے، لیکن مشیت کو روبراہ کرنے اور واجبات ومحرمات کے کاموں میں اس قدرت و نعمت سے استفادہ کرنے کا کام خود بشر کی طرف سے ہے، وہ کمال بینائی وشنوائی وحریت وآزادی کے ساتھ، مشیت وقدرت خدا اور اس کی نعمتوں سے اچھا یا برا استفادہ کرتا ہے، اس صورت میں قطعی طور پر، وہ اپنے اعمال کے لیے خود ہی جواب دہ ہوگا۔

اگر معتزلہ خدا کے عدل وداد کی وجہ سے ''توحید افعالی'' سے گریز کرتے ہیں اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم یہ کہیں گے کہ عالم میں صرف ایک ہی مستقل خالق ہے، تو اس صورت میں، بدکاریوں اور گنہگاروں کو سزا اور عذاب دینا عدل کے خلاف ہوگا، تو انہوں نے ایک نکتہ کی طرف سے غفلت برتی ہے اور وہ یہ ہے کہ گنہگاروں کو سزا تو اسی صورت میں عدل الٰہی کے خلاف ہوگی جب کہ ہم خدا کی نعمتوں سے استفادہ کرنے میں انسان کی حریت وآزادی کا انکار کریں اور اس کو بالکل ہی مجبور اور پابند سمجھ لیں اور نچلے اور درمیانے طبقات کی علیت وفاعلیت کا انکار کردیں۔

اور دوسرے افراطی مکتب (مکتب اشعری) کی طرح جس کی طرف ہم ابھی ابھی شارہ کریں گے، یہ عقیدہ اپنالیں کہ تمام موجودات بطور مستقیم خدا ہی کی وجود میں لائی ہوئی ہیں (اور وہی تمام طبیعی اور غیر طبیعی علتوں کا جانشین ہے) اور اصل ہستی کی صرف ایک ہی علت ہے اور وہ خدا ہے اور اس کے علاوہ علیت وسببیت میں۔نہ مستقل طور سے اور نہ ہی غیر مستقل طور سے۔کسی کا بھی مطلقاً کوئی حصہ نہیں ہے۔جب ہمارا خدا کے بارے میں یہ تصور ہوگا تو اس صورت میں مکتب معتزلہ حق پر ہوگا، کیونکہ جب انسان کا اپنے کاموں کے انجام دینے میں معمولی سا بھی دخل نہیں ہوگا تو وہ اپنے اعمال کے لیے جواب دہ کیوں ہو، اگر عالم میں مستقل یا غیر مستقل ایک علت سے زیادہ ہے ہی نہیں تو کسی دوسرے کا مواخذہ کیوں ہو۔

لیکن اس طور سے۔جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے کہ ''توحید افعالی'' دوسرے طبقات کی علیت اور طبیعی اور غیر طبیعی عوامل وعلل کے انکار کا نام نہیں ہے۔بلکہ اس مکتب میں، تمام علل وعوامل کی علیت وسببیت محفوظ ہے اور ایک موجود کے وجود میں آنے کی شرط۔علت ومعلول کے نظام کے تحقق کا مرہون منت ہے، جو پورے عالم پر حکومت کرتا ہے، لیکن ہم اس اعتراف کے باوجود یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ سبب مستقل اور موثر بالذات۔جس کے وجود پر تو اور مشیت وارادہ کے ماتحت باقی کے تمام علل واسباب اپنا اپنا وظیفہ انجام دیتے ہیں۔ایک سے زیادہ نہیں ہے اور وہ خدا ہے، جو ہر قسم کے شرک فی الذات اور شرک در فعل سے منزہ ہے۔

اشعری مکتب

مکتب معتزلہ کے مقابلہ میں ایک اور افراطی مکتب، اشعری مکتب کے نام سے موجود ہے۔

یہ مکتب خدا کے علاوہ ہر قسم کی علت کے وجود کا انکار کرتا ہے، اس کے نظریہ کے مطابق سورج اور آگ، روشنی اور حرارت کے ایجاد کرنے میں معمولی سے معمولی اثر بھی نہیں رکھتے، بلکہ ارادہ خداوندی اس سے متعلق ہوا ہے کہ سورج کے بعد روشنی اور آگ کے بعد حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور سورج اور آگ کا، روشنی اور حرارت میں ہرگز معمولی سے معمولی دخل بھی نہیں ہے۔

عوامل طبیعی کی تاثیر کے بارے میں، یہ افراطی نظریہ، علمی و فلسفی براہین اور صریح آیات قرآنی کے ساتھ باطل و مردود ہے، فلسفی براہین کی نظر سے، اس خیال کے بے بنیاد ہونے کے بارے میں تو ہم کسی دوسرے وقت میں بحث کریں گے اب صرف آیات قرآنی کے لحاظ سے، اس نظریہ کے بطلان کے بارے میں، بحث کرتے ہیں۔

ذیل میں بیان کردہ آیات ہیں، علل طبعی کے بارے میں وضاحت کے ساتھ تصریح ہوئی ہے۔

۱۔ وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ ۭ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (رعد)

''اگر زمین میں پاس پاس ایسے قطعات ہیں، جن میں انگور، زراعت اور کھجوریں ایک ہی جڑ سے کئی کئی اور علیحدہ علیحدہ اُگے ہوئے ہیں، اور سب کے سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں اور ہم نے بعض کے پھلوں کو دوسرے بعض پر برتری دی ہے، بے شک اس میں عقلمند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

''یسقی بماء واحد' کا جملہ بتلاتا ہے کہ پانی درختوں کی پرورش میں موثر ہے، لیکن اس کے باوجود بعض کا پھل دوسرے بعض پر برتری رکھتا ہے۔

ذیل میں بیان کردہ دو آیات، اس آیت سے زیادہ واضح ہیں:

۲۔ وَّأَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (البقرہ:۲۲)

''اور ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا، اور اس کے ذریعہ ہم نے پھلوں کی پرورش کی، تاکہ وہ تمہاری روزی بن سکیں۔''

۳۔ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ

اَنۡعَامُهُمۡ وَاَنۡفُسُهُمۡ ؕ اَفَلَا يُبۡصِرُوۡنَ﴿۲۷﴾ (سجدہ)

''کیا تم دیکھتے نہیں کہ ہم پانی کو خشک سرزمین کی طرف چلاتے ہیں، پھر ہم اس کے ذریعہ سے کھیتیاں اُگاتے ہیں، جن میں تمہارے چوپائے بھی اور تم خود بھی کھاتے ہو، تم غور و فکر کیوں نہیں کرتے۔''

یہ دونوں آیات زراعت اور باغ میں پانی کی تاثیر کی وضاحت کے ساتھ تصریح کرتی ہیں، اور لفظ ''بہ'' میں ''با'' سببیت کے معنی میں ہے۔

۴۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزۡجِىۡ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيۡنَهٗ ثُمَّ يَجۡعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الۡوَدۡقَ يَخۡرُجُ مِنۡ خِلٰلِهٖ‌ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ جِبَالٍ فِيۡهَا مِنۡۢ بَرَدٍ فَيُصِيۡبُ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَصۡرِفُهٗ عَنۡ مَّنۡ يَّشَآءُ‌ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرۡقِهٖ يَذۡهَبُ بِالۡاَبۡصَارِ﴿۴۳﴾ (نور)

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ بادل کو چلاتا ہے، پھر انہیں آپس میں ملا دیتا ہے، پھر انہیں تہ بہ تہ کر دیتا ہے، پھر تم بارش کو اس کے درمیان سے نکلتے ہوئے دیکھتے ہو اور آسمان کی طرف سے پہاڑوں سے اولے برساتا ہے اور اسے جس کے پاس چاہتا ہے پہنچا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ٹال دیتا ہے اور قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک، آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دے۔''

اگر اس آیت میں غور کیا جائے تو بارش اور اولوں کے آسمان سے برسنے کے مقدمات واضح طور پر بیان ہوئے ہیں، اس طرح سے کہ موجودہ علم نے اپنے ان تمام آلات و لوازم کے ساتھ۔ جو فضائی موجودات کے علل و اسباب کے کشف کرنے کے بارے میں استعمال کیے ہیں۔ اس سے کچھ زیادہ حاصل نہیں کر پائے، جو اس آیت نے بیان کیا ہے، اب ہم اس آیت کے جملوں میں غور کرتے ہیں۔

۱۔ یزجی سحابا، بادل کو چلاتا ہے

۲۔ ثم یولف بینه، بادل کے ٹکڑوں کو آپس میں ملاتا ہے۔

۳۔ ثم یجعله رکاما، پھر انہیں تہ بہ تہ کرتا ہے۔

۴۔ فتری الودق یخرج من خلاله، تہ بہ تہ کرنے کے بعد (اور پر ہونے پر) تم دیکھتے ہو کہ اس کے درمیان سے بارش برس رہی ہے۔

۵۔ یکادسنا برقه یذهب بالابصار، بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔

ان تمام جملوں میں علل طبیعی کی تاثیر کی تصریح ہوتی ہے، البتہ ان تمام علل و اسباب کی تاثیر خدا کے حکم اور اس کے ارادہ و مشیت سے

ہے، اور اگر وہ نہ چاہے تو یہ تمام علل واسباب سے بیکار ہو جائیں۔

۵۔ اَللّٰہُ الَّذِیۡ یُرۡسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیۡرُ سَحَابًا فَیَبۡسُطُہٗ فِی السَّمَآءِ کَیۡفَ یَشَآءُ وَیَجۡعَلُہٗ کِسَفًا فَتَرَی الۡوَدۡقَ یَخۡرُجُ مِنۡ خِلٰلِہٖ ۚ (روم ۴۸)

''وہ خدا جو ہواؤں کو بھیجتا ہے، پھر ہوا بادلوں کو اٹھاتی ہے، اس کے بعد وہ ان بادلوں کو آسمان میں جس طرح چاہتا ہے پھیلا دیتا ہے، پھر وہ انہیں کالے کالے ٹکڑوں میں کر دیتا ہے، پھر تم بادلوں کے درمیان سے بارش کو برستے ہوئے دیکھتے ہو۔''

اس سے زیادہ واضح و روشن جملہ اور کیا ہوگا کہ وہ کہتا ہے: ''فتثیر سحابا'' ہوا بادل کو اٹھاتی اور حرکت میں لاتی ہے۔

اس آیت کے جملوں میں غور کرنے سے، بحکم خدا علل طبیعی کی تاثیر کے بارے میں، ہماری قرآن کے نظریہ کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔

اس آیت میں جو علل بیان ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ بارش کے برسنے میں ہوا کی تاثیر۔

۲۔ بادلوں کو اٹھانے اور ان کے چلانے میں ہوا کی تاثیر۔

۳۔ بادلوں کا آسمان میں پھیلا جانا۔

۴۔ ان بادلوں کا بعد میں سیاہ و تاریک ٹکڑوں میں ہو جانا۔

۵۔ ان مقدمات کے بعد بارش برسنے لگتی ہے۔

اگر قرآن ان آیات میں بارش اور اولوں کے برسنے میں خدا کا نام لیتا ہے (خدا بادلوں کو پھیلاتا ہے اور انہیں تاریک ٹکڑوں میں کر دیتا ہے) تو یہ اسی ''توحید تدبیری'' کی بناء پر ہے، جس کے بارے میں ہم آئندہ قرآن کے نظریہ کے مطابق بحث کریں گے۔

وہ آیات جو علل طبیعی کی تاثیر کی تصدیق کرتی ہیں اور عالم آفرینش کو علل و معالیل کا مجموعہ سمجھتی ہیں، جو سب کی سب اسی کے ارادہ و مشیت سے کام کرتی ہیں، اور سب کی تاثیر و فاعلیت خدا کی فاعلیت کی فرع اور اس کی علیت کے طول میں ہے۔ اس سے کہیں زیادہ ہیں، جو یہاں پیش اور بیان کی جا سکیں، لیکن جتنی مقدار ہم نے بیان کر دی ہے، واقع بین افراد کے لیے اتنی ہی کافی ہے، اب جب کہ دونوں مکتبوں کا بنیاد ہونا واضح ہو گیا ہے تو ضروری ہے کہ ہم حقیقت کے چہرہ سے پردہ ہٹائیں اور وہ حق جو ان دونوں افراطی اور تفریطی مکتبوں کے درمیان چھپا ہوا ہے اسے بیان کریں۔

توحید افعالی کا دو حصوں میں خلاصہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ جہاں ہستی میں ایک اصیل اور مستقل خالق کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اور دوسری علل کی تخلیق اس کی خالقیت کے طول میں اور اس کے

اذن اور فرمان سے صورت پذیر ہوتی ہے۔

۲۔ جہانِ آفرینش کا مدبر و مدیر ایک سے زیادہ نہیں ہے اور وہ خدا ہے اور عالم میں جس قسم کی تدبیر بھی صورت پذیر ہوتی ہے اس کے فرمان، ارادہ اور مشیت سے ہوئی ہے۔

پہلا حصہ تو وہی ''توحید در خالقیت'' ہے اور دوسرا حصہ وہی ''توحید در ربوبیت'' ہے اور ''رب'' سے مراد، جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے، خالق کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ مدیر و مدبر کے معنی میں ہے، جس کو کسی فرد گروہ یا کسی چیز کی اصلاح و درستی، سپرد کی گئی ہو۔[1]

اس حصہ میں ہم توحید در خالقیت کے بارے میں گفتگو کریں گے اور اگلے (آٹھویں) حصہ میں ''توحید در ربوبیت کے بارے میں گفتگو ہوگی۔

توحید در خالقیت

قرآن کی طرف رجوع کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب آسمانی خدا کے علاوہ کوئی خالق اور اس کے سوا کسی پیدا کرنے والے کو تسلیم نہیں کرتی اور جو چیز بھی عالم ہستی میں موجود ہے، اس کا خالق خدا ہے۔

وہ آیات جو اس مطلب پر گواہی دیتی ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾ (رعد)

''کہہ دے، خدا ہی ہر چیز کا خالق ہے، اور وہی یکتا و یگانہ اور غالب و قہار ہے۔''

۲۔ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۚ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۶۲﴾ (زمر)

''وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہر چیز کا مختار ہے۔''

۳۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ (انعام۔۱۰۲)

''یہ ہے تمہارا خدا ہر چیز کا پیدا کرنے والا، اس کے علاوہ کوئی خالق نہیں۔''

۴۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ (انعام ۱۰۲)

''یہ ہے خدا تمہارا پروردگار، اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں، وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، بس تم اسی کی

---

[1] وہابی مولفین نے ''توحید در ربوبیت'' کو ''توحید در خالقیت'' کے معنی میں مراد لیا ہے، حالانکہ رب خالق کے معنی میں نہیں ہے اور اس حصہ کو آپ آئندہ پڑھیں گے، جیسا کہ انہوں نے ''توحید در الوہیت'' کو ''توحید در عبادت'' کے معنی میں لیا ہے، حالاکہ الوہیت ''خدائی'' کے معنی میں ہے، نہ کے معبودیت کے معنی میں، ہم پہلے بھی اس مطلب کو بیان کر چکے ہیں۔

عبادت کرو۔"

۵۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (حشر ۲۴)

"وہی خدا خلق کرنے والا، وجود میں لانے والا اور شکل وصورت بنانے والا ہے، اچھے نام اسی کے لیے ہیں۔"

۶۔ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ (انعام ۱۰۱)

"اس کے بیٹا ہو کیسے سکتا ہے، جب کہ اس کی بیوی تو ہے ہی نہیں، اور ہر چیز کو اسی نے پیدا کیا ہے۔"

۷۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ (فاطر ۳)

"اے لوگو! خدا کی نعمتوں کو یاد کرو، کیا خدا کے سوا کوئی اور پیدا کرنے والا ہے۔"

۸۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾ (اعراف)

"خلق کرنا اور حکم دینا اسی کے اختیار میں ہے، بزرگ ہے وہ خدا جو عالمین کا پروردگار ہے۔"

کوئی جملہ اور کوئی عبارت ان آیات سے زیادہ واضح اور بلیغ تر نہیں ہو سکتی، جو تمام عالم ہستی اور چیزوں کو، ان کے اپنے مخصوص آثار و خواص کے ساتھ، خدا کا معلول اور اس کی مخلوق سمجھے۔

وہی ہے جس نے سورج، چاند اور آگ کو پیدا کیا اور انہیں روشنی و درخشندگی اور فروزندگی (حرارت) بخشی، اور ان کی ذات اور ان کے آثار کے درمیان ایک واضح و روشن تعلق برقرار کر دیا ہے۔

قرآن ایک مخصوص واقع بینی کا معتقد ہے، کہ عالم آفرینش وخلقت میں، آسمان، ستارے، زمین، پہاڑ، بیابان دریا وسمندر، عناصر، معاون، بادل، رعد، صاعقہ، بارش، اولے، گیاہ ونباتات، درخت، حیوان اور انسان وغیرہ عالم ہستی کے ایک حصہ کو تشکیل دیتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک مخصوص آثار وخواص کے ایک سلسلہ کا مبداء ہے اور ان موجودات کی ان آثار کے ساتھ نسبت فاعل وفعل کے ساتھ نسبت ہے اور علت ومعلول کے مشابہ ہے۔

لیکن یہ سب موثر اور آثار فاعل اور افعال، اس اعتراف کے باوجود کہ ان کے درمیان علیت ومعلولیت کا رشتہ ہے، سب کے سب خدا کی مخلوق اور اسی کے پیدا کردہ ہیں اور علیت کا رشتہ اور تعلق وہاں جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ انسان کئی اعفال مثلاً: کھانا، پینا، چلنا، بیٹھنا۔ سرانجام دیتا ہے اور یہ افعال خود انسان سے مربوط اور اس کا فعل ہیں اور اگر یہ اس کا فعل نہ ہوتے، تو یہ ہرگز بھی صحیح نہ ہوتا کہ انسان کو خدا کی طرف سے امر ونہی کی جائے، لیکن اس کے باوجود، علت ومعلول

(انسان اور اس کے کام) مجموعی طور پر مخلوقِ خدا بھی ہیں، کیونکہ انسان اس ہستی اور وجود کے ذریعہ جو خدا نے اسے دی ہے اور اس قدرت و توانائی کی وجہ سے جو اسے بخشی ہے، اس سلسلہ افعال کا مبدء ہے، تو اس صورت میں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کا فعل خود انسان کے ساتھ تو مربوط ہو، لیکن خدا کے ساتھ مربوط نہ ہو۔

جیسا کہ انسان کے اختیار سے باہر کے حالات مثلاً: تندرستی، بیماری، رشد و نمو (نشوونما) اور فرح و شادمانی ایک طرح سے خدا کے ساتھ مربوط ہیں، اسی طرح سے اس کے اختیاری اور ارادی کام بھی خدا کی مخلوق ہیں اور سبب (ذات انسان) کی ایجاد سے، وہ مسبب (فعل انسان) کا خالق بھی ہوگا۔

قرآن کی کچھ آیات، اس حقیقت کو، ایک دوسرے طریقہ سے بیان کرتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ خدا نہ صرف اشیاء کا خالق ہے، بلکہ اس نے ہر چیز کو ایک خاص تقدیر اور اندازہ گیری اور تعین اہداف اور غایات زندگی کے ساتھ پیدا کیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

۹۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا ۝۲ (فرقان)

''اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کی اندازہ گیری کی۔''

۱۰۔ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝۵ (طٰہ)

''وہ خدا جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر اس کو ہدایت کی۔''

۱۱۔ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝۲ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝۳ (اعلیٰ)

''وہ خدا جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کو درست کیا، وہ خدا جس نے ہر چیز کی اندازہ گیری کی اور اسے ہدایت کی۔''

یہ آیات، توحید در خلقت کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں، اور خدا کے سوا کسی کو اصیل اور مستقل خالق نہیں سمجھتیں۔

ایک سلسلہ سوالات کا جواب

پہلا سوال

۱۔ اگر بت پرست معاشرہ کو ''توحید درخالقیت'' کے موضوع میں شک اور تردد نہیں تھا، تو قرآن ان کی مذمت کرتے ہوئے یہ کیوں کہتا ہے کہ ان کے معبودوں نے تو کسی بھی چیز کو پیدا نہیں کیا ہے۔ مثلاً

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۧ﴿۱۱﴾

(لقمان)

''یہ تو خدا کی خلقت ہے (آسمانوں اور زمین کی خلقت) اب مجھے دکھاؤ کہ دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے، لیکن ستمگر دور دراز کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔''

اور سورۂ فرقان کی آیہ ۳، سورۃ رعد کی آیہ ۱۶ اور سورۃ حج کی آیہ ۷۳، سورۂ روم کی آیہ ۴۰ اور سورۃ فاطر کی آیہ ۴۰ میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

جواب

خدا کی خالقیت کے بیان کرنے اور دوسروں سے خالقیت کو سلب کرنے کا ہدف و مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے بتوں کو خالق سمجھتے تھے، بلکہ خدا میں خالقیت کے انحصار اور بتوں سے خالقیت کے سلب کو پیش کرنے کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ ان کو غیر خدا کی عبادت سے روکے، کیونکہ عبادت و پرستش کا صرف وہی سزاوار ہے جو کمال سے آراستہ اور نقص سے پیراستہ، پاک و منزہ ہو، صفت خالقیت سے بالاتر اور کون سا کمال ہے کہ جس کے حامل نے اپنی قدرت سے تمام چیزوں کو لباس ہستی پہنایا ہے۔

دوسرے لفظوں میں: عبادت مالکیت و مملوکیت کے شئون میں سے ہے، وہ مالکیت جس کی بنیاد خلق کرنے پر ہے، اب جب کہ مشرکین کے اعتراف کے مطابق بھی صرف خدا ہی خالق ہے، اور اس کے سوا اور کوئی خالق نہیں ہے، تو پھر اسی کی پرستش کرنا چاہیے اور اس کے سوا اور کسی کی پرستش نہیں کرنا چاہیے۔

اس بناء پر، قرآن کا اس بات پر اصرار کہ خدا خالق ہے اور ان کے معبود خالق نہیں ہیں، اس وجہ سے نہیں ہے کہ انہیں توحید درخالقیت کے بارے میں کوئی شک اور تردد تھا، یا وہ اس سے غافل تھے، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ توحید درخلقی کے لازمہ سے، جو وہی توحید درعبادت ہے،

غافل تھے، خداوند تعالیٰ اسی کی یاددہانی کراتے ہوئے، انہیں اس قسم کی توحید کے لازمہ (توحید در عبادت) کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کو اس پر اصرار کیوں ہے کہ خدا کے سوا اور کوئی خالق نہیں ہے اور ان میں سے کچھ آیات [۱] ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اور کچھ آیات میں اس کی "خلاق علیم" کے ساتھ توصیف کرتا ہے [۲] اور دوسری آیت میں انتہائی وضاحت کے ساتھ کہتا ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۗ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾ (الاعراف)

"خلق کرنا اور حکم دینا اسی کے لیے ہے، بزرگ ہے وہ خدا جو عالمین کا کردگار ہے۔"

خلاصہ یہ ہے کہ خدا میں خلقت کے انحصار کو پیش کرنے کی ایک علت، اور اسی طرح ان پوجے جانے والے بتوں کی مذمت، جو کسی کو خلق کرنے پر قادر نہیں تھے [۳] اور دوسری تمام مذمتیں، سب کی سب وجدانوں کو بیدار کرنے کے لیے ہیں، کیونکہ اب جب کہ مشرکین کے اعتراف کے مطابق بھی اس کے سوا اور کوئی خالق نہیں ہے، اور دوسرے معبودوں میں خلق کرنے کی قدرت نہیں ہے تو اس صورت میں صرف اسی کی پرستش کرنا چاہیے، جو تمام موجودات کو عدم سے وجود میں لایا ہے، نہ کہ ان عاجز و ناتواں بتوں کی، جن میں ایک مکھی کو پیدا کرنے کی بھی طاقت نہیں ہے۔

دوسرا سوال

جب عالم آفرینش میں اس کے سوا کوئی دوسرا خالق ہے ہی نہیں، تو پھر قرآن، ذیل میں بیان کردہ آیات میں مسیح کو پرندے کے پیدا کرنے والے کے طور پر کیسے معرفی کراتا ہے۔

اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ (آل عمران ۴۹)

"میں مٹی سے ایک پرندہ کی شکل بناؤں گا، پھر میں اس میں پھونک ماروں گا، تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ بن جائے گا۔"

خدا، رحم مادر میں، انسان کی آفرینش کے مراحل و مراتب کو بیان کرنے کے بعد اپنے آپ کو "احسن الخالقین" کے ساتھ توصیف کرتا

---

[۱] سورۂ انعام آیہ ۱۰۱-۱۰۲، رعد آیہ ۱۶، فاطر آیہ ۳، زمر آیہ ۶۲، مومن آیہ ۶۲، مومن آیہ ۶۲، حشر آیہ ۲۴، اعراف آیہ ۵۴، و............ہم ان آیات کے متن پہلے پیش کر چکے ہیں۔

[۲] سورہ حجر آیت ۸۶، یس آیہ ۸۱

[۳] سورہ حج آیہ ۷۳

ہے اور فرماتا ہے:

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴿۱۴﴾ (مومنون)

''بزرگ ہے وہ خدا جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔''

خدا کا اپنی یہ توصیف بیان کرنا کہ وہ بہترین آفریدگار ہے ضمنی طور پر اس بات کا اعتراف ہے کہ اس کے سوا اور دوسرے بھی پیدا کرنے والے ہیں۔

جواب

اس سوال کا جواب خدا کے فعل میں مستقل ہونے اور اس کے علاوہ دوسروں کے مقام ذات وفعل وتاثیر میں وابستہ اور غیر مستقل ہونے پر توجہ کرنے سے پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے کیونکہ وہ خالقیت جو خدا میں منحصر ہے وہ ہرگز کسی دوسرے کے لیے قابل اثبات نہیں ہے، وہ آفریدگار جو آفرینش وخلقت میں اصیل ومستقل ہو اور کسی شخص اور مقام پر تکیہ کیے ہوئے نہ ہو خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اور قرآن نے اس قسم کی صفت کی کسی اور کی طرف نسبت نہیں دی ہے۔

لیکن وہ خلقت جس کا خلق کرنے والا اپنے فعل میں خدا پر تکیہ کئے ہوئے ہو اور اس نے اس کی مدد اور ارادہ سے اپنا کام انجام دیا ہو وہ ان دوسرے موجودات میں سے جن میں سے ہر ایک اپنے مقام وحیثیت میں خلاقیت اور آفرینندگی رکھتا ہے اور اس قسم کی تخلیق کی نسبت، اس کے غیر کی طرف ''توحید در خالقیت'' کے ساتھ جس طرح سے بیان ہوئی ہے منافات نہیں رکھتی۔

تیسرا سوال

توحید در خالقیت کا اعتقاد (اور یہ کہ عالم ہستی میں خدا کے علاوہ اور کوئی خالق نہیں ہے اور وہی تمام موجودات کا اپنے مخصوص آثار کے ساتھ، یہاں تک کہ انسان اور اس کے اعمال کا خالق ہے) جبر کو ثابت کرتا ہے اور اسی طرح یہ اعتقاد بھی کہ عالم میں جو کچھ انجام پاتا ہے، وہ اس کی مشیت وارادہ سے ہوتا ہے اور حوادث میں سے کوئی چیز بھی اس کے ارادہ کے بغیر نہیں ہوتی، کیونکہ اس صورت میں انسان کے اعمال کا جواب وہ خود خدا ہے جو اس کا خالق ومرید ہے نہ کہ انسان جس کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

جواب

یہ اعتراض صرف اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جب کہ ہم دو اصولوں میں سے کسی ایک کو قبول کر لیں۔

ا۔ ہم نچلے طبقات کی علیات اور تاثیر کا انکار کر دیں اور تمام مجرد و مادی علل کا جانشین ہم خدا ہی کو سمجھ لیں، اور یہ کہیں کہ کوئی موجود کسی قسم کے اثر کا مبدءنہیں ہے، نہ تو اصالتاً اور نہ ہی خدا کی مشیت وارادہ کی روئے سے، خلاصہ یہ ہے کہ ہم عالم کے بارے میں اشعری کے

نظریہ کو قبول کرلیں۔

۲۔ دوسرے موجودات کی علیت کو ان کے آثار و افعال کے بارے میں تو ہم قبول کرلیں، لیکن انسان کے بارے میں ایک قسم کی علیت یعنی علیت اضطراری سے زیادہ کے ہم قائل نہ ہوں۔

ان دونوں اصولوں میں سے کسی ایک اصل کو قبول کرنے سے مذکورہ اعتراض پیدا ہوجاتا ہے، لیکن اگر ہم دونوں اصولوں کا انکار کر دیں تو پھر اس اعتراض کا جواب واضح ہوجائے گا۔

پہلی اصل کے بارے میں تو ہم پہلے بھی بحث کرچکے ہیں اور واضح ہوچکا ہے کہ فلسفی اور خصوصاً قرآنی دلائل موجودات اور ان کے فعل واثر کے درمیان، علیت و معلولیت کے رابط کو قبول کرتے ہیں اور خدا کو ''علۃ العلل'' کے طور پر معرفی کراتے ہیں نہ کہ تمام علل کے جانشین ہونے اور دوسرے علل کے بیکار ہونے کے طور پر۔

اب ہم دوسری اصل کے بارے میں جو علت کی اضطراری اور اختیاری میں تقسیم ہے، بیان کرتے ہیں۔

عالم خلقت میں دو قسم کی علت پائی جاتی ہے:

۱۔ ایک تو وہ علت ہے جس میں شعور و ادراک اور اختیار و ارادہ پایا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں فاعل مختار وہ علت ہے جو دوراہے پر کھڑے ہوکر، انتہائی آزادی اور اختیار کے ساتھ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے۔

۲۔ علل کی دوسری قسم پہلی علت کے بالکل برخلاف ہے جس میں یا تو اپنے اور اپنے افعال کے بارے میں عام علم وشعور ہوتا ہی نہیں یا ان میں ادراک و احساس تو ہوتا ہے، لیکن ان میں اختیار و ارادہ نہیں پایا جاتا اور علل و اسباب کا یہ گروہ چاہے شعور سے محروم ہو یا صرف اختیار کا مالک نہ ہو ''فاعل مضطر'' کہلاتا ہے۔

سورج کا چمکنا، نباتات کی نشوونما، ان علل و اسباب میں سے ہے، جو اپنے فعل اور کام سے آگاہ نہیں ہیں، لہٰذا وہ اس کے انجام دینے میں طبعاً مضطر ہوں گے، لیکن جانور، شہد کی مکھی، چیونٹی اور چوپائے اگرچہ اپنے کام سے آگاہ ہوتے ہیں، لیکن ان کا عمل سو فیصد ایک فطری عمل ہوتا ہے، جو اختیار اور عقل وخرد کی صوابدید سے صورت پذیر نہیں ہوتا، بلکہ ان کے تمام اعمال فطری ہوتے ہیں اور اختیاری نہیں ہوتے۔

اس تقسیم کی طرف توجہ کرتے ہوئے مذکورہ اعتراض کا جواب واضح ہوجاتا ہے، کیونکہ یہ تو درست ہے کہ افعال بشر خدا کی مخلوق بھی ہیں اور اس کے ارادے کے ماتحت بھی ہیں اور خدا کی ازل سے مشیت یہی ہے کہ اس قسم کے حوادث عالم ہستی میں رونما ہوں، لیکن خدا کے خالق ہونے کی کیفیت کو، اس کے ارادہ کے تعلق کی کیفیت سے ہی معلوم کیا جاسکتا ہے اور جب ہم اس کے ارادہ کے تعلق کی کیفیت سے آگاہ ہوجائیں گے، تو پھر اپنے افعال کے بارے میں اس کی خالقیت کی کیفیت سے بھی آگاہ ہوجائیں گے، لہٰذا ہم اپنی آئندہ بحث میں، اس کے ارادہ کے تعلق کی کیفیت کو پیش کررہے ہیں۔

خدا نے کس طرح سے ارادہ کیا ہے؟ اس نے ازل سے ہی یہ ارادہ کیا ہے کہ ہر معمول اپنی علت سے اس سے مناسب نسبت میں سرزد ہو اور ہر موجود اپنی مخصوص علت سے ایک خاص شکل میں صادر ہو، یعنی اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ سورج بغیر شعور و ادراک کے

اپنی شعاعیں دشت و دمن پر ڈالے اور شہید کی مکھی اور چیونٹی اپنی فطرت کے ماتحت حس وشعور کے ساتھ لیکن اختیار و آزادی کے بغیر، درختوں کے شیرہ کو چوسے اور چھ کونے والا چھتہ بنائے اور اسی طرح سے اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ انسان ارادہ اور کمال اختیار و آزادی کے ساتھ اپنے کاموں کو انجام دے۔

زیادہ واضح الفاظ میں جس طرح سے انسان کا اصل وجود اور اس کا فعل خدا کے ارادہ کے ماتحت ہے، اسی طرح سے اس کے فعل کی صفت اور قید بھی، جو اس کا اختیاری ہونا ہے، اس کے ارادہ ومشیت کے ماتحت ہے، اس قسم کا ایک ازلی ارادہ، نہ صرف یہ کہ انسانوں کی آزادی کا مخالف نہیں ہے، بلکہ واضح صورت میں اس کے آزاد ہونے کو بھی مستحکم اور ثابت کرتا ہے۔

کیونکہ جیسا کہ واضح ہے، خدا کا ارادہ نافذ و قاطع اور تخلف ناپذیر ہے اور وہ جس چیز کو جس شکل میں چاہتا ہے، یقینی طور پر وہ اس طرح سے انجام پاتی ہے، چونکہ خدا نے یہ چاہا ہے کہ ہر کام اپنی مخصوص علت سے صادر ہو، اور چونکہ انسان اپنے افعال کی نسبت فاعل مختار اور آزاد ہے، لہٰذا خدا نے یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ اپنے عمل کو از روئے اختیار انجام دے، اس طرح سے خدا کی مشیت پوری ہو جاتی ہے، لیکن اگر ہم یہ فرض کریں کہ وہ اپنا کام بطور جبر اور بغیر اختیار کے انجام دیتا ہے، تو اس صورت میں انسان کا کام، خدا کی مشیت کے مطابق نہیں ہوگا اور اس کی مشیت پوری نہیں ہوگی، حالانکہ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ خدا کا ارادہ تخلف ناپذیر ہے۔

یہ صحیح ہے کہ عالم کے تمام موجودات، خدا ہی کے ارادہ کے ماتحت عالم وجود میں آتے ہیں اور خدا کا ارادہ تکوینی یہ ہے کہ انسان کچھ اعمال کو سرانجام دے، لیکن دیکھنے والی بات یہ ہے کہ خدا نے یہ ارادہ کس طرح سے کیا ہے، کیا خدا نے اس طرح سے ارادہ کیا ہے کہ انسان اپنے کاموں کو جس طرح سے چاہیں انجام دیں، چاہے اختیاری صورت میں ہوں یا جبر واضطرار کے ساتھ، حالانکہ اس نے ازل سے یہ ارادہ کیا ہے کہ ہر معلول اپنی مخصوص صفات کی علت سے اس کی مناسبت کے مطابق صادر ہو۔

انسان کے بارے میں جو فاعل اور صاحب ارادہ واختیار ہے، اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ اپنے فعل کو چاہے وہ اچھا ہو یا برا، اپنے ارادہ واختیار سے، کمال حریت و آزادی کے ساتھ انجام دے، اس قسم کا ازلی ارادہ نہ صرف یہ کہ جبر کا موجب اور اختیار کو سلب کرنے والا نہیں ہے، بلکہ اختیار و آزادی کو ثابت کرنے والا ہے، کیونکہ خدا کا ارادہ نافذ اور تخلف ناپذیر ہے اور وہ جس چیز کو جس طرح سے اور جس صورت میں چاہے، وہ اسی طرح سے انجام پاتی ہے، اور چونکہ صاحب اختیار انسان کے بارے میں اس نے یہ ارادہ کیا ہے وہ اپنے ارادہ واختیار سے اپنے فعل کی علت ہے، اب اس صورت میں فعل کا صدورر، اس طریقہ کے سوا کہ جس کا خدا نے ارادہ کر لیا ہے، محال و ممتنع ہوگا اور اس قسم کے ارادہ (کہ انسان اپنے فعل کو از روئے اختیار انجام دے) اور جبر کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ علم اور ارادۂ ازلی کا وجود، جبر کا موجب اور اختیار کو ختم کرنے والا نہیں ہو سکتا، بلکہ علم کی صورت اور ارادہ کی کیفیت میں کافی غور وخوض کرنا چاہیے پھر اس کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ عالم کے تمام موجودات جس میں سے انسان کا فعل بھی ہے، خدا کے ارادہ کی حدود سے باہر نہیں ہے اور اس کی حکومت کے اندر کوئی بھی کام اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر انجام نہیں پاتا اور اس کا ارادہ ازل سے، اس موجود کے وجود میں آنے سے متعلق ہو گیا ہے۔

لیکن خدا نے جو کچھ اس کے لیے ارادہ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان اختیار و آزادی کے ساتھ اس عمل کو انجام دے نہ کہ جبر و اضطرار کے ساتھ اس عمل کو انجام دے جس بات کا ارادہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر فعل اپنے مبادی اور علل خاصہ سے صادر ہو، اگر فاعل مضطر ہو تو اس نے ازل سے یہی چاہا ہے کہ وہ از روئے اضطرار اپنے کام کو انجام دے اور اگر فاعل آگاہ اور آزاد ہے تو پہلے دن سے اس نے یہی چاہا ہے کہ وہ انتہائی آزادی اور اختیار کے ساتھ اپنے فعل کی علت بنے اور اس قسم کا ازلی ارادہ، نہ صرف یہ کہ موجب جبر نہیں ہے، بلکہ ٹھیک جبر کے برخلاف اور اس کے نقطہ مقابل میں ہے۔

خدا کے ارادہ ازلی سے صرف ایک ہی صورت میں جبر لازم آتا ہے اور ایک ہی صورت میں اس سے اختیار کی تائید ہوتی ہے، جب ہم یہ کہیں کہ خدا نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ہر چیز اپنی علت سے بغیر ارادہ و اختیار کے سرزد ہو، تو اس صورتمیں اس قسم کے ارادہ ازلی کا وجود موجب جبر ہے، لیکن اگر ہم عالم کو جہاں اسباب و مسببات سمجھیں اور ہر موجود چیز کے لیے ہم ایک خاص علت کو نظر میں رکھیں اور علل کے درمیان میں سے، ہم انسان کو فاعل مختار سمجھیں اور یہ کہیں کہ ازل سے ہی خدا کا ارادہ و مشیت یہ تھی کہ ہر معلول اپنی مخصوص علت سے، اپنی علت سے مناسب شکل و صورت میں صادر ہو اور ہر انسان کا فعل انتہائی آزادی اور اختیار کے ساتھ سرزد ہو تو اس صورت میں اس قسم کے ارادۂ ازلی اور مسئلہ جبر کے درمیان سینکڑوں میلوں کا فاصلہ ہے۔

چوتھا سوال

عام طور پر عقائد اور تفسیر کی کتابوں میں، ذیل میں بیان کردہ آیت کے ساتھ، خالق عالم کی یکتائی پر استدلال ہوتا ہے، کیا یہ آیت توحید کے اس حصہ کے بارے میں ہے؟ آیت یہ ہے:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۝۲۲ (انبیاء)

''اگر آسمان اور زمین میں خدا کے علاوہ کچھ اور بھی خدا ہوتے تو کارخانہ آفرینش فساد اور تباہی سے دوچار ہو جاتا، عرش کا مالک خدا ان کی اس توصیف سے پاک و منزہ ہے۔''

جواب

اس آیت کا اصلی ہدف دو تدبیروں کے خیال کو باطل کرتا ہے نہ کہ دو خالق کے تصور کو، اس حصہ کی تفصیل آئندہ حصہ میں بیان ہوگی اور اس آیت میں بحث کا زور دو تدبیروں کے بارے میں ہے، چاہے ان کا خالق ایک ہو یا دو یا زیادہ، اسی لیے کہتا ہے: اگر آسمانوں اور زمین میں دو خدا ہوتے اور یہ نہیں کہتا کہ اگر ان میں دو خالق ہوتے اور دو خدا ہونا عام ہے دو خالق ہونے سے، کیونکہ خدا کا کام خلق کرنا بھی ہے اور تدبیر کرنا بھی اور حقیقت میں اس آیت کا ہدف اور مقصد ان افراد کے نظریہ پر تنقید کرنا ہے جو اس عالم کے لیے دوسرے مدیریں کا تصور کرتے ہیں،

چاہے وہ ایک خالق کے معتقد ہوں یا دو خالق کے، ہاں! وہ آیت جس کا ہدف دو خالق کا ابطال ہے، وہ یہ آیت ہے جسے ہم اب پیش کرتے ہیں۔

دو خالقوں کا مفروضہ

قرآن دو خالقوں کے مفروضہ کو دقیق ترین برہان کے ساتھ باطل کرتا ہے جہاں فرماتا ہے:

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ (مومنون ۹۱)

''اس کے ساتھ کوئی دوسرا خدا نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں ہر خدا اپنی مخلوق کی تدبیر کرتا اور ان میں سے بعض دوسرے بعض پر برتری حاصل کرتے۔''

یہ آیت تین جملہ سے مرکب ہے:

پہلا جملہ مدعا بیان کرتا ہے، جہاں فرماتا ہے:

"ما كان معه من اله"

''اس کے ساتھ کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔''

دوسرا جملہ

"اذا لذهب كل اله بما خلق"

''اس صورت میں ہر خدا اپنی مخلوق کی تدبیر کرتا۔ یہ برہان کی ایک شق کو بیان کرتا ہے۔

تیسرا جملہ

"ولعلا بعضهم على بعض"

''اور بعض بعض پر اپنی برتری چاہتے۔''

یہ برہان کی دوسری شق کو بیان کرتا ہے۔

اب ہم برہان کی دونوں شقوں کو آپ کی توجہ کے لیے پیش کرتے ہیں۔

اگر عالم میں دو خالق ہوتے تو اس جہان کی تدبیر، ذیل کی صورتوں میں سے کسی ایک کے مطابق ہوتی۔

۱۔ ہر ایک اس حصہ کا ادارہ کرے جسے اس نے پیدا کیا ہے، اس صورت میں ہر حصہ کا ایک مستقل نظام ہوگا اور ان دونوں حصوں کے درمیان کسی قسم کی وابستگی نہ ہوگی، حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ سارا جہان ایک ہی نظام کے ماتحت چل رہا ہے، ایک ایسا نظام جو یکتا و یگانہ اور ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے، یہ وہی چیز ہے جسے خدا نے یوں فرمایا ہے: ''اذ الذهب كل اله بما خلق' ہر خدا

اپنی خلق شدہ چیزوں کی تدبیر کرتا، جس کے نتیجہ میں سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

۲۔ ان مختلف خالقوں اور فرمانبرواؤں کے درمیان ایک سب سے برتر اور دوسروں پر حاکم ہو اور ان کے کام کو وحدت اور ہم آہنگی بخشے، تو اس صورت میں یہی وہ ایک ہے جو واقعاً سارے جہان کا خالق وفرمانروا ہے اور یہ وہی چیز ہے جو دوسرے جملہ میں بیان ہوئی ہے، ''ولعلا بعضهم علی بعض'، ان میں سے بعض دوسرے بعض پر برتری حاصل کرتے۔

۳۔ ان خداؤں میں سے ہر ایک، اکیلا ہی سارے جہاں پر۔ چاہے وہ حصہ اس کی مخلوق ہو یا مخلوق نہ ہو۔ فرمانروائی کرتا ہو اور ہر موقع پر جس طرح چاہتے ہوں حکم دیتے اور عمل کرتے ہوں، یہ شق اگرچہ اس آیت میں وارد نہیں ہوئی ہے۔

لیکن چونکہ اس صورت میں تعدد خالق سے تعدد تدبیر لازم آتا ہے لہٰذا اس آیت سے جو تعدد یا وحدت خالق سے قطع نظر خصوصیت کے ساتھ تعدد تدبیر کو باطل کرنے کے بارے میں وارد ہوئی ہے، اس صورت کے ابطال کے لیے مدد لی جاسکتی ہے اور وہ آیت یہ ہے:

لَوۡ كَانَ فِيۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا‌ ۚ فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ ۝۲۲ (انبیاء)

''اگر آسمان اور زمین میں خدا کے علاوہ کچھ اور بھی خدا ہوتے تو کارخانہ آفرینش فساد اور تباہی سے دو چار ہو جاتا، عرش کا مالک خدا ان کی اس توصیف سے پاک اور منزہ ہے۔''

آیہ: مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنۡ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنۡ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ‌ؕ (مومنون ۹۱) کے ہدف اصلی کا خلاصہ، دو خالق ہونے کے تعدد کا ابطال ہے چاہے وہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ دو تدبیروں کی بنا پر ہو۔

جب کہ آیت: لَوۡ كَانَ فِيۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا‌ ۚ (انبیاء ۲۲) کا ہدف اصل دو تدبیروں کے تصور کا بطلان ہے، چاہے وہ دو خالقوں کی صورت میں ہو یا ایک خالق ہونے کی صورت میں۔

اس بنا پر ان آیات کی تفسیر میں دونوں آیات کے اصلی اہداف و مقاصد سے غفلت نہیں برتنی چاہیے، البتہ دوسری آیہ (لو کان فیهما الهة) کے ذریعہ دو خالقوں کی تینوں صورتوں میں سے ایک کے بطلان پر استدلال کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

بہت سے مفسرین نے آیت کی تفسیر میں، دونوں آیات کے اہداف کی تشخیص سے غفلت برتی ہے اور بعض نے تو آیت کے مضمون اور اس کے طرز استدلال کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ استدلال کی قدر و قیمت ہی گھٹا دی ہے۔

استاد عالی قدر حضرت علامہ طباطبائی نے تفسیر المیزان میں دونوں مطالب کو دو مستقل برہان سمجھا ہے اور اس بارے میں انہوں نے تقریباً اس طرح بیان کیا ہے۔

پہلی برہان کی وضاحت

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ یہ عالم دو خداؤں کی مخلوق ہے، تو دو ہونے کی بنا پر ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہ دو خدا کئی جہات سے ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں، ورنہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ وہ ہوں تو دو لیکن وہ آپس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہ رکھتے ہوں اور دو خالقوں کا اختلاف، ایک دوسرے کی تدبیر کے طرز وطریقہ میں مخالفت کا سبب بنے گا، مثلاً اگر عالم بالا کی تدبیر اس کے خالق کے ساتھ مربوط ہو اور زمین اور اس کے حوادث کی تدبیر خود اسی کے خالق سے مربوط ہو تو قطعی اور یقینی طور سے ان دونوں نظاموں کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہوگا اور ان کے درمیان کوئی ہم آہنگی نہ ہوگی، کیونکہ یہ امر محال ہے کہ ایک جہان کے اجزاء کے درمیان جو دو مختلف اور متضاد تدبیروں کے ساتھ ادارہ ہو رہے ہوں پیوستگی، ارتباط اور ہم آہنگی برقرار رہ سکے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عالم کا نظام اور جہان کے دو اجزاء کا باہمی ربط ٹوٹ جائے گا، کیونکہ علمی تحقیقات کے مطابق عالم کے اجزاء کی ہم آہنگی، ایک ایسے ارتباط کی معلول ہے جیسا کہ منظومہ شمسی کے درمیان پایا جاتا ہے اور اگر یہ ارتباط، تدبیر کے اختلاف کی وجہ سے منقطع ہو جائے مثلاً جذب و دفع کی قوت میں خلل پڑ جائے تو یقیناً عالم میں خلل واقع ہو جائے گا اور اس عالم کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا، قرآن مجید اس برہان کی طرف ذیل کے جملہ کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اذا لذهب كل اله بما خلق"

''ہر خدا اپنی مخلوق کی تدبیر کرتا۔''

یعنی ہر ایک خدا اپنی مخلوق کو اپنے خاص طریقہ سے تدبیر کرتا اور تعدد تدبیر کی بناء پر، آخر کار عالم کے اجزاء کے درمیان وہ ارتباط جو اس کی بقاء کا سبب ہے، برقرار نہ رہتا اور نظام کا شیرازہ بکھر جاتا۔

دوسرے برہان کی وضاحت

عالم آفرینش میں کلی وعمومی نظاموں کا ایک سلسلہ پایا جاتا ہے جن کے درمیان جزئی نظاموں کا ایک سلسلہ برقرار ہے جو ان میں ضمنی طور پر ادارہ ہوتا ہے، انسان وحیوان اور گیاہ ونباتات روئے زمین میں ایک چھوٹا نظام اور کرۂ زمین کے کلی نظام کا ایک جزء ہے، جب کہ کرۂ زمین کا نظام، وسیع اور پھیلے ہوئے نظام کی نسبت، جہاں کے کلی نظام کا ایک جزء اور ایک چھوٹا نظام شمار ہوتا ہے اور یہی نسبت نظام شمسی کی کہکشاں کے ساتھ ہے جو اس کا ایک جزء ہے۔

اب اگر جہان کا عالی اور کلی نظام دو خداؤں میں سے ایک کے ساتھ مربوط ہو اور جزئی نظاموں کی تدبیر دوسرے خدا سے مربوط ہو، تو اس صورت میں عالی وکلی نظام کے مدبر نے دوسرے نظام کے مدبر پر برتری حاصل کرلی ہے۔ اس طور پر کہ اگر پہلا نظام درمیان سے ختم ہو جائے تو جزئی نظام کا جو نظام بالا کا پیرو ہے کوئی اثر اور نشان باقی نہ رہے گا۔ مثلاً خود کرۂ زمین کا نظام درہم برہم ہو جائے گا قطعی اور یقینی طور پر انسان، حیوانات اور گیاہ ونباتات کے نظام کا بھی یہی انجام ہوگا، اگر نظام شمسی میں خلل پڑ جائے تو یقینی طور پر منظومہ شمسی کا جزئی نظام مثلاً کرۂ

زمین کے نظام میں بھی اسی کے ساتھ خلل واقع ہوجائے گا، لیکن اس کے برعکس صحیح نہ ہوگا اس موقع پر نظام عالی وکلی کی، نظام جزئی پر برتری کی وجہ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ نظام عالی وکلی کے مدبر کو نچلے اور جزئی نظام کے مدبر پر برتری حاصل ہے اور اس فرض کا نتیجہ یہ ہے کہ نظام کلی وعالی کو ایجاد کرنے والا، جزئی نظام کے ایجاد کرنے والے سے بے نیاز ہوگا لیکن اس کے برعکس نچلے نظام کا مدبر اپنی مخلوق کی تدبیر اور ادارہ کرنے میں، دوسرے خدا کا محتاج اور نیاز مند ہوگا، کیونکہ فرض یہ ہے کہ نیچے والا نظام اوپر والے نظام کے ساتھ پوری پوری وابستگی رکھتا ہے اور ہمیشہ نظام بالا سے مدد لیتا ہے، اس مدد لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ نظام جزئی کو ایجاد کرنے والا تاثیر وتدبیر میں مستقل نہ ہوگا اور ہمیشہ اپنے سے غیر پر تکیہ کرے گا اور وہ موجود جو اپنی ایجاد وتدبیر میں دوسرے کا محتاج ہو، وہ خدائے غنی وبے نیاز نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید میں اسی طرز استدلال کی طرف ذیل کے جملہ میں اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"وَلَعَلَا بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ‌ؕ"

''بعض خدا بعض دوسرے خداؤں پر برتری حاصل کریں گے۔''

اور اس برتری کی علت یہ ہے کہ واقعی اور ہمہ جانبہ تدبیر دوسرے کے ساتھ مربوط ہے، اس طور پر کہ اگر کلی وعالی تدبیر ختم ہوجائے تو دوسری کسی تدبیر کا اثر اور نام ونشان باقی نہیں رہ جاتا اور تدبیر کی برتری خود مدبر کی برتری کا سبب بھی ہوتی ہے۔

اب ہم آپ کے وجدان کو گواہ بناتے ہیں کہ کیا اس قسم کی محکم واستوار منطق جس کی عظمت کے سامنے بڑے بڑے مفکر حیرت سے انگشت بدندان ہیں۔ ایک ان پڑھ شخص کی فکر کا نتیجہ ہوسکتی ہے، جس کا علاقہ اور قوم اس قسم کے مسائل سے کبھی بھی آشنا نہ ہوئی تھی؟ ہرگز نہیں۔

ایک سوال

جب جہان ممکنات، اپنی تمام خصوصیات اور آثار کے ساتھ خدا کی مخلوق ہے اور ان کا سرچشمہ ارادہ ومشیت خدا ہے اور تمام موجودات اسی کی قدرت سے وجود میں آئی ہے، تو اس صورت میں، ان برے کاموں کو جو بندگانِ خدا سے سرزد ہوتے ہیں، خدا کی طرف کیسے منسوب کرسکتے ہیں؟ کیا ظلم وستم اور تمام ناشائستہ کاموں کو خدا کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اور انہیں مخلوق خدا کہ سکتے ہیں؟ وہ خدا جو یہ کہتا ہے ''خدا برے کام کا حکم نہیں دیتا''[1] ''خدا اپنے بندوں پر ظلم وستم نہیں کرتا''[2] کیا اس کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ خود قبیح اور ناروا امور کا خالق اور پیدا کرنے والا ہے۔

اس سوال کو ایک دوسری صورت میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آیہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَىۡءٍ (انعام ۱۰۲) بتلاتی ہے کہ وہ ہر چیز کا خالق ہے اور جو چیز بھی ''شیء'' کی مصداق ہے، وہ اس کا خالق ہے اور دوسرے لفظوں میں آیہ الَّذِىۡۤ اَحۡسَنَ كُلَّ

---

[1] قُلۡ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ‌ؕ (اعراف ۲۸)

[2] وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ‏ ﴿۴۶﴾ (حم السجدہ)

شَیۡءٍ (سجدہ ۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی تمام مخلوقات حسن وزیبائی کے ساتھ موصوف ہے اور ناشائستگی اور ناروائی سے دور ہے، اس طور پر کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خلقت کے کارخانہ میں ''خلقت'' اور ''زیبائی'' ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں اور یہ کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے، اگر خدا سب چیزوں کا خالق اور پیدا کرنے والا ہو تو پھر ظلم وستم ناشائستگیوں اور ناروائیوں کو حسن وزیبائی کا لباس کس طرح سے پہنایا جا سکتا ہے، جب کہ وہ سب کی سب قبیح اور نازیبا ہیں اس کے علاوہ یہ اعتراض صرف بندوں کے برے اور ناروا افعال کے مسئلہ میں ہی منحصر نہیں ہے، بلکہ اس بارے میں آفات اور بلاؤں کا وجود خود ایک دوسرا اعتراض ہے، کیونکہ اس قسم کے حوادث، جو انسان کے لیے ''بلا'' شمار ہوتے ہیں، خدا سے کیسے سرزد ہوتے ہیں؟

آیئے اس اعتراض کو زیادہ واضح صورت میں بیان کرتے ہیں:

ذیل میں بیان کردہ دو باتوں میں اعتراض ہے:

۱۔ بندوں کے برے کام خدا کی مخلوق کیسے ہو سکتے ہیں، اصولی طور پر یہی فکر اس بات کا سبب بنی ہے کہ متکلمین کا ایک گروہ افعال انسانی کو مطلقاً۔ چاہے وہ اچھے ہوں یا برے۔ انسان کی مخلوق سمجھتا ہے اور مقام ربوبیت سے ان کے ہر قسم کے ربط و تعلق کو منقطع جانتا ہے اور ان کو جس چیز نے اس بات پر آمادہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان کے کام خدا کے مخلوق ہوں تو پھر ظلم وستم کے کاموں کو خدا کی مخلوق کیسے کہا جا سکتا ہے؟

۲۔ عالم آفرینش میں بہت سی برائیاں، آفات اور بلائیں دیکھنے میں آتی ہیں تو پھر عادل وحکیم خدا کو ان برائیوں اور آفات کا خالق کیسے کہہ سکتے ہیں اور اسی سبب سے مجوسیوں کا گروہ عالم کے لیے دو خالق کا عقیدہ رکھتا ہے۔

۱۔ خیر اور اچھے کاموں کا خالق خدا بنام ''یزدان''

۲۔ آفات، بلاؤں اور شرور کا خالق خدا بنام ''اہریمن''

اب جب کہ قرآن ایک سے زیادہ خالق کا قائل نہیں ہے تو اس کا ان دونوں گروہوں کے لیے کیا جواب ہے؟ یعنی وہ ناشائستہ کاموں کو خدا کی طرف نسبت دینے کی کس طرح سے توجیہہ کرتا ہے اور شرور وآفات کو کس طرح سے مخلوق خدا جانتا ہے؟

جواب

قبیح اور برے کام دو جنبے رکھتے ہیں، دوسرے لفظوں میں ان کا دو طرح سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وجودی اور ثبوتی جنبے

۲۔ عدمی اور سلبی جنبے

جس ناشائستہ کام کو بھی آپ دیکھیں گے وہ وجود وہستی کے لحاظ سے قبیح اور نازیبا نہیں ہے، اگر وہ قبیح و نازیبا ہے تو دوسرے نقطہ نظر سے ہے، یعنی عدمی اور سلبی جنبیوں کی بنا پر ہے۔

مثلاً کسی مرد اور عورت کے تعلق کو دیکھیں جو غیر شرعی اور غیر قانونی صورت میں انجام پایا ہو تو اس قسم کا تعلق وجودی پہلوؤں کے لحاظ سے مشروع اور قانونی آمیزش کے ساتھ ملتا جلتا ہے، دونوں عمل عزیزہ جنسی کی فعالیت کا نتیجہ ہیں ان دونوں اعمال کے درمیان جو فرق ہے وہ صرف اتنا ہے کہ پہلے عمل کی خدا یا ملک کی، قوت مقننہ کی طرف سے اجازت نہیں ہے جب کہ دوسرا عمل قانون کے مطابق ہے اور اسے قوت مقننہ کی تائید حاصل ہے، اس بنا پر ''زنا'' میں قباحت اور برائی کا عامل، عمل کے غیر مشروع ہونے کی صفت ہے جو سو فیصد ایک عدمی چیز ہے اور خدا کی قدرت سے جو چیز تعلق رکھتی ہے وہ اس کا وجودی پہلو ہے نہ کہ اس چیز کا عدمی اور منفی پہلو، اصولی طور پر، عدمی امور اور منفی پہلو، اس سے کہیں زیادہ پست ہیں کہ ان سے قدرت اور خلقت کا تعلق قرار دیا جائے۔

آپ اس مثال میں غور و خوض کر کے ظلم و ستم، دھوکہ و فریب، حیلہ و بہانہ، جرم و خیانت جیسے دوسرے امور کا وضاحت کے ساتھ تجزیہ و تحلیل کر سکتے ہیں، مثلاً ظلم، اس لحاظ سے برا اور قبیح شمار ہوتا ہے کہ اس سے مظلوم کا حق ضائع ہو جاتا ہے اور معاشرے کو نیکی اور ہدایت سے روکتا ہے۔ بعینہ یہی سوال بلا و آفات مثلاً زلزلہ و سیلاب وغیرہ کے بارے میں درپیش ہے اور اس جواب کی وضاحت کے لیے ہم شرور کے بارے میں تحلیل و تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

بلاؤں اور شرور کے متعلق ایک تجزیہ [1]

جب کبھی بھی کوئی شر یا غیر مطلوب چیز نظر آتی ہے تو معمولی سی تحقیق کرنے پر معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اس لحاظ سے غیر مطلوب شمار ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ عدمی پہلو ہوتا ہے۔

مثلاً بیماری اس لحاظ سے نامطلوب ہے کیونکہ اس کی وجہ سے بیمار شخص کی صحت و عافیت مفقود ہو جاتی ہیں، نابینا اور بہرا شخص، اس لحاظ سے کہ وہ ایک مفکر اور فضائل سے آراستہ انسان ہے جس کے لیے بینائی اور شنوائی انتہائی مطلوب ہے، لیکن نابینائی اور ناشنوائی کوئی واقعیت نہیں ہے، جو نابینا شخص کی آنکھ میں اور بہرے شخص کے کان میں وجود میں آئی ہو، بلکہ ان کی واقعیت وہی بینائی اور شنوائی کا نہ ہونا ہے اور اس امر عدمی کے سوا اور کوئی واقعیت نہیں ہے۔

دوسرے موارد کا ان دونوں موارد سے موازنہ کرنے پر ہم دیکھیں گے کہ جہاں کہیں بھی بدی اور برائی کے بارے میں گفتگو ہے وہاں ہی ایک قسم کے فقدان اور نیستی کا ہاتھ ہے جو ہر فاعل اور پیدا کرنے والے سے بے نیاز ہے اور تمام برائیاں اور قباحتیں اس لحاظ سے بری اور قبیح ہیں کیونکہ ان میں ہستی و وجود مفقود ہوتا ہے اور عدم و نیستی لازم ہوتی ہے، درندے، تمام نقصان پہچانے والی چیزیں، بلائیں اور آفات میں سے ہر ایک، اس لحاظ سے بری ہیں کیونکہ ان سے ہر ایک ہستی کے سلسلہ کے مفقود ہونے تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور وہ کئی ہستیوں اور موجودات کو ختم

---

[1] مولف نے بلاؤں اور سرور کے بارے میں ان کے حکمت و عدل الٰہی سے ناسازگار ہونے کے لحاظ سے کتاب ''شناخت صفاتِ خدا'' ص ۲۲۷-۲۸۰ پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، شائقین اس کتاب کی طرف رجوع کریں۔

کر دیتی ہیں، کیونکہ یہ عوامل یا تو موت کا سبب بن جاتے ہیں، یا کسی عضو یا قوت کے ضائع ہونے کا سبب بنتے ہیں، یا استعدادوں کے رشد و پرورش میں مانع ہوتے ہیں اور اگر ان شرور میں اس قسم کے نتائج نہ ہوتے تو زلزلے اور نباتی و حیوانی آفتیں، کبھی بھی بری، قبیح یا شر شمار نہ ہوتیں۔

اگر جہالت و نادانی، موت اور فقر و فاقہ برے اور قبیح شمار ہوتے ہیں، تو ان کمیوں اور نقائص کی وجہ سے ہے جو ان موارد میں محسوس ہوتے ہیں، کیونکہ علم و کمال ایک واقعیت ہے، جو جاہل انسان میں موجود نہیں ہے اور حیات و زندگی ایک حقیقت ہے، جو مردہ آدمی میں موجود نہیں ہے اور فقیر نادار آدمی کے پاس وہ مال و ثروت نہیں ہے جس کے ذریعہ وہ زندگی بسر کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ''عالم میں ایک قسم کے وجود کے علاوہ اور کچھ موجود نہیں ہے اور وہ خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ ساری کی ساری برائیاں اور بدیاں، عدم اور نیستی کی قسم سے ہیں اور نیستی مخلوق نہیں ہے، بلکہ یہ ''خلق نہ کرنے سے'' ہے ''خلق کرنے سے'' نہیں ہے، اس بناء پر یہ نہیں کیا جا سکتا کہ عالم کے دو خالق ہیں، ایک ہستیوں کو پیدا کرنے والا اور دوسرا نیستیوں کا خالق، ہستی و نیستی کی مثال، سورج اور سایہ جیسی ہے، جب ہم شاخص کو دھوپ میں نصب کرتے ہیں تو ہم اس حصہ کو جو شاخص کی وجہ سے تاریک رہ گیا ہے اور سورج کی روشنی سے روشن نہیں ہوا، ''اسے ہم سایے کا نام دیتے ہیں، اب سایہ کیا ہے؟'' ''سایہ'' ظلمت ہے اور ظلمت نور اور روشنی کے نہ ہونے کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ روشنی خورشید عالم تاب کے مرکز سے شعاعیں بن کے نکلی ہے، تو اب یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ سایہ اور ظلمت کسی چیز سے وجود میں آیا ہے، بلکہ یہ دونوں (سایہ اور ظلمت) چیزیں کس چیز سے (شعاع بن کر) نہیں نکلیں اور نہ ہی ان کا اپنا کوئی مستقل مبدء اور مرکز ہے۔

خداوند عالم کی طرف سے، شرور و آفات کے صدور کے بارے میں ایک دوسری توجیہہ بھی ہے، جسے ہم اب قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

شرور کے بارے میں ایک اور تحلیل

شرور کے بارے میں اس سے پہلے جو تحلیل پیش کی گئی ہے علماء نے ''مثنویوں'' (دو خالقوں کے ماننے والوں) کے استدلال کا جو پہلا جواب دیا ہے، وہ تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے اور اس سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ برائیاں اور قباحتیں عدمی چیز ہیں اور امور عدمی کو جو ایک قسم کا فقدان ہے، کسی خالق و آفریدگار کی کوئی احتیاج نہیں ہے، اب ہم دوسری وضاحت کے ساتھ ان کا جواب دیتے ہیں۔

شر نسبی چیز ہے

علماء کی اصطلاح میں ''حقیقی'' اور ''نسبی'' کے الفاظ رائج ہیں اور بہت سے انسانی اور تجرباتی علوم میں استعمال ہوتے ہیں اور وضاحت کے عنوان سے ہم کہتے ہیں جس وجود کی بھی ہم کسی صفت کے ساتھ توصیف کرتے ہیں تو وہ دو حال سے خارج نہیں ہے یا تو ہر چیز سے قطع نظر، وہ صفت اس موجود میں ہر حال میں پائی جاتی ہے تو اس صفت کو ہم صفت ''حقیقی'' کہتے ہیں۔

مثلاً ایک زندہ موجود مطلقاً زندہ ہے اور صفت حیات اس کے لیے حقیقتاً ثابت ہے اور صفت ''حیات'' سے اس کی توصیف کرنے میں ہمیں کسی قسم کے قیاس یا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں ہے تو اس جہت سے یہ کہنا پڑے گا کہ ایک زندہ موجود کے لیے حیات ایک حقیقی اور واقعی وصف ہے۔

ہر میٹر سو سینٹی میٹر کے برابر ہوتا ہے، یہ واقعیت ہر میٹر کے لیے تمام حالات میں ثابت ہے اور ''میٹر'' کی اس مقدار کے ساتھ توصیف کے لیے ہم کسی قسم کے قیاس اور لحاظ کے محتاج نہیں ہیں۔

اس کے مقابلہ میں ''نسبی اوصاف'' میں اس معنی میں کہ جب تک ہم کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ قیاس نہ کریں اور کسی دوسرے موجود کو درمیان میں نہ لائیں، اسے کسی طرح سے بھی اس صفت کے ساتھ موصوف نہیں کیا جا سکتا۔

مثلاً چھوٹا یا بڑا ہونا نسبی اوصاف میں سے ہے نہ کہ حقیقی اوصاف میں سے اور ایک ہی چیز ایک لحاظ سے چھوٹی اور دوسرے لحاظ سے بڑی ہو سکتی ہے، مثلاً کرۂ زمین، چاند کے کرہ سے بڑا ہے، لیکن کرہ خورشید سے چھوٹا ہے، تو کرۂ زمین کا چھوٹا ہونا یا بڑا ہونا کوئی حقیقی اور واقعی صفت نہیں ہے، جو اس کرۂ کی حقیقت میں داخل ہو، ورنہ دو متضاد صفات کے ساتھ اسے موصوف کرنا ممکن نہیں تھا، بلکہ یہ دونوں صفات، کرۂ زمین کی ایک ایسی حالت ہے، جو دوسرے دو کروں کے ساتھ اس کا موازنہ کرنے سے، اس پر عارض ہوتی ہے اور ہم اس کی ان دو صفات کے ساتھ توصیف کر سکتے ہیں، سفیدے کا ایک درخت ایک پرانے چنار کے درخت کی نسبت چھوٹا ہے لیکن انار کے درخت کی نسبت بہت بڑا ہے، تو مسلمہ طور پر بڑا ہونے یا چھوٹا ہونے کی کوئی واقعیت ثابت نہیں ہے ورنہ اس میں تغیر اور دگرگونی نہ ہوتی، بلکہ یہ ایک نسبی مفہوم ہے، جسے ہمارا ذہن دوسری چیز کی نسبت سے ایجاد کرتا ہے۔

اس قیاس سے ایک فلسفی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو چیزیں کچھ واقعیت رکھتی ہیں اور واقعیت رکھنے کی بنا پر فاعل اور پیدا کرنے والے کی محتاج ہیں، وہی اشیاء کی ''حقیقی صفات'' ہیں، جو اس شے کے وجود کی طرح سے واقعیت کی حامل ہیں، نہ کہ سلبی صفات جو کسی بھی خارجی واقعیت کی حامل نہیں ہوتیں، بلکہ وہ قیاس کرتے وقت ہمارے ذہن کی ساختہ اور ہمارے فکر کی مخلوق ہوتی ہے، اسی بنا پر انہیں کسی خالق اور پیدا کرنے والے کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ ان کی کوئی حقیقت وواقعیت نہیں ہوتی جس کے لیے خالق کی ضرورت ہو۔

ایک سلول کی حیات وزندگی، یا ایک میٹر کا ''سوسینٹی میٹر'' ہونا، ایک خارجی واقعیت کا حامل ہے اور جب تک ان دونوں کے ساتھ کوئی دوسری واقیعت (علت) نہ ہو، جو ان کے بدن پر لباس ہستی پہنائے، اس وقت تک وہ ہرگز بھی کسی قسم کی واقعیت اور ہستی کا کوئی رنگ پیدا نہیں کر سکتے۔

لیکن اس کے مقابلہ میں کرۂ زمین اور سفیدے کے درخت کا چھوٹا ہونا اور بڑا ہونا خارج میں ایک ثابت اور مسلمہ واقعیت نہیں ہے، جن کے لیے خالق وآفریدگار کی ضرورت ہو، وہ چیز جسے خالق اور آفریدگار کی ضرورت ہے وہ خود کرۂ زمین یا سفیدے کے درخت کا وجود ہے لیکن ان کا چھوٹا یا بڑا ہونا ہمارے ذہن کی پیداوار اور ایک خیالی چیز ہے جو دو جسموں پر قیاس کرنے سے ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔

اس بیان سے شرور وآفات کی حقیقت کو معلوم کیا جا سکتا ہے اور اس بات کو سمجھا جا سکتا ہے کہ شر و بدی دونوں قسم کی صفات میں سے کون سی صفت ہے، کیا بدی ایک حقیقی صفت ہے یا ایک نسبی صفت ہے؟

معمولی سی تحقیق اور مطالعہ سے ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ برائیاں اور شرور ایک قسم کے نسبی امور ہیں، حقیقی اور واقعی نہیں ہیں اور کوئی بھی موجود اپنی ذات کی حد تک ہرگز بھی برا نہیں ہے اور بدی ایک قسم کی ایسی حالت ہے جو دو چیزوں کے درمیان قیاس کرنے کے موقع پر ظہور میں آتی ہے۔

مثلاً سانپ اور بچھو کو زہر اور بھیڑیے کی درندگی، خود ان کے لیے کوئی بری چیز نہیں ہے اور ان کے وجود کے ساتھ انتہائی سازگار ہے اور ان کے تکامل وارتقا اور زندگی کی بقا کا سبب ہے لیکن وہ صرف اس بنا پر بری ہے کہ وہ انسان کی فنا اور اس کو نقصان پہنچنے کا سبب بن جاتی ہے۔

سیلاب لانے والی بارش کا برسنا، ہرگز اس کی ذات کی حد تک برا نہیں ہے بلکہ دو چیزوں کے درمیان قیاس کرنے کے موقع پر، ان دو صفات میں سے کسی ایک صفت کے ساتھ اس کی توصیف کی جاتی ہے۔ مثلاً اگر وہ کسی مناسب فصل میں برسے اور اس کے ذریعہ جنگل، باغ اور کھیتیاں سرسبز وشاداب ہو جائیں، تو یہ اچھی اور خیر وبرکت والی ہوگی، لیکن اس لحاظ سے کہ وہ بیابان کے کنارے پر مٹی سے بنے ہوئے چار گھروں کی خرابی وویرانی کا سبب بن جاتی ہے، لہٰذا اسے شر اور بدی کا نام دیا جاتا ہے۔

اس بنا پر اگر بدی اور قبیح امور اوصاف حقیقی میں سے ہوتے اور وہ کوئی حقیقی وجود رکھتے ہوتے، تو اس صورت میں تو یہ گنجائش تھی کہ کوئی شخص اس کے خالق اور فاعل کے پیچھے جاتا اور یہ کہتا کہ وہ مبدا جو خیر مطلق ہے، اس کا ان شرور کے ساتھ کوئی ربط اور تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا ضرور کسی دوسرے مبدا کو ماننا پڑے گا، جو ان شرور کے ساتھ ربط رکھنے کی وجہ سے انہیں پیدا کرے۔

لیکن اگر وہ چیز جو واقعیت رکھتی ہے، خود بچھو کا زہر ہو اور اس بنا پر کہ وہی ایک واقعیت وحقیقت ہے، وہ پیدا کرنے والے کے وجود

سے بے نیاز نہیں ہوگا، لیکن اس کا بدی اور شر ہونا کوئی دوسری واقعیت نہیں ہے جو بچھو کے زہر کے ساتھ ضمیمہ ہو اور اس کو بھی کوئی وجود اور ہستی قرار دیا جائے اس صورت میں اس کے پیدا کرنے والے کی بحث بے معنی ہوگی کیونکہ شر اس معنی میں کوئی واقعیت نہیں ہے کہ ہم اس کے فاعل اور پیدا کرنے والے کو تلاش کرتے پھریں۔

دوسرے لفظوں میں وہ خدا جس نے زہر رکھنے والا بچھو پیدا کیا ہے، اس نے دو مستقل کام انجام نہیں دیئے ہیں، ایک یہ کہ بچھو کو ڈنگ اور زہر کے ساتھ پیدا کیا ہو، دوسرے یہ کہ اسے شر اور بد پیدا کیا ہو، بلکہ اس نے ایک سے زیادہ کام انجام نہیں دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نے ایک ایسے موجود کو لباس ہستی پہنایا ہے اور یہ ہم ہیں جو ایک موجود کا کسی دوسرے موجود کے ساتھ قیاس اور موازنہ کرتے ہیں اور اس کے بعد ہم اس کی بدی اور قبیح ہونے کے ساتھ توصیف کرتے ہیں۔

اس مقام سے اس جملہ کی حقیقت کو معلوم کیا جا سکتا ہے، جو فلاسفہ اسلام نے، پیدا کرنے والے کی طرف شرور کی نسبت کے بارے میں بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں: عالم کے تمام موجودات، اس لحاظ سے کہ وہ وجود ہستی کے حامل ہیں، خدا کی مخلوق اور اس کے بالذات معلول ہیں، لیکن بدی اور قباحت کے ساتھ موصوف ہونے کے لحاظ سے ان کا آفرینش اور خلقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ مبدا آفرینش کے ساتھ ایک عرضی اور مجازی نسبت ہے۔

آٹھواں حصہ

توحید درربوبیت

عالم کا اصلی اور مستقل مدبر و مدیر صرف ایک ہی ہے اور دوسرے علل و اسباب کے کام اس کی قدرت کے ماتحت ہیں

اس حصہ میں

۱۔ زمانہ جاہلیت کے عرب خالق عالم کے یکتا و یگانہ ہونے کے بارے میں تقریباً ایک ہی نظریہ پر متفق تھے۔

۲۔ اس مسئلہ کے برخلاف، توحید درربوبیت وتدبیر کے موضوع پر ان میں اتفاق نہیں تھا۔

۳۔ بابل میں ابراہیم کے زمانہ کے مشرکین، مختلف ارباب اور مدبروں کا عقیدہ رکھتے تھے اور اصطلاح کے مطابق توحید ربوبی کے قائل نہ تھے۔

۴۔ شرک مکہ کی سرزمین میں عمرو بن لحی کے ذریعہ شرک درربوبیت کی صورت میں وارد ہوا۔

۵۔ آیہ "ولا تذرن ودا ولا سواعا ولا یغوث ویعوق ونسرا" کی تفسیر میں مفسرین کا نظریہ۔

۶۔ کیا لفظ "رب" کے کئی معانی ہیں، یا "رب" کے ایک سے زیادہ معنی نہیں ہیں اور وہ وہی ہستی ہے جو کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو۔

۷۔ وہابیوں کے نظریہ کے برخلاف "توحید درربوبیت" توحید درخالقیت کے معنی میں نہیں ہے اور بہت سی آیات اس مطلب کی گواہی دیتی ہیں۔

۸۔ قرآن جہان کے لیے ایک سے زیادہ رب اور ایک سے زیادہ مدیر کا قائل نہیں ہے۔

۹۔ فلسفی لحاظ سے تدبیر خلقت ہی کی ایک شاخ ہے اور ان دونوں کے درمیان ہرگز جدائی نہیں ڈالی جاسکتی۔

۱۰۔ نظام کی وحدت، مدیر کی وحدت کی دلیل ہے۔

۱۱۔ آیہ "قل لو کان فیہما الهة الا الله لفسدتا" کی دو طرح سے تفسیر کی جاسکتی ہے۔

۱۲۔ دوسرے مدبرین عالم کی ذمہ داری کیا ہے۔

۱۳۔ وہ دس موارد جن میں قرآن ایک چیز کی خدا کی طرف نسبت دیتا ہے اور ان دونوں نسبتوں کے درمیان معمولی سا بھی فرق نہیں ہے۔

۱۴۔ نیکی اور بدی دونوں خدا کی طرف سے ہیں اور ایک معنی کے لحاظ سے نیکی خدا کی طرف سے اور بدی انسان کی طرف سے ہے، ان آیات کی وضاحت جو اس سلسلہ میں وارد ہوتی ہیں۔

توحید در ربوبیت یا توحید در تدبیر و کارگردانی

قرآنی آیات میں غور کرنے اور تاریخ کی کتابوں میں بت پرستوں کے عقائد کا مطالعہ کرنے سے، واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ توحید در خالقیت کے موضوع پر، ان کے درمیان کامل اتفاق تھا اور ان کا اشتباہ اور لغزش دوسرے مراحل مثلاً ''توحید در تدبیر'' اور ''توحید در عبادت''، میں تھی۔

اور زیادہ واضح الفاظ میں، ان سب کا یا ان میں سے اکثر کا اس نظریہ پر اتفاق تھا کہ عالم کا ایک سے زیادہ خالق و آفریدگار نہیں ہے اور تمام چیزوں کی خلقت و آفرینش اسی کے ساتھ مربوط و مخصوص ہے اور جہان کی خلقت میں اس کا کوئی شریک اور ساتھی نہیں ہے اور یہ حقیقت قرآن میں بار ہا وارد ہوئی ہے، جن میں سے ہم صرف ایک ہی کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ﴿٦١﴾ (عنکبوت)

البتہ زردشت کے دین میں عالم کے لیے دو خالقوں کے وجود کا اعتقاد ''یزدان'' و ''اہرین'' کے نام سے مشہور ہے۔[1]

اگر چہ ان مسائل میں اس کا عقیدہ بہت ہی زیادہ مبہم ہے۔

نہ صرف اسی گروہ کے عقیدہ میں ابہام پایا جاتا ہے بلکہ برہمنوں، بدھوں اور ہندوؤں کے مذاہب کے عقائد بھی وحدت خالق یا اس کے تعدد کے مسئلہ میں، چنداں واضح نہیں ہیں[2] اور چونکہ ان کے عقائد کے بارے میں تحقیق ہماری بحث سے خارج ہے، اس بنا پر ہم اپنی ہی بحث کو جاری رکھتے ہیں۔

گذشتہ آیات کی طرف رجوع کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کے بت پرست ''توحید در خالقیت'' کے مسئلہ میں اشکال اور لغزش سے دوچار نہیں تھے، اگر چہ انہوں نے ''توحید در خالقیت'' کو اس طرح سے، جیسا کہ قرآن تشریح کرتا ہے[3]۔ نہیں سمجھا تھا، لیکن اجمالی طور پر ان کا یہی عقیدہ تھا کہ عالم کا ایک سے زیادہ خالق نہیں ہے اور وہی آسمان و زمین کا خالق ہے، لیکن ''تدبیر در خلقت'' کے مسئلہ میں، کچھ فلسفی مکاتب کی پیروی کرتے ہوئے ایک گروہ، مشرک تھا، لیکن سب ایسے نہ تھے، ان مشرکین کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا نے آفرینش عالم کے

---

[1] ملل و نحل ج ۱ ص ۲۱۷ ط مصر

[2] مولف کتاب ''العقائد الوثنیه فی الدیانة النصرانیة'' نے اس حصہ میں قابل توجہ تحقیق کی ہے۔

[3] ہم اس بحث کے آخر میں بتلائیں گے کہ قرآن کے مطابق شرک در تدبیر، شرک در خلقت کی طرف لوٹتا ہے، اگر چہ اس زمانہ کے لوگ اس سے غافل تھے اور ان دونوں اقسام میں شرک کے قائل تھے۔

بعد، بعض امور خلقت کی تدبیر، اپنی برتر مخلوقات میں سے کسی ایک کے سپرد کر دی ہے اور خود ایک طرف ہو گیا ہے، ان کی نظر میں یہ برتر مخلوق فرشتے، جن، ارواح مقدسہ اور ستارے وغیرہ تھے اور ان میں سے ہر ایک ان کی نظر میں اس جہان کے کسی ایک گوشہ کا مدبر تھا۔

اپنے دعویٰ کو دلیل و برہان کے ساتھ پیش کرنے کے لیے ہم اپنے قارئین کی توجہ قرآن کے نزول کے زمانہ میں اس قسم کے شرک کے وجود کے دلائل کی طرف منعطف کراتے ہیں، ان دلائل کی طرف توجہ کرنے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں اور اس سے پہلے شرک در تدبیر کے وجود کے بارے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے اور یہ جو بعض اوقات تصور ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عرب یا گذشتہ قومیں بتوں کو بارگاہِ الٰہی میں صرف شفیع سمجھتے تھے اور بس، یہ کلی اور عمومی بات نہیں ہے، بلکہ یہ مطلب، شرک در تدبیر، ان میں سے اکثر لوگوں کا عقیدہ تھا۔

شرک در تدبیر کے وجود کے دلائل

مختلف اور گونا گوں مدبرین کے وجود کے اعتقاد پر واضح ترین گواہ ابراہیمؑ کے زمانہ میں ستارہ پرستوں کے خلاف ابراہیمؑ کے احتجاج کا واقعہ ہے اور وہ سب کے سب ستارہ، چاند اور سورج کو (خالق اور افریدگار ہونے کے لحاظ سے نہیں بلکہ) ''رب'' اور پروردگار کے عنوان سے پرستش کرتے تھے، ان کا خیال یہ تھا کہ نچلا نظام اوپر والے نظام کے اختیار میں ہے اور ان کی تدبیر انہیں تفویض اور سپرد کر دی گئی ہے۔ اسی عقیدہ کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے افول وغروب کے طریقہ سے ان کی ربوبیت کو باطل کیا، اب ہم حضرت ابراہیمؑ کے استدلال میں کچھ غور و فکر کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ ستارہ کے افول وغروب کو سامنے رکھ کر کس چیز کو ثابت کر رہے تھے اور کس چیز کی نفی کر رہے تھے۔

اگر قوم ابراہیمؑ کے نظریہ کے مطابق، یہ ستارے موجودات زمینی کے جن میں سے انسان بھی ہیں۔ مدبر و مدیر ہیں (اور اس سبب سے کہ مورد تربیت فرد کا نظام زندگی اس کے اختیار میں ہے اور وہ اس کی توجہ کے زیر سایہ زندگی بسر کرتا ہے اور کمال کی طرف پیش رفت کرتا ہے) تو اس کا مورد تربیت موجودات کے ساتھ ہمیشہ لگاؤ اور ارتباط ہونا چاہیے تا کہ وہ ان کی تدبیر کرتا رہے اور اس قسم کا ارتباط مدیر کی بے خبری اور افول وغروب کے ساتھ سازگار نہیں ہے، اس بنا پر اجرام فلکی کا افول وغروب اس بات کا واضح گواہ ہے کہ وہ ہرگز موجوداتِ زمینی کے مدیر اور کارگردان نہیں ہیں۔

لیکن اگر ابراہیمؑ کی قوم، ان اجرمِ فلکی کی اس بنا پر پرستش کرتی ہوتی کہ وہ مقدس موجودات ہیں جن کی پرستش قرب الٰہی کا سبب ہے اور بس تو اس صورت میں صفحہ آسمان سے ان کا غروب وافول، وہ بھی عبادت کے وقت کے علاوہ، ابراہیمؑ کی قوم کے نظریہ کے بطلان کی دلیل نہیں ہوسکتا، بلکہ صرف عبادت کے موقع پر ان کا موجود ہونا کافی ہے تا کہ ان کی پرستش ہو، اس کے علاوہ تمام اوقات میں پرستش کرنے والوں کے سامنے حاضر اور ان پر ناظر رہنا ضروری نہیں ہے۔

اسی بناء پر ابراہیمؑ تمام مراحل میں لفظ ''رب'' کو ہی استعمال کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: ''ھذا ربی'' اور ''رب'' عربی زبان میں اسی متصرف اور مدبر و مدیر کو کہتے ہیں جو کسی چیز کی تدبیر اور ادارہ کرنے کا ذمہ دار ہو اور یہ سرگذشت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ، ابراہیمؑ کے زمانہ

میں شرک ربوبی کے وجود پر گواہ ہے۔

شرک درربوبیت، بالکل اسی چیز کے مشابہ ہے کہ کوئی شخص ایک گھر بنوانا چاہتا ہے وہ بہت سا تعمیراتی ساز وسامان معمار کے سپرد کر دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ اس کے لیے ایک گھر بنادے، تو اس صورت میں تعمیراتی ساز وسامان تو مالک کی طرف سے ہوگا، لیکن انہیں استعمال کرنا اور کام میں لانا معمار و بناء و کاریگر کے ساتھ مربوط ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک جس طرح سے چاہیں اس مکان کو بناڈالیں۔

اس گروہ کے عقیدہ کے مطابق، موجودات عالم میں سے ہر ایک چاند اور ستارے، حیوان وانسان، درخت اور پتھر............ جہانِ خلقت کے تعمیراتی ساز وسامان کی طرح ہیں اور خدا ان کو پیدا کرکے، عالم کے مواد کو "ارباب" و "الهہ" کے حوالے کر دیتا ہے، اس کے بعد وہ پورے استقلال و آزادی کے ساتھ عالم کی تدبیر اور کارگردانی کرتے ہیں۔

اس گروہ کا عقیدہ یہ تھا کہ مقام خلقت، تدبیر و کارگردانی کے مقام سے الگ چیز ہے! وہ چیز جو خدا کے ساتھ مربوط ہے وہ صرف خلقت وآفرینش ہے، لیکن چونکہ تدبیر خلقت سے الگ ہے، اس بنا پر تدبیر دوسرے موجودات کے ساتھ مربوط ہے، جو اس جہان کا اختیار رکھتے ہیں اور جہان آفرینش کی تدبیر اور کارگردانی انہیں تفویض اور سپرد ہوئی ہے اور خدا جہان خلقت کے کسی ایک حصہ کی، یا ان تمام کی تدبیر کرنے میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔

۲۔ مکہ اور اس کی اطراف میں بت پرستی شرک درربوبیت کی صورت میں وارد ہوئی اور عمرو بن لحی کی سرگذشت اس بات پر واضح گواہ ہے کہ شام کے لوگ بتوں کو امور عالم کے ایک حصہ کا مدبر و کارگردان سمجھتے تھے۔

ابن ہشام لکھتا ہے: پہلا شخص جس نے مکہ اور اس کی اطراف میں بت پرستی وارد کی، وہ عمرو بن لحی تھا، اس نے اپنے سفر "بلقائ" میں جو شام کا علاقہ ہے، ایک گروہ کو دیکھا جو بتوں کی پوجا کرتے تھے، اس نے ان کی پرستش پر وجہ پوچھی تو انہوں نے اس کے جواب میں کہا: یہ ایسے بت ہیں جن کی ہم پرستش کرتے ہیں اور انہیں سے ہم مدد طلب کرتے ہیں، وہ ہمارے لیے بارش برساتے ہیں، ہم ان سے مدد مانگتے ہیں تو وہ ہماری مدد کرتے ہیں، عمرو نے ان سے کہا کیا تم ان میں سے ایک بت مجھے نہیں دیتے کہ میں اسے سرزمین عرب میں لے جاؤں تا کہ وہ بھی اس کی پرستش کریں؟ انہوں نے اسے "ھبل" نامی بت دیا اور وہ اسے اپنے ہمراہ لے کر آیا اور کعبہ کی چھت پر اسے رکھ دیا اور لوگوں کو اس کی پرستش کی طرف دعوت دی۔[1]

بارش طلب کرنا اور مدد چاہنا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ وہ بتوں کو عالم کی تدبیر و کارگردانی اور انسان کی زندگی میں دخیل سمجھتے تھے اور وہ ان کے لیے اس قسم کے کاموں کے کرنے کے قائل تھے۔

یہ تصور نہ ہو کہ وہ ان لکڑی کے بتوں کو متصرف اور عالم طبیعت کا کارگرداں و مدبر سمجھتے تھے تا کہ یہ کہا جائے کہ کوئی بے عقل بھی لکڑی اور دھات کے بت کو اس قسم کے حوادث اور رودادوں کا مبدا خیال نہیں کرتا بلکہ لکڑی کے بت ان کی نظر میں ان متصرف خداؤں کی واقعی صورت

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ا ص ۷۹

کو نمایاں کرنے والے تھے، جنہیں عالم کی تدبیر و کارگردانی تفویض اور سپرد کی گئی ہے اور چونکہ ان کے لیے حس اور لمس سے دور موجود کی پرستش مشکل اور پیچیدہ تھی، اس لیے ان کی صورتوں کو لکڑی اور دھات کے بتوں کے قالب میں ڈھال کر خود معبود کی پرستش کی بجائے ان کی ملموس صوتوں کی پوجا کیا کرتے تھے اور اس حصہ کی تفصیل بارہویں حصہ میں بیان ہوگی۔

اسلامی مفسرین لکھتے ہیں: ''ود'' و ''سواع'' و ''یغوث'' و ''یعوق'' و ''نسر'' خدا کے صالح اور نیک بندوں میں سے تھے اور کچھ لوگ ان کی پیروی کیا کرتے تھے، جب وہ اس دنیا سے چلے گئے، تو ایک گروہ نے اس خیال سے کہ اگر وہ ان کی تصویروں پر نظر رکھیں گے تو خدا کی بہتر طریقہ پر عبادت کر سکیں گے، ان کی تصویریں بنالیں اور پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ان کی تصویروں کو ہی پوجنے لگ گئے۔[1]

۳۔ محقق معاصر آقائے جواد علی نے کتاب ''المفصل'' میں جو اسلام سے پہلے کے عربوں کی تاریخ میں لکھی ہے اور جو آٹھ ضخیم جلدوں میں چھپی ہے اور جس میں مولف نے حد سے زیادہ تحقیق کے ساتھ اسلام سے قبل کے عربوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں گفتگو کی ہے، جھوٹے معبودوں کے بارے میں ان کے عقائد کی کیفیت کو اس طرح سے لکھتا ہے۔

اسلام سے پہلے کے عربوں کے دینی واقعات کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہے، اس بنا پر بعض مستشرقین یورپ نے یہ خیال کر لیا ہے کہ عرب اپنے خداؤں کے بارے میں، یونانیوں، رومیوں، پارسیوں، آریاؤں اور سامیوں کے خداؤں کے افسانوی عقائد نہیں رکھتے تھے اس کے باوجود خداؤں کے بارے میں ان کے عقائد کا ان کے ناموں کے ذریعے اندازہ لگایا جا سکتا ہے چونکہ ان کے بعض خدا ''ود'' و ''سعد'' جو محبت اور خوشبختی کے خدا کے معنی میں ہے، معروف تھے۔[2]

۴۔ روشن فکر گروہ خدا کے علاوہ کسی اور مدبر کا معتقد نہیں تھا اور وہ بتوں کو بارگاہِ خدا میں شفاعت کرنے والے[3] اور ان کی عبادت کو تقرب کا ایک وسیلہ[4] سمجھتے تھے اور بہت سی آیات اس مطلب پر گواہ ہیں جن میں سے ایک کو ہم یہاں پر نقل کر رہے ہیں:

قُلۡ مَنۡ يَّرۡزُقُكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اَمَّنۡ يَّمۡلِكُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَمَنۡ يُّخۡرِجُ الۡحَىَّ مِنَ الۡمَيِّتِ وَيُخۡرِجُ الۡمَيِّتَ مِنَ الۡحَىِّ وَمَنۡ يُّدَبِّرُ الۡاَمۡرَ‌ؕ فَسَيَقُوۡلُوۡنَ اللّٰهُ‌ۚ فَقُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۳۱﴾ (یونس)

''کہ دو وہ کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ وہ کون ہے جو کانوں اور آنکھوں کا

---

[1] مجمع البیان ج ۱۰ ص ۳۶۴ طصیدا

[2] المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام ج ۶ ص ۹۱

[3] وَيَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمۡ وَلَا يَنۡفَعُهُمۡ وَيَقُوۡلُوۡنَ هٰٓؤُلَاۤءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ‌ؕ (یونس ۱۸)

[4] مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰىؕ (زمر ۳)

مالک ہے؟ وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ وہ کون ہے جو امر آفرینش و خلقت کی تدبیر کرتا ہے؟ تو وہ یہی کہیں گے کہ وہ تو خدا ہی ہے کہ دو کہ پھر تم تقویٰ اور پرہیزگاری کیوں اختیار نہیں کرتے۔''

لیکن اس بات کے اعتراف کے باوجود انتہائی صراحت کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ سب کا عقیدہ اس آیت کے مفاد کے مطابق نہیں تھا، بلکہ ایک گروہ اپنے جھوٹے خداؤں کے بارے میں غیبی قدرتوں اور عالم آفرینش میں تصرفات کا معتقد تھا، خصوصاً وہ لوگ جو اپنے خداؤں کو فرشتوں، جنوں اور ارواح مقدسہ میں سے اختیار کرتے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ زمانہ جاہلت کے عربوں کی بت پرستی پورے طور پر غلط اور جاہلانہ تھی اور وہ کسی فکری نظام کے ماتحت نہیں تھی اور ہرگز یونانیوں اور پارسیوں کی طرح نہ تھی کہ ان کی بت پرستی کسی فلسفہ کی بنیاد پر استوار ہو، لیکن اس کے باوجود ان میں سے ایک گروہ اپنے بتوں کی ربوبیت اور کارگردانی کا معتقد تھا اور یہ مطلب ان آیات سے معلوم ہو جائے گا جو بعد میں نقل ہوں گی۔

اس سے پہلے کہ ہم ان آیات کے متون، جو شرک در تدبیر کے وجود پر گواہی دیتی ہیں پیش کریں، ضروری ہے کہ لفظ ''رب'' کا معنی کہ ''ربوبیت'' بھی اسی سے مشتق ہے، پورے غور اور باریک بینی کے ساتھ معلوم کریں۔

عربی زبان کا لغت شناس ابن فارس کہتا ہے:

لفظ ''رب'' مالک، خالق صاحب اور اس شخص کے لیے جسے کسی چیز کی تربیت کے اصلاح سپرد کی گئی ہو استعمال ہوتا ہے۔ [1]

فیروز آبادی لکھتا ہے کہ ''رب'' مالک، مستحق اور صاحب کے معنی میں ہے، اس کے بعد کہتا ہے بعض اوقات مصلح کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً رب الامر اصلحہ [2] (یعنی امر کی اصلاح کی)

المنجد میں لکھا ہے: ''رب'' مالک، بزرگ اور مصلح کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور لغت کی دوسری کتابیں بھی تقریباً یہی معانی و مضامین لکھتی ہیں۔

کیا لفظ رب کے متعدد معانی ہیں؟

لغت کے لکھنے والوں کا کام، ایسے موارد و مواقع کو ضبط تحریر میں لانا ہے کہ جن میں لفظ استعمال ہوتا ہے، لیکن اس بات کی تحقیق کرنا کہ کیا یہ لفظ پہلے دن سے ہی انہی چند موارد و مواقع کے لیے وضع ہوا ہے یا یہ کہ اس لفظ کا پہلے دن سے ایک سے زیادہ معنی نہیں تھا، لیکن مرور زمانہ سے اور کئی مناسبتوں کی بنا پر ان موارد و مواقع میں جو اس واقعی معنی کے مصادیق اور شاخیں سمجھے جاتے ہیں استعمال ہوا ہے۔ ہرگز لغت لکھنے

---

[1] مقاییس اللغۃ ج ۲ ص ۳۸۱

[2] قاموس اللغۃ ج ۱ ص ۷۰ طمصر

والوں کے ذمہ نہیں رہا ہے۔

عربی زبان میں یہ چیز اچھی طرح سے نظر آتی ہے کہ بعض اوقات لغت کی کتابیں لکھنے والے ایک لفظ کے کئی کئی معانی بیان کرتے ہیں کہ انسان پہلی نظر میں یہ خیال کرتا ہے کہ یہ لفظ واقعاً دسیوں علیحدہ علیحدہ معانی رکھتا ہے اور الفاظ کو وضع کرنے والے نے اس لفظ کو دس بار دس معانی کے لیے وضع کیا ہے، لیکن تحقیق کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بیان کردہ لفظ کا ایک سے زیادہ معنی نہیں ہے اور باقی معانی اس اصل معنی کے مشتقات، اس کی شاخیں اور حقیقت میں اس اصل معنی کی وسیع شکل وصورت ہوتے ہیں۔

اتفاق سے لفظ ''رب'' بھی اسی قسم کی سرنوشت سے دو چار ہوا ہے، یہاں تک کہ ''مودودی'' جیسے لکھنے والوں نے خیال کیا ہے کہ لفظ ''رب'' کے پانچ معانی ہیں اور ہر معنی کے لیے اس قرآن سے شواہد پیش کیے ہیں۔[1]

اس میں شک نہیں ہے کہ لفظ ''رب'' قرآن ولغت میں، ذیل کے موارد میں جو ایک ہی معنی کی وسیع اور پھیلی ہوئی شکل ہے، استعمال ہوا ہے۔

۱۔ تربیت وپرورش، مثلاً: رب الولد رباہ، اس نے بیٹے کی پرورش وتربیت کی۔

۲۔ نگرانی اور وضع وکیفیت کی اصلاح: رب ضیعته اس نے اپنے کھیت کی اصلاح کی۔

۳۔ حکومت وسیاست، مثلاً: قد رب فلان قومه، ساسهم وجعلهم ینقادون له اس نے اپنی قوم پر حکومت وریاست کی اور انہیں اپنا مطیع وفرمانبردار بنایا۔

۴۔ مالک: حدیث میں وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ارب غنم ام رب ابل، تو بھیڑوں کا مالک ہے یا اونٹوں کا۔

۵۔ صاحب: رب الدار، صاحب خانہ، قرآن میں آیا ہے: فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ﴿۳﴾ (قریش) اس گھر والے کی عبادت کرو۔

اس میں شک نہیں کہ یہ لفظ ان موارد میں اور ان سے مشابہ موارد میں استعمال ہوتا ہے، لیکن کیا یہ سب مختلف اور علیحدہ علیحدہ معانی اسی لفظ کے ہیں، یا یہ ہے کہ یہ سب کے سب ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں اور یہ سارے ایک ہی معنی کی مختلف صورتیں اور اس کے متعدد مصادیق ہیں اور لفظ ''رب'' کا ایک سے زیادہ معنی نہیں ہے اور وہ، وہ ہستی ہے جس کے ذمہ کسی چیز یا کسی انسان کی تدبیر سپرد ہو۔

اگر بچے کے مربی کو ''رب'' کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کے تربیتی امور اور پرورش اس کے سپرد ہے۔ اگر کھیت والے کو ''رب'' کے نام سے پکارتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کھیت اور زراعت کے امور کی اصلاح اس کے ساتھ مربوط ہے۔

اگر کسی گروہ کے رئیس وسردار کو ''رب'' کہتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ اس گروہ کے اجتماعی اور سیاسی امور اس کے سپرد ہیں اور وہ

---

[1] المصطلحات الاربعہ ص ۱۴

اپنے گھر کا ذمہ دار اور اختیار دار ہے۔

اگر گھر کے مالک یا صاحب کو (چاہے وہ مالک نہ بھی ہو) ''رب'' کہتے یں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک اور گھر کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کو ادارہ کرنا اور اس میں تصرف کرنا اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔

اس بناء پر مربی، مصلح، رئیس، مالک اور اس سے مشابہ معانی ایک اصل معنی کی وسیع صورتیں ہیں، جو ان تمام موارد میں موجود ہیں اور انہیں ہرگز لفظ ''رب'' کے مختلف معانی شمار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اصل معنی وہی مدبر و مدیر اور کارگرداں ہے اور یہی معنی ان تمام موارد میں ایک حقیقت رکھتا ہے۔

اگر یوسف علیہ السلام، عزیز مصر کو ''رب'' کہہ کر پکارتے ہیں اور یہ کہتے ہیں: اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ (یوسف ۲۳) ''وہ میرا مربی ہے، جس نے مجھے اچھی حیثیت اور جگہ میں رکھا ہے'' تو یہ اس وجہ سے ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اس کے گھر میں پرورش پائی تھی اور عزیز ان کا سرپرست اور ان کی تربیت کا کفیل ہے۔

اگر یوسف عزیز مصر کو اپنے قیدی ساتھی کا ''رب'' سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں: اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ (یوسف ۴۱) ''تم میں سے ایک اپنے رب کا ساقی بنے گا'' تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عزیز مصر، مصر کے لوگوں کا رئیس اور بڑا تھا اور قوم کا رئیس ملت کے سیاسی و اجتماعی اوامور کا مدبر ہوتا ہے۔

اگر قرآن یہ کہتا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے علماء اور راہبوں کو اپنے ''ارباب بنا رکھا تھا[1] تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے تشریع اور قانون سازی کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے رکھی تھی اور وہ انہیں امور خداوندی میں صاحب قدرت وتسلط سمجھتے تھے۔

اگر خدا کو ''رب البیت''[2] کہتا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ اس گھر کے معنوی و مادی امور خدا کے ساتھ مربوط ہیں اور اس کے علاوہ اور کوئی شخص حق تصرف نہیں رکھتا۔

اگر قرآن خدا کو رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[3] اور رَبُّ الشِّعْرٰى ۝ۙ[4] اور ان کے مانند چیزوں کے لیے کہتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان امور میں مدیریت و کارگردانی اور اصلاحی تصرفات خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔

اس بیان کے ساتھ ہم ''رب'' کے معنی کے چہرہ سے پردہ اٹھانے اور یہ واضح کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ اس لفظ سے جو قرآن میں بہت سے موارد میں وارد ہوا ہے، مقصود کیا ہے۔

---

[1] اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ ۳۱) انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اپنے ارباب بنا رکھا تھا۔

[2] (قریش ۳)

[3] (عم ۳۷)

[4] (النجم ۴۹)

اب ضروری ہے کہ ہم ''توحید در ربوبیت'' کے مسئلہ میں وہابی فرقہ کی غلط فہمیوں کی طرف اشارہ کریں، انہوں نے توحید کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہوئے کہا ہے:

۱۔توحید در ربوبیت

۲۔توحید در الوہیت

توحید در ربوبیت یہ ہے کہ ہم خدا کو عالم کا خالق سمجھیں اور اس کے علاوہ کسی اور کو خالق نہ سمجھیں اور زمانہ رسالت کے مشرکین سب کے سب اس مطلب پر متفق ہیں۔

توحید در الوہیت وہی توحید در عبادت ہے کہ ہم اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور رسول کریمؐ کا مبارزہ اسی اصل پر تھا۔[1]

اس بات میں کہ تمام مشرکین یا قریب قریب ان سے اتفاق رکھتے ہوئے ان میں سے اکثر توحید در خالقیت کے مسئلہ میں متفق تھے، کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اس قسم کی توحید کو ''توحید ربوبی'' کا نام دینا اشتباہ اور غلطی ہے کیونکہ ربوبیت کا معنی خالقیت نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے وضاحت کی ہے اس کا معنی و مفاد وہی تدبیر و کارگردانی اور جہان و آسمان و زمین کے امور کا ادارہ کرنا ہے اور اس مسئلہ میں وہ ہرگز اتفاق نظر نہیں رکھتے تھے اور اگر روشن فکر گروہ خدا کے علاوہ کسی اور مدبر کا قائل نہیں تھا تو دوسرے گروہ گوناں گوں مدبروں اور تدبیروں کے قائل تھے، جس کا گذشتہ مدارک کے علاوہ خود آیاتِ قرآنی سے بھی استفادہ ہوتا ہے۔

ہم اس گروہ کی نظر کو جن سے بڑی مشکل سے تفاہم ہوسکتا ہے ذیل میں بیان کردہ آیات کی طرف جلب کرتے ہیں۔

۱۔ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ (انبیاء ۵۶)

''تمہارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔''

اگر اس آیت میں ''رب'' سے مراد خالق اور پیدا کرنے والا ہو تو پھر (الذی فطرھن) کا جملہ کامل طور پر زائد ہوگا، اس کا گواہ یہ ہے کہ اگر آپ لفظ رب کی جگہ خالق رکھ دیں تو پھر آپ دیکھیں گے کہ اب اس بیان کردہ جملہ کی ضرورت نہیں ہے بخلاف اس کے اگر رب سے مراد مدبر و متصرف و کارگردان ہو تو اس صورت میں ذکر شدہ جملہ کا عمدہ اور اچھا مطلب نکلے گا اور یہ گذشتہ جملہ کی تعلیل کے طور پر ہوگا اور یہ بتلائے گا کہ وہی ذات جس نے انہیں پیدا کیا ہے وہی ان کا متصرف و مدبر بھی ہے۔

۲۔ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ (بقرہ ۲۱)

''اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں خلق کیا ہے۔''

---

[1] فتح المجید ص ۱۲ و ۲۰

اس آیت کی، اس بات پر دلالت کی طرز کہ لفظ رب خالق وآفریدگار کے معنی میں نہیں ہے گذشتہ آیت کے ساتھ یکساں ہے کیونکہ اگر لفظ ''رب'' خالق کے معنی میں ہو، تو پھر ''الذی خلقکم ''کا جملہ بے محل ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر رب مدیر کے معنی میں ہو، تو اس صورت میں الذی خلقکم کا جملہ توحید در ربوبیت کی علت ہوگا یعنی وہ ذات جس نے تمہیں پیدا کیا ہے وہی تمہارے امور کا مدبر اور رب بھی ہے۔

۳۔ قُلۡ اَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡغِىۡ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَىۡءٍ ؕ (انعام ۱۶۴)

''کہہ دے، کیا میں خدا کے علاوہ کوئی اور پروردگار تلاش کروں، حالانکہ وہی ہر چیز کا پروردگار ہے۔''

یہ آیت اس بات کی ترجمانی کر رہی ہے کہ زمانہ رسالت کے مشرکین پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ مسئلہ ربوبیت میں ایک طرح کا اختلاف رکھتے تھے اور پیغمبر اکرمؐ کو یہ حکم ہوا تھا کہ وہ ان کے خطا اور غلطی پر ہونے کا اظہار کریں اور وہ ان کے نظریہ کے برخلاف خدا کے علاوہ کسی کو ''رب'' نہ بنائیں۔

مسلمہ طور سے مشرکین کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کا اختلاف توحید در خالقیت کے مسئلہ میں نہیں تھا کیونکہ گذشتہ آیات کو گواہی کے مطابق وہ خدا کے علاوہ کسی اور خالق کے قائل نہیں تھے لہٰذا لازمی طور پر ان کا اختلاف خالقیت کے علاوہ کسی اور مسئلہ میں تھا اور وہ وہی امور آفرینش کے ادارہ کرنے کا مسئلہ ہے، یہ سارے جہاں کا ارادہ کرنا ہو یا اس کے ایک گوشہ کا

۴۔ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰى ۛۚ شَهِدۡنَا ۛۚ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِيۡنَۙ‏ ﴿۱۷۲﴾ (اعراف)

''کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں، انہوں نے کہا: کیوں نہیں! ضرور ہے! ہم نے ان سے یہ اقرار اس لیے لیا تا کہ وہ قیامت کے دن کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ ہم تو اس سے غافل تھے۔''

اس آیت میں خدا نے تمام افراد سے توحید در ربوبیت کے بارے میں اعتراف لیا ہے اور اس عہد و پیمان کے اخذ کرنے کی علت وہی ہے جس کو خود ہی بیان کرتا ہے کہ وہ قیامت کے دن اس عہد و پیمان کی وجہ سے اپنے بندوں پر حجت قائم کرے گا اور بعد والی آیت میں اس طرح کہتا ہے: ہم نے یہ عہد و پیمان اس لیے بھی لیا ہے کہ کہیں وہ یہ نہ کہنے لگیں کہ ہمارے آباؤ اجداد نے شرک کیا تھا اور ہم ان کی اولاد ہیں کیا تو ہمیں ان باطل پرستوں کے کام کی بنا پر نابود و ہلاک کرے گا؟[1]

شرک کے ماحول میں اس آیت کا نزول اس بات پر گواہ ہے کہ اس ماحول میں ایک قابل ملاحظہ گروہ تھا جو اس بیان کی مخالفت کرتا تھا۔ اب اگر ربوبیت، خالقیت کے معنی میں ہو تو یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ عہد رسالتؐ کے مشرکین کو اس مسئلہ میں ہرگز اختلاف نہیں تھا کہ وہ عہد و پیمان کے مخالف شمار ہوں لہٰذا لازمی طور سے ان کی پیمان شکنی جہاں خلقت کی تدبیر اور اس کی کارگردانی کے بارے میں تھی۔

---

[1] اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنۡۢ بَعۡدِهِمۡ‌ ۚ اَفَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ‏ ﴿۱۷۳﴾ (اعراف)

۵۔ رَجُلًا اَنۡ یَّقُوۡلَ رَبِّیَ اللّٰہُ وَقَدۡ جَآءَکُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ (مومن ۲۸)

''کیا تم ایک آدمی کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ یہ کہتا ہے کہ تمہارا پروردگار ''خدا'' ہے اور وہ تمہارے پاس اس طرف سے دلائل لے کر آیا ہے۔''

یہ آیت ''مومن ال فرعون'' کے ساتھ مربوط ہے جو فرعون کے خاندان سے دوستی کے اظہار کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کا دفاع اور حمایت کر رہا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو یقینی موت سے نجات دلائے اور اس آیت کی اس امر پر دلالت کہ ''رب'' خالق کے معنی میں نہیں ہے، واضح ہے۔

کیونکہ فرعون ہرگز زمین و آسمان کی خالقیت کا دعویٰ نہیں کرتا تھا یا اپنے آپ کو آفرینش و خلقت میں خدا کا شریک نہیں سمجھتا تھا اور تاریخ فراعنہ بھی اس چیز پر گواہی دیتی ہے تو اس صورت میں حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو جو کہتے تھے ''ربی اللہ'' تدبیر اور کارگردانی سے ہی مربوط ماننا پڑے گا نہ کہ خلقت و آفرینش کے ساتھ اور اگر حضرت موسیٰ کی دعوت خدا کی خالقیت کے بارے میں ہوتی تو اس صورت میں ان کا فرعون کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس سے پہلی آیت میں اس طرح کہتا ہے:

۶۔ ذَرُوۡنِیۡۤ اَقۡتُلۡ مُوۡسٰی وَلۡیَدۡعُ رَبَّہٗ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّبَدِّلَ دِیۡنَکُمۡ (مومن ۲۶)

''چھوڑ دو مجھے کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں اور وہ اپنے پروردگار کو بلا لے، میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں تمہارے دین کو بدل نہ دے۔''

توحید در خالقیت کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا کہ جس کے بارے میں اختلاف ہو اور حضرت موسیٰ کی دعوت ان کے درمیان دین کے تغیر اور دگرگونی کا سبب بن جائے۔

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ فرعون کا اپنی اس گفتار ''انا ربکم الاعلی'' [1] سے مقصد کیا ہے۔

۷۔ فَقَالُوۡا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَنۡ نَّدۡعُوَا۟ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِلٰـہًا (کہف ۱۴)

''انہوں نے کہا، ہمارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے، ہم اس کے علاوہ کسی کو بھی خدا کے عنوان سے نہیں پکاریں گے۔''

وہ جوان جنہوں نے اس وقت کے جابر بادشاہ کی حکومت کی گھٹن کے ماحول سے تنگ آ کر اپنا گھر بار چھوڑا اور ایک غار میں جا کر پناہ

[1] (نازعات ۲۴)

لی، وہ ایک ایسا گروہ تھا جو ان لوگوں کے درمیان زندگی بسر کر رہا تھا جو غیر خدا کی الوہیت کے معتقد تھے، ان میں غیر خدا کو الوہیت تعدد خالق کی صورت میں نہیں تھی خصوصاً اس صورت میں کہ وہ واقعہ مسیح کی ولادت کے بعد رونما ہوا جب کہ عالم کے افکار نے توحید کے مسائل میں قابل لحاظ ترقی کر لی تھی، طبعی طور پر ان کا شرک دوسری صورت میں تھا اور وہ مدبر و پروردگار کا تعدد تھا۔

۸۔ اس بات کا واضح اور روشن گواہ کہ مقام ربوبیت وہی جہان آفرینش کی تدبیر اور امور کے ادارہ کرنے کا مقام ہے یہ ہے کہ سورۂ رحمن میں "فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ" کی آیت ۳۱ بار وارد ہوئی ہے اور لفظ "رب" لفظ "الاء" کے، جو نعمتوں کے معنی میں ہے۔ ساتھ ساتھ آیا ہے اور نعمتوں کے موضوع کو پیش کرنا، بشر کی زندگی اور اس کو نابودی و ہلاکت سے بچانے کے لیے خدا کے مقام تدبیری کے ساتھ مناسب اور زیادہ سازگار ہے۔

۹۔ قرآن میں پانچ مواقع پر [۱] شکرگزاری کا مسئلہ لفظ "رب" کے ہمراہ آیا ہے اور شکر نعمت کے مقابلہ میں ہوتا ہے جو انسانی حیات کی بقاء اور اس کی زندگی کو برقرار رکھنے اور اس کو فساد و نابودی سے بچانے کا سبب ہے اور انسان کی تدبیر کی حقیقت اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

کئی مقامات پر قرآن خدا کی ربوبیت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور اس کے بعد بلا فاصلہ بارش برسانے اور مال و اولاد اور باغ و انہار دینے کی بات کرتا ہے اور یہ مسائل جہان آفرینش کے مقام تدبیر اور کارگردانی کے ساتھ زیادہ سازگار نہیں، جیسا کہ فرماتا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ (نوح)

"میں نے ان سے کہا کہ تم خدا سے طلب بخشش کرو، وہ گناہوں کا بخشنے والا ہے، وہ آسمان کو فراواں بارش کرنے کے لیے مقرر کرتا ہے اور تمہاری مال و اولاد سے مدد کرتا ہے اور تمہارے لیے باغات اور نہریں قرار دیتا ہے۔" [۲]

نتیجہ بحث

اس وسیع بحث سے دو نتیجے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ خدا کی ربوبیت، وہی مقام تدبیر اور اس کی کارگردانی ہے، نہ کہ مقام خالقیت و آفریدگاری

۲۔ ان میں سے کچھ آیات اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ توحید در تدبیر کا مسئلہ توحید در خالقیت کے مسئلہ کے برخلاف متفق علیہ نہیں تھا اور

---

[۱] سورہ ابراہیم آیہ ۷، نمل آیہ ۱۹۔۴۰، سبا آیہ ۱۵، واحقاف آیہ ۱۵ کی طرف رجوع کریں۔

[۲] سورہ ہود کی آیہ ۵۲ کی طرف رجوع کریں۔

ایک گروہ نے عالم کی تدبیر اور کارگردانی یا اس کے کچھ حصہ کی تدبیر غیر خدا کے سپرد اور تفویض کر دی تھی اور وہ اس کے سامنے ''رب'' کے عنوان سے خضوع کرتے تھے۔

البتہ خدا کی ربوبیت کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ممکن ہے کہ کچھ لوگ ایک حصہ میں تو موحد ہوں اور دوسرے حصہ میں مشرک ہوں۔ مثلاً یہود و نصاریٰ نے شرک در مقام ربوبیت میں صرف امور تشریع کی باگ ڈور احبار و رہبان کے ہاتھ میں دی ہے اور انہیں اس لحاظ سے ارباب کہتے تھے۔[1]

جب کہ دوسرے گروہ کا امر ربوبیت میں شرک، اس دائرہ میں منحصر نہیں تھا، بلکہ وہ جہانِ خلقت کے چند کاموں کو ہی فرشتوں، جنوں، ارواح مقدسہ یا اجرام فلکی کی طرف منسوب کرتے تھے، اگرچہ اب تک کوئی ایسا گروہ ہمیں نہیں ملا جو آسمانوں اور زمین کی اس کے تمام جانداروں اور بے جان انواع کے ساتھ تدبیر و کارگردانی کی غیر خدا کی طرف نسبت دیتا ہو اور زیادہ تر شرک در ربوبیت کا مسئلہ جزوی صورت میں اور عالم کے بعض کاموں کو بعض برتر موجودات کے سپرد کرنے تک ہے۔

وہ آیات جو ان دو نتائج پر گواہی دیتی ہیں اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ انہیں یہاں پر نقل کیا جا سکے، لہٰذا انہی دس آیات پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اب ہم اس مقام پر مسئلہ تدبیر کے خدا میں انحصار اور اس کے دلائل کے بارے میں قرآن کے قطعی فیصلہ کو پیش کرتے ہیں۔

قرآن خدا کا یکتا مدبر عالم کے عنوان سے تعارف کراتا ہے

قرآن زیادہ سے زیادہ قاطعیت کے ساتھ خدا کو اکیلا اور تنہا مدبر عالم سمجھتا ہے اور اس بارے میں ہر قسم کی مخالف و مستقل تدبیروں کو جو غیر خدا کو ربوبیت کی مظہر ہوں غلط اور باطل قرار دیتا ہے۔ وہ آیات جو اس مطلب پر گواہی دیتی ہیں یہ ہیں:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾ (یونس)

''تمہارا پروردگار وہ خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں (دوروں) میں پیدا کیا، پھر عرش (قدرت) پر غالب آ گیا، وہی امور آفرینش کی تدبیر کرتا ہے، کوئی شفیع (واسط و علت) عالم میں نہیں ہے، مگر اس کے اذن سے اپنی ذمہ داری کو ادا کرتا ہے، یہ ہے تمہارا پروردگار، پس تم اسی کی عبادت

---

[1] اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ: ۳۱) پیغمبر اکرمؐ عیسائی روساء کو اپنے تاریخی خطوط میں یہ آیت لکھ کر بھیجا کرتے تھے...... وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ (آل عمران ۶۴) بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کو رب اور پروردگار نہ بنائیں، مسلمہ طور سے عیسائی اپنے علماء کو امور تشریعی میں متصرف سمجھتے تھے۔

کرو، تم یہ بات یاد کیوں نہیں رکھتے۔''

۲۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ﴿۲﴾ (رعد)

''وہ خدا جس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر جسے تم دیکھ سکو بلند کیا ہے، ہر ایک وقت معین تک کے لیے گردش میں ہے، وہ امر خلقت کی تدبیر کرتا ہے، آیت کو کھول کر بیان کرتا ہے، تا کہ تم اپنے پروردگار کی ملاقات کا یقین کرلو۔''

ان آیات میں ذیل میں ذکر شدہ جملے سب سے زیادہ قابل توجہ ہیں:

۱۔ ثم استوی علی العرش، عرش قدرت پر غالب آیا۔

۲۔ یدبر الامر، امور خلقت کی تدبیر کرتا ہے۔

۳۔ مامن شفیع الا من بعد اذنه، کوئی شفیع نہیں ہے مگر وہ اس کے اذن کے بعد (انجام وظیفہ کرتا ہے)

اب ہم مذکورہ جملوں کی وضاحت کرتے ہیں۔

خداوند عالم ان دو آیات میں اور ان دونوں مشابہ آیات میں[1] آسمان و زمین کی آفرینش و خلقت کے بیان کرنے کے بعد عرش پر غلبہ و استیلاء کو پیش کرتا ہے اور اس کو پیش کرنے کا ہدف و مقصد یہ ہے کہ جہان خلقت کی باگ ڈور خلقت کے بعد بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور ہرگز اس کے ہاتھ سے خارج نہیں ہوئی اور کسی اور کو سپرد نہیں ہوئی، عرش قدرت پر غلبہ و استیلاء تمام عالم ہستی اور نظام امکان پر تسلط سے کنایہ ہے۔

(یدبر الامر) کے جملہ کا عرش پر استیلاء کے بعد آنے میں نکتہ یہ ہے کہ فرمانبروایانِ عالم تخت پر بیٹھتے تھے اور وہاں سے ملک کے امور کی تدبیر کرتے تھے، گویا عالم خلقت کا فرمانروا عرش قدرت سے عالم ہستی پر حکومت کرتا ہے اور نظام عالم کی نگرانی کرتا ہے۔ پہلی آیت میں مسئلہ تدبیر کے بعد شفاعت کرنے والوں کا مسئلہ پیش آیا ہے اور یہ اس بات کو بتلاتا ہے کہ ہر شفیع کا کام اذن خدا کے ساتھ مربوط ہے، اس آیت میں شفیع سے مراد روز قیامت کے شفیع نہیں ہیں بلکہ وہی جہان خلقت کے علت و معلول کا نظام ہے کہ اوپر اور نیچے کے نظام میں ہر علت کی تاثیر اذن خدا کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ تمام موجودات کی تاثیر اور فعالیت خدا کے ارادہ اور مشیت کے ساتھ وابستہ ہے، اسی بنا پر قرآن مدیریت کو بیان کرنے کے بعد جہانِ خلقت کے علت و معلول کے

---

[1] سورہ اعراف آیہ ۵۴ و فرقان آیہ ۵۹ و سجدہ آیہ ۴ و حدید آیہ ۴

نظام کے مسئلہ کو پیش کرتا ہے، تاکہ یہ بتائے کہ خدا کی مدیریت مطلقہ، عالم ہستی میں علت ومعلول کے نظام کے اعتقاد سے مانع نہیں ہے، کیونکہ اس نظام کو وجود، اس کی تدبیر کا مظہر اور اس کے ارادہ سے قائم ہے، اور اصیل و مستقل مدیر وہی ہے اور دوسرے مدبروں کی تدبیر اور کارگردانی اس کے اذن سے صورت پذیر ہوتی ہے۔

اگر قرآن موجودات عالم کی علت کو شفیع کا نام دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ شفیع زوج اور جفت کے معنی میں ہے، گویا نظام علل خدا کے ارادہ اور مشیت کے ضمیمہ سے اپنے اثرات دکھاتا ہے۔

شاید کچھ لوگ یہ تصور کریں کہ قرآن نے توحید در تدبیر کے مسئلہ کو، کوئی دلیل پیش کیے بغیر ایک اعتقادی مسئلہ کے طور پر پیش کیا ہے، حالانکہ، قرآن مذکورہ موضوع کو واضح دلیل کے ساتھ ثابت کر چکا ہے، ہم ان میں سے کچھ دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ا۔تدبیر، خلقت وآفرینش ہی کی ایک شاخ ہے

مشرکین کے اشتباہ کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ وہ عالم خلقت کی تدبیر کو، ایک گھرانے، ایک ادارے اور ایک موسسہ وحکومت کے امور کی تدبیر کے ساتھ یکساں سمجھتے تھے اور ان کا ایک دوسرے پر قیاس کرتے تھے۔

خاندان کا بزرگ ان کی زندگی کے امور میں سوائے حکم دینے اور ارشاد و رہنمائی کرنے کے اور کوئی کام نہیں کرتا، اور اسی طرح ایک ملک کے اوپر ایک حاکم کی فرمانروائی کا حال ہے، جب کہ تدبیر خداوندی وہی خلقت کو دوام بخشنا اور آفرینش کا استمرار ہے اور خلقت کا جاری و ساری رہنا خود ایک قسم کی آفرینش ہے، وہ لوگ جو صرف خدا ہی کو خالق اور پیدا کرنے والا جانتے ہیں، انہیں اسے یکتا مدبر بھی ماننا پڑے گا۔

نظام امکانی، اس بنا پر کہ وہ ''بالذات'' فاقد وجود وہستی ہے اور یہ فقر ہمیشہ اس کے ساتھ ہے، اس بنا پر ضروری ہے کہ فیض خلقت مسلسل اور لگاتار ہو، نہ صرف اصل خلقت میں دوام ہو، بلکہ موجودات کے ایک دوسرے کے ساتھ روابط اور ان کی سب میں تاثیر بھی مسلسل اور استمراری رہے، اس صورت میں عالم کی تدبیر کی حقیقت، وجود عالم کا اپنی خصوصیات وروابط کے ساتھ استمرار اور جاری وساری رہنا ہے اور اس قسم کا استمرار وہی جدید خلقت اور نئے سے نئی آفرینش ہے، اور دوسرے لفظوں میں اسی خلقت کا دوام واستمرار ہے، تو جب خدا کے علاوہ اور کوئی خالق نہیں ہے، تو یقینا مدبر بھی اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے، کیونکہ تدبیر آفرینش ہی کی ایک شاخ ہے۔

اس مطلب کو ایک دوسری صورت میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

تدبیر مادہ ''دبر'' سے جو ''کسی چیز کے دوسری چیز کے پیچھے آنے'' کو کہتے ہیں۔ لیا گیا ہے اور فارسی زبان میں اسے ''کارگردانی'' کہتے ہیں اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ خالق عالم علل واسباب کو اسطرح سے قرار دے کہ معالیل ومسببات اس کے پیچھے قرار پائیں اور عالم آفرینش کے اجزاء کو اس طرح سے آپس میں جوڑے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے میں اثر کرے اور ہر موجود اپنے مناسب ہدف وکمال کو پہنچ جائے۔

اگر تدبیر سے مراد یہ ہو کہ اس قسم کا کام، خلقت سے جدا نہیں ہے بلکہ عالم آفرینش کے اندر چھپا ہوا ہے تو اس حالت میں 'تدبیر'' کو

خلقت سے، جیسے جدا خیال کر سکتے ہیں اور اس کے لیے آفرینش سے جدا مقام کیسے تصور کر سکتے ہیں۔

اسی بنا پر قرآن میں آسمان وزمین کی خلقت کا بیان کرنے کے بعد، سورج اور چاند کی تسخیر کے مسئلہ کو[1] جو کہ عین تدبیر ہے۔ پیش کرتا ہے اور اس طریقہ سے ہمیں حقیقت تدبیر سے جو آفرینش کی ایک قسم ہے آگاہ کرتا ہے۔

۲۔ نظام کی وحدت یگانگی مدبر پر گواہ ہے

ہم نے گذشتہ حصہ میں عالم ہستی کے نظام پر یکپارچگی کے سلسلہ میں، اس طرح سے بیان کیا تھا کہ جس سے واضح طور پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کتاب آفرینش کے ہر ورق کا مطالعہ ہمیں ایک پیوستہ اور یکپارچہ نظام کی طرف رہبری کرتا ہے، گویا عالم خلقت ایک تدوین شدہ کتاب کی طرح ہے، جس کے بے شمار ورقوں کو کسی ماہر جلد ساز کے ہاتھ نے آپس میں جوڑ کر، سب کو ایک صورت میں کر دیا ہے۔

نظام خلقت کی آپس میں پیوستگی اور یک پارچگی کی ایک نشانی، جذب و دفع کی قوت کا مطالعہ کرنا ہے، جس نے ہمارے نظام شمسی اور کہکشاں کو وحدت و یگانگی بخشی ہے۔

وہ قوانین جو تمام موجودات طبیعی میں جاری و ساری ہیں، کلی و عمومی ہیں یہاں تک کہ علمی تحقیقات کے وہ نتائج جو عالم کے کسی حصہ میں صورت پذیر ہوتے ہیں، وہ کلی اور عالمی قوانین کے کشف کا سبب بنتے ہیں، نظام کی پیوستگی اور قوانین کا کلی ہونا ہمیں دو مطالب کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

ا۔ عالم کا ایک سے زیادہ خالق اور آفریدگار نہیں ہے اور اس بات کی وضاحت آپ گذشتہ حصہ میں پڑھ چکے ہیں۔

۲۔ عالم کا مدبر ایک سے زیادہ نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں نظام کی یکپارچگی اور قوانین خلقت کی وحدت، قرآن کی گفتگو کی صحت کی واضح دلیل ہے جو فرماتا ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۝۵۴ (اعراف)

''پیدا کرنا اور حکم دینا اسی کے لیے ہے، بزرگ ہے وہ خدا جو عالمین کا پروردگار ہے''

''له الخلق'' کا جملہ توحید در خالقیت کی طرف اور ''الامر'' کا جملہ توحید در تدبیر کی طرف اشارہ ہے جو عالم ہستی پر ایک قسم کی فرمانبروائی ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوانین کا عمومی ہونا اور یکپارچگی، مدبر اور فرمانروائے عالم کی وحدت پر گواہ کس طرح سے ہے۔

اس کا جواب واضح ہے اگر جہان پر دو آراء اور دو افکار حکومت کرتے ہوئے تو یقیناً ایک ہی نظام اور یکتا و یگانہ تدبیر کا نام و نشان تک نہ ہوتا اور اس کے نتیجہ میں کارخانہ خلقت اور نظام ہستی میں فساد رونما ہو جاتا۔

---

[1] سورہ اعراف آیہ ۵۴ اور رعد آیہ ۳

وحدت نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ سارا عالم ایک ہی فرمانروا کے ماتحت چلے اور اگر عالم دو مدبروں کے قلمرو میں ہوگا، تو اس استوار اور محکم نظام کا نام ونشان تک نہ ہوگا، کیونکہ یہ دو مدبر چونکہ تمام جہات میں آپس میں یکساں نہیں ہیں۔ لہٰذا تدبیر کے لحاظ سے ان میں فرق اور امتیاز ہوگا اور دو تدبیروں کا لازمہ، استوار و محکم نظام کی نابودی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر یہ دونوں مدبر ہر لحاظ سے آپس میں یکساں ہوں تو وہ قہراً دو نہیں ہوں گے اور چونکہ ہم نے دو فرض کر لیے ہیں لہٰذا ان کا آپس میں کئی جہات سے اختلاف ماننا پڑے گا، تدبیر و ارادہ، مشیت اور فرمان میں اس قسم کا اختلاف اور ناموافقت۔ چاہے ایک ہی بات میں ہو۔ اپنا اثر دکھا کر رہے گا۔

اس برہان کو دو صورتوں میں بیان کیا جا سکتا ہے

ا۔ برہان کے بیان میں ہم مثبت جنبوں کی طرف توجہ کریں اور یہ کہیں کہ عالم کے اجزاء کا آپس میں ارتباط اور پیوستگی اور ہر ایک کی دوسرے میں تاثیر اس بات کی گواہ ہے کہ عالم پر ایک ہی حکیم حکومت وفرمانبروائی کر رہا ہے جو سب کا ایک ہی نقشہ کے مطابق ادارہ کر رہا ہے۔

خاندان رسالت کی احادیث میں بھی بعض اوقات اس نقطہ پر تکیہ ہوا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

”جب میں نے عالم آفرینش کو منظم دیکھا اور میں نے کشتی کے چلنے اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے بعد آنے اور سورج اور چاند کی حرکت کو مشاہدہ کیا تو امور خلقت کی ایک دوسرے کے ساتھ پیوستگی، استوار فرمانروائی اور محکم تدبیر نے اس بات کی گواہی دی کہ مدبر ایک ہی ہے۔“[1]

اور کبھی اس برہان کے منفی پہلوؤں پر تکیہ کیا جا سکتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعدد تدبیر نظام خلقت کے فساد وخرابی کا سبب ہے، قرآن اس بیان پر تکیہ کرتا ہے اور فرماتا ہے:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۝۲۲ (انبیاء)

”اگر عالم میں خدا کے علاوہ اور بھی خدا ہوتے تو دستگاہ خلقت وآفرینش فساد و تباہی سے دوچار ہو جاتی، صاحب عرش خدا اس سے جو وہ اس کی توصیف کرتے ہیں، پاک اور منزہ ہے۔“

خاندان رسالت کی روایات میں دونوں بیان وارد ہوئے ہیں۔

امام صادق، ہشام بن حکم کے جواب میں جو خالق وآفریدگار کے یکتا و یگانہ ہونے کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اتصال التدبير و تمام الصنع كما قال الله عزوجل لو كان فيهما الهة

---

[1] فلما رأيت الخلق منتظما والفلك جاريا و اختلاف الیل والنهار و الشمس و القمر على صحة الامر لالتدبير وائتلاف الامر على ان المدبر واحد (توحید صدوق ۲۴۴)

الا اللہ لفسدتا۔ [1]

''نظام کی پیوستگی اور خلقت کی استواری، خدا کی یگانگی کی دلیل ہے، جیسا کہ خدا خود فرماتا ہے کہ اگر آسمانوں اور زمین میں خدا کے علاوہ اور بھی خدا ہوتے تو سارا کا سارا عالم تباہ و برباد ہو جاتا۔''

نتیجه

۱۔ نظام کی پیوستگی اور عالم کی یکپارچگی اور اس کے قوانین کی وسعت، وحدت خالق پر بھی اور وحدت مدبر پر بھی گواہ ہو سکتے ہیں۔

۲۔ اس برہان کو دو صورتوں میں بیان کیا جا سکتا ہے اور دونوں کی دونوں ایک ہی برہان کی حقیقی و واقعی صورت میں، جو قرآن میں وارد ہوئی ہے۔

دوسرے مدبروں کی ذمہ داری کیا ہے؟

گذشتہ آیات نے خدا کو عالم کا یگانہ مدبر معرفی کرایا ہے اور عقلی دلائل بھی اس کی تائید میں قائم ہیں، لیکن دوسری طرف سے، ساز مان ہستی علت و معلول اور سبب و مسبب کے نظام کی بنیاد پر استوار ہے اور موجودہ زمانہ کی تعبیر میں ایک منظم اور سسٹمیٹک جہاں ہے اور کوئی موجود علل طبیعی کے بغیر وجود میں نہیں آتا تو اس صورت میں یہ سوال سامنے آئے گا کہ اس قسم کے علل و اسباب کی ذمہ داری جو موجودات کے وجود کا سبب اور ایک قسم کے مدبر اور ان کی پرورش کرنے والے ہیں، کیا ہوگی؟

اگر مدبر کا معنی یہ ہو کہ ایک موجود دوسرے موجود کا کفیل اور نگران ہے تو اس نظام میں ہر علت معلول کی نگران اس کے وجود کی کفیل اور دوسرے اجزاء جہاں سے اس کے ارتباط کی محافظ، اس کی ہستی کے دوام و بقاء کا سبب ہوگی۔

اس کے علاوہ قرآن بھی مدبرین اور علل کے ایک سلسلہ کا اعتراف کرتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ﴿۵﴾ (نازعات)

''وہ جو امور خلقت کا ادارہ کرتے ہیں۔''

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ (انعام ۶۱)

''وہی اپنے بندوں پر مقتدر اور برتر ہے اور وہی تمہارے لیے نگہبان مقرر کرتا ہے۔''

اگر یہ نگرانی کرنے والے نگہبان، انسان کی برائیوں اور بلاؤں سے نگرانی اور حفاظت کرتے ہیں تو یقینی طور پر یہ ایک طرح کے مدیر بھی ہوں گے۔

---

[1] توحید صدوق ص ۲۵۰

جواب

ان مباحث سے جو ''توحید در خالقیت'' کے حصہ میں انجام پا چکی ہیں، اس سوال کا جواب واضح ہو چکا ہے ''توحید در ربوبیت'' کا معنی یہ نہیں ہے کہ تمام علل واسباب معطل ہو جائیں اور خدا تمام علل واسباب کا جانشین بن جائے کیونکہ یہ بات تو وہی گروہ ''اشاعرہ'' کا نظریہ ہے جو ''توحید در خالقیت'' کی بحث میں قرآن کی نظر سے رد کیا جا چکا ہے۔

بلکہ ''توحید در ربوبیت'' کی حقیقت یہ ہے کہ مجموعِ ہستی میں صرف ایک ہی اصیل اور مستقل مدبر موجود ہے اور دوسرے عوامل کی تدبیر میں اصالت واستقلال نہیں ہوتا، بلکہ وہ سب کے سب خدا کی مشیت اور اس کے ارادہ سے اپنا وظیفہ انجام دیتے اور ذمہ داری پورا کرتے ہیں، اس صورت میں اس قسم کے تابع اور ظلی مدبروں کا اعتراف کر لینا، خدا کے ساتھ تدبیر استقلالی کے انحصار سے مانع نہیں ہے۔

وہ گروہ جو معارف القرآن کے الف، باء سے واقف نہیں ہے، وہ آیات کے ایک سلسلہ میں حیران اور مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں کہ کچھ آیات میں شفاعت، مالکیت، رازقیت، علم غیب اور ارواح کا قبض کرنا وغیرہ موضوعات خدا کے ساتھ مخصوص اور اس میں منحصر امور میں کس طرح سے شمار ہوتے ہیں، جب کہ دوسری آیات میں یہی امور بندگان خدا کے ساتھ بھی منسوب ہوئے ہیں، تو وہ انحصار اس انتساب کے ساتھ کس طرح سے سازگار ہے۔

اس طرح کے چند نمونے یہ ہیں:

۱۔ قرآن قبض ارواح کو خدا کا فعل جانتا ہے اور یہ کہ وہ خدا ہی ہے جو جانوں کو موت کے وقت لیتا ہے۔[۱]

حالانکہ دوسری آیت میں فرماتا ہے: جس وقت تمہاری اموات آن پہنچی ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) تمہاری جان لے لیتے ہیں۔[۲]

۲۔ قرآن سورۂ حمد میں حکم دیتا ہے کہ ہم یہ کہیں کہ بارالہا ہم صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔[۳]

جب کہ دوسری آیت میں حکم دیتا ہے کہ بردباری اور نماز گزاری سے بھی مدد حاصل کرو۔[۴]

۳۔ قرآن شفاعت کو خدا کا اختصاصی حق سمجھتا ہے اور بس اور یہ کہ قلمروئے شفاعت میں کسی کو مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔[۵]

---

[۱] اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا (زمر ۴۲)

[۲] حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡہُ رُسُلُنَا (انعام ۶۱)

[۳] وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ (حمد)

[۴] وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ (بقرہ ۴۵)

[۵] لِلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیۡعًا ؕ (زمر ۴۴)

اور دوسری آیت میں ملائکہ کے گروہ میں سے کئی شفیع معرفی کراتا ہے۔

۴۔ قرآن علم غیب کو خدا کے مخصوص صفات میں سے جانتا ہے اور کہتا ہے کہ آسمان اور زمین میں اس کے علاوہ کوئی بھی غیب سے آگاہ نہیں ہے۔[۱]

جب کہ دوسری آیت میں فرماتا ہے: خدا تمہیں غیب پر مطلع نہیں کرتا، لیکن اپنے پیغمبروں میں سے جسے چاہتا ہے اس امر کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔[۲]

۵۔ قرآن حضرت ابراہیمؑ سے نقل کرتا ہے: جب میں بیمار پڑ جاتا ہوں تو وہی (خدا) مجھے شفا دیتا ہے۔[۳]

اور آیت کا ظاہر یہ کہتا ہے کہ صرف خدا ہی شافی ہے۔

اس کے بعد جب کہ خدا شہد کو اور خود قرآن کو شفا بخش معرفی کراتا ہے۔[۴]

۶۔ اگر چہ قرآن کی نظر سے صرف خدا یکتا و یگانہ رزاق، روزی رساں اور روزی دینے والا ہے۔[۵]

اس کے باوجود دوسری آیت میں حکم دیتا ہے کہ صاحب حیثیت لوگ کمزوروں اور ماتحتوں کو روزی دیں اور انہیں لباس پہنائیں۔[۶]

۷۔ قرآن کی نگاہ میں حقیقی زارع خدا ہے۔[۷]

جب کہ دوسری آیت میں کھیتی باڑی کرنے والوں کو بھی زارع کہا ہے۔[۸]

۸۔ ایک آیت میں آیا ہے کہ خدا اپنے بندوں کے اعمال کو لکھتا ہے۔[۹]

جب کہ دوسری آیت میں فرشتوں کو اعمال کے لکھنے پر مامور بنا تا ہے[۱۰] [۱] ۰۱

---

[۱] وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ (نجم ۲۶)

[۲] قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ (نمل ۶۵)

[۳] وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ (ال عمران ۱۷۹)

[۴] وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۪ۙ (شعرا) وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ (اسراء ۸۲)

[۵] اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (الذاریات)

[۶] وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ (نساء ۵)

[۷] ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (واقعہ)

[۸] يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ (فتح ۲۹)

[۹] وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ (نساء ۸۱)

[۱۰] [۱] بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ (زخرف ۸۰)

۹۔ قرآن کی نگاہ میں سارے جہاں کا مالک صرف ایک اکیلا اور تنہا خدا ہے اور اس کے علاوہ کوئی بھی شخص کسی بھی چیز کا مالک نہیں ہے۔[۱]

جب کہ دوسری آیت میں انسانوں کی مالکیت کا اعتراف کرتا ہے۔[۲]

۱۰۔ اسی بحث (توحید در تدبیر) میں ہم نے کئی آیات نقل کی ہیں جو خدا کو یگانہ مدبر معرفی کراتی ہیں، یہاں تک کہ اگر مشرکین سے بھی یہ سوال ہو کہ مدبر کون ہے، تو وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ خدا ہے۔[۳]

لیکن دوسری آیت میں دوسرے مدبرین کا بھی اعتراف کرتا ہے۔[۴]

جواب

ان دس نمونوں جیسی چیزیں قرآن میں فراواں ہیں، جو شخص اس آسمانی کتاب سے انس رکھتا ہے اور اس کے معارف کے الف باء سے آشنا ہے، وہ جانتا ہے کہ ان کا قیام ذاتِ خدا کے ساتھ اس قسم کا ہے کہ جس میں کوئی شخص اس کا شریک اور ہمتا نہیں ہے۔ وہ ان تمام کاموں کو کسی سے مدد اور کمک لیے بغیر اصیل اور مستقل طور سے انجام دیتا ہے، جب کہ اس کے غیر، انہی دس امور کی انجام دہی میں، اپنی ذات وہستی میں بھی اور فعل وعمل میں بھی، اسی کے نیاز مند اور محتاج ہیں اور اس کی قدرت و ارادہ اور مشیت کے ماتحت انہیں انجام دیتے ہیں اور اس قسم کی توصیف اور نسبت یکساں نہیں ہے تا کہ ان کے درمیان کوئی مخالفت یا منافات پائی جائے۔

اگر خدا ان کاموں کی اپنے غیر کی طرف نسبت دیتا ہے تو وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ یہ جہان، عالم اسباب ومسببات ہے اور نظام علت و معلول ہے اور ہر چیز اپنے مجرائے خاص سے صادر ہوتی ہے۔ خدا کا خالق اور مدبر ہونا اس بات میں مانع نہیں ہے کہ کچھ موجودات اس کے فرمان سے کچھ کاموں کو انجام دیں۔

اس بنا پر ان موجودات کا کام خود خدا کا کام بھی ہے، البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے اعمال کی خود ان ہی کی طرف نسبت جنبہ مباشری رکھتی ہے اور خدا کی طرف ان کی نسبت جنتبہ تسبیبی رکھتی ہے اور دوسرے لفظوں میں: اصیل اور مستقل فاعل تو خدا ہے اور اس کے حکم اور اذن سے کام کرنے والے اور اس کے ساتھ وابستگی رکھنے والے اس کے بندے اور اس کی مخلوقات ہیں۔

قرآن ایک آیت میں ان دونوں باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

---

[۱] وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (ال عمران ۱۸۹)

[۲] اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ (نساء ۳)

[۳] وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ (یونس ۳۱)

[۴] فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝ (نازعات ۵)

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى ۚ (انفال ۱۷)

''جب تو نے تیر پھینکا تھا تو وہ تیر تو نے نہیں پھینکا تھا، بلکہ وہ خدا نے پھینکا تھا۔''

اس آیت میں اگر چہ پیغمبر اکرمؐ کو تیر پھینکنے والا بتاتا ہے اور صراحت کے ساتھ کہتا ہے: ''اذ رمیت'' (جب کہ تو نے تیر مارا) لیکن بعد میں خدا کو حقیقی تیر انداز بتاتا ہے اور اس کا نکتہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے اپنا کام خداداد قوت کے ساتھ انجام دیا ہے تو یقینی طور پر اس کا فعل خدا کا فعل بھی ہے اور واقع بینی کے لحاظ سے فعل کی خدا کی طرف نسبت کہ بندہ کی ذات وہستی وقوت اور قدرت اسی کی طرف سے ہے، اسے بندہ کی طرف نسبت دینے سے کئی درجہ زیادہ قوی ہے، لیکن نسبت کی یہ شدت ہرگز اس بات کا سبب نہیں بنتی کہ خدا اپنے بندوں کے اعمال کا مسئول اور جوابدہ ہو، کیونکہ یہ تو صحیح ہے کہ کسی چیز کے ابتدائی مقدمات خدا کے ساتھ مربوط ہیں لیکن چونکہ کسی چیز کے وجود میں آنے کی علت کا آخری جز انسانی ارادہ ہے، جو پوری آزادی کے ساتھ اسے وجود میں لایا ہے، اس بنا پر اپنے اعمال کا مسئول اور جواب دہ وہی ہوگا اور جب تک یہ آخری جزء اس موجود وجود میں ہی نہیں آتا۔

مولوی کہتا ہے:

دست پنهاں و قلم میں خط گزار
اسب در جولان و ناپیدا سوار
گه بلندش می کندگا ہیش پست
گه درستش می کندگاہی شکست
گه یمینس می بردگاہی یسار
گه گلستانش کندگاہیش خار
تیر پراں بیں و ناپیدا کماں
جانہا پیدا و پنہاں جان جاں
تیر رامشکن که این تیر شہی است
نیست پر تابی زشعت آگهی است
مارمیت از رمیت گفت حق
کار حق برکارہا دارد سبق [1]

---

[1] مثنوی دفتر دوم ۱۳۳ ط علمی

ترجمہ:

ہاتھ تو چھپا ہوا ہے اور قلم لکھ رہا ہے گھوڑا جولان میں ہے اور سوار نظر نہیں آتا کبھی تو اسے بلند کرتا ہے اور کبھی پست کبھی اس کو ٹھیک کرتا ہے اور کبھی توڑ دیتا ہے کبھی اسے دائیں طرف لے جاتا ہے کبھی بائیں طرف کبھی اسے گلستان بنا دیتا ہے کبھی کانٹا تیر تو اڑ رہا ہے لیکن کمان نظر نہیں آتی جانیں تو نظر آتی ہیں لیکن جان جان پنہاں ہے تیر کو مت توڑ کیونکہ یہ بادشاہ کا تیر ہے یہ تیر عام تیروں کی طرح نہیں پھینکا گیا بلکہ س تیر کو تو عرفان و آگہی کی شفت ونشانہ بنا کر پھینکا گیا ہے۔حق تعالیٰ نے مارمیت اذرمیت کہا ہے حق تعالیٰ کا کام تمام کاموں پر سبقت رکھتا ہے

کامیابی اور شکست خدا کی طرف سے ہے

خداوند عالم منافقین کو جو جنگوں میں کامیابیوں کو خدا کی طرف اور شکستوں کو خود پیغمبر اکرمؐ کی طرف نسبت دیتے تھے خطا اور غلطی پر قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ دونوں ہی خدا کی طرف سے ہیں۔آیت کا متن یہ ہے:

وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ‌ؕ قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ‌ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَۤاءِ الۡقَوۡمِ لَا يَكَادُوۡنَ يَفۡقَهُوۡنَ حَدِيۡثًا۝۷۸ (نساء)

''اگر منافقین کو کامیابی ہو جائے تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر انہیں شکست ہو جائے تو کہتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے کہ دے کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے، اس قوم کو کیا ہو گیا ہے یہ اتنی سی بات کو کیوں نہیں سمجھتے۔''

آیت میں ''حسنہ'' سے مراد وہ امور ہیں، جو انسان کے مزاج اور مصالح کے ساتھ منطبق ہوں اور سکیئۃ سے مراد وہ باتیں ہیں جو اس کے برخلاف ہوں، مثلاً ''جنگ میں کامیابی'' اس گروہ کے لیے تو جو جنگ میں کامیاب ہوا ہے حسنہ ہے اور اس گروہ کے لیے جو شکست کھا گیا سیئہ کا نام دیا جاتا ہے۔

منافقین قرآن کے بلند معارف سے آگاہ نہ ہونے کی بنا پر مسلمانوں کی مشرکین سے جنگ میں فتح مندیوں اور کامیابیوں کو تو خدا کی طرف سے جانتے تھے اور جنگوں میں شکست کو جیسا کہ جنگ ''احد'' میں ہوئی تھی، پیغمبر اکرمؐ سے مربوط سمجھتے تھے، اس تفسیر میں ایک بہت پرانی بات ملتی ہے۔حضرت موسیٰ کے دشمنوں کی منطق بھی یہی تھی، جب فرعونیوں کو کوئی نعمت حاصل ہوتی تھی تو وہ اسے اپنی لیاقت اور شائستیوں کا نتیجہ اور محلول سمجھتے تھے اور جب کبھی وہ کسی مصیبت، بلا اور عذاب سے روبرو ہوتے تو حضرت موسیٰؑ کے وجود کو فال بد بنا کر اسے حضرت موسیٰ اور ان

افراد کے وجود کا نتیجہ بتاتے جو ان کے گرد و پیش تھے۔[1]

قرآن منافقین کی غلط منطق کے مقابلہ میں جو نیکیوں کو خدا کی طرف اور برائیوں کو پیغمبر اکرمؐ کی طرف نسبت دیتے تھے، گویا عالم میں دو مستقل موثر وجود رکھتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی دوسرے کے مقابلہ میں اپنی اپنی مخلوق ہے۔ اس طرح کہتا ہے: قل کل من عند اللہ، دونوں خدا کی طرف سے ہیں۔

کیونکہ ''توحید در خالقیت'' اور ''توحید در تدبیر'' کی بنا پر عالم میں ایک سے زیادہ خالق نہیں ہے اور کامیابیوں، شکستوں، نعمتوں اور بلاؤں میں سے جو چیز بھی وجود کا لباس پہنتی ہے، وہ اس لحاظ سے کہ خارج میں وجود رکھتی ہیں سب کی سب خدا کی طرف سے ہیں اور ہرگز یہ بات صحیح نہیں ہے کہ ایک کا خالق خدا دوسرے کا خالق پیغمبر اکرمؐ یا کوئی دوسرا شخص ہو۔

اسی بنا پر قرآن کی منطق یہ ہے کہ ''قل کل من عند اللہ''

ایک سوال

یہاں ایک سوال کی گنجائش باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ''حسنہ'' اور ''سیئۃ'' اور دوسرے لفظوں میں اچھائیاں اور برائیاں دونوں خدا کی طرف سے ہیں، تو پھر بعد والی آیت میں دوسری طرح سے کیوں کہتا ہے اور یہ فرماتا ہے ہر قسم کی نیکی جو پیغمبر اکرمؐ کو پہنچتی ہے وہ تو خدا کی طرف سے ہے اور ہر قسم کی برائی جو انہیں پہنچتی ہے وہ خود انہیں کی طرف سے ہے، جب وہ اچھائیاں اور برائیاں جو منافقین کو پہنچتی ہیں، دونوں خدا کی طرف سے ہیں، تو پھر وہ اچھائیاں اور برائیاں جو پیغمبر اکرمؐ کو پہنچتی ہیں، وہ بھی خدا ہی کی طرف سے ہونی چاہئیں، کیونکہ اس چیز میں خصوصیت کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ اور منافقین کے درمیان کیا فرق ہے۔

آیت کا متن یہ ہے:

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ

(نساء)

''جو نیکی تجھے پہنچے وہ تو خدا کی طرف سے ہے اور جو بدی تجھے پہنچے وہ خود تیری ہی طرف سے ہے۔''

جواب

اس سوال کا جواب ''بلا'' اور ''شر'' کے نسبی ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے بہت ہی واضح ہے، کیونکہ ہر قسم کا ''شر'' اور ''بلا'' یہاں تک کہ سانپ اور بچھو بھی، اس لحاظ سے کہ انہوں نے خدا سے وجود حاصل کیا ہے اور موجودات عالم کی صورت میں وجود میں آئے

---

[1] فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ (اعراف ۱۳۱)

ہیں، سراسر خوب وزیبا اور خوبصورت ہیں، یہ موجودات ''سیئۃ'' کا عنوان اور ''بدی'' کا رنگ اس وقت اپنے لیے لیتے ہیں جب ہم ان کا انسان کے ساتھ مقائسہ اور موازنہ کرتے ہیں اور ان کی ناسازگاری کا حکم لگاتے ہیں، یہ وہ موقع ہے جب ہم کہتے ہیں کہ سانپ اور بچھو انسان کی جان کے لیے بلا ہیں۔

اگر پہلی آیت میں تمام کامیابیوں اور ناکامیوں، فتح مندیوں اور شکستوں، بارشوں اور سیلابوں کو خدا کی طرف سے کہتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر موجود اس لحاظ سے کہ وہ موجود ہے حسن وزیبائی کا ایک حصہ رکھتا ہے، لہٰذا قہراً خدا کی طرف سے ہے تو اب اس موقع پر اس کو سیئۃ اور برائی کا نام نہیں دے سکتے، اگر قرآن نے پہلی آیت میں اس کو ''سیئۃ'' بھی کہا ہے تو وہ مخاطب کی زبان میں گفتگو کرنا چاہتا ہے کیونکہ جب تک کوئی مقالیسہ اور موازنہ درمیان میں نہ ہو اس وقت تک کوئی موجود بدی کے ساتھ موصوف نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ سراسر حسن وحسن ہوگا، اسی بنا پر پہلی آیت میں سبھی کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہے۔

اس کا نام ''سیئۃ'' (بدی) اسی صورت میں رکھا جاسکتا ہے، جب اس کے اور انسان کی زندگی کے درمیان ایک قسم کی نسبت آجائے، مثلاً دشمن کی قدرت اپنے مدمقابل کو ضرر پہنچانے میں صرف ہو، بارش کسی گھر کے خراب وبرباد ہونے کا سبب بن جائے تو یہی وقت ہے جب اس کا نام ''سیئۃ'' رکھنا پڑتا ہے، یہی وہ موقع ہے جب لوگ کہتے ہیں کہ بلا نازل ہوئی۔

ایسی صورت میں خدا سیئہ کی خود انسان کی طرف نسبت دیتا ہے اور کہتا ہے، ''وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک''، ''جو برائی تجھے پہنچے تو وہ خود تیرے نفس سے ہے۔'' کیوں؟ اس لیے کہ اس موقع پر انسان کے برے اور گذشتہ اور دیرینہ اعمال اور کوتاہیوں کو اس گرفتاری میں بے اثر نہیں سمجھا جاسکتا یا اس سے بے پرواہی نہیں کی جاسکتی، کیونکہ شکستیں اور ناکامیاں، بلائیں اور مصیبتیں انسان کی انفرادی اور اجتماعی کوتاہیوں کا معلول اور نتیجہ ہوتی ہیں۔

شرابی اور نشہ کا عادی انسان مصائب کے ایک سلسلہ کا منتظر ہے، وہ قوم جو سیلابوں کے راستے میں بند نہیں باندھتی اور زلزلہ خیز علاقہ میں ایسے گھر جو زلزلہ کا توڑ ہیں کھڑے نہیں کرتی، اس قسم کا کوتاہی کرنے والا معاشرہ گھروں کو تباہ کرنے والی بلاؤں کی گھات میں واقع ہے، اسی لحاظ سے خدا دوسری آیت میں فرماتا ہے:

مَآ اَصَابَكَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنۡ سَيِّئَةٍ فَمِنۡ نَّفۡسِكَ ؕ

''جو نیکی بھی تمہیں پہنچتی ہے وہ تو خدا کی طرف سے ہے اور جو برائی تجھے پہنچتی ہے، وہ خود تیری اپنی طرف سے ہے۔''

خدا کے پیغمبر ہمیشہ اس گروہ کی جو پیغمبروں کے وجود کو فال بدخیال کرتے تھے اور برائیوں اور ناکامیوں کو انہی کی طرف سے سمجھتے تھے، ندامت کیا کرتے تھے اور کہتے تھے:

قَالُوۡا طَآئِرُكُمۡ مَّعَكُمۡ ؕ اَئِنۡ ذُكِّرۡتُمۡ ؕ (یس ۱۹)

''تمہاری سرنوشت تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے وہ تمہارے ہی ساتھ ہے اگر تم متذکر ہو۔''

اگر دوسری آیت میں یہ کہتا ہے:

اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ (اعراف)

''ان کی سرنوشت خدا کے پاس ہے، لیکن ان میں سے بہت سے نہیں جانتے۔'' [۱]

مقصد یہ ہے کہ خدائے بزرگ و برتر، اپنے وسیع علم و آگاہی کے ذریعہ، تمہاری سرنوشت سے آگاہ اور باخبر ہے۔

قابل ملاحظہ نکتہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں کہتا ہے: تمہاری سرنوشت تمہارے ساتھ (طائرکم معکم) کیونکہ انسان کے اعمال ہی انسان کی سرنوشت کو بناتے ہیں، لیکن جب انسان کی سرنوشت کے بارے میں خدا کے علم محیط کی گفتگو کرتا ہے تو وہاں یہ کہتا ہے: (انما طائرھم عنداللہ)

قرآن دوسری آیات میں انسان کے گذشتہ اعمال اور حالات کو گرفتاریوں اور دگرگونیوں کی علت سمجھتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

وَمَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾ (شوریٰ)

''جو مصیبت بھی تمہیں پہنچتی ہے، وہ ان کاموں کے ایک سلسلہ کی وجہ سے جو تم نے انجام دیئے ہیں اور بہت سے امور کو تو معاف کر دیتا ہے۔''

اور دوسری آیت میں فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ (رعد ۱۱)

''خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود ہی پہلے سے اپنی حالت کو نہ بدل ڈالیں۔'' [۲]

بحث کے اختتام پر چند نکات کی یاددہانی

۱۔ قرآنی آیات اور عقلی دلائل نے وضاحت کے ساتھ یہ ثابت کر دیا ہے کہ ''توحید در خالقیت'' اس بات سے مانع نہیں ہے کہ نظام آفرینش علت و معلول کی اساس و بنیاد پر استوار ہو اور ہر موجود چیز کسی خاص سبب کے بعد وجود میں آئے، کیونکہ اسباب کی تاثیر خدا کے ارادہ اور مشیت سے الگ نہیں ہے اور ایک طرح سے خود اسی کا فعل ہے۔

---

[۱] سورۂ نمل کی آیہ ۴۷ بھی اسی مضمون کی ہے۔

[۲] سورۂ انفال کی آیہ ۵۳ کا بھی تقریباً یہی مضمون ہے۔

۲۔ بعض اوقات مصالح کا تقاضا ہوتا ہے کہ خدا سبب کو سببیت سے روک دے اور علت کے اثر کو اس سے سلب کر لے، مثلاً آگ کو حکم دے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کو نہ جلائے [۱]۔ اور دریا کو حکم دے کہ حضرت موسیٰ اور اس کی قوم کو غرق نہ کرے [۲] اور اسی طرح............ یہی وجہ ہے کہ خدا کی کبھی سبب سازی اور کبھی سبب سوزی کے ساتھ توصیف ہوتی ہے اور ہم یہ کہتے ہیں، سبب ساز خدا اور سبب سوز خدا۔

مولوی اس موضوع کے بارے میں اس طرح کہتا ہے:

عین آں تخییل را، حکمت کند
عین آں زہر آبرا، شربت کند
درخرابی، گنج ہا، پنہاں کند
خار راگل، جسم ہارا، جاں کند
آن گمان انگیزرا، سازد یقین
مہر ہا انگیزد از اسباب کیں
پرورد درآتش ابراہیمؑ را
ایمنی روح سازد، بیم را
از سبب سازیش من سودائیم
وزسبب سوزیش سو فسطائیم
در سبب سازیش سر گردان شدم
در سبب سوزیشن ہم حیراں شدم [۳]

خدا خواب وخیال کو حکمت ودانائی بنا دیتا ہے اور زہر والے پانی کو شربت کر دیتا ہے خرابوں اور ویرانی میں خزانوں کو پنہاں رکھتا ہے اور کانٹے کو پھول اور جسموں کو جان بنا دیتا ہے گمان پیدا کرنے والی چیز کو یقین بنا دیتا ہے اور بغض وکینہ کے اسباب سے مہر ومحبت پیدا کر دیتا ہے آگ میں حضرت ابراہیمؑ کی پرورش کرتا ہے خوف اور خطرے کو روح کی راحت کا سبب بنا دیتا ہے اس کی سبب سازی سے میں دیوانہ ہو گیا ہوں اور اس کی سبب سوزی سے میں سوفسطائی بن گیا ہوں میں اس کی سبب سازی میں سرگرداں ہوں اور اس کی

---

[۱] قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ (انبیاء ۶۹)

[۲] فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِى الْبَحْرِ يَبَسًا (طٰہٰ ۷۷)

[۳] مثنوی دفتر اول ص ۱۴ ط علمی

سبب سوزی میں بھی حیران ہوں

۳۔ ''اس جہان میں ہر موجود چیز کسی علت کی معلول ہے'' اور یہ ایک کلی اور عمومی قانون ہے جو عقل کے فیصلہ کی بناء پر بدلنے کے قابل نہیں ہے، تو اس صورت میں یہ سوال ہوگا کہ اشیاء کے معجزات اور اولیاء کی کرامات کس عامل کے ماتحت وجود میں آئے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ خارق العادۃ امور کی طبیعی یا مخصوص طبیعی علت ایسی نہیں ہے، جس کی شناخت اور پہچان ہوتی ہو، یہ بات نہیں ہے کہ پیغمبروں کے معجزات بغیر علت کے معلول ہوں اور کسی سبب کے بغیر ہی ظہور میں آ گئے ہوں، معجزہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس کی علت طبیعی کو پہچانا نہیں گیا ہے نہ یہ کہ اس کی بالکل کوئی علت ہی نہیں ہے۔

لیکن خارق العادت امور کی علت کیا ہے؟ علماء اسلام نے علم کلام کی کتابوں میں ان کے بارے میں بحث اور گفتگو کی ہے۔[1]

۴۔ جب خدا کی سنت اس پر جاری ہے کہ اس کی مادی اور معنوی فیوض مخصوص اسباب کے ذریعہ ہم تک پہنچیں، مثلاً خدا کی مشیت یہ ہے کہ خدا کی مادی اور معنوی تربیتیں سورج اور پیغمبروں کے ذریعہ ہم تک پہنچیں، تو اس صورت میں قیامت کے دن شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کو بھی اسی مقولہ سے سمجھنا چاہیے۔

شفاعت ایک فیض الٰہی ہے جو خدا کی جانب سے ہمیں پہنچتا ہے اور فیض کا واسطہ وہی اس کی بارگاہ کے عالی مقام شفیع ہیں۔

اس بات کی واضح و روشن دلیل کہ شفاعت فیض الٰہی ہے، یہ ہے کہ خود خدا شفیع کو اذن دیتا ہے کہ اس بارے میں شفاعت کرے۔[2]

وہ شفاعت کرنے والے کو اٹھاتا ہے کہ وہ اس بارے میں خدائی فیض اور مغفرت کا حامل بنے۔

اصولی طور پر آخرت کی شفاعتیں دنیوی شفاعتوں کے برعکس نہیں، آخرت میں خدا شفاعت کرنے والے کو کھڑا کرے گا کہ وہ گنہگار کے بارے میں شفاعت کرے، جب کہ اس جہان میں گنہگار شفاعت کرنے والے کے پیچھے جاتا ہے اور اسے اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں شفاعت کرے۔ اس بنا پر دنیاوی شفاعتیں ایک قسم کی پارٹی بازی سے مشابہ ہیں جو عدالت اسلامی کی روح کے ساتھ سازگار نہیں ہیں جب کہ اخروی شفاعتیں خدائی فیض ہیں جو مبدأ اعلیٰ کی طرف سے مذنبین اور گنہگاروں کی طرف نازل ہوتی ہیں۔

---

[1] مولف نے بھی کتاب (رسالت جہانی پیغمبران) کے ص ۹۹ - ۱۱۳ پر اس بارے میں کچھ بحث کی ہے۔

[2] مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ (بقرہ ۲۵۵)

نواں حصہ

توحید افعالی

حاکمیت خدا کا مخصوص حق ہے اور اس کے سوا کوئی بھی حق حکومت نہیں رکھتا اور ہر قسم کی حکومت کو
اسی کے حکم سے صورت پذیر ہونا چاہیے

اس حصہ میں

۱۔ لوگوں پر حکومت کرنا، ان کی جان و مال پر ولایت کے آثار میں سے ہے اور خدا کے علاوہ اور کوئی بھی اس قسم کی ولایت نہیں رکھتا۔

۲۔ یہ بات کہ حکومت خدا کا مخصوص حق ہے، اس سے مانع نہیں ہے کہ شائستہ اور لائق افراد خدا کی جانب سے زمام حکومت ہاتھ میں لیں۔

۳۔ حکومت کے مسئلہ کے خدا کے ساتھ مخصوص ہونے کا خوارج کے نعرے کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔

۴۔ پیغمبروں اور اولیاء خدا کی حکومت اذن خدا سے صورت پذیر ہوتی ہے۔

۵۔ حکومت ایک ایسی چیز ہے جس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

۶۔ اس بارے میں مارکس کے نظریہ کی نارسائی اور دنیا کے عظیم فلاسفہ کے نظریہ کا بیان۔

۷۔ حکومت ہدف و مقصد نہیں ہے بلکہ وسیلہ اور ذریعہ ہے۔

۸۔ اس بارے میں سب سے اہم بات، حکومت اسلامی کے طرز اور طریقہ کو بیان کرنا ہے۔

حاکمیت، خدا کا خاص حق ہے

''حکومت'' سے مراد اس بحث میں وہی تسلط ہے اور ''حاکم'' سے مقصود وہی صاحب تسلط فرمانبروا ہے جو یہ چاہتا ہے کہ معاشرے میں نظم وضبط قائم کرے۔

دوسرے لفظوں میں حاکم وہ شخص ہے جو اس ولایت کی بنا پر جو اس کے پاس ہے لوگوں کے مال ونفوس کے بارے میں جو چاہے ارادہ کرے اور جو چاہے فرمان دے۔

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ حاکم اس ولایت کی بنا پر جو اس کے پاس ہے، لوگوں کے مال وجان میں جو چاہے ارادہ کرے تو اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ لوگوں کے مال کو لوٹ مار کے ذریعہ چھین لے اور ان کے نفوس کو جان سے مار دے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ نظم وضبط کی حفاظت کے لیے انسانوں کے اموال میں حدود وقیود کو عمل میں لائے، درآمد وبرآمد کو محدود کرے اور زکوۃ وخمس کے مالیات وصول کرے اور ضرورت کے وقت لوگوں کو جنگ کی طرف بھیجے اور اسلامی مملکت سے باہر جانے کے لیے پروگرام منظم کرے وغیرہ وغیرہ۔

تو جب نظام کی برقراری کے لیے حکومت کا وجود جان ومال پر ایک قسم کا تسلط چاہتا ہے تو پھر کوئی بھی شخص چاہے وہ خدا کا برگزیدہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، کسی پر بھی اس قسم کا تسلط نہیں رکھتا، سوائے اس خالق ومالک کے جو جہان وانسان کو عدم سے وجود میں لایا ہے اور اس کی ہر چیز اسی کی مخلوق مملوک ہے اور وہ ہر لحہ اس کی طرف محتاج ونیاز مند ہے۔

کیونکہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، حکومت اس ولایت کی بنا پر ہے جو حاکم مورد ولایت انسان کے جان ومال پر رکھتا ہے اور چونکہ تمام انسان بارگاہ خداوندی میں یکساں ہیں لہٰذا کوئی بھی شخص کسی بھی شخص پر بالذات اس قسم کا حق ولایت وسرپرستی نہیں رکھتا۔ سوائے خدائے بزرگ کے کہ انسانکی تمام چیزیں چاہے اس کی جان ہو یا اس کا مال، اسی کی مخلوق ہیں یا پھر وہ لوگ جنہیں خدا ولایت عطا کرے اور انہیں اپنا قانونی والی وحاکم معرفی کرائے۔

اس بنا پر یہ کہنا چاہیے کہ حکومت ''ولایت رکھنے اور فرمان دینے کے حق'' کے معنی میں خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ توحید کے مراتب میں سے ایک شمار ہوتی ہے اور ''توحید در حکومت'' کی حقیقت یہ ہے کہ ہم صرف اس کو ہی بشر کے جان ومال کا حاکم سمجھیں اور بس۔

آیات قرآنی نے ایک طرح سے اس تحلیل عقلی کو قبول کیا ہے اور اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝۴۰ (یوسف)

''حکومت خدا کے علاوہ اور کسی کے لیے نہیں ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ ہم صرف اسی کی عبادت کریں یہی

استوار و محکم دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

آیت میں ''ان الحکم'' کے جملہ سے مراد وہی حکومت اور فرمانروائی ہے، اس کی گواہی یہ چیز دیتی ہے کہ اس کے بعد تشریعی امر و نہی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

امر الا تعبدوا الا ایاہ

اس سے مراد حکومت تکوینی ہرگز نہیں ہے کہ جو وہی عالم کی تدبیر اور اس کا ادارہ کرنا ہے۔

اگرچہ اس سورہ کی آیۃ ۶۷ سے مراد [۱] حکومت وولادیت تکوینی ہی ہے جس کی بازگشت تدبیر عالم کی طرف ہے۔

اسی طرح کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم لفظ ''حکم'' کو جو ایک وسیع معنی رکھتا ہے، خالص طور سے قضاوت اور فیصلہ کرنے یا تشریع اور قانون وضع کرنے میں محصور کر دیں، بلکہ اس آیت میں لفظ ''حکم'' ایک وسیع معنی کا حامل ہے، جس کے شئون میں سے ایک قضاوت اور فیصلہ کرنا بھی ہے اور اس سے وہی وسیع معنی میں تسلط اور فرمان مراد ہے، آپ اس حقیقت کو (کہ حکومت خدا کے ساتھ مخصوص ہے) دوسری آیت سے بھی معلوم کر سکتے ہیں۔[۲]

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ حکومت ایک ایسا حق ہے جو خدا کے ساتھ مخصوص ہے، شفاعت کی طرح سے ہے کہ وہ بھی ایک ایسا حق ہے جو خدا کے ساتھ مختص ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: وَلِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ط (زمر ۳) اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ خدا کو ہی براہ راست بندوں کے امور اور اجتماع کے نظام کا ادارہ کرنا بھی اپنے ذمہ لے لینا چاہتے اور چونکہ وہ ولایت رکھتا ہے لہذا رئیس و امیر بھی اسی کو ہونا چاہیے۔ نہیں! اس قسم کے حق کا خدا کے ساتھ اختصاص اس کی مستقیم اور براہ راست سرپرستی کے ساتھ لازم نہیں ہے، بلکہ خدا اس قسم کا حق رکھنے کی بنا پر نوع بشر میں سے کسی کو اس کے لیے امیر و رئیس مقرر کر سکتا ہے، جو اس کی طرف سے حکومت کرے، کیونکہ ایسے بشر پر، جو مادی ماحول کے اندر زندگی بسر کرتا ہے، براہ راست اور بہ نفس خود اس کے لیے فرمانروائی کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس بنا پر خدا نے ایک گروہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کی طرف سے لوگوں کے درمیان حکومت کرے اور اس نے انہیں اس کام میں اپنا جانشین بنایا ہے، جیسا کہ ''داؤدؑ'' کو ذیل کے خطاب کے ساتھ مخاطب کر کے فرماتا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ

---

[۱] ان الحکم الا للہ علیہ توکلت و علیہ فلیتوکل المتوکلون، چونکہ وہ یہ حکم دے رہا ہے کہ ہم اپنی زندگی میں اسی پر توکل کریں، اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد خدا کی ولایت تکوینی ہے جو وہ عالم پر رکھتا ہے اور توکل ولایت تکوینی کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

[۲] المعجم الفہرس مادہ ''حکم'' کی طرف رجوع کریں۔

الْهَوٰى (ص ٢٦)

''اے داوٴدؑ، ہم نے تجھے روئے زمین میں اپنا نمایندہ مقرر کیا ہے تا کہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کرے اور ہوا وہوس سے پرہیز کرے۔''

یہ آیت اگر چہ قضاوت اور فیصلہ کرنے کے ساتھ مربوط ہے، لیکن قضاوت وداوری کے محیط و ماحول میں ان کی بات کا سرچشمہ ان کی وسیع ولایت وحکومت ہی ہے اور وہ حکومت وفرمانروائی کو بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ کیونکہ اس بات کے علاوہ کہ قاضی کے حکم کا نفاذ تسلط اور مقتدر حکومت رکھنے کے بغیر ممکن نہیں ہے، حضرت داوٴدؑ کے زمانہ میں قوت قضائی قوت اجراتی سے جدا نہیں تھی اور ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت داوٴدؑ ایک بہت ہی طاقت ورحکومت کے مالک تھے، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (بقرہ ٢٥١)

''حضرت داوٴدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا اور خدا نے اسے فرمانروائی اور حکومت دی اور جو کچھ اس نے چاہا اسے علم دیا، اگر خدا بعض لوگوں کو دوسرے بعض کے ذریعے دفع ونابود نہ کرتا تو روئے زمین میں فساد ہو جاتا۔''

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ حضرت داوٴدؑ حکومت واقتدار رکھتے تھے اور اس امر کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ کوئی قدرت قضائی اور عدالت، ایک طاقت ورحکومت پر تکیہ کئے بغیر موثر نہیں ہوسکتی اور یہ کہ پیغمبروں میں مقام قضاوت وفیصلہ مقام اجراء ونفاذ سے جدا نہیں تھا، یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت داوٴدؑ نے خدا کی طرف سے نمائندگی کی بنا پر اس قسم کے مقام کے حامل تھے اور حق حکومت وفرمانروائی رکھتے تھے اور اگر خدا کی طرف سے انہیں اس قسم کا مقام نہ دیا گیا ہوتا تو نہ تو ان کی قضاوت ہی نافذ ہوتی اور نہ ہی ان کے دوسرے فرامین واحکام۔

اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ حکومت خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہم اس سے خوارج کے شعار اور نعرے کو زندہ کرنا نہیں چاہتے۔ جب کہ وہ مسجد میں نعرے لگاتے تھے اور یہ کہتے تھے:

ان الحکم الا للہ لا لک ولا لا صحابک [1]

''ولایت وحکومت خدا کے ساتھ مخصوص ہے، نہ تیرے لیے اور نہ ہی تیرے اصحاب کے لیے، اے علیؑ۔''

وہ یہ نعرے لگا کر جو بظاہر حق اور قرآن کی پیروی تھا۔ اس کے باطل معنی کا ارادہ کرتے تھے اور وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ اصولی طور پر روئے زمین پر کوئی امیر نہیں ہونا چاہیے۔ چاہے اس کی حکومت کو خدا کی تائید ہی کیوں نہ حاصل ہو اور وہ اس کی طرف سے مقرر شدہ ہی کیوں نہ

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ٣٩

ہو، وہ یہ باتیں اس لیے کرتے تھے تا کہ معاشرے کو ہرج ومرج کی طرف کھینچ کرلے جائیں اور معاشرے میں ایک قسم کی بدنظمی پیدا کردیں۔

اس وجہ سے امام نے ان کے جواب میں فرمایا:

کلمة حق یراد بها الباطل نعم لا حکم الا لله ولکن هولاء یقولون لا امرة الا لله، [1]

''یہ بات تو حق ہے، لیکن انہوں نے اس سے باطل معنی مراد لیا ہے، وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ روئے زمین پر اصلاً کوئی حکومت قائم نہیں ہونی چاہیے اور کسی قسم کا امیر اور کوئی رئیس لوگوں کے درمیان نہیں ہونا چاہیے۔''

''توحید در حکومت'' سے ہمارا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ حق حکومت اصالتاً خدا کے ساتھ مربوط ہے اور دوسروں کی حکومت اس کے نصب کرنے اور خصوصی اجازت کے ساتھ ہونی چاہیے۔

پیغمبرؐ اور اولی الامر کی حکومت خدا کی طرف سے ہے

آیات قرآن کی طرف رجوع کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام نے پیغمبرؐ کی حکومت اور اولی الامر کی ولایت کو رسمی اور قانونی طور پر قبول کیا ہے اور اسی بنا پر حکم دیا ہے کہ ہم ان کی اطاعت اور پیروی کریں، جیسا کہ فرماتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (نساء۵۹)

''اے ایمان والو! خدا کی اور پیغمبر اکرمؐ اور صاحبان امر کی اطاعت کرو، جو تم میں سے ہیں۔''

کسی فرد یا مقام کی اطاعت کا حکم اسی صورت میں صحیح ہے جب کہ وہ فرد یا مقام اصالتاً یا نیابتاً منصب اور حکومت کا حامل ہو اور اس قسم کے مقام ومنصب کے حصول کے بغیر اطاعت کو لازم قرار دینا بے سبب اور بلا جواز ہے۔

اب ''اولی الامر'' سے کون مراد ہے، کیا یہ انہیں بارہ آئمہ معصومین میں منحصر ہے، یا یہ بات ہے کہ یہ حضرات تو اس کے واضح مصادیق میں اور ہر واجد الشرائط زمامدار بھی اولی الامر کا مصداق ہے، اس کے بارے میں کسی دوسری جگہ بحث وگفتگو کرنا چاہیے۔

یہ آیت اور اس کے مانند دوسری آیتیں [2] اس بات کی ترجمان ہیں کہ خدا نے پیغمبرؐ اور اولوا الامر کو اسلام میں رسمی اور قانونی طور پر

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۳۹

[2] اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (احزاب ۶)

حاکم ووالی تسلیم کیا ہے اور اسی وجہ سے ان کی اطاعت واجب قرار دی ہے۔

حکومت اور سلطنت لازمی وضروری چیز ہے

ایک گروہ کے تصور کے برخلاف، جن کا خیال یہ ہے کہ حریت وآزادی اور سلطنت وحکومت آپس میں دو متناقص ومتضاد چیزیں ہیں اور یہ ہرگز جمع نہیں ہو سکتے اور افراد کی آزادی کی حفاظت کا تقاضا یہ ہے کہ قانون اور حکومت کو زندگی کی لغت سے حذف کر دیا جائے۔

یا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ حکومت اور سلطنتیں ہمیشہ طاقت وروں اور زور مندوں کی طرف داری کرتی ہیں اور عوام الناس کے مصالح کو نظر میں نہیں رکھتیں۔ یا یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان ذاتی طور پر خیر اور نیکوکار، عاقل اور صاحب فکر ونظر پیدا ہوا ہے پھر حکومت کے قیام کی کیا ضرورت ہے۔

ان کمزور اور بے بنیاد خیالات کے برخلاف، جو ایک قسم کی ہرج ومرج طلبی، سفسطہ اور سادہ دلی کے ترجمان ہیں، نوع بشر کی اجتماعی زندگی کے لیے حکومت کے وجود کی ضرورت اس قدر واضح ہے کہ کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی حکومت جو انفرادی آزادیوں کی اجتماعی مصالح کے دائرہ کے اندر حفاظت کرے، استعدادوں کی پرورش وتربیت کی کوشش کرے اور لوگوں کو اپنے فرائض سے آشنا کرے اور خدا کے یا لوگوں کے قوانین کو اجرا کرے، اسی بنا پر عالم کے عظیم دانش مندوں، مثلاً افلاطون [1]، ارسطو [2] اور ابن خلدون [3] اور کچھ دوسرے مفکرین نے حکومت کے وجود کو ایک لازمی اور ضروری چیز قرار دیا ہے۔

ان میں سے مارکس نے جب تک طبقاتی اختلاف ہے اس وقت تک تو حکومت کے وجود کو ضروری جانا ہے لیکن اس کا عقیدہ یہ ہے کہ کیمیونزم کے ساری دنیا میں پھیل جانے کے بعد حکومت کو ختم ہو جانا چاہیے، اس کا خیال یہ ہے کہ نزاع واختلاف کا سبب صرف طبقاتی اختلاف ہے اور اس کے مٹ جانے کے بعد اختلاف کا سبب ہی باقی نہیں رہے گا جو حکومت کے وجود کا تقاضا کرے۔

لیکن ''مارکس'' نے انسانی معاشرے کو صرف ایک ہی زاویہ سے دیکھا ہے اور وہ زاویہ اختلاف طبقاتی ہے، جب کہ انسانی معاشرے کے دوسرے زاویے اور پہلو بھی ہیں اگر وہ معاشرے کا ان زاویوں سے بھی مطالعہ کرتا تو پھر وہ اپنی اصلاح کے مطابق ''کیمونزم کے پھیل جانے'' کے بعد بھی حکومتوں کے ختم ہو جانے کا فیصلہ نہ دیتا، کیونکہ نزاع وجدال کا سبب صرف اور صرف طبقاتی اختلاف ہی نہیں ہوتا کہ جس کے ختم ہو جانے کے بعد سارا جہاں بہشت بریں ہو جائے، بلکہ دوسرے غرائز وطبائع مثلاً جاہ طلبی اور ایسی خودخواہی جس کی ہدایت نہ ہوئی ہو، نزاع کا مرکز اور جدال کا سرچشمہ ہوتے ہیں، اس لیے معاشرے کے لیے حکومت کا ہونا ضروری ہے جو افراد بشر کو اپنے قانونی وظائف اور ذمہ داری سے

---

[1] الجمہوریہ

[2] السیاست ترجمہ احمد لطفی ص ۹۶

[3] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۱ ۔ ۴۲

آشنا کرے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے، حق دار کو حق دلائے اور معاشرے کے نظم و ضبط کی جو تمدن کی بقاء کی بنیاد اور مادی و معنوی جہات میں انسانی پیش رفت کا سبب ہے، حفاظت کرے۔

اصولی طور پر کوئی بھی معاشرہ حتمیٰ کیمونزم کے پھیل جانے کے زمانہ میں بھی مکان، صحت، ڈاک، تار، ٹیلیفون، بجلی، پانی اقتصادی امور، کھیتی باڑی اور اس قسم کی چیزوں سے بے نیاز نہیں ہوسکتا اور ذمہ داریوں اور وظائف کی تقسیم کا مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جو کسی خاص زمانہ کے ساتھ مربوط ہو، تو قہراًوہ گروہ جو ان ذمہ داریوں کو تقسیم کرے اور وہ گروہ جو انہیں انجام دے، انہیں حکومت اور سلطنت کے علاوہ اور کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔

اس بیان سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسانی معاشرہ کسی بھی عصر اور زمانہ میں، چاہے وہ افلاطون کے "مدینہ فاضلہ" کی چوٹی کو بھی فتح کرے۔ حکومت کی تشکیل سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ نظام اجتماعی اور تمدن انسانی کی حفاظت کے لیے اور افراد کو حقوق اور ذمہ داریوں سے آشنا کرنے اور معاشرے میں ہر قسم کے اختلاف و نزاع کو دور کرنے کے لیے ایک قوی اور طاقت ور مرجع کی ضرورت ہے جو اس انسانی فریضہ کے ساتھ قیام کرے اور تمدن کی بنیادوں کی جو وہی معاشرے کے نظام کی حفاظت ہے، صیانت و حفاظت کرے اور فرائض اور ذمہ داریوں کی تقسیم کے ساتھ معاشرے کی بقاء کا ضامن ہو۔

اسلام کی حقیقت اصول و فروع کا ایک سلسلہ ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اور پیغمبر اسلامؐ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دینے اور مناسب حالات میں انہیں عملی جامہ پہنانے پر مامور تھے، لیکن چونکہ احکام کے ایک سلسلہ کا اجراء جو معاشرے میں نظم و ضبط کا محافظ ہے، تشکیل حکومت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا پیغمبر اسلامؐ نے عقل و خرد کے حکم کے مطابق اور اس ولایت کے حکم کے مطابق جو خدا نے انہیں دی تھی ایک حکومت کی تشکیل کی اور نظام توحید کو ایک حکومت اسلامی کے قالب میں ڈھال دیا۔

اسلام میں حکومت ہرگز ہدف اور مقصد نہیں ہے، بلکہ اس بنا پر کہ احکام و قوانین کا اجراء اور اسکے عالی اہداف و مقاصد کی برقراری، سیاسی نظم و ترتیب اور تشکیلات کے بغیر ممکن نہیں ہے، لہٰذا پیغمبر اسلامؐ نے ذاتی طور پر حکومت و سلطنت کی بنیاد رکھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ چور اور زانی کی حد کا اجرا، مالی اور حقوقی امور میں مسلمانوں کے اختلافات کا فیصلہ، ذخیرہ اندوزی اور گرانفروشی کو روکنا، زکوات اور دیگر اسلامی مالیات کی وصولی، اسلامی تعلیمات کی توسیع اور اسلامی ضروریات کو پورا کرنا، ایک جامع پیشرو اور قاطع سرپرست کے بغیر اور ملت کے لیے قابل قبول ایک زعامت اور حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اب جب کہ مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان اسلامی احکام اور تعلیمات کو صحیح طریقہ سے اجراء کریں اور دوسری طرف سے ایک مرکز کی تاسیس کے بغیر جس سے سب کے سب احکام و ہدایت حاصل کریں، ان کا صحیح اجرا ممکن نہیں ہے، ان وجوہات کی بنا پر مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ تعلیمات اسلامی کے تمام اطراف میں سیاسی تشکیلات اور اداروں کو منظم کریں، تاکہ وہ ہر زمانہ میں ہر ضرورت کو پورا کرے۔

امیر المومنین اپنی ایک گفتگو میں تشکیلات سیاسی اور حکومت کے لازمی اور ضروری ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ظالم حاکم کے

وجود کو بھی ہرج و مرج اور جنگلی زندگی بسر کرنے پر ترجیح دیتے ہیں اور آپ یاد دہانی کراتے ہیں کہ اصولی طور پر حکومت ہدف و مقصد نہیں ہے بلکہ موت کے دن کے آنے تک آرام و سکون کی زندگی کے لیے ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے اور دشمن کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے مالیات کے جمع کرنے، راستوں کے امن و امان کی حفاظت، طاقت ور اور قوی لوگوں سے مستضعف اور کمزوروں کا حق دلانے کا ایک وسیلہ ہے، جیسا کہ آپ فرماتے ہیں:

"انه لا بد من امیر بر او فاجر یعمل فی امرته المومن ویستمتع فیها الکافر و یبلغ الله فیها الاجل و یجمع به الغیئی و یقاتل به العدو و تأمن به السبل و یوخذ به للضعیف من القوی" [1]

''لوگوں کے لیے ایک امیر اور رئیس کا ہونا ضروری ہے، چاہے وہ نیکوکار ہو یا بدکار، تاکہ مومن اس کی حکومت میں اپنے کام میں مشغول رہے اور کافر اپنا فائدہ اٹھا سکے، نظم و نسق اور سکون آرام کے ذریعہ خدا ہر شخص کو اس کی اجل تک پہنچائے، اس حاکم کے ذریعہ مالیات جمع ہوں، دشمن سے جنگ اور چور اور ڈاکوؤں سے راستے پر امن رہیں اور ضعیف و ناتواں کا حق طاقت ور سے لیا جائے۔''

اس بیان سے بھی اور ایک اجتماعی محاسبہ اور مطالعہ سے بھی، عقل و خرد کی نظر میں حکومت کی تشکیل ایک ضروری چیز اور اجتماعی لازمی ضرورت دکھائی دیتی ہے، جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

اسلام میں حکومت کا طریقہ کیا ہے؟

حکومت اسلامی میں اہم ترین بحث، اسلام میں حکومت کے طریقہ کا بیان کرنا ہے اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہر زمانہ میں مسئلہ کی طرف بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے۔ اہل سنت کے لکھنے والوں نے خلفاء کی حکومت کو اسلامی حکومت کا معیار قرار دیا ہے اور یہی چیز ان کے فکری جمود کا سبب بنی ہے، پھر انھوں نے کوئی کوشش ہی نہیں کی کہ اپنی فکر کو طرزِ حکومت معلوم کرنے کے لیے کام میں لائیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا ان کے ایک مفکر مولف نے بھی اعتراف کیا ہے اور وہ لکھتا ہے: ایک خاص طریقہ سے خلفاء کا انتخاب علماء اسلام کے دماغی قوا کے معطل ہونے کا سبب بن گیا ہے، اس کے بعد انہوں نے یہ چاہا ہی نہیں ہے کہ ان دوسرے طرز ہائے حکومت میں، جن کا غیر اسلامی معاشروں میں تجربہ کیا ہے، بحث و تمحیص اور غور و فکر کریں۔

ایک شخص کی بیعت جس کا نمونہ صدر اسلام میں سقیفہ بنی ساعدہ میں انجام پایا، ذہنوں میں حکومت اسلامی کا معیار قرار پا گئی ہے اور

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۴۰

اس سے آگے نہیں بڑھی۔[1]

اور چونکہ علماء شیعہ اکثر حکومتوں پر معترض تھے، لہٰذا ان حکومتوں نے انہیں اپنے افکار ونظریات کی نشر واشاعت کی اجازت ہی نہیں دی، اس لیے قہراًوہ حکومت سے مربوط مسائل سے دور رہے اور وہ اس وادی میں بہت کم وارد ہوئے ہیں، سوائے چھوٹے چھوٹے کتابچوں اور رسالوں کے اور وہ بھی صرف چند ایک مسائل میں، جو حکومت کے ساتھ مربوط تھے، مثلاً جہاد، دفاع، احکام اراضی خراجی اور ظالم حاکم کی حکومت میں رکاوٹ ڈالنے کے موضوع پر اور کوئی چیز تالیف نہیں کی۔

اس بنا پر اسلام میں حکومت کی نوعیت اور طرز اور طریقہ کے بارے میں بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے اور اس سلسلہ میں کافی تحقیق انجام نہیں پاسکی۔

ہاں: گذشتہ صدی (چودھویں صدی) میں عظیم اور قابل قدر شخصیتوں مثلا آیت اللہ نائینی اور استاد بزرگوار حضرت آیۃ اللہ امام خمینی دام ظلہ نے ''تنبیہہ الامہ'' اور ''ولایت فقیہ'' جیسی کتابیں نشر کر کے پردے ہٹا دیئے ہیں اور افکار کو مسئلہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا ہے اور ہم نے بھی اپنے حصہ کی اس سلسلہ کی دو کتابیں نشر کی ہیں، ایک فارسی زبان میں ''حکومت اسلامی در چشم انداز ما'' کے نام سے اور دوسری عربی زبان میں ''معالم الحکومت الاسلامیہ'' کے نام سے جو عالم جلیل آقائے جعفر ہادی کے فاضلانہ قلم سے لکھی گئی ہے، امید ہے کہ ان دونوں کتابوں کا مطالعہ ہمیں حقیقت سے آشنا کرے گا۔

---

[1] الخلافت والامامت ص ۲۷۲

دسواں حصہ

توحید در اطاعت

عالم ہستی میں خدا کے علاوہ اور کوئی مطاع بالذات نہیں ہے اور دوسروں کی اطاعت اس کے اذن سے ہی انجام پانی چاہیے۔

اس حصہ میں

۱۔ توحید در اطاعت سے کیا مراد ہے؟
۲۔ خدا کے علاوہ اور کوئی بالذات ''واجب الاطاعت'' کیوں نہیں ہے؟
۳۔ وہ آیات جو خدا کو یکتا مطاع بتاتی ہوں۔
۴۔ اولیاء خدا کی اطاعت خدا کے اذن وفرمان سے انجام پاتی ہے اور ان کی اطاعت ایک طرح سے خدا ہی کی اطاعت ہے۔
۵۔ وہ گروہ جن کی خدا نے اطاعت واجب قرار دی ہے۔
۶۔ پیغمبر اسلامؐ اولی الامر، والدین۔
۷۔ پیغمبر اسلامؐ مقام تبلیغ کے علاوہ حکمرانی وفرمانروائی کا منصب بھی رکھتے ہیں۔
۸۔ اولی الامر سے کون مراد ہے؟
۹۔ والدین کی اطاعت حدود شرعیہ کے ساتھ محدود ہے۔
۱۰۔ والدین کی اطاعت کے تربیتی آثار۔

توحید در اطاعت

توحید کی اہم شاخوں میں سے ''توحید در اطاعت'' کا مسئلہ ہے، یعنی یہ اعتقاد رکھنا کہ خدا کے علاوہ اور کوئی فرمانروا اور مطاع (جس کی اطاعت کی جائے) نہیں ہے، صرف خدا ہی کی اطاعت کرنی چاہیے اور اسی کی بات سننی چاہیے، اس کے علاوہ کسی کی اطاعت واجب نہیں ہے۔

نکتہ

یہ مطلب واضح ہے کیونکہ اطاعت مالکیت اور مملوکیت کے شئون میں سے ہے وہ ذات جو ہستی اور وجود کی مالک ہے اور انسان کے تمام شئون اسی کی طرف سے ہیں اور اس کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی کی طرف سے ہے، تو اس کی بات اور اس کا فرمان واجب اطاعت اور اس کا حکم جاری ہونا چاہیے اور اطاعت کا معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اس کی نعمتوں کو جن میں سے ایک انسان کا وجود و ہستی اور ارادہ و خواہش بھی ہے، صرف انہی کاموں میں کہ جن میں اس کی رضا ہے، صرف کریں اور اس قسم کے فرمان سے سرکشی کرنا، سوائے ظلم و ستم کے جس کی قباحت اور برائی عقل کے نزدیک ثابت ہے اور کوئی چیز نہیں ہے۔

اس بیان سے واضح ہو گیا ہے کہ اس کی کیوں اطاعت کرنا چاہیے اور اس کے غیر کی اطاعت، نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں ہے بلکہ بعض اوقات جائز بھی نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں: صرف وہی (خدا ہی) حکم اور فرمان دینے کا حق رکھتا ہے اور یہ بات ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہے کہ انسان خود کو کسی دوسرے کا مطیع اور زیر فرمان قرار دے لے کیونکہ وہی اکیلا خالق و مالک ومنعم ہے، کہ انسان کی ہستی اور اس کے تمام شئون اسی کی طرف سے ہیں اور اس کے علاوہ سب کے سب انسان کی طرح ہے ہی اس کے محتاج اور نیازمند ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اسی کی طرف سے ہے تو اس طرح سے وہ دوسروں کے لیے واجب الاطاعت اور فرمانبروا کیسے بن سکتے ہیں۔

قرآن نے اس حقیقت کو ایک آیت میں جسے ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، بیان فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾ (فاطر)

''اے لوگو! تم سب کے سب خدا کے نیازمند اور محتاج ہو اور خدا بے نیاز اور لائق تعریف ہے۔''

اور زیادہ واضح عبارت میں: اگر ہمارا اعتقاد یہ ہو کہ عالم میں ایک پیدا کرنے والے اور ایک نعمت دینے والے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اور اس چہل پہل والی دنیا کا وہی سرچشمہ ہے اور ہر شخص کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اسی کی طرف سے ہے تو اس صورت میں دوٹوک طریقہ سے کہا جا سکتا ہے کہ عالم میں ایک سے زیادہ واجب الاطاعت بھی نہیں ہے اور صرف اسی کی اطاعت کرنا چاہیے اور بس۔

اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کئی ایک آیات میں صرف خدا ہی کی اطاعت کو پیش کرتا ہے۔ مثلاً:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ

(تغابن،۱۶)

''جتنا ہوسکتا ہے خدا کی مخالفت سے بچو اور اس کی بات کان دھر کر سنو اور اس کے حکم کی اطاعت کرو اور (اس کی راہ میں) خرچ کرو، یہ بات خود تمہارے لیے بہتر ہے۔''

دوسری آیت میں مومنین کے اس گروہ کی تعریف کرتا ہے جو خدا کے حکم کو کان دھر کر سنتے ہیں:

وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۖ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ﴿۲۸۵﴾ (بقرہ)

''انہوں نے کہا ہم نے سنا اور اطاعت کی، اے خدا ہم تیری بخشش کے خواہاں ہیں اور تیری ہی طرف بازگشت ہے۔''

ایک اور آیت میں پیغمبر اکرمؐ کی اطاعت کو اپنی اطاعت کی شاخ قرار دیتا ہے اور اس حقیقت کو دو آیات کے ذریعہ بیان کرتا ہے:

۱۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ (نساء ۶۴)

''کوئی پیغمبر ہم نے نہیں بھیجا مگر یہ کہ لوگ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کریں۔''

یہ آیت وضاحت کے ساتھ بتاتی ہے کہ پیغمبر کی اطاعت خدا کی اطاعت کی شاخ ہے اور اس کی اطاعت کے طول میں واقع ہے اور وہ ہرگز بالذات مطاع نہیں ہے اور اگر خدا اس کی اطاعت کا حکم نہ دیتا تو اس کی اطاعت کبھی بھی واجب نہ ہوتی۔

اسی بناء پر دوسری آیت میں رسولؐ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۖ (نساء ۸۰)

''جو شخص پیغمبر اکرم کی اطاعت کرے اس نے خدا ہی کی اطاعت کی ہے۔''

جب پیغمبر اکرمؐ کی اطاعت بھی صرف خدا کے حکم سے ہی صورت پذیر ہوتی ہو اور خدا کے اذن اور حکم کے بغیر اسے بھی (مطاع، واجب الاطاعت) ہونے کا مقام و منصب حاصل نہ ہو تو اس سے ان دوسرے ''مطاع'' (واجب الاطاعت) افراد کا حکم واضح ہو جاتا ہے، جن کی اطاعت قرآن میں وارد ہوئی ہے۔

اب ہم یہ تحقیق و تعین کریں گے کہ وہ افراد کون ہیں جن کی اطاعت خدا کے امر و فرمان سے واجب کی گئی ہے۔

وہ افراد جن کی اطاعت لازم ہے

وہ افراد جن کی اطاعت خدا کے امر و فرمان سے واجب کی گئی ہے، وہ چند گروہوں سے تجاوز نہیں کرتے۔

ا۔رسول گرامی اسلام علیہ الصلوۃ والسلام

پیغمبر اکرمؐ ان افراد میں سے ہیں جن کی اطاعت خدا کے حکم سے واجب ولازم ہے اور یہ حقیقت کئی آیات میں بیان ہوئی ہے، جو حسب ذیل ہیں:

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ (آل عمران)

''کہہ دے، خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرو، اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دے اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔''

پیغمبر اکرمؐ کی اطاعت کا لازم وواجب ہونا،نساء ۵۹، مائدہ ۹۲،انفال ۲۰، ۴۶،نور ۵۴،محمد ۳۳،مجادلہ ۱۳،تغابن ۱۲ میں بھی وارد ہوا ہے اور چند ایک آیات میں اطاعت کا ''امر'' اور حکم دینے کی بجائے ''ومن یطع اللہ ورسولہ'' جیسا جملہ وارد ہوا ہے،مثلاً نساء ۱۳، ۶۹، ۸۰،توبہ ۷۱،نور ۵۲،احزاب ۷۱ اور فتح ۱۷۔

پیغمبر اکرمؐ کی اطاعت اور فرمان سے روگردانی کا گناہ جو خدا کی طرف سے فرمانروائی کے منصب پر نصب کئے گئے ہیں،اس قدر ہے کہ آیات قرآن نے اسے کفر کے برابر سمجھا ہے،جیسا کہ فرماتا ہے:

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ (آل عمران)

''کہ دے خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرو اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دے خدا کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔''

جو شخص خدا کی جانب سے منصوب شدہ فرمانددار کے فرمان کو رد کرتا ہے تو اس نے حقیقت میں خدا کو ہی اصل واجب الاطاعت فرمانروا کے عنوان سے قبول نہیں کیا ہے اور اس کی اطاعت کا طوق اپنی گردن میں نہیں ڈالا ہے۔

اسی لزوم کی بنا پر چند ایک آیات میں پیغمبرؐ کی باتوں کی تکذیب،خدا اور اس کی آیات کی تکذیب شمار ہوئی ہے،جیسا کہ فرماتا ہے:

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ (انعام)

''ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتیں تجھے غمناک کرتی ہیں، وہ تیری تکذیب نہیں کرتے، بلکہ یہ ستمگر

(دراصل) خدا کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔"
اس بنا پر قرآن اور پیغمبر اکرمؐ اور ہر اس چیز کی تکذیب، جو مسلمہ طور سے خدا کے ساتھ وابستہ ہے، غیر مستقیم صورت میں خدا کی ہی تکذیب شمار ہوتی ہے۔

پیغمبر اکرمؐ کی اطاعت سے کیا مراد ہے؟

پیغمبر اکرمؐ کی ذمہ داریوں میں سے ایک خدا کے پیغام کی تبلیغ ہے اور خدا کے پیغاموں کی تبلیغ دو صورتوں میں انجام پاتی ہے۔

۱۔ آیات قرآن کی تلاوت جو پیک وحی ان کے قلب مبارک پر نازل کیا کرتا تھا، وہ آیات جن میں امر ونہی کا بیان ہوتا تھا، مثلاً أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ......

۲ خدا کے احکام اور فرامین کی اپنے شخصی بیانات کے ساتھ تبلیغ اور شخصی بیانات سے مراد وہی احادیث ہیں جن کے الفاظ خود پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ مربوط ہیں اور ان کے معانی خدا کی جانب سے ہوتے ہیں اور اصطلاح میں انہیں حدیث کہتے ہیں اور احادیث اسلامی میں خدا کے بہت سے احکام وفرامین جو ظاہراً قرآن میں وارد نہیں ہوتے، بیان ہوتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ خدا کے پیغامات کے پہچانے میں، چاہے وہ تلاوت قرآن کے ذریعہ ہو یا حدیث کی زبان سے ہو، سوائے اس کے کہ وہ رسولؐ اور پیغام لانے والے اور احکام الٰہی کی تبلیغ اور بیان کرنے والے ہیں اور کوئی مقام ومنصب نہیں ہے اور اگر قرآن پیغمبرؐ کی شاہد وبشیر ونذیر و...... کے ساتھ توصیف کرتا ہے تو وہ اسی قسم کے پیغامات کی طرف ناظر ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کا کام پیغام رسانی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

اس مقام ومنصب کے مقابلہ میں پیغمبر اکرمؐ کا ایک دوسرا مقام ومنصب بھی ہے جس کی رو سے وہ اسلامی معاشرہ کی اصلاح اور ادارہ کرنے کے لیے امر ونہی صادر فرماتے ہیں جہاد کا حکم دیتے ہیں، سب لوگوں کے جمع ہونے کا اعلان کرتے ہیں، کسی شخص کو فوج کی کمان کرنے کے لیے معین کرتے ہیں و............یہی وہ موقع ہے کہ جہاں پیغمبر اکرمؐ کے احکامات کی پیروی کرنا چاہیے اور ان کی مخالفت نہیں کرنا چاہیے اور ان کی مخالفت کرنا گناہ ہے اور بسا اوقات وہ مخالفت دین سے خروج کا سبب بھی بن جاتی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کے احکامات کی پیروی کے لازم وواجب ہونے سے مربوط آیات اسی موقع کے لیے ہیں، اس موقع پر پیغمبرؐ کا مقام ومنصب ایک حاکم اور فرمانروا کا مقام ومنصب ہے جو اپنے ماتحتوں کو امر ونہی کرتا ہے، اس موقع پر پیغام رسانی کا مقام اور احکامِ الٰہی کی تبلیغ کا مقام ومنصب نہیں ہوتا۔

مثلاً بعض اوقات اسلامی مصالح کا تقاضا ہوتا ہے کہ مسلمان واجب حقوق کی ادائیگی کے علاوہ کچھ اور مال بھی اسلامی مصالح کی راہ میں پیش کریں۔ کبھی کسی شوہر کی اپنی بیوی کے بارے میں سختگیری پیغمبر اکرمؐ پر ثابت ہو جاتی ہے تو آپ زن وشوہر کے تعلقات کے برقرار رہنے کو ناقابل برداشت قرار دے دیتے ہیں و............تو یہ ایسے مواقع ہوتے ہیں جب کہ آپ حکم دیتے ہیں کہ مسلمان کچھ اور رقم اسلامی خزانے میں جمع کرائیں یا شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے دے و............تو ایسے موقع پر مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ آپؐ کے حکم کی اطاعت کریں اور آپؐ کی مخالفت نہ کریں۔

قرآن مجید ایک اور آیت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝۳۶

(احزاب)

''جب خدا اور اس کا پیغمبرؐ کسی چیز کے بارے میں حکم اور فیصلہ کر دیں تو اہل ایمان کو (اس کی مخالفت نہیں کرنا چاہیے) کیونکہ اس بارے میں ان کا اپنا کوئی اختیار نہیں رہتا اور جو شخص خدا اور اس کے پیغمبرؐ کی مخالفت کرے گا، تو وہ واضح طور پر گمراہ ہو گیا ہے۔''

یہ آیت جو خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے، ہرگز اس مقام اور منصب کے بارے میں نہیں ہے کہ جس مقام و منصب پر پیغمبر اکرمؐ پیغام رساں کی حیثیت سے گفتگو کرتے ہیں کیونکہ اس صورت میں مخالفت صرف خدا کی مخالفت اور اس کی نافرمانی ہوگی، اس میں پیغمبر اکرمؐ کی مخالفت یا ان کی نافرمانی نہیں ہوگی۔

پیغمبر اکرمؐ کی مخالفت تو اسی صورت میں ہوگی، جب پیغمبر اکرم ایک فرمانروا کی حیثیت میں سامنے آئیں اور حکم صادر فرمائیں نہ کہ وہ تبلیغ اور پیغام رسانی کی منزل میں ہوں۔

اولی الامر

صاحبان حکم و فرمان۔ دوسرا گروہ جن کے متعلق خدا حکم دیتا ہے کہ ہم ان کی اطاعت کریں، وہ، وہ افراد ہیں جنہیں قرآن ''اولی الامر'' سے تعبیر کرتا ہے اور نتیجہ کے طور پر وہ لوگ جو اسلامی معاشرے میں ''اولوالامر'' کے مقام و منصب پر فائز ہوں ہمیں چاہیے کہ ہم ان کی فرمانبرداری کریں، جیسا کہ فرماتا ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (نساء ۵۹)

''خدا اور رسولؐ اور اپنے میں سے صاحبان امر کی اطاعت کرو۔''

صاحبان امر و فرمان (اولی الامر) کی اطاعت کے لازم و واجب ہونے کی علت اور سبب، محتاج بیان نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص حق کے ساتھ اس قسم کے منصب کا حامل ہے، یعنی وہ صاحب امر و نہی ہے تو پھر یقیناً اس کی اطاعت کرنا چاہیے کیونکہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ خدا کسی کا ''اولی الامر'' ہونے کے ساتھ تعارف کرائے اور دوسری طرف سے یہ کہے کہ اس کی اطاعت لازم و واجب نہیں ہے۔

ایک اور آیت میں مسلمانوں کو حکم دے رہا ہے کہ ''اولی الامر'' کے مقام و مرتبہ اور منصب کی حفاظت کے لیے فتح یا شکست کے بارے میں ہر قسم کی خبر جو بھی تم سنو اس کو شائع اور عام کرنے سے اجتناب کرو تا کہ ''اولی الامر'' حقیقت کو لوگوں کے لیے تشریح کریں، کیونکہ اکثر

ایسی خبریں بھی سنی جاتی ہیں جن کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہوتی اور وہ ہمیں دھوکہ دینے کے لیے گھڑی جاتی ہیں یا ان کی کوئی اساس و بنیاد تو ہو مگر ان کی نشر واشاعت میں مصلحت نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کے مسائل جو سیاسی پہلو رکھتے ہیں، انہیں مشورے اور ان کا نکتہ نظر معلوم ہونے کے بعد ہی نشر ہونا چاہیے جیسا کہ فرماتا ہے:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ط وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ط (نساء ۸۳)

''جب کوئی فتح یا شکست کی خبر ملتی ہے تو وہ اسے فوراً ہی شائع کر دیتے ہیں، اگر وہ اسے پیغمبر اکرمؐ اور صاحبان امر کی طرف لوٹا دیتے، تو ان میں سے اصل حقیقت کے متلاشی اسے معلوم کر لیتے۔''

جو بات ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ ہم جانیں کہ ان دو آیات میں خصوصاً پہلی آیت میں صاحبان امر سے کون مراد ہیں؟ کیونکہ ان کو پہچانے بغیر ان کے حکم کی اطاعت ممکن نہیں ہے، لیکن چونکہ ہماری بحث کا موضوع توحید و شرک سے مربوط مسائل ہیں اس لیے ''اولی الامر'' کے مصادیق کی پہچان ہمارے موضوع کلام سے خارج ہے اور ہم نے اپنی بعض تحریروں میں اس سلسلہ میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

ماں اور باپ

ماں باپ وہ تیسرا گروہ ہے کہ قرآن ان سے نیکی کرنے کو واجب جانتا ہے اور ان کی مخالفت کو جو لوگوں کی نظر میں ''عقوق'' شمار ہوتے ہیں، حرام سمجھتا ہے۔ جہاں ''اُف'' کہنا جو ان کے لیے تکلیف کا باعث ہو حرام ہو، تو یقیناً علی الاعلان ان کی مخالفت کرنا بدرجہ اولی حرام ہوگا لیکن اس بات پر توجہ رکھنا چاہیے کہ ماں باپ کی اطاعت قرآن میں محدود شکل میں وارد ہوئی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے ہم ان کی اس حد تک اطاعت کریں کہ جب تک وہ ہمیں شرک، دوگانہ پرستی اور خدا کی نافرمانی کی دعوت نہ دیں۔

قرآن نے تفصیلی بیانات کے ساتھ انسان کو والدین کا احترام کرنے اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کی دعوت دی ہے لیکن اس کے باوجود ایک جالب توجہ نکتہ بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اولاد کی مہر و محبت، اندھادھند اور بے حساب نہیں ہونی چاہیے جو عدالت کی سرحد سے پاؤں باہر رکھنے کا سبب بن جائے، اگر انہیں ظالم و ستمگر سمجھو تو پھر حق کی شہادت دینے سے گریز نہ کرو جیسا کہ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ج (نساء ۱۵۳)

''اے ایمان والو! عدالت کو قائم کرو، اللہ کے لیے گواہی دو، اگرچہ وہ خود تمہارے یا تمہارے ماں باپ یا اقرباء کے برخلاف ہی کیوں نہ ہو۔''

اگر انسان کے ماں باپ اسے شرک، بت پرستی اور جادۂ حق سے انحراف کی دعوت دیں تو ان کے مقابلے کے لیے ڈٹ جانا چاہیے اور عواطف پدری و پسری اسے حقیقت کے برخلاف نہ کھینچ لے جائیں، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا (لقمان ۱۵)

''اگر وہ اس بات کی کوشش کریں کہ تو اس کو میرا شریک قرار دے دے جس کے بارے میں تجھے کوئی علم ہی نہیں ہے تو توان کی اطاعت نہ کر۔''[۱]

امیر المومنین ایک مختصر سے جملہ میں، والدین کی محدود اطاعت کے حق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فحق الوالد علی الولد ان یطیعه فی کل شیء الا فی معصیة الله" [۲]

''ماں باپ کا بیٹے پر حق یہ ہے کہ باپ کے ہر حکم کی اطاعت کرے سوائے ان موارد کے جو گناہ شمار ہوتے ہیں۔''

والدین کے احترام کا تربیتی اثر

ایک عیسائی نوجوان مسلمان ہو گیا اور مراسم حج کے بعد امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے گھر کے اندرونی حالات بتلائے تو معلوم ہوا کہ اس کی ایک نابینا ماں ہے، امام نے فرمایا: اپنی ماں کی خدمت کرو اور اس کے ساتھ نیکی اور احسان کرو اور جب وہ مر جائے تو سوائے تیرے اور کوئی بھی اس کے دفن اور تجہیز کا اہتمام کرنے والا نہ ہو، تو خود اس کے مراسم دفن کو انجام دینا، مجھ سے اپنی ملاقات کو کسی سے بیان نہ کرنا جب تک میں تجھ سے منیٰ میں ملاقات کروں............

تازہ مسلمان کہتا ہے، میں منیٰ میں آیا تو دیکھا کہ لوگ آپ کے گرد وپیش جمع ہیں اور مختلف سوالات آپ سے کر رہے ہیں اور آپ انتہائی ہمدردی کے ساتھ سب کو جواب دے رہے ہیں، گویا بچوں کو درس دے رہے ہیں............ میں کوفہ کی طرف لوٹا تو اپنی ماں کی زیادہ خدمت اور اس کے ساتھ زیادہ مہربانی کرنے لگا، میں اسے خود کھانا کھلاتا اور اس کے سر اور لباس کا خیال رکھتا، میری ماں نے کہا بیٹا! تو تو بالکل ہی بدل گیا ہے پہلے جب تو ہمارے دین میں تھا تو اس قسم کا سلوک نہیں کرتا تھا جس دن سے تو نے ہجرت کی ہے اور دین حنیف (اسلام) میں داخل ہوا ہے یہ سب خوش رفتاری کر رہا ہے تجھ میں یہ تبدیلی کیسی ہے؟ میں نے کہا مجھے پیغمبر اکرمؐ کی اولاد میں سے ایک شخص نے اسی طرح حکم دیا ہے اس نے کہا کیا وہ پیغمبر ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں بلکہ پیغمبرؐ کا فرزند ہے۔ اس نے کہا وہ پیغمبر ہے، اس قسم کے احکام تو پیغمبروں کی طرف سے ہی

---

[۱] اس آیت کا مضمون سورۂ عنکبوت آیت ۸ میں بھی ذکر ہوا ہے۔

[۲] نہج البلاغہ کلمات قصار شمارہ ۳۹۹

ہوتے ہیں۔ میں نے کہا ماں ہمارے پیغمبرؐ کے بعد کوئی اور پیغمبر نہیں آئے گا، وہ پیغمبر گا فرزند ہے تو اس نے کہا بیٹا تمہارا دین بہترین دین ہے، مجھے بھی اس کی تعلیم دے، میں نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا تو وہ مسلمان ہوگئی۔ میں نے اسے اسلام کے احکام سکھائے اس نے ظہر وعصر اور مغرب وعشا کی نماز پڑھی، اس رات اسے ایک حالت عارض ہوئی، اس نے مجھ سے کہا کہ میرے عزیز! جو کچھ تو نے مجھے سکھایا ہے اسے دوبارہ دہرا دے، میں نے اسے دہرایا اور وہ خوشی خوشی دنیا سے رخصت ہوگئی۔ صبح ہوئی تو مسلمان جمع ہوئے اور اسے غسل دیا اور میں نے بھی اس کے جنازے پر نماز پڑھی اور اسے سپرد خاک کر دیا۔[1]

---

[1] کافی ج ۲ ص ۱۶۱

گیارہواں حصہ

توحید در تقنین و تشریع

قانون بنانا خدا کا مخصوص حق ہے

اس حصہ میں

۱۔ انسان کی اجتماعی زندگی ایک سلسلہ قوانین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۲۔ قانون بنانے والے کو کامل طور سے انسان شناس اور جامعہ شناس ہونا چاہیے۔

۳۔ قانون بنانے میں کسی بھی قسم کا نفع لینے سے پاک ومنزہ ہو اور ایسی ذاتِ خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

۴۔ وآیات جو قانون سازی کو خدا کے ساتھ مختص سمجھتی ہیں وہ چھ قسم کی ہیں۔

۵۔ تشریع خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے علاوہ کوئی شخص قانون بنانے کا حق نہیں رکھتا۔

۶۔ حکم خداوندی کے ہوتے ہوئے اس کے غیر کی پیروی جائز نہیں ہے۔

۷۔ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک مکمل پروگرام لے کر مبعوث ہوئے ہیں۔

۸۔ طاغوتی حکام سے اختلافات کا حل کرانا حرام ہے۔

۹۔ اہل کتاب نے چونکہ تشریع کی باگ ڈور احبار اور رہبانوں کو سپرد کر دی تھی اس لیے وہ شرک سے دوچار ہوئے تھے۔

۱۰۔ ایمان کا واضح اثر تشریع خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

۱۱۔ چند سوالات کا جواب۔

۱۲۔ پیغمبر اکرمؐ نے چند ایک مواقع پر احکام کی بنیاد کس طرح رکھی ہے؟

توحید در تقنین وتشریع

روئے زمین میں انسانی زندگی کا پھیلاؤ اور جنگلوں اور بیابانوں میں انسانوں کی انفرادی زندگی کا خاتمہ اس بات کی ترجمانی کرتا ہے کہ انسان فطری طور پر اجتماعی زندگی کا خواہاں ہے تا کہ ایک دوسرے کے تعاون اور ہمکاری سے دشواریوں پر قابو پالے۔

دوسری طرف سے انسان ایک ''خودخواہ'' ہے اور ''حب ذات'' اس کے لیے ایک فطری امر ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ہر چیز کو اپنے اندر منحصر کرلے اور اگر وہ کسی وقت سخت معاشرتی قوانین کے قبول کرنے پر آمادہ بھی ہوتا ہے تو وہ ضرورت اور ناچاری کی وجہ سے ہوتا ہے اور اگر یہ ضرورت نہ ہوتی تو عام طور پر انحصار طلبی سے دستبردار نہ ہوتا۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ جس وقت بھی اس کو موقع ملتا ہے وہ دوسروں کے حقوق ضائع کرنے سے باز نہیں آتا۔

اسی بنا پر تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ ایک صحیح انسانی معاشرے کے لیے، ایک قانون کی بنیاد رکھنا ضروری ہے، تا کہ اسکے زیر سایہ، اجتماعی زندگی میں افراد کے حقوق اور انسانوں کی ذمہ داریاں واضح ہو جائیں، یہ بنیاد وہی اجتماعی قوانین ہیں جو ایک انسانی معاشرے کی بنیاد ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عالی قانون کی بنیاد کس کے ذریعہ ڈالی جانی چاہیے۔

اجمالی طور پر کہنا چاہیے: قانون گزار یہ چاہتا ہے کہ انسانی معاشرے کو اپنے انفرادی اور اجتماعی پروگراموں کی تنظیم کے ساتھ کمال کی طرف رہبری کرے اور افراد کے وظائف اور ذمہ داریوں کی تعیین اور ان کے حقوق کی تامین کے سائے میں ان کی جسمانی اور روحانی سعادت کو فراہم کرے۔

اس صورت میں قانون گزار کو ذیل میں بیان کردہ دوشرائط کا حامل ہونا چاہیے۔

ا۔ قانون گزار کو انسان شناس ہونا چاہیے

اگر قانون گزاری کا ہدف اور مقصد انسان کی جسمانی اور روحانی ضروریات اور حاجات کو پورا کرنا ہے تو اسے انسان کے تمام جسمانی و روحانی رموز واسرار سے دقیق طور پر آگاہ ہونا چاہیے۔ مثلاً ڈاکٹری کا نسخہ اسی صورت میں دقیق اور کامل ہوگا جب ڈاکٹر بیمار کے اوضاع وحالت سے پورے طور پر آگاہ ہو اور وہ نسخہ کو بیمار کے مزاج کی حالت اور اس کے روحانی شرائط کے مطابق تجویز کرے۔

دوسرے لفظوں میں: قانون گزار پورے طور پر انسان شناس اور جامعہ شناس ہونا چاہیے۔

انسان شناس ہوتا کہ انسانوں کے غرائز وعواطف سے آگاہ ہو، تا کہ اس کے احساسات اور غرائز کا پورے طور پر اندازہ لگائے اور رہبری وہدایت کرے۔

جامعہ شناس ہوتا کہ معاشرے میں افراد کے وظائف اور ذمہ داریوں اور انکے اعمال کے مصالح ومفاسد اور اجتماعی زندگی کے ردعمل

اور انسانوں کے روابط کے عکس العمل سے اچھی طرح سے باخبر اور مطلع ہو۔

۲۔ ہر قسم کی سود جوئی سے پاک اور منزہ ہے

انسانوں کے مصالح کی حفاظت اور واقع بینی کے لیے ضروری ہے کہ قانون بنانے والا قانون بنانے میں ہر قسم کی ''حب ذات''، سود جوئی اور نفع طلبی سے پاک ومنزہ ہو کیونکہ ''خودخواہی'' کا مزاج قانون بنانے والے کی نگاہوں کے سامنے ایک دبیز اور ضخیم پردہ ڈال دیتا ہے کیونکہ ایک انسان چاہے کتنا ہی عادل، واقع بین اور منصف کیوں نہ ہو، غیر شعوری طور پر ''سود جوئی''، ''نفع طلبی'' اور ''حب ذات'' کے احساس اور جذبہ کے زیر اثر ہوتا ہے۔

آیئے! اب دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں شرائط مکمل طور پر کہاں جمع ہیں۔

اس میں تو شک ہی نہیں ہے کہ اگر یہ بنا ہو کہ قانون گزار پورے طور پر انسان شناس ہو تو کوئی بھی خدا سے زیادہ کامل انسان شناس نہیں ہے اور کوئی بھی اپنے مصنوع کے بارے میں اس کے بنانے والے سے زیادہ آگاہ نہیں ہوتا۔ اتفاق سے خود قرآن بھی اسی موضوع پر تکیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَ ہُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۴﴾ (ملک)

''کیا وہ اپنی مخلوق کو اچھی طرح نہیں پہچانتا، حالانکہ وہ اس کی خلقت کے تمام رموز واسرار سے پورے طور پر آگاہ ہے۔''

وہ خدا جو موجود کے ذرات کا بنانے والا، بے شمار سلولوں کا پیدا کرنے والا اور انسان کے وجود کے مختلف حصوں کو ترکیب وترتیب دینے والا ہے، یقیناً وہ اپنے مصنوع کے نہاں وآشکار ضروریات اور مصالح ومفاسد سے دوسروں سے زیادہ آگاہ ہے۔

وہ اپنے وسیع علم کی وجہ سے افراد کے روابط اور ان تعلقات اور ذمہ داریوں کے ردعمل سے جو معاشرے کے نظم وضبط اور ہم آہنگی کا سبب ہیں اور ان حقوق سے جو ہر انسان کے مقام کے لائق ہیں، پوری آگاہی رکھتا ہے۔

دوسری شرط جو وضع قانون میں، ہر قسم کی سود جوئی ونفع طلبی سے پاک منزہ ہونا ہے، سوائے خدا کے کسی میں موجود نہیں ہے کیونکہ وہ صرف خدا ہی ہے جسے ہمارے معاشرے کا کوئی فائدہ اور نفع نہیں ہے اور ہر قسم کے غرائز خصوصاً خودخواہی کی جبلت اور غریزہ سے پاک ومنزہ ہے، جب کہ تمام افراد بشر میں کم وبیش خودخواہی کا احساس وجذبہ جو صحیح قانون گزاری کے لیے آفت ومصیبت ہے، پایا جاتا ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں کہ خود کو اس غریزہ اور فطرت سے بچائے رکھیں لیکن وہ پھر بھی اس میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

یہ قول ''ژان ژک روسو'' بہترین قوانین بنانے کے لیے جو تمام اقوام وملل کے کام آسکے ایک عقل کل کی ضرورت ہے جو تمام انسانی خواہشات کو تو دیکھے لیکن وہ خود کوئی احساس وجذبہ نہ رکھتا ہو اور طبیعت وجبلت وسرشت کے ساتھ اس کا کوئی ربط وتعلق نہ ہو، لیکن وہ اس کو کامل طور سے پہچانتا ہو اس کی سعادت نیک بختی اور بھلائی ہمارے ساتھ مربوط نہ ہو۔ لیکن وہ ہماری سعادت اور بھلائی کے لیے، مدد اور کمک کرنے پر

تیار ہو، خلاصہ یہ ہے کہ وہ صرف ایسے افتخارات اور اعزازت پر اکتفا کرے جو مرور زمانہ کے ساتھ ظاہر ہوں، یعنی ایک صدی میں خدمت کرے اور دوسری صدی میں نتیجہ حاصل کرے۔[1]

ان وجوہات کی رو سے قرآن کی نظر میں کوئی مقننہ، نہ انفرادی صورت میں اور نہ ہی اجتماعی صورت میں اور کوئی قانون گزار، سوائے خدا کے اور کوئی شارع، سوائے ''اللہ'' کے موجود نہیں ہے اور دوسرے افراد مثلاً فقہاء و مجتہدین سب کے سب قانون شناس ہیں جو منابع قوانین کی طرف رجوع کر کے خدائی احکام و قوانین کو بیان کرتے ہیں۔

آیات قرآنی کے مطالعہ سے وضاحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ تقنین و تشریع صرف خدا کے ساتھ مربوط ہے اور نظامِ توحیدی میں کسی بھی شخص کی رائے اور نظریہ کسی کے حق میں بھی حجت اور نافذ نہیں ہے اور کوئی بھی شخص اس بات کا حق نہیں رکھتا کہ وہ اپنی رائے اور نظر کو کسی فرد یا معاشرے پر لادے اور لوگوں کو اس کے اجراء پر زبردستی اور قہر و غلبہ کے ساتھ دعوت کرے۔

''نظام توحیدی'' میں جہاں تک نگاہ جاتی ہے، پیغمبر گرامیؐ کے ارشاد کے مطابق انسانی معاشرے کے افراد[2] کنگھی کے دندانوں کی طرح ہیں جن میں سے کوئی بھی دوسرے پر برتری نہیں رکھتا، اس بنا پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ کوئی فرد بشر یا کوئی مجلس شوریٰ کسی فرد کے فائدہ کے لیے یا کسی گروہ کے نفع میں یا کسی فرد یا گروہ کے ضرر میں کوئی حکم یا قانون بنائے اور لوگوں کو اس کی پیروی کی دعوت دے۔

نظام توحید میں حد نظر تک اعلیٰ ترین مساوات کی تجلی کا مظہر یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: الناس امام الحق سواء: ''تمام لوگ حق اور قانون کے مقابلہ میں مساوی اور برابر ہیں'' اور قانون تمام افراد کے بارے میں تمام امتیازات کو لغو قرار دیتے ہوئے جاری ہوتا ہے۔ اسلام نے ساسانی دور جیسی طبقہ بندی کے ساتھ، جس میں ایک گروہ نے خود کو قانون سے بالا اور مافوق سمجھ لیا تھا اور دوسرے گروہ پر قانون کو لاگو کیا جاتا تھا، بڑی سختی سے مبارزہ کیا ہے۔

نظام طاغوتی میں جو مذہبی ذمہ دار رہنماؤں اور رہبروں کی عالی ہمتی اور ہر طبقہ کے لوگوں کی ہمکاری و ہمستگی کے ذریعہ ختم ہو گیا ہے اور امید ہے کہ عنقریب نظام توحیدی و الٰہی اس کی جگہ لے لے گا، بادشاہ اور شاہزادے اور تمام درباری ہر قسم کی کسٹم ڈیوٹی سے مستثنیٰ تھے۔ گویا اربوں ڈالروں کے مالک ہونے کے باوجود مزید نرمی و رحم اور مہربانی کے مستحق تھے جب کہ ملک کے دوسرے افراد یہاں تک کہ فقراء اور تہی دست صارفین کو بھی انکے مالیات کا بارگراں اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑتا تھا اور دھاگہ اور سوئی تک کا کسٹم بھی جو برہنگی کا مقابلہ کرنے کے لیے باہر سے لاتے تھے، دونوں ہاتھوں سے ادا کرنا پڑتا تھا۔

---

[1] قرارداد اجتماعی ترجمہ زیرک ص ۸۱

[2] الناس کلسنان المشط سواسیة (من لا یحضرۃ الفقیہ ج ۴ ص ۲۷۲ ط نجف)

وہ آیات جو توحید در تقنین پر گواہی دیتی ہیں

وہ آیات جو تقنین (قانون سازی) کو خدا کے ساتھ مخصوص بتلاتی ہیں اور کسی کو بھی یہ اجازت نہیں دیتیں کہ وہ خدا کے ساتھ مخصوص حق کی قلمرو میں وارد ہو، چھ حصوں میں پیش ہوسکتی ہیں

پہلا حصہ

اس حصہ کی آیات اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ کوئی بھی شخص قانون بنانے اور حکم کرنے کا حق نہیں رکھتا کیونکہ صرف وہی ہستی خدا کے بندوں کی زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے، جس کا ان کے اوپر ایک قسم کا غلبہ اور تسلط ہو اور اس قسم کی ہستی خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہے اور وہ واضح ترین آیت جو اس مطلب پر گواہی دیتی ہے ذیل میں ذکر شدہ آیت ہے:

۱۔ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسۡمَآءً سَمَّيۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝۴۰ (یوسف)

''تم تو بے مسمیٰ الفاظ کی پرستش کرتے ہو، جنہیں تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے خدا کا نام دیدیا ہے۔ حالانکہ خدا نے ان کے بارے میں کوئی مضبوط دلیل نازل نہیں کی ہے، حکم دینا صرف خدا کے ساتھ مخصوص ہے، اس نے یہ حکم دیا ہے کہ ہم اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں، یہی مضبوط، محکم اور استوار دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

''ان الحکم الا للہ'' کا جملہ سورہ یوسف میں دو مقام پر وارد ہوا ہے، ایک تو یہی آیت ہے اور دوسری اسی سورہ کی آیہ ۶۷ ہے، جسے ہم ابھی پیش کرتے ہیں:

۲۔ وَقَالَ يٰبَنِىَّ لَا تَدۡخُلُوۡا مِنۡۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادۡخُلُوۡا مِنۡ اَبۡوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغۡنِىۡ عَنۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ ؕ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ ۚ وَعَلَيۡهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُتَوَكِّلُوۡنَ ۝۶۷ (یوسف)

''حضرت یعقوبؑ نے کہا، اے میرے بیٹو! تم ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔ خدا کے سامنے تمہارے لیے مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ فرمانروائی اس کے لیے مخصوص ہے، میں اسی پر توکل کرتا ہوں اور توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہیے۔''

''حکم''، عربی زبان میں فرمانروائی کے معنی میں ہے اور بعض اوقات اس سے تخلیقی اور تکوینی فرمارروائی مراد ہوتی ہے کہ سارا جہاں اسی کے قبضہ قدرت و تدبیر میں ہے (جس طرح سے ''توحید در تدبیر'' کے حصہ میں تفصیل کے ساتھ بحث ہوچکی ہے) دوسری آیت میں ''ان الحکم'' سے مراد یہی ہے اور آیت کے دوسرے جملے بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ کیونکہ اس حال میں کہ حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹوں کو حصول مقصد کے لیے رہنمائی کررہے ہیں اور مصر میں کامیابی کی راہ بتارہے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مختلف دروازوں سے وارد ہونا تو فوراً ہی کہتے ہیں تمہارے لیے مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا کیونکہ عالم ہستی کے امور خدا ہی کے ہاتھ میں ہیں، لہٰذا اسی پر توکل کرنا چاہیے۔

آیت کا لب ولہجہ یہ بتارہا ہے کہ آیت کا ہدف و مقصد خدا کی تکوینی حکومت و فرمانروائی کو بیان کرتا ہے، جس کی طرف دوسرے مقامات پر ''له ملك السماوات والارض'' (حدید ۲) کے جملہ کے ساتھ اشارہ ہوا ہے اور حضرت یعقوبؑ کا مقصد یہ ہے کہ عالم کے سارے کے سارے کام، شکستیں اور کامیابیاں، اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

جب کہ پہلی آیت میں اس سے مراد تشریعی فرمانروائی ہے، یعنی خدا ہی اس مقام و موقعیت وحیثیت کا مالک ہے کہ حق رکھتا ہے کہ امرو نہی کرے، جائز وحلال یا حرام قرار دے، اسی لیے بلا فاصلہ کہتا ہے: ''امر الا تعبدوا الا اياه'' اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔

گویا ''ان الحکم الا لله'' کا جملہ کہنے کے بعد کوئی شخص یہ سوال کرتا ہے کہ اب جب کہ مقام حکم وتشریع اللہ کے لیے مخصوص ہے تو پرستش وعبادت کے بارے میں خدا کا حکم کیا ہے؟ تو فوراً جواب دیتا ہے: ''امر الا تعبدوا الا اياه۔''

اس بنا پر (ان الحکم الا لله) کے جملہ سے مقصود وہ حکومت ہے جس کا نتیجہ تشریعی تسلط اور تقنینی قدرت ہے اور اس قسم کا سارے کا سارا دربست مقام خدا ہی کے اختیار میں ہے اور کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس مقام میں دخل دے اور تشریعی تسلط اور قانون گزاری خدا ہی کے ساتھ مربوط ہے اور کسی کے لیے بھی یہ جائز اور روا نہیں ہے کہ وہ اس مقام کی اجازت کے بغیر کوئی حکم دے اور کوئی ذمہ داری معین کرے۔

دوسرا حصہ

اس حصہ کی آیات اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ جس بارے میں حکم الٰہی موجود ہو، کسی کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ خدا کے حکم کے سوا کسی کی پیروی کرے اور اس حصہ کی آیات اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ ان صفحات میں بیان کی جاسکیں، ہم ان میں سے بعض کو اس بحث میں شامل کرتے ہیں۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ فَاِنْ جَاۗءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَـيْـــًٔا ۭ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ؀ (مائدہ)

''وہ تیری باتوں کو زیادہ تر اس لیے سنتے ہیں تا کہ ان کی تکذیب کریں۔ مال حرام زیادہ سے زیادہ کھاتے ہیں، اگر وہ تیرے پاس آئیں تو ان کے درمیان فیصلہ کریا (اگر مصلحت ہو تو) انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دے اور اگر تو ان سے صرف نظر کر لے تو وہ تجھے نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اگر تو ان کے درمیان فیصلہ کرے تو عدالت کے ساتھ فیصلہ کر دے، کیونکہ خدا عدل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ۝۴۳ (مائدہ)

''وہ تجھ سے فیصلہ کیسے طلب کرتے ہیں، حالانکہ تورات ان کے پاس ہے اور اس میں خدا کا حکم موجود ہے (اور پھر) تجھ سے فیصلہ چاہنے کے بعد تیرے حکم سے روگردانی کرتے ہیں اور وہ ایمان لانے والے ہی نہیں ہیں۔''

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝۴۴ (مائدہ)

''ہم نے تورات کو نازل کیا، جس میں ہدایت اور نور تھا اور وہ پیغمبر جو خدا کے حکم کے مطیع تھے وہ اس کے ذریعہ یہودیوں کے لیے حکم کرتے تھے اور اسی طرح سے علماء ربانی اور پیشوایان روحانی بھی، اس خدائی کتاب کے ساتھ جو ان کے سپرد کی گئی تھی اور وہ اس پر گواہ تھے، فیصلہ کیا کرتے تھے تو اس بنا پر آیات الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنے سے لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو اور میری آیات کو تھوڑی سی قیمت پر فروخت نہ کرو، اور وہ لوگ جو ان احکام کے مطابق جنہیں خدا نے نازل کیا ہے حکم اور فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔''

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝۴۵

(مائدہ)

''ہم نے ان (بنی اسرائیل) پر اس (تورات) میں یہ فرض کر دیا تھا کہ جان کا بدلہ جان، آنکھ کا بدلہ آنکھ، ناک کا بدلہ ناک، کان کا بدلہ کان اور دانت کا بدلہ دانت ہے۔ اور ہر زخم کا قصاص اور بدلہ ہے اور اگر کوئی اسے معاف کر دے (اور قصاص سے درگزر کرے) تو وہ (اس کے گناہوں کا) کفارہ ہو جائے گا اور جو شخص ان احکام کے مطابق جو خدا نے نازل کیے ہیں حکم نہ کرے وہ ظالم و ستمگر ہے۔''

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٦﴾ (مائدہ)

''اور ان (یعنی گذشتہ انبیاء کے) کے پیچھے ہم نے عیسیٰؑ بن مریمؑ کو بھیجا جو اس چیز کی جو اس سے پہلے بھیجی گئی تھی (تورات سے) تصدیق کرتا ہے اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت اور نور تھا، (اس کی آسمانی کتاب تھی) تورات کی، جو اس سے پہلے تھی، تصدیق کرتی تھی اور وہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور موعظہ تھی۔''

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٤٧﴾ (مائدہ)

''ہم نے اہل انجیل (پیروان مسیحؑ) سے کہا کہ خدا نے جو کچھ اس میں نازل کیا ہے وہ اس کے ساتھ حکم کریں اور جو لوگ اس کے مطابق خدا نے نازل کیا ہے حکم نہ کریں گے وہ فاسق ہیں۔''

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٤٨﴾ (مائدہ)

''اور ہم نے اس کتاب کو حق کے ساتھ تجھ پر نازل کیا ہے، یہ گذشتہ کتابوں کی تصدیق بھی کرتی ہے

اوران کی محافظ ونگہبان بھی ہے، اس بنا پر جو احکام خدا نے نازل کئے ہیں تم ان کے مطابق ہی ان کے درمیان حکم اور فیصلہ کرو اور ان کی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو اور احکام الٰہی سے روگردانی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک واضح آئین اور طریقہ مقرر کر دیا ہے اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت قرار دیدیتا، لیکن خدا چاہتا ہے کہ تمہیں اس چیز کے ساتھ جو اس نے تمہیں دی ہے آزمائے (اور تمہاری استعدادوں کی پرورش کرے) اس بنا پر تم کوشش کرو اور نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت کرو، تم سب کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے اور وہ اس چیز کے بارے میں جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے تمہیں خبر دے گا۔''

وَاَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ وَاحۡذَرۡهُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنُوۡكَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ‌ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّصِيۡبَهُمۡ بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِهِمۡ‌ؕ وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۹﴾ (مائدہ)

''اور تمہیں ان (اہل کتاب) کے درمیان، اس کے مطابق جو خدا نے نازل کیا ہے حکم کرنا چاہیے اور ان کی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو اور اس بات سے بچتے رہو کہ کہیں وہ تمہیں ان بعض احکام سے جو خدا نے تم پر نازل کئے ہیں منحرف نہ کریں اور اگر وہ (تیرے حکم اور فیصلہ سے) روگردانی کریں تو جان لو کہ خدا انکے بعض گناہوں کی وجہ سے ان کو سزا دینا چاہتا ہے اور لوگوں میں سے بہت سے فاسق ہیں۔''

اَفَحُكۡمَ الۡجَاهِلِيَّةِ يَبۡغُوۡنَ‌ؕ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكۡمًا لِّقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۵۰﴾

(مائدہ)

''کیا وہ (تجھ سے) جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں اور صاحبان ایمان ویقین کے لیے خدا سے بہتر حکم کرنے والا اور کون ہوسکتا؟''

اگر کوئی شخص (سورۂ مائدہ کی ۴۲ سے لے کر ۵۰ تک) ان آیات کے مضامین میں غور کرے تو اسے واضح طور پر معلوم ہوجائے گا کہ خدا نے پہلے ہی دن سے جب سے اس نے نوع بشر کے لیے رسول اور پیغمبر بھیجے ہیں، ہرگز یہ اجازت نہیں دی ہے کہ وہ خود سے اپنی زندگی کے لیے کوئی قانون بنالے، بلکہ اس نے ہی، بشر کی علم و دانش میں نارسائی اور غیر پختگی کی وجہ سے پروگرام منظم کئے ہیں اور ہر زمانہ میں، اس زمانہ کے مناسب اور مطابق بہترین اور کامل پروگرام بھیجا ہے۔

ان آیات میں زیر بحث مطلب پر تصریحات اور اشارات موجود ہیں، جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ اکالون للسحت، آیہ ۴۲: وہ خدا کی حلال وحرام کی سرحدوں کو توڑ رہے ہیں اور خدا کی محرمات کی پرواہ نہیں کرتے۔

۲۔ وعندھم التوراۃ فیھا حکم اللہ، آیہ ۴۳: تورات دن کے ان کے پاس ہے جس میں خدا کا حکم موجود ہے۔

۳۔ انا انزلنا التوراۃ فیھا ھدی و نور یحکم بھا النبیون، آیہ ۴۴: ہم نے تورات نازل کی جس میں رہنمائی اور نور ہے اور پیغمبر اس کے ساتھ حکم کرتے ہیں۔

۴۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون: آیہ ۴۴: جو شخص اس کے مطابق حکم نہ کرے جو خدا نے نازل کیا ہے وہ کافر ہے۔

۵۔ و کتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس، آیہ ۴۵: ہم نے تورات میں لکھ دیا ہے کہ انسان کو انسان کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔

۶۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظالمون، آیہ ۴۵: جو شخص اس کے مطابق حکم نہ کرے جو خدا نے بھیجا ہے، وہ ستمگروں میں سے ہے۔

۷۔ ولیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ، آیہ ۴۷: اہل انجیل اس کے مطابق جو خدا نے اس میں نازل کیا ہے فیصلہ کریں۔

۸۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون، آیہ ۴۷: جو شخص اس کے مطابق حکم نہ کرے جو خدا نے نازل کیا ہے وہ خدا کی اطاعت سے خارج ہو گیا ہے۔

ان مذکورہ امور میں غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ نہ صرف دین اسلامی میں بلکہ گذشتہ ادیان میں بھی خدا نے ہر قسم کی تقنین و تشریع کا دروازہ لوگوں پر بند کیا ہوا ہے۔

یہ دروازہ صرف خدا کے لیے کھلا ہوا ہے اور تشریع جو اس کا خاص فعل ہے کسی کو سپرد نہیں ہوا اور قرآن اس گروہ کو، جو کسی دوسرے نظام کو ''نظام توحیدی'' کا جانشین بنائیں، ان آیات میں کافر، ظالم اور فاسق کہتا ہے، وہ کافر ہیں اگر رد و انکار کے ساتھ ان کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو جائیں اور ظالم ہیں کیونکہ انہوں نے تقنین کو، جو خدا کا مسلمہ حق ہے، اس کے غیر کے سپرد کر دیا ہے اور فاسق ہیں کیونکہ وہ خدا کی اطاعت سے خارج ہو گئے ہیں۔

ان آیات میں جن کی نقل اور ترجمہ قارئین کرام کی نظر سے گزر چکا ہے، امت اسلامی میں توحید در تقنین پر واضح گواہ ہیں، لہٰذا ہمیں اس امت میں خدا کے سوا ہرگز کسی کو مقنن اور شارع نہیں سمجھنا چاہیے۔

ان شواہد میں سے کچھ یہ ہیں:

۹۔ فاحکم بینھم بما انزل اللہ، آیہ ۴۸: جو کچھ خدا نے نازل فرمایا ہے اس کے مطابق حکم کر۔

۱۰۔ لکل جعلنا منکم شرعۃ و منھاجا، آیہ ۴۸: امتوں میں سے ہر ایک کے لیے آئین اور ایک راستہ معین و مقرر کیا ہے۔

یہ منہاج وطریق وہی نظامنامہ زندگی ہے جو تمام امتوں کے لیے ان کی استعداد ولیاقت کو مدنظر رکھتے ہوئے نازل کیا گیا ہے اور یہ بات ہرگز بھی ممکن نہیں ہے کہ خدا کا نظامنامہ ناقص اور کمزور ہو کہ اس کی نظام بشری کے طریق سے تکمیل کی جائے۔ اس بنا پر نظام الٰہی کے ہوتے ہوئے نظام بشری کی ضرورت واحتیاج نہیں ہے۔

۱۱۔ دوبارہ پلٹ کر دوٹوک لب ولہجہ کے ساتھ غیر خدا کے احکام کی پیروی کو ہواوہوس کی پیروی قرار دیتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے: فاحکم بینھم بما انزل اللہ و لا تتبع اھوائھم عما جاءك من الحق، آیہ ۴۸ اس حکم کا تابع رہ جو خدا نے بھیجا ہے اور دوسروں کی ہواوہوس کی پیروی نہ کرو۔

۱۲۔ اور آخر میں، ہر حکم اور قانون کو جو منبع وحی کے علاوہ ہو، اسے زمانہ جاہلیت کا حکم کہا ہے اور پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے: افحکم الجاھلیة یبغون، آیہ ۵۰: کیا وہ جاہلانہ احکام وقوانین کی پیروی کرتے ہیں۔

ایک سوال

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ یہ آیات اس سے زیادہ نہیں بتاتیں کہ جن باتوں کے لیے خدا کا حکم موجود ہے ان میں خدا کے حکم کی پیروی کرنا چاہیے لیکن جن باتوں کے لیے اس قسم کا حکم موجود نہ ہو اس صورت میں کوئی فرد یا مجلس شوریٰ امت کے اہداف ومقاصد کی پیشرفت کے لیے کوئی قانون کیوں نہیں بنا سکتی۔

جواب

اس سوال کا جواب واضح ہے، جب خدا یہ فرماتا ہے: (لکل جعلنا منکم شرعة و منھاجاً) (ہم نے تمہارے لیے ایک راستہ اور طریقہ قرار دے دیا ہے) اس کا مفاد، اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ حکیم علی الاطلاق خدا کی جانب سے جو کچھ بھی بھیجا جائے گا وہ جامع اور کامل پروگرام ہوگا۔ یہ ہے کہ اب کسی دوسرے کے لیے امر تشریع میں مداخلت کا امکان باقی نہیں رہ جاتا۔

اصولی طور پر قرآن نوع بشر پر حاکم تمام احکام کی دو قسمیں قرار دیتا ہے، حکم الٰہی اور حکم جاہلی [1] اور وہ ہر حکم جو غیر ''ما انزل اللہ'' ہو وہ قہراً حکم جاہلی ہوگا۔

دوسرے لفظوں میں جب کوئی حکم انسان کے دماغ کی پیداوار ہو، تو چونکہ وہ ''ما انزل اللہ'' کا جز نہیں ہے تو یقیناً وہ احکام جاہلی میں سے ہوگا۔ [2]

---

[1] افحکم الجاھلیة یبغون

[2] امام باقر فرماتے ہیں: الحکم حکمان حکم اللہ و حکم اھل الجاھلیة فمن اخطاحکم بحکم اھل الجاھلیة، وسائل الشیعہ ج ۱۸ کتاب القصاص ۱۸: حکم الٰہی اور حکم جاہلیت، جو شخص حکم خدا سے تجاوز کرے گا، اس نے حکم جاہلیت کے ساتھ فیصلہ کیا ہے۔

دوسرا سوال

ان آیات سے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ احکام جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں اور اصطلاح کے مطابق وہ "ما انزل اللہ" کا جزء ہیں ان کی پیروی کرنا چاہیے لیکن وہ احکام جو پیغمبر اکرمؐ کی زبان یا دوسرے پیشواؤں سے لیے گئے ہیں۔ ہرگز یہ آیات اس قسم کے احکام کی پیروی کرنے کے لازم ہونے کی دلیل نہیں ہیں۔

جواب

قرآن خود کو ان تمام چیزوں کا جن کی نوع بشر کو اپنی زندگی کے منظم کرنے کے لیے ضرورت ہے، بیان کرنے والا معرفی کراتا ہے اور کہتا ہے: (نحل آیہ ۸۹) ''ہم نے قرآن کو تجھ پر نازل کیا ہے، جو ہر چیز کا بیان کرنے والا ہے۔''

دوسری آیت میں پیغمبر اکرمؐ کے بیانات کو جو نازل شدہ آیات کی تفسیر و توضیح کے بارے میں ہیں، حجیت بخشتے ہوئے کہتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے وظائف اور ذمہ داریوں میں سے ایک یہ ہے کہ نازل شدہ آیات کی امت کے لیے تشریح و توضیح کرے (نہ کہ صرف قراءت کرے اور انہیں پڑھ دے) جیسا کہ فرماتا ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ۝۴۴
(نحل)

''ہم نے تجھ پر قرآن نازل کیا تا کہ جو کچھ لوگوں کے لیے بھیجا گیا ہے تم اس کو بیان اور واضح کرو اور وہ خود بھی آیات کے مضامین میں غور وفکر کریں۔''

یہ آیت وضاحت کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کو ان آیات کا مبین اور توضیح دینے والا معرفی کراتی ہے، جو خدا نے نازل کی ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ کی قرآن کے بارے میں دو ذمہ داریاں ہیں جنہیں ایک دوسرے سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔

۱۔ قرآن کے اہداف و مضامین کا مبین اور واضح کرنے والا جیسا کہ لتبین للناس...... کے جملہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۲۔ ان کلمات و الفاظ وحی کو پڑھ کر سنانے والا ہے جنہیں وہ امین وحی سے سنتے ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

وَقُرۡاٰنًا فَرَقۡنٰهُ لِتَقۡرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكۡثٍ (اسراء ۱۰۶)

''ہم نے قرآن کو بتدریج نازل کیا ہے تا کہ تم اسے لوگوں کے لیے بہ تدریج اور آہستہ آہستہ پڑھو۔''

ہم جو یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ مبین قرآن ہے، اس سے مانع نہیں کہ بہت سی آیات قرآن بیان پیغمبرؐ سے قطع نظر عام لوگوں کے

لیے عربی زبان کو جاننے کے بعد واضح و آشکار اور قابل فہم ہیں، کیونکہ آیات قرآنی کے ایک حصہ کا قابل فہم ہونا یا معانی آیات کے ابعاد و جہات میں سے ایک بعد یا جہت کا قابل فہم ہونا اس سے مانع نہیں ہے کہ آیات کا ایک حصہ پیغمبرؐ کی تفسیر کا محتاج ہو اور اگر زیر بحث آیت پیغمبرؐ کو مبین قرآن بتاتی ہے تو اس سے مقصود مجمل آیات کا بیان کرنے والا یا آیات قرآن کے معانی کے دوسرے ابعاد و جہات کا بیان کرنے والا ہے۔

اس صورت میں شرائع اور احکام کے بارے میں پیغمبرؐ سے جو کچھ وارد ہوا ہے وہ اس آیت کے مطابق حجت ہے اور اس کی پیروی لازم و واجب ہے، کیونکہ تقریباً توضیح و تشریح سے ربوط ساری کی ساری آیات وہ ہیں، جن کے اصول و کلیات قرآن میں وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً ان آیات کے جو عبادات، معاملات اور سیاسیات سے مربوط ہیں۔

حدیث ''ثقلین''[۱] اور ''حدیث سفینہ نوح''[۲] کے مطابق شیعوں کے معصوم آئمہ کی گفتگو بھی پیغمبر گرامی سے ماخوذ ہے اور ان امور کی طرف توجہ کرتے ہوئے قرآن اور پیغمبرؐ اور ان کے حقیقی جانشینوں کی گفتگو کی حیثیت پورے طور پر واضح و روشن ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ پیغمبر اکرمؐ کی گفتگو کی حجیت اسی آیت میں منحصر نہیں ہے بلکہ دوسری آیات بھی ان کی گفتار و رفتار کی حجیت پر شہادت دیتی ہیں۔[۳]

تیسرا حصہ

اس حصہ کی آیات وضاحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام ایک مکمل پروگرام کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں، اس حصہ سے مربوط آیات یہ ہیں:

۱۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝۹ (اسراء)

''قرآن انسان کو راہ عدل و استوار کی ہدایت کرتا ہے اور ان مومنین کو جو نیک کام انجام دیتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

''التی ھی اقوم'' (استوار و محکم طریقہ) سے مراد وہی شریعت اسلام ہے، جو دوسری آیت میں ''شریعت'' کے لفظ کے ساتھ وارد ہوا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

---

[۱] انی تارك فیکم الثقلین کتاب الله و عترتی۔ یہ متواتر احادیث میں سے ہے۔

[۲] مثل اهل بیتی کسفینة نوح من رکبها نجی و من تخلف عنها عزق، متفق علیہ احادیث میں سے ہے۔

[۳] مثلاً وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴ (سورہ نجم) وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (سورہ حشر ۷) اور دوسری آیات جو پیغمبر اکرمؐ کے گناہ و خطا سے معصوم ہونے اور صیانت و حفاظت کے حصہ میں بیان ہوئی ہیں۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا (الجاثیہ ۱۸)

لفظ ''اقوم'' قیام کے مادہ سے ہے، جسے فارسی زبان میں ''ایستادہ'' (کھڑا ہوا) کہتے ہیں اور یہ تعبیر احکام قرآن کی درستی، استحکام اور استواری سے کنایہ ہے، اس طرح سے کہ اس کے تمام احکام آفرینش وخلقت کی ساختماں کے طرز کے موافق ہوتے ہیں، احکام اسلام ہمیشہ انسان کو سعادت اور زندگی بخشتے ہیں اور اسے کمال کی طرف چلا کر لے جاتے ہیں۔ جب کہ دوسرے قوانین بشری اگر ایک جہت سے لوگوں کی حالت کے لیے نافع اور سودمند ہوں تو دوسری جہات سے ان کی حالت اور زندگی کے لیے مضر اور نقصان دہ ہوتے ہیں۔

اب ''شریعت اقوم، اور محکم واستوار آئین بھیجنے کے بعد، جو استحکام اور استواری کی بنا پر انسان کی احتیاج کو ہر قسم کی قانون سازی سے بے نیاز کر دیتا ہے، کیا اس امر کی گنجائش ہے کہ انسان اس قسم کے دین وآئین کامل کے مقابلہ میں قانون سازی کرے۔

یہ حقیقت ایک دوسری آیت میں زیادہ واضح طور پر وارد ہوئی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

۲۔ قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ڬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ (انعام ۱۶۱)

''کہہ دے کہ میرے خدا نے مجھے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی ہے، استوار دین، خدا پرست ابراہیمؑ کا طریقہ۔''

اس آیت میں اسلام کے تمام اصول وفروع ذیل کے جملوں کے ساتھ توصیف ہوئے ہیں۔

الف) دینا قیما : استوار ومحکم دین

ب) ملۃ ابراھیم: ابراہیمؑ کا طریقہ

دوسری آیت میں احکام اسلام کو لفظ شریعت سے یاد کیا گیا ہے، جہاں فرماتا ہے:

۳۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ (جاثیہ ۱۸)

''ہم نے تجھے امر دین میں سے ایک طریقہ پر قرار دیا ہے، پس تو اس کی پیروی کر اور بے علم و نادان لوگوں کی ہوا وہوس اور خواہشات کی پیروی نہ کر۔''

کیا استوار آئین اور محکم شریعت کی موجودگی میں یہ بات مناسب ہے کہ انسان شریعت سازی کرے۔

اس آیت میں دو واضح نکتے نظر آتے ہیں:

۱۔ پیغمبر اسلامؐ ایک شریعت کے ساتھ لوگوں کو کمال تک پہنچانے کے لیے مبعوث کئے گئے ہیں اور شریعت، طریقہ اور راستہ کے معنی میں

ہے، فطری اور طبعی طور سے راستہ اپنے لیے ایک ایک مقصد اور مقصود چاہتا ہے اور وہ انسان کا کمال ہے۔

۲۔ وحی الٰہی کے احکام کے علاوہ کسی بھی حکم کی پیروی، خواہ وہ کسی بھی دماغ سے نکلے، (اھوا الذین لا یعلمون) ہوا و ہوس کی پیروی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

ذیل میں بیان کردہ آیت، اس حصہ کی آیات کے مضمون کی تائید کرتی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾ (حج)

''ہم نے ہر امت کے لیے (زندگی میں) ایک راستہ قرار دے دیا ہے کہ وہ اس راستہ کی پیروی کریں اور اس کام میں تجھ سے نزاع اور مجادلہ نہ کریں، اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیئے رکھ، تو سیدھی اور سچی ہدایت کا پیرو ہے۔''

وہ مناسک جنہیں یہ آیت بیان کر رہی ہے، وہی شرائع الٰہی ہیں، جو خدا نے ہر امت کی حالت کے مناسب نازل کئے ہیں اور مرور زمانہ اور امت کے تکامل سے ان میں تبدیلیاں کی ہیں اور انہیں مکمل کیا ہے۔

ان آیات کے مضامین کی طرف توجہ کرتے ہوئے موضوع ''توحید تقنینی'' وتشریعی اچھی طرح سے واضح وروشن ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسانی معاشرے سے ہر طرح سے اور ہر صورت میں قانون گزاری کا حق سلب ہے اور یہ حق سارا کا سارا صرف اور صرف خدا کے ساتھ مربوط ہے، اگر ہم فرد یا گروہ کو اس کام میں شریک کریں گے تو ہم عملی طور سے ایک قسم کے شرک کے مرتکب ہو گئے ہیں۔

دین، شریعت اور ملت کے کیا معانی ہیں؟

سورہ انعام کی آیہ ۱۶۱ میں لفظ دین اور ملت وارد ہوا ہے اور سورہ جاثیہ کی آیۃً ۱۸ میں لفظ شریعت وارد ہوا ہے اس بنا پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان تینوں الفاظ کے فرق کو واضح کریں۔ لیکن اس وجہ سے بحث کا سلسلہ بھی ٹوٹنے نہ پائے، اس کی وضاحت کو ہم اس حصہ کے آخر میں بیان کریں گے۔

چوتھا حصہ

اس حصہ کی آیات وضاحت کے ساتھ متنبہ کرتی ہیں کہ ہمیں اپنے نزاعات واختلافات کو طاغوتی حکومتوں کے پاس ہرگز نہیں لے جانا چاہیے اور حق کی پیروی سے باہر اور دستور وقانون خدا سے سرکشی کرنے والے جابر حکمرانوں کے نظام اور پروگراموں سے فیصلہ نہیں کرانا چاہیے، بلکہ ہمیں ہر قسم کا مقدمہ اور نزاع، فیصلہ کے لیے خدا اور اس کی رسولؐ کے پاس لے جانا چاہیے، اس حصہ کی آیات یہ ہیں جیسا کہ فرماتا ہے:

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَطِیعُوا اللّٰهَ وَأَطِیعُوا الرَّسُولَ وَأُولِی الْأَمْرِ مِنْکُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُولِ إِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِیلًا ﴿۵۹﴾ (نساء)

''اے ایمان والو! خدا رسولؐ اور اپنے میں سے صاحبان امر کی اطاعت کرو، اگر کسی چیز کے بارے میں تمہارے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف پلٹا دو۔ اگر تم خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، کیونکہ یہ کام (خدا پیغمبرؐ کی طرف رجوع کرنا) تمہارے لیے بہتر اور اچھا انجام رکھتا ہے۔''

اصولی طور پر آیات قرآن اسلامی معاشرے کو طاغوتی نظام کی طرف جو طغیان، ظلم وستم اور خدا کی بندگی کی راہ ورسم سے دوری کا مظہر ہے، ہر قسم کے جھکاؤ سے شدت کے ساتھ روکتی ہیں [1]۔ چہ جائیکہ ہم اپنی سرنوشت ہی طاغوتی گروہ کے ہاتھ میں دیدیں کہ جو چاہیں ہمارے ساتھ سلوک کریں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَی الَّذِینَ یَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَیْکَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیدُونَ أَنْ یَتَحَاکَمُوا إِلَی الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ یَکْفُرُوا بِهِ ۖ وَیُرِیدُ الشَّیْطَانُ أَنْ یُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِیدًا ﴿۶۰﴾ (نساء)

''وہ لوگ جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ تیری کتاب پر اور تجھ سے پہلے نازل شدہ کتاب پر ایمان لائے ہیں، کیا تو دیکھتا نہیں کہ وہ اپنے اختلافات حکام طاغوت کے پاس لے جاتے ہیں، حالانکہ انہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ حکام کے اس گروہ کے ساتھ کفر کریں (اور انہیں قانونی حیثیت نہ دیں) اور شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ انہیں ضلالت وگمراہی میں پھینک دے۔''

کیا اس صدی میں ہمارا اسلامی معاشرہ اس راستہ کے سوا کوئی اور راستہ طے کر رہا تھا، یہ طاغوتی حکام ہی تو تھے جو ضد بشر نظام کے ساتھ ہم پر حکومت کر رہے تھے اور ہر قسم کا مقدمہ اور اختلاف طاغوتی قوانین کے ذریعہ حل کرتے تھے۔

ایک اور سوال

خاتمیت سے مربوط تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ اسلام میں دو قسم کے قانون موجود ہیں۔

---

[1] سورہ بقرہ آیہ ۲۵۶۔۲۵۷، سورہ نساء آیہ ۵۱ وغیرہ کی طرف رجوع کریں۔

۱۔ ثابت اور اصطلاح کے مطابق ابدی قوانین جو مسلسل ہیں اور جن میں تبدیلی اور دگر گونی کی گنجائش نہیں ہے۔

۲۔ متغیر اور تبدیل ہونے والے اصول و مقررات جو حالات اور تقاضوں کے بدلنے سے بدل جاتے ہیں۔

اب جب کہ آیات قرآنی وضاحت کے ساتھ توحید تشریعی کو ثابت کرتی ہیں تو اس قسم کے مقررات کے بارے میں شرعی حکومت کی ذمہ داری کیا ہے؟

جواب

اس حصہ میں ان مقررات کے لیے جن کا مرور زمانہ اور حالات کی دگر گونی سے شکل ولباس بدل جاتا ہے، ثابت اصول کا ایک سلسلہ موجود ہے جن سے کبھی بھی تخلف نہیں ہوسکتا اور تغیر وتبدل ہمیشہ قانون کی شکل اور لباس میں ہوتا ہے نہ کہ خود قانون میں۔

مثلاً حکومت اسلامی کے اجانب سے تعلقات کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، بعض اوقات حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ حکومت وقت دوستی کی راہ سے وارد ہو اور دوستانہ تعلقات استوار کرے اور اپنے سیاسی، فرہنگی اور تجارتی روابط کو وسعت دے اور کبھی حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اپنے روابط منقطع کرلے، یا کم از کم ایک مدت کے لیے تجارتی وفرہنگی اور تمدنی روابط کو محدود کردے لیکن یہ شدت قانون کی شکل ولباس اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے طرز میں ہے، نہ کہ اصل قانون میں، ورنہ اصل قانون کبھی بھی تبدیل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسلامی حاکم پر لازم ہے کہ اسلامی مصالح اور مسلمانوں کی برتری کی حفاظت کرے اور اسلامی ملک کو کفار اور استعماریوں کے تسلط میں نہ جانے دے، یہ قانون وہی آیہ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ (نساء) ہے ''یعنی خدا کافروں کے لیے مسلمانوں پر ہرگز برتری نہیں دیتا۔''

اصل بات یہ ہے کہ اسلام کی عظمت ومرکزیت کی حفاظت کبھی تو قطع روابط میں ہوتی ہے اور کبھی روابط کو برقرار رکھنے میں۔

اسی طرح اسلام کی دفاعی بنیاد کی تقویت کے مسئلہ میں ہم ایک کلی اصل رکھتے ہیں، جسے قرآن نے بیان کیا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ (انفال ۶۰)

''اپنے دفاع کے لیے جہاں تک ہوسکے طاقت وقوت مہیا کرو۔''

یہ قانون جو لشکر اسلام کے ساری دنیا کے لشکروں پر برتری کے لازم ہونے کو بیان کرتا ہے، کبھی بھی تبدیل اور دگرگوں نہیں ہوتا، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ مختلف ادوار میں اس کی صورت اور اس کو عملی جامہ پہنانے کا طریقہ بدلتا رہتا ہے۔ گذشتہ زمانہ میں لشکر اسلام کی طاقت و قدرت تیر وکمان اور شمشیر وسنان کے حصول کے طریقہ سے تھی۔ اب اس قانون کو ایک دوسری صورت میں عملی جامہ پہنایا جاتا ہے، لہٰذا اب لشکر اسلام کو آخری ماڈرن ہتھیاروں کے لحاظ سے زمینی، فضائی اور بحری حصوں میں آمادہ وتیار رہنا چاہیے۔

اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ تشریع الٰہی کبھی بھی خدا کے بندوں کے ہاتھ میں نہیں ہے، یہاں تک کہ مقررات کے اس حصہ میں بھی، قانون کی اساس اور اس کی روح بیان کردی گئی ہے۔ البتہ اس کی شکل ولباس حاکم اسلامی کے اختیار میں ہے۔

ان دونوں موارد میں غور کرنے سے ان دوسرے موارد کا حکم بھی جو اسلام کے متغیر مقررات کی قسم سے ہیں، کامل طور سے واضح وروشن

ہو جاتا ہے۔

پانچواں حصہ

وہ آیات جو یہودیوں اور عیسائیوں کی مذمت کرتی ہیں کہ انہوں نے اپنے علماء راہبوں اور تارکین دنیا کو اپنا ''رب'' اور مختار قرار دے لیا تھا، مثلاً

۷۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ

(توبہ ۳۱)

''انہوں نے اپنے علماء اور رہبانوں اور مسیح کو ''رب'' مختار اور مدبر و مدبر قرار دے لیا تھا۔''

اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے علماء اور راہبوں کو خدا کیسے بنایا تھا، کیا وہ انہیں عالم آفرینش کا خالق سمجھتے تھے؟ مسلمہ طور سے ایسا نہیں ہے، بلکہ شئون الہٰی اور خدا کے کاموں میں سے ایک کام جو وہی قانون گزاری ہے، انکے سپرد کر دیا تھا اور اگر وہ کسی حرام کی حلال اور کسی حلال کو حرام کر دیتے تھے تو وہ اسے قبول کر لیتے تھے۔

مرحوم کلینی نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت صادق سے دو روایات نقل کی ہیں جن میں سے ہم ایک کے مضمون کو یہاں نقل کرتے ہیں: ''خدا کی قسم نہ تو وہ ان کے لیے روزہ رکھتے تھے اور نہ ہی نماز پڑھتے تھے، لیکن وہ ان کے لیے حرام کو حلال قرار دیتے تھے اور حلال کو حرام اور وہ بھی اسے بے چون و چرا قبول کر لیتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔[۱]

ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک دن عدی بن حاتم مسیحی تازہ مسلمان مسجد نبویؐ میں داخل ہوا تو پیغمبر اکرمؐ اسی آیت کو تلاوت فرما رہے تھے، عدی جو پہلے عیسائی تھا اور ابھی اسلام لایا تھا پیغمبر اکرمؐ سے کہنے لگا کہ ہم ان کی عبادت تو نہیں کیا کرتے تھے، فرمایا: کیا وہ حلال خدا کو حرام نہیں کر دیا کرتے تھے اور تم اسے حرام ہی شمار کرتے تھے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں! ایسا تو تھا، فرمایا یہی تو ان کی عبادت تھی۔''[۲]

ربیع کہتا ہے: میں نے ابوالعائیہ سے کہا، ان کی خدائی اور معبودیت کیا تھی؟ تو اس نے کہا، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ کسی مطلب کو کتاب خدا میں دیکھتے تھے، جو احبار و رہبانوں کے قول کے برخلاف ہوتا تھا، تو وہ ان کے قول کو قبول کر لیتے تھے اور جو کچھ کتاب خدا میں ہوتا تھا، وہ اسے قبول نہ کرتے تھے۔[۳]

---

[۱] کافی ج ۲ ص ۵۳

[۲] کافی ج ۲، ص ۵۳

[۳] تفسیر فخر رازی ج ۱۶ ص ۳۳

چھٹا حصہ

وہ آیات جو مسلمانوں کو پیغمبر اکرمؐ پر سبقت کرنے سے روکتی اور منع کرتی ہیں اور یہ حکم دیتی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ پر سبقت نہ کرو اور یہ توقع نہ رکھو کہ پیغمبر اکرمؐ وحی الٰہی کو ترک کر کے ان کی بات کی پیروی کرے گا، جیسا کہ فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ① (حجرات)

''اے ایمان والو! خدا اور اس کے پیغمبرؐ پر سبقت نہ کرو (مخالفت سے) پرہیز کرو، خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

موارد سبقت میں سے ایک یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا کہ افراد مسافر روزہ نہ رکھیں کیونکہ مسافر پر روزہ حرام ہے۔ ایک گروہ نے تقدس کی بنا پر حکم پیغمبرؐ کے اجرا سے روگردانی کی اور روزہ نہ توڑا تو پیغمبرؐ نے انہیں عاصی اور طغیانگر کہا[1]۔

اسی لیے قرآن اسی سورہ میں خطا کاروں کے افکار کی پیروی کرنے کے خیال کی سخت مذمت کرتا ہے اور فرماتا ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ (حجرات ۷)

''جان لو کہ پیغمبر اکرمؐ تمہارے درمیان ہیں، اگر وہ تمہارے نظریات کی پیروی کرنے لگیں تو تم زحمت میں پڑ جاؤ گے۔''

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان حقیقت اسلام کی تفسیر کے سلسلہ میں امیر المومنین کی گفتگو کی قدر و قیمت سے واقف ہوتا ہے، جہاں آپ فرماتے ہیں:

''الاسلام هو التسليم'' [2]

''حقیقت اسلام یہ ہے کہ انسان تشریع الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔''

---

[1] وسائل الشیعہ کتاب صوم ج ۴ باب الافطار فی المغرب ص ۱۲۵

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار شمارہ ۱۲۵

شرک در تشریع

اب جب کہ تشریع میں توحید کی حقیقت واضح ہوگئی تو اس سے شرک در تشریع کا معنی اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے۔ہم بارہویں حصہ میں یہ ثابت کریں گے کہ شرک کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص ذات کو متعدد سمجھے یا کسی مخلوق کو خدائی کاموں کا مبدأ سمجھے۔

شرک کی پہچان کے سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ ہم خدائی کاموں کو انسانی کاموں سے جدا کر کے اچھی طرح سے پہچانیں اور یہی نقطہ ایک عظیم لغزش کا مقام ہے،ان لوگوں کے لیے جو یہ چاہتے ہیں کہ وہ توحید کو شرک سے الگ کریں،خدائی کام یہ ہے کہ فاعل اپنے کام میں ہر لحاظ سے مستقل ہو اور کسی فرد اور مقام سے اس کی انجام دہی میں مدد نہ لے۔جیسا کہ خدا خلق و آفرینش،مارنے اور اگانے کے ہر کام کے انجام دینے میں اپنی ذات کے علاوہ کسی پر تکیہ نہیں کرتا اور اگر اس راستے میں کچھ اسباب کو ابھارتا ہے تو وہ سب کے سب اس کے ارادہ و مشیت اور حکم و فرمان سے مشغول کار ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کو انجام دیتے ہیں۔

تقنین و تشریع اللہ کے کاموں میں سے ایک کام ہے اور وہی مستقل طور پر تشریع کے کام کو انجام دیتا ہے اگر کوئی شخص کسی فرد یا مقام کو خدا کے سوا اس قسم کے کام کا مختار سمجھے اور یہ کہے کہ جر یہود یا راہب مسیحی اپنی طرف سے یہ حق رکھتے ہیں کہ لوگوں کے لیے ان کی ذمہ داریوں کا تعین کریں اور کچھ چیزوں کو حرام و حلال قرار دیں،تو اس صورت میں اس نے انہیں اپنا رب اور اختیاردار قرار دے لیا ہے اور خدا کے فعل کی،اس کے غیر کی طرف نسبت دی ہے اور توحید در فعل کی سرحد کو توڑ دیا ہے،لہٰذا اس نظر سے وہ مشرک ہے۔

اور اگر اس اعتقاد کے ساتھ اس کے سامنے خضوع کرے اور جھکے تو ان کے لیے یہ خضوع ان کی عبادت اور پرستش ہوگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھنا کہ کوئی فرد یا مقام بطور اصالت و استقلال حق تشریع و تقنین رکھتا ہے تو خود یہ اعتقاد شرک در فعل ہوگا، کیونکہ اس قسم کا فرد یا مقام اس اعتقاد کی وجہ سے ''رب'' اور اختیاردار سمجھا جائے گا۔

اور اگر کوئی شخص اس اعتقاد کے ساتھ اس کے سامنے خضوع کرے تو اس کا خضوع ''شرک در عبادت'' کا رنگ اختیار کر لے گا،اسی بنا پر قرآن کہتا ہے:

''یہود و نصاریٰ نے اپنے احبار اور راہبوں کو اپنے رب قرار دے لیا تھا''

اور اس موقع پر ''رب'' کے معنی وہی حلال و حرام قرار دینے کی اختیارداری ہے،جب کہ خدا نے اس قسم کا اختیار انہیں نہیں دیا ہے۔

ایک سوال

اگر خدا کے علاوہ اور کوئی حق تشریع نہیں رکھتا تو پھر روایات میں یہ کس طرح وارد ہوا ہے کہ:

۱۔ خدا نے یومیہ نمازوں کو دس رکعت،دو،دو رکعت کی صورت میں واجب کیا تھا۔پیغمبر اکرمؐ نے دو دو رکعت کا نماز ظہر و عصر اور عشاء میں اور ایک رکعت کا مغرب میں اضافہ کیا۔

۲۔ خدا نے ماہ رمضان کے روزے واجب کئے تھے، پیغمبر اکرمؐ نے شعبان کے روزوں اور ہر ماہ میں تین روزوں کا مستحب کے عنوان سے اضافہ فرمایا۔

۳۔ خدا نے شراب کو حرام کیا تھا اور پیغمبر اکرمؐ نے ہر مست کرنے والی چیز کو حرام کہا۔

۴ خدا نے میراث میں دادا کے لیے کوئی چیز معین نہیں کی تھی، لیکن پیغمبر اکرمؐ نے اس کے لیے چھٹا حصہ مقرر کر دیا۔[۱]

جواب

ان روایات میں غور کرنے سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا کام درخواست کرنے سے زیادہ نہیں تھا اور خدا نے پیغمبر اکرمؐ کی درخواست کو منظور کرتے ہوئے نافذ کر دیا، اس تشریع میں پیغمبر اکرمؐ کا بطور استقلال ہاتھ نہیں تھا، اسی بنا پر ان تمام موارد میں یہ جملہ نظر آتا ہے:

"فاجاز الله عزوجل له ذالك"

''پس خدا نے آپؐ کو اس کی اجازت دے دی۔''

اگر پیغمبر اکرمؐ کو تشریع کا اختیار اور قوۃ تقنین سپرد کر دی گئی ہوتی اور خدا یہ مقام انہیں تفویض کر کے خود ایک طرف ہو گیا ہوتا، تو پھر نئے سرے سے اجازت اور منظوری لینے کی ضرورت نہیں تھی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ ایسے لوگوں میں سے تھے جنہوں نے امام امیر المومنین کی تعبیر کے مطابق ''عقلوا الدین عقل وعاية و رعاية''[۲] دین کو وعایت اور دانائی کے ساتھ پہچانا تھا، لہٰذا وہ احکام کی بنیادوں سے بھی واقف تھے اور ان کے مصالح و مفاسد سے بھی آگاہ تھے اور اس قسم کی خطا ناپذیر آگاہی کے مطابق احکام صادر کرتے تھے جو حقیقت میں حکم ہوتا تھا۔

---

[۱] کافی ج ۱ ص ۲۹۷-۲۹۶

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۳۴، ط، عبدہ

دین ملت اور شریعت کے مفاہیم کی وضاحت

تیسرے حصہ کی آیات میں ہم نے بیان کیا تھا کہ سورہ انعام کی آیہ ۱۶۱ میں دین اور ملت کے الفاظ اور سورہ جاثیہ کی آیہ ۱۸ میں لفظ شریعت وارد ہوا ہے اور ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اس حصہ کے آخر میں ہم ان الفاظ کے معانی کی وضاحت کریں گے۔

اس حصہ کی وضاحت اس طرح ہے:

دین قرآن کی اصلاح میں وہ خدائی عمومی اور ہمگانی طریقہ ہے، جو تمام افراد کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے اور زمانہ کے بدلنے اور حالات کے تبدیل ہونے سے ہرگز دگرگوں اور تبدیل نہیں ہوتا اور تمام افراد بشر پر اس کی پیروی کرنا واجب ہے اور یہ تمام زمانوں اور ادوار میں ایک ہی طرز پر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اسی لیے قرآن نے کبھی بھی دین کا لفظ جمع کے طور پر استعمال نہیں کیا اور ہمیشہ لفظ دین کو مفرد کی صورت میں ہی استعمال کرتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

نَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ (آل عمران ۱۹)

''خدا کے نزدیک دین اسلام ہے۔''

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَفِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ (آل عمران ۸۵)

''جو شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی پیروی کرے گا تو وہ اس سے قبول نہیں ہوگا اور وہ آخرت میں زیانکاروں میں سے ہوگا۔''

جب کہ شریعت اخلاقی اور اجتماعی تعلیمات کا مجموعہ ہے جو ممکن ہے کہ مرور زمانہ اور معاشرے کے تکامل وارتقا سے دگرگونی اور تغیر کو قبول کرے، لہٰذا لفظ شرائع کو جمع کی صورت میں استعمال کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور قرآن نے شرائع کے تعدد کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے قرآن نے مذکورہ آیات میں تو دین کی وحدت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جب کہ ذیل میں بیان کردہ آیت میں شریعت کے تعدد کی تصریح کرتا ہے اور کہتا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ (مائدہ ۴۸)

''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور طریقہ قرار دے دیا ہے۔''

اسی بنا پر تمام افراد بشر کو ایک دین کی دعوت دی گئی ہے اور وہ دین اسلام ہے، جس کے اصول تمام ادوار میں ایک جیسے تھے، لیکن دین کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے طرق وشرائع ہیں، جو پیغمبروں کے ذریعہ امتوں اور ملتوں کے حالات کی مناسبت سے بیان ہوئے ہیں۔

ملت قرآن کی زبان میں وہی حیات بخش سنتیں ہیں، اس طور پر کہ اس کے مفہوم میں غیر سے اخذ ہونا پایا جاتا ہے، اسی لیے قرآن مجید میں ہمیشہ پیغمبروں اور اقوام کی طرف اس کی اضافت ہوئی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

مِلَّةَ اِبْرٰهِمَ حَنِيْفًا ط (بقرہ ۱۳۵)

''ابراہیمؑ کا سیدھا طریقہ''

اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (یوسف ۳۷)

''میں نے اس قوم کے راہ ورسم کو، جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے تھے، چھوڑ دیا ہے۔''

اسی بنا پر ملت وشریعت، معنی ومفاد کے لحاظ سے ایک ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ لفظ ملت کی اضافت غیر خدا کی طرف ہوتی ہے اور کہتے ہیں ملت ابراہیمؑ، ملت محمدؐ، لیکن ''ملۃ اللہ'' اللہ کی ملت کبھی نہیں کہتے۔

بارہواں حصہ

توحید در عبادت

اس حصہ میں ان اعمال اور دعاؤں کا ایک سلسلہ بیان ہوا ہے جنہیں وہابی حضرات اور عالم اسلام میں ان کے پیروکار شرک در عبادت خیال کرتے ہیں اور اس کے لیے قرآنی تجزیہ و تحلیل کے ساتھ بحث و تمحیص پیش کی گئی ہے اور اگر ایک انسان تعصب کی زنجیر سے چھٹکارا حاصل کرے تو قرآنی دلائل اسے خالص توحید کی طرف رہبری کر سکتی ہیں۔

اس حصہ میں

۱۔ یکتا پرستی اور خدا کے علاوہ ہر موجود کی پرستش سے پرہیز کرنا تمام آسمانی پیغمبروں کی دعوت کی بنیاد ہے۔

۲۔ ہمیں عبادت کے حقیقی معنی کو اس کے مجازی معنی سے تمیز دینا چاہیے۔

۳۔ عبادت اس ہستی کے لیے خضوع و خشوع کے معنی میں ہے جسے ہم خدا یا خدائی کاموں کا مبدء سمجھیں، دوسرے لفظوں میں ہم اس کو الوہیت و ربوبیت کے معتقد ہوں۔

۴۔ مولف المنار شیخ شلوتت اور ابن تیمیہ کے نزدیک عبادت کی تعریفیں۔

۵۔ کیا طبیعی اور غیر طبیعی اسباب سے متوسل ہونا شرک ہے؟

۶۔ کیا موت و حیات شرک و توحید کی سرحد ہے؟

۷۔ کیا اولیاء خدا کے میلاد و وفات منانا اور اسے اہمیت دینا توحید کے مخالف ہے؟

۸۔ اولیاء کے آثار سے تبرک حاصل کرنا کیسا ہے؟

۹۔ کیا عجز و قدرت توحید و شرک کی سرحد ہے؟

۱۰۔ کیا غیبی تسلط کا اعتقاد رکھنا موجب شرک ہے؟

۱۱۔ کیا خارق عادت اور معجزات کی درخواست کرنا موجب شرک ہے؟

۱۲۔ کیا خارق عادت امور کی درخواست کرنا غیر خدا سے کارخدائی کی درخواست کرنا ہے؟

۱۳۔ جہان آفرینش ایک منظم، مترتب، ساز مان یافتہ اور سسٹمیٹک ہے اور شرک اسی صورت میں ہوگا کہ جب ہم اسباب کے لیے استقلال کے قائل ہوں؟

۱۴۔ کیا شفاعت کی درخواست کرنا شرک ہے؟

۱۵۔ کیا غیر خدا سے مدد مانگنا اصول توحید کے خلاف ہے؟

۱۶۔ کیا نیک اور صالح لوگوں کو پکارنا اور ندا دینا ان کی پرستش ہے؟

۱۷۔ زمانہ جاہلیت کے عربوں کے اصنام واوثان (بتوں کے بارے میں عقائد وآراء کا بیان۔

۱۸۔ وہابی مولفین کے لیے یاد دہانی۔

توحید در عبادت و پرستش

ہر زمانہ میں آسمانی پیغمبروں کی دعوت کی اساس یکتا پرستی رہی ہے، یعنی تمام انسانوں کو چاہیے کہ وہ خدائے یگانہ کی پرستش کریں اور دوسرے موجودات کی پرستش سے پرہیز کریں۔

یکتا پرستی کی دعوت اور دوگانہ پرستی کی زنجیروں کو توڑنا، وہ اساسی ترین آسمانی قانون ہے جو خدائی پیغمبروں کے پروگراموں کا سرنامہ رہا ہے، گویا سارے کے سارے پیغمبر ایک ہی ہدف اور مقصد کے لیے مبعوث کیے گئے تھے اور وہ یکتا پرستی کا قیام اور شرک کے ساتھ مبارزہ ہے۔

قرآن مجید اس حقیقت کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

۱۔ وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ ۚ (نحل ۳۶)

''ہم نے ہر امت کے درمیان ایک نہ ایک پیغمبر کو (اس حکم کے ساتھ) مبعوث کیا ہے کہ وہ خدا کی پرستش کریں اور خدا کے علاوہ ہر معبود سے اجتناب کریں۔''

۲۔ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۲۵﴾ (انبیاء)

''تجھ سے پہلے ہم نے کوئی بھی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا، جس کی طرف ہم نے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور میری ہی پرستش کرو۔''

قرآن مجید یکتا پرستی کا تمام آسمانی شرائع کے درمیان ایک مشترک اصل کے طور پر تعارف کراتے ہوئے فرماتا ہے:

قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَكُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشۡرِكَ بِهٖ شَیۡـًٔا (آل عمران ۶۴)

''کہہ دے اے اہل کتاب آؤ ہم اس کلمہ کو جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے قبول کر لیں اور وہ یہ ہے کہ ہم خدا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور اس کا کسی کو شریک نہ بنائیں۔''

توحید در عبادت ایک مسلمہ اور محکم و استوار اصل ہے جس کی مسلمانوں میں سے کسی نے بھی مخالفت نہیں کی ہے اور تمام گروہ اور فرقے اس کے بارے میں ایک ہی نظریہ رکھتے ہیں اگرچہ معتزلہ توحید افعالی میں اختلاف نظر رکھتے ہیں اور وہ توحید صفات میں بھی اشاعرہ کے خلاف

ہیں، لیکن تمام اسلامی فرقے اس اصل کے بارے میں ایک ہی نظریہ رکھتے ہیں اور کوئی بھی مسلمان اس اصل کا منکر نہیں ہوسکتا اور اگر کچھ اختلاف اس بارے میں ہے بھی تو وہ مصادیق کے ساتھ مربوط ہے۔یعنی کچھ مسلمان بعض افعال کو عبادت سمجھتے ہیں، جب کہ دوسرے انہیں تعظیم وتکریم سمجھتے ہیں، یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں ''عبادت'' کے معنی کو لغت اور قرآن کی رو سے پورے طور پر واضح کرنا پڑے گا، اس کے بعد موارد و مصادیق کا معاملہ خود بخود واضح ہو جائے گا۔

ہم اس کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ توحید در عبادت کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جسے کوئی خاص گروہ اپنی طرف نسبت دے بلکہ تمام یکتا پرست، موحدین، خصوصاً تمام مسلمان اس بارے میں ایک ہی نظریہ رکھتے ہیں اگر کوئی بات ہے بھی تو وہ صرف اعمال کے ایک سلسلہ میں بحث وگفتگو ہے کہ ایک گروہ تو ان اعمال کو عبادت قرار دیتا ہے جب کہ دوسروں کے نزدیک ان کا عبادت کے ساتھ کوئی ربط اور تعلق نہیں ہے۔اس بنا پر ضروری ہے کہ ہم دو مطالب کے بارے میں بحث وگفتگو کریں۔

۱۔ عبادت کی حد بندی اور اس کی جامع وکامل تعریف۔

۲۔ ان باتوں کی تحقیق جنہیں وہابی حضرات شرک در عبادت سمجھتے ہیں۔

ہم یہ بات یاد دلائے دیتے ہیں کہ ہم نے موضوعی بحثوں کے اس سلسلہ کی جلد اول میں اگر چہ عبادت کے بارے میں تفصیلی طور پر بحث کی ہے اور اب اس بات کی ضرورت نہیں تھی کہ ہم دوبارہ اس کے بارے میں بحث وتحقیق کریں، لیکن چونکہ اس جلد میں ہم نے توحید کے تمام شئون اور شاخوں کے بارے میں مبسوط صورت میں بحث کی ہے، لہٰذا ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ تکمیل بحث کے لیے، پہلی جلد کے ص ۴۱۔۶۵ میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس میں سے کچھ یہاں بھی بیان کریں اور اس مطلب کے لیے دوسری جگہ کا حوالہ دینے سے پرہیز کریں، لیکن پہلے ہم یہ مقدمہ پیش کرتے ہیں۔

عبادت کے حقیقی معنی اور اس کے مجازی معنی میں فرق

اس میں شک نہیں ہے کہ لفظ عبادت قرآن، لغت اور عام لوگوں کی اصطلاح میں بعض اوقات ایسے موارد میں استعمال ہوتا ہے جو لفظ عبادت کا پرستش کے معنی میں حقیقی مصداق نہیں ہے اور اگر لفظ عبادت ایسے موقعوں پر پرستش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو وہ واقعی پرستش کے ساتھ استعمال کے موقع کی تشبیہ کے طور پر ہوتا ہے۔

اب ہم ان موارد کو بیان کرتے ہیں جہاں لفظ پرستش استعمال ہوتا ہے، لیکن وجدانی طور پر وہ عبادت کا مصداق اور فرد واقعی نہیں ہے۔اس طرح سے کہ ہم اس گروہ کو مشرکین میں سے قرار نہیں دے سکتے۔

۱۔ دلدادہ عشاق اپنے معشوق کے سامنے انتہائی خضوع کرتے ہیں اور ان کی خواہشات کے مقابلہ میں عنان صبر ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس قسم کے خضوع کا نام عبادت نہیں رکھا جا سکتا، اگر چہ کہتے یہی ہیں کہ فلاں آدمی زن پرست ہے۔

۲۔ وہ لوگ جو ہوا و ہوس کے اسیر ہیں اور اپنی خواہشات نفسانی کے مقابلہ میں بے اختیار ہو جاتے ہیں اور اپنی خواہشات نفسانی کے آگے

سر جھکا دیتے ہیں، وہ ہرگز واقعی پرستش کرنے والے نہیں ہیں اور انہیں مشرکین می اِشمار نہیں کیا جا سکتا۔ چاہے یہ کہتے رہیں کہ فلاں آدمی ہوا پرست ہے، لیکن یہ ایک قسم کی تشبیہہ اور مجاز ہوگا۔ قرآن ہوا و ہوس کا "الہ" کے ساتھ تعارف کراتا ہے، لہٰذا قہرا ہوا خواہی کا نام عبادت ہی رکھے گا، جیسا کہ فرماتا ہے:

اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَيۡهِ وَكِيۡلًا ۝۴۳ (فرقان)

"کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات نفسانی کو اپنا خدا بنا رکھا ہے؟

کیا تو اس کا ضامن ہے؟

جیسا کہ خواہشات نفسانی اور ہوا و ہوس کا "الہ" اور خدا ہونا بطور مجاز ہے، اسی طرح اس کی طرف انسان کے جھکاؤ کا عبادت ہونا بھی ایک قسم کا مجاز ہی ہے۔

۳۔ ایک گروہ اپنی ہر چیز کو مقام و منصب کے لیے قربان کر دیتا ہے تاکہ اپنے اقتدار اور مقام و منصب کو ہاتھ سے نہ دے بیٹھے، یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص مقام و منصب کا پرستار ہے لیکن اس کے باوجود ہم جانتے ہیں کہ وہ مشرک نہیں ہے اور وہ مقام و منصب کا حقیقی پرستش کرنے والا نہیں ہے۔

۴۔ نژاد و نسل پرست اسرائیل، خودخواہ اور نفس پرست افراد، وہ گروہ جو خدا کے احکام سے روگردانی کر کے شیطانی ترغیب اور دعوت کی پیروی کرتے ہیں، لوگوں کی اصلاح میں انہیں نژاد پرست، نفس پرست اور شیطان کا پجاری کہا جاتا ہے لیکن وجدانی طور پر ہم جانتے ہیں کہ ان کا یہ عمل عبادت نہیں ہے۔ شیطان کا مطیع ہونا اور بات ہے اور عبادت کرنا ایک دوسری بات ہے۔

اگر قرآن مجید نے شیطان کی پیروی اور اس کی اطاعت کو پرستش کا نام دیا ہے تو حقیقت میں عصیان کرنے والے گروہ کی بے چون و چرا اطاعت کو عبادت کے ساتھ تشبیہہ دی ہے اور اس کا ہدف و مقصد اس سے نفرت کو بیان کرنا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَيۡكُمۡ يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّيۡطٰنَ‌ۚ اِنَّهٗ لَـكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ۝۶۰ وَّاَنِ اعۡبُدُوۡنِىۡ‌ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ۝۶۱ (یس)

"اے اولاد آدم، کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا، کیونکہ وہ تمہارا واضح دشمن ہے اور میری ہی پرستش کرنا یہی صراط مستقیم ہے"

اور اسی کی مانند ذیل کی دو آیات ہیں:

يٰۤاَبَتِ لَا تَعۡبُدِ الشَّيۡطٰنَ‌ ؕ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ كَانَ لِلرَّحۡمٰنِ عَصِيًّا ۝۴۴ (مریم)

"بابا جان شیطان کی عبادت نہ کریں، کیونکہ شیطان خدائے رحمن کا عاصی اور نافرمان ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ آذر بت کی پرستش کرتا تھا نہ شیطان کی، لیکن چونکہ بت کی پرستش کا شیطان سے تعلق تھا اور وہ بے چون و چرا

شیطان کی باتوں پر کان دھرتو تھا لوگو یا وہ اس کی پوجا کرتا تھا۔

أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ (مومنون)

''ہم اپنے ہی جیسے دو انسانوں پر ایمان کس طرح سے لے آئیں حالانکہ ان کی قوم ہماری بندگی کرتی ہے۔''

اس میں بحث کی کوئی بات ہی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل فرعون کی پرستش نہیں کرتے تھے، لیکن چونکہ فرعون نے انہیں اپنے حکم و فرمان کا مقہور اور مسخر بنایا ہوا تھا تو گویا فرعون کی نظر میں بنی اسرائیل اس کی پرستش کرتے تھے۔

ان موارد کی طرف توجہ کرتے ہوئے (کہ قرآن کی اصطلاح میں اور لوگوں کی زبان میں تو لفظ عبادت و پرستش استعمال ہوا ہے، لیکن وجدانی طور پر انہیں واقعی و حقیقی پرستش کرنے والا اور مشرکین میں سے شمار نہیں کیا جا سکتا) تصدیق کی جا سکتی ہے کہ ہر قسم کا خضوع و اطاعت اور ہر قسم کا اکرام و احترام، عبادت و پرستش نہیں ہے اور اگر بعض اوقات کچھ اطاعتوں اور افراطی تعلقات کو ''عبادت'' کا نام دیا بھی جاتا ہے، تو وہ ایک قسم کی تشبیہ اور مجاز ہے اور انسان عمل سے ہرگز موحدین اور یکتا پرستوں کے زمرے سے خارج نہیں ہوتا، اگرچہ وہ ایک ناپسندیدہ اور قبیح فعل کا مرتکب ہوتا ہے لیکن کسی فعل کا قبیح ہونا الگ بات ہے اور موحدین کے زمرے سے خارج ہونا دوسرا مطلب ہے، عصیان و گناہ اور خواہشات نفسانی کو لبیک کہنا اور شیطانی افکار کے سامنے سر تسلیم خم کر لینا گناہ ہے لیکن انسان اس عمل کی وجہ سے ہرگز یکتا پرستوں کے فرقے سے خارج نہیں ہوتا اور مشرکین کے گروہ میں شمار نہیں ہوتا، البتہ کامل وہی شخص ہے جس کا عمل فرمان خدا کے ساتھ مطابق ہو، لیکن موضوع گفتگو موحد کامل نہیں ہے بلکہ موضوع بحث مشرک کے مقابلہ میں موحد ہے۔

دوسرے لفظوں میں، نسل پرست، نفس پرست اور مقام پرست وغیرہ افراد سب کے سب سرکش اور گنہگار ہیں اور وہ سخت ترین عذاب و سزا کے مستحق ہیں لیکن اس کے باوجود وہ عبادت میں شرک کرنے والوں کے زمرے میں نہیں آتے اور ان کی توحید عبادت پر کوئی چوٹ نہیں آئی ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے:

''من اصغی الی ناطق فقد عبدہ فان کان ینطق عن اللہ فقد عبد اللہ وان کان ینطق عن غیر اللہ فقد عبد غیر اللہ''

''جو شخص کسی بولنے والے کی طرف کان دھرے تو اس نے اس کی عبادت کی ہے، اگر وہ خدا کی طرف سے بات کرتا ہے تو اس نے خدا کی عبادت کی ہے اور اگر وہ اس کے غیر کی طرف سے بات کرتا ہے تو اس

نے غیر خدا کی عبادت کی ہے۔"[1]

دنیا کے لوگ مختلف گروہوں کے بات کرنے والوں کی باتوں پر کان دھرتے ہیں اور ان میں سے بہت سے غیر خدا کی بات کرتے ہیں تو کیا ہم خود کو اس بات کی اجازت دین گے کہ ہم روئے زمین کے ان سب لوگوں کو ایسی باتیں کرنے والوں کا عبادت گزار سمجھیں، جو معاشرے سے مربوط وسائل کی بات کرتے ہیں؟ یا یہ سمجھیں کہ ایسے مواقع پر عبادت کے لفظ کا استعمال ایک قسم کا مجاز اور تشبیہہ کی وجہ سے ہے جو معنی مجازی اور معنی حقیقی کے درمیان حکم فرما ہے۔

---

[1] سفینۃ البحار ج۲ مادہ "عبد"

پرستش اس ہستی کے سامنے خضوع ہے جسے ہم خدا یا خدائی کاموں کا مبداء سمجھیں

عبادت عربی زبان میں، فارسی زبان کے لفظ پرتش کے ہم پلہ ہے۔ جس طرح ہمارے نزدیک لفظ پرستش کا ایک واضح مفہوم ہے، اسی طرح لفظ ''عبادت'' کا بھی ایک مکمل واضح مفہوم ہے، چاہے ہم اس کی کسی جملہ کے ساتھ ایک منطقی تعریف کی صورت میں تعریف و تفسیر نہ کرسکیں۔

اس میں شک نہیں کہ زمین وآسمان کا ہمارے نزدیک ایک مکمل اور واضح وروشن مفہوم ہے۔ اگرچہ ہم میں سے بہت سے ان کی ایک مکمل تعریف نہیں کرسکتے یا اس کی وضاحت نہیں کرسکتے لیکن یہ چیز اس سے مانع نہیں ہے کہ ان دونوں الفاظ کے سننے سے ان کا معنی ہمارے ذہن میں مجسم ہوجاتا ہے۔

عبادت و پرستش بھی زمین وآسمان کے الفاظ کی طرح ہے، ہم سب ہی اس کے واقعی معنی سے واقف وآگاہ ہیں چاہے ہم اپنے ادراک کی کوئی منطقی تعریف نہ کرسکیں۔ اسی طرح سے عبادت، تعظیم، یا پرستش و بزرگداشت میں سے ہر ایک کے واقعی مصادیق ہمارے نزدیک واضح وروشن ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے مصداق کا دوسرے سے جدا کرنا بہت ہی آسان ہے۔

وہ دلدادہ عاشق جو اپنے معشوق کے در و دیوار چومتا پھرتا ہے یا اس کے لباس و پیراہن کو اپنے سینہ کے ساتھ لگاتا ہے یا اس کی موت کے بعد اس کی قبر اور تربت کے بوسے لیتا ہے، کسی بھی قوم وملت کے نزدیک اس کی عبادت کرنے والا نہیں کہا جاتا، ان لوگوں کا عمل اور کام جو عالمی بزرگ لیڈروں کے مومی مجسموں کی جو عوام میں سے کسی گروہ کے نزدیک مرجع عقیدت ہوتے ہیں، زیارت کو جاتے ہیں یا ان کے آثار، گھر اور مکان دیکھنے کے لیے جاتے ہیں اور ان کے احترام کے لیے چند سیکنڈ کے لیے سکوت اور خاموشی اختیار کرتے ہیں اور کچھ دوسرے مراسم ادا کرتے ہیں ہرگز عبادت اور پرستش شمار نہیں ہوتے، چاہے ان کا خضوع اور اظہار عقیدت، خدا کے سامنے خدا پرستوں کے خضوع کا ہم پلہ ہو۔

اس بحث میں صرف بیدار وجدان ہی قاضی اور فیصلہ کرنے والے ہوسکتا ہے تاکہ وہ احترام وتعظیم کو عبادت و پرستش سے الگ کرسکیں۔

اب اگر بنا یہ ہو کہ ہم لفظ عبادت کی منطقی تعریف کی صورت میں تحلیل وتجزیہ کریں تو ہم اس کی ذیل کی تین اقسام میں تعریف کرسکتے ہیں اور ان تینوں تعریفوں کا ہدف ومقصد ایک ہی ہوگا۔

عبادت کی پہلی تعریف [1]

عبادت اس عملی یا لفظی وزبانی خصوع کو کہتے ہیں جو اس کی اولوہیت کے اعتقاد سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے جس کے لیے خضوع کیا جا رہا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ الوہیت کیا ہے؟ اور بحث کا حساس نقطہ یہ ہے کہ ہم اولوہیت کے معنی کو باریک بینی کے ساتھ معلوم کریں، الوہیت خدائی کے اور الہ خدا کے معنی میں ہے اور اگر کبھی لفظ الہ کی معبود کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے تو لازمہ کی صورت میں تفسیر ہے، نہ کہ معبود الٰہ کا واقعی اور حقیقی معنی ہے بلکہ اس سبب سے کہ حقیقی الٰہ اور الٰہ ہائے خیالی، اقوام وملل جہان میں معبود اور مورد پرستش رہے ہیں لہٰذا یہ خیال کرلیا گیا کہ الٰہ معبود کے معنی میں ہے، ورنہ معبود ہونا الٰہ کے لوازم میں سے تو ہے، لیکن اس کا ابتدائی اور اصلی معنی نہیں ہے۔

اس چیز کا واضح گواہ کہ لفظ ''اللہ'' خدا کے معنی میں ہے نہ کہ معبود کے معنی میں وہی کلمہ اخلاص ہے، یعنی ''لا الہ الا اللہ'' ہے، اگر اس جملہ میں لفظ ''اللہ'' معبود کے معنی میں ہو تو یہ کلمہ ایک جھوٹ سے زیادہ نہیں ہوگا، کیونکہ یہ بات واضح اور بدیہی ہے کہ اللہ کے علاوہ ہزار ہا دوسرے موجودات ہیں جن کی عبادت کی جاتی ہے۔

وہ افراد جو لفظ ''الہ'' کو معبود کے معنی میں لیتے ہیں وہ جھوٹ کو رفع کرنے اور اس جملہ کی اصلاح کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں کہ لفظ ''بحق'' کو مقدر سمجھیں اور کہیں کہ ''لا الہ الا اللہ'' میں لفظ الہ کا معنی یہ ہے کہ معبود برحق اللہ کے علاوہ نہیں ہے اور یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ لفظ ''بحق کی تقدیر خلاف ظاہر ہے، اس بنا پر الہ، خدا کے معنی میں اور الوہیت خدائی کے معنی میں ہے اور ہر قسم کی تعظیم وتکریم کا سرچشمہ اگر مد مقابل کی الوہیت اور خدائی ہو تو اسی کو عبادت کہتے ہیں۔

اس تعریف کا واضح گواہ وہ آیات ہیں جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں، ان آیات کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ عبادت اس قسم کی گفتار ورفتار ہے جس کا سرچشمہ طرف مقابل کی الوہیت اور خدائی کا اعتقاد ہو [2] اور جب تک کسی موجود کے بارے میں اس قسم کے اعتقاد نہ ہو

---

[1] اس تعریف میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ہم الہ اور الوہیت کے حقیقی اور واقعی معنی سے آشنا ہوں، اور یہ جان لیں کہ الہ خدا کے معنی میں ہے (معبود کے معنی میں نہیں ہے) عام اس سے کہ بڑا خدا یہ یا چھوٹا۔ حقیقی خدا ہو یا خیالی اور ''لا الہ الا اللہ'' کے جملہ کا ہدف اور مقصد، ہر قسم کی الوہیت کی جو کسی بھی شکل وصورت میں ہو نفی کرنا ہے، چاہے وہ اسی صورت میں ہو کہ ہم کسی غیر خدا کو اگر چہ وہ مخلوق ہی ہو شفاعت ومغفرت کے مقام کا مالک خیال کریں اور ایک گروہ کی بڑی غلط فہمیوں میں سے ایک بات یہی ہے کہ انہوں نے یہ تصور کرلیا ہے کہ الہ کے معنی معبود کے ہیں۔

[2] بتوں کے خدا ہونے کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ حتمی طور پر خالق، پیدا کرنے والے اور جہان وانسان کے مدبر ومدیر ہوں، بلکہ خدا ہونا ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو واقعی اور حقیقی خداؤں کے ساتھ ساتھ نمائشی خداؤں کو بھی شامل ہے، جب ہم کسی موجود کو خدائی کاموں کا مبدء سمجھ لیں اور یہ خیال کرلیں کہ خدا کے کچھ کام مثلاً شفاعت ومغفرت ان کو سپرد ہوگئی ہے تو ہم نے اسے خدا سمجھ لیا ہے، البتہ وہ ایک چھوٹا خدا ہے، بڑے خدا کے مقابلہ میں۔

اس وقت تک اس کے لیے خضوع وخشوع یا تعظیم وتکریم عبادت و پرستش نہیں ہوگی، اس کا گواہ یہ ہے کہ قرآن جس وقت خدا کی عبادت کا حکم دیتا ہے تو فوراً اسے مدلل کرتا ہے کہ اس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔

جیسا کہ فرماتا ہے:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (اعراف ۵۹)

''اے میری قوم، خدا کی عبادت کرو کیونکہ اس کے علاوہ تمہارا اور خدا کوئی نہیں ہے۔''

اس آیت کا مضمون نو ''۹'' آیات میں یا اس سے بھی زیادہ میں وارد ہوا ہے اور قارئین کرام سورۂ اعراف کی آیہ ۶۵، ۷۳، ۸۵ اور سورۂ ہود کی آیہ ۵۰، ۶۱، ۸۴ اور سورۂ انبیاء کی آیہ ۲۵ اور سورۂ مومنون کی آیہ ۲۳، ۳۲ اور طٰہٰ کی آیہ ۱۴ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

یہ تعبیریں بتاتی ہیں کہ عبادت وہ خضوع وتذلل ہے جس کا سرچشمہ الوہیت کا اعتقاد ہو اور اگر اس قسم کا اعتقاد درمیان میں نہ ہو تو اس کو عبادت نہیں کہتے۔

نہ صرف یہ آیت اور اس کا مضمون ہی اس مطلب پر گواہ ہے بلکہ دوسری آیات بھی اس حقیقت پر گواہی دیتی ہیں، مثلاً:

اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۳۵﴾ (صافات)

''وہ ایسے لوگ ہیں کہ جس وقت انہیں یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کے علاوہ اور کوئی خدا نہیں ہے تو وہ تکبر کرتے ہیں، یعنی اس بات کی طرف اعتنا نہیں کرتے کیونکہ وہ دوسرے موجودات کی الوہیت کے معتقد تھے۔''

اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۳﴾ (طور)

''کیا ان کے لیے اللہ کے علاوہ کوئی اور خدا ہے۔ خدا اس سے پاک اور منزہ ہے جو اس کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔''[1]

اس آیت میں شرک کا سبب یہ بیان ہوا ہے کہ وہ غیر خدا کی الوہیت کے معتقد ہو جائیں۔

الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ (حجر)

''وہ لوگ جو خدا کے ساتھ دوسرا خدا قرار دیتے ہیں وہ عنقریب اپنے اعمال کے نتائج سے آگاہ ہو جائیں گے۔''

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (فرقان ۶۸)

اس بات کا گواہ کہ مشرکین کی دعوت اپنے بتوں کی الوہیت کے اعتقاد کے ساتھ تھی ذیل کی آیات ہیں:

---

[1] سورۂ توبہ کی آیہ ۳۱ اور نحل کی آیہ ۶۳ کی طرف بھی رجوع فرمائیں۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ (مریم)

''انہوں نے خدا کے علاوہ کچھ اور خدا بھی بنائے ہوئے ہیں تا کہ وہ ان کے لیے باعث عزت ہوں۔''

اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ۭ (انعام ۱۹)

''کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں۔''

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ (انعام ۷۴)

''جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ (چچا) سے کہا، کیا تو نے بتوں کو خدا بنالیا ہے۔''

ان آیات کی طرف رجوع کرنے سے جن میں بت پرستوں کے شرک کا مسئلہ وارد ہوا ہے، یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ بت پرستوں کا شرک اس بات کا معلول تھا کہ وہ اپنے معبودوں کی الوہیت کے معتقد تھے کہ خدائے بزرگ کے کچھ کام ان کے سپرد ہوئے ہیں اور اسی بنا پر ان کی پرستش کرنا چاہیے۔

اور یہ ان کی الوہیت اور خدائی کا اعتقاد ہی تو تھا کہ جس کی وجہ سے انہیں جس وقت خدائے یگانہ کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو وہ کفر کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جاتا تھا تو اس پر ایمان لے آتے تھے، چنانچہ یہی مضمون ذیل میں بیان کردہ آیت میں وارد ہوا ہے:

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۭ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴿١٢﴾ (مومن)

''یہ اس بنا پر ہے کہ جس وقت خدا کو اکیلا پکارا جاتا ہے تو تم اس سے کفر اختیار کرتے ہو اور اگر اسکے ساتھ شریک قرار دیا جائے تو ایمان لے آتے ہو اور حکومت تو اس بلند مرتبہ اور بزرگ خدا کے لیے ہی ہے۔''

مرحوم آیت اللہ شیخ محمد جواد بلاغی اپنی گراں قدر تفسیر ''آلاء الرحمن'' میں، جس کی افسوس ہے کہ دو جلدیں ہی لکھی گئی ہیں۔ جب وہ حقیقت عبادت کی تفسیر و تشریح پر پہنچے تو اس کی اس طرح سے تعریف کرتے ہیں:

"العبادة ما یزونه مستشعرا بالخضوع لمن یتخذه الخاضع الها لیوفیه بذالك ما یراه له من حق الامتیاز بالالیهیة" [1]

''عبادت وہی عمل ہے جو انسان کے کسی ایسے شخص کے سامنے خضوع کرنے کا ترجمان ہو جسے اس نے

[1] الاء الرحمن ص۵۷ طصیدا

اللہ بنالیا ہے، تاکہ اس کی برتری کے حق کو مقام ''الوہیت'' رکھنے کی بنا پر ادا کرے۔''

مرحوم بلاغی نے عبادت کے بارے میں اپنے وجدان کی دریافت و ادراک کو لفظ کے قالب میں ڈھال کر بیان کیا ہے اور ذکر شدہ آیات پورے طور پر اس تعریف کی صحت واستواری کی تائید اور وضاحت کر رہی ہیں۔

استاد بزرگوار حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خمینی نے اپنی گراں قدر کتاب میں اسی نظریہ کو اختیار کیا ہے، وہ فرماتے ہیں عبادت عربی زبان میں اور پرستش فارسی زبان میں ہے کہ کسی کی اس عنوان سے کہ وہ خدا ہے ستائش وتعریف کریں چاہے وہ بڑے خدا کے عنوان سے ہو یا چھوٹے خدا کے عنوان سے ہو۔[1]

اس نظریہ کا واضح ترین گواہ، ان آیات کا مجموعی طور پر ملاحظہ کرنا ہے جو شرک کے ساتھ مبارزہ کرتی ہیں، کیونکہ مشرکین کے تمام فرقے جن موجودات کے سامنے خضوع کرتے تھے اور ان کی ستائش وتعریف کرتے تھے وہ ان سب کو ''الہ'' خیال کرتے ہوئے اسی عنوان سے ان کے سامنے تذلل وخضوع کیا کرتے تھے۔

۲۔عبادت وہ خضوع ہے جو اس کے لیے ہو جسے ہم ''رب'' سمجھتے ہیں

ہم لفظ عبادت کے بارے میں اپنی دریافت اور ادراک کو ایک دوسرے قالب میں بھی ڈھال سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ عبادت وہ قولی یا عملی خضوع ہے جو طرف مقابل کی ربوبیت کے اعتقاد سے سرچشمہ حاصل کرتا ہے اور لفظ عبودیت ربوبیت کے مقابلہ میں ہے جب کوئی انسان اپنے آپ کو عبد اور غلام اور طرف مقابل کو اپنا تکوینی رب جان لے اور اس خیال کے ساتھ اس کے مقابلہ میں خضوع کرے تو اس قسم کے عمل کو عبادت کہتے ہیں۔

وہ آیات جنہیں ہم ابھی بیان کرتے ہیں ان سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ عبادت شئون ربوبیت میں سے ہے۔ اب ہم ان چند آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ (مائدہ ۷۲)

''اے بنی اسرائیل خدا کی عبادت کرو، چونکہ وہ میرا اور تمہارا رب ہے۔''

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ (انبیاء)

''یہ تمہاری امت ہے جو ایک ہی ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس میری عبادت کرو۔''

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾ (آل عمران)

''خدا ہی میرا اور تمہارا رب ہے، پس اسی کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔''

---

[1] کشف الاسرار ص ۲۹

یہی مضمون دوسری آیات میں بھی وارد ہوا ہے۔

کچھ آیات میں عبادت، خالقیت کے شئون میں سے شمار کی گئی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ (انعام ۱۰۲)

''یہی اللہ تمہارا رب اور مالک ہے، اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، وہی تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے، پس اسی کی عبادت کرو۔''

حضرت آیت اللہ خوئی اپنی تفسیر میں عبادت کی اس طرح سے تفسیر کرتے ہیں:

''العبادة انما یتحقق بالخضوع لشیء علی انه رب یعبد'' [۱]

''عبادت اس صورت میں متحقق ہوتی ہے جب کسی چیز کے مقابلہ میں اس عنوان سے کہ وہ رب ہے خضوع ہو۔''

اس تعریف کی واضح دلیل وہی آیات ہیں جو ہم نے بیان کی ہیں۔

لفظ رب سے کیا مراد ہے؟

عربی زبان میں ''رب'' ایسے شخص کو کہا جاتا ہے، جس کو کسی چیز کی مدیریت اور تدبیر سپرد کی گئی ہو اور اس کی سرنوشت اس کے اختیار میں ہو اور اگر عربی زبان میں گھر کے مالک بچے کی دایہ اور کھیت میں کھیتی باڑی کرنے والے کو ''رب'' کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اختیار اس کے سپرد کیا گیا ہے اور ان کی سرنوشت ان کے ہاتھ میں قرار پائی ہے، اگر ہم اپنے خدا کو ''رب'' سمجھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے تمام شئون کی سرنوشت، وجود و ہستی حیات و ممات، رزق و روزی تقنین و تشریح، مغفرت و آمرزش اس کے ہاتھ میں قرار پائی ہے، اب اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ ہماری سرنوشت سے مربوط شئون اور امور میں سے کوئی ایک کسی دوسرے کے ہاتھ میں قرار پائی ہے، مثلاً خدا نے حیات و ممات یا رزق و روزی یا تقنین و تشریع یا مغفرت و امرزش میں سے کوئی امر کسی دوسرے کے سپرد کر دیا ہے، اسطرح سے کہ وہ فرد مستقل طور پر ان سب کا، یا ان کاموں میں سے کسی ایک کا عہدہ دار ہے تو اس صورت میں ہم نے اسے اپنا ''رب'' خیال کر لیا ہے اور اگر ہم اس عقیدہ کے ساتھ اس کے سامنے خضوع کریں، تو ہم نے اس کی عبادت و پرستش کی ہے۔

دوسرے لفظوں میں عبادت و پرستش احساس بندگی سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے اور بندگی کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ انسان خود کو مملوک اور بالاتر مقام و شخصیت کو اپنے وجود و ہستی، موت و حیات، رزق و روزی یا کم از کم خصوصیت سے مغفرت [۲]

---

[۱] البیان ص ۵۰۲

[۲] وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران ۱۳۵)

شفاعت [1] اور وضع قوانین و وظائف [2] کا مالک اور اختیار دار سمجھے، تو اس صورت میں اس کو اپنا رب تصور کر لیا ہے اور جو شخص اس قسم کی مملوکیت کا احساس، زبان یا عمل کے ذریعہ خارج میں مجسم کرے یا اپنے احساس کو عمل یا الفاظ کے قالب میں ڈھالے، تو بلا شک وشبہ یہ اس کی عبادت اور پرستش کی ہے۔

۳۔عبادت کی تیسری تعریف

یہاں عبادت کی تیسری تعریف بھی بیان کی جاسکتی ہے اور اپنے وجدانی ادراک کو تیسری تعریف کے قالب میں ڈھالا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ عبادت خضوع وخشوع ہ اس کے سامنے جسے ہم خدا یا خدائی کاموں کا مبدء خیال کریں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ عالم خلقت وآفرینش سے مربوط کام مثلاً امور جہاں کی تدبیر، انسانوں کا احیاء اور زندہ کرنا افراد کی اماتت اور ان کو مارنا، جانداروں کو رزق دینا، بندوں کے گناہوں کی مغفرت اور انہیں بخشنا خدا کے ساتھ مخصوص ہے، اگر آپ تدبیر عالم، خلقت اشیاء سا فراد کی موت اور ان کو مارنا، انسانوں کی حیات اور ان کو زندہ کرنا وغیرہ سے مربوط آیات [3] کا مطالعہ کریں، تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے تاکیدی اصرار کے ساتھ اس قسم کے کاموں کو خدا کے ساتھ مخصوص سمجھا ہے اور ان کو اس کے علاوہ کسی اور سے منسوب کرنے کو شدت کے ساتھ روکا ہے، یہ ایک طرف ہے۔

دوسری طرف سے ہم جانتے ہیں کہ عالم آفرینش وخلقت ساز مان یافتہ، منظم ومترتب اور سسٹمٹک ہے اور اس جہاں میں جو کام بھی انجام پاتا ہے وہ فراواں اسباب کے بغیر جو سب کے سب خدا تک منتہی ہوتے ہیں، انجام پذیر نہیں ہوتا، خود قرآن کئی ایک موارد میں ان افعال کے علل واسباب کی طرف، جو خدا کے غیر ہیں لیکن اس کے حکم وفرمان سے کام کرتے ہیں، تصریح کرتا ہے۔

مثلاً قرآن خصوصی تاکید کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ محی وممیت خدا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ (مومنون ۸۰)

”وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بناتا ہے۔“

لیکن یہی قرآن دوسری آیات میں فرشتوں کو اماتت اور مارنے کا وسیلہ بتاتا ہے اور فرماتا ہے:

حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (انعام ۶۱)

”جب کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ان کی جان کو لے لیتے ہیں (مارتے ہیں)“

---

[1] قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ (زمر ۴۴)

[2] اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ ۳۱)

[3] سورہ قصص آیات ۷۱۔۷۳ سورہ نمل آیات ۶۰۔۶۴ سورہ زمر ۵ و ۶۔

اس بنا پر جمع کی راہ یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ان علل طبیعی کی فاعلیت اور سببیت، خواہ مادی ہو یا غیر مادی مثلاً فرشتے خدا کے اذن، حکم اور فرمان سے ہے اور یہ قرآن کے بلند معارف میں سے ایک ہے، جو خدا کے افعال کے بارے میں بہت سی آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے اب اگر کوئی شخص خدائی افعال کو اس سے منقطع سمجھے اور یہ کہے کہ یہ کام نورانی موجودات فرشتوں اور اولیاء کو سپرد اور انہیں تفویض ہوئے ہیں اور اس اعتقاد کے ساتھ ان کے سامنے خضوع کرے تو مسلمہ طور پر اس کا خضوع عبادت اور اس کا یہ عمل خدا کے ساتھ شرک کا رنگ اپنے اندر لے لے گا۔

دوسرے لفظوں میں وہ معتقد ہو کہ خدا نے ان کاموں کی انجام دہی ان کے سپرد کر دی ہے اور وہ اختیار تام کے طور پر ان کاموں کو انجام دیتے ہیں، اس صورت میں وہ انہیں خدا کا مثل اور ''ند'' بنا بیٹھا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا اعتقاد عین شرک اور اس قسم کے اعتقاد کے ساتھ ان سے ہر قسم کی درخواست اور دعا کرنا اور خضوع و خشوع ان کی عبادت و پرستش ہوگی، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ (بقرہ ۱۶۵)

''کچھ لوگوں نے خدا کے لیے مثل اور شریک قرار دے لیے ہیں اور ان کو خدا کی طرح دوست رکھتے ہیں۔''

کسی موجود کے لیے بھی خدا کا ''ند'' و مثل و نظیر ہونے کا تصور نہیں ہوسکتا۔ اس صورت میں کہ وہ کوئی ایک کام یا کئی کاموں کے انجام دینے میں مستقل اور پورا پورا اختیار رکھتا ہو، لیکن اس صورت کے علاوہ یعنی اگر اس کے فرمان اور اذن سے کوئی کام کرے تو نہ صرف یہ کہ وہ اس کا ''ند'' و مثل نہیں ہوگا، بلکہ وہ ایک مطیع و فرمانبردار موجود ہوگا، جو اس کے حکم سے وہ کام انجام دیتا ہے۔

اتفاق سے رسالت کے زمانہ کے مشرکین جن خداؤں کی پرستش کرتے تھے وہ ان کے لیے خدائی کاموں کے انجام دینے میں ایک قسم کے استقلال کے معتقد تھے۔

زمانہ جاہلیت میں شرک کا سب سے معمولی عقیدہ یہ تھا کہ ایک گروہ نے یہ خیال کر لیا تھا کہ احبار و رہبان کو تقنین و تشریع کا حق تفویض ہوا ہے [۱] یا شفاعت و مغفرت جو محض خدا کا حق ہے ان کے بتوں اور معبودوں کو سپرد ہوا ہے اور وہ اس کام میں مستقل ہیں، اسی لیے شفاعت سے مربوط آیات کا اصرار یہ ہے کہ کوئی شخص اذن خدا کے بغیر شفاعت نہیں کر سکتا [۲] اور اگر ان کا عقیدہ یہ ہوتا کہ ان کے معبود خدا کے اذن کے ساتھ شفاعت کریں گے تو پھر اذن خدا کے بغیر نفی شفاعت کے مسئلہ پر اصرار کرنے کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔

حکماء یونان کے ایک گروہ نے انواع جہاں میں سے ہر نوع کے لیے ایک خدا خیال کر لیا تھا اور وہ یہ تصور کرتے تھے کہ ان انواع کی

---

[۱] سورہ توبہ آیت ۳۱

[۲] سورہ بقرہ آیہ ۲۵۵

تدابیر انہیں تفویض ہوئی ہیں اور تدبیر عالم کا کام جو خدا کا فعل ہے وہ انہیں سپرد ہوا ہے، زمانہ جاہلیت کے عربوں کا وہ گروہ جو فرشتوں اور سیارہ و ثوابت کی پرستش کرتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ عالم خلقت اور انسان کی تدبیر انہیں تفویض ہوتی ہے اور خدا مقام تدبیر سے کلی طور پر معذول ہو گیا ہے اور وہ پورے اختیار کے ساتھ تدبیر جہان کے مالک ہیں، اسی بنا پر ہر قسم کا خضوع اور کورنش جو اس احساس کو مجسم کرتا تھا عبادت اور پرستش شمار ہوتا تھا۔[1]

زمانہ جاہلیت کے عربوں کا ایک دوسرا گروہ، اگر چہ وہ لکڑی اور دھات کے بنے ہوئے اصنام و اوثان (بتوں) کو اپنا خالق و آفریدگار یا جہان و انسان کا مدبر نہیں سمجھتے تھے، لیکن وہ انہیں مقام شفاعت کا مالک سمجھتے تھے اور یہ کہتے تھے:

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ (یونس ۱۸)

''یہ اللہ کے ہاں ہماری شفاعت کرنے والے ہیں۔''

وہ اسی باطل خیال کی بنا پر کہ وہ مقام شفاعت کے مالک ہیں، ان کی پرستش کیا کرتے تھے اور انکی پرستش کو بارگاہ الٰہی کے تقرب کا باعث سمجھتے تھے، جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى ؕ (زمر ۳)

''ہم تو ان کی پرستش صرف اس لیے کرتے ہیں تا کہ وہ ہمیں خدا سے نزدیک کر دیں۔''

خلاصہ یہ ہے کہ ہر قسم کا وہ عمل جس کا سرچشمہ اس طرح کا احساس ہو اور وہ ایک قسم کی سرسپردگی کا ترجمان ہو وہ عبادت شمار ہوگا۔

اس کے مقابلہ میں ہر قسم کی رفتار و کردار جس کا سرچشمہ اس قسم کا اعتقاد نہ ہو اور کوئی شخص اس قسم کا اعتقاد رکھے بغیر کسی موجود کے سامنے خضوع کرے یا اس کی تعظیم و تکریم کرے، وہ عبادت اور شرک نہیں ہوگا، اگر چہ ہوسکتا ہے کہ وہ فعل حرام ہو۔

مثلاً عاشق کا معشوق کے لیے سجدہ کرنا، فرمانبردار کا فرمانروا کے لیے اور بیوی کا شوہر کے لیے وغیرہ کا سجدہ کرنا عبادت نہیں ہے۔ اگر چہ دین مقدس اسلام میں یہ حرام ہے، کیونکہ خدا کے حکم کے بغیر کوئی شخص اس قسم کی عبادت کی صورت کسی کے بارے میں انجام نہیں دے سکتا، سوائے اس کے کہ وہ اسی کے فرمان اور حکم سے ہو۔

اس بیان سے ایک اور سوال کا جواب بھی واضح و روشن ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر عبادت کے متحقق ہونے میں، الوہیت یا ربوبیت یا خدائی کاموں کے تفویض ہونے کا اعتقاد و شرط ہو، تو پھر کسی انسان کو سجدہ کرنا اس نیت کے بغیر جائز شمار ہونا چاہیے؟

اس کا جواب واضح ہے، چونکہ سجدہ ایک ہمگانی اور عمومی حیثیت سے عبادت و پرستش کا ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے اور دنیا کی تمام اقوام خدا کی اسی کے ذریعہ عبادت کرتی ہیں، اس بنا پر اسلام نے اس بات کی اجازت نہیں دی ہے کہ اس عمومی وسیلہ اور ذریعہ کے ساتھ، ان موارد تک میں بھی جو پرستش نہیں ہیں، استفادہ کیا جائے اور یہ تحریم خصوصیات اسلام میں سے ہے اور حضرت یعقوبؑ کے زمانہ میں اس قسم کی تحریم موجود

---

[1] ملل و نحل، ج ۲ ص ۲۴۴

نہیں تھی، ورنہ وہ اپنے بیٹوں سمیت حضرت یوسفؑ کو سجدہ نہ کرتے۔

بعض محققین [1] نے ذیل میں بیان کردہ آیات سے استدلال کیا ہے کہ غیر خدا کو سجدہ کرنا مطلقاً حرام ہے۔ اگرچہ وہ عبادت و پرستش کے عنوان سے نہ ہو۔

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴿۳۷﴾ (حم السجدہ)

''سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ تم خدا ہی کو سجدہ کرو اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔''

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴿۱۸﴾ (جن)

''سجدے کے مقامات خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہیں پس تم اس کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔''

لیکن ان دونوں آیات میں غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہدف و مقصد اس سجدہ کی تحریم ہے، جو پرستش اور عبادت کے عنوان سے ہو نہ کہ تعظیم و تکریم کے عنوان سے کیونکہ پہلی آیت میں فرماتا ہے: ''ان کنتم ایاہ تعبدون' اور دوسری آیت میں فرماتا ہے: ''فلا تدعوا مع اللّٰہ'' اور اس آیت میں دعوت سے مراد عبادت و پرستش ہے۔

بہتر ہے کہ اس سلسلہ میں اجماع و احادیث سے بھی استدلال کیا جائے، لہٰذا وہ خود فرماتے ہیں:

''فقد اجمع المسلمون علی حرمۃ السجود لغیر اللّٰہ''

''مسلمانوں میں اس بات پر کامل اتفاق ہے کہ غیر خدا کو سجدہ کرنا حرام ہے۔''

استاد بزرگوار حضرت آیت اللہ العظمیٰ خمینی غیر خدا کے لیے سجدہ کے بارے میں، چاہے وہ عبادت کے عنوان سے بھی نہ ہو، فرماتے ہیں: ہاں! اگر خدا نے کسی خاص قسم کی تواضع سے منع کر دیا ہو، تو اس کی اطاعت کرنا چاہیے اگرچہ وہ شرک نہ ہو، جیسا کہ ہم غیر خدا کے لیے سجدہ کرنے کو احترام کے عنوان سے بھی جائز نہیں سمجھتے اور اگر کوئی شخص کسی بزرگ کو احترام کے عنوان سے سجدہ کرے تو ہم اسے گنہگار شمار کریں گے اگرچہ ہم اسے مشرک نہیں سمجھتے۔ [2]

ہم نے یہاں تک آپ کو ایک طرح سے وضاحت کے ساتھ ''عبادت'' اور ''شرک'' کی حقیقت سے آشنا کر دیا ہے اب ہم اس بحث کا نتیجہ پیش کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کچھ انسانوں کے مقابلہ میں خضوع و تواضع کرے، نہ تو وہ ان کو ''الٰہ'' سمجھے، نہ ہی وہ انہیں رب جانے اور نہ ہی انہیں خدائی کاموں کا مبدء خیال کرے، بلکہ ان کا اس لحاظ سے احترام کرے کہ وہ: بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴿۲۶﴾ لَا

---

[1] البیان ص ۵۰۴

[2] کشف اسرار

يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ﴿۲۷﴾ (انبیاء) خدا کے مکرم بندے ہیں وہ بات کرنے میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

یقینی طور پر اس قسم کا عمل سوائے تعظیم و تکریم اور تواضع و فروتنی کے اور کوئی چیز نہیں ہوگا۔

خدا نے اپنے بندوں کے ایک گروہ کا کچھ صفات کے ساتھ تعارف کرایا ہے، جو ہر انسان کی عقیدت کو ان کی تعظیم و تکریم اور احترام کے لیے کھینچتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴿۳۳﴾ (آل عمران)

''خدا نے آدمؑ کو نوحؑ کو اور آل ابراہیمؑ اور آل عمرانؑ کو عالمین پر برتری عطا فرمائی ہے۔''

خدا نے قرآن مجید کی تصریح کے ساتھ ابراہیمؑ کو مقام امامت و رہبری کے لیے منتخب فرمایا ہے: جیسا کہ فرماتا ہے:

قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (بقرہ ۱۲۴)

''خدا نے کہا میں نے تجھے امامت و پیشوائی کے لیے چن لیا ہے۔''

خدا نے قرآن میں حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ، داوٗدؑ، سلیمانؑ، موسیٰؑ، مسیحؑ اور حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عالی صفات کے ایک سلسلہ کے ساتھ توصیف کیا ہے، جن میں سے ہر ایک صفت جلب قلوب کا باعث اور دلوں میں نفوذ کا سبب ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض کی محبت ہم پر واجب و لازم قرار دے دی ہے۔[1]

اگر لوگ ان بندگان خدا کی، ان کی زندگی میں یا ان کی وفات کے بعد، اس لحاظ سے کہ وہ خدا کے محترم بندے ہیں، احترام اور تعظیم کریں، دراں حالیکہ نہ تو انہیں خدا سمجھتے ہوں اور نہ ہی خدائی کاموں کا مبدا خیال کرتے ہوں، تو کسی بھی قوم و ملت کے درمیان اس احترام کو پرستش اور عبادت نہیں کہا جاتا اور ایسا کرنے والے کو مشرک نہیں سمجھا جاتا۔

ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اور اب بھی یاد دہانی کراتے ہیں کہ ہم انسانوں کے سردار و آقا کی پیروی کرتے ہوئے، مراسم حج میں، حجر اسود کو جو ایک سیاہ پتھر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، ہاتھ سے چھوتے ہیں اور اس کا بوسہ لیتے ہیں۔

خدا کے گھر کے گرد جو ایک مٹھی بھر گارے اور پتھر سے زیادہ نہیں ہے، طواف کرتے ہیں، صفا و مروہ نامی دو پہاڑوں کے درمیان سعی کرتے ہیں، یعنی وہی کام انجام دیتے ہیں جو بت پرست اپنے بتوں کے لیے انجام دیتے تھے لیکن اس کے باوجود کسی کے بھی خیال میں یہ نہیں آیا کہ ہم اس عمل کے ذریعہ پتھر اور گارے کی عبادت کرتے ہیں، کیونکہ ہم ہرگز پتھر اور گارے میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا نفع اور ضرر

---

[1] سورہ شوریٰ آیہ ۲۳

کا تصور بھی نہیں کرتے، لیکن ہم اگر ان اعمال کو، اس اعتقاد کے ساتھ کہ یہ پتھر اور پہاڑ خدا یا خدائی آثار کا مبدء ہیں، انجام دیتے تو اس صورت میں ہم بت پرستوں کی ردیف میں قرار پاتے، اس بنا پر پیغمبر وامام یا معلم واستاد یا ماں اور باپ کے ہاتھ کو بوسہ دینا یا قرآن اور دینی کتابوں یا ضریح یا ہر اس چیز کو جو خدا کے مکرم ومحترم بندوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، بوسہ دینا، صرف تعظیم وتکریم ہوگی۔

بحث کے آثار میں ہم قارئین کی توجہ کو، عبادت کی کچھ اور تعریفوں اور ان کی نارسائی اور غیر پختگی کی طرف منعطف کرانا ضروری سمجھتے ہیں۔

ا۔ مولف ''المنار'' جو اس کے استاد شیخ محمد عبدہ کے درس کی تقریریں ہیں، عبادت کی ذیل کی صورت میں تعریف کرتا ہے:

"العبادة ضرب من الخضوع بالغ حد النهاية ناشيى عن استشعار القلب عظعة المعبود لا يعرف منشاها و اعتقاد بسلطة لا يدرك كنهها وما هيتها" [1]

''عبادت شدید اور حد سے زیادہ خضوع ہے جس کا سرچشمہ عظمت معبود کا احساس ہے، ایسی عظمت جس کا منشا معلوم نہیں ہے، لیکن معتقد ہے کہ وہ ایسے تسلط کا حامل ہے جس کی کنہ اور حقیقت واضح نہیں ہے۔''

عبادت کی تعریف مذکورہ طریقہ سے نارسائی اور غیر پختگی سے خالی نہیں ہے، کیونکہ عبادت کی بہت سی اقسام فوق العادہ اور شدید خضوع کی مصداق نہیں ہیں، لیکن وہ اس کے باوجود عبادت شمار ہوتی ہیں، مثلاً وضو وغسل اور اقامہ جو ایک قسم کی عبادت شمار ہوتی ہیں، لیکن ہرگز خضوع کے لحاظ سے رکوع وسجود کے پائے تک نہیں پہنچتی، اس صورت میں ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ عبادت، فوق العادہ اور شدید خضوع کو کہتے ہیں؟ بلکہ اکثر اوقات عاشق کا معشوق کے سامنے اور کسی فوجی سپاہی یا منصب دار کا اپنے سے اوپر کے درجہ کے افسر کے سامنے خضوع، بہت سے بندگان خدا کی، پروردگار کے لیے عبادت وپرستش کے مقام میں خضوع سے زیادہ شدید ہوتا ہے، اس کے باوجود عاشق کے خضوع کو عبادت نہیں کہا جاتا، جب کہ دوسرے خضوع کو یعنی انسان کے اس ذات کے سامنے خضوع کو، جسے عبادت کرنے والا شخص الہ سمجھتا ہے، عبادت و پرستش سمجھا جاتا ہے۔

البتہ یہی لکھنے والا اپنی گفتگو کے درمیان ایک جملہ رکھتا ہے جو عبادت کی صحیح تعریف ہوسکتا ہے اور وہ مضمون کے لحاظ سے ہمارے بیان سے مطابقت رکھتا ہے:

"للعبادة صور كثيره فى كل دين من الاديان شرعت لتذكير الانسان بذالك الشعور بالسلطان الالهى الا على الذى هو روح

---

[1] المنار ج۱ص۵۷

العبادۃ و سرھا"[1]

''ادیان میں سے ہر دین میں عبادت کی مختلف صورتیں پائی جاتیں ہیں اور ان عبادات کی تشریع کا ہدف و مقصد انسان کو خدا کے بزرگ اور اعلیٰ تسلط کے احساس و ادراک کی طرف متوجہ کرنا ہے جو عبادت کی روح اور حقیقت شمار ہوتا ہے۔''

الشعور بالسلطان الالھی کا جملہ اس بات کا ترجمان ہے کہ عبادت کرنے والا شخص چونکہ طرف مقابل کی الوہیت کا معتقد ہے، لہٰذا وہ اس نظر سے اس کی عبادت کر رہا ہے اور جب تک یہ اعتقاد موجود نہ ہو، اس وقت تک انسان کا عمل عبادت کا رنگ اختیار نہیں کرتا۔

۲۔ شیخ محمد شلتوت، شیخ جامع الازہر نے بھی، اپنی تفسیر میں اسی طرح سے، جیسا کہ ہم نے عبدہ سے نقل کیا ہے تفسیر کی ہے، اگرچہ الفاظ میں فرق ہے، لیکن ان کا مضمون ایک ہی ہے، جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

"العبادۃ خضوع لا یحد لعظمۃ لا یحد"[2]

''پرستش و عبادت غیر محدود خضوع ہیں، غیر محدود عظمت کے مقابلہ ہیں۔''

جو نارسائی المنار کی عبادت میں تھی وہ اس کی تفسیر میں بھی محدود ہے اور تھوڑے سے تامل اور غور و فکر سے واضح ہو جاتا ہے کہ المنار کی تعریف میں ایک اور اشکال بھی ہے، جو شلتوت کی تعریف میں نہیں ہے کیونکہ تفسیر ''المنار'' کہتی ہے کہ عبادت کا سرچشمہ عظمت معبود کا اعتقاد ہے کہ اس عظمت کا منشا معلوم نہیں ہے، حالانکہ عبادت کرنے والا جانتا ہے کہ عظمت کی علت وہی خدائی تسلط اور اس کا خدا ہونا ہے تو پھر اس عظمت کی جڑ بنیاد کیسے معلوم نہیں ہے؟[3]

۳۔ بدترین تعریف ابن تیمیہ کی تعریف ہے، وہ کہتے ہیں:

"العبادۃ اسم جامع لکل مایحبہ اللہ ویرضاہ من الاقوال والاعمال الباطنۃ والظاھرۃ کالصلاۃ والزکاۃ و الصیام والحج وصدق الحدیث واداء الامانۃ و بر الوالدین و صلۃ الارحام و......"

''باطنی اور ظاہری اقوال و اعمال میں سے ہر وہ چیز، جسے خدا دوست رکھتا ہے اور اس سے خوش ہوتا ہے، وہ عبادت ہے، مثلاً نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، سچائی، اداء امانت، والدین سے نیکی کرنا اور صلہ رحمی و......''

---

[1] المنار ج۱ ص۵۷

[2] تفسیر القرآن الکریم ص ۳۷

[3] تفسیر القرآن الکریم ص ۳۷

اس مولف نے تعبد اور تقرب میں کوئی فرق ہی نہیں رکھا اور اس نے یہ خیال کرلیا ہے کہ جو چیز خدا کے قرب کا باعث ہے وہ اس کی عبادت کا باعث بھی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ امور جو اس کی رضا و خوشنودی کا سبب ہیں اور اجر و پاداش رکھتے ہیں، بعض اوقات اس کے قرب کا باعث بھی ہوتے ہیں، درآں حالیکہ وہ اس کی عبادت میں شمار نہیں ہوتے، مثلاً ماں باپ سے نیکی کرنا یا خمس یا زکوٰۃ وغیرہ دینا یہ سب امور تقرب کا باعث ہیں جب کہ یہ اس کی پرستش و عبادت نہیں ہیں اور اصطلاح کے مطابق خدا کی اطاعت تو ہیں لیکن ہر اطاعت پرستش نہیں ہوتی۔

دس ضروری نقاط کی تشریح

''توحید درعبادت'' کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان اس بات پر متفق ہیں اور وہ ''توحید درصفات'' کی مانند ہرگز نہیں ہے جسے معتزلہ تو قبول کرتے ہیں لیکن اشاعرہ اس کے منکر ہیں یا ''توحید درافعال'' کی طرح بھی نہیں ہے کہ اشاعرہ تو اس کے طرفدار ہیں لیکن معتزلہ اس کے منکر ہیں، بلکہ تمام عالم کے مسلمان اس کو ماننے پر متفق ہیں اور اس مسئلہ کی اصل کبریٰ (غیر خدا کی عبادت حرام ہے) سب کے نزدیک مسلم ہے۔

فقط ایک مسئلہ جو یہاں درپیش ہے، وہ عبادت کے مصادیق اور موارد کی تشخیص ہے اور عبادت کے معنی کی تشریح اور اس کے میزان کلی کی طرف توجہ کرتے ہوئے، موارد کا حکم واضح ہوجاتا ہے، لیکن زیادہ وضاحت کے لیے لازم ہے کہ ان موارد کا حکم، جنہیں ایک گروہ مثلاً وہابی حضرات عبادت و پرستش کا مصداق سمجھتے ہیں جب کہ وہ دوسروں کے نزدیک عبادت و پرستش نہیں ہے، واضح ہوجائے اور وہ موارد حسب ذیل ہیں:

۱۔ کیا طبیعی اور غیر طبیعی اسباب سے تمسک شرک ہے؟

۲۔ کیا حیات وموت، توحید وشرک کی سرحد کا سبب ہیں؟

۳۔ کیا اولیاء خدا کی ولادت ووفات کے دنوں کو منانا اور انہیں اہمیت دینا شرک ہے؟

۴۔ کیا اولیاء خدا کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد ان کے آثار سے تبرک حاصل کرنا شرک ہے؟

۵۔ کیا قدرت وعجز توحید وشرک کی سرحد ہیں؟

۶۔ کیا غیبی تسلط کا اعتقاد رکھنا شرک کا باعث ہے؟

۷۔ کیا خارق عادت امور کی درخواست کرنا شرک ہے؟

۸۔ کیا شفاعت کی درخواست کرنا شرک درعبادت ہے؟

۹۔ کیا نیک اور صالح انسانوں کو پکارنا شرک ہے؟

۱۰۔ زمانہ جاہلیت کے بت پرستوں کے عقائد

ان دس موارد کی تشریح سے اوہام کے پردے ہٹ جائیں گے اور حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔

ا۔کیا طبیعی اور غیر طبیعی اسباب سے تمسک شرک ہے؟

صوفی اور درویش جو اپنے چند کھوکھلے الفاظ سے بہت خوش ہیں، اپنے اقطاب اور پیران طریقت کی تعریف وتوصیف میں بظاہر شرک کی سرحد تک پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے شرک وتوحید کی سرحدوں کو ویران کر دیا ہے۔

ملائے رومی نے اپنے پیر طریقت شمس تبریزی کی تعریف وتصویف میں کچھ اشعار کہے ہیں جن میں سے بہت سے شرک آمیز ہیں اور وہ ہرگز قرآن کی توحید کے واضح مبانی کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔

شیخ محمود شبستری گلشن راز میں حلاج کے بارے میں جو بنی عباس کے ایک خلیفہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا اس طرح کہتا ہے:

چوکر دی خویشتن راپنبه کاری
تو ہم حلاج وار ایں دم برآری
برآور پنبه پندارت از گوش
ندای واحد القہار بینوش
ندامی آید از حق بر دو امت
چرا گشتی تو موقوف قیامت؟
درآ در وادی ایمن که ناگاه
درختی گویدت انی انا اللّٰه،
روا باشد انا الحق از درختی
چرا نبود روا از نیک بختی
ہر آنکس را که اندر دل شکی نیست
یقین داند که ہستی جز یکی نیست [1]

ترجمہ:

جب تو اپنی پنبہ کاری کرلے گا تو تو بھی حلاج کی طرح سے یہ نعرہ لگائے گا پندار کی روئی کو اپنے کان سے نکال دے اور واحد القہار کی ندا کو سن تجھے ہمیشہ حق تعالیٰ کی ندا آئے گی تو نے قیامت پر کیوں موقوف کر

[1] گلشن راز چاپ حبیبی ص ۳۸

رکھا ہے؟ تو وادی ایمن کے اندر داخل ہو جا تو تجھے درخت سے آواز آئے گی کہ میں ہی اللہ ہوں اگر کسی
درخت سے انا الحق کی ندا جائز ہے تو پھر کسی نیک بخت سے کیوں جائز نہیں ہے؟ جس شخص کے دل میں
کوئی شک نہیں ہے تو پھر وہ یقین کے ساتھ جان لے کہ ہستی و وجود ایک سے زیادہ نہیں ہے

اگر چہ بعض عرفا نے اس قسم کی تعبیروں کی بہت سی تاویلیں کی ہیں، لیکن حق بات یہ ہے کہ ایک فرد موحد کو کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہیے جس کا ظاہر توحید اسلامی کے ساتھ سازگار نہ ہو، اس گروہ نے شرک کے بارے میں ایسی سوچ اختیار کی ہے کہ بہت سے قطعی اور یقینی شرک کو توحید بنا دیا ہے اور شرک کے دائرے کو انہوں نے بہت ہی ضیق اور تنگ بنا دیا ہے۔

ان افراد کے مقابلے میں کچھ ایسے گروہ بھی ہیں جو موضوع شرک میں اتنے وسیع المشرب ہیں کہ انہوں نے اہل توحید کی ہر قسم کی حرکت وسکون کو جو اولیا اللہ کے احترام کے لیے انجام دی جاتی ہے، شرک قرار دے دیا ہے اور وہ انبیاء و اولیاء کے احترام کرنے والوں کو مشرک سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ ایک دن اس کتاب کے مولف (میں) نے مسجد الحرام میں احترام کے عنوان سے امر بالمعروف کرنے والے ایک شخص کے لیے سر کو حرکت دی تو اس نے کہا: اس قسم کی حرکات شرک ہیں اور حرام ہیں، گویا ان حضرات کے صندوقچے میں شرک کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے اور اگر توحید و شرک کا معنی وہی ہے جو وہابی حضرات کہتے ہیں تو پھر روئے زمین پر کسی بھی شخص کے لیے شناختی کارڈ صادر نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی کو موحد کہا جا سکتا ہے۔

میرے ایک عزیز دوست نے لکھا ہے کہ میں نے مسجد نبوی کے خطیب اور امام شیخ عبدالعزیز بن صالح سے پوچھا کہ شرک کسے کہتے ہیں؟ اس نے شرک کی تعریف میں اس طرح کہا:

"کل تعلق بغیر اللہ سبحانہ، شرك"

''غیر خدا کے ساتھ ہر قسم کا تمسک اور تعلق شرک ہے۔''

اگر شرک کا یہی معنی ہو جو اس خطیب نے بیان کیا ہے تو پھر سب ہی لوگوں کو مشرک ماننا پڑے گا، یہاں تک کہ خود وہابی حضرات کو بھی جو اپنے اہداف و مقاصد کے حصول کے لیے اسباب وعلل کا سہارا لیتے ہیں کیونکہ یہ تو ہرگز کہا ہی نہیں جا سکتا کہ اسباب وعلل عین خدا ہیں، بلکہ یقینا وہ غیر خدا ہیں، درآنحالیکہ یہ تعلقات اور تمسکات نہ صرف یہ کہ وہ شرک نہیں ہیں، بلکہ عین توحید ہیں۔ کیونکہ ایک منظم، سازمان یافتہ اور اصطلاح کے مطابق سسٹمیٹک عالم میں، اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہے کہ ہم اپنے اہداف و مقاصد کو علل و اسباب کے ذریعہ حاصل کریں، البتہ ان کے لیے استقلال کا قائل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ہمیں ان سب کی تاثیر کو خدا کے ارادہ اور اس کے فرمان کے زیر سایہ سمجھنا چاہیے۔

اسباب ظاہری اور علل مادی سے تمسک ایک لحاظ سے عین توحید ہے اور دوسرے لحاظ سے کاملاً شرک ہے، اگر ہم علل و اسباب کے لیے استقلال کے قائل نہ ہوں اور ان کی تاثیر کو خدا کی تاثیر کے عرض میں نہ جائیں اور سب کو خدا کے ارادہ اور مشیت کے طول میں اور اس کی قدرت کا پرتو اور توحید در افعال کی شاخ سمجھ لیں، تو اس صورت میں ہم موحد ہوں گے، کیونکہ ہم نے ان سب کی تاثیر کو ارادہ حق تعالیٰ اور خدا کی لامتناہی

قدرت کا مظہر سمجھا ہے اور توحیدی جہاں بینی میں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

لیکن اگر ہم ان علل کے لیے استقلال کے قائل ہوں اور یہ خیال کریں کہ وہ ارادہ خدا سے ہٹ کر سببیت اور تاثیر رکھتے ہیں تو پھر اس صورت میں ہم دو خالق، دو پیدا کرنے والوں اور دو موثروں کے قائل ہو گئے ہیں۔

موحد کو چاہیے کہ وہ موجودات عالم کے درمیان علت و معلول کے قانون کو محفوظ رکھے اور یہ عقیدہ رکھے کہ یہ علل اپنی طرف سے اپنی تاثیر کے سلسلہ میں استقلال نہیں رکھتیں اور جو کچھ رکھتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہے اور دوسری طرف سے یہ عقیدہ رکھے کہ سورج کا چمکنا نباتات کی پرورش میں اور ہواؤں کا چلنا بارش کے برسنے میں و............کامل طور پر موثر ہے۔

اس کے باوجود کہ ایک فرد موحد سارے جہان کو ایک منظم، منضبط، مترتب اور ساز مان یافتہ سمجھتا ہے، جو مادی کے نظام کی بنیاد پر استوار ہے، لیکن وہ ان تمام علل کو ایک ہی سبب کے دریچہ سے کہ اس کی تمام چیزیں خدا ہی کی طرف ہیں، دیکھتا ہے اور اس طرح کہتا ہے:

خدائی که مشک آفرینذ زخون
زسنگ آتش لعل اردبرون
زمرد و بد تو وه خاک را
عطارد و بد طارم افلاک را
زابر افگند قطره ای سوی یم
زصلب آورد نطفه در شکم
از آں قطره لولوی لالاکند
وزیں قامت سرو بالاکند
دہد نطفه را صورتی چوں پری
که کرده است در آب صورت گری

ترجمہ:

وہ خدا جو خون سے مشک پیدا کرتا ہے اور پتھر سے لعل روشن نکالتا ہے جو مٹی کے ڈھیر کو زمرد عطا کرتا ہے اور افلاک کے گنبد کو عطارد دیتا ہے جو بادل سے سمندر کی طرف ایک قطرہ ڈالتا ہے اور صلب سے شکم مادر میں نطفہ کو پہنچاتا ہے بادل کے اس قطرے سے تو موتی بنا دیتا ہے اور اس (نطفہ) سے سرو قامت پیدا کرتا ہے نطفہ کو پری جیسا چہرہ عطا کرتا ہے جیسا کہ پانی کے اوپر نقش نگاری کی ہے

اسلامی جہاں بینی اور خدا شناسوں کے مکتب فلسفی میں پہلی علت اور پہلا موثر خدا ہے اور دوسرے علل و اسباب اس کے عرض میں نہیں

ہیں، بلکہ ان کا وجود و تاثیر اور ان کی سببیت سب خدا کی طرف سے ہیں اور جس موجود کی بھی ہم علل مادی سے تفسیر و توجیہہ کریں، آخر کار ہمیں ان سب کو اس کی طرف لوٹانا پڑے گا اور اسی کی طرف سے جاننا پڑے گا۔ ایک خدا پرست کی جہاں شناسی اور ایک میٹریالسٹ کی جہاں شناسی میں یہی فرق ہے کہ دوسرا علل مادی کو اصالت بخشتا ہے اور سب کو مستقل موثر سمجھتا ہے جب کہ ایک خدا پرست، علت و معلول کے نظام کا اعتقاد رکھنے کے باوجود سب کو اسی کی طرف سے مستند اور اسی کی طرف منتھی سمجھتا ہے اور اس طرح کہتا ہے:

نقش ہستی تقشی از ایوان ماست
آب و باد و خاک سرگردان ماست
مابہ دریا حکم طوفان می دہیم
مابہ سیل و موج فرماں می دہیم
آبہا از خود نہ طغیاں می کند
آنچہ می گوئیم ما، آں می کنند

ترجمہ:

عالم ہستی کا نقش ہمارے ایوان کا نقش ہے پانی، ہوا اور مٹی کو ہم ہی گردش دیتے ہیں ہم ہی دریا کو طوفان کا حکم دیتے ہیں ہم ہی سیل و موج کو فرمان جاری کرتے ہیں پانی اپنے آپ خود سے طغیانی نہیں کرتے جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ وہی کچھ کرتے ہیں

قرآن کی گواہی

علل طبیعی اور مادی کے استقلال اور عدم استقلال کا مسئلہ اساس توحید و شرک کی سرحد ہے اور اس سرحد کی حفاظت کرنے سے موحد، مشرک سے اچھی طرح پہچانا جاتا ہے۔ قرآن نے بھی اس حقیقت کی طرف متعدد آیات میں اشارہ کیا ہے۔

ایک گروہ مشکلات میں چاروں طرف سے گھر جانے اور بیچارگیوں کی صورت میں خصوصاً ایسے موقع پر جب ان کی کشتی دریا کے طوفان سے دو چار ہو جاتی ہے اور گھاس کے تنکے کی طرح ادھر ادھر ہچکولے کھاتی ہے تو وہ خدا ہی کی طرف رخ کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کوئی اور چارہ گر اور ملجا و ماویٰ اور پناہ گاہ خیال میں نہیں آتی اور وہ تمام اسباب سے ناامید ہو کر اسی کو پکارتے ہیں لیکن جس وقت ان کی کشتی ساحل نجات پر پہنچ جاتی ہے تو وہ اپنے شرک کی طرف پلٹ جاتے ہیں، وہ آیات جو اس مضمون کو بیان کرتی ہیں قرآن میں بہت زیادہ ہیں، ہم ان میں سے چند ایک کو بیان کرتے ہیں۔ وہ چیز جو اہمیت رکھتی یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ ان آیات میں شرک سے کیا مراد ہے جس کا یہ نجات پانے والا گروہ مرتکب ہوتا ہے۔

ان آیات کا متن یہ ہے:

۱۔ وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ (روم)

''جب لوگوں کو کوئی بیچارگی اور تکلیف عارض ہوتی ہے تو وہ خدا کی طرف رجوع کرتے ہوئے اسے پکارتے ہیں، پھر جب وہ انہیں اپنی رحمت کا مزہ چکھا دیتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ شرک کرنے لگتا ہے۔''

۲۔ فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ (عنکبوت)

''جس وقت وہ کشتی میں سوار تھے تو خدا کو پورے خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں لیکن جب وہ انہیں ساحل پر پہنچا دیتا ہے تو اچانک وہ مشرک ہو جاتے ہیں۔''

۳۔ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾ (انعام)

''کہہ دے کہ خدا ہی تمہیں اس سے اور ہر کرب و اندوہ سے نجات دیتا ہے، پھر تم مشرک ہو جاتے ہو۔''

۴۔ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ (نحل)

''جب اس نے بیچارگی اور تکلیف کو تم سے دور کر دیا تو تم ہی میں سے ایک گروہ خدا کے لیے شریک قرار دینے لگ جاتا ہے۔''

(اذا هم یشرکون) اور اسی قسم کے جملوں میں زیادہ سے زیادہ غور کرنا چاہیے، ان جملوں سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ مصیبت اور تکلیف سے نجات کے بعد بتوں اور جھوٹے خداؤں کی پرستش کرنے لگ جاتے تھے، بلکہ اس سے دوسرے وسیع معنی کا ارادہ کیا گیا ہے، جو ایک دوسرے شرک کو بھی شامل ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ گرفتاری کے علاوہ دوسرے موقع پر یہ خیال کرتے ہیں کہ یہی اسباب عادی اور علل طبیعی ان کے لیے کافی ہیں اور ان کو نجات دلانے والی وہی مادی اور طبیعی قدرتیں ہیں، پھر وہ اس حالت میں اپنے اندر لطف خدا اور اس کی خاص عنایت کی احتیاج محسوس نہیں کرتے اور اپنی مادی گری اور مادیت کی طرف جھکاؤ کو جاری وساری رکھتے ہیں۔

اس بنا پر استقلال کے عنوان سے عادی اسباب اور مادی علل کی طرف توجہ خود شرک ہی ہے جس سے اجتناب کرنا چاہیے اور الٰہی جہاں بینی اور جہاں مادی کو علیحدہ کرنے والے نقاط میں سے ایک نقطہ یہی ہے، اگر آپ توحید و شرک سے مربوط آیات کا پورے غور کے ساتھ مطالعہ کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے خاص اہتمام کے ساتھ یہ بتانے پر اصرار کیا ہے کہ عالم آفرینش میں خدا کی قدرت کے عرض میں

کوئی قدرت نہیں ہے اور کسی بھی سبب کی تاثیر خالق وآفریدگار کی سبب سازی کے بغیر انجام نہیں پا سکتی اور یہ آسمانی کتاب تمام موارد میں ایک خاص طرز پر اس مطلب کو ادا کرتی ہے۔

نمونہ کے طور پر:

اَمَّنۡ یَّهۡدِیۡكُمۡ فِیۡ ظُلُمٰتِ الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ وَمَنۡ یُّرۡسِلُ الرِّیٰحَ بُشۡرًۢا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشۡرِكُوۡنَ ﴿۶۳﴾ (نمل)

''وہ کون ہے جو تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں ہدایت کرتا ہے؟ اور کون ہے وہ جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے بشارت دینے کے لیے بھیجتا ہے، کیا اللہ کے علاوہ کوئی اور خدا ہے، وہ ان کی باتوں سے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں پاک اور منزہ ہے۔''

اس میں شک نہیں کہ انسان گذشتہ زمانہ میں بھی اور موجودہ میں بھی سمندروں اور خشکی میں اپنی رہنمائی کے لیے طبیعی اور مادی وسائل مثلاً ستاروں، قطب نما اور دوسرے تکنیکی ذرائع سے استفادہ کیا کرتا تھا اور کرتا ہے، اس کے باوجود قرآن کہتا ہے:

''وہ تمہارے ہادی نہیں ہیں بلکہ تمہارا واقعی وحقیقی رہنما خدا ہے۔''

بلا شک وتردید ہوا اور بارش کے لیے عالم طبیعت میں طبیعی علل کا ایک سلسلہ موجود ہے اور وہی ان چیزوں کے پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ وہی ہے جو ہوا کو اپنی رحمت کے آگے آگے بھیجتا ہے۔

یا یہ فرماتا ہے کہ:

وَهُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ الۡغَیۡثَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا قَنَطُوۡا وَیَنۡشُرُ رَحۡمَتَهٗ ؕ (شوریٰ ۲۸)

''وہی ہے جو بارش کو نازل کرتا ہے بعد اس کے کہ وہ مایوس ہو جاتے ہیں اور اپنی رحمت کو پھیلاتا ہے۔''

اس بات سے پورے طور پر آگاہ ہو جانے کے بعد کہ تمام موجودات اور پیدا ہونے والی چیزیں خصوصاً بارش طبیعی علل کے ایک سلسلہ کی معلول ہے تو پھر قرآن سب کو خدا کی طرف مسند کس طرح جانتا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ علل واسباب چونکہ اپنے وجود اور اپنی تاثیر میں استقلال نہیں رکھتے اور انکے پاس جو کچھ ہے وہ خدا کی طرف سے ہے تو اس بنا پر یہی کہنا پڑے گا کہ سمندر اور خشکی میں حقیقی رہنما اور ہواؤں کو واقعی طور سے بھیجنے والا خدا ہے، یہ حقیقت سورہ واقعہ کی آیات میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور قرآن تاکیدی اصرار کے ساتھ کہتا ہے کہ انسانوں کا پیدا کرنے والا زراعتوں کو اگانے والا، بارشوں کو برسانے والا درختوں کو وجود میں لانے والا وغیرہ............سب کا بس خدا ہی ہے۔[1]

---

[1] آیات کا متن اس کے ترجمہ کے ساتھ گزر چکا ہے۔

یہ تاکید اس معنی میں نہیں ہے کہ قرآن کی نگاہ سے جہاں بینی میں علل و اسباب طبیعی مورد انکار قرار پائے ہیں بلکہ اس بنا پر ہے کہ یہ علل خود سے استقلال نہیں رکھتے اور ہمیشہ جس طرح نام کے معنی کے ساتھ حرف کا معنی قائم ہے، اسی طرح سے وہ خدا کے ساتھ قائم ہیں، اگر خدا ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی عنایت کو منقطع کرے تو تمام قالب اور ڈھانچے دھڑام سے گر جائیں گے عالم ہستی اپنی ساری چمک دمک کے ساتھ ظلمت و تاریکی میں بدل جائے، ان وجوہات کی بنا پر علل طبیعی کو نظر انداز کیا گیا ہے، ان کا انکار نہیں کیا گیا۔

ہم رات کی تاریکی میں کسی ''تہران'' جیسے بڑے شہر کو دیکھتے ہیں کہ سارے کا سارا شہر رات کو بھی نور اور روشنی میں ڈوبا ہوا ہے، ایک واقع بین شخص کے نزدیک یہ نور و روشنی تہران کے بجلی پیدا کرنے والے کارخانہ کے ساتھ مربوط ہے کہ اگر ان بلبوں کا ربط، بجلی پیدا کرنے والے کارخانہ سے ایک لمحہ کے لیے بھی منقطع ہو جائے تو ہر جگہ تاریکی چھا جائے اور روشن اور منور رات اندھیری رات میں بدل جائے۔

اب یہ اعتراف کرنے کے باوجود کہ اوپر والی مثال علل طبیعی کی خدائے بزرگ کے ساتھ نسبت کی حقیقت کی تصویر کشی سے کوسوں دور ہے، ہم کہتے ہیں کہ اگرچہ سورج چمکتا ہے اور چاند روشنی دیتا ہے اور آگ جلاتی ہے لیکن یہ ساری جلوہ گری جہاں خلقت کے خالق کی قدرت کے ساتھ مربوط ہے نہ کہ خود ان سے۔

کیا غیر طبیعی اسباب سے فائدہ اٹھانا شرک ہے؟

مادی اور طبیعی اسباب سے فائدہ اٹھانا تو کسی بھی ملت اور کسی بھی گروہ کے درمیان شرک نہیں ہے اور انسانوں کی زندگی کی اساس و بنیاد کو ایسے عوامل ہی تشکیل دیتے ہیں، لیکن وہابی حضرات غیر طبیعی اور غیر مادی اسباب سے تمسک کو ایک قسم کا شرک خیال کرتے ہیں، انہوں نے یہ تصور کر لیا ہے کہ ان کی تاثیر کا اعتقاد رکھنے سے ان کی الوہیت کا اعتقاد لازم آتا ہے اور اس قسم کے اعتقاد کے ساتھ ان سے درخواست کرنا اور انہیں پکارنا ان کی عبادت و پرستش ہے۔

ابوالاعلائے مودودی اپنی کتاب المصطلحات الاربعہ مصر [1] میں لکھتا ہے:

"فالمرء اذا کان اصابه العطش مثلا فدعاه خادمه وامره باحضار الماء لا یطلق علیه حکم الدعاء ولا ان الرجل اتخذ الخادم الها و ذالك ان کل ما فعله الرجل جار علی قانون العلل و الاسباب و لکن اذا ستغاث بولی فی هذا الحال، فلا شك انه دعاء لتفریج الکربة و اتخذه

[1] اس نے یہ کتاب قرآنی الفاظ میں سے چار الفاظ ''الٰہ'' رب، عبادت اور دین کی وضاحت میں لکھی ہے اور ان کی وضاحت کرتے ہوئے کئی غلط فہمیوں میں مبتلا ہوا ہے اور جو لکھنے والا بھی ''پہلے سے کئے ہوئے فیصلے'' کی بنیاد پر کوئی چیز لکھے گا، انہیں کی طرح غلطیاں کرے گا۔

الها"

فکانی به یراه سمیعاً بصیراً و یزعم ان له نوعا من السلطة علیعالم الاسباب مما یجعله قادرا علی ان یقوم با بلاغه الماء او شفائه من المرض و صفوة القول ان التصور الذی لاجله یدعو الانسان الا له و یستغیثه و یتضرع الیه هو لا جرم تصور کونه مالکا للسلطة المهیمنة علی قوانین الطبیعة وللقوی الخارجة عن دائرہ نفوذ قوانین الطبیعة" [1]

جس وقت انسان کو پیاس لگتی ہے تو اگر وہ اپنے خادم کو پکارے اور اسے یہ حکم دے کہ وہ پانی لے آئے، اس کہنے کو دعا نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح یہ بھی نہیں کہتے کہ اس نے اپنے خادم کو خدا بنا لیا ہے، کیونکہ وہ اپنے مطلوب کو علل و اسباب طبیعی کے ساتھ طلب کر رہا ہے لیکن اگر یہ شخص اولیاء میں سے کسی ولی کی پناہ لے اور اس سے درخواست کرے کہ وہ اس کی گرفتاری اور مصیبت کو برطرف کرے، تو اس نے اسے اپنا ''الہ'' بنا لیا ہے گویا اسے سننے والا اور دیکھنے والا سمجھ لیا ہے اور وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے لیے عالم اسباب پر ایک قسم کا تسلط ہے۔ جو اسے توانا بناتا ہے کہ وہ اسے پانی پہنچائے یا بیماری سے شفا بخشے، خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے خدا کو پکارنے اور اس سے استغاثہ کرنے کی علت یہ ہے کہ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ ایسے تسلط کا حامل ہے جو قوانین طبیعت اور قویٰ پر، جو مادی قوانین کے نفوذ کی حدود سے باہر ہیں حاکم ہے۔

اس مولف کے بارے میں جو کئی علل و اسباب کی بنا پر وہابیوں کے نظریہ کے زیر اثر قرار پایا ہے، دو موارد میں گفتگو ہے۔

۱۔ جب کسی شخص کی نظر میں کسی چیز کے دو اسباب ہوں ایک طبیعی اور دوسرا غیر طبیعی اور وہ شخص علت طبیعی سے ناامیدی کے بعد اپنے ہدف اور مقصد کے لیے علت غیر طبیعی کی طرف رجوع کرے اور اس سے اپنی کامیابی کے لیے مدد طلب کرے تو کیا ایسے شخص کے عمل کو شرک کہیں گے اور اس کی درخواست کو عبادت کا نام دیں گے؟

۲۔ یہ اعتقاد کہ ولی اس غیبی تسلط کا حامل ہے جو قوانین طبیعت پر حاکم ہے، کیسا ہے؟ اس مولف نے اپنی گفتگو کے دوسرے حصہ میں اسی

---

[1] المصطلحات الاربعہ ص ۱۷-۱۸، ط۔ از انتشارات دار التراث العربی

چیز پر تکیہ کیا ہے اور ہم اس کے بارے میں آئندہ گفتگو کریں گے، اس وقت ہم اس کے کلام کے پہلے حصہ پر بحث کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص بطور حق اور صحیح طور پر یا خطا اور غلطی سے یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ اس کے مطلب کے حصول کے لیے دو سبب ہیں، ایک طبیعی و مادی جنبہ اور دوسرا غیر طبیعی جنبہ، اگر طبیعی سبب فراہم ہو تو اسے اسی کے ذریعہ اپنا مطلب حاصل کرنا چاہیے اور جب یہ صورت نہ ہو تو وہ اپنے مطلوب کا حصول غیر طبیعی طریقہ سے بھی کر سکتا ہے، جو خاص مقدمات اور شرائط کے ساتھ اسے مطلوب تک پہنچاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس نیت اور مقصد کے ساتھ جس کے ذریعہ علت طبیعی کی طرف رجوع کرتا تھا اور اس کا اعتقاد یہ تھا کہ خدا نے یہ اثر اسے دیا ہے۔[1] اسی نیت کے ساتھ غیر طبیعی علت کی طرف بھی رجوع کرے اور اس کا عقیدہ یہ ہو کہ خدا نے مثلاً ایک مشت خاک میں خاص حالات وشرائط میں شفا قرار دے دی ہے یا خدا نے حضرت مسیح کو یہ قدرت وطاقت دی ہے کہ اگر وہ چاہے تو خدا کے اذن سے بیمار کو شفا بخش سکتا ہے اور مردہ کو زندہ کر سکتا ہے۔

اگر کوئی شخص علل واسباب طبیعی سے مایوس ہونے کے بعد اپنے سامنے امید کا ایک دریچہ کھلا ہوا دیکھے اور کربلا کی خاک یا دم مسیح کی طرف رخ کرے تو کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ اس نے خاک شفا اور مسیح کو اپنا ''الٰہ'' بنالیا ہے حالانکہ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ خدا نے اس خاک کو یہ اثر بخشا ہے اور مسیح کو جو کہ عبد اور بندے ہیں اس قسم کی قدرت عطا کی ہے، اب اگر اس اعتقاد کے ساتھ جو بیان کیا گیا ہے، غیر طبیعی اسباب کی طرف رجوع شرک ہو، تو پھر اسباب طبیعی کے ساتھ تمسک کو بھی شرک ماننا پڑے گا۔

آپ اس کے اس عقیدہ کو (کہ خدا نے ''سید الشہداء'' کی خاک میں شفا قرار دی ہے یا مسیح کو اس قسم کی قدرت دی ہے) باطل اور غلط قرار دے سکتے ہیں اور اس سے دلیل اور شہادت طلب کر سکتے ہیں اور یہ کہ سکتے ہیں کہ خدا نے امام کی خاک میں ہرگز شفا قرار نہیں دی ہے، یا مسیح کو ایسی طاقت اور قدرت نہیں دی ہے، لیکن آپ کو یہ حق نہیں ہے کہ آپ اس کو اس عقیدہ کی بنا پر مشرک سمجھیں، کیونکہ اس کی نظر میں طبیعی اور غیر طبیعی سبب سے استفادہ کرنے کی بنیاد ایک جیسی ہے اور اس کا اعتقاد یہ ہے کہ وہی خدا جس نے سورج کو تابانی چاند کو درخشندگی اور آگ کو سوزندگی دی ہے اور شہد میں شفا[2] کا اثر قرار دیا ہے، اسی نے خاک شفا اور حضرت عیسیٰؑ کو یہ قدرت اور لطف عنایت فرمایا ہے، بعینہ یہی مطلب ارواح مقدسہ اور اولیاء خدا سے حاجت طلب کرنے کے بارے میں ہے جن کے بدن تو مٹی میں چھپے ہوئے ہیں، لیکن ان کے ارواح عالم غیب میں زندہ ہیں اور سب کا حکم ایک ہی جیسا ہے۔

استاد بزرگوار حضرت آیت اللہ العظمی امام خمینی دام ظلہ کا ایک مضمون اس بارے میں ہے جسے ہم اختصار کے ساتھ یہاں پر نقل کرتے ہیں۔ اگر ہم کسی شخص کو خدائے جہاں سمجھیں یا اسے تاثیر میں مستقل جانیں اور اس عقیدہ کے ساتھ اس سے حاجت طلب کریں تو پھر ہم شرک سے دو چار ہوئے ہیں لیکن اگر ہم اس سے کسی اور طریقہ سے حاجت طلب کرتے ہیں اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا جو ہر چیز پر قادر ہے اس نے اس

---

[1] جیسا کہ سورج اور چاند کے بارے میں ہمارا یہی عقیدہ ہے اور قرآن بھی یہی کہتا ہے: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا (یونس ۵)

[2] فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ (نحل ۶۹)

مٹی میں ایک قربان ہونے والے کی قربانی کی قدردانی کے طور پر، جس نے دین کی راہ میں اپنی ہستی اور وجود تک کو قربانی کر دیا تھا، شفا قرار دی ہے، تو ہم کسی بھی قسم کے شرک کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں۔

اگر کوئی خدا پرست یہ کہے: وہی خدا جس نے دوائیوں میں شفا کا اثر رکھا ہے اسی خدا نے ایک تھوڑی سی مٹی میں جس پر فدا کار مظلوم کا خون بہا ہے، وہی اثر اور شفا قرار دے دی ہے (تا کہ لوگوں کی آرزوؤں کی نگاہ مرتے دم تک اس سے نہ ہٹے) اگر وہ چاہے تو اس خدائی دوا کے ساتھ شفاء دے اور اگر نہ چاہے تو بیمار ایک پر محبت دل کے ساتھ اپنے خدا سے اور ایک امیدوار آنکھ کے ساتھ عالم کے پیدا کرنے والے کی مقدس بارگاہ میں نازل ہو) تو اس کی درخواست کو ہرگز شرک نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی اس سبب کو جس کے ساتھ اس نے تمسک کیا ہے ''الہٰ'' سمجھا جا سکتا ہے۔[1]

ہم اسلام کے بلند معارف میں پڑھتے ہیں ''خداوند سبب ساز اور خداوند سبب سوز'' اس جملہ کا کیا معنی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ خدا کبھی ایک چیز کو ایک اثر بخش دیتا ہے اور کبھی اس سے اثر کو سلب کر لیتا ہے اور ہم اس سے پہلے ان دونوں اصطلاحوں کو بیان کر چکے ہیں۔[2]

کبھی خدا سیاہ مٹی کو ایسا اثر بخش دیتا ہے کہ ''وہ اس بچھڑے میں جو بنی اسرائیل کے زیورات سے بنایا گیا تھا'' آواز پیدا کر دیتی ہے جیسا کہ ہم سامری کے واقعہ میں پڑھتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ نے سامری سے کہا تو نے کیا کیا تھا کہ بچھڑے میں زندگی آ گئی تو اس نے کہا:

بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا (طٰهٰ ٩٦)

''میں نے تھوڑی سی مٹی رسول (جبرئیلؑ) کے پاؤں کے نیچے کی اٹھائی اور ''گوسالہ نما میں ڈال دی تو وہ زندہ ہو گیا۔''

خداوند عالم نے اس مٹھی بھر خاک میں جس سے ایک زندہ نے عبور کیا تھا یہ قدرت بخشی ہے، تو اب اگر خدا اس خاک کو، جس پر ابدی اور جاودانی زندوں (شہیدان راہ خدا) کا خون بہایا گیا ہے، اس قسم کا اثر بخش دے اور اس میں خاص حالات و شرائط کے ساتھ شفاء قرار دیدے، تو تعجب اور حیرت کی کوئی بات نہیں ہے اور اس قسم کے سبب کے ساتھ تمسک پکڑنا عین توحید ہے۔

سبب ساز خدا نے حضرت یوسفؑ کے پیراہن میں یہ اثر رکھا تھا کہ جس وقت حضرت یعقوبؑ نے اسے اپنی آنکھوں پر پھیرا تو ان کی بینائی پلٹ آئی، جیسا کہ فرماتا ہے:

---

[1] کشف اسرار ص ۵۳

[2] ص............ کی طرف رجوع کریں۔

فَلَمَّآ اَنۡ جَآءَ الۡبَشِیۡرُ اَلۡقٰىهُ عَلٰى وَجۡهِهٖ فَارۡتَدَّ بَصِیۡرًا ۚ (یوسف۹۶)

''جس وقت یوسفؑ کا پیراہن اپنے چہرے پر ڈالا تو اس کی بینائی لوٹ آئی۔''

اس بنا پر ان اسباب سے فائدہ اٹھانا، چاہے وہ غیر طبیعی اور غیر مادی ہوں توحید کے ساتھ منافات نہیں رکھتا کیا ان نمونوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں، یہ بات صحیح ہے کہ ہم غیر طبیعی اسباب سے فائدہ اٹھانے کو باعث شرک اور غیر خدا کی عبادت سمجھیں۔

ارواح مقدسہ سے توسل اور زندہ جاوید ارواح سے مدد طلب کرنا، ایک قسم کا غیر طبیعی اسباب سے تمسک ہے، اب رہی یہ بات کہ ان میں مدد کرنے کی طاقت اور استغاثہ کرنے والے کا جواب دینے کی قدرت ہے یا نہیں، وہ سردست ہمارے زیر بحث نہیں ہے، اس وقت جو چیز زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ کیا غیر طبیعی اسباب سے اس قسم کا توسل اور فائدہ اٹھانا، توحید در عبادت اور شرک سے پاک اور منزہ ہونے کے ساتھ سازگار ہے یا نہیں۔

اگر کوئی شخص (صحیح یا غیر صحیح) علل و اسباب کا معتقد ہو جائے کہ اسباب طبیعی و مادی کے بیکار ہو جانے کی صورت میں خدا نے ان ارواح مقدسہ کو اس قسم کی قدرت عطا فرمائی ہے کہ وہ خداوند عالم کی اذن و اجازت سے کسی دردمند کی فریاد کو پہنچیں اور اس کی غیب کے طریق سے مدد کریں تو اس قسم کے عقیدہ کو ہرگز شرک اور دوگانہ پرستی نہیں کہا جا سکتا، اب رہی یہ بات کہ یہ عقیدہ صحیح ہے یا نہیں سردست ہماری بحث سے باہر ہے۔

ہم اس کی باتوں کے دوسرے حصہ کے بارے میں بحث کو کہ کیا کچھ افراد میں غیبی تسلط کا اعتقاد رکھنا شرک ہے یا نہیں، دوسری فصل کے لیے چھوڑتے ہیں۔

۲۔ کیا سبب کی موت وحیات، شرک و توحید کی سرحد ہے؟

دنیا بھر کے انسان، افراد بشر کے درمیان تعاون و ہمکاری کے لازم و ضروری ہونے کے مسئلہ سے، صمیم دل کے ساتھ آگاہ ہیں، تاریخ تمدن بشر انسانوں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جو تعاون ہمکاری اور انسانی قوت کے آپس میں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے سے سرچشمہ حاصل کرتا ہے۔ آسمانی کتابوں کے متن، خصوصاً قرآن اس بات کی ترجمانی کرتا ہے کہ ہر انسان ضرورت کے وقت دوسرے انسان کی طرف دست سوال دراز کرتا تھا، اور اس سے مدد طلب کرتا تھا، چنانچہ ذیل کی آیہ میں اس طرح سے بیان ہوا ہے:

فَاسۡتَغَاثَهُ الَّذِیۡ مِنۡ شِیۡعَتِهٖ عَلَى الَّذِیۡ مِنۡ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوۡسٰى فَقَضٰى عَلَیۡهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیۡنٌ ۝۱۵ (قصص)

''موسیٰؑ کے پیرو نے اپنے دشمن کے برخلاف موسیٰؑ سے مدد چاہی، موسیٰؑ نے اسے گھونسا مارا اور اس کی

زندگی کا رشتہ ختم ہوگیا، موسیٰؑ نے کہا یہ شیطانی کام تھا، کیونکہ وہ واضح گمراہ کرنے والا دشمن ہے''

وہابی حضرات سبب کی موت وحیات کو توحید وشرک کی سرحد سمجھتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی پیغمبر یا امام سے اس کی زندگی میں مدد طلب کی جائے تو یہ کام اصل توحید کے مطابق ہے، اور اگر انکی وفات کے بعد ان سے مدد طلب کی جائے، مثلاً موسیٰؑ کا وہی پیرو کار موسیٰؑ کی وفات کے بعد موسیٰؑ سے اس قسم کی درخواست کرے تو یہ استغاثہ شرک اور اصول توحید کے مخالف ہوگا۔ محمد بن عبدالوہاب اس بارے میں اس طرح کہتے ہیں:

وهٰذا جائز فی الدنیا و الأخرة ان تاتی رجلا صالحا تقول له ادع الله لی کما کان اصحاب رسول الله یسألونه فی حیاته و اما بعد مماته فحاشی و کلا، انهم سألوا ذالك بل انکر السلف علی من قصد دعاء الله عند قبره فکیف بدعاه نفسه.[1]

''دنیا میں اُخروی زندگی میں تو یہ بات جائز ہے کہ انسان ایک مرد صالح کے پاس آئے، اور اس سے یہ کہے کہ میرے حق میں دعا کرے جیسا کہ رسولؐ کے اصحاب آنحضرتؐ کی زندگی میں آپؐ سے یہ سوال کرتے تھے لیکن انکی وفات کے بعد آپؐ سے ہرگز دعا کی درخواست نہ کرتے تھے، بلکہ علمائے سابق نے اس قسم کے عمل کا انکار کیا ہے، اور اس شخص کے عمل کو جو انکی قبر کے پاس خدا کو پکارے اور دعا کرے، صحیح نہیں سمجھتے، چہ جائیکہ خود پیغمبرؐ سے کسی چیز کی خواہش اور دعا کریں۔

اس اصل کے بارے میں ہمارا نظریہ

اس قسم کی قضاوت اور فیصلہ اسلام کی کسی فکری اور اعتقادی اصل کے مطابق نہیں ہے، اور توحید وشرک کا سبب اور میزان ہمارے اختیار میں نہیں ہے، کہ ہم جس طرح سے چاہیں شرک وتوحید کی تفسیر کریں، کسی شخص کی موت وحیات جس سے استغاثہ کیا جارہا ہے۔ شرک وتوحید کی میزان نہیں ہوسکتا، کہ ان میں سے ایک توحید کے مطابق ہو اور دوسرا اسکے مخالف ہو۔ کیونکہ کسی زندہ شخص سے استغاثہ اور مدد چاہنا بھی ایک صورت میں شرک اور کُفر ہے، اور وہ صورت استغاثہ کرنے والے کی حفاظت کے لیے قدرت و مدد واصالت میں اس کے استقلال کا اعتقاد ہے، اور جو چیز قرین اور عادی وعمومی ہے وہ یہ ہے کہ ہم زندہ شخص سے مدد طلب کریں، نہ یہ کہ ہم اسے اس کے کام اور تاثیر میں اصیل اور مستقل کریں، حضرت موسیٰؑ کے پیروکار کا استغاثہ بھی صرف ایک ہی صورت میں اصول توحید کے مطابق ہوسکتا ہے کہ وہ انکی توان بخشی میں اصالت اور استقلال

---

[1] کشف الارتیاب ص ۲۱۷ مطابق نقل کشف اشبہات ص ۷

کا قائل نہ ہو، بلکہ انکی قدرت نمائی کو خدا کے قدرت کے طول میں اور اس سے حاصل شدہ سمجھے۔ بعینہ یہی حقیقت ارواح مقدسہ سے امداد طلب کرنے میں ہے، جو قرآن اور موجودہ زمانہ کے علوم کے حکم کے مطابق زندہ اور آگاہ ہیں۔

اگر حضرت موسیٰؑ کا پیرو اسی عقیدہ اور نظریہ کے ساتھ، جس کے ذریعہ اس نے موسیٰؑ کی زندگی میں اُن سے استفادہ کیا تھا، انکی وفات کے بعد[1] بھی، ان سے مدد طلب کرے تو یہ شرک نہیں ہوگا، اور وہ موسیٰؑ کو خدا کی ذات، صفات، افعال اور پرستش وعبادت میں شریک و ہمتا قرار نہیں دے گا۔ یا وہ اس درخواست کے ساتھ اس کی عبادت نہیں کرے گا، اور اگر تصرف کرنے میں انکی روح کی اصالت و استقلال کے اعتقاد کے ساتھ مدد اور نصرت طلب کرے گا اور یہ عقیدہ رکھے گا کہ وہ خدا کی قدرت کو چھوڑ کر کوئی کام انجام دیتے ہیں، تو مسلمہ طور پر وہ مشرکین کے زمرے میں قرار پائے گا۔

اس شخص کی موت وحیات جس سے مدد طلب کی جاتی ہے، اگر وہ موثر ہو، تو پھر وہ اس کے مفید ہونے اور مفید نہ ہونے میں موثر ہونا چاہیے نہ کہ شرک و توحید میں، اور ہم اس مقام پر ارواح مقدسہ سے استغاثہ کے سودمند اور مفید ہونے کے بارے میں گفتگو نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ہماری بحث صرف شرک و توحید کے بارے میں ہے۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ حاجت طلب کرنا، مدد چاہنا اور شفاعت کی درخواست کرنا ایک ہے اور زندہ شخص سے تو عین توحید سمجھی جاتی ہے، جب کہ یہی عمل نہیں خصوصیات کے ساتھ ایک مردہ شخص سے شرک کا رنگ اپنے میں لے لیتا ہے اور اس کے مرتکب کا قتل واجب ہو جاتا ہے،

خدا گنہگاروں اور مجرموں کو یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ پیغمبر کی بارگاہ میں جائیں اور ان سے درخواست کریں کہ وہ ان کے لئے خدا سے طلب امرزش و بخشش کریں۔[2]

اسی طرح خدا حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں سے نقل کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ ان کے لئے طلب مغفرت کریں، اور باپ نے یہ وعدہ دیا کہ وہ عنقریب انکے حق میں طلب مغفرت کریں گے۔[3]

یہ دونوں استغاثے اور طلب شفاعت وہابی حضرات کی نظر میں اصول توحید کے ساز گار ہیں، لیکن اگر حضرت یعقوبؑ کے وہی بیٹے باپ کی وفات کے بعد باپ کی مقدس روح سے چاہیں کہ وہ انکے حق میں دعا کرے اور طلب بخشش کرے تو ان کا یہ کام وہابیت کے مکتب میں شرک شمار ہوگا اور اگر وہ توبہ نہ کریں تو انکا قتل واجب ہوگا۔

اگر کوئی گنہگار اور مجرم پیغمبر اسلام کی زندگی میں آنحضرتؐ سے اس قسم کا تقاضا کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اگر پیغمبر اکرمؐ

---

[1] ممات سے مراد وہی روح کی بدن سے جدائی ہے، اگر چہ باقی رہنے والی اور جاودانی ہے۔

[2] نساء۔ ٦٤

[3] یوسف۔ ٩٧۔ ٩٨

کی رحلت کے بعد آپؑ سے اس قسم کی درخواست کرے تو وہ مشرک ہو جائے گا۔

حیرت وتعجب کی بات ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی زندگی اور موت کسی عمل کی ماہیت کو کس طرح دگرگوں اور تبدیل کر دیتی ہے۔حالانکہ اگر یہ عمل شرک ہوتو پھر اسے دونوں حالتوں میں شرک ہونا چاہیے۔

اب اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ عمل بے فائدہ ہے یا نئی ایجاد اور بدعت ہے جو اسلام میں نہیں ہے تو اس کا جواب واضح ہے۔

کیونکہ اول تو یہ عمل اس صورت میں بدعت ہوگا جب اس کو انجام دینے والا اسے شریعت کی طرف منسوب کرے اور یہ کہے کہ خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ ارواح مقدسہ سے مدد طلب کی جائے ،لیکن اگر وہ اس کو شرع انور کی طرف نسبت نہیں دیتا لیکن اس کام کو انجام دے تو وہ ہرگز بدعت نہیں ہوگا۔

دوسرے سردست ہماری بحث شرک وتوحید کی سرحدوں کی پہچان کے بارے میں ہے،اور بدعت ہونے کا مسئلہ اس وقت ہمارے زیر بحث نہیں ہے،اور جو لوگ ارواح مقدسہ سے توسل کو جائز سمجھتے ہیں وہ اس کے جواز میں قطعی ویقینی دلائل کا ایک سلسلہ رکھتے ہیں جو اس مسئلہ کو بدعت ہونے سے باہر کر دیتی ہے۔

بہر حال اس عمل کو توحید کے مقابلہ میں شرک کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ یعنی درخواست کرنے والا، اس عمل کے ساتھ نہ تو خدائی ذات، صفت اور فعل میں کسی کو شرک قرار دیتا ہے، کہ جس سے اس کی ذاتی ،صفاتی اور افعالی توحید پر کوئی زد پڑتی ہو اور نہ ہی وہ اس درخواست کے ساتھ اس کی عبادت کرتا ہے، تا کہ اس کی توحید عبادت پر اعتراض ہو۔

اگر شرک کے بارے میں بیان کردہ اصل (استقلالِ طرف) کو فراموش کر دیا جائے، تو سارے نجد حجاز میں ایک موحد بھی شرک سے مبرا نظر نہ آئے۔

ان تمام مشکلات کا حل اور راستہ وہی ہے، جس کی تشریح وتوضیح میں ہم نے کوشش کی ہے، اگر ہم اس اصل کو نظر انداز کر دیں تو پھر توحید کی آرزو ایک محال سی آرزو رہ جائے گی۔اب ''ابن تیمیہ'' کے شاگرد کی باتوں کی طرف توجہ فرمایئے،

ابن قیم کہتا ہے:

ومن انواع الشرك، طلب الحوائج من الموتى و الاستغاثة بهم والتوجه اليهم و هذا اصل شرك العالم فان الميت قد انقطع عمله و هو لا يملك لنفسه نفعا ولا ضرا"[1]

''شرک کی اقسام میں سے مُردوں سے حاجت کی درخواست کرنا، ان سے مدد مانگنا اور انکی طرف توجہ کرنا

---

[1] فتح المجيد ص ٦٨ ط ششم

ہے، اور یہ کام تمام اقسام شرک کی جڑ بنیاد ہے، کیونکہ مُردہ کا ہاتھ عالم سے کوتاہ ہو چکا ہے، اور اب وہ اپنے نفع ونقصان کا مالک نہیں رہا''

''ابن تیمیہ'' کے شاگرد (ابن القیم) نے اپنے مدعا کیلئے جو دلیل پیش کی ہے وہ اس کے مدعا کو ثابت نہیں کرتی کیونکہ اس کا یہ کہنا کہ ان کا ہاتھ دنیا سے کوتاہ اور منقطع ہو گیا ہے اس کام کے بے فائدہ ہونے کی دلیل ہے، اس کام کے شرک ہونے کی دلیل نہیں ہے، لیکن اس لکھنے والے نے ان دونوں مطالب کے درمیان کوئی فرق ہی نہیں رکھا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ وہ یہ کہتا ہے: وہ اپنے نفع اور نقصان کے مالک نہیں ہیں، حالانکہ اس مطلب میں تو زندہ اور مردہ میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ کوئی بھی شخص اذن خدا کے بغیر اپنے نفع ونقصان کا مالک نہیں ہے، چاہے وہ زندہ ہو یا مردہ۔

اس کے اس بیان سے اسکے استاد ''ابن تیمیہ'' کی گفتگو کی بے پائیگی بھی واضح ہو جاتی ہے، وہ کہتا ہے:

"كل من غلا في نبي اور رجل صالح وجعل فيه نوعا من الالهية مثل ان يقول: يا سيدی فلان انصرنی اور اغثنی.......فكل هذا شرك و ضالل يستتاب صاحبه فان تاب و الا قتل[1]

''جو شخص پیغمبر یا کسی نیک اور صالح شخص کے بارے میں غلو کرے، اور اسکے بارے میں ایک قسم کا خدائی کا عقیدہ رکھے، اور کہے اے میرے آقا میری مدد کیجیے، اور میری فریاد کو پہنچیے۔ اس قسم کی سب پکاریں شرک اور ضلالت ہیں، کہنے والے کو توبہ کرائی جائے گی اگر وہ توبہ کرے تو بہتر ہے ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا''۔

اگر ارواح مقدسہ سے مدد طلب کرنے سے، جو انکی تعبیر کے مطابق، (مردے ہیں) انکی خدائی کے ایک قسم کا اعتقاد لازم آتا ہے، تو پھر ہر فرد سے درخواست کرنے سے۔ چاہے وہ زندہ ہو یا مردہ۔ یہی عقیدہ لازم آئے گا، کیونکہ طرف مقابل کا زندہ یا مردہ ہونا تو مفید اور غیر مفید ہونے کی سرحد ہے، شرک وتوحید کی سرحد نہیں ہے، جب کہ زندہ شخص سے مدد کی درخواست کرنا، انسانی معاشرے کی زندگی کے ضروری ترین اور بدیہی ترین مسائل میں سے ہے،

اب ہم اس کی باتوں کے ایک اور حصہ کی طرف توجہ کرتے ہیں:

"والذين يدعون مع الله الهة اخرى مثل المسيح والملائكة والاصنام لم يكونوا يعتقدون انها تخلق الخلائق او تنزل المطر و انما كانوا يعبد

[1] مدرك سابق ص ١٦٧

و نهم او يعبدون قبورهم او يعبدون صورهم يقولون: ما نعبدهم الا ليقربونا زلفى او هؤلاء شفعاءنا[1]

''وہ لوگ جو خدا کے ساتھ دوسرے خداؤں، مثلاً حضرت مسیحؑ فرشتوں اور بتوں کو پکارتے تھے وہ ہرگز یہ نہیں کہتے تھے کہ وہ کسی موجودات کو خلق کرتے ہیں یا بارش برساتے ہیں، بلکہ وہ تو صرف انکی یا ان کی قبروں کی یا ان کی تصویروں کی عبادت کیا کرتے تھے، تا کہ اس قسم کی پرستش انہیں بارگاہ خدا سے نزدیک کردے یا وہ ان کے بارے میں شفاعت کریں''

اولیاء الٰہی سے ''وہ حاجت کی درخواست'' کرنے کا، بت پرستوں کے عمل کے ساتھ قیاس اور موازنہ واقع بینی سے انتہائی دور ہے، کیونکہ وہ تو حضرت مسیحؑ اور بتوں کے بارے میں ایک قسم کی الوہیت کے قائل تھے، اور بتوں کو شفاعت کا مالک سمجھتے تھے۔[2] بلکہ ابن ہشام کی نقل کے مطابق تو وہ انہیں مدبر عالم اور کم از کم بارش برسانے والے جانتے تھے اور اسی اعتقاد کی بنا پر ان کے لیے ان کا خضوع وخشوع اور ان سے حاجت طلب کرنا رنگ عبادت اور پرستش کی صورت رکھتا تھا۔

اب بھی دنیائے عیسائیت، حضرت مسیحؑ کے بارے میں الوہیت کی سخت ترین معتقد ہے اور انہیں خدا کے ساتھ متمد سمجھتی ہے۔

اس بنا پر جہاں کہیں حاجت کی درخواست، عقیدہ الوہیت سے نزدیک ہو جائے، تو یقیناً وہ شرک وضلالت ہوگی لیکن اگر مدد کی درخواست۔ چاہے وہ زندہ سے ہو یا مردہ سے۔ اس قسم کی قید سے پاک اور منزہ ہو، تو مسلمہ طور پر باعثِ شرک نہیں ہوگی، اور درخواست عبادت شمار نہیں ہوگی، اس بارے میں تو صرف اس کے مفید ہونے یا غیر مفید ہونے میں غور کرنا چاہیے۔ نہ کہ شرک اور انکی پرستش کے بارے میں۔

۳۔ کیا اولیاء خدا کی ولادت و وفات منانا شرک ہے؟

وہابی حضرات اولیاء اور آسمانی مردان خدا کی ولادت و وفات کے دنوں میں احترام اور منانے کو بدعت اور حرام جانتے ہیں، گویا وہ بزرگان دین اور اولیاء خدا کے سخت ترین دشمن ہیں، اور وہ انکی ولادت اور وفات کے دنوں میں اجتماع کرنے کو شرک کہتے ہیں۔

محمد حامد فقی، رئیس جماعت انصار السنۃ المحمدیہ فتح المجید پر اپنے حاشیہ میں لکھتا ہے:

الذكريات التى ملات البلاد باسم الاولياء هى نوع من العبادة لهم

---

[1] سابقه مدرك ص ١٦٧

[2] سيرة ابن هشام ج ١ ص ٧٧

تعظیمهم۔ [1]

''اولیاء کرام کی ولادت کے دنوں میں جشن منانا انکی پرستش شمار ہوتا ہے، اور انکی ایک قسم کی تعظیم محسوب ہوتا ہے''

انکی تمام غلط فہمیوں کی جڑ بنیاد صرف ایک بات ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے شرک و توحید کیلئے، اور خاص طور پر ''عبادت'' کے مفہوم کیلئے، کوئی سرحد معین نہیں کی ہے، اس بناء پر ہر قسم کے احترام و تعظیم کو عبادت اور پرستش تصور کرتے ہیں، جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں کہ اس نے اپنی گفتگو میں لفظ ''عبادت'' اور تعظیم کو ایک دوسرے کے ساتھ قرار دے کر یہ تصور کرلیا ہے کہ ان دونوں الفاظ کا ایک ہی معنی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن نے بارہا انبیاء کرامؑ اور اولیاء کے ایک گروہ کی فصیح و بلیغ جملوں کے ساتھ تعریف کی ہے۔

قرآن حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ و۔۔۔۔۔۔۔۔ کے بارے میں کہتا ہے:

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ ﴿٩٠﴾ (انبیاء)

''وہ نیک کاموں کی طرف جلدی کرتے تھے اور امید وخوف کے ساتھ ہمیں پکارتے تھے اور ہمارے سامنے خشوع اور فروتنی کرتے تھے''

اب اگر کوئی شخص ان حضرات کی قبور کے پاس، یا ان مجالس میں جو اُنکے اس طریقے سے تجلیل و تعظیم کرے تو کیا اس نے قرآن کی پیروی کے علاوہ کوئی اور کام انجام دیا ہے''۔

خدا خاندان رسالت (اہل بیتؑ) کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے:۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ﴿٨﴾ (دہر)

''وہ کھانے کی ضرورت ہونے کے باوجود، اسے یتیم و مسکین و اسیر کو دیتے ہیں''

اب اگر ہم امیر المومنین کی ولادت کے دن ایک جگہ اکٹھے ہوجائیں اور یہ کہیں کہ حضرت علیؑ وہ شخص ہیں جو اپنا کھانا مسکین و یتیم و اسیر کو دے دیتے تھے، تو ہم مشرک کیوں ہوگئے؟

---

[1] فتح المجید ص ۱۵۴۔ اس کے بعد کتاب ''قرۃ العیون'' سے اسی مضمون کی ایک عبادت نقل کرتا ہے، ان دنوں میں جبکہ یہ اوراق اور صفحات چھپنے جارہے تھے اور اس حال میں کہ تمام اسلامی ممالک میں، پیغمبر اسلامؐ کی ولادت کی مناسبت سے، خوشی کے جشن اور محافل بپا ہیں، مفتی سعودی ''بن باز'' پیغمبر اسلامؐ کی ولادت کی ہر قسم کی یاد منانے کو بدعت اور حرام ہونے کا اعلان کررہا ہے۔

اگر پیغمبر اکرمؐ کی ولادت کے دن ان آیات کو جنھوں نے پیغمبر اکرمؐ کی مدح وثناء کی ہے، ہم عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں ترجمہ کر کے بیان کریں، یا انہیں اشعار کے قالب میں ڈھالیں، اور انہیں کسی محفل میں پڑھیں، تو ہم شرک سے دو چار کیوں ہوں گے؟

یہ حضرات پیغمبر اسلامؐ اور اولیاء اللہ کی تعظیم وتکریم کے دشمن ہیں اور شرک سے مبارزہ ومقابلہ کرنے کے پردہ میں ان کی تعظیم وتکریم سے روکنا چاہتے ہیں۔

اگر وہ یہ کہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں اس قسم کے جشن اور دن نہیں منائے جاتے تھے، تو انکا جواب یہ ہے کہ پیغمبرؐ کے زمانہ میں کسی چیز کا نہ ہونا اس کے شرک ہونے کی گواہی نہیں دیتا۔

اگر کوئی شخص جشن کی محفلوں اور عزاداری کی مجلسوں کے قائم کرنے کی خدا اور رسولؐ کی طرف نسبت دے اور کہے کہ انہوں نے حکم دیا ہے کہ ہم انکے احترام میں اس قسم کی مجالس برپا کریں، تو اس صورت میں اس بات کی تحقیق کرنی پڑے گی کہ انہوں نے عمومی طور پر یا خصوصی طور سے اس قسم کا کوئی حکم دیا ہے یا نہیں، اگر انہوں نے اس قسم کا کوئی حکم نہ دیا ہو تو پھر اس قسم کی نسبت ''بدعت'' ہوگی، یہ شرک درعبادت نہیں ہوگی، اور وہابیوں کی غلط فہمیوں میں سے ایک بدعت کو شرک درعبادت کے ساتھ خلط ملط کرنا ہے، لیکن اگر اس بارے میں کوئی عمومی یا خصوصی اجازت بھی وارد ہوئی ہو تو اس صورت میں یہ ''بدعت'' بھی نہیں ہوگی اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ قرآن میں عمومی اجازت موجود ہے۔

قرآن مجید ایک گروہ کی جو پیغمبر اسلامؐ کا احترام اور تعظیم کرتے ہیں مدح سرائی کر رہا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۵۷ (اعراف)

''وہ لوگ جو پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لائے ہیں اور انہوں نے انکی عزت واحترام کیا اور انکی نصرت کی اور اس نور (قرآن) کی، جو اس کے ساتھ بھیجا گیا ہے پیروی کی وہی فلاح اور رستگاری پانے والے ہیں''

وہ جملے جو اس آیت میں نازل ہوئے ہیں انکی عبارت یہ ہے:

۱۔ امنوابه، ۲۔ عزروه، ۳۔ نصروه اور ۴۔ واتبعوا النور......

کیا کسی کو بھی یہ احتمال ہوگا کہ: امنوا به، نصروه، واتبعوا النور کے جملے صرف زمانہ پیغمبر کے ساتھ مخصوص ہیں، ان تین جملوں کے بارے میں اس قسم کا احتمال نہیں ہوسکتا تو پھر قطعی ویقینی طور پر ''عزروه'' کا جملہ بھی، جو پیغمبر اکرمؐ کی تعظیم وتکریم کے ساتھ مدد و نصرت کرنے کے معنی میں ہے[1] پیغمبرؐ کے زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوگا اور اس عالی قدر رہبر کی ہمیشہ ہمیشہ عزت واحترام وتعظیم وتکریم کرنی پڑے گی۔

---

[1] مفردات راغب مادہ عزر کی طرف رجوع کریں۔

کیا بعثتِ پیغمبرؐ اور انکی ولادت کے دنوں میں آپ کی یاد منانے کی محافل ترتیب دینا اور ان میں خطاب اور تقاریر کرنا اور اصلاحی اشعار پڑھنا "وعزروہ" کا واضح مصداق نہیں ہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ وہابی حضرات اپنے رؤساء اور برسر اقتدار افراد کے سامنے تو اس طرح تعظیم وتکریم کرتے ہیں اور ایک عام انسان کا اس قدر احترام کرتے ہیں لیکن پیغمبرؐ اور انکے محراب وممبر کے بارے میں اس کے سویں حصہ کو بھی شرک اور برخلاف اسلام کہتے ہیں، اور انجام کار اسلام کو ملل واقوام عالم کی نظر میں ایک خشک اور احساس وجذبات سے عاری دین ظاہر کرتے ہیں، اور اس شریعت کو، جو سہل اور آسان، انسانی فطرت اور جذبات واحساسات کے مطابق، اور افراد کیلئے قابل قبول ہونے کی حیثیت سے بلند نظر ہے، ایک ایسا خشک دین و آئین، جو بزرگوں کی تعظیم وتکریم کے بارے میں انسانی فطرت اور جذبات واحساسات کو نظر انداز کرتا ہے، اور اقوام وملل عالم کو جذب کرنے اور اپنے کو ان کیلئے قابل قبول بنانے کی توانائی نہیں رکھتا۔ معرفی کراتے ہیں۔

وہابی گروہ جو شہداء راہ خدا کیلیئے ہر قسم کی مجلس عزاء قائم کرنے کے مخالف ہیں، حضرت یعقوبؑ کی سرگذشت کے بارے میں کیا کہتے ہیں، اگر یہ پیغمبر بزرگوار موجود زمانہ میں نجدیوں اور محمد بن عبدالوہاب کے پیروکاروں کے درمیان رہتے ہوتے، تو یہ انکے بارے میں کس قسم کا فیصلہ کرتے؟

وہ تو رات دن حضرت یوسفؑ کے فراق میں رویا کرتے تھے، اور ہر حال میں ہر شخص سے اپنے فرزند کے بارے میں پوچھتے تھے، انکے فراق اور جدائی کے غم میں اتنا روئے کہ بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔[1]

حضرت یعقوبؑ کی بیماری اور بینائی کا جاتے رہنا، یوسفؑ کی فراموشی کا باعث نہ بن سکا، بلکہ جوں جوں وعدہ وصل نزدیک تر ہوتا جاتا تھا، اپنے فرزند دلبند کیلیئے، انکے عشق کی آگ، ان کے دل میں، زیادہ سے زیادہ شعلہ ور ہوتی جاتی تھی۔ اور اسی لئے وہ کوسوں دور سے یوسفؑ کی خوشبو کو سونگھ رہے تھے [2] اور بجائے اس کے کہ ستارہ یوسفؑ۔ خورشید یعقوبؑ کے پیچھے پیچھے ہوتا، انکی فکر کا آفتاب یوسفؑ کے پیچھے دربدر تھا۔

کسی فرد (یوسفؑ) کے ساتھ محبت اور عقیدت کی وجہ سے، اس کی زندگی میں اس قسم کی محبت اور لگاؤ کا اظہار تو صحیح اور عین توحید ہے، لیکن اس کی وفات کے بعد جہاں انسان کے دل میں اور بھی زیادہ سوز وگداز اور بے قراری ہوتی ہے، حرام اور شرک کیوں ہو جائے گا؟

اب اگر ہمارے زمانہ کے یعقوب ہر سال اپنے یوسفوں کی وفات کے دن اپنے بیٹوں کو اپنے گرد اکٹھا کر لیں اور اپنے یوسفوں کی اخلاقی قدروں اور نفسانی خوبیوں کے سلسلہ میں گفتگو کریں، اور اس سے متاثر ہو کر کچھ آنسو بہا لیں تو کیا اس عمل کے ساتھ انہوں نے اپنے بیٹوں

---

[1] وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ (سورہ یوسف آیہ ۸۴)

[2] اِنِّىْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾ سورہ یوسف آیہ ۹۴

کی پرستش کی ہے؟[1]

اس میں شک نہیں کہ ذوی القربیٰ کی مودت اسلامی فرائض و واجبات میں سے ایک ہے، جس کی طرف قرآن نے پوری پوری صراحت کے ساتھ ہمیں دعوت دی ہے، اب اگر کوئی شخص اس مذہبی فریضہ پر چودہ صدیاں گزرنے کے بعد عمل کرنا چاہے، تو اس کا کیا طریقہ ہے؟ کیا اس کے سوا بھی کچھ ہے کہ انکی خوشی کے دنوں میں خوش ہو اور ان کے غم واندوہ کے دنوں میں اندوہناک ہو۔

اب اگر وہ اپنی خوشی کے اظہار کیلئے ایک محفل برپا کرے اور اس محفل میں انکی زندگی کے حالات اور انکی فداکاریوں کے واقعات کو بیان کرے، یا انکی مظلومیت، اور انکے اپنے حقوق حقہ سے محروم کئے جانے کو بیان کرے، تو کیا ایسے آدمی نے اظہار وعقیدت اور ذوی القربیٰ سے اظہار مودت کے علاوہ کوئی اور کام انجام دیا ہے۔

اب اگر ایسا آدمی زیادہ سے زیادہ اظہار عقیدت ومحبت کے لئے انکی اولاد کے پاس جائے اور ان انکے مدفن کے قریب حاضر ہو، اور اس قسم کی مجالس انکی قبروں کے پاس برپا کرے تو عقلاء عالم اور بابصیرت خردمندوں کی نگاہ میں اس نے سوائے اظہار عقیدت ومودت کے کوئی اور کام کیا ہے؟

مگر یہ کہ وہابی یہ کہے: مودت ومحبت کو سینوں میں ہی محبوس اور پوشیدہ رہنا چاہیے، اور کسی شخص کو محبت کے اظہار کا حق نہیں ہے، پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں اور آپؐ کے بعد، جو عقائد کی تبدیلی اور افکار کے انقلاب کا دور تھا، مختلف ملل واقوام، قسم قسم کے تمدنوں اور طرح طرح کے رسوم وآداب کے ساتھ، اسلام کی طرف رُخ کررہی تھیں، اور شہادتین کہنے سے ہی ان کا اسلام قبول کرلیا جاتا تھا، اور پیغمبر اکرمؐ اور انکے بعد کے رہبروں اور رہنماؤں کا ہرگز یہ طریقہ نہیں تھا، کہ عقائد کی تفتیش کا محکمہ قائم کرکے، ملل واقوام کے تمام رسوم وآداب کو سنسر اور تفتیش کرتے ہوں اور انہیں پگھلا کر کسی سانچے میں ڈھال کر کسی دوسرے قالب میں لاتے ہوں، جو گذشتہ قالبوں سے کسی قسم کی شباہت نہ رکھتا ہو۔

بزرگوں کا احترام، انکی یاد منانے کی مجالس ومحافل، انکی قبور پر حاضری، اور انکے آثار کے ساتھ اظہار عقیدت، ساری دنیا کی اقوام و ملل میں مرسوم تھا اور ہے، اور اب بھی مشرق ومغرب کی قومیں، اپنے قدیمی رہبروں کی قبروں، اور انکے مومی مجسموں کی زیارت کیلئے، کئی کئی گھنٹے صف انتظار میں کھڑے رہتے ہیں، تاکہ وہ انکے جسم یا قبر کے پاس کھڑے ہو کر اظہار عقیدت کریں، اور اپنی آنکھوں کے گوشہ سے شوق کے آنسو بہائیں، اور وہ اس کو ایک قسم کا احترام شمار کرتے ہیں، جس کا سرچشمہ انکے اندرونی جذبات ہوتے ہیں۔

ایسا کبھی بھی نہیں ہوا کہ پیغمبر اکرمؐ نے افراد کے عقائد کی تفتیش کے بعد اور انکی زندگی کے رسوم وآداب کی تحقیق کے بعد ان کا اسلام قبول کیا ہو، بلکہ آپؐ صرف شہادتین کے اظہار پر اکتفا کرتے تھے، اور اگر اس قسم کے رسوم وآداب شرک وکفر تھے تو پہلے ان سے بیعت لینے اور ان رسوم سے تبری وبیزاری کا عہد وپیمان لینے کے بعد ان اقوام وملل کا اسلام قبول کرتے، جب کہ ہرگز ایسا نہیں تھا۔

---

[1] اس سے قطع نظر خاندان رسالتؐ کے مظلومین کے مراسم عزا بپا کرنے کے بارے میں متواتر روایات وارد ہوئی ہیں، مرحوم علامہ امینی نے کتاب "سیرتنا وسنتنا" میں کچھ روایات جمع کی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ خداوند تعالی سے مائدہ آسمانی طلب کرتے ہیں اور اس کے نزول کے دن کا روز عید کے ساتھ تعارف کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

رَبَّنَآ اَنۡزِلۡ عَلَيۡنَا مَآٮِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوۡنُ لَنَا عِيۡدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنۡكَ‌ ۚ وَارۡزُقۡنَا وَاَنۡتَ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ‏ ﴿۱۱۴﴾ (مائدہ)

''پروردگار! ہم پر آسمان سے مائدہ نازل فرما تا کہ وہ ہمارے اول و آخر کے لئے عید قرار پائے، اور تیری طرف سے نشانی ہو، اور ہمیں رزق دے کہ تو بہترین رزق دینے والا ہے''

کیا پیغمبر گرامیؐ کے وجود کی قدر و قیمت ایک آسمانی مائدہ سے کمتر ہے، کہ حضرت عیسیٰؑ اس کے نزول کے دن کیلئے عید ہونے کا اعلان کرتے ہیں، اگر اس دن کو عید قرار دینا اس بناء پر تھا کہ مائدہ خدا کی نشانی ہے، تو کیا پیغمبر اسلامؐ خدا کی عظیم ترین آیت اور نشانی نہیں ہیں۔

وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ ؕ‏ ﴿۴﴾ (انشراح)

''ہم نے تیرے ذکر اور شہرت کو عالم میں بلند کر دیا ہے''

کیا پیغمبر اکرمؐ کے روز مولود مسعود پر، محافل جشن کو ترتیب دینا، آپؐ کے نام و نشان اور شہرت کو بلند کرنے کے سوا کوئی اور نتیجہ رکھتا ہے، ہم اس بارے میں قرآن کی پیروی کیوں نہ کریں، کیا قرآن ہمارے لئے ایک اسوہ اور نمونہ نہیں ہے؟

۴۔ اولیاء کے آثار سے برکت حاصل کرنا، نہ ان کی زندگی میں شرک ہے، نہ ان کی وفات کے بعد

وہابی حضرات اولیاء کے آثار سے تبرک حاصل کرنا شرک سمجھتے ہیں اور جو شخص رسول کریمؐ کے محراب و ممبر کا بوسہ لے لے تو وہ اسے مشرک کہتے ہیں، چاہے وہ اس میں کسی بھی قسم کی الوہیت کا عقیدہ نہ رکھتا ہو، بلکہ پیغمبر کی مہر و محبت اس کا سبب ہو کہ محبوب سے مربُوط آثار کا بوسہ لے، لیکن وہ یوسفؑ کے پیراہن کے بارے میں کیا کہیں گے؟

حضرت یوسف علیہ السلام کہتے ہیں، میرا قمیض لے جاؤ اور اُسے میرے باپ کی آنکھوں پر ڈال دو تا کہ اسے دوبارہ بینائی مل جائے۔ حضرت یعقوبؑ بھی یوسفؑ کے پیراہن کو جو کوئی عالی شان کپڑے کا نہیں تھا اپنی آنکھوں پر ملتے ہیں اور اسی وقت انکی بینائی لوٹ آتی ہے۔ اگر حضرت یعقوبؑ اس قسم کا کام نجدیوں اور محمد بن عبد الوہاب کے پیروکاروں کے سامنے انجام دیتے تو وہ ان سے کیا معاملہ کرتے، اور معصوم اور گناہ و خطا سے مصئون پیغمبر اکرمؐ کے اس عمل کی کس طرح سے توصیف کرتے؟

اب اگر کوئی مسلمان خاتم انبیاء کی قبر و ضریح و مرقد کی مٹی کو آنکھوں سے لگاتا ہے، اور آئمہ اور پیشواؤں کی قبر و ضریح کا احترام کے عنوان سے بوسہ لیتا ہے، یا ان سے تبرک حاصل کرتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ خدا نے اس مٹی میں اثر رکھا ہے، اور اس کام میں وہ حضرت یعقوبؑ زمانہ کی پیروی کرتا ہے، تو اسے سب و شتم اور لعن و تکفیر کیوں کی جاتی ہے؟[۱]

کیا عجز و قدرت، توحید و شرک کی سرحد ہے؟

وہابیوں کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ توحید اور شرک در عبادت کیلئے ایک دوسرا معیار بھی ہے، اور وہ طرف مسئول کی اس حاجت کیلئے جس کی اس سے درخواست ہو رہی ہے، عجز و قدرت ہے، وہ کہتے ہیں کہ کسی مخلوق سے ایسی چیز کی درخواست کرنا، جس کے کرنے پر سوائے خدا کے اور کوئی قادر نہ ہو شرک اور عبادت شمار ہوگا۔

ابن تیمیہ اس بارے میں لکھتا ہے:

"من یأتی الیٰ قبر نبی او صالح و یسأله حاجته و یستنجده مثل ان یسأله ان یزیل مرضه اور یقضی دینه او نحو ذالك معا لا یقدر علیه الا الله عزو جل فهذا شرك صریح یجب ان یستتاب صاحبه فان تاب و الا قتل"[۲]

"اگر کوئی شخص پیغمبر اکرمؐ یا کسی نیک آدمی کی قبر پر آئے اور اس سے حاجت طلب کرے، مثلاً اس سے درخواست کرے کہ وہ اس کی بیماری کو شفا دے یا اس کے قرض کو ادا کرے، یا اسی قسم کی کوئی اور حاجت طلب کرے، جس پر خدا کے علاوہ اور کوئی قادر نہیں ہے تو یہ شرک ہے، اور ایسا عقیدہ رکھنے والے کو جتنی جلدی ہو سکے توبہ کرانا چاہیے، اگر توبہ کرے تو بہتر ہے ورنہ اس کو قتل کر دینا چاہیے"

اس عبادت میں عجز و ناتوانی کو میزان شرک بتایا گیا ہے، اور یہ کہ غیر خدا سے ایسی چیزوں کی درخواست کرنا جو صرف خدا کی قدرت

---

[۱] پیغمبر گرامیؐ کے زمانہ سے لے کر آج تک تمام مسلمانان عالم سوائے وہابیوں کے رسول اکرمؐ کی آثار سے تبرک حاصل کرتے رہے ہیں اور شیخ محمد طاہر مکی نے قطعی تاریخی شواہد سے، اس مطلب کو ایک رسالہ میں، جو ۱۹۸۵ء میں چھپا ہے اور جسکا نام "تبرک الصحابہ بآثار رسول اللہؐ" ہے، اور اس کا فارسی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ ثابت کیا ہے۔

[۲] زیارة القبور، والاستنجاد بالمقبور ص ۱۵۶، اور رسائل "الهدیة السنیة" ص۔۴ میں بھی تقریباً یہی مطلب نکلتا ہے۔

میں ہیں، شرک کا سبب ہے، اس کی یہ بات گذشتہ تفصیل کے خلاف ہے، جس میں طرف مقابل کی موت وحیات میزان تھی، اس بنا پر مناسب تو یہ تھا کہ ابن تیمیہ الی قبر نبی او صالح کے جملہ کے بعد " او ولی حی" کا اضافہ کرتا، تاکہ واضح ہو جاتا کہ طرف مسئول کی موت وحیات میزان نہیں ہے بلکہ اس کی قدرت وعجز میزان ہے، جیسا کہ "صنعانی" نے جو کہ ایک وہابی مؤلف ہے، یہی کام کیا ہے، اور اس نے یہ کہا ہے "من الاموات اور من الاحیاء" اس کی عبارت کا متن یہ ہے:

"الاستغاثة بالمخلوقين الاحياء فيما يقدرون عليه مما لا ينكرها احد..........و انما الكلام فى استغاثة القبوريين و غير هم باوليائهم و طلبهم منهم امورا لا يقدر عليها الا الله تعالى من عافية المريض و غيرها..........وقد قالت ام سليم يا رسول الله خادمك انس ادع الله له وقد كانت الصحابة يطلبون الدعاء منه وهو حى و هٰذا امر متفق على جوازه والكلام فى طلب القبورين من الاموات او من الاحياء ان يشفعوا مرضهم و يردوا غائبهم..........ونحو ذالك من المطالب التى لا يقدر عليها الا الله" [1]

"زندوں میں سے مدد طلب کرنے میں کسی کو انکار نہیں ہے، گفتگو اولیاء سے مرنے کے بعد مدد طلب کرنے میں ہے وہ بھی ایسے امور کی درخواست جن پر خدا کے علاوہ کوئی قدرت نہیں رکھتا، مثلاً مریض کو شفا دینا۔۔۔۔۔۔ "ام سلیم" نے پیغمبر اکرمؐ سے درخواست کی تھی کہ آپؐ "انس" کے بارے میں دعا کریں، اور اصحاب پیغمبر بھی آپؐ سے دعا کی درخواست کیا کرتے تھے، اور یہ مطلب زیر بحث نہیں ہے، گفتگو مُردوں اور زندوں سے طلب حاجت کرنے میں ہے کہ وہ انکے بیماروں کو شفا دیں یا گمشدہ کو واپس لوٹا دیں یا ایسے امور انجام دیں جن پر خدا کے علاوہ کوئی قادر نہیں ہے"۔

گزشتہ بحث میں مسئول کی موت وحیات پیش کی گئی تھی اور حاجت کی زندہ سے درخواست شرک نہیں تھی، جب کہ مردہ سے حاجت کی درخواست قرین شرک تھی، لیکن اس بحث میں "شرک در عبادت" کی میزان ایسی چیز کی درخواست ہے جس پر صرف خدا ہی قادر ہے، نہ کہ بندہ، اس صورت میں مسئول کا زندہ یا مردہ ہونا مسئلہ میں کوئی فرق نہیں رکھتا۔

---

[1] کشف الاتیاب ص ۲۷۲

یہ نظریہ اس سے کہیں زیادہ بے بنیاد ہے، کہ جواب کا محتاج ہو، کیونکہ عجز و ناتوانی، یا قدرت و توانائی اس شخص کی جس سے حاجت طلب کی جارہی ہے، درخواست کے عقلائی یا غیر عقلائی ہونے کی میزان ہے، شرک و توحید کی میزان نہیں ہے۔

اگر کوئی آدمی کنویں کے اندر گرا ہوا ہو اور وہ ادھر اُدھر کے پتھروں سے امداد طلب کرے تو وہ آدمی احمق ہے اور اس کا کام احمقانہ ہو گا، اور اگر کسی راہ گذر سے جو اس کی نجات کی طاقت اور توانائی رکھتا ہے اس قسم کی درخواست کرے تو اس کا کام عقلائی اور قابل تعریف ہوگا۔

اس بناء پر اس حصہ کی تنقید میں اس سے زیادہ خراب نہیں ہونا چاہیے، اور گفتگو کا رُخ دوسری تفصیلات کی طرف کرنا چاہیے۔

٦۔ کیا غیبی تسلط کا اعتقاد شرک کا باعث ہے؟

اس میں شک نہیں کہ حقیقتاً حاجت کرنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ حاجت طلب کرنے والا طرف مسئول کو اپنی حاجت کے انجام دینے میں قادر و توانا سمجھے۔

کبھی تو یہ قدرت ظاہری اور مادی ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ ہم کسی سے پانی مانگتے ہیں، اور وہ پانی کے برتن کو دودھ سے پر کر کے ہمیں دے دیتا ہے۔

اور کبھی یہ قدرت، قدرت غیبی، اور طبیعی ذرائع اور مادی قوانین سے دور ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ ایک انسان کا عقیدہ یہ ہو کہ حضرت علیؑ ''خیبر'' کے دروازے کو، جو ایک عام انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ اپنی جگہ سے اکھاڑ سکتے ہیں، وہ بھی قدرت بشری سے نہیں بلکہ قدرت غیبی کے ساتھ۔

یا حضرت عیسٰی علیہ السلام اپنے شفا بخش دم کے ساتھ ایسے بیمار کو جس کا علاج مشکل ہے۔ بغیر اس کے کہ بیمار دوا کھائے یا اس کا اپریشن کیا جائے۔ شفا دے سکتے ہیں، اس قسم کی قدرت غیبی کا اعتقاد، اگر وہ خدا کی قدرت و اذن و مشیت کے ساتھ مستند ہو، تو قدرت مادی کی طرح ہو جائے گا، جس سے شرک لازم نہیں آتا، کیونکہ وہی خدا جس نے اس قدرت مادی کو ایک شخص کے اختیار میں دیا ہے، اسی نے قدرت غیبی بھی دوسرے شخص کو دی ہے، بغیر اس کے کہ کسی مخلوق کو خالق فرض کیا جائے، یا کسی بشر کو خدا سے بے نیاز تصور کر لیا جائے۔

وہابیوں کا نظریہ

وہ کہتے ہیں کہ اگر انسان کسی ولی اللہ سے۔ چاہے وہ زندہ ہو یا مر چکا ہو۔ درخواست کرے کہ وہ اس کے بیمار کو شفاء دے یا اس کے گمشدہ کو لوٹا دے یا اس کے قرض کو ادا کر دے، اس درخواست کا لازمہ یہ ہے کہ وہ مسئول کے بارے میں کسی تسلط اور قدرت و طاقت کا معتقد ہے، جو نظام طبیعی اور جہانِ خلقت میں جاری قوانین پر حاکم ہے۔ اور غیر خدا کے بارے میں اس قسم کے تسلط اور قدرت کا اعتقاد مسئول کی ''الوہیت'' کا ہی اعتقاد ہے، اور اس قید کے ساتھ، اس سے درخواست کرنا شرک ہوگا۔

بیاباں میں پیاسا انسان اگر اپنے نوکر سے پانی طلب کرے تو اس نے قوانین طبیعت پر حاکم نظام کی پیروی کی ہے، لہذا اس قسم کی

درخواست شرک نہیں ہوگی، لیکن اس نبی یا امام سے جو زمین میں دفن ہو چکے ہیں یا دوسری جگہ رہتے ہیں پانی مانگے، تو اس قسم کے اعتقاد سے اس کا تسلط غیبی لازم آتا ہے کہ وہ اسباب وعلل مادی کے بغیر ہی سائل تک پانی پہنچا سکتا ہے، اور اس قسم کا اعتقاد، طرف مسئول کی "الوہیت" کا اعتقاد ہی ہے،

ابوالاعلائے مودودی انہی افراد میں سے ایک ہیں جنہوں نے اس چیز کی تصریح کی ہے، اور انکی وہ عبارت جو ہم نے پہلے نقل کی ہے، وہ اسی مطلب کو بیان کرتی ہے،

انہوں نے اس عبارت میں جو پہلے بیان ہو چکی ہے یہ کہا ہے:

"انسان کے خدا کو پکارنے، اور اس سے استغاثہ کرنے کی علت یہ ہے، کہ وہ یہ خیال کرتا ہے، کہ خدا اس تسلط کا حامل ہے، جو قوانین طبیعت اور ان قوتوں پر حاکم ہے، جو مادی قوانین کے حدود ونفوذ سے باہر ہیں۔[1]

ہمارا نظریہ

مؤلف کے اشتباہ اور غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ اس نے یہ خیال کر لیا ہے کہ کچھ افراد میں تسلط غیبی کا اعتقاد مطلقا شرک اور دوگانہ پرستی کا سبب ہے، اور اس نے یا تو یہ چاہا ہی نہیں ہے، یا وہ ایسا کر نہیں سکا کہ اس تسلط وقدرت کے اعتقاد کو جو خدا کی قدرت وتسلط پر متکی ہو، اس تسلط و قدرت کے اعتقاد سے، جو مستقل اور خدا سے جدا ہو، تمیز کرے، جو بات شرک کا سبب ہے وہ دوسری ہے، پہلی نہیں ہے،

قرآن انتہائی صراحت کے ساتھ کچھ افراد کے نام لیتا ہے جو سب کے سب تسلط غیبی کے حامل تھے، اور ان کا ارادہ قوانین طبیعت پر حاکم تھا۔ ہم اس مقام پر ان اولیاء خدا کے ناموں کی طرف جو قرآن کی نظر سے اس قسم کی قدرت کے حامل تھے، اشارہ کرتے ہیں:

ا۔ حضرت یوسفؑ اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں:

اِذۡهَبُوۡا بِقَمِيۡصِىۡ هٰذَا فَاَلۡقُوۡهُ عَلٰى وَجۡهِ اَبِىۡ يَاۡتِ بَصِيۡرًا ۚ (یوسف ۹۳)

فَلَمَّاۤ اَنۡ جَآءَ الۡبَشِيۡرُ اَلۡقٰىهُ عَلٰى وَجۡهِهٖ فَارۡتَدَّ بَصِيۡرًا ۚ (یوسف ۹۶)

"میرا یہ پیراہن لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو تو اس کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ بینا ہو جائے گا۔ جب بشیر آیا، اور پیراہن کو اس کے چہرے پر ڈالا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ بینا ہو گیا"

آیت کا ظاہر یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں حضرت یوسفؑ کے ارادے اور خواہش اور قدرت اکتسابی کے سایہ میں بینا ہوئیں، اور یہ کام ہرگز خدا کا براہ راست کام نہیں تھا، ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ حضرت یوسفؑ اپنے بھائیوں کو یہ حکم دیتے کہ اس کے قمیص کو باپ کے چہرے پر ڈال دینا، بلکہ اتنا کافی تھا کہ آپ صرف دعا کرتے، اور یہ کام، اس جہان میں جزوی طور پر، اذن خدا سے ولی خدا کے تصرف کے سوا اور کوئی

---

[1] المصطلحات الاربعة ص۱۸ اور اس کی عبارت کا متن ص پر نقل ہو چکا ہے۔

چیز نہیں ہے، اور اس کا کرنے والا سلطۂ غیبی کا حامل ہے، جو خدا نے خاص خاص موقعوں کیلئے اسکے اختیار میں دیئے ہوئے ہیں۔

۲۔ حضرت موسیٰؑ خدا کی طرف سے مامور ہوتے ہیں کہ وہ اپنا عصا پہاڑ پر ماریں تاکہ بنی اسرائیل کے قبائل کی تعداد کے برابر بارہ چشمے اس سے باہر نکلیں، جیسا کہ فرماتا ہے:

اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ (بقرہ۶۰)

''ہم نے موسیٰؑ سے کہا اپنا عصا پتھر پر مارو، تا کہ اس سے بارہ چشمے پھوٹیں''

دوسری جگہ موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے کہ اپنے عصا کو دریا پر ماریں تا کہ پانی کا ہر حصہ ایک پہاڑ کی مانند ہو جائے اور بنی اسرائیل اس سے عبور کریں، جیسا کہ فرماتا ہے:

فَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ﴿٦٣﴾ (شعراء)

''ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ اپنا عصا دریا پر مارو، موسیٰؑ نے اپنے عصا کو پانی کے ایک حصہ پر مارا، تو پانی کا ہر حصہ ایک پہاڑ کی صورت ہو گیا''

یہاں پر یہ نہیں سمجھ سکتے، کہ چشموں کے پیدا ہونے اور پہاڑوں کے ظاہر ہونے میں، موسیٰؑ کے ارادہ وخواہش اور انکے عصا مارنے کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۳۔ حضرت سلیمانؑ نبی خدا کے بزرگ اولیاء میں سے تھے، جو وسیع غیبی قدرتوں کے حامل تھے، اور انہوں نے ان عظیم خدائی نعمتوں کو وَأُوتِينَا مِن كُلِّ شَيْءٍ ۖ (نمل ۱۶) کے جملہ سے تعبیر کیا ہے، اور اسی سورہ کی آیہ ۱۷، ۴۴ اور سورہ سبا کی آیہ ۱۲، اور سورہ انبیاء کی آیہ ۸۱، اور سورۃ ص کی آیہ ۳۶، ۴۰ میں ان نعمتوں کی تفصیل آئی ہے، اور ان آیات کا مطالعہ ہمیں حضرت سلیمانؑ کی موہوبی قدرت کی عظمت سے آشنا کرتا ہے، اور اس غرض سے کہ قارئین کرام مختصر طور پر ان قدرتوں سے آشنا ہو جائیں، ہم اس ولی خدا سے مربوط آیات میں سے چند ایک یہاں پیش کرتے ہیں تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ بندگان خدا کی غیبی قدرت کا اعتقاد ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی قرآن نے خبر دی ہے۔

حضرت سلیمانؑ قرآن کی نظر سے جنات اور پرندوں پر تسلط رکھتے تھے، اور پرندوں اور حشرات کی زبان جانتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَوَرِثَ سُلَيْمَٰنُ دَاوُۥدَ ۖ وَقَالَ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ ٱلطَّيْرِ وَأُوتِينَا مِن كُلِّ شَيْءٍ ۖ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ ٱلْفَضْلُ ٱلْمُبِينُ ﴿١٦﴾ وَحُشِرَ لِسُلَيْمَٰنَ جُنُودُهُۥ مِنَ ٱلْجِنِّ وَٱلْإِنسِ وَٱلطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿١٧﴾ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَتَوْا۟ عَلَىٰ وَادِ ٱلنَّمْلِ قَالَتْ

نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾ (نمل)

''سلیمانؑ داوٗدؑ کے وارث بنے، اور کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی زبان سکھائی گئی ہے، اور ہر قسم کی نعمت عطا ہوئی ہے، یہ ایک عظیم اور واضح فضل و بخشش ہے، اور سلیمانؑ کا لشکر جنوں، انسانوں اور پرندوں میں سے نظم و ضبط کے ساتھ اسکے پاس حاضر ہوا، یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹے نے کہا، اے چیونٹیو! تم سب کی سب اپنے بلوں میں پلٹ جاؤ، کہیں سلیمانؑ اور ان کا لشکر بے خبری میں تمہیں روند نہ ڈالیں۔ سلیمانؑ چیونٹے کی بات سن کر ہنس پڑے اور کہا، پروردگار مجھے توفیق عطا فرما کہ میں اس نعمت کا جو تو نے مجھے اور میرے باپ کو عطا کی ہے، شکر بجالاؤں''

اب اگر ''ہدہد'' کی داستان کو جو حضرت سلیمانؑ کی طرف سے ان کا پیغام ملکہ سبا تک پہنچانے کیلئے مامور ہوا تھا، قرآن میں مطالعہ کریں، تو سلیمانؑ کی قدرت غیبی پر انگشت بدنداں ہو جائیں گے، اس بناء پر ہم چاہتے ہیں کہ آپ سورۂ نمل کی آیہ ۲۰، ۲۴ کا مطالعہ کریں اور ان آیات کے نکات میں غور و فکر کریں۔

حضرت سلیمانؑ قرآن کی تصریح کے مطابق تسلط غیبی رکھتے تھے، اور ہوا انکے فرمان اور انکی خواہش کے مطابق چلتی تھی جیسا کہ اللہ فرماتا ہے:

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾ (انبیاء)

''ہم نے سخت اور تیزی کے ساتھ چلنے والی ہوا کو سلیمانؑ کے لئے رام کر دیا تھا جو اس کے فرمان سے اس زمین کی طرف جسے ہم نے برکت دی ہے، چلتی ہے، اور ہم ہر چیز کو جانتے تھے''

قابل توجہ نکتہ ''تجری بامرہ'' ہے، جو یہ بتاتا ہے کہ ہوا انکے حکم سے چلتی ہے۔

۴۔ مسیحؑ و سلطہ غیبی

آیات قرآنی کے مطالعہ سے حضرت مسیحؑ کی غیبی طاقت کو معلوم کیا جا سکتا ہے، ہم انکے مقام و حیثیت کی طرف اشارہ کیلئے ایک آیت

پیش کرتے ہیں۔قرآن حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اس طرح نقل کرتا ہے:

اَنِّیۡ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ۙ اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَهَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡهِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبۡرِئُ الۡاَکۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۹﴾ (آل عمران)

''مسیح نے ان سے کہا میں مٹی سے پرندہ کا مجسمہ بناتا ہوں، اور اس میں پھونک مارتا ہوں، تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ ہو جائے گا، اور مادرزاد اندھے کو اور برص کی بیماری والے کو خدا کے حکم سے شفاء دیتا ہوں، اور مردوں کو خدا کے حکم سے زندہ کرتا ہوں، اور جو کچھ تم نے کھایا ہے اور جو کچھ تم نے اپنے گھروں میں ذخیرہ کیا ہے، تمہیں اس کی خبر دیتا ہوں، ان کاموں میں تمہارے لئے حجت اور میری حقانیت کی نشانی ہے، اگر تم اہل ایمان ہو''

اگر مسیح اپنے کاموں کو اذن خدا سے وابستہ کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی پیغمبر بھی اذن خدا کے بغیر اس قسم کے تصرف کا حامل نہیں ہوتا جیسا کہ اللہ فرماتا ہے:

وَمَا کَانَ لِرَسُوۡلٍ اَنۡ یَّاۡتِیَ بِاٰیَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ (رعد ۳۸)

''کوئی رسول اذن خدا کے بغیر معجزہ نہیں لا سکتا''

اس کے باوجود حضرت عیسیٰؑ غیبی کاموں کی اپنی طرف نسبت دیتے ہیں اور کہتے ہیں، میں شفاء بخشتا ہوں، میں زندہ کرتا ہوں، میں خبر دیتا ہوں، جیسا کہ ''ابرئ''۔''احی'' اور ''انبئکم'' کے جملے۔ جو سب کے سب متکلم کے صیغے ہیں۔ اس مطلب پر دلالت کرتے ہیں۔

یہ صرف یوسفؑ و موسیٰؑ و سلیمانؑ و مسیح ہی نہیں ہیں، جو قدرت غیبی اور مافوق طبیعت تسلط کے حامل تھے، بلکہ پیغمبروں [۱] اور فرشتوں کا ایک گروہ غیبی تسلط کا حامل رہا ہے اور ہے۔ قرآن جبرئیلؑ کے بارے میں ''شدید القویٰ [۲]'' اور فرشتوں کے بارے میں ''فالمدبرات امرا'' [۳] کی تعبیر لاتا ہے۔

---

[۱] انبیاء کرامؑ اور اولیاء کے غیبی تسلط کے بارے میں ایک مستقل رسالہ کی ضرورت ہے، اور ہم نے اس کے بارے میں کتاب ''نیروی معنوی پیامبران'' میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے، اور یہ کتاب ۱۳۵۶ء میں جیبی سائز میں چھپ چکی ہے۔

[۲] نجم۔۵

[۳] نازعات۔۵

فرشتوں کا قرآن میں مدبرین امور عالم، ارواح کے قبض کرنے والے، انسانوں کے محافظ، نگہبان، اعمال کے لکھنے والے اور عاصی و نافرمان اقوام و ملل کو نابود کرنے والے و۔۔۔۔۔۔۔۔ کے ساتھ تعارف کرایا گیا ہے، اور جو شخص بھی قرآنی الف، ب سے آشنائی رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ فرشتے غیبی طاقتوں اور قدرتوں کے حامل ہیں، اور وہ اذن خدا اور اس کی قدرت پر تکیہ کرتے ہوئے خارق العادت امور کو انجام دیتے ہیں۔

اگر تسلط غیبی کے اعتقاد سے طرف مقابل کی اُلوہیت لازم آتی ہے، تو پھر قرآن کی رو سے ان سب کو الہ اور خدا ماننا پڑے گا۔

راہ حل وہی ہے جو بیان ہو چکا ہے اور وہ یہ ہے کہ قدرت استقلالی اور قدرت اکتسابی میں فرق کا قائل ہونا چاہیے جب کہ قدرت اکتسابی کا اعتقاد ہر عمل کے بارے میں توحید کا متن ہے۔

۷۔ کیا خارق العادہ کاموں کی درخواست کرنا شرک ہے؟

عدم سے وجود میں آنے والی ہر چیز ''علت و معلول'' کے قانون کے مطابق اپنی کوئی نہ کوئی علت رکھتی ہے، جس کا وجود اس علت کے بغیر ممکن نہیں ہے، نتیجہ کے طور پر کوئی بھی وجود میں آنے والی چیز علت کے بغیر نہیں ہوتی۔

اولیاء اور پیغمبروں کے کرامات اور معجزات بھی علت کے بغیر نہیں ہوتے، زیادہ سے زیادہ یہ بات ہے کہ انکی کوئی مادی اور طبیعی علت نہیں ہوتی۔ اور یہ اس سے الگ بات ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ان کے لئے علت نہیں ہے۔

اگر موسیٰؑ کا عصا اژدھا بن جاتا ہے، اور مردے عیسیٰؑ کے ذریعہ زندہ ہو جاتے ہیں، اور چاند پیغمبر اکرمؐ کے ذریعہ دو ٹکڑے ہو جاتا ہے اور سنگریزے رسول خداؐ کے ہاتھ میں تسبیح پڑھنے لگتے ہیں و...................تو ان میں سے کوئی بھی بات علت کے بغیر نہیں ہے، البتہ یہ اور بات ہے کہ ان موارد میں کوئی ایسی علت نہیں ہوتی جو علت طبیعی یا علت مادی کے طور پر پہچان لی گئی ہو، نہ یہ کہ بنیادی طور پر انکی کوئی علت ہی نہیں ہوتی۔

کبھی یہ تصور کیا جاتا ہے کہ طبیعی اور مادی کاموں کی کسی سے درخواست کرنا تو شرک نہیں، لیکن خارق عادت کاموں کی درخواست کرنا شرک ہے، اب ہم اس نظریہ کی بھی تحقیق و جستجو کر لیتے ہیں۔

جواب

قرآن کئی ایسے واقعات بیان کرتا ہے جہاں پیغمبروں سے، یا دوسرے افراد سے، بہت سے ایسے خارق العادت کاموں کی درخواست ہوئی ہے، جو مادی اور طبیعی قوانین کی حدود سے باہر ہیں، اور قرآن اس درخواست کو، اس کے تنقید کئے بغیر نقل کرتا ہے، مثلاً موسیٰؑ کی قوم نے۔ قرآن کی تصریح کے مطابق۔ موسیٰؑ کی طرف رُخ کر کے ان سے پانی اور بارش کی درخواست کی تا کہ خشک سالی کی تنگی سے نجات حاصل کریں۔ جب کہ اللہ فرماتا ہے:

وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى اِذِ اسۡتَسۡقٰٮهُ قَوۡمُهٗۤ اَنِ اضۡرِبْ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ ۚ

(اعراف ۱۶۰)

''جب موسیٰؑ کی قوم نے ان سے پانی مانگا تو ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ اپنا عصا زمین پر مارو......''[1]

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ زندہ شخص سے خارق عادت فعل کی درخواست میں تو اعتراض کی کوئی بات نہیں ہے، لیکن کسی مردے سے اس قسم کے کام کی درخواست کرنے پر اعتراض ہے تو اس کا جواب واضح ہے، کیونکہ موت وحیات سے ایسے عمل میں، جو اصل توحید کے مطابق ہے، کوئی فرق نہیں پڑتا، اس طور پر کہ ایک کو شرک اور دوسرے کو عین توحید قرار دے دیا جائے۔

سلیمانؑ بلقیس کا تخت منگواتے ہیں

حضرت سلیمانؑ نے، تخت بلقیس کو حاضر کرنے کیلئے اپنی مجلس کے حاضرین سے خارق العادت کام کی درخواست کی اور کہا:

اَيُّكُمۡ يَاۡتِيۡنِىۡ بِعَرۡشِهَا قَبۡلَ اَنۡ يَّاۡتُوۡنِىۡ مُسۡلِمِيۡنَ ۝۳۸ قَالَ عِفۡرِيۡتٌ مِّنَ الۡجِنِّ اَنَا اٰتِيۡكَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ تَقُوۡمَ مِنۡ مَّقَامِكَ ۚ (نمل ۳۸۔۳۹)

''پاس پہنچیں، لے آئے، گروہ جنات میں سے ایک نے کہا، میں اسے تیرے پاس اس سے پہلے لے آؤں گا، کہ تو اپنی جگہ سے اٹھے (دربار برخاست ہو)''

اگر اس قسم کا نظریہ صحیح ہو تو پھر تمام اعصار وقرون میں نبوت کا دعویٰ کرنے والوں سے معجزہ کی درخواست کرنا کفر وشرک محسوب ہونا چاہیے، کیونکہ لوگ معجزہ کو۔ جو ایک خارق العادہ کام ہے۔ مدعی نبوت سے طلب کرتے ہیں، نہ کہ اس کے بھیجنے والے خدا سے، اور وہ اس طرح کہا کرتے تھے۔

اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ فَاۡتِ بِهَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ۝۱۰۶ (اعراف)

''اگر تو سچ کہتا ہے تو کوئی معجزہ دکھا''

درآنحالیکہ تمام ملل واقوام سچے نبی کی جھوٹے مدعی نبوت سے پہچان کیلئے یہی طریقہ اختیار کیا کرتے تھے، اور پیغمبر ہمیشہ دنیا کی تمام ملل واقوام کو دعوت دیتے تھے کہ وہ آئیں اور انکے معجزہ کو دیکھیں، اور اس کا مشاہدہ کریں، اور قرآن بھی اقوام وملل کی پیغمبروں سے معجزہ طلب کرنے کی درخواست کی گفتگو کو۔ کسی انکار کے بغیر، جو اس کے قبول کرنے کی ترجمان ہے۔ نقل کرتا ہے۔

اگر کوئی قوم جستجو کرتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ کی بارگاہ میں پہنچ جائے اور یہ کہے کہ اگر آپ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں تو اس نابینا یا برص کی

---

[1] سورہ بقرہ کی آیہ ۶۰ کی طرف رجوع کریں۔

بیماری میں مبتلا شخص کو شفا بخش دیں، تو وہ نہ صرف یہ کہ مشرک نہیں ہوگا بلکہ وہ حقیقت کے متلاشیوں میں سے شمار ہوگا اور اس کی اس بات پر تعریف کی جائے گی، اب اگر حضرت عیسیٰؑ کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد ان کی امت انکی روح پاک سے یہ استدعا کرے کہ انکے دوسرے بیمار کو شفاء بخشیں، تو اسے مشرک کیوں سمجھا جائے گا، اور گذشتہ بحث میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ طرف مسئول (جس سے درخواست کی جا رہی ہے) کی موت وحیات شرک وتوحید میں موثر نہیں ہے، [1]

جواب کا خلاصہ

یہاں تک کے بیان سے واضح ہوگیا ہے کہ قرآن کی تصریح کے مطابق خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے ایک گروہ خارق عادت امور کی انجام کی قدرت رکھتا تھا، اور کئی موارد میں اس قدرت سے استفادہ کیا کرتا تھا، اور کئی افراد ان سے رجوع کر کے ان سے درخواست کرتے تھے کہ اس قدرت سے استفادہ کریں، اب اگر وہابی یہ کہتا ہے کہ کوئی شخص خدا کے علاوہ اس کام کی انجام دہی پر قادر نہیں ہے تو اس صورت میں یہ آیات اس کے برخلاف گواہی دیتی ہیں۔

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ اس طریقہ سے کسی کام کی درخواست کرنا شرک ہے، تو پھر حضرت سلیمانؑ اور دوسروں نے اس قسم کی درخواست کیوں کی، اگر وہ یہ کہتا ہے کہ اولیاء سے بطور خارق عبادت حاجت کی درخواست کرنے سے، تسلط غیبی کا اعتقاد لازم آتا ہے، تو اس کا جواب گذشتہ گفتگو کے حصوں میں سے ایک حصہ میں بیان ہو چکا ہے، اور یہ کہا گیا ہے کہ تسلط غیبی کا اعتقاد دو طرح کا ہے ایک عین توحید اور دوسرا شرک کا باعث ہے۔

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ زندہ اولیاء سے کرامات کی درخواست پر کوئی اعتراض نہیں، اعتراض مرے ہوئے افراد کے بارے میں ہے، تو اس کا جواب وہی ہے جو اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ موت وحیات شرک وتوحید کا سبب نہیں ہے۔

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ شفائے بیمار اور ادائیگی قرض کی دعا غیر عادی طور پر خدا کے کام کی درخواست ہے غیر خدا سے تو پہلے بیان ہو چکا ہے کہ شرک کا سبب یہ ہے کہ ہم مسئول کو خدا یا خدائی کا مبدأ سمجھیں، اور غیر طبعی کام کی درخواست، غیر خدا سے خدائی کام کی درخواست نہیں ہے، کیونکہ یہ خدائی کام کی میزان نہیں ہے کہ وہ عادی قوانین کے حدود سے برتر و بالا ہوں، تا کہ اس قسم کی درخواستیں اس کے بندے سے اسکے کام کی درخواست ہو جائے، بلکہ خدا کے کام کی میزان یہ ہے کہ فاعل اس کی انجام دہی میں مستقل ہو، اور اگر کوئی فاعل خدائی قوت وطاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے کسی کام کو انجام دے تو پھر اس قسم کے کام کی درخواست غیر خدا سے کار خدا کی درخواست نہیں ہوگی چاہے وہ کام عادی ہو یا غیر عادی اور ہم اس مطلب کی تکمیل کیلئے خاص طور سے شفاء کی درخواست کے سلسلہ میں بحث کریں گے۔

کبھی یہ تصور ہوتا ہے کہ اولیاء سے شفاء اور اس سے مشابہ کاموں کی درخواست، غیر خدا سے خدائی کام کی درخواست ہے اور ہم نے

---

[1] حضرت عیسیٰؑ کے معجزات سے آگاہی کے لئے آل عمران۔ ۴۹۔ مائدہ۔ ۱۰۰، و ۱۱۰ کی طرف رجوع کریں۔

اس سے پہلے یہ بیان کیا ہے کہ اس کے غیر سے خدائی کاموں کی درخواست شرک اور دوبینی کا سبب ہے کیونکہ اس صورت میں ہم نے مسئول کو خدائی کاموں کا مبدء سمجھا ہے،

جبکہ قران کہتا ہے:

وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ (شعراء)

''جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے''

اس کے باوجود ہم یہ کس طرح کہتے ہیں کہ اے پیغمبرؐ میرے بیمار کو شفاء دیجئے، اور اسی طرح سے وہ تمام درخواستیں ہیں جن میں خارق عادت ہونے کا پہلو موجود ہو۔

جواب

اس گروہ نے خدائی کاموں کو، بشری کاموں سے، الگ کر کے پہچانا نہیں ہے، اور انہوں نے یہ تصور کر لیا ہے کہ جو کام طبیعی طریقے سے باہر ہو اس کا نام تو خدائی کام رکھا جانا چاہیے، اور جو کام جنبہ طبیعی اور علت مادی رکھتا ہو، اس کو بشری کام جاننا چاہیے۔

اس گروہ نے یا تو چاہا نہیں ہے یا ان سے ہو نہیں سکا کہ وہ خدائی کام کی میزان کو، غیر خدائی کام سے الگ کر کے پہچان سکیں، اور بشری کاموں، اور الٰہی کاموں میں، کاموں کا عادی یا غیر عادی ہونا، ہرگز میزان نہیں ہے، ورنہ ریاضت کرنے والے مرتاضین کے کاموں کو خدائی کاموں کا نام دینا چاہیے، اور ان سب کو ''الھه'' سمجھنا چاہیے۔

بلکہ خدائی کاموں کی میزان وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ:

ہر وہ فاعل و عامل جو اپنے کام میں اپنے نفس پر تکیہ کئے ہوئے ہو، اور وہ اپنے غیر کی مدد طلب نہ کرتا ہو، تو اس قسم کے آدمی کا کام خدائی کام ہے لیکن وہ عامل جو اپنے کام کو خدائی قدرت کے سایے میں انجام دے، تو اس کا کام غیر خدائی کام ہے، چاہے وہ کام عادی جنبہ رکھتا ہو یا وہ عادی کاموں میں سے نہ ہو،

بشر جس کام کی انجام دہی میں، چاہے وہ عادی ہو یا وہ عادی کاموں میں سے نہ ہو، خدا پر تکیہ کئے ہوئے ہو، اور اس کی قدرت سے مدد طلب کرتا ہو، اور جس کام کو بھی انجام دیتا ہو اس قوت وقدرت سے انجام دیتا ہو جو اس نے خدا سے حاصل کی ہے۔ اس صورت میں اس قسم کی قدرت کا حامل ہونا یا مقاصد کے انجام دینے میں اسے کام میں لانا یا کام میں لانے کی اس سے درخواست کرنا، ان میں سے کوئی سی چیز بھی شرک کا سبب نہیں بن سکتی، کیونکہ ان تمام مراحل میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ قدرت خدا نے اس کو دی ہے اور اس کو اجازت اور حکم دیا ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔

استاد بزرگوار حضرت آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی دامت برکاتہ، خدائی کام کو غیر خدائی کام سے الگ کر کے پہچاننے کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں:

خدائی کام اسے کہتے ہیں جب فاعل اپنے غیر کی دخالت کے بغیر اور کسی دوسری قوت سے مدد طلب کئے بغیر اپنے کام کو انجام دے۔ دوسرے لفظوں میں، خدائی کام وہ ہے جس کے کرنے والا اسکے کرنے میں مستقل و تام اور دوسرے سے بے نیاز ہو اور غیر خدائی کام ٹھیک اس کا نقطہ مقابل ہے۔

خداوند عالم خلق کرتا ہے، روزی دیتا ہے، صحت و شفاء بخشتا ہے، اس کے کام کسی دوسری قوت سے مدد لئے بغیر صورت پذیر ہوتے ہیں، اور کوئی شخص بھی اس کے کاموں میں کلی یا جزوی دخل نہیں رکھتا اور اس کی قدرت و قوت کسی غیر سے کسب شدہ نہیں ہے، لیکن اگر غیر خدا کوئی کام انجام دے، چاہے وہ عادی اور آسان ہو یا غیر عادی اور مشکل، اس کی قوت خود اس کی نہیں ہوتی، اور وہ خود اپنی قدرت سے اسے انجام نہیں دیتا۔

زیادہ واضح عبارت میں: جب ہم کسی موجود کے بارے میں وجود یا تاثیر کے لحاظ سے استقلال کے قائل ہو جائیں تو ہم جادہ توحید سے منحرف ہو جائیں گے۔ کیونکہ کسی شے کی اصل ہستی میں استقلال کا اعتقاد رکھنا، ہستی و وجود میں اس کے خدا سے بے نیاز ہونے کے مساوی ہے اور اس قسم کا وجود جو اپنے وجود و ہستی میں کسی کا محتاج نہ ہو اور اس کا وجود خود اسی کے ساتھ مربوط ہو۔ سوائے خدا کے اور کوئی نہیں ہے۔

اسی طرح اگر ہم اس کے وجود کو خدائی مخلوق جانیں لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہو کہ اس عالم کے امور یا بندوں کے امور اسے تفویض ہوئے ہیں، اور وہ انکی تدبیر میں اپنی طرف سے استقلال رکھتا ہے تو اس صورت میں بھی ہم مشرک ہوں گے۔

زمانہ جاہلیت میں اور طلوع اسلام کے وقت تک بہت سے مشرکین کا عقیدہ یہی تھا، وہ اس بات کے معتقد تھے کہ فرشتے یا ستارے جو مخلوق ہیں، مدبر عالم تھے [1] یا کم سے کم خدائی کاموں کا ایک حصہ مثلاً شفاعت و مغفرت انکے سپرد کی گئی ہے اور وہ ان کاموں میں مکمل استقلال رکھتے ہیں۔

معتزلہ کا ایک گروہ جو انسان کو ہستی و وجود کے لحاظ سے خدا کی مخلوق سمجھتے ہیں، لیکن تاثیر اور انجام کار کے مقام میں اس کے لئے استقلال کے قائل ہیں، اگر وہ اپنی بات میں اچھی طرح سے غور و فکر کریں تو وہ دیکھیں گے کہ اس قسم کا عقیدہ ایک طرح سے شرک خفی ہے جس سے وہ غافل ہیں اگرچہ وہ مشرکین جیسا شرک نہیں ہے۔ ان دونوں قسم کے شرک کا فرق بہت ہی واضح ہے، ان میں سے ایک تو امور جہاں کی تدبیر اور خدائی کاموں میں استقلال کا مدعی ہے اور دوسرا انسان کے اپنے کاموں میں مستقل ہونے کا دعویدار ہے۔

ابن تیمیہ سے ایک سوال

اب ہم ابن تیمیہ اور انکے پیروکاروں سے سوال کرتے ہیں کہ تمہارا اس جملہ سے۔ کہ: ''کسی شخص سے ایسے مطلب کی درخواست

---

[1] جب عمر بن لحی نے بتوں کی پرستش کی وجہ پوچھی، تو شام کے لوگوں نے یہ کہا کہ اس سے بارش کا مطالبہ کرتے ہیں تو وہ ہمارے لئے بارش برسا دیتے ہیں، مدد مانگتے ہیں تو مدد کرتے ہیں اور وہ اسی عقیدہ کے ساتھ ہبل بت کو اپنے ہمراہ مکہ میں لایا۔ (سیرہ ابن ہشام ج ا ص ۷۷)

کرنا، جس پر خدا کے علاوہ اور کوئی قادر نہیں ہے، شرک ہے''۔ کیا مقصد ہے؟

کیا اس سے مقصود یہ ہے کہ ''کوئی شخص پیغمبروں اور اولیاء کی ارواح سے کسی حاجت کی درخواست کرنے اور انہیں اس کام کے انجام دینے میں خود اپنے او پر بھروسہ کرنے والا سمجھے، اس صورت میں درخواست کرنے والے نے اس عمل کے ساتھ انکی عبادت کی ہے'' اگر مقصود یہی ہے تو ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہ بات ہے تو صحیح لیکن کوئی بھی مسلمان اس قسم کے نظریہ اور اعتقاد کے ساتھ اولیاء الٰہی سے کسی چیز کی درخواست نہیں کرتا، آپ سارے عالم اسلام میں۔ جو اولیاء الٰہی کے لئے احترام کے قائل ہیں اور انکے مشاہدہ اور مقابر اور آثار کو محترم سمجھتے ہیں، گھوم پھر کر دیکھیئے اور ان سے پوچھیئے اور کہیے کہ اولیاء خدا سے حاجت طلب کرنے سے تمہارا مقصد کیا ہے؟ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ ان مراتب کے اختلاف کے باوجود، جو وہ اولیاء خدا کے مقام کو سمجھنے میں رکھتے ہیں، ذیل میں بیان کردہ دو جوابوں میں سے کوئی سا ایک جواب دیں گے۔

وہ یہی کہیں گے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ولی الٰہی کی روح مقدس دعا کرے، کہ خدا ہمارے فرزند کو شفا دے، ہمارے قرض کو ادا کر دے و............ جس طرح ان کی زندگی میں ان سے درخواست کیا کرتے تھے،

وہ لوگ جو ولایت کے مقام بلند سے زیادہ آگاہ ہیں وہ یہ کہیں گے کہ اولیاء خدا کو، عبودیت و بندگی کی راہ طے کرنے کی بناء پر خدا کی طرف سے کمالات، قدرتوں اور الطاف کا ایسا فیض پہنچتا ہے کہ وہ جہان اور انسان میں مصالح کے مطابق اذن خدا سے تصرف کر سکتے ہیں، جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ، آصف بن برخیا اور حضرت سلیمانؑ کچھ تصرفات دکھاتے تھے، اس بناء پر ہم چاہتے ہیں کہ وہ اس روحانی قوت و طاقت سے استفادہ کرتے ہوئے اذن خدا سے ہمارے بیمار کو شفا دیں، ہمارے گمشدہ واپس لوٹا دیں، ہمارا قرض ادا کر دیں و................. جس طرح ہم یہ درخواستیں ان بندگان والا مقام سے انکی زندگی میں کیا کرتے تھے۔

یہ دو قسم کی تفسیریں ساری دنیا کے مسلمانوں کے توسلات کے لئے موجود ہیں اور کوئی باخبر اور صاحب ایمان مسلمان کسی تیسرے نظریہ کو جس کا وہابی طالب ہے، بیان نہیں کرتا۔

یہ بات کہ ولی خدا حالت حیات وموت میں غیر عادی کاموں کا مبدأ قرار پائے اور اپنے کام میں قدرت الٰہی سے استفادہ کرے، نہ صرف یہ کہ شرک نہیں ہے بلکہ اس کا اعتقاد رکھنا، اولیاء خدا کے مقامات بلند کے اعتقاد کا لازمہ ہے۔

یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر اولیاء خدا اذن خدا سے بیماروں کو شفا دینے کی قدرت رکھتے ہیں تو پھر خدا بیماروں کو شفا دینے کو اپنے ساتھ مختص کیوں کرتا ہے، اور یہ کیوں فرماتا ہے: ''وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ اب اس مطلب کی وضاحت:

عالمِ آفرینش سازمان یافتہ ہے

اس میں شک نہیں ہے کہ عالم خلقت وآفرینش ایک سازمان یافتہ عالم ہے اور اصطلاح کے مطابق ''سسٹمیٹک'' ہے اور عالم وجود میں آنے والی تمام چیزیں اور خلقت کے سارے حادثات کا سرچشمہ وہ علل واسباب ہیں جو خدا کی مخلوق ومعلول ہیں۔

چونکہ یہ سارے کے سارے عوامل اور علل ذاتی طور پر کسی قسم کا کمال وہستی نہیں رکھتے اور انہوں نے قدرت خدا کے سایہ میں ہستی ووجود

حاصل کیا ہے، اور قدرت و طاقت پیدا کی ہے، (اس بناء پر) انکے افعال وآثار کی خدا کی طرف بھی نسبت دی جاسکتی ہے۔

کسی تجارتی ادارے میں کام کرنے والے جو ایک رئیس کے زیر نگرانی کام کرتے ہیں اور تمام جہات میں اسی سے ہدایات لیتے ہیں، اگر وہ کسی کام کو اس کے حکم کے مطابق انجام دیں تو وہ کام تو اگر چہ کام کرنے والے کا ہی ہے مگر وہ رئیس کا کام بھی کہلائے گا کیونکہ فرض یہ ہے کہ انکے حرکات وسکنات اسی کے حکم وفرمان کے مطابق ہیں اور اگر وہ نہ کہتا تو ہرگز کوئی کام بھی نہ ہوتا، اگر چہ یہ مثال ہمارے موضوع سے کوسوں دور ہے، لیکن موضوع بحث پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈال سکتی ہے۔

قرآن مجید عالم ہستی کیلئے کچھ مدبرین کا تعارف کراتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ﴿۵﴾ (نازعات)

''ان کی قسم جو امور جہاں کی تدبیر کرتے ہیں''

قرآن خدا کے عرش کیلئے کہ سارے کا سارا عالم ہستی ہی اس کی قدرت کا عرش ہے۔ کچھ حاملین کا تعارف کراتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (مومن ۷)

''وہ حاملین عرش ہیں، اور وہ جو اس کے اطراف میں قرار پائے ہیں، خدا کی حمد وستائش اور ہر طرح کے نقص وعیب سے اس کی پاکی بیان کرتے ہیں''

قرآن مجید خطاء اور خطرے سے انسان کو بچانے کیلئے کچھ نگہبانوں اور محافظین کا تعارف کراتا ہے:

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (انعام ۶۱)

''وہی صاحب اقتدار اور بندوں سے مافوق ہے، اور وہی تمہارے لئے نگہبان مقرر کرتا ہے، یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے اس کی جان قبض کر لیتے ہیں''

ان آیات اور اسی طرح دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائی کام آ گاہ اسباب وعوامل، مثلاً فرشتے یا غیر آ گاہ عوامل واسباب، مثلاً عوامل طبیعی کے بغیر انجام نہیں پاتے۔

ان آیات کے مقابلہ میں، کچھ دوسری آیات بھی ہیں جو جہانِ خلقت میں جاری تمام امور، مثلاً خلق کرنے، رزق دینے اور امور آفرینش کی خلقت وتدبیر کو خدا کی طرف سے سمجھتی ہیں، یعنی:

ان میں صرف خدا ہی جہان آفرینش کا تنہا مدبر معرفی ہوا ہے، اور جہان آفرینش کی تدبیر کو حق تعالی کا فعل ظاہر کیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (یونس ۳)

''عرش قدرت پر مسلط ہوکر امور خلقت کی وہی تدبیر کرتا ہے''

آیات کے ان دونوں گروہوں کے درمیان جمع کا راستہ۔ جنکے نظائر قرآن میں بہت زیادہ ہیں۔ وہی ہے، جسے بیان کیا جا چکا ہے، کہ ایک ہی فعل جسے ''تدبیر'' کہتے ہیں، جہاں فرشتوں اور دوسری مقرر کردہ قوتوں کا کام ہے، وہاں ساتھ ہی ساتھ خدا کا کام بھی ہے، اگر وہ تدبیر کا کام بطور مباشرت انجام دیتے ہیں تو خدا اسباب انگیزی کے طور پر ان عوامل کو پیدا کرکے اور قدرت عطا کرکے، انہیں انجام دیتا ہے۔

اس بناء پر یہ صحیح ہے کہ فرشتوں کو جہان آفرینش کا مدبر کہا جائے لیکن اس کے باوجود خدا بھی مدبر ہے بلکہ واقعی وحقیقی مدبر وہی ہے اور دوسرے عوامل اس کے دستور وفرمان کے مطابق تدبیر کے کام میں مشغول ہیں۔

دوسرے لفظوں میں چونکہ یہ آ گاہ اور غیر آ گاہ عوامل واسباب، وجود وتاثیر اور کیفیت کار میں اپنی طرف سے کوئی استقلال نہیں رکھتے اور یہ سب کے سب خدا کے اذن اور اس کے فرمان سے کام میں مشغول ہیں اور اپنا وظیفہ اور ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں، لہذا قہراان کا کام خدا ہی کا کام ہے، اور خدا کی طرف فعل کی نسبت، مجاز کے شائبہ کے بغیر صحیح ہوگی۔

ہم مشرک تو تب ہوں گے، اگر ہم ان عوامل کے لئے وجود میں یا تاثیر میں کسی استقلال کے اور خلاصہ یہ کہ ہم انکے کام اور پروگرام میں کسی قسم کی خودمختاری کے قائل ہوجائیں جیسا کہ عرب بت پرست فرشتوں، ستاروں یا جنوں کے بارے میں یہی خیال رکھتے تھے۔

اس بیان سے انسان کے سامنے معارف کا ایک باب کھل جاتا ہے اور آیات کے بہت سے مشکلات حل ہوجاتے ہیں، مثلاً قرآن پوری تاکید کے ساتھ خدا کو بندوں کا یکتا ویگانہ رازق بتاتا ہے اور فرماتا ہے:

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (یونس ۳۱)

''کہہ دے، کون ہے وہ جو تمہیں آسمان سے اور زمین سے روزی دیتا ہے''

ان تمام تاکیدوں کے باوجود جو قرآن اس بارے میں متعدد آیات میں کرتا ہے، ایک آیت میں اسی فعل کی اپنے بندوں کی طرف بھی نسبت دیتا ہے اور کہتا ہے:

وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاکْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝ (نساء۵)

''غلاموں کو روزی دو، انہیں لباس پہناؤ اور ان سے اچھی بات کرو''

یہی صرف ایک موقع نہیں ہے کہ خدا اپنے فعل کی دوسروں کی طرف بھی نسبت دے رہا ہے، بلکہ مارنا، شفاعت کرنا، غیب سے آ گاہی، ہدایت وغیرہ جو آیات قرآن کی تصریح کے مطابق، خدا کے ساتھ مختص افعال ہیں کئی موارد میں انکی فرشتوں، پیغمبروں اور دوسرے بندوں کی طرف بھی نسبت دی ہے اور تمام آیات کا مفاد ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ذکر شدہ افعال بطور استقلال تو خدا کے افعال ہیں اور غیر مستقل طور پر اور خدا کے اذن واجازت سے اس کے بندوں کے ہیں۔

اس بیان سے "و اذا مرضت فھو یشفین" والی آیت کا مفاد بھی واضح ہو جاتا ہے اور اس میں ہرگز منافات نہیں ہے کہ خدا بھی شافی ہو اور اس کے پیغمبر اور اولیاء بھی کیونکہ یہاں ایک فعل "شفا" سے زیادہ نہیں ہے، اس فعل کی تسبیبی طور پر نسبت تو خدا کی طرف ہے اور مباشرتی طور پر پیغمبر اور امام کی طرف منسوب ہے اور درحقیقت حقیقی اور واقعی شفا دینے والا وہی ہے۔

اس نے اپنے اولیاء کرام کو اس قسم کی طاقت وقوت بخشی ہے اور انہیں اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ خاص خاص موقعوں پر اس معنوی قدرت اور غذائی طاقت سے فائدہ اٹھایا کریں، قرآن اس بات کے باوجود کہ خدا کو واقعی شافی بتاتا ہے لیکن پھر بھی شہد کو شفا بخش جانتا ہے اور اس کے بارے میں فرماتا ہے:

فِيهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ط (نحل ۶۹)

"شہد میں لوگوں کیلئے شفاء ہے"

اور وہ یہ بھی فرماتا ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ لا (اسراء ۸۲)

"ہم قرآن سے مومنین کے لئے شفا اور رحمت نازل کرتے ہیں"

ان دونوں قسم کی آیات کے درمیان جمع کی راہ وہی ہے جو بیان ہو چکی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک ہی فعل ایک طرح سے خدا کی طرف اور دوسری طرح سے ان اسباب کی طرف جو اس نے پیدا کئے ہیں اور انہیں قدرت بخشی ہے منسوب ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس اصل کی طرف توجہ رکھتے ہوئے اولیاء خدا سے شفاء کی درخواست کسی معمولی سے معمولی دغدغہ اور شک کے بغیر جائز اور مشروع ہے اور یکتا پرستی کے اصول کے ساتھ مکمل طور پر موافق ہے۔

کیونکہ اولیاء خدا سے شفاء کی درخواست کرنے کا مقصد شہد اور دوسری نباتاتی اور کیمیائی دواؤں میں شفاء کے وجود کے اعتقاد کی ہے، فرق اتنا ہے کہ شہد اور دوسری دواؤں کا شفاء بخش ہونا خودکار اور انکے ارادہ واختیار سے باہر ہے جبکہ پیغمبر اور امام کی شفاء بخشی اختیار اور ارادے کے ساتھ ہے اور شفا طلبی کا ہدف ومقصد یہ ہے کہ ولی خدا اس قدرت کے ذریعہ جو خدا نے اسکے اختیار میں دی ہے استفادہ کرے اور حق تعالیٰ کے خاص اذن واجازت سے بیماری سے شفاء بخشے جس طرح سے عیسیٰ مسیح اذن الٰہی اور اس سے حاصل کردہ قدرت کے ذریعہ مشکل اور لا علاج بیماروں کو شفا بخشا کرتے تھے۔

اس قسم کی درخواست کو ہرگز شرک نہیں کہا جا سکتا، ہاں! اس اصل موضوع میں بحث وگفتگو ہو سکتی ہے کہ کیا خدا نے اس قسم کی قدرت و طاقت ولی کے اختیار میں رکھی ہے یا نہیں لیکن اس وقت جو مسئلہ ہمارے سامنے ہے وہ شرک وتوحید کا موضوع ہے، اولیاء خدا کی قدرتوں کا موضوع زیر بحث نہیں ہے بلکہ اس بارے میں ہم کسی دوسرے مقام پر بحث وگفتگو کریں گے۔

۸۔کیا شفاعت کی درخواست کرنا شرک در عبادت ہے؟

اس میں شک نہیں ہے کہ شفاعت خدا کا خاص حق ہے، بُرہان عقلی کے علاوہ جو اس بات پر گواہی ہے، قرآنی آیات بھی اس کی شاہد ہیں، مثلا:

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ (زمر ۴۴)

''کہ دے کہ حق شفاعت خدا ہی کیلئے ہے''

اس اصل کی طرف توجہ کے ساتھ ہی یہ یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ دوسری آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خدا نے یہ اجازت دی ہے کہ ایک گروہ اس حق سے استفادہ کرے اور خاص شرائط کے ماتحت شفاعت کریں یہاں تک کہ کچھ آیات میں چند ایک شفاعت کرنے والوں کے نام بھی لئے ہیں، مثلاً:

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ۝۲۶ (نجم)

''آسمان میں کتنے ہی فرشتے ایسے ہیں جن کی شفاعت کچھ کام نہ آئے گی مگر اسی وقت جب خدا کسی کو کسی کے بارے میں اذن دے اور راضی ہو''

پیغمبر گرامی اسلام علیہ الصلوٰۃ، قرآن کی تصریح کے مطابق، مقام محمود (شائستہ مقام) کے حامل ہیں جیسا کہ فرماتا ہے:

عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝۷۹ (اسراء)

''شاید تیرا پروردگار تجھے مقامِ محمود پر فائز کرے''

مفسرین اسلام روایات کے مطابق کہتے ہیں کہ مقامِ محمود سے مراد وہی مقام شفاعت ہے اور خدا نے آپؐ کو اس قسم کا مقام دیا ہے۔

یہاں تک تو اسلامی فرقوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، بحث اس بارے میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی ہستی سے جو مسلمہ طور سے مقام شفاعت کا حامل ہے، شفاعت کی درخواست کرے مثلا یہ کہے: اے پیغمبرؐ خدا آپ میرے حق میں شفاعت کیجیے تو کیا اس قسم کی درخواست شرک ہے یا نہیں۔

کیا اس میں کوئی فائدہ ہے یا یہ بے فائدہ ہے۔

اس قسم کی درخواست کے سودمند اور مفید ہونے کے بارے میں بحث کرنا ہمارے موضوع بحث سے باہر ہے۔ ابھی تو ہم توحید و شرک کی سرحدوں کی پہچان کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کسی عمل کے مفید ہونے کی پہچان یا مفید نہ ہونے کی پہچان کے درپے نہیں ہیں۔

توحید و شرک کی میزان کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو گذشتہ حصوں میں واضح طور پر بیان ہو چکی ہے اس قسم کی درخواست کا حکم واضح ہے۔

جس شخص سے ہم درخواستِ شفاعت کر رہے ہیں، اگر ہم اسے "الٰہ" اور ایک چھوٹا خدا سمجھیں اور یہ عقیدہ اختیار کر لیں کہ وہ اور ان جیسے افراد مقام شفاعت کے مالک ہیں اور خدا نے یہ حق انہیں تفویض کر دیا ہوا ہے کہ وہ جس شخص کے بارے میں چاہیں شفاعت کر لیں اور انہیں خدا کے اذن و اجازت کی کوئی احتیاج اور نیاز نہ ہو تو اس قسم کی درخواست کرنا قطعی طور پر انکی پرستش ہے اور درخواست کرنے والا مشرک ہو گا کیونکہ شفاعت ربوبی اور الٰہی مقام کے کاموں میں سے ہے اور خدائی کام کی دوسرے سے درخواست کرنا شرک ہوگا۔

لیکن اگر ہم انہیں خدا کی محدود مخلوق سمجھیں جو خدا کے خاص اذن اور اجازت سے ایک گروہ کی شفاعت کر سکتے ہیں اور پھر اس قید و شرط کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم ان سے شفاعت کی درخواست کریں تو مسلمہ طور پر اس قسم کی درخواست اور ایک عام عادی کام کی درخواست میں کوئی فرق نہیں ہوگا اور یہ عمل توحید کی سرحد سے باہر نہیں جائے گا۔

یہ تصور کہ ہمارا یہ عمل (اولیاء خدا سے شفاعت کی درخواست) ظاہری لحاظ سے مشرکین کے عمل سے مشابہت رکھتا ہے، جو اپنے بتوں سے شفاعت کی درخواست کیا کرتے تھے ایک بے بنیاد تصور ہے کیونکہ ظاہری مشابہت فیصلہ کی میزان نہیں ہوتی بلکہ فیصلہ کی بنیاد درخواست کرنے والے کی نیت اور ارادہ اور شفاعت کرنے والے کے بارے میں اس کے اعتقاد کی کیفیت ہے اور اولیاء خدا کے بارے میں ایک موحد کے اعتقاد کی کیفیت بتوں کے بارے میں ایک مشرک کے اعتقاد کے طریقہ سے کاملا مختلف ہے۔ اس حالت میں ان دونوں درخواستوں کا ایک دوسرے پر کیسے قیاس ہو سکتا ہے۔

اگر فیصلہ کی بنیاد ظاہری شباہت ہو تو پھر خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنا، حجر اسود پر ہاتھ رکھنا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا شرک کا سبب ہونے چاہیں، کیونکہ اس قسم کے اعمال میں ظاہری طور پر مشرکوں کے اعمال سے کوئی فرق نہیں ہے۔

وہابی اور شفاعت کی درخواست

لیکن وہابی گروہ اولیاء خدا سے شفاعت کی درخواست کرنے کو مطلقاً شرک سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ جو قرآن نے بت پرستوں کو مشرک کہا ہے اس کی علت یہ ہے کہ وہ بتوں کے سامنے نالہ و زاری کرتے ہوئے ان سے شفاعت کی درخواست کرتے تھے جیسا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللهِ ؕ (یونس ۱۸)

"وہ خدا کے علاوہ ایسے موجودات کی پرستش کیا کرتے تھے جو انہیں کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہنچاتے

تھے اور وہ یہ کہتے تھے کہ وہ خدا کے ہاں ہمارے شفیع ہیں''

اس بناء پر اولیا کا شفاعت کرنا تو حق اور ثابت ہے لیکن چونکہ ہر قسم کی شفاعت طلب کرنا یہاں تک کہ واقعی شفیعوں سے بھی انکی پرستش شمار ہوتی ہے۔ لہذا وہ جائز و مشروع نہیں ہے۔

اس سوال کے دو جواب ہو سکتے ہیں:

ا۔ یہ آیت انکے مقصود پر چھوٹی سے چھوٹی دلالت بھی نہیں رکھتی۔ اگر قرآن ذکر شدہ افراد کو مشرک جانتا ہے تو وہ اس لحاظ سے نہیں ہے کہ وہ بتوں سے شفاعت طلب کرتے تھی بلکہ ان کے مشرک ہونے کی علت یہ تھی کہ وہ انکی پرستش کرتے تھے تاکہ وہ آخر کار انکی شفاعت کریں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: بت پرست گروہ دو کام انجام دیتا تھا:

الف۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ بت بارگاہ الٰہی میں نفوذ رکھتے ہیں اور وہ یہ تصور کرتے تھے کہ وہ انکی عبادت و پرستش کے ذریعہ انکی رضا و خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں اور خدا اس حقیقت کو اسی آیت میں مذکورہ جملوں میں بیان کرتا ہے

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ

اور اسی وجہ سے وہ مشرک تھے۔

ب۔ چشم امید انکی طرف لگائے ہوئے ان سے شفاعت طلب کرتے تھے اور خدا نے اس حقیقت کو ذیل کے جملہ میں بیان کیا ہے:

وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ

آیت کے معنی میں غور کرنے سے، اور یہ کہ یہ بتوں کے بارے میں دو کام انجام دیتے تھے، واضح ہو جاتا ہے کہ انکے مشرک ہونے کی علت وہی بتوں کی پوجا کرنا تھی نہ کہ ان سے شفاعت چاہنا اور اگر بتوں سے شفاعت چاہنا ہی انکی پرستش تھی تو پھر کوئی وجہ نہیں تھی کہ (ویعبدون) کے جملہ کے علاوہ، **ویقولون............** جیسا جملہ لائے۔

چونکہ آیت میں دو جملوں کا ایک دوسرے پر عطف ہوا ہے، یہ اس بات کا ترجمان ہے کہ بتوں کی پرستش کا موضوع ان سے شفاعت چاہنے کے مسئلہ سے جدا ہے۔

ا۔ بتوں کی پرستش شرک اور دوگانہ پرستی کی نشانی ہے، جب کہ پتھر اور لکڑی سے شفاعت طلب کرنا احمقانہ اور علم و منطق سے دور عمل شمار ہوتا ہے۔

یہ آیت ہرگز یہ دلالت نہیں کرتی کہ بتوں سے شفاعت طلب کرنا انکی پرستش ہے، چہ جائیکہ حیّ اور زندہ اولیاء اور اس کی بارگاہ کے محترم بندوں سے شفاعت طلب کرنا انکی پرستش کی نشانی ہو۔

۲۔ اس سے قطع نظر ہمارے شفاعت طلب کرنے اور بت پرستوں کے شفاعت طلب کرنے کے درمیان واضح فرق ہے۔

وہ بتوں کو مقامِ شفاعت کا مالک سمجھتے تھے کہ وہ جس طرح سے چاہیں اور جس شخص کے بارے میں چاہیں شفاعت کر سکتے ہیں اور

اس قسم کی مالکیت کے اعتقاد کے ساتھ جو ایک قسم کا الوہیت کا اعتقاد ہے۔شفاعت کی درخواست شرک شمار ہوگی۔اسی لئے قرآن اس عقیدہ پر تنقید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ (زمر ۴۴)

''ساری کی ساری شفاعت خدا کے ساتھ مربوط ہے''

جب کہ مسلمان اپنے اولیاء کے بارے میں اس قسم کے مقام اور مالکیت کے معتقد نہیں ہیں اور وہ دن رات ہمیشہ ذیل کی آیہ کا ورد رکھتے ہیں:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ (بقرہ ۲۵۵)

''کون ہے جو خدا کے ہاں اس کے اذن کے بغیر شفاعت کرے''

اتنے واضح فرق کے ساتھ ان دونوں کا ایکدوسرے پر قیاس کرنا انصاف سے کتنا دور ہے۔

اب جبکہ شفاعت طلب کرنے کا مسئلہ واضح ہوگیا تو اب ضروری ہے کہ ہم اولیاء خدا سے مدد طلب کرنے کی بحث بھی کچھ کرلیں۔ اگرچہ یہ تمام فصلیں اور بحثیں ایک ہی قسم کا تجزیہ وتحلیل رکھتی ہیں لیکن علیحدہ علیحدہ بحث کرنے کی علت زیادہ سے زیادہ وضاحت ہے۔

کیا غیر خدا سے مدد طلب کرنا شرک ہے؟

عقلی دلائل اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ممکن کے تمام حالات وکوائف،اس کا وجود وہستی،اس کی قدرت وطاقت خدا ہی کی طرف سے ہیں۔جس طرح سے ممکن اپنے وجود میں خدا کا محتاج ہے،اسی طرح اپنے عمل اور کام کی انجام دہی میں بھی خدا کی قدرت سے بے نیاز نہیں ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان اپنے عمل اور کام میں مختار اور آزاد ہے لیکن وہ جس کام کو بھی انجام دے وہ اس قدرت کے زیر سایہ ہے جو ہر ہر لحہ خدا کی جانب سے اسے پہنچتی رہتی ہے۔اگر ایک لحہ کیلئے بھی فیض الٰہی اس سے منقطع ہوجائے تو وہ کسی کام کے انجام دینے پر قادر نہیں ہوگا۔

یہ صرف انسان ہی نہیں ہے جو اصل ہستی اور انجام کار میں خدا سے بے نیاز نہیں ہے بلکہ تمام عوامل واسباب طبیعی اصل وجود ہستی میں اور ہر عمل کے انجام دینے میں خدا کے محتاج ہیں اور اگر حق تعالی کی مدد اور کمک ایک لحہ کیلئے بھی اس سے منقطع ہوجائے تو عوامل طبیعی اپنے کام کو انجام دینے پر قادر نہیں رہیں گے۔

اس بناء پر صفحہ ہستی میں،موثر نام اور سب سے بے نیاز ہستی ایک سے زیادہ نہیں ہے اور وہ خدا کی ذاتِ اقدس ہے جو اپنی اور اپنی مخلوق کی قرآن میں اس طرح توصیف کرتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ⑮ (فاطر)

''اے لوگو! تم سب خدا کے محتاج ہو اور خدا بے نیاز اور لائق حمد وستائش ہے''

یعنی خدا کے سوا تم سب کے سب ہی فقیر، نیاز منداور محتاج ہو اور عالم ہستی میں کوئی بھی عامل چاہے جتنا بھی قوی اور طاقتور اور ہمارے منظومہ شمسی کے کئی ہزار سورج کے برابر طاقت وقدرت رکھتا ہو۔ پھر بھی وہ خدا کا نیاز منداور محتاج ہے اور اس کی قدرت کے بغیر کوئی کام انجام نہیں دے سکتا۔

اس بیان سے واضح وروشن ہوجاتا ہے کہ صفحہ ہستی پر ایک سے زیادہ حقیقی معین و مددگار نہیں ہے اور اس بناء پر کہ سب کے سب فقیر بالذات ہیں۔لہذا اس پر تکیہ کیئے بغیر اعانت و مدد ممکن ہی نہیں ہے۔

اورکوئی بھی شخص اس کے اذن کے بغیر اوراس کی قدرت سے مدد طلب کئے بغیر کسی کام کو انجام نہیں دے سکتا اور کوئی بھی موجود اس کے ارادہ کے نفوذ میں مانع نہیں ہوسکتا۔

ذیل کی آیت اوراس سے مشابہ آیات اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں:

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُکُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِکُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِکُمْ رَحْمَةً ؕ وَلَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴿۱۷﴾ (احزاب)

کہہ دے کہ اگر خدا تمہارے بارے میں عذاب کا ارادہ کرے تو کون ہے جو تمہیں اس کے عذاب سے محفوظ رکھے یا اگر وہ رحمت کا ارادہ کرے (توکون مانع ہے) وہ ایسے موقع پر اپنے لئے خدا کے علاوہ اور کسی کو ولی وناصر نہ پائیں گے''

غیر خدا سے مدد

غیر خدا سے استعانت اور مدد دوطرح سے ممکن ہے۔

۱۔ کسی عامل سے، چاہے وہ طبیعی ہو یا غیر طبیعی، ہم اس لحاظ سے مدد لیتے ہیں کہ اس کی ذات اوراس کا فعل خدا کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اوراس نے ہی اسے یہ اثر دیا ہے کہ بعض موارد میں وہ بندوں کی مشکلات کو رفع کرے اور حقیقت میں غیر خدا سے اس قسم کی مدد طلب کرنا، خدا سے مدد طلب کرنے سے الگ اور جدا نہیں ہے، کیونکہ اسی نے یہ قدرت اس کو عطا کی ہے اور جس وقت وہ چاہے اسے واپس لے سکتا ہے۔

اگر ایک موحد اور خدا شناس کسان سورج، پانی، ہل چلانے اور کیمیائی کھاد سے مدد لیتا ہے تو حقیقت میں وہ خدا سے مدد حاصل کررہا ہوتا ہے کیونکہ اسی نے ان عوامل کو یہ قدرت وطاقت عطا کی ہے کہ جس سے وہ دانوں کی پرورش کرسکتے ہیں اور انہیں حد کمال تک پہنچا سکتے ہیں۔

۲۔ کسی انسان یا عامل طبیعی سے ہم مدد طلب کریں اوراس کو وجود ہستی میں یا کم ازکم ایجاد اور مدد کرنے میں مستقل خیال کرتے ہوئے اسے خدا سے بے نیاز سمجھ لیں اور ہم یہ عقیدہ اپنالیں کہ وہ خدا سے مدد طلب کئے بغیر اوراس کے اذن واجازت کے بغیر ہی ہماری مدد کرسکتا ہے

اور ہماری سرنوشت اس کے ہاتھ میں ہے اور ہمارا کام اس کے سپرد کیا ہوا ہے، اسی قسم کی استعانت اور طلب امداد شرک اور ان آیات کے ساتھ جو استعانت کو خدا کی ذات اقدس میں منحصر قرار دیتی ہیں مخالف ہے۔

''المنار'' کا مؤلف اس حقیقت کے بیان کرنے میں اشتباہ اور غلط فہمی سے دوچار ہوا ہے اور اس نے یہ تصور کر لیا ہے کہ توحید و شرک کی سرحد یہ ہے کہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے سب سے پہلے اپنی قوت وقدرت سے اور ایک دوسرے کی کوشش سے استفادہ کریں اور باقی ماندہ کام کو ہر چیز پر قدرت رکھنے والے خدا پر چھوڑ دیں اور اسی سے خواہش کریں کہ وہ ہمارے کام کو نتیجہ تک پہنچائے نہ کہ کسی اور سے۔[1]

کیونکہ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہمیں اپنی قوت وقدرت سے اور اصطلاح کے مطابق طبیعی اور مادی عوامل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے لیکن فائدہ اٹھانے کی کیفیت میں ہمیں اس بات کی طرف متوجہ رہنا چاہیے کہ یہ عوامل خود سے کوئی استقلال اور اصالت نہیں رکھتے اور اس صورت کے سوا ہم توحید کی سرحد سے باہر نکل جائیں گے۔

اب اگر کسی شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ ان قوتوں اور طاقتوں کے علاوہ، کہ جو ہمارے اختیار میں ہیں، علل غیر طبیعی کا ایک اور سلسلہ بھی موجود ہے، جو اذن خدا سے ہماری مدد کر سکتا ہے اور وہ وجود وایجاد اور اصل ہستی اور مدد کرنے میں کوئی استقلال اور اصالت نہیں رکھتے، اس قسم کا آدمی اس طرح کے اعتقاد کے ساتھ اگر ان غیر طبیعی اسباب سے مدد طلب کرے تو نہ صرف یہ کہ اس کی استعداد اور طلب امداد صحیح ہے بلکہ اس کا مدد طلب کرنا ایک طرح سے خدا سے ہی مدد طلب کرنا ہے، ان دونوں قسم کی استعانتوں میں (عوامل طبیعی سے استعانت اور خدا کے پاک بندوں سے استعانت) معمولی سا بھی فرق نہیں ہے، اگر اس قسم کی استعانت کو شرک شمار کیا جائے تو پھر پہلی قسم کی استعانت کو بھی شرک ہی شمار کرنا چاہیے۔

اس بیان سے دونوں قسم کی آیات کا ہدف اور مقصد، جن میں سے ایک استعانت کو خدا میں منحصر کر کے خدا کے علاوہ کسی اور کو ناصر و معین نہیں بتاتی، جبکہ دوسری قسم کی آیات ہمیں معین و مددگار کے ایک اور سلسلہ کی دعوت دیتی ہیں اور انہیں بھی معین و ناصر سمجھتی ہیں، واضح ہو جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ آیات کے ان دونوں گروہوں کے درمیان کوئی تعارض واختلاف نہیں ہے۔

وہ لوگ جو قرآن کے عقلی معارف سے صحیح آگاہی نہیں رکھتے وہ آیات کے پہلے دستہ کے ساتھ چمٹتے ہیں اور غیر خدا سے ہر قسم کی استعانت کو غلط اور نادرست کہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ انسانی قوت اور مادی اسباب سے استعانت کو اس بناء پر کہ شریعت نے اجازت دی ہے، (تخصیص کر کے) ان آیات سے باہر نکال دیں یعنی صرف خدا سے اعانت اور مدد طلب کرنا چاہیے، مگر ان موارد میں جہاں خدا نے اجازت دی ہے کہ اس کے غیر سے مدد لیں اور اس گروہ کی منطق میں انسانی قوت اور طبیعی عوامل سے مدد لینا جب کہ یہ غیر خدا سے

---

[1] شیخ محمد عبدہ، ''ایاك نستعین'' کی تفسیر میں اس طرح کہتا ہے: یجب علینا ان نقوم بما فی استطاعتنا منذالك و نبذل من اتقان اعمالنا كل ما نستطیع من حول و قوة وان نتعاون و یساعد بعضنا بعضا علی ذالك ونفوض الامر فیما وراء كسبنا الی القادر علی كل شیء ونلجاء الیه وحده و نطلب المعونه للعمل والموصل لثمر ته منه سبحانه دون سوا (المنار ج ا ص ۵۸)

مدد لینا ہے جائز اور مشروع ہے۔

جب کہ آیات کا ہدف و مقصد اس کے علاوہ ہے اور تمام کی تمام آیات ہمیں ایک ہی مطلب کی طرف دعوت دیتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ غیر خدا سے مدد طلب نہیں کرنا چاہیے اور دوسرے عوامل سے مدد طلب کرنا اس طرح سے ہونا چاہیے کہ خدا میں استعانت کے حصر کے ساتھ منافات نہ رکھتا ہو اور ان سے مدد طلب کرنا خدا سے استعانت ہی شمار ہو، نہ کہ اس سے باہر۔

دوسرے لفظوں میں، اصیل و مستقل ناصر و معین، جو دوسرے ناصروں اور مددگاروں کی نصرت و اعانت کا سرچشمہ ہے، خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود عالم آفرینش میں ایسے علل و اسباب موجود ہیں جو خدا کے اذن و فرمان سے اور خدا کی دی ہوئی قدرت کے ساتھ افراد بشر کی مدد کرتے ہیں اور فرع سے مدد طلب کرنا، اصل سے ہی مدد مانگنا ہے۔

اب ہم دونوں گروہوں کی کچھ آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ (آل عمران)

''نصرت صرف خدائے توانا و حکیم کی طرف سے ہے''

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾ (حمد)

''ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں''

یہ آیات پہلے گروہ کا نمونہ ہے اب ہم دوسرے گروہ کی آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ہمیں یہ حکم دیتی ہیں کہ ہم خدا کے علاوہ دوسرے عوامل سے بھی مدد طلب کریں:

۱۔ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ (بقرہ ۱۵۳)

''صبر و بردباری اور نماز سے مدد طلب کرو''

۲۔ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ (مائدہ ۲)

''نیک کاموں اور تقوے و پرہیزگاری میں دوسرے سے تعاون کرو''

۳۔ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ (کہف ۹۵)

''میرے پروردگار نے مجھے جو قدرت دی ہے وہ بہتر ہے، تم میری (سد بنانے میں) مدد کرو''

۴۔ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ (انفال ۷۲)

''اگر غیر مہاجر مسلمان تم مہاجر مسلمانوں سے مدد طلب کریں تو انکی مدد کرنا''

اس قسم کی آیات کے حل کی کلید وہی ہے جسے ہم بارہا بیان کر چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ:

عالم آفرینش میں مستقل فاعل اور موثر تام صرف ایک ہی ہے جو وجود وایجاد میں کسی اور پر تکیہ نہیں کرتا اور دوسرے عوامل وجود وایجاد میں اسی کے محتاج ہیں اور سب کے سب اسی کے اذن وقدرت سے اپنا اپنا وظیفہ اور ذمہ داری پوری کرتے ہیں اور اگر وہ دوسرے عوامل کو قدرت وطاقت نہ دیتا تو وہ معمولی سے معمولی کام پر بھی قادر نہ ہوتے۔

سورۃ توحید میں بھی اسی طرح کا حکم ہے، تمام مراحل میں معین ومددگار واقعی خدا ہی ہے اور کسی شخص سے بھی مستقل مدد کے عنوان سے مدد طلب نہیں کی جاسکتی۔ اس بناء پر اس طرح کی استعانت صرف اس کی ذات اقدس میں ہی منحصر ہے، لیکن یہ بات اس سے مانع نہیں ہے کہ ہم دوسروں سے غیر مستقل عامل کے عنوان سے جو عنایات خداوندی کے سائے میں ہماری مدد کرتے ہیں، مدد طلب کریں اور اس قسم کی استطاعت، خدا میں مدد طلب کرنے کے حصر کے ساتھ منافات نہیں رکھتی کیونکہ

اولاً۔ وہ استعانت جو ذاتِ اقدس کے ساتھ مخصوص ہے وہ اس استعانت سے جو دوسرے عوامل کے بارے میں انجام پاتی ہے، الگ اور جدا ہے، کسی سے اس عنوان سے مدد طلب کرنا کہ وہ بالذات اور کسی پر تکیہ کئے بغیر کسی کام کو انجام دیتا ہے اور ہماری مدد کرتا ہے، یہ بات ذات الٰہی کے ساتھ ہی مخصوص ہے جب کہ دوسرے عوامل سے مدد کی درخواست دوسری طرح سے ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ خدا کی قدرت پر تکیہ اور بھروسہ کرتے ہوئے مدد کرتے ہیں۔ بالذات اور استقلال کے طور پر نہیں، اب اگر پہلی صورت میں استعانت، ذات اقدس الٰہی کے ساتھ مخصوص قرار پائی ہے تو یہ اس بات کی دلیل نہیں بنتی کہ دوسری بھی اسی کے ساتھ مخصوص ہو۔

ثانیاً۔ مخلوق خُدا سے اس قسم کی مدد چاہنا، خدا سے مدد چاہنے سے الگ اور جدا نہیں ہے بلکہ یہ بھی اسی سے مدد چاہنا ہے اور ایک فرد موحد کی جہاں بینی میں، جو تمام عالم کو خدا کا فعل اور اسی کی طرف مستند سمجھتا ہے، اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے، آخر میں ہم پھر یاد دہانی کراتے ہیں کہ:

مؤلّف ''المنار'' نے چونکہ ارواح مقدسہ سے استعانت اور مدد طلب کرنے کو ایک قسم سے زیادہ تصور نہیں کیا ہے، لہٰذا اس سے شرک کو لازم جانا ہے اور یہ کہتا ہے:

''ومن هنا تعلمون ان الذين يستعينون با صحاب الا ضرحة والقبور على قضاء حوائجهم و تيسر امورهم و شفاء امراضهم و نماء حرثهم وزرعهم و هلاك اعدائهم و غير ذالك من المصالح، هو عن صراط التوحيد نا كبون وعن ذكر الله معرضون'' (المنار، ج ا ص ۵۹)

''وہ لوگ جو صاحبان ضریح وقبور سے اپنی حاجات کے پورا ہونے، اپنے کاموں کی آسانی، بیماروں کی شفا اور زراعت وکھیتی کی نشوونما اور اپنے دشمنوں کی نابودی کیلئے مدد طلب کرتے ہیں وہ جادہ توحید سے منحرف اور یادخدا سے روگردان ہیں''

اس بات پر اشکال واضح ہے کیونکہ غیر خدا سے مدد طلب کرنا عوامل طبیعی سے مدد طلب کرنے کی طرح دو قسم پر ہے جن میں سے ایک عین توحید ہے اور دوسری باعثِ شرک ہے، ایک سے یاد خدا لازم آتی ہے اور دوسری خدا کی فراموشی کا سبب ہے۔

توحید وشرک کی سرحد اسباب ظاہری اور غیر ظاہری نہیں ہیں بلکہ اس کی سرحد وہی استقلال وعدم استقلال ہے، غنا وفقر اور اصالت و عدم اصالت ہے۔

غیر مستقل اور خدا سے وابستہ عوامل کی فعالیت خدا کے اذن سے ہے اور ان سے مدد طلب کرنا نہ صرف غفلت کا سبب نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف توجہ کا سبب ہے۔ اس کے باوجود وہ یہ کس طرح سے کہتا ہے: عن ذکر الله معرضون " اور اگر اس قسم کی استعانتیں اور امدادیں خدا کی فراموشی کا سبب ہوں تو پھر اسباب مادی اور انسانی قوتوں سے توسل کو بھی فراموشی کا سبب ہونا چاہیے۔

تعجب تو ایک دوسرے مؤلف شیخ محمود شلتوت پر ہے جو اپنی تفسیر کے ص ۴۶ پر بغیر کمی بیشی کے ''عبدہ'' کے جملوں کو بعینہ نقل کر کے مسئلہ کا اختتام کرتا ہے اور ظاہر حصر کو (ایاك نستعین) لیا ہے اور اس آیت اور دوسری آیات کی حقیقت سے غفلت کی ہے۔

۹۔ کیا صالح اور نیک افراد کو پکارنا ان کی پرستش ہے؟

گذشتہ مباحث نے یہ واضح کر دیا ہے کہ غیر خدا سے حاجت طلب کرنا، اس عنوان سے کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور امور وشئون میں سے کسی چیز کا مالک نہیں ہے اور کوئی چیز اسے تفویض نہیں ہوئی ہے، تو یہ شرک نہیں ہے۔ یہاں ایک اور مطلب باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن نے متعدد موارد میں، غیر خدا کے مطلقا پکارنے کو، اس کی عبادت اور پرستش سمجھا ہے، گویا دوسرے کو پکارنا اور ندا دینا اس کی عبادت اور پرستش کرنے کے برابر ہے۔

وہ آیات یہ ہیں:

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ (جن)

''مساجد یا سجدہ گاہیں خدا کے لئے ہیں، پس خدا کے ساتھ کسی کو نہ پکارو''

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ (رعد ۱۴)

''دعوت حق خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے جو لوگ اس کے سوا کسی دوسرے کو پکارتے ہیں وہ ہرگز انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے''

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾

(اعراف)

''جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ تو نہ تمہاری ہی کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی''

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ؁۱۳ (فاطر)

''خدا کے سوا جسے بھی تم پکارتے ہو، وہ تو خرمے کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہوئے''

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (اعراف ۱۹۴)

''خدا کے علاوہ جن جن کو تم پکارتے ہو، وہ تو تمہاری ہی طرح کے بندے ہیں''

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ؁۵۶

(اسراء)

''کہہ دے، جنہیں تم خدا کے سوا گمان کرتے ہو، پکارو! وہ ہرگز بھی ضرر کو دفع کرنے، اور اسے تم سے ٹالنے پر قادر نہیں''

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ (اسراء ۵۷)

''جنہیں وہ پکارتے ہیں، وہ تو خدا کی طرف وسیلہ کے طلبگار ہیں''

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ (یونس ۱۰۶)

''خدا کے سوا کسی ایسے کو نہ پکارو جو نہ تو تجھے کوئی نفع دے سکتا ہے اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے''

اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ (فاطر ۱۴)

''اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری آواز کو نہیں سنتے''

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (احقاف ۵)

''اور اس سے زیادہ گمراہ اور کون ہوگا جو خدا کے علاوہ کسی اور کو پکارتا ہے جو ہرگز اسے روزِ قیامت تک جواب نہیں دے گا''

ان آیات سے وہابی گروہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اولیاء اور صلحاء کو انکے اس دنیا سے گذر جانے کے بعد پکارنا، انکی عبادت اور پرستش شمار

ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص پیغمبر اسلامؐ کی قبر کے پاس یا کہیں دور سے "یامحمد" کہے تو خود یہی ندا اور پکارنا آنحضرتؐ کی عبادت و پرستش ہے۔

''صنعانی'' کشف الارتیاب ص ۲۷۴ کی نقل کے مطابق کتاب تنزیہ الاعتقاد میں کہتا ہے:

"وقد سمی الله الدعاء عبادة بقوله: "ادعونی استجب لکم، ان الذین یستکبرون عن عبادتی" ومن هتف باسم نبی او صالح بشیئ او قال اشفع لی الی الله فی حاجتی او استشفع بك الی الله فی حاجتی او نحو ذالك او قال اقض دینی او اشف مریضی او نحو ذالك فقد دعاء ذالك النبی و الصالح والدعاء عبادة بل مخها فیکون قد عبد غیر الله وصار مشرکا اذ لایتم التوحید الا بتوحیده تعالی فی الالهیة با عتقاد ان لا خالق ولا رازق غیره، و فی العبادة بعدم عبادة غیره ولو ببعض العبادات، و عباد الاصنام انما اشرکوا العدم توحید الله فی العبادة۔

قرآن نے مطلق دعا اور غیر خدا کے پکارنے کو عبادت کہا ہے، اس کا گواہ یہ ہے کہ آیت کی ابتدا میں کہتا ہے:

''ادعونی استجب لکم'' اور آیت کے ذیل میں کہتا ہے، ''یستکبرون عن عبادتی'' اس بنا پر جو شخص کسی پیغمبر یا کسی نیک شخص کو پکارے یا یہ کہے کہ آپ میری حاجت کے بارے میں شفاعت کریں یا یہ کہے کہ میں آپ سے اپنی حاجت کے بارے میں شفاعت طلب کرتا ہوں یا یہ کہے میرا قرض ادا کیجیئے یا میرے بیمار کو شفا دیجیئے، یا اسی قسم کی کوئی اور دعا کرے تو اس صورت میں اس شخص نے اپنی اس گفتگو سے اس کی عبادت کی ہے اور عبادت کی حقیقت دعا اور پکارنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور نتیجہ اس کا یہ ہے کہ اس پکارنے والے نے غیر خدا کی پرتش کی ہے اور وہ مشرک ہو گیا ہے کیونکہ توحید ربوبی کو (خدا کے سوا کوئی خالق و رازق نہیں ہے) توحید عبادت کے ساتھ (جو اس کے غیر کی پرستش نہ کرنا ہے) ہونا چاہیے، بت پرستوں کا شرک صرف یہی تھا کہ وہ خدا کے غیر کی پرستش کیا کرتے تھے۔

جواب

اس میں شک نہیں کہ عربی لُغت میں لفظ ''دعا'' ندا کرنے اور پکارنے کے معنی میں ہے اور عبادت کا لفظ پرستش کرنے کے معنی میں ہے اور ان دونوں لفظوں کو ہرگز ایک دوسرے کا مترادف اور ہم معنی شمار نہیں کیا جا سکتا یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر ندا اور پکارنا پرستش اور عبادت

ہے، کیونکہ:

اولاً، قرآن مجید میں لفظ دعوت کئی موارد میں استعمال ہوا ہے، جسکے بارے میں ہرگز یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے مراد عبادت ہے، مثلاً

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّنَهَارًا ۙ (نوح)

''اس نے کہا: پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات دن (تیری طرف) دعوت دی اور پکارا''

کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ نوح کا مقصد یہ ہے کہ میں نے اپنی قوم کی رات دن عبادت کی،

وَمَا کَانَ لِیَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ اَنۡ دَعَوۡتُکُمۡ فَاسۡتَجَبۡتُمۡ (ابراہیم ۲۲)

''شیطان کہتا ہے: میرا تم پر کوئی تسلط نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں (برے کاموں کی طرف) دعوت دی اور پکارا، تو تم نے اسے قبول کرلیا۔''

کیا کسی کو یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ اس سے مقصود کہ شیطان نے انہیں دعوت دی، یہ ہے، کہ شیطان نے اپنے پیروکاروں کی پرستش کی؟ حالانکہ اگر پرستش ہو بھی تو وہ شیطان کے پیروکاروں کی طرف سے ہوگی نہ کہ خود شیطان کی طرف سے۔

ان آیات میں اور دوسری دسیوں آیات میں جنہیں ہم نقل نہیں کر رہے ہیں، لفظ دعوت، عبادت اور پرستش کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے، اس بناء پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دعوت اور عبادت ایک دوسرے کے مترادف اور ہم معنی ہیں اور اگر کسی شخص نے کسی پیغمبر یا کسی نیک بزرگ سے امداد طلب کی ہے اور اسے پکارا ہے تو اس صورت میں اس نے اس کی عبادت نہیں کی ہے کیونکہ دعوت اور پکارنا پرستش اور عبادت سے اہم ہے۔[1]

ثانیاً۔ ان تمام آیات میں دعا سے مقصود مطلقاً پکارنا نہیں ہے، بلکہ ایک خاص قسم کا پکارنا ہے، جو ہوسکتا ہے کہ لفظ پرستش کا مترادف اور ہم معنی ہو، کیونکہ یہ ساری آیات ان بت پرستوں کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، جو اپنے بتوں کو چھوٹے خدا سمجھتے تھے جنہیں کچھ شئون الٰہی سپرد کئے گئے ہیں اور وہ اپنے کام میں ایک قسم کا استقلال رکھتے ہیں، یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ کسی موجود کے لیے بڑے یا چھوٹے خدا کے عنوان سے، اس نظر سے کہ وہ (اللہ) اور (رب) اور شفاعت و مغفرت کے امور کا مالک ہے، خضوع و تذلل یا کسی بھی قسم کی گفتار و رفتار، عبادت و پرستش ہوگی۔

اس میں شک نہیں ہے کہ بت پرستوں کا خضوع و خشوع اور ان کا استغاثہ و دعا ان بتوں کے سامنے تھی جنہیں وہ حق شفاعت و.................. کے عنوان سے توصیف کرتے تھے اور انہیں دنیا و آخرت سے مربوط امور میں مستقل متصرف سمجھتے تھے اور یہ بات کہے بغیر واضح

---

[1] نسبت دینے کے لحاظ سے، پکارنے اور عبادت کرنے میں عام و خاص وجہ کی نسبت ہے، خدا پر تکیہ کرنے والے عامل کے عنوان سے غیر خدا سے مدد طلب کرنے کے موقع پر پکارنا صادق آتا ہے، عبادت صادق نہیں آتی لیکن عملی حمد اور ستائش، مثلاً رکوع و سجود میں جو طرف مقابل کی الوہیت کے اعتقاد کے ساتھ ہوتی ہے، عبادت صادق آتی ہے نہ کہ پکارنا اور بعض موارد مثلاً نماز میں دونوں صادق آتے ہیں۔

ہے کہ ان حالات میں ان موجودات سے ہر قسم کی دعا و درخواست عبادت و پرستش ہی ہوگی، اس بات کا واضح ترین گواہ کہ ان کی دعا و پکار، ان کی الوہیت کے اعتقاد کے ساتھ تھی، ذیل کی آیت ہے:

فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ (ہود ۱۰۱)

''وہ خدا جن کی وہ ''اللہ'' کے علاوہ پرستش کیا کرتے تھے، وہ انکے کچھ کام نہ آئے''

اس بناء پر زیر بحث آیات کا ہمارے موضوع بحث سے کوئی تعلق اور ربط نہیں ہے، ہماری بحث کا موضوع ایک بندہ کا دوسرے بندے سے درخواست کرنا ہے، جسے نہ تو وہ ''الٰہ اور رب'' سمجھتا ہے اور نہ ہی دنیا و آخرت سے مربوط امور میں مختار کامل اور مالک و متصرف جانتا ہے بلکہ وہ اسے خدا کا ایک محترم و مکرم بندہ سمجھتا ہے کیونکہ خدا نے اسے مقام رسالت یا امامت کیلئے انتخاب کیا ہے اور وعدہ دیا ہے کہ خدا اپنے بندوں کے بارے میں اس کی دعا کو قبول کرلے گا، جیسا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۶۴﴾ (نساء)

''اگر وہ اس وقت جب کہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا تیرے پاس آتے اور خدا سے طلب بخشش کرتے اور پیغمبر بھی ان کیلئے استغفار کرتے تو یقیناً وہ خدا کو توبہ قبول کرنے والا اور رحیم پاتے۔''

ثالثاً:

خود ذکر شدہ آیات میں اس بات کی واضح گواہی موجود ہے کہ دعوت سے مراد، مطلق کسی کام یا حاجت کی درخوست نہیں ہے بلکہ عبادتی اور پرستشی دعوت مراد ہے، اسی بناء پر ایک آیت میں لفظ ''دعوت'' کے بعد بلا فاصلہ اسی معنی کو لفظ عبادت کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، مثلاً

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴿۶۰﴾ (مومن)

جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ ابتدا آیہ میں لفظ (ادعونی) اور اسی آیہ کے ذیل میں لفظ عبادتی استعمال ہوا ہے اور یہ واضح گواہ ہے اس بات کا کہ اس دعوت سے مراد، ایسی موجودات کے سامنے جنہیں انہوں نے صفاتِ الٰہی کے ساتھ متصف کر رکھا تھا[1] خصوصی استغاثہ، نالہ و فریاد اور درخواست کرنا تھا۔

سید الساجدین امام زین العابدینؑ اپنی دعا میں فرماتے ہیں:

---

[1] اس آیت میں دعا سے مراد عبادت تو ہے لیکن یہ آیت بت پرستوں کے متعلق نہیں ہے۔ (سید محمد حسین زیدی برستی)

" فسميت دعاك عبادة و تركه استكبارًا و توعدت على تركه دخول جهنم داخرين"[1]

''تو نے اپنے پکارنے کا نام عبادت رکھا ہے اور اس کے ترک کرنے کو کبر کا نام دیا ہے اور اسکے ترک کرنے والوں کو ذلت وخواری کے ساتھ آگ میں داخل ہونے کی وعید دی ہے''

اور بعض اوقات دو آیات میں جو ایک ہی مضمون کی ہیں ایک جگہ لفظ عبادت اور دوسری جگہ لفظ دعوت وارد ہوا ہے۔ مثلاً

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ (مائدہ ۷۶)

''کہہ دے، کیا تم خدا کے سوا ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو تمہارے سود وزیاں کی مالک نہیں ہے''

اور دوسری آیت میں فرماتا ہے:

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا (انعام ۷۱)

''کہ دے، کیا ہم خدا کے سوا ایسی چیز کو پکاریں جو ہمارے سود وزیاں کی مالک نہیں ہے''

اور سورہ فاطر کی آیہ ۱۳ میں فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ؕ‎﴿۱۳﴾ (فاطر)

''جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو، وہ تو خرمے کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں''

اس آیت میں لفظ ''تدعون'' استعمال ہوا ہے، جب کہ ایک دوسری آیت جو اسی مضمون کی ہے لفظ ''تعبدون'' استعمال ہوا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا (عنکبوت ۱۷)

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ (انعام ۵۶)

''کہہ دے مجھے اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ اس کی پرستش کروں جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو، (انکی پرستش کرتے ہو)''[2]

میں قارئین کرام سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ''المعجم المفهرس'' میں ''عبد'' اور ''دعا'' کے مادوں کی طرف رجوع کریں تا کہ وہ یہ دیکھیں کہ ایک ہی مضمون ایک آیت میں لفظ عبادت اور وہی مضمون دوسری آیت میں لفظ دعوت کے ساتھ کس طرح سے وارد

---

[1] صحیفہ سجادیہ دعاء ۴۵، اور مراد سورہ مومن کی آیہ ۶۰ ہے

[2] سورہ مومن کی آیہ ۶۶ بھی اسی مضمون کی ہے۔

ہوا ہے اور یہ خود اس امر کا گواہ ہے کہ ان آیات میں دعوت سے مراد عبادت و پرستش ہے نہ کہ مطلق ندا اور پکارنا۔

اگر آپ ان تمام قرآنی آیات کا، جن میں لفظ دعوت عبادت کے معنی میں استعمال ہوا ہے غور کے ساتھ مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ آیات یا تو خداوند عالم کے بارے میں ہیں، جس کی الوہیت، ربوبیت اور مالکیت و.................. کے سارے موحد معترف ہیں، یا وہ ان بتوں کے بارے میں ہیں، جن کی پرستش کرنے والے، انہیں چھوٹے خدا اور مقام شفاعت کا مالک سمجھتے تھے۔اس صورت میں موضوع بحث کیلئے ان آیات سے استدلال کہ اولیاء میں سے کسی کو پکارنا، یا ان میں سے کسی سے استغاثہ کرنا کہ ان میں سے کسی میں بھی یہ صفات نہیں پائی جاتیں واقعاً حیرت انگیز ہے۔

زمانہ رسالت کے بت پرستوں کے عقائد سے آگاہی اس حقیقت سے واضح طور پر پردہ اٹھا دیتی ہے، اس بناء پر ہم اس بارے میں بھی مختصر طور پر بحث کر رہے ہیں۔

۱۰۔زمانہ جاہلیت میں بت پرستوں کے عقائد

اقوام و ملل کے واقعات پر مشتمل کتابوں کی طرف مراجعہ آپ کو کچھ بت پرستوں، مثلاً ثنویوں (دو خداؤں کے قائل) مزدکیوں (مزدک کو خدا ماننے والوں) اور حرنائیوں، (مجوسیوں کے ایک گروہ) کے عقائد سے آگاہی بخشے گا، ان گروہوں کے عقائد کے بارے میں بحث کرنا تو باعث طوالت ہوگا، لہٰذا ہم بعض بت پرستوں کے عقائد کی طرف صرف اشارے کرتے ہیں، کیونکہ شرک و بت پرستی سے مربوط بہت سی آیات انہی کے بارے میں ہیں۔

ا۔ اصحاب ہیاکل

ان کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان میں خدا کی عبادت کرنے کی لیاقت اور قابلیت نہیں ہے، اس لئے مجبوراً کسی واسطہ کی عبادت کرنا چاہیے کہ اس کی عبادت کے ذریعہ، خدا کا تقرب حاصل کریں۔اس بناء پر وہ ارواح مجردہ کی پرستش کیا کرتے تھے جنہیں وہ مدبر عالم خیال کرتے تھے اور چونکہ ارواح ان کیلئے ملموس نہیں تھے، لہذا وہ سیارستاروں (ہیاکل) کی پرستش کیا کرتے تھے اور وہ اس بات کے معتقد تھے کہ ان ارواح میں سے ہر ایک، ان (ستاروں) میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتی ہے۔لہذا ستاروں کی پرستش ارواح کی پرستش ہے اور انکی پرستش انہیں خدا کے قریب کر دے گی۔

وہ ان سات سیاروں کی پرستش کیلئے کچھ تشریفات کے قائل تھے، وہ ان سیاروں میں سے ہر ایک کی صورت پر انگوٹھی بنواتے تھے اور انکے مخصوص اوقات میں اسے ہاتھ میں پہنتے تھے اور (خوشبو کیلئے) بخور جلاتے تھے اور ہر ایک ستارے کی ایک مخصوص وقت میں عبادت کیا کرتے تھے، اس کے بعد ان سے اپنی حاجات طلب کرتے تھے۔وہ ستاروں کو تو (الٰہ) اور (ارباب) اور خدائے بزرگ و برتر کو (رب

الارباب) اور (الہ الالہتہ) کہتے تھے۔[1]

اصحاب اشخاص

یہ گروہ اصحاب ہیاکل کا ہم رائے اور ہم فکر تھا، سوائے اس کے کہ وہ ستاروں کی بجائے انکی اشکال کی عبادت کرتے تھے کیونکہ وہ یہ کہتے تھے کہ ستارے طلوع وغروب ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا ہم ہمیشہ ان سے بات نہیں کر سکتے اس بناء پر انہوں نے سیار ستاروں کے مشابہ تصویریں بنالی تھیں اور وہ کہتے تھے کہ بت کی عبادت ہیاکل کے تقرب کا سبب ہے اور ہیاکل کا تقرب ارواح مجرد سے تقرب ہے اور ارواح مجرد جو چھوٹے خدا ہیں وہ انہیں خدائے بزرگ سے نزدیک کردیتے ہیں۔[2]

زمانہ جاہلیت کے عربوں کا عقیدہ

ان میں سے ایک بہت ہی چھوٹا سا گروہ دھری تھا جو طبیعت کو زندہ کرنے والا اور دہر کو فنا کرنے والا جانتا تھا۔ انکے نظریہ کے مطابق زندگی ترکیب عناصر اور موت تحلیل عناصر اک نام تھی، وہ عناصر کو جمع کرنے والے کو طبیعت اور انہیں منتشر کرنے والے کو زمانہ سمجھتے تھے لیکن ان میں سے اکثر نے خدا اور حدوث عالم کو قبول کر لیا تھا لیکن وہ قیامت اور پیغمبروں کے خدا کی طرف سے مبعوث ہونے کے منکر تھے۔[3]

انہی میں سے ایک گروہ فرشتوں اور جنوں کی پرستش کیا کرتا تھا اور انہیں خدا کی بیٹیاں سمجھتا تھا اور ایک گروہ ”صابئ“ تھا جو ستاروں کی پرستش کرتا تھا۔

ایک گروہ نے خدا، حدوث عالم اور قیامت کو تو قبول کر لیا تھا لیکن وہ پیغمبروں کی بعثت کا منکر تھا، مگر دونوں گروہ بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے اور انہیں بارگاہ خداوندی میں مقام کا مالک سمجھتے تھے۔

عربوں میں سے بعض لوگ یہود و نصاریٰ کے دین کی طرف بھی مائل ہو گئے تھے، پہلے گروہ کا مرکز مدینہ میں تھا اور دوسرے گروہ کا مرکز نجران و..................میں تھا۔

عیسائیوں کے تینوں گروہوں کے عقائد، عیسیٰ مسیح و روح القدس اور باپ، مشہور و معروف ہیں، وہ تین گروہ یہ ہیں:

۱۔ ملکانیہ ۲۔ نسطوریہ ۳۔ یعقوبیہ

تینوں گروہ اپنے اختلافات کے باوجود حضرت عیسیٰؑ کی پرستش کرتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کے احتجاج سے مربوط آیات میں، منظومہ شمسی کے سیاروں کی پرستش کرنے والوں کے عقائد کی طرف اشارہ

---

[1] ملل و نحل و شہرستانی۔ ج ۲ ص ۲۴۴

[2] ملل و نحل و شہرستانی۔ ج ۲ ص ۲۴۴

[3] ملل و نحل و شہرستانی۔ ج ۲ ص ۲۴۴

ہوا ہے۔

عیسائیوں کے عقائد کے بارے میں بھی متعدد آیات وارد ہوئی ہیں۔[1]

شرک سے مربوط آیات زیادہ تر ان بت پرستوں کے ساتھ مربوط ہیں جو جزیرہ نما عربستان میں زندگی بسر کرتے تھے اور انکی اکثریت بتوں کی، شفیع اور چھوٹے خدا کے عنوان سے پرستش کرتی تھی اور قرآنی آیات اس مطلب پر مکرر طور پر گواہی دیتی ہیں:

نمونہ کے طور پر:

وَإِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (انبیاء)

''جب کافر لوگ تجھے دیکھتے ہیں تو وہ تیرا مذاق اڑاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں: کیا یہی ہے وہ جو تمہارے خداؤں پر تنقید کرتا ہے، اور وہ خدائے رحمن کے قرآن کے منکر ہیں۔''

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ۭ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ (انبیاء ۴۳)

''کیا ان کیلئے ایسے خدا ہیں جو انہیں ہمارے عذاب سے روک لیں گے، وہ تو اپنی مدد کی بھی استطاعت نہیں رکھتے''

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ (انعام ۱۰۰)

''انہوں نے خدا کے لئے شریک قرار دے لئے ہیں، حالانکہ اس نے انہیں خلق کیا ہے اور اس کے لئے بغیر علم و آگاہی کے بیٹے اور بیٹیاں قرار دے لی ہیں''

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ (نجم)

''کیا تم نے لات اور عزیٰ کو اور منات کو جو تیسرا بت ہے، دیکھا ہے؟

[1] اقوام ابراہیمؑ کے عقائد کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کیلئے چوتھے حصہ کے ص............اور اسی طرح عیسائیوں کے عقائد کے بارے میں پانچویں حصہ میں ص............کی طرف رجوع کریں۔

زیر بحث آیات میں قرآن کا مبارزہ کس گروہ سے ہے؟

ان آیات میں قرآن کا بنیادی ہدف، ان بت پرست گروہوں کا دعوت سے انکار ہے جو بتوں کو خدا کا شریک اور مدبر یا شفاعت کا مالک سمجھتے تھے اور ہر قسم کا خضوع وتذلل یا نالہ واستغاثہ اور طلب شفاعت اور حاجت کی درخواست اسی بناء پر تھی کہ وہ چھوٹے خدا اور معبود برحق ہیں جو خدائی کاموں کے عہدہ دار ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے دنیا وآخرت سے مربوط کاموں کا ایک حصہ انکے سپرد کر دیا ہے۔

ان آیات کا اس پاک روح سے استغاثہ کرنے کے ساتھ کیا ربط ہے، جس نے پکارنے والے کے عقیدہ کے مطابق ذرہ برابر بھی بندگی کی سرحد سے آگے قدم نہیں رکھا، بلکہ خدا کا محبوب اور گرامی قدر بندہ شمار ہوتا ہے؟

اگر قرآن فرماتا:

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ (جن)

''مساجد خدا کیلئے ہیں، پس خدا کے ساتھ کسی کو نہ پکارو''

اس سے مراد وہ پکارنا ہے جو عبادت کے عنوان سے ہو جو زمانہ جاہلیت کے عرب، لات وعذیٰ اور منات کی یا اجرامِ فلکی یا فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے، گویا وہ یہ کہتا ہے:

فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾

بارگاہ خداوندی کے محترم ومکرم بندوں کو پکارنے کی حرمت پر اس آیت سے استدلال کرنا، خوارج کے آیہ ''اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ'' (یوسف۔۴۰) سے استدلال کی مانند ہے جو اجتماع اور معاشرے میں صالح حکومت کے وجود کی نفی ہے، یہ آیت ''فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾'' (جن) جو آجکل نئے اٹھنے والے وہابیوں کا شعار ہے، اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ ے جملہ کے مانند ہی ہے، جسے خوارج نے اپنا شعار بنا رکھا تھا، اور وہ اپنے مقصد کو ثابت کرنے کیلئے زمین وآسمان کے قلابے ملاتے تھے، یہ آیت مومن سے دعا کی درخواست کرنے کے مسئلہ کے ساتھ کیا ربط رکھتی ہے جس کی دعا کی اجابت قطعی وحتمی ہے۔ اگر قرآن، خدا کے ساتھ کسی کے شریک کرنے اور پرستش کرنے کو منع کرتا ہے تو اس کا دعا کی درخواست یا دوسرے ایسے اعمال کے ساتھ جو ایک پاک روح کی قدرت میں ہے کیا ربط ہے۔

اگر قرآن فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ (رعد ۱۴)

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (اعراف ۱۹۷)

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (اعراف ۱۹۴)

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ﴿١٣﴾ (فاطر)

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا (انعام ۷۱)

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ (یونس۔۱۰۶)

تو یہ آیات اور ان سے ملتی جلتی آیات جو قرآن مجید میں کثرت سے نظر آتی ہیں وہ سب بتوں، ستاروں، فرشتوں اور جنوں کے سامنے پرستش کے طور پر پکارنے کے ساتھ مربوط ہیں، جنہیں وہ چھوٹے خدا، معبود برحق اور تام الاختیار شفیع سمجھتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان موجودات سے اس قسم کے اعتقاد کے ساتھ، دعا اور درخواست، عبادت اور پرستش ہی ہوگی تو یہ آیات کسی ایسے موجود سے، جسکے بارے میں درخواست کرنے والا کسی خدائی یا ربوبی یا تدبیری یا سپردگی کے مقام کا قائل نہیں ہے۔ اذن خدا کے ساتھ محدود دعا کی درخواست کرنے یا شفاعت طلب کرنے کے ساتھ کیا ربط رکھتی ہیں۔ کیا ایسے دو قسم کے عقیدوں اور محرکات کے ساتھ ان دونوں دعوتوں میں کوسوں دور کا فاصلہ ہونے کے باوجود ان دونوں کا آپس میں قیاس کیا جا سکتا ہے اور ان دونوں کو یکساں طور پر شرک کہا جا سکتا ہے؟

ان دونوں قسم کی دعوتوں میں جوہری اختلاف کا واضح گواہ یہ ہے کہ وہابی اس قسم کی درخواست کو پیغمبروں اور صلحا کی وفات کی حالت میں شرک سمجھتے ہیں لیکن انکی زندگی میں اسے جائز اور مشروع اور اصول وسنن توحید کے موافق شمار کرتے ہیں اور ہم نے گذشتہ مباحث میں ثابت کیا ہے کہ طرف مقابل کی موت وحیات عمل کی ماہیت میں کوئی تاثیر نہیں رکھتی۔

وہابیوں کے چبائے ہوئے جھوٹ سے استفادہ

ہٹ دھرمی کی شریعت جو ہمیشہ وہابیوں کے چبائے ہوئے جھوٹ سے استفادہ کرتی ہے اور اس کی کتاب (توحید در عبادت) جو ابن تیمیہ کی کتاب (منہاج السنۃ) اور محمد بن عبدالوہاب کے نواسہ شیخ عبدالرحمن نجدی کی کتاب (فتح المجید) کا چربہ ہے، اس غرض سے کہ وہ نجدیوں کے قافلہ سے پیچھے نہ رہ جائے، غیر خدا سے استغاثہ کو شرک سمجھتی ہے، وہ اس سلسلہ میں لکھتا ہے:

دعا دو قسم کی ہوتی ہے، ا۔ دعائے عبادت و پرستش، ۲۔ دعائے مسئلت وخواہش، دعائے مسئلت یہ ہوتی ہے کہ دعا کرنے والا، جلب منفعت یا دفع ضرر میں سے جو چیز اس کے نفع میں ہے اسے طلب کرتا ہے اور خداوند تعالی قرآن کریم میں اس شخص کو جو غیر خدا کو جلب منفعت یا دفع ضرر کیلئے پکارے غلطی اور خطا پر سمجھتا ہے، چنانچہ فرماتا ہے،

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا (انعام ۷۱)

''کیا ہم خدا کے علاوہ اسے پکاریں جو نہ نفع پہنچاتا ہو اور نہ ضرر''

اس کے بعد لکھتا ہے: ہر عبادت والی دعا کیلئے مسئلت والی دعا لازم ہے اور ہر مسئلت والی دعا سے عبادت والی دعا لازم

آتی ہے۔

جیسا کہ خدا فرماتا ہے:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (اعراف)

''اپنے پروردگار کو تضرع اور زاری کے ساتھ پوشیدہ طور پر پکارو، وہ تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا''

وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (جن)

''مساجد خدا ہی کیلئے ہیں، خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو نہ پکارو''

اور اس قسم کی آیات قرآن میں بکثرت ہیں جو یہ بتلاتی ہیں کہ دعا مسئلت، دعائے عبادت کو مستلزم ہے کیونکہ سائل کو چاہیے کہ وہ اپنے سوال کو خداوند تعالی کے لئے خالص قرار دے۔

اور اسباب ظاہری میں امور حسی سے استغاثہ جائز ہے، مثلاً تمہارے گھر کو آگ لگ جائے تو تم استغاثہ کرو کہ اے مسلمانوں میری مدد کو پہنچو۔

یہ تمام چیزیں سید المرسلینؐ کی امت کے اجماع سے شرک نہیں ہیں لیکن امور معنوی میں استغاثہ اور ایسے امور جن پر خدا کے علاوہ کوئی قدرت نہیں رکھتا، مثلاً شفا مرض یا قرض کی ادائیگی غیر معین طریقہ سے، یا روزی کا طلب کرنا اور اسی قسم کی دوسری چیزیں تو اس قسم کا استغاثہ ذاتِ پروردگار کے ساتھ مخصوص ہے اور اسکے علاوہ کسی دوسرے سے کرنا شرک ہے اور جائز نہیں ہے کہ تم کسی نبی یا کسی ولی سے استغاثہ کرو اور یہ کہو کہ مجھے شفا دو یا یہ کہو:

"استغيث بك يا فلان" [1]

ان دونوں قسم کی دعاؤں اور نداؤں کے بارے میں ہم نے جو تفصیلی بحث کی ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ ان میں سے ایک تو (عبادت و پرستش) ہے اور دوسری حاجت کی درخواست ہے اور یہ دونوں قسم کی دعائیں اور درخواستیں کبھی بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتیں۔ اس سے اس کی باتوں کے اشکالات واضح ہو جاتے ہیں کیونکہ:

اولاً: وہ دوسری اور تیسری آیت سے یہ کیسے استفادہ کرتے ہیں کہ دعائے مسئلت (کسی سے کسی چیز کی درخواست کرنا) دعائے عبادت (یعنی طرف مقابل کی پرستش) ہے، اگر واقعاً لفظ ''ادعوا'' دوسری آیت میں اور لفظ ''فلا تدعوا'' تیسری آیت میں دعا اور

[1] توحید عبادت ص ۶۴، ۶۶، مولف نے ان مطالب کا، محمد بن عبدالوہاب کے نواسے، شیخ عبدالرحمن کی تالیف کردہ کتاب، فتح المجید کے ص ۱۶۶ سے ترجمہ اور اقتباس کیا ہے اور اس پر کچھ اضافہ کیا ہے، حریت اور آزادئ فکر کا مفہوم یہ ہے!!!

پکارنے کے معنی میں ہے تو اس سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ دعائے مسئلت، دعائے عبادت کو مستلزم ہے؟ یعنی طرف مقابل سے حاجت کی درخواست کرنے سے اس کی پرستش لازم آتی ہے۔

یہ دونوں آیات برفرض دلالت (اگر چہ ہرگز دلالت نہیں کرتیں) اس سے زیادہ نہیں بتاتیں کہ کسی کو کبھی بھی نہیں پکارنا چاہیے لیکن یہ بات کہ کسی کو پکارنے سے اس کی پرستش لازم آتی ہے ظاہر آیت اس بالکل دلالت نہیں کرتا، کسی چیز سے منع کرنا اس بات کا گواہ نہیں ہے کہ جس بات سے منع کیا گیا ہے وہ پرستش وعبادت کا مصداق ہے۔

ثانیاً: دعائے مسئلت سے اس صورت میں دعائے عبادت لازم آتی ہے، جب انسان طرف مقابل کو خدا اور امور دنیا وآخرت کا مالک اور خدائی کاموں کے ایک حصہ کا مختار تام سمجھے تو یہ وہ موقع ہے جہاں دعائے مسئلت سے دعائے عبادت لازم آتی ہے بلکہ وہ خود عبادت ہی ہے نہ کہ اس سے لازم آتی ہے اور اس قسم کی دعوت عین پرستش ہے نہ کہ اس کو ملازم ہے۔

لیکن اگر کسی کی دعا و پکار اس قسم کے محرکات اور عوامل سے خالی اور پاک ہو اور وہ اس کو ایک بندہ صالح کے سوا جس کی دعا بارگاہ خدا میں ایک خاص اثر رکھتی ہے اور کچھ نہ سمجھتا ہو تو ہرگز اس کو ندا دینا اور پکارنا، اس کی پرستش اور عبادت نہ ہوگی اور جو آیت اس نے اپنے بیان میں پیش کی ہے وہ مشرکین کے معاشرے کے ساتھ مربوط ہے جو بتوں کو چھوٹے خدا مقام ربوبیت میں تام الاختیار شفعاء سمجھتے تھے اور ان دونوں آیات اور دوسری آیات سے ان دعوتوں اور درخواستوں پر استدلال جو ان اوہام وافکار سے خالی اور پاک ہیں، بہت ہی زیادہ باعث تعجب ہے۔

ثالثاً: انہوں نے امور حسی میں کسی زندہ سے اس بناء پر استغاثہ کس طرح صحیح سمجھ لیا کہ امت اسلامی نے اس کے جواز پر اتفاق اور صاد کیا ہے اور انہوں نے اس طرف توجہ نہیں کی ہے کہ اگر غیر خدا سے مطلق استغاثہ۔ جو طرف مقابل کی الوہیت یا مالکیت کے اعتقاد کے ساتھ نہ ہو شرک ہو، تو طرف مقابل کا زندہ یا مردہ ہونا اس سلسلہ میں کوئی اثر نہیں رکھتا۔

ہٹ دھرمی کی شریعت وہابیوں کی کتابوں میں ڈوبے رہنے کی بنا پر انکی باتوں کے زیر اثر واقع ہوئی ہے اور اس طرف کوئی توجہ نہیں ہے کہ جو چیز عبادت اور پرستش کو درخواست اور سوال کرنے سے جدا کرتی ہے وہ طرف مقابل کی حیات وممات اور قدرت وناتوانی نہیں ہے بلکہ سوال کرنے والے کا مسئول کے بارے میں عقیدہ ہے اور بس۔

اگر کوئی شخص کسی سے اس اعتقاد کے ساتھ کہ وہ امور خداوندی کا مالک ہے کسی مطلب کی درخواست کرتا ہے، چاہے مسئول زندہ ہو یا مردہ تو وہ مشرک اور اس کی عبادت و پرستش کرنے والا ہوگا لیکن اگر اس عقیدہ سے ہٹ کر پاک اور مبرا رہتے ہوئے سوال پیش کرے تو اس کا شرک کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا، چاہے طرف مقابل زندہ ہو یا وفات پا چکا ہو۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم بعض اوقات تو ارواح مقدسہ سے دعا کی درخواست کرتے ہیں اور کبھی بیمار کی شفاء اور قرض کے ادا ہونے کی درخواست کرتے ہیں تو کیا ان دونوں درخواستوں کے درمیان کوئی فرق ہے یا نہیں، کیا دوسرا خدا کا کام ہے یا ایک معنی کے لحاظ سے خدا کا کام ہے اور ایک معنی کے لحاظ سے بشر کا کام ہے۔ اس سلسلہ میں ہم پہلے بھی بحث کر چکے ہیں اور یہ بیان کر چکے ہیں کہ خدائی کاموں کی میزان کیا ہے۔

اس بیان سے اس حدیث کا معنی ومفہوم، جسے فریقین نے نقل کیا ہے اور آج وہ وہابیوں کی دستاویز بنا ہوا ہے، واضح ہو جاتا ہے اور وہ حدیث یہ ہے کہ پیغمبر گرامیؐ نے ارشاد فرمایا:

"الدعاء مخ العبادة"

''دعا اور ندا عبادت کا مغز ہے'' [1]

وہابی کہتا ہے: جب عبادت و پرستش کی حقیقت و واقعیت وہی دعا اور کسی کو پکارنا ہی ہے تو پھر اس صورت میں اولیا خدا سے شفاعت کی درخواست کرنا اور انہیں پکارنا اور ندا کرنا بھی ان کی پرستش شمار ہوگا۔

لیکن یہ استدلال سفسط سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ اس میں کچھ میں شک نہیں ہے کہ کسی شخص کو مطلق طور سے پکارنا اور کسی انسان کو ندا دینا عبادت نہیں ہے۔ اس بنا پر وہ خاص ندا اور پکار جو مغز عبادت سمجھی جاتی ہے، وہ دعوت ہے جو طرف مقابل کی الوہیت کے اعتقاد کے ساتھ ہو۔

دوسرے لفظوں میں (الدعا) سے مراد (دعا اللہ) (اللہ سے دعا کرنا) ہے اور حدیث کا مفاد یہ ہے کہ:

(دعا الله مخ العبادة) خداوند عالم سے دعا کرنا اور اس کو پکارنا عبادت کا مغز ہے، اس حدیث کا پاکیزہ انسانوں کو پکارنے کے ساتھ کیا رابط ہے، جن کے بارے میں ہرگز الوہیت کا معمولی سے معمولی اعتقاد بھی نہیں ہے۔

ختم شد

قم۔ مؤسسہ امام صادقؑ

۲۳: جمادی الاول ۱۴۰۲ مطابق ۲۸: اسفند ماہ ۱۳۶۰

تفسیر موضوعی کی دوسری جلد کا ترجمہ بوقت پونے دس بجے شب بروز بدھ بتاریخ ۲۷ رذی الحجہ ۱۴۰۶ھ مطابق ۳ رستمبر ۱۹۸۶ء بر مکان سیٹھ نوازش علی ساعتی ۱۸۱ ای ماڈل ٹاؤن لاہور بدست حقیر پر تقصیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم اختتام پذیر ہوا۔

احقر۔ صفدر حسین ۸۶۔۹۔۳

---

[1] سفينة البحار۔ مادہ دعا۔